خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ

سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ

جون 2021

عید مبارک

بانی

معراج رسول

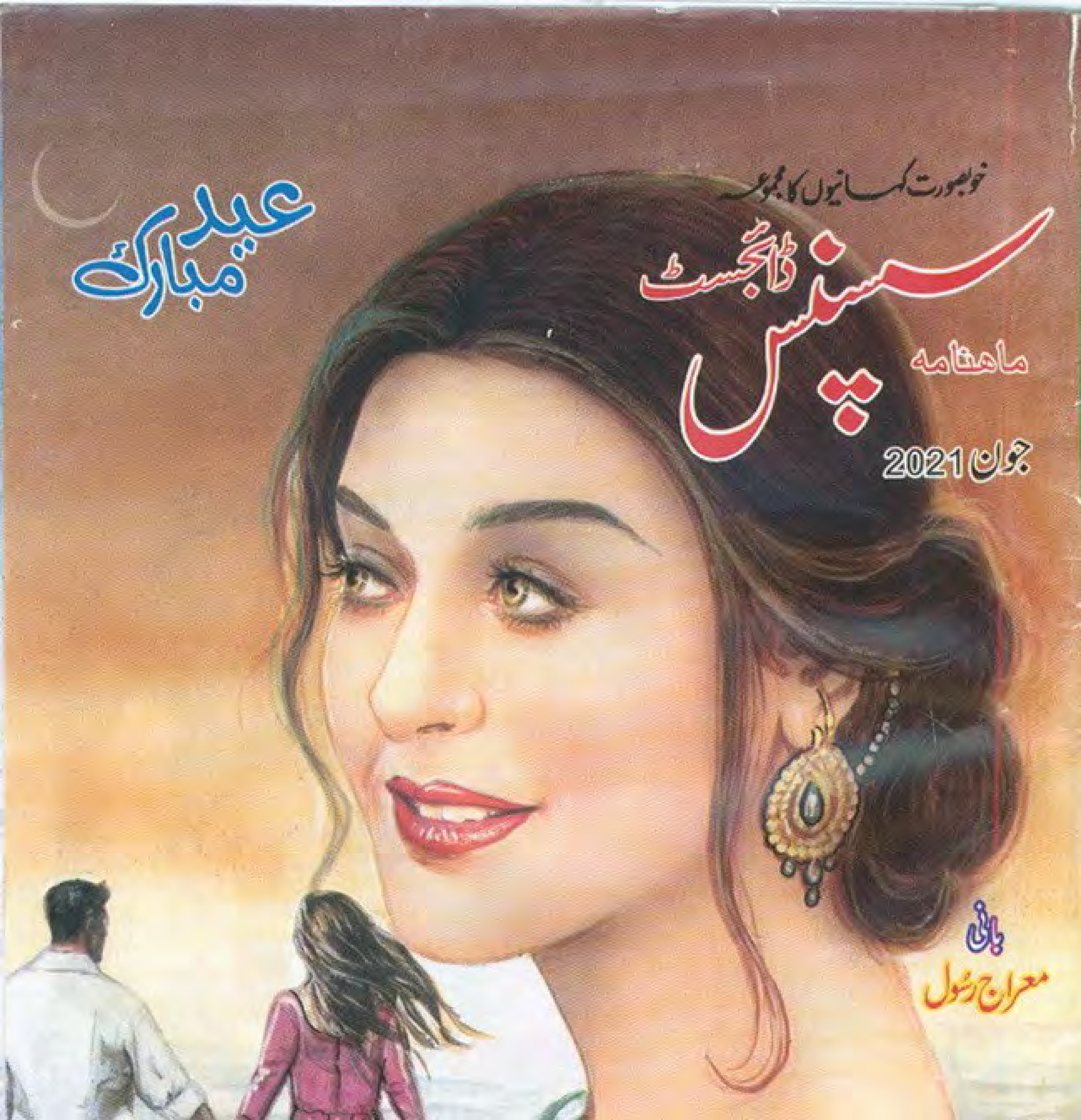

www.pklibrary.com

سسپنس ڈائجسٹ

مدیرِ اعلیٰ
عذرا رسول

انشائیہ 07 — جون ایلیا
عصری المیے کا آفاقی حل
نکتہ رس کی نکتہ رسی

آپ کے خط 08 — مدیر اعلیٰ
سسپنس کی مجلس مشاورت قارئین کی تلخ و
شیریں باتیں، گلے شکوے اور پرخلوص مشورے

بساط 12 — زویا اعجاز
ماضی کا آئینہ با اختیار اور بے اختیار
انسانوں کے سبق آموز اور عبرت آمیز واقعات

متبادل 45 — تنویر ریاض
جرائم کی دنیا میں متبادل مجرم
کا انوکھا انداز اور انجام کا ماجرا

اصل تابا 57 — نجمہ مودی
انسانی اعضا کی خوفناک
تجارت اور بے حرمتی کا ماجرا

شہ زور 64 — اسما قادری
اپنے حریفوں پر قہر بن کر نازل ہونے والے
ایک سراپا انتقام نوجوان کی تحیر انگیز داستان

بابِ محبت 93 — ناہید سلطانہ اختر
حالات کی کڑی دھوپ اور محبت کے سائے
کے درمیان رسا کشی کا دلچسپ احوال

باتدبیر 117 — سلیم انور
ایک ذہین و فطین مجرم کی
کارروائیوں کا دلچسپ احوال

ابن الحرص 120 — مرزا امجد بیگ
حرص و ہوس کی بساط پر کھیلنے والے چند
فریب کاروں کا عبرت اثر انجام

مینجر اشتہارات
محمد شہزاد خان
0333-2256789

سرکولیشن مینجر
سید منیر حسین
0333-3285269

جلد 50 • شمارہ 06 جون 2021 • زرِ سالانہ 1500 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 150 روپے •
خط کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 215 کراچی 74200 • فون: 35895313(021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com

www.pklibrary.com

ہندو معاشرے میں اپنے پرائے کی ظالمانہ تقسیم کا دل سوز قصہ

اپنوں کی محبت میں مر مٹنے والے ایک جانباز کا قصہ

آپ کے ہاتھوں سجی ایک انجمن رنگ رنگ
آپ کی پسند آپ کے ذوق سے ہم آہنگ

ایک بے گناہ مگر..... چشم دید گواہ کا سبق آموز ماجرا

ایک معمولی سی بات کو بڑھاوا دینے والوں کا قصہ

طاقت کے گھمنڈ اور غرور کے محلوں کو مسمار کرنے والے ایک شجاع کے عزم کا سنسنی خیز سلسلہ

دشمنی کے انداز میں ہمدردی کرنے والے ایک ہیرو کا منفرد طریقہ

سلسلۂ تصوف کی ایک نادر شخصیت کی سوانح اور اقوال

بے چارگی کے جنگل میں بھٹکنے والے ایک سمجھ دار انسان کا قصہ

شکر کی نعمت سے بیزار رہنے والے چند عاقبت نااندیشوں کی عبرت اثر داستان

پبلشر و پروپرائٹر: ذیشان رسول • مقام اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکس ٹینشن، ڈیفنس، مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

www.pklibrary.com

انشائیہ

جون ایلیا

منطق اور فلسفہ

تم دیکھ رہے ہو کہ انسانوں نے انسانیت کی طرف سے کس طرح آنکھیں پھیر لی ہیں۔ محبت ہماری بستیوں میں کس طرح نایاب ہوگئی ہے۔ ہر طرف نفرت کا دور دورہ ہے۔ نفرت کے جو مناظر ہم نے اپنے دور میں دیکھے ہیں، انہوں نے انسانیت کی نگاہیں نیچی کردی ہیں۔ سیاست نے کیا کیا؟ زندگی کے خلاف فقط سازشیں کیں۔ اس کا ثمرہ یہ ہے کہ زندگی حرام ہوکر رہ گئی ہے۔ غرض مند علم نے کیا فرض انجام دیا؟ جہل کے حوصلے بڑھائے۔ اس کا فیضان یہ ہے کہ لوگ بدی کے نئے نئے گر سیکھ گئے ہیں۔

ہمارے مدبّر بے تدبیری میں طاق اور مشاق ہیں۔ سن لو! وہ ایسی باتیں کررہے ہیں جو غریبوں، سادہ لوحوں اور مظلوموں کے ایک گروہ کو دوسرے گروہ کا جانی دشمن بنادیں۔ جھگڑا آخر کیوں کھڑا کیا گیا ہے؟ اس لیے کہ مظلوم اور محروم آپس میں ٹکرا جائیں اور ظالم اور غاصب تماشا دیکھیں۔ یہی ان کا تدبّر ہے اور یہی ان کی حکمت۔

سب سے زیادہ دکھ کی بات یہ ہے کہ ہمارے پڑھے لکھے لوگ تعصب کے سب سے بڑے وکیل ہیں۔ اگر یہ لوگ فریب کار نہیں ہیں تو یقیناً فریب خوردہ ہیں۔ یہ ایک دردناک حقیقت ہے کہ اس ملک میں جتنی نفرتیں پھیلائی ہیں، وہ پڑھے لکھے لوگوں ہی نے پھیلائی ہیں۔ یہاں پڑھا لکھا ہونا اور متعصب ہونا، دونوں کا ایک ہی مطلب ہے۔ علم نے جہل کو جس گرم جوشی کے ساتھ اپنے سینے سے لگا رکھا ہے، وہ ہمارے زمانے کا ایک طرفہ ماجرا ہے۔

تم ان لوگوں سے بات کرو جو پڑھے لکھے نہیں ہیں۔ اگر انہیں بُری طرح بہکا نہ دیا گیا ہو تو پھر تم دیکھو گے کہ نہ ان میں زبان کا تعصب ہے اور نہ علاقے کا۔ اگر انہیں کسی پر غصہ آئے گا یا وہ کسی وجہ سے کسی سے نفرت کریں گے تو وہ اپنے غصے اور اپنی نفرت کے حق میں کوئی فلسفہ نہیں گھڑیں گے۔ ان کی نفرت اس شخص کی ذات سے آگے نہیں بڑھے گی جس سے انہیں کوئی اذیت پہنچی ہو۔ مگر یہ پڑھے لکھے لوگ اپنی نفرت اور غصے کو ایک منطق اور فلسفہ بنا کر پیش کرتے ہیں۔ یہ لوگ مفسدانہ کلیے بناتے ہیں اور گروہوں کے درمیان مستقل فتنے پھیلاتے ہیں۔ ہمیں ان لوگوں کی زبان سے اس قسم کے مقولے سننے کو ملتے ہیں کہ فلاں قوم تعصبی ہوتی ہے۔ اس قسم کے بے رحمانہ کلیے صرف چند مثالوں کو سامنے رکھ کر بڑی شتابی اور نہایت بے حسی اور بے شرمی کے ساتھ لاکھوں کروڑوں انسانوں پر تھوپ دیے جاتے ہیں۔

آج کل ان ''حکیمانہ کلیوں'' اور ''دانشمندانہ مقولوں'' کی ساعتوں کے بازاروں میں بڑی مانگ ہے۔ لوگ یہ کلیے اور مقولے تحفے کے طور پر ایک دوسرے کی سماعت کو پیش کرتے ہیں۔ زہر ہے کہ پھیل رہا ہے، نفرتیں ہیں کہ بڑھ رہی ہیں۔ عقل دیوانی ہوگئی ہے اور دماغ ماؤف اور دانش بے دانشی کے چبوترے پر بیٹھی ہوئی بکواس کررہی ہے۔ سمجھا جائے کہ ہم اپنی تاریخ کے جس دور سے گزر رہے ہیں وہاں خود غرض اور مطلبی طبقے اسی قسم کے شوشے اٹھایا کرتے ہیں۔ اسی طرح کے اشتعلے چھوڑا کرتے ہیں ورنہ تم خود سوچو کہ زبانوں، تہذیبوں اور علاقوں کے درمیان بھلا کیا جھگڑا ہے۔ آخر اس بات کے کیا معنی ہیں کہ میں فلاں گروہ سے اس لیے نفرت کرنے لگوں کہ وہ ایک خاص زبان بولتا ہے اور ایک خاص گروہ پیش سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کے ہر گروہ کو اپنے گروہ کے سوا ہر گروہ کا دشمن ہونا چاہیے۔ یہ کتنی مجنونانہ بات ہے اور کتنی بے معنی۔ سنو کہ ہمیں اس بات کو اور ایسی ہی باتوں کو سختی سے رد کرنا ہے۔

☆☆☆

www.pklibrary.com

عزیزانِ من!

السلام علیکم!

جون 2021ء کا سسپنس آپ کے مطالعے کے لیے حاضر ہے۔ گویا آدھا سال...... پتا ہی نہیں چلا کہ کتنی تیزی سے گزر گیا۔ کورونا کی نئی لہر نے ایک بار پھر ہر طبقے میں تشویش کی لہر دوڑا دی ہے۔ ماہِ صیام اپنی رحمتوں اور نوازشوں کے ساتھ رخصت ہو چکا ہے۔ عید الفطر بھی کورونا کی نذر ہوئی۔ وقفے وقفے سے آنے اور جانے والے اس کورونا نے ملک بھر میں شاید کسی کو بھی کچھ کرنے کے قابل نہیں چھوڑا۔ اس کا سب سے بُرا اثر مزدور طبقے کے ساتھ ساتھ طالبِ علموں پر پڑا ہے جو اپنے تعلیمی مراکز سے دور اور دیگر ایکٹیویٹی میں مشغول ہو گئے ہیں۔ والدین بھی اس صورت حال سے انتہائی فکر مند ہیں جو اس مہنگائی کے دور میں قطرہ قطرہ جوڑ کر اپنے بچوں پر پیسا لگا رہے ہیں مگر تعلیم کے حوالے سے انتہائی غیر مطمئن ہیں۔ پچھلے ڈیڑھ دو سالوں کے اندر ماحول بالکل بدل کر رہ گیا ہے۔ اس سلسلے میں حکومت کو ان طالب علموں کے لیے خاص پروگرامز شروع کرنا چاہیے تھے تاکہ آن لائن ہی سہی، ان کے سیکھنے اور جاننے کا عمل جاری رہتا۔ روزگار کے حوالے سے بھی کچھ خاص اقدامات کیے جاتے تو کتنے ہی ہاتھ دعا کے لیے اٹھ جاتے مگر...... تا حال اس سلسلے میں کوئی بھی مثبت اقدام دیکھنے میں نہیں آیا۔ بس ہر جانب سے ایک خوف، ناامیدی اور بے بسی کی کیفیت نے گھیرا ہوا ہے۔ ابھی تو عوام پر بجٹ کے نام پر بھی ایک اور بم گراتا ہے۔ اللہ کرے اس بار انتہائی نرم پالیسیوں کو ترتیب دیا گیا ہو... جس میں غریب عوام کو کچھ ریلیف مل سکے ورنہ...... دل کو غمزدہ کرنے والی صدائیں تو ہر جانب سے آ رہی ہیں۔ بہر حال حالات جو بھی ہوں مقابلہ تو کرنا پڑتا ہے۔ یہ قوم بہت بہادر سہی مگر ایک مقام پر آ کر تھکن ہو ہی جاتی ہے نا۔ اللہ رب العزت اس قوم کو تھکنے سے پہلے سکون دے دے، الٰہی آمین۔ اب ذرا چلتے ہیں اپنی محفل کی جانب۔

✠ محمد عثمان خان کی لاہور سے آمد۔ ”امید کرتا ہوں کہ سسپنس ڈائجسٹ کا تمام اسٹاف اور قارئین خیریت سے ہوں گے۔ پاکستان میں کورونا کے کیسز دوبارہ بڑھ گئے ہیں۔ اللہ اس وبا کو جلد ختم کرے، آمین۔ اس مرتبہ سسپنس ڈائجسٹ خلافِ توقع جلدی آ گیا۔ مئی کا شمارہ اکیس اپریل کو نیوز ایجنسی سے خریدا۔ سرورق کی حسینہ پسند آئی۔ تمام قارئین کے خطوط پسند آئے۔ کنول صاحبہ کو کرسیٔ صدارت سنبھالنے پر مبارک باد۔ بہترین تبصرہ لکھا۔ عامر مشتاق کو سسپنس کی محفل میں خوش آمدید۔ کنول صاحبہ اور عامر مشتاق صاحب کا شکریہ کہ انہوں نے میرا خط شائع ہونے پر مبارک باد دی۔ کہانیوں میں سب سے پہلے زویا اعجاز صاحبہ کی تحریر ”محبت گزیدہ“ پڑھی۔ بہترین تحریر تھی۔ آخر میں روزی کی حالتِ زار پر افسوس ہوا۔ ”نامعلوم“ دلچسپ تحریر تھی۔ ہوائی فائرنگ واقعی بہت خطرناک ہوتی ہے۔ ”خوش قسمتی“ بہترین تحریر تھی۔ سطر سطر میں سسپنس تھا، ویلڈن۔ ”جشنِ محبت“ بھی ایک عمدہ تحریر تھی۔ ”کایا پلٹ“ ایک دلچسپ تحریر تھی۔ ”مال کار“ میں ملک صفدر حیات نے عمدگی سے حامد علی خان کو اس کے انجام تک پہنچایا۔ ”مس فٹ“ غلام قادر صاحب کی مخصوص انداز میں لکھی ہوئی تحریر تھی۔ مجھے یہ سمجھ نہیں آتا کہ غلام قادر صاحب کی اکثر کہانیوں میں ہیرو بیرونِ ملک کیوں ہوتا ہے۔ ”سادہ لوح“ سراغ رسانی سے بھرپور تحریر تھی۔ آخر میں فلورنس پکڑی گئی۔ ”دائرہ“ منظر امام صاحب کی مخصوص انداز میں لکھی گئی تحریر تھی۔ ”دو پجاری“ میں باپ بیٹا ایک ہی طوائف پر عاشق ہو گئے۔ ”ابوالطیب متنبی“ کا دوسرا حصہ بھی دلچسپی سے پڑھا۔ شبینہ گل کی ”تلاش“ پڑھ کر آنکھیں نم ہو گئیں۔ بہت عمدہ تحریر تھی۔ آخری صفحات پر نشور ہادی کی تحریر ”بولتی آنکھیں“ پیچیدہ کہانی لگی۔“

✠ شاہانہ سلطان کا محبت نامہ گلشنِ ظہور کراچی سے حاضر ہے۔ ”اس بار جون ایلیا کا انشائیہ ”یہ شہر“ کے نام سے پڑھنے کو ملا۔ کیا خوب، سطر سطر نے حیران کر دیا۔ برسوں پہلے لکھے گئے یہ الفاظ اس دور پر بھی کیسے حرف بہ حرف پورے بیٹھ رہے ہیں۔ روشن خیال اور باشعور قلم کاروں کا یہی کمال ہوتا ہے کہ وہ آنے والے وقت کو بھی بڑی گہرائی سے دیکھ لیتے ہیں۔ واہ، بہت خوب۔ آخری صفحات پر نشور ہادی کی تحریر ”بولتی آنکھیں“ کے عنوان سے شامل تھی۔ ہپناٹزم کے حوالے سے کہانی کو پراسرار بنانے کی کوشش کسی حد تک کامیاب ٹھہری مگر کہیں کہیں کسی کمی کا احساس بھی ہوا۔ خاص طور پر سائرہ کے ماضی کے واقعات کچھ خاص تاثر نہ چھوڑ سکے۔ بہر حال قدم قدم پر سسپنس پیدا کیا گیا جو کسی حد تک کامیاب بھی رہا۔ البتہ شہلا سے متعلق سائرہ کا فیصلہ غیر دانش مندانہ تھا۔ پسندیدگی میں یہ ملاپ کرنا ضروری تو نہیں تھا۔ کسی دوسرے رستے کا بھی انتخاب کیا جا سکتا تھا۔ بہر حال مجموعی طور پر کہانی مناسب ہی لگی (ارے بھئی اتنے چھوٹے دل کے ساتھ تعریف نہیں کرتے۔ تھوڑا حوصلہ اور بڑا دل ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے کھل کر تعریف کرنا چاہیے......) بہت عرصے بعد کچھ ماہ سے تاریخی صفحات کی چاشنی میں اضافہ ہو چلا ہے۔ تاریخ میں ناکام محبتوں اور اپنے اپنے دور کے مسائل کا ادراک، اس وقت کا رہن سہن، حکومتی راز و نیاز اور دوست احباب کا احوال پڑھ کر بہت لطف آ رہا ہے۔ ”محبت گزیدہ“ نے تو آنکھوں میں آنسو اور دل میں دکھ کی لہر پیدا کر دی۔ ناانصافی اور طبقاتی کشمکش نے ہر دور میں پُردرد داستانوں کو جنم دیا ہے۔ زویا اعجاز کے قلم کی روانی اور پختگی نے دل کو خوش امکانی سے بھر دیا ہے۔ بہت مبارک ہو زویا...... ہو زورِ قلم اور زیادہ، خوش رہو۔ اس بار ”تلاش“ کے عنوان سے شبینہ گل کی تحریر پڑھی۔ چھوٹی سی اس تحریر نے سوچ کے کئی در وا کر دیے۔ یہ محبت بھی عجیب طلسماتی جذبہ ہے۔ جسے ہو جائے وہ تو متاثر ہوتا ہی ہے، جسے کسی کی محبت کا علم ہو جائے اس پر بھی اثر انداز ہو جاتا ہے۔ بہت خوب۔ عشق و محبت کے اسی تناظر میں ایک دوسری کہانی ”دو پجاری“ کے نام سے پڑھی۔ کتنا عجیب سا احساس ہوتا ہے یہ سوچ کر کہ ایک ہی عورت...... باپ اور بیٹے میں تمیز کرنے میں کتنی دیر لگا دیتی ہے۔ آپ کے دونوں سلسلے بھرپور توانائی کے ساتھ ماشاء اللہ آگے بڑھ رہے ہیں۔ ان میں سے ایک سلسلہ البتہ ہمیں

www.pklibrary.com

اختتام کی طرف بڑھتا دکھائی دے رہا ہے۔ اسما قادری کی شہ زور نے تو خم ٹھونک کر بازی لگائی ہوئی ہے۔ تصوف میں ابوالطیب متنبی کا دوسرا اور آخری حصہ پڑھا۔ انسان پر گھمنڈ اور تکبر کبھی جچا ہی نہیں۔ یہ تو اللہ کی شان ہے جو اسی پر جچتی ہے۔ تاریخ گواہ ہے جب جب انسان نے گھمنڈ کی چادر لپیٹی، انتہائی تباہ کن حالات سے دوچار ہوا۔ غلام قادر کی کہانی ''مس فٹ'' ایک دم فٹ ثابت ہوئی۔ جو خود کسی قابل نہیں ہوتا وہی اپنا جھوٹا بھرم قائم رکھنے کے لیے دوسروں کو اپنے قابل نہ ہونے کا رونا روتا ہے۔ بہرحال اچھی کہانی تھی۔ ''دائرہ'' منظر امام کی کہانی نے احساس دلایا کہ کوئی انسان چاہے کتنی ہی لمبی زندگی پالے، بالآخر موت ہی اس کا انجام ہے اور یوں وہ اپنی زندگی کا دائرہ مکمل کر جاتا ہے۔ دل میں چٹکی لیتی تحریر تھی۔ محفل شعر و سخن میں اس بار تمام اشعار دل کو چھو لینے والے تھے۔ بہت اچھی محفل سجائی۔ تنویر ریاض کی کہانی ''نامعلوم'' نے بھی بہت لطف دیا۔ ہوائی فائرنگ تو ویسے بھی کوئی ایسا اچھا کارنامہ نہیں ہوتا جس پر فخر کیا جاسکے اور جب ایسی کوئی غلطی سرزد ہو جائے جو کسی کی جان لینے کا سبب بن جائے تو دل کرتا ہے کہ اس بندے سے سوال کیا جائے کہ اپنی اتنی معمولی سی خوشی کی خاطر کسی دوسرے کی جان لے کر تمہیں کیا ملا...... اور بعد میں یوں اس طرح فرار ہونے اور پچھتانے سے بھی کیا حاصل...... کیا جائے اگر تھوڑی سی عقلمندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس فضول سے فیصلے سے اجتناب برت لیا جائے۔ ہائے مگر ایسی عقل ہو تو ایسی غلطیاں ہی کوئی کیوں کرے۔ اللہ ہم سب پر اپنا خاص رحم فرمائے۔ بابر نعیم کی ''کایا پلٹ'' نے بھی اچھا درس دیا۔ خلوص صرف دوست ہی کی میراث نہیں بلکہ انصاف پسند دشمن بھی خلوص و وفا کا ثبوت دے سکتا ہے۔ وہ بھی تو ایسا ہی دوست ثابت ہوا تھا جس پر دشمن ہونے کا الزام تھا۔ ویل ڈن، اچھی کاوش تھی۔ ''جشنِ محبت'' آصفہ ضیا احمد لے کر آئیں اور چھا گئیں۔ ہندو معاشرے کی بھی عجیب اور اچھوتی کہانیاں سامنے آتی رہتی ہیں۔ ازدواجی تعلقات کو مضبوط کرنے کا کتنا واضح اشارہ اس میں موجود ہے۔ جو شوہر اپنی بیوی کا لباس بن جاتے ہیں، وہ ایسے ہی ایثار اور محبت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ یہ کہانی بھی بہت اچھی تھی۔ دل کے تاروں کو ہلا گئی۔ ملک صفدر حیات کی ''تال کار'' تو اس ماہ کی سب سے بیسٹ کہانی ثابت ہوئی۔ عزت کے بیوپاریوں کا عبرت اثر احوال دل کو خوش کر گیا۔ کاش آج کے دور میں بھی ملک صفدر حیات جیسے پولیس آفیسر ہوں تو معاشرے میں جرم کی شرح گھٹ جائے...... اور جناب اب میرے ہاتھ دکھ رہے ہیں تبصرہ لکھتے لکھتے۔ دعا کیجیے گا اگلے ماہ تک میرے ہاتھوں کا یہ درد ٹھیک ہو جائے اور میں ایک بار پھر تبصرہ لے کر حاضر ہو جاؤں (بہت ہی خوب جناب...... کیسا بھرپور تبصرہ لے کر آئیں اور چھا گئیں...... بہت اچھا لگتا ہے جب قارئین اتنی توجہ سے ہماری کاوشوں کو سراہتے ہیں)۔''

☩ کنول کا انتظار چنیوٹ سے۔ ''اس بار سرگزشت کی آمد کے بعد جاسوسی کا انتظار تھا لیکن بالکل ہی غیر متوقع طور پر سسپنس کی آمد ہو گئی اور حیرت انگیز طور پر سسپنس کے بعد پھر سے اگلے مہینے کا سرگزشت بھی آ گیا پر جاسوسی کا نام و نشان نہیں تھا۔ لگتا ہے رسالوں کی ترتیب اور شیڈول بدلنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ بہرحال سسپنس میں میرا تبصرہ پہلے نمبر پر شائع ہوا۔ دیکھ کر اچھا لگا۔ رومی انصاری صاحب کا تبصرہ پسند کرنے پر بہت شکریہ۔ سب سے پہلے شبینہ گل کی تحریر ''تلاش'' پڑھی۔ ہمارے معاشرے میں بڑھاپے میں جوان اولاد کی موجودگی میں نئے بچے کی آمد کے ساتھ جڑے مسائل کا ذکر کیا گیا۔ بے سہارا بچوں کی طرح پروان چڑھی مینا جس جذباتی بحران کا شکار ہوئی اور محبت کی تلاش میں گھر سے باہر دیکھنے پر مجبور... ہوئی اور پھر راز فاش ہونے پر اس کے ساتھ جو سلوک کیا گیا ایک آنکھ نہیں بھایا۔ حسّام کا کردار ایک ٹیپیکل دھوکے باز اور بے وفا مرد کا تھا۔ بہرحال کہانی کا انجام اچھا ہی کیا گیا۔ ایک اثر انگیز اور خوبصورت تحریر تھی۔ محمد نواز ادیالوی کی تحریر ''دو پجاری'' ایک انار سو بیمار والے محاورے پر پوری اترتی نظر آئی۔ باپ اور بیٹا ایک ہی نجمہ نامی طوائف کے دیوانے نکلے اور میں کہانی پڑھ کر سوچ میں پڑ گئی کہ واقعی میں طوائف نجمہ تھی یا وہ باپ بیٹے؟ اور عورت کے لیے تو طوائف کا خطاب موجود ہے ایسے مردوں کے لیے کیا لقب اور نام رکھا جائے؟ اچھی تحریر تھی۔ شاہ زین رضوان کی تحریر ''سادہ لوح'' کچھ خاص پسند نہیں آئی۔ خشک سی لگی۔ غلام قادر صاحب کی کہانی ''مس فٹ'' وقت گزارنے کے لیے ٹھیک ٹھاک تھی اور غلام قادر صاحب ایسی بہت سی باتیں لکھ جاتے ہیں جو حقیقت سے کوسوں دور ہوتی ہیں۔ مغرب میں شوبز انڈسٹری اتنی غیر پروفیشنل ہرگز نہیں ہوتی کہ ایک منٹ میں کسی اداکار کے کہنے پر کسی کو بھی بغیر آڈیشن کے کاسٹ کر لیا جائے۔ ان کے تو آڈیشنز بھی کئی کئی ماہ چلتے ہیں۔ بابر نعیم کی تحریر ''کایا پلٹ'' ایک ایوریج تحریر تھی۔ ڈینی جیسے مردوں پر لعنت بھی بھیجنے کا دل نہیں کرتا۔ مطلب بیوی گھر میں موجود ہے دوسری عورت سے چکر چلا رہا ہے پھر اس پر تشدد کرتا ہے اور اتنا کرتا ہے کہ جان سے مار دیا لیکن دعویٰ پھر بھی یہی کہ میں اس سے بہت پیار کرتا تھا۔ سبحان اللہ۔ اسے محبت کہتے ہیں تو نفرت کیا ہوتی ہے؟ ایسے مرد کسی کے وفادار نہیں ہوتے اور اپنے اثر و رسوخ اور سسٹمیٹک تعصبات کی بنا پر کسی بھی سزا سے صاف بچ بھی نکلتے ہیں۔ آصفہ ضیا احمد کی کہانی ''جشنِ محبت'' بھی ٹھیک ٹھاک کہانی تھی۔ بری بھی نہیں تھی اور بہت اعلیٰ بھی نہیں تھی اور ایک بار پھر ہندوستانی ماحول میں لکھی گئی۔ کسم پر پڑنے والی افتاد اور خطرے کا اس کے پتی نے بہت سمجھداری سے حل نکالا اور روپیش سے نجات حاصل کر لی۔ مظہر سلیم ہاشمی کی تحریر خوش قسمت اچھی کہانی تھی۔ کوئین واقعی میں خوش قسمت ثابت ہوا اور خطرناک مجرم پکڑنے میں کامیاب رہا۔ تنویر ریاض کی کہانی ''نامعلوم'' بھی... ایک اچھا پیغام لیے ہوئے اچھی تحریر تھی۔ خوشی کے مواقع پر کی جانے والی ہوائی فائرنگ اور اس کے نقصانات بیان کرتی تحریر پسند آئی۔ نشور ہادی کی تحریر ''بولتی آنکھیں'' ان کے مخصوص افسردہ سے انداز کی تحریر تھی۔ سکندر اور سائرہ تو بچپن کے ساتھی تھے اور محبت میں مبتلا ہو کے شادی بھی کر لی۔ لیکن یہ جو ہر دوسری کہانی میں دوسری شادی کو نارملائز کرنے کی کوشش کی جاتی ہے نا یہ بہت ہی غلط حرکت ہے۔ مطلب شوہر نہ ہوا کوئی کھلونا یا ٹافی ہو گیا کہ خوشی خوشی بانٹ لیا (ارے رے رے...... اتنا غصہ...... معاملہ کیا ہے جناب۔ کافی غصے والی معلوم ہوتی ہیں۔ چلیں جی آپ کا تبصرہ سر آنکھوں پر)۔''

☩ محمد عثمان ذوالفقار کا گزشتہ شمارے پر تبصرہ ساہیوال سے۔ ''اپریل کا سسپنس ملا تو سب سے پہلے سرورق پر نظر پڑی۔ اداس حسینہ تھوڑی

www.pklibrary.com

پر ہاتھ رکھے جانے کس کی سوچ میں گم خلاؤں کو گھور رہی تھی اور جانے کون اس کی سوچوں کو درہم برہم کر رہا تھا تو ہم نے سوچا کہ چل رہن دے، ہم جا کر محفل درہم برہم کرتے ہیں اور یہ سوچتے ہی چھلانگ لگا کر محفل میں داخل ہوئے جہاں پر ریاض بٹ صاحب حسن ابدال سے آکر کرسیِ صدارت سنبھالے ہوئے تھے اور محفل کو درہم برہم کرنے میں مشغول تھے۔ اس کے بعد کنول صاحبہ تسلی اور تفصیل سے پچھلے شمارے کی ساری کہانیوں کا خلاصہ کرنے میں مصروف نظر آئیں۔ رمضان پاشا تین ماہ کی غیر حاضری کے بعد مختصر تبصرے کے ساتھ شکوہ کرتے نظر آئے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صحتِ کاملہ عاجلہ عطا فرمائے، آمین ثم آمین۔ میانوالی سے ریاست خان بھی کہانیوں کے کرداروں کو درہم برہم کرتے ہوئے آئے۔ لاہور سے میرے ہم نام یعنی عثمان خان کو خوش آمدید کہتا ہوں۔ امید کرتا ہوں آپ مزید تبصرے بھی بھیجیں گے۔ بشیر احمد صاحب نے خوبصورت اور روز خشاں ماضی کی یاد دلانے کی کوشش کی جس میں وہ کسی حد تک کامیاب رہے اور ہماری سوچوں کو درہم برہم کرنے کی کوشش کی۔ عیوق بخاری سسپنس ڈائجسٹ کی گولڈن جوبلی پر مبارکباد پیش کر رہی تھیں۔ آپ کو بھی مبارک ہو۔ اب آتی ہے کہانیوں کو خلاص کرنے کی باری۔ اولین صفحات پر زویا اعجاز صاحبہ کی ”چاہ قفس“ تھی۔ زویا اعجاز صاحبہ کے بارے میں صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ یہ ان چند لکھاریوں میں سے ایک ہیں جو تاریخ جیسے خشک موضوع کو اتنے دلچسپ انداز میں بیان کرتی ہیں کہ تاریخ کی خشکی محسوس نہیں ہوتی۔ اللہ شاد و آباد رکھے اور مزید تحاریر لکھنے کی توفیق دے۔ شاکر لطیف کی ”رونگ ڈیلیوری“ نے خوب درہم برہم کیا۔ انجام بھی بہترین تھا۔ صرف ایک رونگ ڈیلیوری کی وجہ سے پرکاش کا قاتل ایلین کے سامنے ظاہر ہو گیا اور اس نے اسے خلاص کر دیا۔ ورنہ اس نے تو مارشل کو قاتل تسلیم کر لیا تھا۔ ویسے سارجنٹ واشٹن نے منصوبہ اچھا بنایا تھا۔ ”تغافل“ میں واصف نے اچھی ایکٹنگ کی، پر چل رہن دے۔ ”شہ زور“ میں سونیا نے بہت بار معاذ کو روکا کہ چل رہن دے لیکن آخر میں اس نے سارے بندوں کو خلاص کر دیا اور دوسری طرف عالم درہم برہم کرنے کے بعد انڈیا پہنچا اور اغوا کرنے والوں کو خلاص کرنے کا سوچا لیکن اجالا درمیان میں آ گئی کہ چل رہن دے۔ جس طرح مصنفہ نے معاذ اور عالم دونوں کو انڈیا پہنچایا اس سے مجھے تقریباً یقین ہو گیا ہے کہ ان دونوں کی ملاقات ضرور ہو گی، پر چل رہن دے۔ آصفہ ضیا احمد کی ”آخری کہانی“ میں میناکشی نے جوائے سے شادی کرنے کے لیے سب کچھ درہم برہم کر دیا لیکن آخر میں جوائے نے ہی اسے خلاص کر دیا۔ انسپکٹر نے کیا خوب کہا کہ وہ مردم شناس نہیں تھی لیکن میرے خیال میں ایک مصنف سے بڑا مردم شناس کون ہو سکتا ہے۔ وہی تو لوگوں کی نبض پر ہاتھ رکھ کر اپنی کہانی کی بُنت کرتا ہے۔ پر چل رہن دے۔ تنویر ریاض کی ”کھلاڑی“ اوسط تھی جس میں احساسِ کمتری کی شکار ایک عورت کو دکھایا گیا تھا۔ جس نے ایک دوسری عورت کی زندگی درہم برہم کرنے کی کوشش کی۔ لیکن کچھ نہ کر سکی۔ شیر شاہ سید کی ”زخمی“ میں ایک ملازمہ عورت سلاماہاتکی نے کیا خوب انتقام لیا اور کیسے لیا، چل رہن دے۔ ”ناکام منصوبہ“ عاطر شاہین کی پہلی کہانی شامل ہوئی سسپنس ڈائجسٹ میں، جس پر ان کو مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنے ناکام منصوبے سے سسپنس کی فضا کو درہم برہم کرنا چاہا۔ انجم فاروق ساحلی کے انسپکٹر عمران کی ”عقابی نظر“ نے چھوٹی سی بات بھانپ لی۔ انسپکٹر عمران نے چھٹی پر ہونے کے باوجود کچھ درہم برہم ہونے کو محسوس کر لیا۔ اس کے بعد باری آتی ہے ”ساشا“ کی جو عمر عبداللہ کے قلم سے نکل کر مسحور کر رہی ہے اور ہماری غیرتِ ایمانی کی پُرسکون نیند کو درہم برہم کرنے پر تلی ہوئی ہے۔ آخر کار سردار زادی لیلیٰ اور ان کا قبیلہ سلطانی فوج کے آنے سے بچ گیا۔ دشمن تو پہلے ہی داؤد بن معیز اور ساشا سے خوف زدہ تھا۔ امید ہے کہ وہ اگلی قسط میں اپنی ذہانت اور بہادری سے دشمنوں کے منصوبے کو سبوتاژ کر کے داؤد بن معیز کو بچا لے گا اس لیے فی الحال چل رہن دے۔ فہمیدہ فرید خان شرلاک ہومز کا ایک نیا کارنامہ ”مہم جو“ کے نام سے لے کر آئیں۔ جس میں ہومز نے کالج میں ہونے والے ایک واقعے کو اپنی ذہانت اور مشاہدے سے درہم برہم کر دیا۔ احمد جعفری کی ”سکون کی تلاش“ بس درمیانے درجے کی تھی۔ کچھ خاص تاثر نہ پیدا کر سکی۔ ناہید سلطانہ اختر ”شوباز“ کے نام سے ایک مختصر سی کہانی لے کر آئیں جس میں امیروں کے نت نئے شوق کو موضوع بنایا گیا تھا۔ زین رضوان کی ”نشانی“... ٹھیک تھی۔ جس میں ایک بچھڑی محبت کا تذکرہ کر کے کچھ درہم برہم کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ آخری صفحات پر کاوش صدیقی کی تحریر ”بھید بھری محبت“ شائع ہوئی ہے اور یقین مانیں پڑھ کر بہت زیادہ خوشی ہوئی۔ سوچوں کو درہم برہم کر دیا۔ کتنی خوبصورتی سے خواتین کے جذبات کو پیش کیا گیا ہے۔ جو جو کچھ خواتین کو اپنے رشتوں میں قربان کرنا پڑتا ہے۔ پہلے تو ہمیں شک ہوا کہ کہیں کسی خاتون لکھاری کی تو نہیں لیکن چونکہ مصنف کا نام پہلے ہی پڑھ چکے تھے۔ اس لیے اس خیال کو کہا چل رہن دے۔ (بھئی آپ کا تبصرہ انتہائی خوبصورت اور جامع انداز میں بہت پسند آیا۔ ابھی ہم اور بھی کچھ کہتے کہ درہم برہم ہونے کا خدشہ ہوا اس لیے چل رہن دے)۔“

٭ تاریخ اشاعت کی تبدیلی کے حوالے سے خطوط دیر سے موصول ہوئے لہٰذا گزشتہ شمارے پر ام عبداللہ کا شاہ فیصل سے تبصرہ حاضر ہے۔ ”امید ہے مزاج بخیر ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ آپ سب کو خوش و خرم اور شاد و آباد رکھے، آمین۔ پیارے قارئین اور ادارے سمیت سب کو رمضان المبارک کی بہت بہت مبارک باد۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس ماہِ مبارک میں کثرت سے تلاوت قرآن اور خوب خوب نیکیاں کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ ایک گزارش ہے کہ اس لاک ڈاؤن کی وجہ سے جو گھر بے روزگاری اور مہنگائی کی وجہ سے متاثر ہوئے ہیں، ان گھرانوں کی خاطر خواہ مدد کی جائے خاص طور پر رشتے دار اور پڑوسی۔ اللہ تعالیٰ برکتوں اور رحمتوں کی برسات سے ہمیں بھی مالا مال فرمائے۔ آمین۔ خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ یعنی سسپنس ڈائجسٹ کا سرورق بہت شاندار رہا۔ پس منظر میں اڑتے پنچھی اور سوچ میں ڈوبی حسین دوشیزہ، شہد رنگ بال بکھرائے، ٹھوڑی پر ہاتھ ٹکائے، نیلگوں آنکھوں میں سوچ کے در وا کیے نہ جانے کن خیالوں میں گم ہے۔ اپریل 2021ء کا یہ شمارہ اپنی مثال آپ ہے۔ محمد عثمان خان لاہور سے خوبصورت تبصرے کے ساتھ حاضری لگا رہے ہیں۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔ رمضان پاشا صاحب آپ کے تبصرے محفل کی جان ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت و تندرستی اور درازیٔ عمر بالخیر عطا فرمائے، آمین۔ بشیر احمد بھٹی کا تبصرہ بھی شاندار رہا۔ حسن ابدال سے ریاض بٹ صاحب کا تبصرہ قابلِ ستائش ہے اور محفل کو چار چاند لگا گیا ہے۔ چنیوٹ سے کنول اور لیہ سے عیوق بخاری نے بھی اپنا اچھا حصہ ڈالا، ویلڈن۔ کافی عرصے سے کچھ نئے اور پرانے تبصرہ نگار محفل سے غیر حاضر ہیں۔ اللہ

www.pklibrary.com

تعالیٰ سب پر اپنا خصوصی فضل و کرم فرمائے، آمین۔ محفل شعر و سخن کی انجمن خوب رہی۔ ناہید یوسف کا ابتدا میں دیا گیا انتخابی شعر کمال کا تھا۔ سائرہ نواب، ثوبیہ خان، محمد یوسف، ناصر علی، ثمینہ ممتاز، وزیر محمد خان، زوہیب ملک، نوشتہ گلزار، محمد عثمان، کامران شاہد، صبا حمید اور مائرہ کے اشعار کمال کے رہے۔ دیگر لوگوں نے بھی اپنا اچھا حصہ ڈالا، ویلڈن۔ جون ایلیا کے چبھتے الفاظ اور فلسفے نے کافی متاثر کیا۔ زویا اعجاز ''چاہِ قفس'' میں اپنے اچھوتے اندازِ بیان سے متاثر کرتی نظر آئیں۔ تاریخ کے آئینوں میں ابھرتے، عروج و زوال اور عبرت آمیز واقعات پڑھ کر ایسا لگتا ہے جیسے ہم وہیں ان کے دور میں موجود وہاں کے حالات کو براہِ راست ملاحظہ کر رہے ہیں۔ شاکر لطیف کی ''رونگ ڈیلیوری'' دلکش پیرائے میں لکھی خوبصورت کہانی۔ حسن و دلکشی سے سجی، عقل مندی کا مظاہرہ کرتی، صبا مغل کی دوشیزہ کی ''تغافل'' کی داستان دل کو چھو گئی۔ خوب لکھا۔ منہ زور گھوڑی کی طرح اڑان بھرتی ''شہ زور'' خوبصورت موڑ پر آ پہنچی ہے۔ عمر عبداللہ کی ''ساشا'' بھی اپنا رنگ جمانے میں کامیاب رہی۔ یہ سنسنی خیز سلسلے سسپنس کے شمارے کی جان اور اس کی رونق کو چار چاند لگانے میں اپنی مثال آپ ہیں۔ مرزا امجد بیگ کے ''فیصلے'' نے کئی رازوں سے پردہ اٹھایا۔ سسپنس بھی خوب رہا۔ بہت خوب۔ تنویر ریاض کی ''کھلاڑی'' نے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دیا۔ زبردست۔ ناہید سلطانہ اختر نے قلم کی اٹھان لیے اچھوتی تحریر ''شوباز'' لیے حاضر ہیں۔ یہ ہمیشہ نئے موضوع پر قلم اٹھاتی ہیں۔ ''آخری کہانی'' میں آصفہ ضیا احمد نے منفرد انداز میں کہانی کے مقصد کو واضح کیا، ویلڈن۔ احمد جعفری کی ''سکون کی تلاش'' رشتوں کی بے ثباتی کو واضح کرتی خوبصورت تحریر۔ محبتوں کو امر کرتی شاہ زین رضوان کی ''نشانی'' نے انمٹ نقوش چھوڑے۔ بہت خوب۔ کاوش صدیقی کی ''بھید بھری محبت'' بھی اپنا رنگ جمانے میں کامیاب رہی۔ انجم فاروق ساحلی ''عقابی نگاہ'' لیے حاضر ہیں۔ کہانی جدت کا پہلو لیے عجلت و جلد بازی کی تباہ کاریوں کو اجاگر کرتی دلکش انداز میں تحریر کی گئی۔ مہم جو، ناکام منصوبہ اور دیگر کہانیاں بھی پسند آئیں۔ مجموعی طور پر شمارہ دلچسپ و شاندار رہا۔''

☸ ریاض بٹ کا حسن ابدال سے اپریل کے شمارے پر تبصرہ۔ ''سرورق اس بار دلنشین، سندر اور خوبصورت ہے۔ حسینہ سرورق نہ جانے کس کی راہ دیکھ رہی ہے۔ خیر ہمیں کیا۔ جون ایلیا صاحب نے اس بار بھی کمال کی تحریر لکھی کیونکہ وہ ہمارے دلوں میں اپنی تحریروں کے ذریعے زندہ ہیں۔ کاش ہمارے حکمران غریب عوام پر رحم کریں۔ مہنگائی کا شکنجہ دن بدن تنگ ہو رہا ہے۔ یہ نہ ہو کہ عوام کی قوتِ برداشت جو اس وقت آخری سانس لے رہی ہے، دم توڑ دے۔ جب ہڑ (سیلاب) آتا ہے تو سب کچھ بہا کر لے جاتا ہے۔ بوجھل دل کے ساتھ اپنی محفل میں پہنچے تو مہنگائی کا رونا ہی تھا۔ رمضان المبارک آ رہا ہے اور مہنگائی کا ایک اور طوفان آنے والا ہے۔ بہر حال کنول بہن کا تبصرہ لاجواب ہے۔ میرا تبصرہ پسند کرنے کا بے حد شکریہ۔ آپ نے عورت اور مرد کے لیے دہرے معیار کی بات کی ہے تو یہ بات درست ہے۔ محترم رمضان پاشا صاحب کی حاضری تو محفل کی جان ہوتی ہے۔ ہم سب کی دعا ہے کہ خدائے بزرگ و برتر آپ کو اپنی حفظ و امان میں رکھے، آمین۔ ریاست خان صاحب آپ کا تبصرہ بھی قابلِ تعریف ہے۔ شکر ہے آپ نے میری بات کی تائید کی۔ محمد عثمان خان خوش آمدید۔ واقعی بہت دیر کر دی مہماں آتے آتے۔ کیونکہ آپ محفل کے مہمان ہی تو ہیں۔ بشیر احمد بھٹی آپ کا تبصرہ بھی اچھا ہے۔ خاص کر اس بات کا ذکر کہ آپ نے جاسوسی اور سسپنس ڈائجسٹ پڑھ کر لکھنا سیکھا۔ اللہ آپ کے قلم کو اور جلا بخشے، آمین۔ عیوق بخاری کی آمد لیٹ ہے۔ آپ کی کہانیاں جب پرچے میں چھپیں گی تو تبصرہ ہوگا، فی الحال تبصرہ کرتا ہوں پرچے میں موجود کہانیوں پر۔ زویا اعجاز کی ''چاہِ قفس'' بڑی متاثر کن کہانی ہے۔ گیا وقت اور بہتا دریا کبھی واپس نہیں آتا۔ انسان چاہے اسے پکارتا رہے۔ اس کی آواز بازگشت بن کر واپس آجاتی ہے اور آخر میں وہ خود بھی ماضی کا حصہ بن جاتا ہے اور ماضی تو کبھی واپس نہیں آتا، بہر طور ویل ڈن۔ اس کے بعد حسبِ معمول مرزا امجد بیگ سے ملنے پہنچے۔ اس بار وہ فیصلہ لے کر آئے۔ عدالت نے ان کے حق میں فیصلے تو بہت دیے ہیں لیکن یہ فیصلہ، بلکہ اگر اسے قدرت کا فیصلہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ ان سب سے منفرد بھی ہے اور باعثِ عبرت بھی۔ ثاقب نے دولت کے گھمنڈ اور نشے میں ایک بے گناہ شخص کی جان لی اور اس کے باپ نے دولت کا سہارا لے کر اسے بچانے کے لیے سارے داؤ پیچ کھیلے لیکن آخر میں مقتول کی بیوی بلکہ بیوہ کو نہ خرید سکا۔ یہ دونوں زر گزیدہ تھے۔ بیگ صاحب نے اس بار استغاثہ کی گرتی دیوار کو اپنے وکیلانہ تجربے اور کرتبوں سے دوبارہ کھڑا کر دیا اور ایسا پہلی بار ہوا، ورنہ عموماً انہوں نے وکیلِ صفائی بن کر اپنے بے گناہ موکلوں کو بری کروایا تھا۔ ان کا یہ نیا روپ بہت پسند آیا اور قلم بے ساختہ یہ لکھنے پر مجبور ہو گیا کہ ویل ڈن بیگ صاحب! اور شاباش حسام بٹ! تنویر ریاض سسپنس کے مستقل رائٹر ہیں۔ ان کی کہانیاں مغربی ادب سے ہوتی ہیں۔ اس ماہ کی کہانی ''کھلاڑی'' بھی پسند آئی۔ کسی کو دوبارہ، وہ بھی ایک ایسے شخص کو جسے اس نے دودھ میں پڑی مکھی کی طرح نکال پھینکا تھا، اپنا گرویدہ بنانا بھی ایک گھاگ کھلاڑی کا کام ہوتا ہے۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید کی ''زخمی'' پڑھ کر بے اختیار آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ سلاماہاتکی کے ساتھ جو ظلم ہوا وہ پڑھ کر انسان تو انسان رہا، پتھر بھی رو پڑے لیکن سلاماہاتکی نے انتقام بھی خوب لیا۔ ایسے وقت میں انسان کو وہ نظر نہیں آتا جو اس نے کیا ہوتا ہے اور جس کی وجہ سے اس کے ساتھ یہ سلوک ہوا ہوتا ہے۔ یہی سب سے بڑی ٹریجڈی ہے۔ عاطر شاہین ''ناکام منصوبہ'' لے کر آئے۔ علینہ نے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر ایک خوفناک منصوبہ بنایا جس کو قدرت نے ناکام بنا دیا۔ یہ سچ ہے کہ محبت ایک فطری جذبہ ہے۔ لیکن محبت کو غلط طریقے سے حاصل کرنا ایک ایسا جرم ہے جو انسان کو ذلیل و خوار کر دیتا ہے۔ بہر حال اچھی کہانی ہے۔ اس میں عبرت کا سامان بھی ہے اور یہ سبق بھی ہے کہ بے شک اولاد کو سونے کے نوالے کھلاؤ لیکن آنکھ شیر کی رکھو تا کہ وہ اس حد تک نہ بگڑ جائیں کہ دوسروں کی زندگی سے کھیلنے لگ جائیں۔ انجم فاروق صاحب بھی عقابی نگاہ کی صورت میں ایک اچھی کہانی لے کر آئے۔''

اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہو سکے۔

اسما احمد، ملتان۔ بشیر سلطان، کراچی۔ عاصم ملک، سرگودھا۔ پرویز خان، کوئٹہ۔ نازیہ علی، ٹنڈو الہیار۔ مہتاب احمد، حیدر آباد۔ عمر خان، پشاور۔ غزالہ احمد، چنیوٹ۔ غزالہ خان، لیہ۔

www.pklibrary.com

بساط

زویا اعجاز

ماحول انسانی سوچ اور
نظریات پر بہت اثر ڈالتا ہے۔
ہندوستان واقعی ایک جادوئی
سرزمین تھی۔ یہ کسی مضبوط سے
مضبوط ترین کھلاڑی کو بھی شہ مات
دے سکتی تھی۔... اسی سرزمین سے
ہزاروں داستانوں نے جنم لیا اور تاریخ کے
صفحات پر رقم ہوگئیں... اسی قطعۂ زمین پر
ظلم و بربریت ہو یا تخت و تاج کے درمیان رسّا
کشی... حسن و عشق کے فسانے ہوں یا رقابت و
حسد کی عکاسی... ہر رنگ نے نہ صرف اپنا گہرا اثر
چھوڑا بلکہ درس و عبرت کے در بھی وا کیے۔ انہی
داستانوں میں سے ایک داستان اس مغربی جوڑے کی بھی
گزری جس کی شاطرانہ چالوں نے ہندوستان کے نوابوں کے
جذبات میں تلاطم برپا کر ڈالا۔ جب طاقت و اختیار... حرص
کی زنجیروں میں جکڑ جاتے ہیں تو نظر نہ آنے والی یہی قید...
بالآخر ایک دن اختیارات کھو دینے کا سبب بن جاتی ہے۔

www.pklibrary.com

www.pklibrary.com

ابر آلود آسمان شام سے پہلے ہی برسنے لگا تھا۔ بارش کی بوندیں کسی مدھر موسیقی کا تاثر دے رہی تھیں۔ اس بارش کے ساتھ ہلکی سرد ہوا بدن اور مزاج میں ایک دلفریب گدگداہٹ پیدا کرنے لگی۔ جان مل اپنے گھر کی کھڑکی میں استادہ فلک سے تنی آبی چادر بہت انہماک سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی سوچتی نظریں بوندوں کے ساتھ ہی حرکت کرنے لگتیں۔

''کیتھی! کہاں ہو تم؟'' اس نے کچھ دیر اس مشغلے میں مصروف رہنے کے بعد کہا۔

دوسری جانب خاموشی طاری رہی۔ جان نے کھڑکی سے ہاتھ باہر نکال کر چند بوندیں ہتھیلی میں سمیٹیں اور اپنے چہرے کو بھگونے لگا۔ بوندوں کا یہ کھیل اور کس مزاج میں مزید فرحت پیدا کرنے لگا۔ کچھ دیر اس نئے مشغلے میں الجھے رہنے کے بعد اسے ایک بار پھر کیتھی کا خیال آیا۔

''کیتھی! بیبی کہاں ہو تم؟'' اس نے بڑے رومانی انداز میں صدا دی۔

چند لمحوں بعد کیتھرائن اس کے سامنے تھی۔ وہ ایک حسین اور جاذب نظر عورت تھی۔ شہابی رنگت، گھنی سنہری زلفیں، نیلگوں آنکھیں، قدرے طویل قامت اور قیامت خیز سراپا۔ اس کا حسن بلاشبہ انمول تھا۔

''کیا بات ہے..... کوئی کام تھا کیا؟'' اس نے شوہر کی پُرشوق نگاہیں نظر انداز کیں۔

''کیا میں تمہیں کسی کام کے بغیر نہیں بلوا سکتا؟'' جان نے حیرت سے پوچھا۔

کیتھرائن اس سوال پر خاموش رہی۔

''اچھا! چھوڑو ان باتوں کو۔ یہ بتاؤ کیا کر رہی تھیں؟ میں نے پہلے بھی تمہیں آواز دی تھی۔ ذرا دیکھو تو سہی! موسم کتنا خوبصورت ہے۔'' جان نے بوندیں ہتھیلی میں سمیٹ کر اس کی طرف اچھالیں۔ وہ بیزاری سے پیچھے ہٹ گئی۔

''بس یہی بتلانا تھا کیا؟'' وہ سنجیدگی سے بولی۔

''لندن میں ایسا موسم ایک معمول ہے اور کوئی بھی چیز معمول بن جائے تو اپنی خوبصورتی کھو دیا کرتی ہے۔''

''کیا بات ہے کیتھی! مجھے تمہاری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں لگ رہی۔'' جان ٹھٹک گیا۔

''کیا کمال ہے کہ میرے شوہر کو کچھ دکھائی دیتا ہے نہ ہی سنائی۔'' اس نے سر جھٹکا۔ ''تم جس موسم کی خوبصورتی کے قصیدے پڑھ رہے ہو، میں اسی موسم کے نقصانات بھگت رہی ہوں۔ کمرے کی دیواریں ٹپکنے لگی ہیں۔''

''اوہ..... میں نے تو سب کچھ مرمت کر دیا تھا۔ پھر بھی.....'' جان حیران ہوا۔

''ہاں! پھر بھی۔ اس سال خوردہ چوبی گھر کو مرمت کی نہیں ڈھا دیے جانے کی ضرورت ہے۔'' وہ بیزاری سے بولی۔

''مجھے ملازمت مل جائے تو یہ کام بھی کرلیں گے۔''

جان نے قدرے امید جتائی تاہم اس امید تلے پوشیدہ کھوکھلے الفاظ کا اسے خود بھی اچھی طرح اندازہ تھا۔

''نوکری..... خدا جانے کب ملے گی..... کب یہ دن پھریں گے..... نوکری ملتے ہی پہلے قرض کا طوق تو اتر جائے۔'' کیتھرائن نے اس کے دلاسے کا کوئی اثر نہ لیا۔

''مجھے یقین ہے کہ خداوند یسوع مسیح ہماری مدد ضرور کرے گا۔ وہ ہمیں کوئی نہ کوئی راستہ ضرور دکھائے گا۔'' جان نے اس سے زیادہ خود کو تسلی دی۔

کیتھرائن خاموش رہی۔

''تمہیں علم ہے کہ ابھی کچھ دیر پہلے میں نے ایک نئی نظم لکھی ہے۔'' جان نے پُرجوش ہو کر بتایا۔

کیتھرائن سپاٹ نظروں سے اسے دیکھتی رہی۔ جان نے ایک جانب رکھا کاغذ اٹھایا اور دوسرے ہاتھ سے بیوی کا ہاتھ تھام کر ایک کرسی پر بٹھا دیا۔

''یہ بارش جب دھرتی کی پیاس بجھاتی ہے۔
میرے تن من میں تمہاری کسک ابھر آتی ہے۔
دھرکنوں کو ہر پل راگ اک نیا سکھاتی ہے۔
تمہاری کمی بے طرح ستاتی ہے۔''

''کھانا تیار ہے۔ آ کر کھا لو جلدی۔'' کیتھرائن نے اسے ٹوکا اور کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''کیا ہوا؟ نظم پسند نہیں آئی کیا؟ مکمل سن تو لیتیں پہلے۔'' جان نے خفگی سے اسے دیکھا۔

''تمہاری اس نظم کا مرکزی خیال پہلے بھی درجن بھر دفعہ تو استعمال ہو چکا ہے۔ میں سنے بغیر ہی جانتی ہوں کہ اس ''تک بندی'' کی اگلی سطور کیا ہوں گی؟'' وہ صاف گوئی سے بولی۔

''پہلے تو تم میری ہر نظم بہت شوق سے سنتی تھیں۔ داد بھی خوب دیتی تھیں۔ اب کیا ہو گیا ہے؟'' جان جھنجلا کر بولا۔

کیتھرائن گہری سانس بھر کے رہ گئی۔ اس سوال کا جواب خود اس کے پاس بھی نہ تھا۔ ان دونوں کی شادی کو زیادہ عرصہ نہ ہوا تھا۔ یہ شادی بھی ایک زوردار رومانی تعلق کا ہی نتیجہ تھی۔ حقیقت تو یہ تھی کہ کیتھرائن اس وقت جان کی شاعری سے ہی متاثر ہو کر اس کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔

''کھانا تیار ہے، کھا لو! اس بارے میں پھر بات

www.pklibrary.com

کریں گے۔'' وہ نرمی سے کہتی ہوئی اندر بڑھ گئی۔

جان نے کاغذ لباس میں ٹھونسا اور لمبے ڈگ بھرتا اندرونی سمت چل دیا۔ کیتھرائن نے کھانا سلیقے سے چن دیا تھا۔ جان نے اپنی پسندیدہ سبزی سے آغاز کیا۔ چند لقمے لینے کے بعد اس نے ہاتھ کھینچ لیا۔

''کیا ہوا؟ رک کیوں گئے؟'' کیتھرائن نے ابرو اچکائے۔

''مسالوں کا استعمال بھول گئی ہو شاید تم۔ بالکل بے مزہ کھانا ہے۔'' وہ جھنجلایا۔

''گھر میں جتنے مسالے تھے میں نے استعمال کر لیے۔ اب نئے لاؤ گے تو ہی کھانا ٹھیک سے بن پائے گا۔'' کیتھرائن نے اسے ایک اور حقیقت بتائی۔

جان نے تھکاوٹ سے سر کرسی کی پشت سے ٹکا لیا۔

''اچھا! کل کرتا ہوں کچھ۔'' وہ محض اتنا ہی کہہ سکا۔

کھانا ختم ہونے تک دونوں کے درمیان خاموشی حائل رہی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے لقموں کی آواز بھی بخوبی سن سکتے تھے۔ رات کو جان کافی دیر تک اپنے کاغذات میں الجھا رہا۔ کیتھرائن کو اس کی حالت دیکھ کر ترس آنے لگا۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی شوہر سے بدلحاظی کا مظاہرہ کر جاتی تھی۔ زندگی اور اس سے وابستہ حقائق اس قدر تلخ تھے کہ ان کی باہمی محبت' ذہنی ہم آہنگی اور رفاقت اپنے رنگ کھونے لگی تھی۔ جان کی شاعری سے متاثر ہو کر اس سے شادی کرنے والی کیتھرائن کو اب وہی الفاظ بے جان اور بے تاثر محسوس ہوتے۔ غربت' معاشی بدحالی اور قرض نے سبھی جذبات ہوا کر دیے تھے۔

''جان! تھک گئے ہو گے۔ باقی کام صبح کر لینا۔'' اس نے شوہر سے کہا۔

جان اسی خاموشی اور جھنجلاہٹ سے کاغذات میں الجھا رہا۔ کیتھرائن کچھ سوچ کر اٹھی اور شوہر کی گردن میں عقب سے بازو حمائل کر دیے۔

''ہم اس مشکل اور آزمائش کو اپنی محبت پر حاوی نہیں ہونے دیں گے۔ یہ وقت کڑا سہی لیکن ہم اس پر غلبہ پالیں گے۔''

''سچ کہہ رہی ہو۔ ہم اس مشکل وقت میں ایک دوسرے کا سہارا ہیں اور اسی سہارے سے سب کچھ پہلے جیسا کر لیں گے۔'' جان نے بھی یقین دلایا۔

بارش کی بوندیں کھڑکی سے ٹکراتی رہیں۔ وہ رات باہمی عہد و پیمان دہراتے اور مشکلات کے خاتمے کا اعادہ کرتے بیت گئی۔

☆☆☆

اگلے چند ماہ اسی کشمکش میں بیت گئے۔

جان اور کیتھرائن کا رشتہ مد و جزر کا ہی شکار رہا۔ وہ کبھی ایک دوسرے سے الجھتے' کبھی روٹھتے اور کبھی مناتے رہے۔ جان کی بے روزگاری' غربت اور قرضوں کا بہر حال اب بھی وہی عالم تھا۔ معاشی خوشحالی ان سے روٹھی ہوئی تھی۔

روزگار کی تلاش میں مارے مارے پھرتے جان کی ایک روز گھر واپسی ہوئی تو وہ مہمان کو دیکھ کر چونک گیا۔ اس کے سامنے تقریباً پچھتر سالہ ایک شخص موجود تھا۔ اس کی رنگت کبھی سرخ و سفید رہی ہو گی لیکن اب اس سفیدی میں ہلکی سنولاہٹ گھل چکی تھی۔ بوڑھے شخص کا جسم غیر خمیدہ اور آنکھیں بے حد چمک دار تھیں۔ وہ کیتھرائن سے کافی بے تکلف دکھائی دے رہا تھا۔ کیتھرائن جان کو دیکھتے ہی چہک اٹھی۔

''ہم تمہارا ہی انتظار کر رہے تھے۔ میں نے انکل کو تم سے ملنے کے لیے روکا ہوا تھا۔''

''میں نے انہیں پہچانا نہیں!'' جان الجھا۔

''پہچانو گے بھی کیسے؟ تم کبھی ان سے ملے ہی نہیں۔ یہ میرے انکل چارلس ہیں۔ میں نے شاید ایک دفعہ ذکر کیا تھا تم سے ان کا۔'' کیتھرائن بے حد خوش مزاج دکھائی دے رہی تھی۔

''کہیں یہ وہی انکل تو نہیں جو ہندوستان چلے گئے تھے۔'' جان کو یاد آیا۔

''ہاں! بالکل وہی۔ اب یہ لوٹ آئے ہیں۔ میری ان سے آج اچانک ہی ملاقات ہوئی تھی۔'' اس نے مزید بتایا۔

جان نے آگے بڑھ کر مصافحہ کیا اور رسمی احوال دریافت کرنے لگا۔

''ہندوستان کتنا عرصہ رہے آپ؟'' اس نے برسبیلِ تذکرہ پوچھا۔

''تقریباً پچاس سال۔'' چارلس مسکرایا۔ ''اپنے اہلِ خانہ سے ملاقات کے لیے میں ہر سال ایک ماہ کے لیے آیا کرتا تھا۔ پہلے ملازمت کرتا رہا پھر کاروبار میں قسمت آزمائی۔''

''پچاس سال..... یعنی نصف صدی تک آپ ایک اجنبی سرزمین میں رہتے آئے ہیں۔'' جان حیران ہوا۔

''ہاں! اور یقین مانو مجھے یہ عرصہ بیت جانے کا بالکل اندازہ نہیں ہوا کیونکہ ہندوستان ایک جادوئی سرزمین ہے۔ اس کی آب و ہوا' فضائیں' ماحول' وسائل اور سیاست سب کچھ ایک بھول بھلیوں جیسا ہے۔ ان بھول بھلیوں میں کھو کر انسان سب کچھ فراموش کر دیتا ہے۔ کمپنی کی حکومت اور آسائشات جیسا لطف بھی تو کہیں نہیں۔'' چارلس نے

www.pklibrary.com

سرور میں کہا۔

جان اور کیتھرائن دلچسپی سے اس کی طرف دیکھنے لگے۔

''کیا ہندوستان واقعی اتنا مجبور ہے کہ ہماری تجارتی کمپنی نے اس کے وسائل پر آسانی سے قبضہ کرلیا ہے اور اب اسے اپنے اشاروں پر چلا رہی ہے۔'' کیتھرائن نے حیرانی سے پوچھا۔

اس سوال پر چارلس بھی لمحاتی طور پر خاموش ہوگیا اور گمبھیر انداز میں کہنے لگا۔

''ہندوستان ایک مضبوط اور بااختیار ملک ہے۔ اس کے بادشاہ اور ریاستی حکمرانوں کو دیکھ کر بڑے بڑوں کا پتا پانی ہوسکتا ہے لیکن یہ طاقت واختیار نفاق اور حرص کی زنجیروں میں جکڑا گیا ہے۔ یہی قید اصل میں کمپنی کے اختیارات کو تقویت دے رہی ہے۔''

''ہندوستان میں کہاں ملازمت کرتے رہے ہیں آپ انکل؟'' کیتھرائن نے پوچھا۔

''بنگال میں..... اور سچ بتاؤں تو کمپنی کو بنگال میں ہی سب سے زیادہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔'' چارلس نے قدرے محتاط انداز اپنایا۔

''میں نے بھی اس بارے میں کافی کچھ سن رکھا ہے۔'' جان نے کہا۔ ''علم ہوا تھا بنگال کے کسی حاکم نے اپنے جانشین کو وصیت کی تھی کہ انگریزوں کو کبھی قوت حاصل نہ کرنے دینا۔ اب میرے ذہن میں اس حاکم کا نام نہیں آرہا۔''

''علی وردی خان۔'' چارلس بے ساختہ بولا۔ ''علی وردی خان نے اپنے نواسے سراج الدولہ سے کہا تھا کہ انگریزوں کو سپاہی رکھنے اور قلعہ تعمیر کرنے کی اجازت نہ دینا۔ اگر ایسا ہوا تو بنگال تمہارا نہیں ہوسکے گا۔ میں انہی دنوں تو وہاں گیا تھا۔ سچ پوچھو تو اس وقت میں ناتجربہ کار تھا۔ ایک اجنبی سرزمین تھی۔ ایسی باتیں مجھے پریشان کردیتی تھیں۔ نواب سراج الدولہ کے اقتدار سنبھالنے پر پیش آنے والے واقعات نے مجھے کافی خوفزدہ رکھا۔ مجھے وہ وقت بھی یاد ہے جب نواب نے قاسم بازار میں کارخانے پر حملہ کردیا تھا۔ وہ کارخانہ زیادہ مستحکم نہیں تھا۔ نواب کی فوج کا مقابلہ ناممکن تھا۔ انگریز سپاہیوں کی تعداد بھی بہت کم تھی۔ نواب اگر چاہتا تو اس وقت ہر انگریز کی بولنے والی زبان کٹوا دیتا لیکن اس نے ایسا نہ کیا۔ پتا نہیں کیا سوچ کر کلکتہ کا رخ کرلیا۔ پھر ہمیں علم ہوا کہ فورٹ ولیم کے افسران نے اس سے مذاکرات کرنے سے انکار کردیا ہے۔ میں ایک بار پھر خوفزدہ ہوگیا۔ خیر! نواب سراج الدولہ کے ہوتے ہوئے کمپنی کبھی مستحکم نہیں ہوسکتی تھی۔ کمپنی نے بھرپور ذہانت اور جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے شطرنج کی بساط بچھائی اور نواب کا مہرہ بالآخر پٹ گیا۔ اور ایک مزے کی بات بتاؤں؟ نواب کی اس شہ مات میں اسی کے قریبی ساتھیوں کا ہاتھ تھا۔ اس روز مجھے یقین ہوگیا کہ اب ہمیں یہاں کوئی خطرہ نہیں۔ میں نے ٹھاٹ سے نوکری کی اور بڑی شان سے اپنے اختیارات کا استعمال بھی کیا۔''

''بنگال میں قحط کے بارے میں بھی کافی کچھ سن رکھا ہے۔ ان باتوں میں کس حد تک سچائی رہی ہے؟'' جان نے پوچھا۔

''جتنا بھی سنا ہے کم ہی سنا ہوگا میرے عزیز!'' چارلس جھرجھرایا۔ ''میں نے وہ وقت بھی اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اس قحط نے بنگال کی ایک تہائی سے زائد آبادی کو موت کی نیند سلا دیا تھا۔''

''تو کمپنی نے ان کے لیے کچھ نہیں کیا انکل؟'' کیتھرائن نے سوال کیا۔

چارلس اس کی ناسمجھی اور نادان سوال پر مسکرانے لگا۔

''بالکل کیا میری بچی! کمپنی کے لیے تو وہ ایک سنہری موقع تھا۔ ہم ملازمین نے انسانی لاشوں کے اوپر کھڑے ہو کر محاصل اور مالیہ کا مطالبہ کیا۔ ہم نواب سراج الدولہ تھوڑے ہی تھے کہ ان پر ترس کھا کر امداد کرتے۔ ان کی تکلیف دیکھ کر ان سے وابستہ خطرات ہی نظر انداز کردیتے۔ کمپنی کے گودام فلک بوس تھے۔ ان گوداموں میں اناج کی کثرت تھی لیکن ہم نے یہ گودام مقفل رکھے۔ ان کالے پیلے ہندوستانیوں کو دانے دانے کے لیے ترپایا۔ ہوسکتا ہے تم لوگوں کو میری باتیں ظالمانہ محسوس ہو رہی ہوں لیکن حقیقت یہی ہے کہ بقا کے لیے انسان کو کچھ بھی کرنا چاہیے۔ اپنی قوم کی ترقی واستحکام کے لیے کسی بھی حد تک جانا چاہیے۔ میں نے بھی یہی کیا۔ اگر زندگی مہلت دے تو دوبارہ بھی یہی کروں گا۔'' چارلس کا عزم دیدنی تھا۔

''ہندوستان کے موجودہ حالات کیا ہیں انکل؟'' کیتھرائن نے یکدم پوچھا۔

''خداوند کی مہربانی اور کمپنی کی بھرپور حکمتِ عملی سے بدتری کی طرف مائل ہیں۔ مغلیہ سلطنت بہت زیادہ کمزور ہوچکی ہے۔ دہلی کی مرکزیت ختم التقریب ہے۔ ہر جانب آزاد اور خودمختار ریاستیں پیدا ہو رہی ہیں۔ کمپنی کا قبضہ دن بہ دن مستحکم ہو رہا ہے۔'' اس نے اعتماد سے بتایا اور کچھ سوچ کر جان سے مخاطب ہوکر کہنے لگا۔

''مجھے کیتھی نے ابھی بتایا کہ تم بے روزگاری سے

www.pklibrary.com

بہت پریشان رہتے ہو۔ کمپنی میں ملازم ہوکر ہندوستان کیوں نہیں چلے جاتے؟''

''کیا ایسا ممکن ہے انکل؟'' کیتھی پُرجوش ہوئی۔

''کیا جان کو کمپنی کی ملازمت مل سکتی ہے؟''

''بالکل مل سکتی ہے۔ تعلیم یافتہ' سمجھدار اور باشعور انسان ہے۔ میرا مشورہ مانو تو کمپنی کی ملازمت ضرور کرو۔ وارے نیارے ہوجائیں گے۔'' چارلس نے اطمینان سے کہا۔

''آپ کی پیشکش تو کافی پُرکشش ہے لیکن میں آپ کی طرح آہنی مزاج کا مالک نہیں ہوں۔ کچھ الگ سوچ اور فطرت ہے۔ میں ٹھہرا شاعری' فنونِ لطیفہ اور دوستی کا قائل۔ اس ماحول میں کیسے ٹھہر سکوں گا؟'' جان نے اپنی الجھن بیان کی۔

''ہندوستان کی ایک سب سے بڑی خوبی جانتے ہو کیا ہے؟'' چارلس نے ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے توقف کیا۔

''ہندوستان ایک گرم جوش ملک ہے۔ یہ ہر پردیسی کا بانہیں کھول کر استقبال کرتا ہے۔ کوئی بھی غریب الوطن جب اس کی بانہوں میں سما جاتا ہے تو اپنایت کی حدت اور خلوص سے اسے گرویدہ بنا کر اس کے مسائل اپنے سر لے لیتا ہے۔ اس سرزمین میں بہت تنوع ہے۔ تمہیں وہاں تہذیب' ادب' فنونِ لطیفہ' شاندار عمارتیں' باغ' سرائے سب کچھ ملے گا۔ شاہی دربار میں شاعر اور فن کار بہت سرمایہ کماتے ہیں۔ تم ذرا سی ہمت کر کے دیکھو۔ تمہیں ہر لحاظ سے آسائشیں اور سہولتیں ملیں گی۔'' چارلس نے ترغیب دی۔

''شاعری نے بھی کسی کا پیٹ بھرا ہے جو اب بھر دے گی؟'' کیتھرائن نے فوراً کہا۔ ''یہ سب آسودگی کے چونچلے ہیں اور اسی وقت اچھے لگتے ہیں۔ روزگار و دولت سب سے بڑی حقیقت ہیں۔ ان کے بغیر زندگی بسر ہونا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔''

''بالکل درست! اگر تم لوگوں کی رضامندی ہو تو میں ملازمت کے لیے تمہاری بھرپور مدد بھی کرسکتا ہوں۔''

چارلس کی اس فیاض پیشکش پر کیتھرائن کی آنکھیں مزید چمک اٹھیں۔

''اگر ایسا ہوجائے تو ہم زندگی میں دوبارہ جی اٹھیں گے۔ قرض خواہ جان کو آنے لگے ہیں۔ اب تو باہر نکلتے ہوئے بھی یہی خوف آتا ہے کہ کوئی راہ چلتے ہی نہ روک کر قرض واپس مانگ لے۔'' وہ آزردگی اور امید کی ملی جلی کیفیات میں مبتلا تھی۔

''میرا یقین کرو کیتھی! سب کچھ ٹھیک ہوجائے گا۔ ہندوستان تمہیں کبھی مایوس نہیں کرے گا۔ وہاں ہر قدم پر کوئی نہ کوئی مددگار مل جائے گا۔ کچھ لو اور کچھ دو کا معاملہ اپناتے ہی وہاں ہر قفل کھل جایا کرتا ہے۔'' چارلس نے اپنے تجربات کے پیشِ نظر بتایا۔

''ٹھیک ہے! میں تیار ہوں۔ میرے اندر آپ جتنا حوصلہ تو نہیں کہ نصف صدی ایک اجنبی سرزمین پر بسر کر دوں، بس کچھ سال گزار لوں گا۔'' جان نے ہامی بھر لی۔

چارلس نے مسکرا کر اس کے فیصلے کی تائید کی اور انہیں اپنے مزید تجربات سے آگاہ کرنے لگا۔

☆☆☆

چارلس کی معاونت کام آئی۔ جان کو کافی دوڑ دھوپ کے بعد کمپنی میں کلرک کی ملازمت مل گئی۔ اس روز کیتھرائن کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ اسے ہندوستانی سرزمین کے رومان نے بے طرح اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ چارلس سے بھی تقریباً روز ہی ملاقات رہتی۔ وہ انہیں مختلف آزمودہ باتیں بتایا کرتا۔

''روانگی سے قبل جتنی جلد ممکن ہو سکے ہندوستانی زبان ضرور سیکھنا۔'' اس نے مشورہ دیا۔

''میں نے سنا تھا کہ وہاں انگریزی زبان سیکھنے پر سخت پابندی ہے۔ اکثر لوگ اسے اپنی مذہبی تعلیمات سے ٹکراؤ قرار دے دیتے ہیں۔'' جان نے اپنی معلومات کا اظہار کیا۔

''تم نے بالکل درست سنا ہے۔ وہاں ایسا طبقہ بھی موجود ہے جو انگریزی زبان سے بہت خار کھاتا رہا ہے۔ خیر! اب حالات کچھ اور ہیں۔ ہندوستانی عوام انگریزی زبان سیکھ رہے ہیں۔ تم لوگ مقامی زبان سیکھ لوگے تو بہت فائدے میں رہو گے۔''

چارلس کی اس تجویز پر جان نے تنقیدی انداز میں سر ہلا دیا۔ اسے اب سیاست اور جوڑ توڑ میں کافی دلچسپی محسوس ہونے لگی تھی۔ کمپنی میں ملازمت اور ہندوستان پر مبینہ حاکمیت کے احساس نے سابقہ گریز کی کیفیت بھی ازخود ہی ختم کردی۔ اب وہ اپنی ذات بے حد معتبر محسوس کیا کرتا۔

یہ احساسات و کیفیات ہندوستان پہنچنے تک برقرار رہے۔ کلکتہ میں ابتدائی قیام اور ملازمت کے چند ہی ہفتوں میں انہیں آئے دال کا بھاؤ معلوم ہوگیا۔ انہیں سب سے پہلا مسئلہ ''موسم'' سے ہوا تھا۔ ان دنوں کلکتہ میں مون سونی بارشیں جاری تھیں۔

www.pklibrary.com

''اوہ خداوند یسوع مسیح! آج تو یہ بارش مت بھیجنا۔'' جان نے اپنے کندھے پر صلیب کا نشان بنایا۔

کیتھرائن مسکراتے ہوئے اسے دیکھنے لگی۔

''کیوں بھئی! تمہیں تو بارشیں بہت پسند ہوتی تھیں۔''

''پسند تو خیر اب بھی ہیں۔'' جان نے جھینپتے ہوئے کہا۔ ''لیکن لندن میں جو بارشیں مزاج میں گدگداہٹ پیدا کرتی تھیں، اب وہی عجیب کوفت بن گئی ہیں۔ حبس اور پسینا ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتا۔''

''ہالی! یہ بات تو تم نے بالکل درست کہی۔ لندن میں رہ کر مجھے کبھی گرمی دانوں کی شکایت نہیں ہوئی۔ یہاں آتے ہی یہ تجربہ بھی سہہ لیا ہے۔'' کیتھرائن نے اپنا دکھ بیان کیا۔

''اب تو آگئے ہیں یہاں۔ بھلا یا برا جیسا بھی ہے سب برداشت کرنا پڑے گا۔'' جان نے گہری سانس لی۔ ''امید ہے کہ موسم کی یہ میعاد جلد ختم ہو جائے گی۔''

کیتھرائن نے اذیت کے باوجود شوہر کی حوصلہ افزائی کے لیے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ مسائل پر قابو پانے کے لیے پُرعزم تھی لیکن اس کی ہمت بہت جلد ڈھے گئی۔ کلکتہ میں مچھروں کی بہتات سے وہ شدید بیمار ہوگئی۔ بیوی کی یہ حالت دیکھ کر جان نے ایک بار پھر دوڑ دھوپ کی اور تبادلے کی درخواست دے دی۔

کمپنی کو مختصر عرصے میں ہی اس کی محنت و جانفشانی کا اندازہ ہو گیا تھا لہٰذا افسران نے مہربانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے ''اودھ'' کے ریزیڈنٹ عملے میں منتقل کر دیا۔ جان سکون کا سانس لیتے ہوئے کیتھرائن کے ساتھ لکھنؤ منتقل ہو گیا۔

رومان پسند کیتھرائن اس بادصف شہر میں آکر بہت خوش تھی۔ جان بھی ملازمت کی نئی ذمے داریوں اور علاقے کی تہذیبی سے قدرے مطمئن تھا۔ کچھ عرصہ اسی اطمینان میں بسر ہو گیا۔ اس کے بعد ایک اور مسئلہ سر اٹھانے لگا۔ کمپنی کی جانب سے ملنے والی تنخواہ معقول سہی لیکن اتنی پُرکشش بھی نہ تھی کہ اخراجات مکمل ہونے کے بعد زیادہ بچت کی جا سکے۔ یہ عدم توازن دونوں کے لیے خلش کا سبب بن گیا۔ وہ اپنے روزمرہ معمولات سے فراغت پا کر اکٹھے بیٹھتے تو یہی نکتہ زیرِ بحث آجاتا۔

''اگر ہم اسی رفتار سے چلتے رہے تو اپنی منزل تک کیسے پہنچیں گے؟'' کیتھرائن نے کہا۔

''مجھے تو خود بھی سمجھ نہیں آتا جادو کی کون سی چھڑی گھماؤں کہ سب مسائل ایک ہی بار ختم ہو جائیں۔'' جان جز بز ہوا۔

''ہمارے سبھی مسائل کا حل دولت ہے۔ زیادہ سے زیادہ دولت۔'' کیتھرائن نے ہاتھ مسلے۔

''مجھے تو ہندوستان میں ایسا کوئی پیڑ نظر نہیں آتا جس سے دولت اتار کر اپنے سارے قرض چکا دوں۔'' وہ کوفت سے بولا۔

''یہاں تم غلطی پر ہو۔'' کیتھرائن نے نرمی سے ٹوکا۔ ''ہندوستان بذاتِ خود ایک سونے کی کان ہے۔ فائدہ اٹھانے کے لیے بس ذرا سی سمجھداری اور ذہانت کی ضرورت ہے۔ میں نے یہاں کے سیاسی حالات جیسی ابتری کہیں دیکھی ہی نہیں۔''

''تمہاری بات بجا لیکن اس سونے کی کان تک رسائی کا رستہ بھی تو ملے۔'' جان نے اپنی الجھن بیان کی۔

''محض ملازمت سے ہمارے مسائل حل نہیں ہوں گے۔ تم کسی کاروبار کے لیے ہاتھ پاؤں مارو۔'' اس نے مشورہ دیا۔

''تمہارا کیا خیال ہے یہ نکتہ میرے ذہن میں نہیں آیا تھا۔ میں اس معاملے پر کئی بار سوچ چکا ہوں۔''

''محض سوچنے سے کیا ہوگا؟ عمل کیوں نہیں کرتے اس پر؟'' وہ جھنجلائی۔

''کمپنی کے قانون نے میرے ہاتھ باندھ رکھے ہیں۔ اس کی رو سے میں ذاتی کاروبار نہیں کر سکتا۔'' جان نے تاسف سے کہا۔

کچھ لمحوں کے لیے دونوں کے درمیان خاموشی حائل ہو گئی۔

''تو اپنے نام سے کاروبار کے بجائے کسی مقامی شخص کے ساتھ شامل ہو جاؤ۔ محنت اس کی سرمایہ تمہارا۔ منافع کی شرح کا تناسب قائم کر لینا۔'' کیتھرائن نے راہ سجھائی۔

''تمہاری بات میں دم تو ہے لیکن یہاں بھی ایک مسئلہ درپیش ہوگا اور اس بات کا اعتراف ابھی تھوڑی دیر پہلے تم خود بھی کر چکی ہو۔'' جان نے کہا۔

''کہیں تمہارا اشارہ لکھنؤ کے سیاسی حالات کی طرف تو نہیں؟'' وہ اس کا اشارہ فوراً بھانپ گئی۔

''بالکل اسی کی بات کر رہا ہوں۔ کسی بھی ملک کے قومی حالات انفرادی زندگیوں پر بہت زیادہ اثر انداز ہوا کرتے ہیں۔ ہندوستان کا انتشار اس کے رہائشی میں سرایت کر چکا ہے۔ چلو! میں ہندوستان بھر کے بجائے

www.pklibrary.com

صرف لکھنؤ کی بات کیے لیتا ہوں۔ یہاں دولت کمانا مشکل نہیں ہے۔ میں نے اس مختصر دورانیے میں اتنا تو جان ہی لیا ہے کہ اودھ کا حاکم ''غازی الدین حیدر'' اور اس کا وزیر ''آغا معتمد الدولہ'' فضول خرچی' عاقبت نااندیشی اور بے پروائیوں میں بے مثل ہیں۔ میں نے ایسے قصے بھی سنے ہیں کہ دربار میں نااہلوں کو بلاسبب کسی بھی بات پر خوش ہو کر ہزاروں روپے بخش دیے جاتے ہیں۔''

''تو اس میں مسئلہ کیا ہے؟ ان حالات سے تو کوئی بھی فائدہ اٹھا سکتا ہے۔'' کیتھرائن نے فوراً لقمہ دیا۔

''مسئلہ یہ ہے کہ ان منتشر حالات میں قومی مزاج بھی وہی صورت اختیار کر چکا ہے۔ میں نے جس حد تک مقامی افراد کو سمجھا اور پرکھا ہے، یہ لوگ وفادار ہیں نہ ہی اچھے رازدار۔ یہ اپنے ذرا سے مفاد کے لیے کسی کو بھی دھوکا دے سکتے ہیں۔ ان کی بدنیتی کا یہ عالم ہے کہ اپنے خاندان سے مخلص دکھائی نہیں دیتے، قوم تو ذرا دور کی بات ہے۔'' جان نے تفصیلی تجزیہ بیان کیا۔

'میں تمہارا نکتہ سمجھ گئی ہوں۔'' کیتھرائن نے متانت سے سر ہلایا۔ ''مقامی افراد اپنے قومی مزاج سے مغلوب ہیں تو تم اپنی قومی خصلت سے مجبور ہو۔ ان متضاد نکات کا ٹکراؤ کاروباری شراکت کو پنپنے نہیں دے گا۔''

''بالکل درست کہا تم نے! یہی میری اصل پریشانی ہے۔'' جان نے آسودگی کا سانس لیتے ہوئے اپنی معاملہ فہم بیوی کو محبت سے دیکھا۔

''اس پریشانی کو پس پشت ڈالنا ہی ہوگا جان! شراکت داری کا خطرہ مول لیے بغیر کامیابی یا ناکامی کا دعویٰ کس طرح کیا جا سکتا ہے بھلا؟ ایک بار قدم اٹھا کر دیکھو۔ خداوند ہماری مدد ضرور کرے گا۔'' کیتھرائن نے اسے ترغیب دی۔

جان نے تفہیمی انداز میں سر ہلا دیا۔ اس کے ذہن میں بھی بہرحال کچھ بھیجا خاکے موجود تھے۔ وہ کسی قدر بہتر کردار کے حامل مقامی شخص سے گٹھ جوڑ کے بعد کاروبار کا آغاز کرنا چاہتا تھا۔ اس کے بعد کسی نہ کسی ایسے وزیر یا درباری تک رسائی ضروری تھی جس سے زائد کمائی حاصل ہو سکے۔ اس ضمن میں وہ اپنی شاعرانہ صلاحیتوں سے بھی استفادہ کر سکتا تھا۔

''ٹھیک ہے کیتھی! میں یہ خطرہ مول لینے کے لیے تیار ہوں۔'' اس نے اپنا حتمی فیصلہ سنایا۔

کیتھرائن خوشی سے کھل اٹھی۔ اس کی آنکھوں میں خوشحالی' مسرت اور آسائشوں کے ہزاروں خواب جگنو بن کر جگمگانے لگے تھے۔

☆☆☆

جان مل کی کوششیں بہت جلد بارآور ثابت ہوگئیں۔ اسے کاروباری شراکت کے لیے ایک ہندو تاجر کالکا پرشاد کی معاونت میسر آ گئی۔ ان دونوں کے درمیان کپڑے اور نیل کے کاروبار پر معاملات طے ہوگئے۔ منافع کا تناسب کچھ زیادہ نہ سہی تو کم بھی نہ تھا۔ آغاز کے لیے اتنا سہارا بہرحال کافی تھا۔

وقت کچھ اور گزرا تو کالکا پرشاد سے کاروباری تعلقات نے نجی نوعیت اختیار کر لی۔ جان نے مقامی تہوار پر کالکا پرشاد کو اپنے گھر مدعو کر لیا۔ ادھیڑ عمر' گہری سانولی رنگت' سفید دھوتی اور قمیص میں ملبوس کالکا کے سر پر بال ایک چٹیا کی صورت میں سر کے عقب میں لٹکتے دکھائی دیتے۔ وہ اپنے اس انگریز شراکت دار سے بہت پُرجوش انداز میں ملنے آیا۔ کیتھرائن نے اس کی اچھی آؤ بھگت کی۔ کھانے کے بعد اس نے ملازم سے کہہ کر شراب کے جام تپائی پر سجا دیے۔ کالکا پرشاد کی آنکھیں شراب اور کیتھرائن کے شباب سے چمک اٹھیں۔ وہ اس کے آتشیں حسن سے بہت متاثر ہوا تھا۔

شراب کا دور چلتے ہی ان دونوں کی بے تکلفی مزید بڑھ گئی۔

''تم بہت اچھی فطرت کے مالک ہو جان! میں نے بہت کم فرنگی تم جیسے دیکھے ہیں۔'' کالکا پرشاد نے سرور میں کہا۔

''شکریہ میرے دوست! حقیقت تو یہ ہے کہ تم بھی ایک اچھے انسان ہو۔'' جان نے جوابی تعریف کی مروت نبھائی۔

کالکا پرشاد کھل اٹھا۔

''اب جبکہ تم نے مجھے کاروباری شریک سے دوست کا استھان بخش دیا ہے تو میرا بھی کرتویہ ہے کہ اپنے سجن متر کو اس کی بھلائی اور برائی سے ساؤدھان رکھوں۔''

''کہو کالکا پرشاد! جو بھی کہنا چاہتے ہو کھل کر کہو!'' جان نے فیاضی سے کہا۔

''تمہاری دھرم پتنی بہت سندر ہے جان! تم سے دوستی کے رشتے وہ میری بھابی ہے اور ہمارے لیے بھابی بالکل ماں سمان ہوتی ہے۔ تمہیں ان کی بہت زیادہ سرکھشا کی ضرورت ہے۔ اپنی دھرم پتنی کو یہاں کے مسلمانوں سے بچا کر رکھنا۔ یہ مسلمان عورتوں کے معاملے میں بہت حریص ہوتے ہیں۔'' اس نے تلخی سے کہا۔

''میرا کسی مسلمان سے بھلا کیا واسطہ؟ اور اگر کبھی

www.pklibrary.com

واسطہ پڑ بھی جائے تو ہر کسی کو گھر میں [illegible] سکتا؟" اس نے بھی جوابی تلخی کا مظاہرہ کیا۔

"ایک مسلمان تو خیر تمہارے گھر میں ہی موجود ہے۔" کالکا پرشاد نے اس کے خانساماں کی طرف اشارہ کیا۔ "عزت کے معاملے میں کسی بھی مسلمان پر وشواس نہیں کیا جاسکتا۔ یہ بات یاد رکھنا۔"

"مجھے اپنی بیوی پر مکمل بھروسا ہے۔ اسے رشتوں کا احترام کرنا آتا ہے۔" جان نے سختی سے کہا۔

"بالکل ایسی ہی ہوں گی وہ۔ میں نے کب انکار کیا؟ لیکن ان مسلمانوں کو میں تم سے زیادہ جانتا ہوں۔ یہ کسی بھی ناری کو بڑی آسانی سے ورغلا لیا کرتے ہیں۔" کالکا پرشاد کے ہر ایک لفظ و انداز میں ازلی تعصب جھلک رہا تھا۔

"تم جو بھی کہو! مجھے اپنی بیوی پر مکمل بھروسا ہے۔" جان نے دوٹوک جواب دیا۔

"بھگوان کرے تمہارا یہ وشواس یونہی سلامت رہے۔ میں صرف تمہیں ساوٗدھان کرنا چاہتا تھا۔ اپنی آنکھیں اور کان بہرحال ہر وقت کھلے رکھنا۔" کالکا پرشاد نے ایک اور مشورہ دیا اور شراب کے بقیہ جام ختم کرنے کے بعد رخصت ہوگیا۔

اس کے جاتے ہی جان خواب گاہ میں کیتھرائن کے پاس چلا آیا۔

"چلا گیا تمہارا مہمان؟" کیتھرائن نے محبت سے اسے دیکھا۔

"ہاں! اس دعوت اور خاطر مدارت کے لیے کافی شکریہ ادا کر رہا تھا۔" جان نے سنجیدگی سے بتایا۔

شوہر کی نبض شناس اور مزاج آشنا کیتھرائن چونک سی گئی۔

"کچھ عجیب سا ہی شخص لگا مجھے۔ اس کی آنکھوں میں مکاری اور موقع پرستی دکھائی دی ہے۔" وہ صاف گوئی سے بولی۔

"یہ سارا معاشرہ ہی ایسا ہے۔ یہاں ہر قدم پر ایسے لوگوں سے ٹاکرا ہوگا۔" جان نے بیزاری سے جواب دیا۔

"مجھے کیوں ایسا لگ رہا ہے کہ تمہیں اس کی کسی بات نے بہت زیادہ ضرب لگائی ہے۔" کیتھرائن نے بڑی محبت سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"نہیں! اس کی تو کسی بات نے ضرب نہیں لگائی۔" جان نے کچھ سوچ کر نفی میں سر ہلایا۔ "میں تو بس اس معاشرے کی اجتماعی کوتاہیوں کے متعلق سوچ کر ذہنی تناؤ کا شکار ہو جاتا ہوں۔"

"یہ معاشرہ ایسا ہی رہے گا۔ ہمیں اس سے کیا لینا [illegible] یہاں قیام کے لیے آئے ہیں۔ اپنا ہدف پورا ہوتے ہی واپس چلے جائیں گے۔" کیتھرائن نے دلاسا دیا۔

"ماحول انسانی سوچ اور نظریات پر بہت اثر ڈالتا ہے کیتھی! ہم جتنا بھی دامن چھڑوائیں ماحول کی کثافت اثر انداز ضرور ہوا کرتی ہے۔ اودھ کے اس اہم مرکز لکھنؤ میں جنسی بے راہ روی عام نظر آتی ہے۔" وہ نپے تلے سے انداز میں بولا۔

"تم شاید یہ بھول رہے ہو کہ ہم لندن جیسے آزاد معاشرے سے یہاں آئے ہیں۔ وہاں جیسی جنسی آزادی بھلا اور کہاں میسر ہوگی؟" کیتھرائن نے اسے آئینہ دکھایا۔

"درست کہہ رہی ہو لیکن ایک فرق تو بہرحال اور بھی ہے۔ یہاں کے بادشاہ، وزیر اور نواب بے تحاشا دولت مند ہیں۔ امارت کی چکاچوند ہی اس ترغیب کو دوگنا بڑھا دیا کرتی ہے۔" اس نے ڈھکے چھپے الفاظ میں اپنا عندیہ بیان کیا۔

کیتھرائن کے لیے اب اس کی الجھن بھانپنا مشکل نہ رہا تھا۔ غصے کی ایک چنگاری بھڑکی اور اس کا وجود خاکستر کر گئی۔

"تو یہ سب کہہ کر گیا ہے وہ کالکا پرشاد! یہ زہر گھول کر پلایا ہے اس نے تمہیں۔" وہ تندی سے بولی۔

جان اس ردعمل پر خائف ہوگیا۔ وہ پشیمانی سے کیتھرائن کی شرربار نظروں اور سرخ پڑتے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔

"اس شخص کی بدنیتی تو میں نے اس کی آنکھوں اور مختلف بہانوں سے میرا ہاتھ چھونے کے طریقوں سے ہی بھانپ لی تھی۔ افسوس تو مجھے اپنے شوہر پر ہے کہ اس نے ایسا سوچ بھی کیسے لیا؟ میرے شوہر نے ایسا گمان بھی کیسے کر لیا کہ اس کی بیوی کسی بے راہ روی کی دولت سے متاثر ہو کر بے وفائی کرنے لگے گی۔" وہ چلّانے لگی۔

"مجھے معاف کر دو کیتھی! خداوند کی قسم! میرا ایسا کوئی مقصد نہیں تھا۔" جان نے آگے بڑھ کر اسے لپٹا لیا۔

کیتھرائن مچلتے ہوئے اس کی گرفت سے خود کو آزاد کروانے لگی۔

"چھوڑ دو مجھے! میں تمہیں اس توہین پر کبھی معاف نہیں کروں گی۔"

جان نے اسے مزید شدت سے لپٹا لیا اور بہ زبان لمس اپنی ندامت کا اظہار کرنے لگا۔ کچھ ہی دیر میں کیتھرائن کا طیش آنسوؤں کی صورت آنکھوں سے بہتا اس کے شانے بھگونے لگا۔

www.pklibrary.com

''معاف کردو! میرا مقصد تم پر شک کرنا نہ تھا۔ میں نے تو ایک عمومی بات کی تھی۔'' وہ ایک ہی بات دہراتا رہا۔

کیتھرائن کا غصہ اب نرم آمیز خود سپردگی میں ڈھل چکا تھا۔

☆☆☆

ایک سال کا عرصہ بیت گیا۔

لکھنؤ میں گرما اپنے جوبن پر تھا۔ موسم کی یہ شدت برداشت کرنا ابھی جان اور کیتھرائن کے بس سے باہر ہی تھا۔ وہ بہت قلیل وقت میں اپنی برداشت اور ضبط کھو دیتے۔ گرمی میں ان کا معمول بہر حال یہی تھا کہ وہ دوپہر سے سہ پہر تک اپنے کمرے میں آرام کرتے۔ کمرے کے دروازے اور کھڑکیوں پر خس کی ٹٹیاں استادہ کی گئی تھیں۔ ملازم قدرے وقفے سے ان پر پانی چھڑک دیا کرتے۔

اس روز وہ تھکاوٹ کے باوجود آرام کرنے سے قاصر تھا۔ طبیعت میں سخت اضطراب جھلک رہا تھا۔

''کیا بات ہے جان! اتنے مضطرب کیوں ہو آج؟'' کیتھرائن نے تشویش سے پوچھا۔

''قرض خواہوں کے متعلق سوچ رہا ہوں۔ وہ ہمارے اہل خانہ کو بہت زچ کر رہے ہیں۔ ان کا گمان ہے کہ ہم دوالیا ہو کر یہاں روپوش ہیں اور اب کبھی لندن نہیں لوٹیں گے۔'' اس نے بتایا۔

''نہایت لغو خیال ہے۔ ہم یہاں مستقل کیسے رہ سکیں گے بھلا؟'' کیتھرائن نے بوجھل انداز میں کہا۔ وہ ایک سال گزرنے کے بعد بھی موسموں کی شدت سے مانوس نہیں ہو پائی تھی۔

''میرا گمان تھا کہ منافع سے ملنے والی رقم وقتاً فوقتاً لندن بھیجتا رہوں گا۔ اس طرح قرض کا بوجھ ہلکا ہوتا جائے گا۔''

''تو اب نفع کی کیا صورت حال ہے؟ کالکا پرشاد سے ایک بار کھل کر بات کیوں نہیں کر لیتے؟'' اس نے تجویز دی۔

''وہ کہتا ہے کہ رقم کاروبار میں پھنسی ہوئی ہے۔ یک مشت منافع کے بجائے قسطوں میں ادائیگی کرے گا۔'' جان نے منہ بنایا۔

''مجھے یہ شخص شروع سے ہی بدنیت لگتا ہے۔''

''ہاں! اعتبار تو مجھے بھی اس پر بالکل نہیں ہے۔ ہماری مجبوریوں کا فائدہ اٹھا رہا ہے وہ۔'' جان اس سے خاصا بیزار ہو چکا تھا۔

''تو پھر اس سے جلد از جلد نجات کیوں نہیں حاصل کر لیتے؟ کوئی اور شراکت دار تلاش کر لو۔'' اس نے مشورہ دیا۔

''نہیں! اس طرح کام نہیں چل سکتا۔ کیا میں ہر سال شراکت دار ہی بدلتا رہوں گا؟'' جان نے شد و مد سے سر ہلایا۔

''تو پھر مزید کتنی دہائیوں تک وطن واپسی کا انتظار کرنا ہے؟ اس مشکل کا کوئی تو حل نکالو۔'' کیتھرائن جھنجلائی۔

''حل تو ایک ہی ہے۔ آج میری مائیکل سے ملاقات ہوئی تھی۔'' اس نے اپنے ایک ہم وطن دوست کا حوالہ دیا۔

''لندن میں وہ ہم سے بھی زیادہ عسرت زدہ تھا۔ قرض خواہ اس کی بوٹیاں نوچ لینے کے درپے تھے لیکن یہاں غازی الدین حیدر کا خاصہ تراش بن کر چند ہی سالوں میں دولت میں کھیلنے لگا ہے۔ لندن کے امرا بھی اس کی امارت کا مقابلہ نہ کر پائیں گے۔''

''مجھے تو سخت حسد محسوس ہونے لگا ہے۔'' کیتھرائن نے کہا۔ ''کیا تم ایسی کوئی راہ نہیں نکال سکتے کہ غازی الدین حیدر یا اس کے وزیر کا اعتماد جیت لو۔ اگر وہ اپنی دولت لٹانے کے درپے ہی ہیں تو تھوڑا بھلا ہمارا بھی ہو جائے۔''

''حسد تو مجھے بھی بہت ہوا تھا۔ دل چاہا کہ ریزیڈنسی سے استعفا دے کر نواب کے دربار میں ملازم ہو جاؤں۔ اس سوکھی تنخواہ میں کیا رکھا ہے؟ لیکن دربار تک رسائی بھی تو آسان نہیں ہے۔ ہمیں کسی نہ کسی کی مدد تو درکار ہوگی۔''

''مائیکل کوئی مدد نہیں کر سکتا کیا؟'' کیتھرائن نے پوچھا۔

''نہیں! اس کی فطرت دیکھ کر مجھے کوئی توقع نہیں۔ نہایت کم ظرف شخص ہے وہ۔ میں بہت اچھی طرح جانتا ہوں اسے۔''

جان کی مایوسی اور جھنجلاہٹ دیکھ کر کیتھرائن اسے دلاسا دینے لگی۔ وہ دوپہر اسی گفتگو کے دوران سہ پہر میں ڈھل گئی۔ وہ دونوں آرام کا خیال ترک کر کے کمرے سے باہر نکل آئے۔ کچھ ہی دیر گزری تھی کہ خانساماں خدا بخش ان کے پاس چلا آیا۔ اس کے بے چین انداز سے علم ہوتا تھا کہ معاملہ گمبھیر ہے۔

''کیا بات ہے خدا بخش! سب خیریت تو ہے؟'' جان نے چونک کر پوچھا۔

''صاحب! ذرا تھوڑی دیر کے لیے میرے ساتھ چلیے گا۔ ایک بہت ضروری بات کرنی ہے۔'' خانساماں نے محتاط نگاہوں سے ارد گرد دیکھتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا۔

''تو یہیں کر لو۔ میں نے کیتھرائن سے اپنا ذاتی یا پیشہ ورانہ کوئی بھی مسئلہ کبھی پوشیدہ نہیں رکھا۔'' جان نے اسے ایک جانب بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''وہ آپ کا ذاتی معاملہ ہے صاحب! آپ زیادہ بہتر

www.pklibrary.com

سمجھتے ہیں۔ ابھی میرے ساتھ چلیے۔ بعد میں بھلے ہی حکیم صاحبہ کو جیسے مرضی بتا دیجیے گا۔'' وہ لجاجت سے بضد ہوا۔

جان اس کے اصرار پر خاموش ہو گیا۔ کیتھرائن نے اشارے سے اسے جانے کا عندیہ دیا اور پُرسوچ انداز میں خدا بخش کی طرف دیکھنے لگی۔ خدا بخش، جان کو اپنے ہمراہ لیے اس رہائش گاہ کی عقبی سمت چلا آیا جہاں فالتو اشیا کا ایک گودام نما کمرا موجود تھا۔ کمرے کے باہر رک کر اس نے ایک بار پھر محتاط نگاہوں سے قرب و جوار کا جائزہ لیا اور سرگوشی میں کہنے لگا۔

''صاحب! میں بہت عرصے سے یہاں ملازم ہوں۔ میں نے آپ کے دیگر ہم وطن افراد کا بھی بہت قریب سے مشاہدہ کیا ہے۔ میں بلاخوشامد ایک بات کہوں گا کہ برطانوی قومی روایات بہت اعلیٰ ہیں۔ آپ لوگ انسان دوست اور اصول پرست ہیں۔''

خدا بخش کے اس فدویانہ انداز اور الفاظ نے جان کا سر احساسِ تفاخر سے بلند کر دیا۔

''بے شک ایسا ہی ہے۔ ہم انسانیت کے ناتے کچھ بھی کر سکتے ہیں۔''

جان کی اس بات پر خدا بخش کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی۔ موضوعِ گفتگو اب اس کے ڈھب پر آ گیا تھا۔

''جی صاحب! اس وقت بھی آپ کی جانب سے ایسے ہی ایک قدم کی ضرورت ہے۔ اگر آپ نے اپنی قومی روایات کے مطابق حق کا ساتھ دے دیا تو مستقبل میں بہت سے مسائل از خود حل ہو جائیں گے۔''

خدا بخش کی اس مبہم بات پر جان سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

''آیئے! میں آپ کو کسی سے ملوانا چاہتا ہوں۔'' اس نے اندرونی سمت بڑھتے ہوئے کہا۔

جان اس کے پیچھے چل دیا۔ گودام میں اسے ایک شخص دکھائی دیا۔ وجیہہ، باوقار اور خوش پوش۔ اس کی عمر تیس سال سے زیادہ نہ تھی۔ آنکھوں میں گہری اداسی جھلک رہی تھی۔

''میں اپنے صاحب کو لے آیا ہوں۔ آپ ان سے بات کر لیجیے۔ میرے صاحب بہت با اصول اور حق گو ہیں۔ وہ آپ سے ضرور تعاون کریں گے۔'' خدا بخش نے اس اجنبی سے کہا۔

''ہم نے کسی سے کیا حکایت کہنی ہے؟ بات صرف اتنی سی ہے کہ ہمیں کچھ روز کے لیے پناہ درکار ہے۔ اس کے بعد جیسے ہی کوئی مناسب انتظام ہوا ہم فیض آباد روانہ ہو جائیں گے۔ وہ فیض ضرورت مند ہونے کے باوجود بے حد انا پرست اور خوددار دکھائی دے رہا تھا۔

خدا بخش نے جز بز ہوتے ہوئے اسے دیکھا اور معاملہ گوش گزار کرنے کی ذمے داری خود سنبھال لی۔ اس نے جان سے مخاطب ہو کر کہا۔

''صاحب! یہ نواب شہامت علی خاں ہیں۔ ان کا تعلق غازی الدین حیدر کے خانوادے سے ہے۔ درباری معاملات کی نزاکتیں آپ اتنی گہرائی میں کہاں جانتے ہوں گے۔ ایک لمحے میں مصاحب اور اگلے ہی پل جانی دشمنی پیدا ہو جاتی ہے۔ نواب شہامت بھی اسی گردشِ زمانہ کا شکار ہوئے ہیں۔ غازی الدین حیدر ان پر بے پناہ اعتماد کرتے تھے۔ دربار میں کچھ سازشی عناصر سے یہ بات برداشت نہ ہوئی۔ انہوں نے سازشوں کا ایسا جال تیار کیا کہ غازی الدین ان کی جان کے درپے ہو گئے۔ زندگی بچانے کے لیے نواب صاحب کو اپنا گھر بار چھوڑ کر آنا پڑا۔ میری خوش قسمتی ہے کہ انہیں اس کٹھن وقت میں کچھ عرصے پر محیط خدمت یاد رہی۔ میں نے ہی انہیں مشورہ دیا ہے کہ ریزیڈنٹ یا ان کے عملے کے کسی بھی فرد کی رہائش گاہ ٹنک کے دائرے میں نہیں آئے گی۔ کہیے صاحب! میں نے کچھ غلط کہا کیا؟ اس مشکل میں صرف آپ ہی نواب صاحب کے لیے سہارا ثابت ہو سکتے ہیں۔ آپ کو اپنی انسان دوستی کا واسطہ! انہیں پناہ دے دیجیے۔'' خدا بخش نے ہاتھ جوڑے۔

''میں تمہارا معاملہ سمجھ گیا ہوں خدا بخش!'' جان نے متانت سے سر ہلایا۔ ''مجھے نواب شہامت کو یہاں پناہ دینے میں بالکل اعتراض نہیں لیکن ہم انسانیت پسند ہیں تو قانون پرست بھی ہیں۔ اس معاملے میں مجھے ریزیڈنٹ سے اجازت لینی پڑے گی۔''

نواب نے اس بات پر جان کو بغور دیکھا اور ایک توقف سے کہنے لگا۔

''خدا بخش نے اس معاملے کو بہت زیادہ ہی سنگین بنا کر پیش کر دیا۔ ہم غازی الدین سے بہت اچھی طرح واقف ہیں۔ آج ناراض ہیں تو کل مان بھی جائیں گے۔ ہمیں تو بس ایک چھوٹی سی مدد درکار ہے۔ ہمارا ایک رقعہ دے کر کسی قابلِ اعتبار شخص کو ''قصرِ شہامت'' بھیج دیجیے۔ ہمیں فیض آباد روانگی کے لیے کچھ اسباب منگوانا ہے۔ ہاں! رقعہ لے جانے والا شخص دس ہزار روپے انعام کا مستحق بھی ہو گا۔ ہم اس بات کا اندراج بھی کر دیں گے۔'' نواب

www.pklibrary.com

شہامت نے بے نیازی سے کہا۔

دس ہزار روپے کا ذکر سنتے ہی جان کی آنکھیں پھٹنے کے قریب ہونے لگیں۔ طمع نے یکدم غلبہ پایا اور وہ بے اختیار کہہ اٹھا۔

''فیض آباد جانے کی کیا ضرورت ہے نواب صاحب! آپ کو ویسے کوئی اسباب منگوانا ہے تو کہیے۔ میری رہائش گاہ کے دروازے آپ کے لیے کھلے ہیں۔ ریزیڈنٹ صاحب کو بھی میں سنبھال لوں گا۔ میرا مشورہ تو یہی ہے کہ فیض آباد روانگی کے بجائے یہیں لکھنؤ میں رہ کر بادشاہ سے تعلقات بہتر بنانے کی کوشش کیجیے۔''

جان کے پیترا بدلتے ہی نواب شہامت کے ہونٹوں پر مسکراہٹ رینگ گئی۔ اسے علم ہو گیا تھا کہ مچھلی نے چارا نگل لیا ہے۔ اس نے قدرے تردد کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنا سامان اور رقم منگوالی۔ دس ہزار کی رقم یک مشت دیکھ کر کیتھرائن کا ردعمل بھی شوہر جیسا ہی تھا۔

''کیا یہ سارے پیسے ہمارے ہیں؟ کیا واقعی؟'' وہ رقم ٹٹولنے لگی۔

''ہاں واقعی! یقین کرلو کیتھی! یہ دولت اب ہماری ہے۔'' جان بھی پُرجوش تھا۔

''کیا وہ مہمان حقیقتاً اتنا دولت مند ہے، ایک بار سامان لانے کے لیے دس ہزار ادا کر دیے؟'' کیتھرائن حسرت سے بولی۔

''وہ ہمارے گمان سے بھی زیادہ دولت مند اور اس وقت واقعی ضرورت مند ہے۔ ہم اس کی ضرورت پوری کرنے کے لیے اپنی راہیں بھی ہموار کر سکتے ہیں۔'' جان نے اپنے ذہن میں پرورد نیا منصوبہ بتایا اور ایک توقف سے کہنے لگا۔

''ہم اسے گودام یا کسی الگ تھلگ کمرے میں ٹھہرانے کے بجائے اپنا نجلی کمرا فراہم کریں گے۔ اس کی ہر ضرورت و آرام کا بھی خاص خیال رکھیں گے۔ آج نہیں تو کل وہ بادشاہ کا اعتماد دوبارہ حاصل کرلے گا۔ ہماری یہ مہمان نوازی اسے احسان بن کر ہمیشہ یاد رہے گی اور وہ اپنی فطرت وعہدے سے مجبور ہو کر یہ احسان چکانے کی کوشش بھی ضرور کرے گا۔''

کیتھرائن کی سوچتی نگاہوں اور چہرے پر اطمینان کی جھلک سے واضح تھا کہ وہ بھی اس منصوبے سے کلی متفق ہے۔ نواب شہامت کے لیے کمرا مکمل آرام دہ بنا دیا گیا۔ کیتھرائن بھی حتی الامکان اس کی روزمرہ ضروریات کا خیال رکھنے لگی۔ اگلے چند روز میں وہ نواب شہامت کی زندہ دلی، نفاستِ طبع، علمیت، ذوق اور معاملہ فہمی کے قائل ہو گئے۔ ان سب پر مستزاد وہ اہل زبان ہی کی طرح انگریزی بھی بول لیا کرتا۔ جان اور کیتھرائن کے دل میں اس کے لیے خود بخود احترام پیدا ہونے لگا۔

چند روز مزید گزرے تو نواب شہامت کی طبیعت خراب ہو گئی۔ جان اس صورتِ حال پر تشویش زدہ ہو گیا۔

''اب کیا کریں گے؟ کیا ریزیڈنٹ سے ڈاکٹر کو بلوایا جائے؟'' کیتھرائن نے پوچھا۔

''نہیں! اس طرح تو یہ معاملہ ہمارے ہی گلے پڑ جائے گا۔ ہم ابھی نواب کی یہاں موجودگی کسی پر بھی ظاہر نہیں کر سکتے۔'' جان نے فوراً کہا۔

''پھر تو کسی مقامی طبیب سے علاج کا بھی کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ مقامی افراد تو یوں بھی قابلِ اعتبار نہیں۔'' کیتھرائن تشویش زدہ ہوئی۔

''ایک ہی صورت باقی ہے۔'' جان نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔ ''ہم خدا بخش کو کسی حکیم کے پاس بھیجتے ہیں۔ وہ مریض کا احوال بتا کر دوا لے آئے گا۔ خداوند نے چاہا تو نواب شہامت بالکل تندرست ہو جائے گا۔''

کیتھرائن نے اس تجویز کی توثیق کر دی۔ خدا بخش نے بھی فوری ہامی بھر لی۔ ادویات آتے ہی کیتھرائن نے نواب کی تیمارداری کا فریضہ خود سنبھال لیا۔ وہ جان کے ملازمت پر جانے کے بعد اس کی ہر چھوٹی سے چھوٹی ضرورت کا خود خیال رکھتی۔ وقت پر دوا دیتی۔ یونانی ادویات کے وہ نسخے خدا بخش تیار کر دیتا تھا جنہیں کیتھرائن پیالے میں بھر کر نواب کو تھما دیتی۔ وہ مسکراتے ہوئے پیالہ تھامتا اور غٹاغٹ ختم کر دیتا۔

کیتھرائن اس کے حوصلے اور ضبط پر حیران ہوا کرتی۔ دوا کی کڑواہٹ کا اسے خود بھی اچھی طرح اندازہ تھا۔ چند روز کی محنت اور بھرپور تیمارداری سے اس کی طبیعت میں افاقہ ہونے لگا۔

''ہم آپ کا یہ نیا احسان کس طرح چکائیں گے کیتھرائن صاحبہ؟'' ایک روز دوا ختم کرتے ہی نواب نے اسے مخاطب کیا۔

''آپ ہمارے مہمان ہیں نواب صاحب! اور مہمان پر کسی بھی تہذیب میں احسان کا کوئی رواج نہیں ہوتا۔ مہمان تو خداوند کی رحمت ہوتے ہیں۔'' وہ نرمی سے بولی۔

''آپ کے ظاہر کی طرح باطن بھی بہت خوبصورت

www.pklibrary.com

ہے کیتھرائن صاحبہ!'' نواب شہامت نے اسے گہری نظروں سے دیکھا۔

کیتھرائن اس کے انداز پر جھینپ گئی۔ اسے نواب کی نگاہوں میں پہلے کی نسبت زیادہ پسندیدگی اور چمک محسوس ہوئی تھی۔

''ہم سچ کہہ رہے ہیں۔ آپ بہت منفرد خاتون ہیں۔ ہم نے آپ جیسی خوبیاں آج تک کسی میں نہیں دیکھیں۔'' شہامت نے اس کی خاموشی سے مزید شہ پاتے ہوئے کہا۔

''منفرد تو آپ ہیں نواب صاحب! آپ جیسی رواں زبان دانی' دلچسپ اندازِ گفتگو' حاضر جوابی اور روشن خیالی میں نے بھی کہیں مشرقی مرد میں نہیں دیکھی۔'' کیتھرائن نے اپنی رائے دی۔

''یہ بات تو بالکل بجا فرمائی آپ نے۔'' اس نے بے ساختہ کہا۔ ''ہم بظاہر مشرقی ہیں لیکن ہمارے دل و دماغ مغربیت سے زیادہ متاثر ہیں۔ کبھی کبھی تو ہمیں ایسا لگتا ہے کہ ہم غلط خطۂ زمین پر پیدا ہو گئے ہیں۔''

شہامت کی اس بات پر کیتھرائن نے محض مسکرانے پر ہی اکتفا کیا۔ اس مسکراہٹ میں افسردگی اور حزن کی جھلک نے نواب شہامت کو کھل کر بات کرنے پر مجبور کر دیا۔ وہ اس مختصر دورانیے میں ہی ان دونوں کے کئی مسائل سے آگاہ ہو چکا تھا۔

''جان بل صاحب کی تنخواہ کیا ہے کمپنی میں ویسے؟'' اس نے ایک توقف کے بعد پوچھا۔

''اونٹ کے منہ میں زیرہ ہی سمجھیے۔'' کیتھرائن نے ٹالا۔

''ویسے اس ناچیز کا مشورہ مانیے تو ہمارے عزیز غازی الدین حیدر کے دربار میں کسی ملازمت کی کوشش کیجیے۔'' اس نے مشورہ دیا۔

''ہماری وہاں تک رسائی کیسے ممکن ہے؟ ہاں اگر آپ اپنی سابقہ حیثیت پر بحال ہو جائیں تو شاید ہماری بھی کچھ سنی جائے۔'' وہ ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے بولی۔

نواب شہامت نے ایک بار پھر گہری نظروں سے اس کا جائزہ لیا اور اپنے لباس سے چابیوں کا ایک گچھا نکال کر اس کے حوالے کر دیا۔

''آپ کو زحمت نہ ہو تو ہمارا صندوق کھول دیجیے۔''

کیتھرائن نے چابیاں تھامیں اور ایک جانب رکھے صندوق کے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی۔ اسے اپنی پشت پر نواب شہامت کی نظروں کا ارتکاز واضح محسوس ہو رہا تھا۔

صندوق کھلنے کے بعد نواب نے شاہانہ انداز میں کہا۔

''ایک تھیلی دکھائی دے گی آپ کو۔ اسے ہمارے پاس لے آیئے۔''

کیتھرائن نے ایسا ہی کیا۔ نواب نے تھیلی تھامتے ہی اپنا ہاتھ کیتھرائن کے ہاتھ سے مس کر دیا۔ کیتھرائن نے غیر محسوس طریقے سے ہاتھ پیچھے کر لیا۔ شہامت کی نظروں میں چمک مزید گہری ہو گئی۔ اس نے تھیلی دوبارہ کیتھرائن کی جانب بڑھا دی۔

''یہ لیجیے! ہماری جانب سے ایک حقیر تحفہ قبول کیجیے۔'' وہ سنجیدگی سے بولا۔

''یہ کس لیے نواب صاحب! کیا آپ ہمارے خلوص اور مہمان نوازی کی قیمت ادا کر رہے ہیں؟'' کیتھرائن بھی سنجیدہ ہوئی۔

''اللہ! ایسا بالکل نہیں ہے۔ ہم واقعی دلی طور پر تحفہ پیش کر رہے ہیں۔'' نواب نے تڑپ کر کہا۔

''نہیں! میں اسے نہیں لے سکتی۔ میرے شوہر کو یہ بات بالکل پسند نہیں آئے گی۔'' کیتھرائن نے وہ تھیلی ایک جانب رکھ دی۔

''ہمارا یقین کیجیے۔ ہم یہ تحفہ کسی غلط نیت سے نہیں دے رہے۔'' اس نے سمجھانا چاہا۔

''اگر ایسا ہی ہے تو یہ تھیلی جان کو دیجیے گا۔ اگر وہ قبول کر لے تو مجھے بھی کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ میں اپنے شوہر کی محبت اور اطاعت کے لیے پابند ہوں۔'' کیتھرائن نے اسے جتایا۔

''آپ ہماری نیت پر شک نہ کریں کیتھرائن صاحبہ! لیکن یہ تحفہ جان صاحب کے سامنے نہیں دیا جا سکتا۔'' اس نے کیتھرائن کی آنکھوں میں جھانکا اور پھر ایک توقف سے کہنے لگا۔

''ہم مرد کی سوچ اور فطرت کو بہت اچھی طرح جانتے ہیں اور یہ بھی سمجھتے ہیں کہ گھر بنانے' سنوارنے' مشکلات سے لڑنے کا حوصلہ عورت میں زیادہ ہوتا ہے۔ وہ مرد سے کہیں بڑھ کر معاملہ فہم ہوتی ہے۔ ہم معذرت کے ساتھ کہنا چاہیں گے کہ آپ کے گھر میں رہتے ہوئے کچھ ایسی باتیں بھی سماعت کا حصہ بنی ہیں جو شاید نہیں بننی چاہیے تھیں۔ ہمیں علم ہوا ہے کہ آپ کے ذمے کافی قرض واجب الادا ہے۔ آپ دونوں اس قرض کی ادائیگی کے لیے بہت فکر مند بھی رہتے ہیں۔ اب اگر ہم یہی بات جان صاحب سے کریں گے تو وہ اسے اپنی انا اور وقار کا مسئلہ بنا لیں گے۔''

www.pklibrary.com

اس کے تجزیے اور اندازوں پر کیتھرائن عش عش کر کے رہ گئی۔ بات کچھ غلط بھی نہ تھی۔ اس کی خاموشی میں پوشیدہ تذبذب بھانپنے کے بعد نواب شہامت نے کہا۔

”آپ نے ہمارے مشکل وقت میں بہت ساتھ دیا ہے۔ ہم جب سوچتے ہیں کہ ہمارے محسن یہاں مالی پریشانیوں کا شکار اور مقروض ہیں تو یقین مانیے دل کٹنے لگتا ہے۔ ہم آج، ابھی اور اسی لمحے آپ کو قول دیتے ہیں کہ آپ کا تمام تر قرض کسی بھی طرح چکا دیں گے۔“

”آپ کو کچھ اندازہ بھی ہے کہ اس قرض کی رقم درحقیقت کتنی ہے؟“ کیتھرائن بے ساختہ بولی۔

”جی ہاں! ہماری سماعت میں کچھ ایسا پہنچا تو تھا کہ چھ ہزار پاؤنڈز واجب الادا ہیں جو ان شاءاللہ اب نہیں رہیں گے۔ آپ خود کو مکمل آزاد اور پرسکون سمجھیے۔ مناسب سمجھیں تو اس تھیلی میں موجود رقم گن لیجیے گا تاکہ ہم بقیہ کا بھی بندوبست کر سکیں۔“

اس کی پیشکش نے کیتھرائن کو دم بخود کر دیا۔ اس نے تھیلی قبول کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ تھیلی قدرے وزنی تھی۔ کیتھرائن کو اپنے سارے تفکرات اور مسائل اس وزن تلے دبے دم توڑتے محسوس ہونے لگے۔

”آپ کا بہت شکریہ نواب صاحب! ایسی فیاضی اور دریا دلی میں نے کہیں دیکھی نہ سنی۔“ کیتھرائن کی زبان میں از خود شیرینی پیدا ہو گئی۔

شہامت علی کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ اسے مغربی حسن کی اس ساحرہ کو اپنی جانب متوجہ کرنے کا گر معلوم ہو گیا تھا۔ نواب شہامت نے اسے مزید چارا ڈالتے رہنے کا فیصلہ کر لیا۔

☆☆☆

جان مل دفتر سے تھکا ہارا واپس آیا تو کیتھرائن نے بہت گرم جوشی اور محبت سے اس کا استقبال کیا۔

”آج دفتر میں زیادہ کام تھا کیا؟ تھکاوٹ کچھ معمول سے زیادہ دکھائی دے رہی ہے۔“ اس نے نرمی سے دریافت کیا۔

”نہیں! کام اور ذمے داریاں کہاں تھکاتے ہیں انسان کو؟ انسان تو رویوں اور ناہمواریوں سے اعصابی انتشار میں مبتلا ہوا کرتا ہے۔“ جان نے حقیقت بیان کی۔

”سمجھ گئی۔ لگتا ہے آج پھر کالکا پرشاد سے ملاقات کر کے آئے ہو۔“ کیتھرائن نے فوری تجزیہ کیا۔

”ہاں! اس کے ذمے دو ہزار روپے واجب الادا تھے۔ وہی طلب کرنے گیا تھا۔“ جان بستر پر بیٹھ گیا۔

شہاب الدین محمد شاہ جہاں

آغازِ حکومت۔ 1628ء میں شہزادہ خرم شاہ جہاں کا لقب اختیار کر کے بڑے شان و شکوہ سے تخت پر بیٹھا۔ شاہ جہاں نے اپنی حکومت کے آغاز ہی میں چند ایسی اصلاحات نافذ کیں کہ راسخ العقیدہ مسلمان خوش ہو گئے۔ اکبر کے زمانے سے بادشاہ کے سامنے سجدہ کرنے کی جو رسم چلی آئی تھی، شاہ جہاں نے اسے موقوف کر دیا اور اس کی جگہ چہار تسلیم کے طریقے نے رواج پایا یعنی دربار شاہی میں جو لوگ حاضر ہوتے تھے انہیں سجدہ کرنے کے بجائے صرف چار جگہ جھک کر تسلیم بجالانی پڑتی تھی۔ اس کے علاوہ سن شمسی کے بجائے سن ہجری رائج کیا گیا اور قمری مہینوں کے حساب سے سارے کام انجام پانے لگے۔ شاہ جہاں کے زمانے میں کئی بغاوتیں ہوئیں۔ سب سے پہلے بندیلہ راجپوتوں کے سردار ججھار سنگھ نے بغاوت کی لیکن شکست کھائی۔ شاہ جہاں کے نامور سپہ سالار خان جہان لودھی کی بغاوت اس سے بھی زیادہ زور کی تھی۔ آخر وہ شکست کھا کر مارا گیا۔ شاہ جہان کی آرزو تھی کہ کسی طرح وسط ایشیا کے علاقے جہاں اس کے بزرگوں نے مدتوں حکومت کی تھی اس کے قبضے میں آجائیں۔ 1649ء میں قندھار پھر ایرانیوں کے قبضے میں چلا گیا۔ شاہ جہان نے پہلے اورنگ زیب کو اس شہر پر حملہ کرنے بھیجا۔ اسے ناکامی ہوئی تو دارا شکوہ کو بھیجا گیا۔ اسے بھی نقصان اٹھا کر واپس آنا پڑا۔ شہزادہ اورنگ زیب جو شاہ جہان کا تیسرا بیٹا تھا 1618ء میں پیدا ہوا۔ اس کی ابتدائی زندگی کا ایک واقعہ بہت مشہور ہے۔ جن دنوں اس کی عمر ابھی چودہ برس کی تھی وہ گھوڑے پر سوار ہاتھیوں کی لڑائی کا تماشا دیکھ رہا تھا کہ یکایک ایک غضب ناک ہاتھی اس پر جھک پڑا۔ اورنگ زیب کی ہمت پر آفرین ہے کہ وہ ڈر کر بھاگا نہیں بلکہ ہاتھی کا مقابلہ کرنے کے لیے تلوار سونت لی۔ دراصل اس کی یہی خوبی تھی جس کی وجہ سے اسے آگے چل کر بڑی کامیابی ہوئی۔ شاہ جہاں کے چار بیٹے تھے۔ دارا شکوہ، شاہ شجاع، اورنگ زیب اور مراد بخش۔

”تاریخ ہند و پاکستان“ سے

انتخاب: ناہید یوسف، اسلام آباد

www.pklibrary.com

''اور اس بار کالکا پرشاد نے کیا بہانہ بنا کر ٹالا؟'' کیتھرائن نے پوچھا۔

''کہنے لگا مجھے ادائیگی سے کب انکار ہے؟ رقم تمہاری ہے اور میں نے ہر حال میں دینی ہی ہے۔ لیکن بازار میں پھیلی ہوئی وصولی ذرا آرام سے ہی ہوگی۔'' وہ بیزاری سے بولا۔

''تو تم نے اسے یہ کیوں نہ کہا کہ حساب کتاب صاف نہ ہوا تو اپنے حصے کا کاروبار ختم کردو گے۔ پچھلی بار ہمارے درمیان ایسا ہی کہنا طے ہوا تھا نا؟'' اس نے یاد دہانی کروائی۔

''میں نے یہی کہا تھا۔'' جان نے منہ بنایا۔ ''جوابی طور پر وہ مجھے کہنے لگا کہ کاروبار جاری رکھنا یا نہ رکھنا تمہارا ذاتی فیصلہ ہے۔ لیکن کاروبار ختم کرنے کی صورت میں پھنسی ہوئی رقم کی وصولی کا کوئی امکان نہیں رہے گا۔ رقم ڈوبی ہی سمجھو۔''

''یہ بھلا کیا بات ہوئی؟'' کیتھرائن بدحواس ہوگئی۔ ''رقم کیسے ڈوب سکتی ہے؟''

''میں نے بھی اس سے یہی سوال کیا کہ ہندوستان میں کاروبار ایسی بددیانتی سے ہوا کرتے ہیں کیا؟ ہمارے انگلستان میں تو ایسا نہیں ہوتا۔ جواب میں کہنے لگا کہ اسے انگلستان کے اصول اور قاعدوں سے کچھ لینا دینا نہیں ہے۔ اسے تو اپنے ملکی معاملات سے مطلب ہے۔'' جان کے اس جواب پر کیتھرائن بھی تاسف میں مبتلا ہوگئی۔ جان نے ایک گہری سانس بھرتے ہوئے کہا۔

''میں چاہتا تو اس سے مزید الجھنے لگتا لیکن اس بددیانت شخص سے بحث کا کوئی فائدہ ہی نہیں۔ اس کا علاج میں نے ڈھونڈ لیا ہے۔ اس علاج کا دورانیہ طویل سہی لیکن کارگر ثابت ہوگا۔ اگر نواب شہامت اپنے عہدے پر بحال ہوگیا تو تم دیکھنا میں اس کالکا پرشاد کا کیا حال کرواتا ہوں۔''

''اسے تمہاری سوچ یا نیت کا اندازہ تو نہیں ہوا؟'' کیتھرائن نے پوچھا۔

''نہیں! میں نے ایک لمحے کے لیے بھی خوش اخلاقی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ بلکہ اس سے یہ بھی دریافت کیا کہ کم از کم دو اڑھائی ہزار مستقل ماہانہ منافع کے لیے کتنی رقم کا انتظام کروں؟ وہ میرے داؤ میں آگیا۔ نہایت خوشامدی انداز میں کہنے لگا کہ دس بارہ ہزار پاؤنڈز کا انتظام کافی ہوگا۔'' اس نے دانت پیسے۔

''اس کی ایسی کم تیسی! کالکا پرشاد نے ہمیں احمق اور لاوارث سمجھ لیا ہے۔ اس کا علاج اب واقعی ضروری ہوگیا ہے۔'' کیتھرائن نے غصے سے کہا۔

''تم فکر نہ کرو۔ میں شہامت علی خاں اور غازی الدین حیدر کی رنجشیں دور کروانے کے لیے ذاتی کوششیں کروں گا۔ اس نواب کی صورت میں ترپ کا پتا ہاتھ میں موجود ہے۔ فائدہ تو ہر حال میں اٹھانا ہی ہے۔'' اس نے دلاسا دیا۔

''مجھے یقین ہے کہ ایسا ہی ہوگا۔ نواب شہامت ہمارے احسان کا بدلہ ضرور چکائے گا۔'' کیتھرائن کو رقم کی تھیلی یاد آئی تو امید کا ماخذ بھی کئی گنا بڑھ گیا۔

☆☆☆

نواب شہامت کی طبیعت اب بہتری کی جانب مائل تھی۔ کیتھرائن نے اس کی خدمت و تیمارداری میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی ہوئی تھی۔ اس کی خوش اخلاقی، شیریں بیانی اور نرمی نواب کے دل میں چٹکیاں بھرنے لگتی۔ وہ اس کے حسن سے تو پہلے ہی متاثر تھا۔ اب شخصی خوبیوں کے سامنے بالکل ہی ڈھیر ہوتا جا رہا تھا۔ تنہائی ملتے ہی اس کے ذہن میں منتشر خیالات کی یلغار ہونے لگتی۔ دل میں شدت سے خواہش ابھرتی کہ کیتھرائن اسے اس بے سروسامانی کے عالم کے بجائے اس وقت ملی ہوتی جب غازی الدین حیدر کے دربار میں شاہی تمکنت عروج پر تھی۔ اس صورت میں وہ اسے اپنے شاہانہ رکھ رکھاؤ اور امارت سے مرعوب کر کے جان سے عاشقی پر بھی مجبور کر دیتا۔

کیتھرائن کی ہر بار آمد، گفتگو اور رفاقت اس کے خیالات میں مزید پراگندگی پیدا کرنے لگتی۔ اس انتشار سے بچاؤ کے لیے نواب شہامت نے خدا بخش کو شراب فراہم کرنے کا حکم دے دیا۔ خدا بخش نے لالچ میں اس کی یہ فرمائش فوراً پوری کر دی۔

''ہم تمہاری خدمت گزاری سے بہت خوش ہیں خدا بخش! تم نے ہماری بہت مدد کی ہے۔'' اس نے شراب کا جام تھماتے ہوئے کہا۔

''خاکسار تو آپ کا غلام ہے نواب صاحب!'' وہ فدویانہ انداز میں بولا۔

نواب شہامت کی خوشامد کرنا اس کی مجبوری تھی۔ وہ ایک طرف اس سے مالی فوائد حاصل کرنا چاہتا تھا تو دوسری سمت جان اور کیتھرائن پر اپنی دولت و عنایات نچھاور کرنے سے بھی روکنا چاہتا تھا۔

''لگتا ہے کسی خاص مسئلے میں گم ہو خدا بخش؟'' شہامت نے اس کی جانب بغور دیکھا۔

www.pklibrary.com

بساط

واہ، کیا کہنے

ایک شخص سیڑھیوں سے گر کر ٹانگ کی ہڈی تڑوا بیٹھا۔ ڈاکٹر نے پلستر چڑھا دیا اور ہدایت کی کہ سیڑھیاں وغیرہ مت چڑھنا۔

''ہائے میں کیا کروں..... ہمارا تو فلیٹ ہی دوسری منزل پر ہے۔'' وہ شخص فکر مند لہجے میں بولا۔

''کوئی اور انتظام کر لینا۔'' ڈاکٹر نے مشورہ دیا۔

ڈیڑھ دو ماہ بعد ڈاکٹر نے اس کا پلستر اتار دیا اور کہا۔

''اب تم ٹھیک ہو۔ سیڑھیاں اترو اور چڑھ سکتے ہو۔''

''شکر ہے، ورنہ میں تو پانی والے پائپ کے ذریعے اترتا اور چڑھتا رہا ہوں۔'' زخمی مریض نے جواب دیا۔

آرزو

ایک خاتون: کیا تم چاہتی ہو کہ تم بھی میری طرح نوجوان، حسین اور خوش گفتار ہو جاؤ۔''

دوسری خاتون: ''نہیں، میں سوچتی ہوں اگر میں صرف آپ جتنی خوش فہم ہی ہو جاؤں تو وہ بھی کافی ہوگا۔''

ایمرجنسی

ڈاکٹر صاحب نے نئی نئی پریکٹس شروع کی۔ کلینک پر کوئی مریض نہ آیا لیکن ایک روز گھر پہنچے تو فون کی گھنٹی بجی۔ انہوں نے لپک کر ریسیور اٹھایا۔ خلاف توقع دوسری طرف بھی کسی مریض کے بجائے ان کے ایک ڈاکٹر دوست بول رہے تھے۔

انہوں نے بتایا کہ تین سابق کلاس فیلوز ایک جگہ بیٹھ کر تاش کھیل رہے ہیں۔ چوتھے پارٹنر کی ضرورت ہے۔ سو انہیں دعوت دی جا رہی تھی۔ انہوں نے ایک لمحے کے لیے سوچا پھر آنے کی حامی بھر لی۔

''کیا کوئی ایمرجنسی کیس ہے؟'' ان کی بیوی نے پرامید لہجے میں پوچھا۔ ''ہاں یہی سمجھ لو، تین ڈاکٹرز وہاں پہلے سے موجود ہیں لیکن میرے بغیر کام نہیں چل رہا۔'' ڈاکٹر نے جواب دیا۔

از: نگینہ ضیا بنگش، کیماڑی

''بالکل نہیں حضور! میں تو بس بادشاہ اور آپ کے متعلق سوچ رہا تھا۔'' وہ ہڑبڑا کر بولا۔

''یعنی تم یہ کہہ رہے ہو کہ ہمارے عزیز غازی الدین حیدر اور ہمارا معاملہ خاص نہیں بالکل عام سی بات ہے۔'' شہامت نے ہونٹ بھینچ لیے۔

''ارے نہیں حضور! توبہ کیجیے۔'' وہ فوراً بولا۔ ''میں تو بس یہ سوچ رہا تھا کہ آپ کے باہمی اختلافات جلدی ختم ہو جائیں تاکہ آپ اس بے سروسامانی سے نجات پالیں۔ مجھے کیا علم نہیں کہ کسی کے گھر یوں پڑے رہنا آپ کی طبع پر کتنا ناگوار گزرتا ہوگا اور ویسے بھی مہمان داری بوجھ بننے سے پہلے ختم ہو جانا ہی تہذیب کے موافق ہوتا ہے۔''

''کیا ہمارے میزبانوں نے تم سے کوئی شکایت کی ہے کہ وہ اس مہمان نوازی سے اوب رہے ہیں؟'' شہامت علی نے شراب حلق میں انڈیلی۔

''حضور! ضروری تو نہیں کہ ہر بات زبان سے ہی ادا کی جائے۔ رویہ اور تاثرات بھی تو کوئی شے ہوتے ہیں پھر میں نے ان میاں بیوی کو اس بات پر بھی جھگڑتے دیکھا کہ قصر شہامت سے سامان منگوانے کے لیے جان صاحب خود کیوں گئے؟ کسی ملازم یا خدا بخش سے کیوں نہ کہہ دیا؟ ملازمین کے کام اب کمپنی کے اہلکار کیوں کریں؟'' اس نے بڑے اطمینان سے جھوٹ تراشا۔

''آہ..... یہ تو بہت نامناسب بات کہی انہوں نے۔'' شہامت نے تاسف جتایا۔ وہ اس ایک ہی پل میں خدا بخش کا اصل مدعا سمجھ گیا تھا۔ اسے یقیناً لالچ نے گھیر لیا تھا۔

''یہ خاکسار آپ کی یوں تذلیل نہیں سہہ سکتا حضور! آئندہ آپ کا ہر کام میں خود کروں گا۔'' اس نے شہامت کے گھٹنے دباتے ہوئے کہا۔

نواب نے دانستہ خاموشی اختیار کیے رکھی۔

''میں آپ سے ایک اور بات کا ذکر کرنا بھول ہی گیا۔ اف خدایا! اتنی اہم بات میرے ذہن سے کیسے نکل گئی؟'' اس نے پیشانی پر ہاتھ مارا۔ ''کل مجھے آغا میر معتمد الدولہ اور وزیر اعظم نے اپنے پاس طلب کیا تھا۔''

''کہیں انہیں شک تو نہیں ہو گیا کہ ہم یہاں روپوش ہیں۔'' شہامت چونکا۔

''شک..... نہیں حضور! انہیں تو مکمل یقین ہے کہ آپ یہیں ہیں۔ بہت خطرناک مزاج دکھائی دے رہا تھا ان کا۔ میں نے جھوٹے حلف اٹھا کر انہیں کہا کہ نواب صاحب کے بارے میں مجھے کچھ علم نہیں۔ وزیر اعظم نے مجھے انعام

www.pklibrary.com

واکرام کے بھی بہت لالچ دیے۔ لیکن حضور! میں آپ سے نمک حرامی کیسے کرسکتا تھا؟''

خدا بخش کے اس دلدوز بیان پر شہامت علی سوچ میں مبتلا ہوگیا۔ اسے خدا بخش کے لالچ اور کردار کی وجہ سے اس بات کا یقین تو نہ تھا کہ ایسا حقیقتاً بھی ہوا ہوگا تاہم سچائی کا ایک فیصد تناسب بھی معاملہ خاصا سنگین بنا سکتا تھا۔ خدا بخش بالواسطہ یہی کہنا چاہ رہا تھا کہ وہ وزیراعظم کے انعام واکرام ٹھکرا آیا ہے لہٰذا نواب شہامت کی جانب سے کوئی مالی منفعت حاصل نہ ہوئی تو وہ اپنی وفاداری تبدیل بھی کرسکتا ہے۔

''ہمیں تمہاری یہ ادا پسند آئی۔'' اس نے ٹھہراؤ سے کہا۔ ''نمک حلالی تو یوں بھی ہمارا پسندیدہ وصف ہے۔ تمہیں اس خوبی کا انعام ضرور ملے گا۔''

اس یقین دہانی پر خدا بخش کی خوشی دیدنی تھی۔ وہ اِدھر اُدھر کی چند باتوں کے بعد رخصت ہوا تو نواب شہامت کو گہری سوچ وتفکرات نے گھیر لیا۔ حالات کا یہ رخ بے حد ناگوار تھا۔

''کیا بات ہے نواب صاحب! آپ کچھ فکرمند دکھائی دے رہے ہیں؟'' کیتھرائن بھی کمرے میں چلی آئی تھی۔

اسے دیکھتے ہی شہامت علی کی نظریں واپس جھکنا بھول گئیں۔ کیتھرائن کی کھلی زلفیں، کھلتی ہوئی رنگت، نیلگوں آنکھیں اور چست لباس دل میں قیامت برپا کررہا تھا۔

''میں نے پوچھا آپ کچھ فکرمند دکھائی دے رہے ہیں نواب صاحب؟'' اس نے اپنا سوال دہرایا۔

''ہم آپ ہی کے متعلق سوچ رہے تھے کہ مہمان نوازی میں کہیں آپ پر بوجھ نہ بن جائیں۔''

''ایسے گمان سے آپ ہماری توہین کررہے ہیں۔'' وہ آزردہ ہوئی۔

''للہ نہیں! ہمارا یہ مقصد نہیں تھا۔ ہم نے تو محض ایک خدشہ بیان کیا کہ کہیں ہماری وجہ سے آپ دونوں کو پیشہ ورانہ مسائل کا سامنا نہ کرنا پڑ جائے۔ اگر اودھ کے عہدیداران کو ہماری یہاں روپوشی کا علم ہوگیا تو وہ آپ کا ناطقہ بند کردیں گے۔'' شہامت علی کیتھرائن کی آزردگی اور خفگی برداشت نہ کرسکا۔

''ایسا ممکن ہی نہیں۔ معذرت کے ساتھ کہوں گی کہ ریزیڈنٹ کے عملے کی تلاشی کی تاب دہلی کے بادشاہ میں بھی نہیں۔'' وہ صاف گوئی سے بولی۔

''آپ نے ہمارا بہت خیال رکھا ہے۔ اب ہمارا فیض آباد چلے جانا ہی بہتر ہے۔'' شہامت نے نرمی سے کہا۔

''ہرگز نہیں! میں آپ کو کہیں نہیں جانے دوں گی۔ اتنی دقتوں سے تو طبیعت سنبھلی ہے۔ ذرا سی بے احتیاطی کہیں آپ کو پھر بیمار نہ کردے۔'' کیتھرائن نے دھونس جتائی۔

''کیا آپ ہمارے لیے اتنی فکرمند ہیں؟'' شہامت علی نے اسے گہری پُرشوق اور جتاتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔

''جی ہاں! اور میں نے جان سے بات کرلی ہے۔ وہ پوری کوشش کرے گا کہ ریزیڈنٹ کے توسط سے غازی الدین حیدر پر دباؤ ڈال کر آپ کے معاملات بہتر کروائے جائیں۔'' وہ اٹھلائی۔

''اپنوں پر احسان نہیں کیا جاتا نواب صاحب! اپنوں کے مسائل دل سے حل کیے جاتے ہیں۔'' کیتھرائن اس کی نظروں میں پوشیدہ اشارات بھانپ کر شرماتے ہوئے بولی۔

اس کے الفاظ وانداز نے شہامت کو مزید ریشہ خطمی کردیا۔

''ایک بار ہمیں اپنے عہدے پر لوٹ لینے دیجیے۔ اس کے بعد ہم بھی آپ کی شاندار مہمان نوازی کریں گے۔''

''میں اس دن کی منتظر ہوں۔'' کیتھرائن نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ شہامت علی کی نظریں بھی اس پر ہی گڑی تھیں۔

''کاش آپ ہم سے کسی اور وقت، کسی اور حالات اور کسی دوسری حیثیت میں ملی ہوتیں۔'' اس نے ٹھنڈی آہ بھری۔

کیتھرائن کا دل شدت سے دھڑکنے لگا۔ وہ نظریں جھکا کر بولی۔

''یہ تو میرے دل کی بات کہی آپ نے۔ میں بھی اکثر یہی سوچتی ہوں کہ کاش آپ مجھے جان سے پہلے ملے ہوتے۔ میں نے آپ جیسا شاندار اور باوصف مرد کہیں نہیں دیکھا۔''

کیتھرائن کے اس اظہار نے نواب شہامت کا وجود سنسنا دیا۔

''قدرت کی کس قدر ستم ظریفی ہے کہ چاہت کی ڈور میں بندھے دو دلوں کو دنیا کے دو الگ خطوں میں بھیج دیا۔ کاش! آپ ہمیں پہلے مل جاتیں۔ اے کاش!'' وہ بے اختیار آگے بڑھا اور کیتھرائن کا ہاتھ تھام لیا۔

کیتھرائن نے مزاحمت کے بجائے شرما کر سر جھکا لیا۔ شہامت نے اس کی شہ پاکے مرمریں ہاتھ پر اپنے ہونٹ ثبت کردیے اور چند لمحوں بعد ہاتھ نرمی سے چھوڑ دیا۔

''محبت کا یہ شائستہ اور پُرخلوص انداز مجھے ہمیشہ یاد رہے گا۔'' کیتھرائن نے اسے مزید شہ دی۔

''ہم آپ کی چاہت کی بارش میں بھیگ چکے ہیں کیتھرائن صاحبہ! سچ کہتے ہیں آپ سے دوری بالکل گوارا

www.pklibrary.com

نہیں ہے۔'' شہامت علی بے خود ہونے لگا۔

''آپ سے دور کون کم بخت ہو رہا ہے؟ بس آپ دیکھتے جایئے۔ مسائل حل ہونے میں اب دیر نہ لگے گی۔ پھر ہی آپ کی چاہت اور مہمان نوازی کا امتحان لیا جائے گا۔'' وہ معنی خیزی سے بولی۔

''ہم آپ کے ہر امتحان سے گزرنے کے لیے تیار ہیں۔ ایک بار آزما کر تو دیکھیے۔'' نواب شہامت نے بے باکی سے کہا۔

کیتھرائن کے ہونٹوں پر مسکراہٹ رینگ گئی۔

☆☆☆

جان کی کوششیں اور بھاگ دوڑ رنگ لے آئی۔ ریزیڈنٹ نے غازی الدین حیدر سے ملاقات کے بعد معاملہ خوش اسلوبی سے حل کروادیا۔ جان اور کیتھرائن یہ خوش خبری سنانے کے لیے شہامت کے پاس خود آئے۔

''مبارک ہو نواب صاحب! ہم نے اپنا وعدہ پورا کر دکھایا۔'' کیتھرائن نے اسے جوش سے مخاطب کیا۔

''کیا واقعی؟ کیا غازی الدین حیدر نے واقعی معاملہ رفع دفع کر دیا ہے؟'' نواب شہامت بے یقین تھا۔

''جی ہاں!'' جان نے جواب دیا۔ ''ریزیڈنٹ صاحب کی نوازش ہے کہ انہوں نے میری التجا مان لی۔ انہوں نے غازی الدین حیدر کے سامنے آپ کی بھرپور وکالت کی۔''

''لیکن غازی الدین کو تو ہم سے بہت گلے شکوے تھے۔'' شہامت کو یاد آیا۔

''بے شک تھے۔ انہوں نے ریزیڈنٹ صاحب سے بھی یہی شکایت کی کہ شہامت علی ولی عہدی کے سلسلے میں فتنوں کو مزید ہوا دیتے ہیں۔ جواباً ریزیڈنٹ صاحب نے کہا کہ یہ افواہ سازشی عناصر نے پھیلا رکھی ہے۔ بادشاہ کو اس بات کا یقین ہونا چاہیے کہ کمپنی اور گورنر جنرل کی رضامندی کے بغیر کوئی نااہل شخص ولی عہد نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ ایسے میں شہامت علی تنہا کیا کر لیں گے؟''

جان کی اس صاف گوئی اور ریزیڈنٹ کی بیان کردہ تلخ سچائی نے شہامت کو کھسیا دیا تاہم مفاد اور موقع پرستی کسی بھی کھسیاہٹ یا کوفت سے برتر تھی۔

''ہم ریزیڈنٹ صاحب کی معاملہ فہمی کو سلام پیش کرتے ہیں۔ غازی الدین نے انہیں مزید کیا فرمایا؟'' وہ تحمل سے بولا۔

''انہوں نے یہ کہہ کر بات ختم کر دی کہ نواب شہامت علی جہاں بھی روپوش ہیں، واپس چلے آئیں۔ انہیں کچھ کہا جائے گا نہ ہی کوئی پرسش ہوگی۔'' جان نے مسکراتے ہوئے بتایا۔

''اس خوش خبری نے ہمارے مردہ تن میں ایک نئی جان پھونک دی ہے۔ ہم آج ہی قصرِ شہامت لوٹ جائیں گے۔'' وہ آسودگی سے بولا۔

''ایک بار پھر مبارک باد قبول کیجیے نواب صاحب! ہمیں یاد ضرور رکھیے گا۔'' کیتھرائن کہنے لگی۔

''یاد تو انہیں کیا جاتا ہے جنہیں انسان بھول جائے۔ ہم آپ دونوں کے احسانات کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔ کبھی بھی نہیں۔''

''باتیں بنانا تو کوئی آپ سے سیکھے۔'' کیتھرائن کھلکھلا کر ہنس دی۔

شہامت دزدیدہ نظروں سے جان کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کے دل میں یہی خدشہ تھا کہ کہیں وہ بیوی کی اس بے تکلفی پر معترض نہ ہونے لگے۔ جان کے چہرے پر چھائی سنجیدگی اس کے خدشات کو ہوا دینے لگی۔

''آپ ہم سے ملنے ضرور آیئے گا جان صاحب!'' شہامت نے خلوص سے کہا۔ ''آپ کے مسائل اب ہمارے مسائل اور آپ کی پریشانیوں کا حل ہماری ذمے داری ہے۔ ہم دوستوں کے احسان ہمیشہ یاد رکھتے ہیں اور دوستوں کے لیے جان بھی قربان کر سکتے ہیں۔''

جان نے متانت سے سر ہلا دیا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سنجیدگی اور اضطراب تھا۔ شہامت علی نے تشنہ نظروں سے کیتھرائن کو دیکھا اور رخصت ہو کر اپنے محل میں چلا آیا۔ محل میں ضروری معاملات نمٹا کر اس نے کاغذ قلم سنبھال لیا۔

''میرے عزیز دوستو!

قسمت کا پھیر بھی بہت عجیب شے ہے۔ یہ انسان کو عجیب و غریب موڑ دکھاتا ہے۔ ہم اپنی مشکل اور روپوشی کے حالات سے پریشان تھے لیکن ہمیں کیا علم تھا کہ اس پریشانی میں بھی راحت پوشیدہ ہوگی۔ اسی کے توسط سے ہماری ملاقات آپ جیسے بااصول، باضمیر اور بااخلاق دوستوں سے ہوگی جن کا کردار ہمیں اپنا گرویدہ بنالے گا۔ آپ نے ہماری روپوشی، علالت اور پھر محل میں باعزت واپسی کے لیے جو کچھ کیا ہے وہ دائمی طور پر ہمارے دل پر نقش ہو گیا ہے۔ ہم نے بہ وقتِ رخصت آپ سے کہا تھا کہ آپ کے مسائل اب سے ہمارے ہیں۔ اسی سلسلے میں آپ کی خدمت میں چھوٹا سا نذرانہ بھیج رہا ہوں۔ ہمیں علم ہے کہ کالکا پرشاد نامی تاجر کاروبار کے نام پر آپ سے دھوکا کر رہا ہے۔ آپ کو

www.pklibrary.com

جائز منافع بھی حاصل نہیں ہو پارہا۔ ہمارا یہ نذرانہ انہی مسائل کو حل کرنے کی چھوٹی سی کوشش ہے۔ آپ اسے اپنے خلوص کی قیمت یا معاوضہ بالکل نہ گردانیے گا۔ کالکا پرشاد سے جائز منافع ملتے ہی آپ چاہیں تو یہ رقم ہمیں واپس کر دیں۔ ہمیں آپ کی عزتِ نفس، وقار اور خودداری بہرحال بہت عزیز ہے۔"

نواب شہامت نے یہ خط ایک قابلِ اعتماد ملازم کے سپرد کرتے ہوئے اسے دس ہزار کی رقم بھی تھما دی۔ ملازم نے فوری طور پر دونوں اشیا متعلقہ افراد تک پہنچا دیں۔ کیتھرائن اور جان اس نعمتِ غیر مترقبہ پر دنگ رہ گئے۔

"مجھے تو لگا تھا کہ یہ شخص محض ہوائی قلعے تعمیر کر رہا ہے لیکن اس نے تو واقعی ہمارے مسائل کا بیڑا اٹھا لیا ہے۔" جان نے بیوی سے کہا۔

"وضع دار شخص ہے۔ خوددار بھی ہے۔ ایسے لوگ اخلاقیات کے عادی ہوتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اپنی باتوں پر عمل بھی ضرور کرے گا۔" کیتھرائن نے کشادہ دلی سے کہا۔

جان اس کے انداز پر ایک بار پھر مضطرب ہو گیا تاہم کچھ کہنے سے گریز ہی کیا۔

"کیا بات ہے؟ کب سے دیکھ رہی ہوں کہ کسی الجھن کا شکار ہو۔" کیتھرائن نے فوراً اس کی خاموشی بھانپ لی۔

"کیتھی! میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں۔ تمہاری زبان سے کسی دوسرے کی تعریف مجھے سلگا کر رکھ دیتی ہے۔" جان نے صاف گوئی اختیار کرنا ہی مناسب سمجھا۔

"میں بھی تم سے بہت محبت کرتی ہوں جان! بلکہ صرف تمہی سے محبت کرتی ہوں۔ میرا ہر عمل، ہر بات صرف ہمارے رشتے کی بقا اور قرض کا بوجھ اتارنے کے لیے ہے۔ میرا یقین رکھنا! کیتھرائن صرف اور صرف تمہاری ہے۔ وہ تم سے کبھی بے وفائی نہیں کرے گی۔" وہ اٹل انداز میں بولی۔

جان اس کی نظروں میں جھانکتا...... جذبوں کی گہرائی سے پگھلنے لگا۔

"اس قرض کی ادائیگی کے بعد ہم ایک دن کے لیے بھی یہاں نہیں رہیں گے۔ میں لندن اور اپنی اس جنت میں واپس لوٹنا چاہتا ہوں۔"

"ایسا ہی ہوگا۔ بس کچھ عرصے کی بات ہے۔ خداوند نے ہمارے مسائل کے حل کا وسیلہ بنا دیا ہے۔ اب سب کچھ بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔" کیتھرائن نے لگاوٹ سے اس کے شانے پر سر رکھ دیا۔

☆☆☆

شہامت علی کے لیے محل میں وقت گزاری کٹھن ہو چکی تھی۔ کیتھرائن کی یاد کسی بھی لمحے کے لیے دل سے اوجھل ہی نہ ہوتی۔ اس کا ساحرانہ حسن، خوشبودار زلفیں، جذبوں سے چمکتی نیلگوں آنکھیں، پُرشباب سراپا اور شیریں گفتگو کسی بھی پل سکون نہ لینے دیتی۔

ان جذبوں سے مغلوب ہو کر شہامت نے جان کی رہائش گاہ روانگی کا فیصلہ کر لیا۔ اس کا شاندار گھوڑا اور خدام کی تابعداری نے شان ہی مختلف بنا دی تھی۔ مکان کے سامنے رکتے ہی اس کا سامنا خدابخش سے ہو گیا۔ وہ اسے دیکھتے ہی فدویانہ انداز میں آگے بڑھا اور اپنے دونوں ہاتھ رکاب کے پاس پھیلا دیے تاکہ نواب ان ہاتھوں پر قدم رکھ کے نیچے اتر آئے۔

"یہ سب کیا ہے خدابخش؟" اس نے ناگواری سے کہا۔ اسے دیکھتے ہی شہامت کو اس کی موقع پرستی اور لالچ یاد آ گیا تھا۔

"یہ حضور کے لیے اس غلام کی محبت ہے۔ میں نے آپ کی عہدے پر بحالی اور بادشاہ سے معاملات معمول پر آنے کے لیے جانے کتنی منتیں مان رکھی تھیں۔"

"ان منتوں کی ادائیگی کا معاوضہ بہرحال مل جائے گا تمہیں۔ ابھی اہلِ خانہ کو ہماری آمد کی اطلاع دو۔" وہ رعونت سے بولا۔

خدابخش ڈھٹائی سے مسکراتا شہامت علی کے لیے دعائیں کرنے لگا۔

"بس...... ٹھیک ہے! اب جاؤ اندر۔" اس نے بیزاری سے کہا۔

خدابخش کے لبوں پر مسکراہٹ ہنوز چپاں تھی۔ اس نے کیتھرائن کو نواب شہامت کی آمد سے مطلع کر دیا۔ کیتھرائن بے تابی سے مرکزی دروازے تک چلی آئی۔ شہامت پر اسے دیکھتے ہی بے خودی طاری ہونے لگی۔

"میں تو مایوس ہو گئی تھی نواب صاحب!" وہ افسردگی سے بولی۔

"ایسا غضب کیوں کیا آپ نے؟" وہ اس کے چہرے پر نظریں جمائے کہنے لگا۔

"میں سمجھی کہ آپ کو ہماری یاد ہی نہیں آئی۔" کیتھرائن نے مزید افسردگی جتائی۔

"ہم نے آپ سے پہلے بھی عرض کی تھی۔ آپ

www.pklibrary.com

کو بھلا ہی نہ پائیں گے تو یاد کا کیا سوال! آپ کا خیال تو کسی لمحے کے لیے بھی دل سے جدا نہیں ہوا۔ آپ کی مہربانیوں اور عنایات نے ہی تو ہمیں دوبارہ اس مقام پر پہنچایا ہے۔ ورنہ ہم تو ایک تنکے سے بھی زیادہ حقیر ہو چکے تھے۔'' وہ گمبھیر انداز میں بولا۔

''اوہ...... میں بھی کتنی بدتہذیب ہوں۔ آپ کو دروازے پر کھڑا کر چھوڑا ہے۔ اندر آیئے نا!'' اس نے دلار سے کہتے شہامت علی کا ہاتھ تھاما اور اندرونی جانب بڑھ گئی۔

کیتھرائن کا یہ التفات نواب شہامت کو ہواؤں میں اڑانے لگا۔

''جان صاحب کہاں ہیں؟ اس وقت تک تو دفتر سے آجایا کرتے ہیں۔'' اس نے کمرے میں نشست سنبھالتے ہوئے پوچھا۔

''شاید کسی ضروری کام میں پھنس گئے ہوں۔'' کیتھرائن نے ٹالا۔

''کالکا پرشاد والا معاملہ کہاں تک پہنچا؟'' اس نے استفسار کیا۔

''وہ ایک ہٹ دھرم اور بددیانت انسان ہے۔ مجھے اس سے بہتری کی کوئی امید نہیں۔'' کیتھرائن نے منہ بنایا۔

''ہم جان صاحب سے اسی سلسلے میں ملنا چاہتے تھے۔ اس بدنیت انسان کا کوئی نہ کوئی علاج اب بہت ضروری ہے۔'' شہامت نے بڑے جلال سے کہا۔

کیتھرائن کا چہرہ بگڑنے لگا۔

''میں سمجھی کہ آپ مجھ سے ملاقات کے لیے آئے ہیں۔ میری نادانی کا بھی کوئی عالم نہیں۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ آپ کے دل میں بھی وہی تڑپ اور کسک موجود ہے جو میں اتنے روز سے محسوس کر رہی ہوں اور میری وقعت تو دیکھیے کہ سامنے موجود ہونے کے باوجود آپ دوسرے معاملات میں الجھے بیٹھے ہیں۔''

''آپ اتنا منفی کیوں سوچ رہی ہیں کیتھرائن؟ یہ بات آپ بھی جانتی ہیں کہ ہم اپنی بے تابی کس قدر مشکل سے ضبط کرتے ہیں۔'' وہ نرمی سے بولا۔

کیتھرائن کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے۔

''پتا نہیں! مجھے خود بھی اندازہ نہیں ہے کہ میں اتنا منفی کیوں سوچنے لگی ہوں۔ میں تو زندگی کے ہر معاملے میں مثبت، روشن پہلو تلاش کرنے والی عورت تھی۔ اپنے شوہر کی وفادار۔ اس کی محبت میں مخمور لیکن جس روز سے آپ کو دیکھا ہے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ زندگی اپنے مدار سے ہٹ گئی ہے۔ اب میری سوچوں، تفکرات اور خواہشات کا محور آپ کی ذات بن گئی ہے۔ صبح بیدار ہونے سے رات کو نیند کی وادی میں قدم رکھنے تک ہر لحہ آپ کا خیال گھیرے رکھتا ہے۔ سنگھار کروں تو خواہش مچلتی ہے کہ آپ کی نظروں کے سوا کوئی مجھے نہ دیکھے۔ میں ایسی تو نہ تھی نواب صاحب! خداوند کی قسم! میں ایسی بالکل نہ تھی۔ آپ سے ملنے کے بعد یہ تبدیلیاں آگئی ہیں۔ سچ کہتی ہوں یہ تبدیلیاں مجھے پاگل کر دیں گی۔''

کیتھرائن کے اس اظہار اور بے باک انداز نے نواب شہامت کو دم بخود کر دیا۔ خواتین سے تعلقات اور رومان اس کے لیے انوکھی بات نہ تھی۔ ہاں اس بار منفرد تھا تو مقابل کی بے باکی اور اندازِ خود سپردگی۔ کیتھرائن سے پہلے کسی عورت نے بھی اس طرح اسے اہمیت کا احساس نہ دلایا تھا۔

''میری بدتہذیبی کی بھی انتہا دیکھیے۔ آپ کی مہمان نوازی تک کا خیال نہ رہا۔ بس یہیں سے اندازہ لگا لیجیے کہ آپ نے میرے ذہن اور سوچوں کو کس حد تک مفلوج کر رکھا ہے۔'' وہ پژمردگی سے بولی۔

''آپ خود کیوں زحمت کرتی ہیں۔ خدا بخش سے کہہ دیجیے وہ سب انتظامات کر دے گا۔ آپ بس یہیں ہمارے سامنے بیٹھی رہیے۔'' وہ ملائمت سے کہنے لگا۔

کیتھرائن نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا اور خدا بخش کو مختلف لوازمات کا کہنے چل دی۔ اس کی واپسی کے بعد بھی شہامت نے دانستہ فروعی معاملات چھیڑے رکھے۔

''کیا میرے جذبات اتنے ہی بے وقعت ہیں کہ آپ ان کے متعلق کوئی بات بھی نہیں کرنا چاہتے؟'' کیتھرائن نے ایک بار پھر ضبط کھو دیا۔

''آپ کے جذبات کی وقعت کوئی ہم سے پوچھ کر دیکھے کیتھرائن صاحبہ! لیکن ہم کسی وجہ سے ہی خاموش ہیں۔ یقین جانیے ہم بھی آپ کو اپنے نہاں جذبات دکھانا چاہتے ہیں مگر وقت مناسب ہے نہ ہی مقام۔ ہم آپ سے کسی ایسے وقت میں ملاقات کرنا چاہتے ہیں جب آس پاس کوئی ذی نفس نہ ہو۔ کسی ایسے مقام پر جہاں تاروں کا آنچل سمیٹ کر بیٹھیں۔ جہاں ہمارے درمیان سانس لیتی محبت کے علاوہ کہیں کچھ بھی نہ ہو۔ وہ وقت بہت جلد آئے گا۔ پھر ہم آپ کے تمام شکوے دور کر دیں گے۔ آپ کو اس قدر ٹوٹ کر محبت دیں گے کہ دامن تنگ پڑ جائے گا۔''

نواب شہامت کے الفاظ کیتھرائن کی بے چینی کے لیے تریاق ثابت ہوئے۔ اب وہ قدرے پُرسکون ہو گئی

www.pklibrary.com

تھی۔ خدا بخش کے لائے گئے لوازمات خود اس کے سامنے سجاتے ہوئے سادگی سے کہنے لگی۔

''خدام کو بھی اندر بلوا لیجیے۔ مجھے مناسب نہ لگے گا کہ میرے گھر سے کوئی بھوکا پیاسا لوٹے۔''

''ایسا ممکن نہیں! وہ خادم ہیں اور ہم ان کے آقا۔ یہ تفاوت قدرت کا تخلیق کردہ ہے۔ آقا اور غلام میں فاصلہ لحاظ اور ادب بے حد ضروری ہے۔'' اس نے جتاتی ہوئی نظروں سے خدا بخش کو دیکھا تو اس کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ نواب شہامت اب اسے بالواسطہ طور پر مقام و حیثیت یاد دلانے لگا ہے۔

خدا بخش کے ذہن میں ایک شیطانی منصوبہ کلبلانے لگا۔ وہ فی الوقت خاموشی اور انتظار پر عمل پیرا تھا۔ اس کے جاتے ہی شہامت اور کیتھرائن کی گفتگو روزمرہ معمولات اور اشارے کنایوں میں بے تابیوں کے اظہار کی جانب رواں رہی۔

کچھ ہی دیر گزری تھی کہ جان بھی دفتر سے چلا آیا۔ وہ نواب شہامت کو دیکھ کر خوشگوار حیرت میں مبتلا ہو گیا۔ وہ دونوں گرم جوشی سے بغلگیر ہوئے۔

''آپ کے بھیجے گئے تحفے کا بہت شکریہ نواب صاحب!'' جان متانت سے کہنے لگا۔

''شرمندہ نہ کیجیے بھئی! آپ کے احسانات کس قدر قیمتی ہیں آپ کو تو اندازہ ہی نہیں ہے۔ ہم آپ کے تادم مرگ شکر گزار رہیں گے۔'' وہ خلوص سے بولا۔

''درباری معاملات میں کسی قسم کے مسائل تو نہیں اب؟'' جان نے بے نیازی جتائی۔

''بالکل بھی نہیں۔ غازی الدین حیدر تو اس بات پر حیران ہیں کہ ہمارے مراسم ریزیڈنٹ صاحب سے کیسے استوار ہو گئے۔ اب ہم انہیں کیا بتائیں کہ یہ کس مہربان کی کرم نوازی ہے۔'' نواب شہامت نے قدرے ٹھہراؤ سے کہا۔

''تردد نہ کیجیے۔ یہ سب کچھ خداوند کی رضا تھی بس۔'' اس کی بے نیازی برقرار تھی۔ وہ شہامت علی کے چہرے پر تذبذب دیکھ کر اجھن سی محسوس کرنے لگا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ شہامت کوئی اہم بات کرنے یا نہ کرنے کی کشمکش میں مبتلا ہے۔

''کیا بات ہے نواب صاحب! ہمارے مراسم اور بے تکلفی بھی آپ کو متذبذب کیے ہوئے ہے۔ جو بھی کہنا ہے کھل کر کہہ دیجیے۔'' جان بالآخر کہہ اٹھا۔

یہ سن کر شہامت خجل دکھائی دینے لگا۔

''بے تکلفی اور مراسم اپنی جگہ مسلم لیکن رواداری بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ جانے آپ کیا سمجھیں کہ شہامت علی خاں تو جان کو ہی آنے لگا ہے۔ گلے کا ہار بن کر اپنا ہر مسئلہ ہی یہاں لے آتا ہے۔''

''ایسی باتیں، تمہید اور انداز تو خواتین کا ہتھیار ہوتے ہیں نواب صاحب!'' کیتھرائن ہنسنے لگی۔ ''جو بھی کہنا ہے صاف صاف کیوں نہیں کہتے آپ؟''

اس بات پر نواب شہامت مزید خجل ہو گیا۔

''یہ مسئلہ ہمیں نہیں بلکہ غازی الدین حیدر کو درپیش ہے۔ انہیں جب سے اس بات کا علم ہوا کہ ہمارے باہمی مراسم بہت اچھے ہیں۔ وہ بضد ہیں کہ ہم آپ کے توسط سے انہیں ''شاہ جہاں'' لقب استعمال کرنے کی باقاعدہ اجازت دلوا دیں۔'' وہ جھینپتے ہوئے بولا۔

''شاہ جہاں..... لیکن وہ تو مرکز میں.....'' جان اس فرمائش پر الجھ گیا۔

''صرف یہی نہیں وہ اپنی بیگمات کے ناموں کے ساتھ نور جہاں، ممتاز محل اور مہر النساء کا اضافہ کروانے کی کوشش کر چکے ہیں لیکن کمپنی نے اجازت نہ دی۔ اب آپ کے توسط سے وہ اس خواہش کی تکمیل کروانا چاہتے ہیں۔'' شہامت کو خود بھی اس عجیب المنطق بات کا اچھی طرح اندازہ تھا۔

''بادشاہ کی خواہش کا کوئی سبب بھی تو ہو گا؟'' کیتھرائن حیران تھی۔

''سبب کیا کہیے؟ ہماری ذاتی رائے میں تو یہ صرف ایک بچکانہ خوشی کی تکمیل ہے۔ اب ان کی ذہنی کیفیت کا یہیں سے اندازہ کر لیجیے کہ وہ نواب کے بجائے خود کو بادشاہ کہلوانا پسند کرتے ہیں۔ اسی بادشاہت کے بھرم میں انہوں نے اپنے لیے القاب کا انتخاب بھی کر لیا لیکن کمپنی نے واضح کر دیا کہ شاہ اودھ اور ان کی تینوں بیگمات اخلاقی طور پر دہلی کے مغل بادشاہ و بیگمات کی ہم سری کے مجاز نہیں۔ گورنر جنرل بہادر نے صاف اور دوٹوک انداز میں ممانعت کر دی تھی۔'' اس نے تفصیل بتائی۔

''تو کمپنی اور گورنر جنرل کے انکار کے بعد ایک معمولی ملازم کی کیا تاب کہ وہ ان کے فیصلے سے ٹکرا جائے۔'' جان نے بھی صاف گوئی سے کہا۔ ''آپ کو علم ہونا چاہیے کہ میری یہ جسارت کمپنی کے معاملات میں دخل اندازی، غیر قانونی اور قابل پرسش معاملہ ہو گا۔ معذرت کے ساتھ کہوں گا کہ میں کمپنی سے ٹکراؤ کا متحمل ہی نہیں۔''

''ہم آپ کی بات سے متفق ہیں۔ یقیناً ایسا اخلاقی اور قانونی طور پر مناسب ہی نہیں۔'' نواب شہامت نے

قدرے ٹھہراؤ سے کہا اور کچھ یاد [illegible]

''ویسے آپ نے ملازمت کی تبدیلی کے بارے میں کیا فیصلہ کیا ہے؟''

''ابھی تو کچھ نہیں سوچا۔ کمپنی اچھی تنخواہ دے رہی ہے۔ میں اس ملازمت سے مطمئن ہوں۔'' جان نے جواب دیا۔

''مطمئن ضرور ہوں گے لیکن خوش نہیں ہو سکتے۔ آپ اس سے کہیں بہتر تنخواہ اور مراعات کے حقدار ہیں۔ ہم غازی الدین حیدر سے کہہ سن کر آپ کے لیے بہترین عہدہ تفویض کروا سکتے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ وہ ہماری بات بھی نہیں ٹالیں گے۔''

نواب شہامت کی اس پیشکش پر جان مخمصے میں مبتلا ہو گیا۔ وہ شہامت کے سامنے کمپنی کی ملازمت اور اپنے قومی وقار سے دست بردار نہیں ہونا چاہتا تھا لیکن شہامت نے آسائشات، مراعات، اختیار اور دولت کے ایسے سبز باغ دکھائے کہ اسے قائل ہوتے ہی بنی۔ یہ پہاڑ سر کرتے ہی نواب شہامت نے انہیں اپنے قصر پر خصوصی دعوت کے لیے مدعو کیا اور رخصت ہو گیا۔

اپنی شاندار بگھی پر سواری سے قبل اس کی نظر خدا بخش پر پڑی۔ وہ معنی خیز نگاہوں سے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ شہامت علی اسے نظرانداز کر کے گھوڑے پر سوار ہونا ہی چاہتا تھا کہ خدا بخش نے اسے روک لیا۔

''آپ کی یہ ناراضگی اور رکھائی ہمارے کس جرم کی سزا ہے قبلہ نواب صاحب! خاکسار تو آپ کا غلام ہے۔ آپ کے لیے یہاں اپنی نوکری خطرے میں ڈالے ہوئے ہے اور آپ ہیں کہ پروا ہی نہیں کرتے۔'' وہ افسردگی سے کہنے لگا۔

''ہماری وجہ سے تمہاری ملازمت کیسے خطرے میں پڑ گئی خدا بخش؟ ہمارا کمپنی کے معاملات و ملازمین سے کیا واسطہ؟'' نواب شہامت نے نخوت سے جواب دیا۔

''کمپنی کے ملازم کی اہلیہ کو تو آپ سے نسبت ہو گئی ہے نا! بس وہ مجھ سے آپ کے متعلق بہت سوالات کرتی ہیں۔ میں بھی اپنی معلومات اور بساط کے مطابق جواب دے دیتا ہوں۔ اب اگر یہ بات جان صاحب کے علم میں آ گئی تو میرا انجام بہت برا ہو گا۔'' وہ خوفزدہ ہوتے ہوئے بولا۔

''کیتھرائن ہمارے بارے میں کیا سوال کرتی ہیں؟'' شہامت علی ایک ہی پل میں سارا دبدبہ بھول گیا۔

''یہی کہ نواب صاحب کی زوجین کتنی ہیں؟ اسلام تو [illegible] گنجائش بھی فراہم کرتا ہے۔ چار شادیوں کی اجازت ہے۔ کیا نواب صاحب کے لیے ایک اور شادی ممکن ہو پائے گی وغیرہ وغیرہ۔'' مچھلی کو چارا نگلتے دیکھ کر خدا بخش بے نیازی جتانے لگا۔

''پھر تم نے کیا جواب دیا؟'' وہ بے تابی سے پوچھنے لگا۔

''اجی چھوڑیے حضور! جانے دیجیے۔ آپ آقا...... میں غلام...... آپ عرش...... میں فرش...... ایسی باتیں بھلا میں آپ سے کیسے کہہ سن سکتا ہوں؟'' اس نے کچھ دیر پہلے کی ہزیمت کا بھرپور بدلہ چکایا۔

نواب شہامت کو اب کسی طور قرار نہ تھا۔ خدا بخش نے گویا اس کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ اسے ایک ہی لمحے میں احساس ہو گیا کہ خدا بخش بہت کارآمد شخص ہے۔ وہ کیتھرائن کا ہم راز ہی نہیں ہمدرد بھی ہے لہٰذا اس سے تعلقات میں خوشگواریت لازم ہے۔

''ہم تمہارے احسانات کیسے فراموش کر سکتے ہیں؟ بہت کچھ سوچ اور تیار کر رکھا ہے تمہارے لیے۔ بس تم کل کسی وقت ہم سے قصر میں آ کر ملو۔'' نواب شہامت نے چارا ڈالا۔

''اب آپ اتنا اصرار کر رہے ہیں تو چلا آؤں گا۔'' وہ بے نیازی سے بولا اور واپس اندر چل دیا۔

☆☆☆

اگلے روز نواب شہامت بے تابی سے خدا بخش کا منتظر تھا۔ وہ کیتھرائن کے شب و روز کی نئی مصروفیات اور اپنی ذات سے وابستہ جذبات کسی دوسرے فرد سے جاننے کے خمار میں مبتلا ہو رہا تھا۔ خدا بخش کے آتے ہی اس کی مناسب ترین مہمان نوازی کی گئی۔

''کل ہمیں کیتھرائن صاحبہ کی طبیعت کچھ منتشر لگی تھی۔ سب خیریت تو ہے نا ویسے؟'' نواب شہامت نے گفتگو کا آغاز کیا۔

''نہیں! خیریت ہی تو نہیں ہے حضور! بیگم صاحبہ اور جان صاحب کے جھگڑے ان کا ذہنی سکون غارت کر رہے ہیں۔ ایسے میں کوئی پُرسکون اور تروتازہ نظر آئے بھی تو کیسے؟'' وہ افسردگی سے بولا۔

''جھگڑے...... وہ کس بات پر؟ ان دونوں کی ذہنی ہم آہنگی تو بے مثال پائی ہے ہم نے۔'' شہامت متجسس ہوا۔

''زیادہ دور کیا جانا حضور! کل کی بات ہی لے لیجیے۔ کسی دعوت میں شرکت پر بہت تکرار ہوئی۔ جان صاحب دعوت میں شریک نہیں ہونا چاہتے کیونکہ ریزیڈنٹ بہادر نے اپنے اہلکاروں کو نوابی امراء اور روساء سے میل جول کی

www.pklibrary.com

www.pklibrary.com

ممانعت کر رکھی ہے۔ دوسری جانب کیتھرائن صاحبہ بضد تھیں کہ اس دعوت میں شرکت ہر حال میں کرنی ہوگی۔'' وہ سرگوشی میں بتانے لگا۔

''پھر حتمی فیصلہ کیا ہوا؟'' شہامت نے پہلو بدلا۔

''حتمی فیصلے سے قبل مزید تلخ کلامی ہوئی تھی۔ اف..... توبہ.....'' وہ اپنے کانوں کی لویں چھونے لگا۔

''جان صاحب نے غصے سے کہا کہ کیتھرائن نواب صاحب کی ذات میں کچھ زیادہ ہی دلچسپی لینے لگی ہیں۔ ان کے لیے اپنے امورِ خانہ شوہر اور پیشہ ورانہ اخلاقیات کو نظر انداز کرنے لگی ہیں۔ جواب میں کیتھرائن صاحبہ کو بھی غصہ آ گیا۔ وہ کہنے لگیں کہ جان صاحب اگر دعوت میں شریک نہیں ہونا چاہتے تو نہ سہی۔ وہ تو بہر صورت شرکت کریں گی۔ بات بڑھتی گئی' تکرار ہوتی رہی۔ جان صاحب نے طیش میں یہاں تک کہہ دیا کہ اگر تم میری حکم عدولی کرو گی تو میں تمہیں جان سے مار دوں گا۔ یہ سن کر کیتھرائن صاحبہ خاموش ہو گئیں۔ غالباً انہیں احساس ہو گیا کہ معاملہ نہایت خرابی کی طرف گامزن ہے۔ انہوں نے نرمی اختیار کر لی اور شوہر کو سمجھانے لگیں کہ اس طرح دعوت رد کرنے سے انگریز قوم کی شائستگی پر حرف آئے گا۔ جان صاحب کو یہ بات سمجھ آ گئی۔ انہوں نے بھی نرمی اور مصلحت اختیار کر لی۔''

خدا بخش کے یہ انکشافات قدرے ہولناک سہی لیکن شہامت علی کا دل گدگدانے لگے تھے۔ اپنی ذات کے لیے کیتھرائن کی دلچسپی ہی کیا کم مخمور کرتی تھی کہ اب اس کا شہامت کے لیے شوہر سے جھگڑنے کا علم ہو گیا تھا۔ وہ اس بے باکی' دلیری اور جنون پر خود کو نہایت معتبر محسوس کرنے لگا۔ اسے خدا بخش کو ہاتھ میں رکھنے کا فیصلہ بالکل درست محسوس ہونے لگا۔

دوسری جانب خدا بخش بھی اس کی ذہنی کیفیت کسی کھلی کتاب کی طرح پڑھ رہا تھا۔ اس نے گزشتہ روز ہونے والی معمول کی گفتگو اور صلاح مشورے کو بڑی مہارت سے اپنا مطلوبہ رنگ دے کر نواب شہامت پر اپنی افادیت ثابت کر دی تھی۔

''میں اب چلتا ہوں حضور! جان صاحب کے مزاج کا کچھ پتا نہیں، خفا ہو گئے تو ملازمت کے درپے بھی ہو سکتے ہیں۔ غریب آدمی ہوں۔ کیسے گزر بسر کروں گا؟'' وہ مسکینیت سے بولا۔

''فکر مند کیوں ہوتے ہو؟ ہمارے ہوتے ہوئے تم پر کبھی آنچ بھی نہیں آئے گی۔ ہمارے قصر کے دروازے تمہارے لیے ہمیشہ کھلے ہیں۔ ملازمت ہو یا کوئی ذاتی نوعیت کا کام۔ تم بلا جھجک ہمارے پاس چلے آنا۔'' نواب شہامت نے اسے انعام و اکرام سے نوازتے ہوئے کہا۔

''بہت شکریہ حضور! خاکسار آپ کے لیے ہمیشہ دعا گو رہے گا۔ پروردگار آپ کا اقبال سدا بلند رکھے۔''

''ہمیں ہر چھوٹی سے چھوٹی بات کی بھی اطلاع دیتے رہنا۔'' شہامت علی نے اسے ایک بار پھر یاد دہانی کروائی اور رخصت کر دیا۔

☆☆☆

دعوت کے روز نواب شہامت کی بے چینی اور اضطراب دیدنی تھا۔ اس نے انتظامات میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔ اس دعوت کا اہتمام ایک بارہ دری میں کیا گیا تھا جو مصنوعی جھیل کے عین وسط میں استادہ تھی۔ جھیل کی خوبصورتی بھی مسحور کن تھی۔ اس کے شفاف پانی میں دیدہ زیب رنگوں اور مختلف قد و قامت کی مچھلیاں تیرتی دکھائی دیا کرتیں۔ کچھ مچھلیاں تو ایک سے ڈیڑھ فٹ تک جسیم تھیں۔ اسی جھیل کے سامنے قصرِ شہامت تھا جسے رنگ برنگے پھولوں اور خوش نما گھاس نے مزید دلفریبی عطا کی ہوئی تھی۔

کیتھرائن کی آمد سہ پہر کے بعد ہوئی۔ جان اس کے ہمراہ نہیں تھا۔ کیتھرائن کی تیاری' جامہ زیبی اور سنگھار نے شہامت علی کو دم بخود کر دیا۔ وہ بے اختیار اس کی جانب بڑھ گیا۔

''آپ کی آمد ہمارے لیے باعثِ افتخار ہے کیتھرائن صاحبہ! ہم کن الفاظ میں آپ کا شکریہ ادا کریں؟''

''آپ کی دعوت میں شرکت میرے لیے بہت اعزاز کی بات ہے۔ میں ہندوستانی تہذیب کو بہت قریب سے دیکھنا چاہتی تھی۔ شکریہ تو آپ کا ادا کرنا چاہیے کہ آپ نے آج یہ موقع فراہم کر دیا۔'' وہ خدمت گار خواتین اور خواجہ سراؤں کے منظم انداز و تابعداری دیکھ کر خوش ہو رہی تھی۔

''جان صاحب بھی اگر آپ کے ساتھ آتے تو ہمیں مزید خوشی ہوتی۔'' شہامت علی نے مروتاً کہا۔

''وہ اپنی پیشہ ورانہ مصلحتوں اور مسائل میں الجھا ہے۔ میرے ساتھ آنے کا وقت ہے نہ تمنا۔'' کیتھرائن نے بیزاری سے کہا۔

''کمال ہے۔ آپ جیسی دلکش خاتون کے سامنے تو ستارے اپنی چال بھول جائیں اور انہیں تمنا ہی نہیں۔'' شہامت بے ساختہ بولا۔

''یہ تو آپ کا حسن ظن ہے نواب صاحب! اب ہر شخص آپ جیسا اہلِ نظر تو نہیں ہوتا نا۔'' کیتھرائن شرما گئی

www.pklibrary.com

اور پھر اردگرد دیکھتے ہوئے بولی۔

''کیا یہیں کھڑے رہ کر باتیں کرنے کا ارادہ ہے؟ مجھے یہاں کی سیر نہ کروائیے گا؟''

''یہ سارا انتظام ہم نے آپ کے لیے ہی تو کیا ہے۔ اس محفل کی جان اور ہمارے دل کی رونق صرف آپ ہیں۔ چلیے چلتے ہیں۔ آج ہم آپ سے اپنے دل کی بہت سی باتیں کرنا چاہتے ہیں۔''

شہامت اس کے انداز پر فریفتہ ہوتے ہوئے اسے جھیل کے کنارے موجود بجرے کی جانب لے آیا۔ ملاحوں نے اسے دیکھتے ہی بجرا کھول دیا۔ شہامت کیتھرائن کا ہاتھ تھامے بجرے پر سوار ہوگیا۔

''بہت خوبصورت جگہ ہے یہ!'' وہ پھولوں اور گھاس کو دیکھتے ہوئے بولی۔

''لیکن آپ سے کم۔'' شہامت نے اس کا ہاتھ اب تک تھام رکھا تھا۔

بجرا حرکت کرتا اب جھیل کے ساحل سے آگے بڑھ رہا تھا۔

''یہ بارہ دری کس قدر شان دار ہے!'' کیتھرائن نے خواب ناک سے انداز میں کہا۔

''ہم پھر یہی کہیں گے کہ آپ سے زیادہ بہرحال نہیں۔'' شہامت نے اس کے ہاتھ پر ہونٹ ثبت کیے۔ وہ اپنے علاقے اور ملازمین کی وجہ سے بالکل بے خوف تھا۔ کیتھرائن اس جسارت پر شرما گئی۔

''اس قدر خوبصورتی دیکھ کر میرا دل چاہنے لگا ہے کہ کاش یہیں رک جاؤں۔''

''تو رک جایئے نا! آپ کو جانے کے لیے کون کافر کہہ رہا ہے؟'' نواب نے ایک اور جسارت کی۔

کیتھرائن نے اس کے شانے پر سر رکھ دیا۔ اس کی زلفیں نواب شہامت کا چہرہ گدگدانے لگیں۔ بارہ دری تک کا سفر خاموشی سے بیت گیا۔ بارہ دری کی سیڑھیوں کے ساتھ بجرا رکتے ہی شہامت علی نے کیتھرائن کا بازو تھام کر سیڑھیوں تک اتار دیا۔ کیتھرائن ہر ایک شے کو بہت خواب وحسرت سے دیکھ رہی تھی۔ بارہ دری کی دیواروں سے پھوٹتی موسیقی کا ماخذ اسے سمجھ ہی نہ آرہا تھا۔

''یہ جگہ کسی پرستان سے کم نہیں ہے۔'' وہ بے ساختہ بولی۔

''آج سے پہلے یہ صرف سنگی دیواروں کا ایک مجموعہ تھی۔ پرستان تو اسے آپ کی موجودگی نے بنایا ہے۔'' نواب کی نظریں اس کے سراپا سے الجھی تھیں۔

''کاش! میں ہمیشہ کے لیے یہاں رہ سکتی!'' وہ حسرت سے کہنے لگی۔

''تو رہ جایئے نا! ہم خود بھی آپ کو جانے نہیں دینا چاہتے۔'' شہامت علی اس کے کندھے پر بازو حمائل کیے آگے بڑھا۔

''میرے قدموں میں اخلاقیات اور شادی کی بیڑیاں ہیں نواب صاحب!'' اس نے بے بسی جتائی۔

''ہمیں اس لقب سے تو ہر کوئی پکارتا ہے۔ آپ ہمارا نام لیا کیجیے۔ آپ کی خوبصورت آواز میں اپنا نام سننے کی بہت تمنا ہے۔'' شہامت نے اس کے کندھے پر گرفت سخت کی۔

''آپ کس قدر نفیس اور احساس مند ہیں شہامت! کاش آپ مجھے جان سے پہلے ملے ہوتے، زمانے بھر سے ٹکرا کر آپ کو اپنا بنا لیتی۔'' وہ دلار سے بولی۔

''ہم اب بھی صرف آپ ہی کے ہیں۔ اور اگر آپ اس شادی سے خوش نہیں تو ہم ہر قدم پر آپ کے ساتھ کھڑے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ شریک حیات سے ذہنی ہم آہنگی یا محبت برقرار نہ رہے تو زندگی بہت کٹھن ہوجاتی ہے۔'' اس نے بھی افسردگی جتائی۔

''کیا آپ بھی اپنی بیوی سے خوش نہیں ہیں؟'' کیتھرائن کی آنکھیں چمکیں۔

''بیوی نہیں بیویاں کہیے۔ ہم نے دو شادیاں کی ہیں لیکن سکون اور اطمینان کسی ایک سے بھی نصیب نہیں ہوا۔'' وہ گفتگو کرتے کرتے ایک نشست گاہ میں آچکے تھے۔

شام کے سائے پھیلنے کا آغاز ہوتے ہی وہاں کافوری شمعیں روشن کردی گئیں۔ نشست گاہ کا ماحول بے حد خوابناک تھا۔ ایک جانب مے نوشی کے لوازمات دھرے تھے۔

''اپنے ملازمین اور خادماؤں کو کہیں دور بھیج دیجیے شہامت! ساقی گری میں خود کروں گی۔ میں ان خوبصورت لمحات میں کسی کی موجودگی برداشت نہیں کرسکتی۔'' کیتھرائن نے اس کا ہاتھ سہلایا۔

شہامت علی حواس کھونے لگا۔ اس نے سبھی ملازمین کو رخصت کردیا۔ کیتھرائن نے نہایت مہارت سے دو جام تیار کیے اور ایک گھونٹ لے کر اپنا گلاس اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ شہامت اس ادا پر لٹو ہوگیا۔ اس نے ایک ہی گھونٹ میں جام خالی کیا اور کیتھرائن کو اپنی آغوش میں بھینچ لیا۔ وہ اس لمحے کے لیے بالکل تیار تھی۔ اس نے پہلے گریز کا مظاہرہ کیا اور چند لمحوں بعد مکمل خود سپردگی پر آمادہ دکھائی دینے لگی۔ شہامت علی اس کی اداؤں سے دیوانہ ہونے لگا تاہم

www.pklibrary.com

اس کی یہ دیوانگی کیتھرائن کے آنسوؤں کی نمی سے سرد ہوگئی۔

''کیا ہوا کیتھی؟ تم رو کیوں رہی ہو؟'' وہ تڑپ اٹھا۔

''آپ مجھے پہلے کیوں نہ ملے شہامت! خداوند کی قسم، آپ جیسے مرد کی ہی چاہ کی تھی میں نے۔ لیکن قسمت نے مجھے جان سے شادی کی زنجیر میں باندھ دیا۔'' وہ مزید آنسو بہانے لگی۔

''یہ زنجیر ٹوٹ بھی سکتی ہے۔ تم ہمت تو کرو۔ میں ہر قدم پر تمہارا ساتھ دوں گا۔'' اس نے شہ دی۔

''کیسے ہمت کروں؟ وہ کمپنی کا ملازم ہے۔ بااختیار ہے۔ مجھے اس کے مزاج کا بہت اچھی طرح اندازہ ہے۔ اگر اس کی رضامندی کے خلاف علیحدگی اختیار کرنے کی کوشش کی تو وہ مجھے نہیں بلکہ آپ کو بھی نقصان پہنچائے گا۔ زندگی تک چھین سکتا ہے وہ آپ کی۔'' وہ خوفزدہ تھی۔

''ہر انسان کی کوئی نہ کوئی کمزوری ضرور ہوتی ہے۔ جان بھی کسی مقام پر تو کمزوری دکھائے گا۔'' اس نے راہ سجھائی۔

کیتھرائن اس کی بات پر سوچ میں مبتلا ہوگئی اور لمحاتی تذبذب سے کہنے لگی۔

''ہاں! ایک کمزوری تو ہے۔ وہ لالچی شخص ہے۔ اگر اسے علیحدگی کے لیے کوئی لالچ دیا جائے تو بات بن سکتی ہے۔''

''اچھا یاد کروایا! ہم کالکا پرشاد کے پاس پھنسی ہوئی رقم بھی اسے کل ہی واپس دلواتے ہیں۔'' شہامت نے سر ہلایا۔

''صرف اتنی سی رقم سے کیا ہوگا؟ وہ تو اس سے مس نہ ہوگا۔'' کیتھرائن نے منہ بنایا۔

''ہم اسے ذاتی طور پر رقوم سے نواز دیں گے۔ غازی الدین حیدر سے بھی انعام واکرام دلوائیں گے۔ تم بالکل بے فکر رہو۔'' وہ اسے تشنہ اور پُرہوس نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

''ٹھیک ہے! ایک بار یہ کانٹا راستے سے ہٹ گیا تو ہماری شادی میں کوئی رکاوٹ نہیں رہے گی۔'' کیتھرائن نے اس کی نظروں میں پوشیدہ پیغام بھانپ کر مسکراتے ہوئے حوصلہ افزائی کی۔

شہامت علی نے سرشاری سے پیش قدمی کا آغاز کردیا۔

☆☆☆

کیتھرائن اور جان اپنی مخصوص نشست گاہ میں بیٹھے تھے۔ جان کچھ دیر پہلے ہی دفتر سے لوٹا تھا۔ اس کا مزاج کافی خوشگوار دکھائی دے رہا تھا۔ کالکا پرشاد نے اسے دو لاکھ روپے ادا کیے تھے۔ اس بھاری بھرکم رقم نے ہی اسے سرشار کر رکھا تھا۔ کیتھرائن کو دھیمے لہجے میں اس وصولی کے متعلق بتاتے ہوئے وہ بیرونی سمت کسی آہٹ سے چونک گیا۔

''وہ باہر ہی ہے۔ تم شروع ہوجاؤ۔'' اس نے کیتھرائن کو آنکھ سے مخصوص اشارہ کیا۔

''جان! تمہیں شہامت سے معذرت کرنی چاہیے۔ کل انہوں نے دعوت میں تمہیں بہت یاد کیا۔'' وہ شوہر کی آنکھ کا اشارہ اور خدا بخش کی موجودگی بھانپ گئی تھی۔

''خوب! وہ شخص ایک ہی روز میں نواب صاحب سے شہامت ہوگیا تمہارے لیے۔'' جان نے غصے سے کہا۔

''کل دعوت میں کیا جانے والا اہتمام اور کھانا شاندار تھا۔ وہ واقعی ایک نفیس اور مہذب شخص ہے۔'' کیتھرائن نے اس کی بات نظر انداز کی۔

''مجھے ان مقامی لوگوں کی نفاست اور تہذیب سے کچھ لینا دینا نہیں ہے۔ یہ سب مطلبی، خود پرست اور خوشامدی لوگ ہیں۔'' وہ چلایا۔

''تمہاری شائستگی اور انسان دوستی کہاں گئی جان؟ مجھے تو لگتا ہے تم وہ شخص ہی نہیں جس سے میں نے شادی کی تھی۔ افسوس ہوتا ہے اب اپنے انتخاب پر۔'' کیتھرائن نے تاسف سے کہا۔

''خوب سمجھتا ہوں کہ اب اس انتخاب پر افسوس کیوں ہونے لگا ہے۔ جب نئی منزلیں نظر آنے لگیں تو سابقہ پڑاؤ بوجھ ہی محسوس ہونے لگتا ہے۔ تمہاری وجہ سے میں یہاں آیا۔ تمہارے انکل کے دکھائے خوابوں نے مجھے بہکایا۔ تمہارے کہنے پر میں نے معاشی قدم اٹھائے۔ کس قدر احمق تھا میں۔ آنکھیں بند کیے تم پر اعتبار کرتا رہا اور تم مجھے اس کا یہ صلہ دے رہی ہو کہ اس دو ٹکے کے انسان کو مجھ پر فوقیت دینے لگی ہو۔''

''وہ دو ٹکے کا شخص اقدار و اخلاقیات میں تم سے کہیں بہتر ہے جان!'' کیتھرائن نے بڑے اطمینان سے چوٹ کی۔ ''اور رہی بات میرے مشوروں پر عمل یا نقصان کی تو میں وہ بھی پورا کردوں گی۔''

''کیسی اقدار اور کیسی روایات؟ یہ کہاں کی اخلاقیات ہے کہ میں نے جس شخص کو بے سروسامانی میں پناہ دی، بیماری میں مکمل علاج کروایا، اس کے سیاسی تنازعات حل کروائے، اب وہی میرے گھر میں نقب لگا رہا ہے۔ میں اسے قتل کردوں گا۔ زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ مجھے علم ہے کہ تم اسی کی شہ پر یہ نقصان وغیرہ پورا کرنے کی بات کر رہی ہو۔ میں سچ کہتا ہوں زمین میں گاڑ دوں گا اسے۔'' اس کا حلق خراش آلود ہونے لگا۔

www.pklibrary.com

''اس ذہنی معیار کے ساتھ رہنا میرے لیے ممکن نہیں اب۔ ہم دونوں کے درمیان خلیج گہری ہوتی جارہی ہے۔ تم لندن لوٹ جاؤ جان! اپنے قرض ادا کرو اور کسی بہتر لڑکی سے شادی کر کے زندگی بسر کرو۔ ہم دونوں شاید ایک دوسرے کے لیے بنے ہی نہیں تھے۔'' کیتھرائن نے نرمی سے کہا۔

جان تن فن کرتا اٹھا اور راستے میں آنے والی ہر شے کو ٹھوکریں مارتا کمرے سے باہر نکل گیا۔ خدا بخش اسے باہر آتے دیکھ کر فوراً ایک آڑ میں ہو گیا۔ کیتھرائن کے ہونٹوں پر مسکراہٹ رینگ گئی۔ اسے یقین تھا کہ نواب شہامت تک یہ بات پہنچتے ہی بقیہ رقوم کی وصولی بھی بہت جلد ہو جائے گی۔

☆☆☆

کیتھرائن کا یہ اندازہ بالکل درست ثابت ہوا۔ خدا بخش نے اپنے مفاد اور انعامات کے لالچ میں مکمل واقعہ مرچ مسالے کی آمیزش سے نواب شہامت کے گوش گزار دیا۔ شہامت کی خوشی دیدنی تھی۔ اسے گزشتہ روز کاکا پرشاد سے ہونے والی ملاقات کی کوفت بھی فراموش ہو گئی۔ کاکا نے رقم کی یک مشت ادائیگی سے انکار کر دیا تھا۔ اس کی بیان کردہ کاروباری مصلحتیں اور مسائل بھی نظر انداز نہیں کیے جاسکتے تھے۔ نواب شہامت نے عجلت اور اپنی ذہنی پراگندگی کے زیر اثر دو لاکھ کی رقم ذاتی طور پر ادا کر دی۔ اس نے کاکا پرشاد کو اس بات کا پابند کر دیا کہ رقم کو وصولی ہی کا ایک حصہ قرار دے۔ وہ کیتھرائن پر اپنے اختیارات اور خلوص کی دھاک بٹھانا چاہتا تھا جس میں ایک ہی روز بعد کامیابی نظر بھی آنے لگی تھی۔

شہامت علی نے کیتھرائن کی مزید توقعات پوری کرنے اور اس کی نظروں میں سرخروئی حاصل کرنے کے لیے جان کی ملاقات غازی الدین حیدر سے طے کروا دی۔ اس کے پیش نظر جان کے لالچ کی تسکین اور کیتھرائن تک جلد از جلد رسائی تھا۔ جان وقتِ مقررہ پر شاہی قصر میں پہنچ گیا۔ وہ قدرے خاموش اور مضطرب دکھائی دے رہا تھا۔ اسے وسیع دالان کے سرے پر دو مربع گز اور کئی فٹ بلند شاہی تخت دکھائی دیا۔ وہ شاہی رعب داب سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ قیمتی مسند کی دیدا اس سے سوا تھی۔ غازی الدین حیدر کی حکمت اور کروفر بھی خوب تھا۔ تخت کے بالائی حصے میں ایک مربع شامیانہ تنا نظر آرہا تھا۔ اس کے چوبی ڈھانچے پر طلائی خول پیوست تھا۔ شامیانے کی چوبیں بے شمار انمول جواہر سے مزین تھیں۔

کیا آپ
لبوب مُقوّی اعصاب
کے فوائد سے واقف ہیں؟

کھوئی ہوئی توانائی بحال کرنے اعصابی کمزوری دور کرنے تھکاوٹ سے نجات اور مردانہ طاقت حاصل کرنے کیلئے کستوری عنبر زعفران جیسے قیمتی اجزاء والی بے پناہ اعصابی قوت دینے والی لبوب مُقوّی اعصاب ایک بار آزما کر دیکھیں۔ اگر آپ کی ابھی شادی نہیں ہوئی تو فوری طور پر لبوب مُقوّی اعصاب استعمال کریں۔ اور اگر آپ شادی شدہ ہیں تو اپنی زندگی کا لطف دوبالا کرنے یعنی ازدواجی تعلقات میں کامیابی حاصل کرنے کیلئے بے پناہ اعصابی قوت والی لبوب مُقوی اعصاب ٹیلیفون کر کے گھر بیٹھے بذریعہ ڈاک وی پی VP منگوالیں فون صبح 10 بجے تا رات 9 بجے تک

المسلم دارالحکمت (رجسٹرڈ)
(دیسی یونانی دواخانہ)
ضلع وشہر حافظ آباد پاکستان

0300-6526061
0301-6690383

آپ صرف فون کریں۔ آپ تک لبوب مقوی اعصاب ہم پہنچائیں گے

www.pklibrary.com

نواب شہامت اور جان نے درباری قاعدے کے مطابق اپنے ہاتھوں میں رومال پر رکھی پانچ اشرفیاں تسلیمات بجالاتے غازی الدین حیدر کو پیش کردیں۔ بادشاہ نے بھی رواج کے مطابق ان اشرفیوں کو ہاتھ سے مس کرتے ہوئے قبولیت کا عندیہ دے دیا۔ شہامت علی نہایت اعتماد سے تخت کی بائیں سمت کھڑا ہوگیا۔ وزیر معتمد الدولہ نے ان سے اشرفیاں لے کر تخت کے عقب میں ایک مخصوص مقام پر لے جا کر جمع کروادیں۔ دائیں سمت کھڑا جان ہر ایک شے کا بغور جائزہ لے رہا تھا۔

''اپنے مہمان سے متعارف نہیں کرواؤ گے ہمیں شہامت علی؟'' پچاس سالہ غازی الدین حیدر نے نخوت سے کہا۔

''کیوں نہیں حضور والا! میں انہیں آپ ہی سے تو ملوانے لایا ہوں۔ یہ جان مل ہیں۔ ریزیڈنٹ صاحب کے بہت باعتماد اہلکار۔ آپ یوں جانیے کہ ہماری باہمی رنجشیں رفع کروانے میں ان کا بھی بہت ہاتھ رہا ہے۔ یہ بادشاہ سلامت کی دید اور شاہی زندگی کی جھلک دیکھنے کے لیے بے تاب تھے لہٰذا ہم انہیں حضور کی دید سے فیض یاب کروانے چلے آئے۔''

''خوب، بہت خوب! کمپنی بہادر کا عملہ معمولی تو ہرگز نہیں ہوسکتا۔'' غازی الدین نے جان کو بغور دیکھا۔ اس لمحے اسے القابات کے متعلق اپنی تشنہ خواہشات یاد آگئی تھیں۔

''اس کرم فرمائی کے لیے شکریہ بادشاہ سلامت!'' جان نے بڑی متانت سے سر جھکایا۔

''اگر یہاں کبھی کسی بھی قسم کا مسئلہ درپیش ہو تو ہمیں ضرور آگاہ کرنا۔ ہمیں ایک بہادر اور ایماندار قوم کے نمائندے کی مدد سے بہت خوشی ہوگی۔'' بادشاہ اپنی خواہشات کے تعاقب میں ذاتی اور قومی وقار پس پشت ڈال چکا تھا۔

''مسئلہ نہیں مجھے تو مسائل درپیش رہے ہیں۔ بعض ہندوستانیوں کے کردار نے بہت مایوس کیا ہے۔'' جان نے افسردگی سے سر جھکالیا۔

''ہمیں فوراً وضاحت سے بتایا جائے۔ ہم اس معاملے کی چھان بین کروائیں گے۔'' غازی الدین کی تیوری شکن آلود ہوگئی۔

جان نے ترچھی نظروں سے نواب شہامت کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ متغیر اور سانس واضح طور پر خشک دکھائی دے رہے تھے۔ جان اس کی حالت سے محظوظ ہوتے بھول ہی گیا کہ وہ بادشاہ کے سوال پر خاموش رہ کر آداب شاہی کی خلاف ورزی کا مرتکب ہو رہا ہے۔ وزیر معتمد الدولہ اس کے قریب آیا اور دھیرے سے کہنے لگا۔

''آپ آداب شاہی سے واقف نہیں شاید۔ بادشاہ سلامت کے سوالات کو خاموش رہ کر نظر انداز کرنا ناقابلِ معافی جرم ہے۔ آپ کو اپنی بات کی وضاحت کرنی ہی ہوگی۔ اگر آپ کسی بااثر شخصیت کے ملوث ہونے سے خائف ہیں تو ہر خدشہ دل سے نکال دیجیے۔ ہمارے بادشاہ سلامت اپنی ریاست میں ناانصافی کے سخت مخالف ہیں۔ وہ آپ کے مجرم کو سخت سے سخت سزا دلوائیں گے۔''

جان نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیری اور دھیرے سے کہنے لگا۔

''میں بنیادی طور پر ایک اصول پرست اور انسان دوست شخص ہوں۔ میں نے ایک معزز شخص کی مشکلات میں بے لوث ہو کر مدد کی اور اب یہ عالم ہے کہ وہ میرے لیے ناسور بن گیا ہے۔ میری زندگی تباہ کرنے کے درپے ہوگیا ہے۔''

''ہمارے شیر خدا حضرت علیؓ کا فرمان ہے کہ تم جس پر احسان کرو اس کے شر سے بچو۔'' غازی الدین کہنے لگا۔ ''بہرحال اپنے محسن سے یہ سلوک نہایت قبیح عمل ہے۔ ہمیں اس کے نام سے مطلع کیا جائے تاکہ ہم اس ننگِ انسانیت کو عبرتناک سزا دے سکیں۔''

بادشاہ کے اس جواب پر شہامت کی دگرگوں ہوتی حالت سے لطف اندوز ہوتے جان نے اپنی مسکراہٹ دبائی اور سنجیدگی سے کہنے لگا۔

''ایک طرف اس شخص کی احسان فراموشی ہے تو دوسری جانب یہ حقیقت بھی ناقابل تردید ہے کہ اس نے میری ذات پر بھی کچھ احسانات کر رکھے ہیں۔ وہ اخلاقیات روند کر احسان فراموش ہوگیا ہے لیکن مجھے تو یاد ہے نا! میرا ظرف اجازت ہی نہیں دے رہا کہ میں بھی اسی کا شعار اپناؤں۔ میں بہرحال کچھ عرصے تک اس کا چلن دیکھوں گا۔ اگر وہ مجھے نقصان پہنچاتا رہا تو پھر میں بھی سب کچھ بھول کر اسے آپ کے کٹہرے میں لا کھڑا کروں گا۔''

جان کے اس جواب، منطق اور ظرف نے غازی الدین کو بہت متاثر کیا۔ وہ اسے پسندیدہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

''آفرین! صد آفرین! ہم یونہی کمپنی بہادر کے عملے اور قومی صفات کے دلدادہ نہیں ہیں۔'' وہ اسے سراہتے ہوئے معتمد الدولہ کی طرف متوجہ ہوا۔

''جان کو خلعتِ فاخرہ اور پانچ ہزار اشرفیاں نوازی

www.pklibrary.com

جائیں۔''

یہ سن کر جان کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ پانچ ہزار اشرفیوں کو انگلستانی رقم میں منتقل کرتے ہوئے وہ اپنے قرض میں کمی کا ذہنی تخمینہ لگا رہا تھا۔ بادشاہ کے حکم پر فوری عمل ہو گیا۔ دربار برخاست ہوتے ہی شہامت علی نے سکون کا سانس لیا ورنہ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ کسی بھی لمحے سر تن سے جدا ہو جائے گا۔ اس نے اسی لمحے جان کو کم ظرف اور مفاد پرست گردان لیا۔

''آپ نے اچھا نہیں کیا جان صاحب! ہم نے آپ کو یہاں تک پہنچایا اور آپ ہماری ہی جان کے درپے ہو گئے۔'' وہ تلخی سے بولا۔

''جو کچھ آپ نے میرے ساتھ کیا ہے اس کے مقابلے میں تو یہ کچھ بھی نہ تھا۔'' جان نے بلا تامل کہا۔

''ہم نے بھلا ایسا کیا کر دیا؟ ہم تو آپ کی معاشی مدد کرنا چاہتے تھے بس!'' شہامت علی نے مکر کیا۔

''اور اس مدد کے عوض میری شریک حیات کو اپنے کسی حرم کا حصہ بنانا چاہتے ہیں۔'' وہ بھی تلخ ہوا۔

''لاحول ولاقوۃ الا باللہ..... ہم نے ایسا گمان بھی نہیں کیا۔'' اس نے ایک بار پھر مکر کیا۔

''کیا آپ کے ہاں کم ظرفی کی کوئی حد بھی ہوتی ہے یا یہ آپ کی لامحدود قومی وذاتی صفت ہے۔'' جان بھڑک گیا۔

''شک کا علاج تو کسی کے پاس بھی نہیں ہے۔ آپ کو یہی مرض لاحق ہوا ہے۔'' شہامت علی بادشاہ سے گوشمالی کے خدشے سے حواس باختہ ہو رہا تھا۔

''مجھے شک کا مرض نہیں بلکہ آپ کو بے حمیتی کا ناسور لاحق ہو گیا ہے۔ آپ میری بیوی کو ورغلانے کے لیے امداد کا ڈھونگ کر رہے ہیں اور مجھ سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ اف بھی نہ کروں۔ واہ! ایسی بے ضمیری آپ کے ہاں ہوتی ہو گی لیکن میں ایسا کم ظرف نہیں۔'' جان نے اس کی بھرپور تذلیل کی۔

شہامت علی دبک گیا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ جان سے الجھنا یا کوئی بھی بات کرنا لاحاصل ہے۔

☆☆☆

جان کے دفتری معمولات سے آگاہ ہونے کی بدولت شہامت انہی اوقات میں اس کی رہائش گاہ پر جا پہنچا۔ کیتھرائن اسے دیکھ کر خوشی سے بے قابو ہو گئی۔

''آج تو خداوند سے کچھ اور بھی مانگتی تو مل جاتا۔ میں صبح سے کس قدر یاد کر رہی تھی آپ کو!'' وہ اس کے گلے کا ہار بن گئی۔

''ہمارا بھی یہی حال ہے کیتھرائن! تم سے دور رہ کر ہر ایک لمحہ عذاب کے سوا کچھ بھی نہیں۔'' شہامت علی نے اسے بھینچ لیا۔ ''یہ شاید تمہاری محبت ہی تھی جو ہم آج زندہ سلامت یہاں کھڑے ہیں۔ ورنہ تمہارے شوہر نے کل ہمیں مروا دینے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔''

''ایسا کیا کر دیا اس کم بخت نے؟'' کیتھرائن غصے سے بولی۔

جواباً شہامت علی نے اپنی مظلومیت ثابت کرنے کے لیے گزشتہ روز کا واقعہ خوب منہ بسورتے ہوئے سنا دیا۔

''دیکھ لیا نا! میں نہ کہتی تھی کہ قسمت نے مجھے شادی کے نام پر ایک آزمائش میں مبتلا کر رکھا ہے۔ وہ شخص ایسا ہی ہے۔ موقع پرست، حریص اور مفاد پرست۔'' وہ تاسف سے کہنے لگی۔

''اس نے ہماری عزتِ نفس کچلی ہے کیتھرائن! ہمارے دل پر لگا یہ زخم بہت اذیت ناک ہے۔'' شہامت علی نے دانت پیسے۔

''اسے اس غلطی کی سزا بھی تو بھگتنی ہو گی۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اب اس سے طلاق لے لوں۔'' وہ سکون سے بولی۔

''خوب، بہت خوب! وہ آئے تو اسے کہنا فوراً تین لفظ بول کر تمہیں آزاد کر دے۔'' شہامت جوش میں بنیادی مذہبی فرق ہی بھول گیا۔

''آہ..... شہامت! کس قدر سادہ ہیں آپ!'' کیتھرائن نے اس کے بالوں میں اپنی انگلیاں پھیریں۔ ''ہمارے ہاں ایسا نہیں ہوا کرتا۔ اپنی طلاق کے لیے مجھے کلکتہ جا کر قانونی مشیروں سے مشورہ کرنا ہو گا۔ اس کے بعد گورنر کونسل میں طلاق کی درخواست جائے گی۔''

''کیا تم خود کلکتہ جاؤ گی؟'' وہ جز بز ہوا۔

''جانا تو ہو گا۔ اس کے بغیر قانونی کارروائی مکمل ہی نہیں ہو سکتی۔'' کیتھرائن نے اسے مخمور نگاہوں سے دیکھا۔ ''تمہارے بنا یہ شہر کاٹ کھانے کو دوڑے گا۔ فضائیں اجنبی محسوس ہوں گی اور ماحول افسردگی کے سوا کچھ بھی تو نہ ہو گا۔'' اس نے جارحانہ پیش قدمی کی۔

''آپ کے بنا میرا بھی یہی عالم ہو گا شہامت! لیکن اس وقتی جدائی کے بعد دائمی وصل بھی تو ہمارا مقدر ٹھہرے گا۔ بس اسی وقت کا تصور کر کے دل بہلا لیجیے گا۔'' کیتھرائن نے اس کی پیش قدمی کی بھرپور حوصلہ افزائی کی۔

''ٹھیک ہے! بس اس شخص سے فوراً جان خلاصی

www.pklibrary.com

کرواؤ۔ ہم تمہیں اس کی دسترس میں ہونے کا تصور بھی کریں تو دم گھٹنے لگتا ہے۔'' شہامت نے حقارت سے کہا۔

''میرے دل میں بھی اس کے لیے غصے و نفرت کے سوا کچھ نہیں۔ آپ نے دیکھ ہی لیا نا کہ وہ کس قدر لالچی ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اسی لالچ کے تحت خود ہی طلاق دینے کے لیے راضی ہوجائے۔ اگر ایسا کوئی موقع آیا تو آپ میرے لیے اپنی دولت کا کچھ حصہ قربان کردیں گے نا؟'' کیتھرائن نے جذباتی پیش قدمیاں جاری رکھیں۔

''ہاں! کیوں نہیں؟ ہماری سب سے قیمتی دولت تو تم ہو کیتھرائن! تمہارے حصول کے لیے ہم بڑی سے بڑی قربانی دینے کے لیے تیار ہیں۔'' شہامت علی مکمل طور پر حواس کھو چکا تھا۔

''بس تو پھر طلاق میں کوئی رکاوٹ حائل نہیں۔ اب ہمیں یوں چھپ چھپ کر ملنا نہیں پڑے گا۔ ہم بہت جلد ایک مضبوط اور قانونی رشتے میں بندھ جائیں گے۔'' کیتھرائن نے بڑی ادا سے نواب شہامت کو ایک جانب ہٹا دیا۔

''ہم اس وقت کا انتظار کریں گے۔ اب ہم چلتے ہیں۔ تمہیں کوئی بھی مشکل درپیش ہو تو خدا بخش سے کہہ دینا۔ وہ ہمیں پیغام پہنچا دے گا۔'' اس نے بلا ارادہ کہا۔

کیتھرائن کے ہونٹوں پر مسکراہٹ مزید گہری ہوگئی۔ اس نے مکمل محبوبیت سے شہامت علی کو رخصت کردیا۔

نواب کے رخصت ہونے کے کچھ ہی لمحوں بعد جان بھی گھر چلا آیا۔ اس کے چہرے سے تھکن نمایاں تھی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی وہ غصے سے ٹھنک کر رک گیا۔

''آج کون آیا تھا یہاں؟''

''کوئی بھی نہیں۔'' کیتھرائن نے کندھے اچکائے۔

''مجھے عطر کی خوشبو محسوس ہو رہی ہے۔ جانتا ہوں کہ وہ کل والے واقعے کی چغلی کرنے آیا ہوگا۔'' جان نے دانت کچکچائے۔

''تو کیا غلط کہنے آیا تھا؟ یہ کیسی حرکت کردی تم نے؟'' وہ چلائی۔

''تمہاری عقل اور سمجھ سلب ہوچکی ہے۔ تمہیں اب بھی وہی شخص درست دکھائی دے رہا ہے۔''

''ہاں! وہ ایک نفیس اور باکردار شخص ہے۔ میں اسے غلط نہیں سمجھتی۔'' کیتھرائن نے ہٹ دھرمی سے کہا۔

جوابی طور پر جان کی زبان سے سخت طیش میں مغلظات برآمد ہونے لگیں۔ وہ اپنے ہوش و حواس سے بالکل ہی بیگانہ ہوچکا تھا۔ کیتھرائن سرد مہری سے اس کی کیفیت دیکھتی رہی اور خاموش ہوتے ہی بولی۔

''اب میں تمہارے ساتھ ایک لمحے کے لیے بھی نہیں رہ سکتی۔ مجھے طلاق چاہیے۔ میں گورنر کونسل سے کسی بھی قیمت پر طلاق لے کر رہوں گی۔''

کیتھرائن کی اس بات پر جان کی سٹی گم ہوگئی۔ اس نے اپنے اعصاب مجتمع کیے اور کیتھرائن کے پاس جا بیٹھا۔

''مجھے معاف کردو کیتھی! میں تم سے علیحدہ نہیں ہونا چاہتا۔ بہت محبت کرتا ہوں تم سے۔'' اس نے بیوی کا ہاتھ تھام لیا۔ آنکھوں میں آنسوؤں کی شدید چمک تھی۔

''میں نے بھی تم سے محبت کی تھی جان! لیکن اب احساس ہوتا ہے کہ وہ صرف ایک خود فریبی تھی۔ اصل محبت کیا ہوتی ہے یہ تو میں نے شہامت علی خاں سے ملاقات کے بعد جانا ہے۔ سچ کہتی ہوں جان! میں تمہارے ساتھ کبھی خوش نہیں رہ سکوں گی۔ وہ شخص میری روح کا مکین بن چکا ہے۔'' وہ سنجیدگی و بے بسی سے کہنے لگی۔

جان کچھ لمحوں تک خاموشی سے گہری سانس لیتا کیتھرائن کو دیکھتا رہا۔ اس کی نظروں میں طیش ہلکورے لینے لگا تھا۔

''میں نے تمہاری محبت کے لیے کیا کچھ نہ کیا؟ اپنا خاندان، شہر اور ملک چھوڑ کر یہاں آبسا۔ تمہاری فرمائشیں پوری کرنے کے لیے قرض تک اٹھائے۔ کیا وہ شخص تمہاری محبت میں اتنی قربانیاں دے سکتا ہے؟''

''بالکل دے سکتا ہے۔'' کیتھرائن پُریقین تھی۔

''اور وہ اس قدر باظرف انسان ہے کہ اپنی قربانیوں کو تمہاری طرح کبھی نہ جتائے گا۔''

''چلو یہ بھی آزما لیتے ہیں۔ اپنے اس عاشق سے کہنا کہ میں طلاق کا معاوضہ لینے کے لیے تیار ہوں۔ دیکھتا ہوں کہ اس کی محبت میں کتنا دم ہے؟'' جان نے مکاری سے کہا۔

''ضرور دیکھنا! شہامت علی اپنی محبت کی سچائی ضرور ثابت کرے گا۔'' اس نے نخوت سے کہا۔

کمرے کے باہر ایک آڑ میں کھڑے خدا بخش کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ اس کے لیے نواب شہامت تک اطلاع پہنچانے میں مزید صبر کا یارانہ تھا۔ خدا بخش نے مارے باندھے اپنے فرائض ادا کیے اور قصر شہامت پہنچ کر تمام تر صورتِ حال نواب کے گوش گزار دی۔

''کیا واقعی جان طلاق دینے پر راضی ہوگیا ہے؟'' وہ خوشی سے نہال تھا۔

''جی ہاں حضور! اس نے بیگم صاحبہ کو بہت دھمکایا

www.pklibrary.com

لیکن وہ اس قدر بہادر ہیں کہ اس کے سامنے ڈٹی رہیں۔"

خدا بخش کی اس بات پر شہامت علی سرور میں آ گیا۔ ایک غیر ملکی خاتون کی اپنی ذات سے ایسی وابستگی اور بے باکی اسے ہوش و حواس سے بیگانہ کیے دے رہی تھی۔ انا کو بے حد تسکین ملی تھی۔ اس نے خدا بخش کو انعام و اکرام سے نوازنے کے بعد کہا۔

"تم بھی کیتھرائن کے ساتھ کلکتہ جاؤ گے۔ طلاق کی قانونی کارروائی کے بعد اسے بحفاظت یہاں لے آنا۔ ہم تمہارا وجود موتیوں سے تول دیں گے۔"

"آپ بے فکر رہیں حضور! خاکسار آپ کی امانت کا بھرپور خیال رکھے گا۔" اس کی آنکھیں بھی چمک اٹھیں۔

نواب شہامت نے اسے مزید ہدایات دے کر رخصت کر دیا۔

☆☆☆

اسی روز سہ پہر کے بعد کیتھرائن بھی نواب شہامت سے ملاقات کے لیے چلی آئی۔ شہامت اسے دیکھ کر کھل اٹھا۔ کیتھرائن کی افسردگی، پژمردگی اور کھوئی کھوئی سی کیفیت اسے عرش پر پہنچانے لگی تھی۔

"میں آپ سے تنہائی میں کچھ گفتگو کرنا چاہتی ہوں۔" اس نے بوجھل سے انداز میں کہا۔ شہامت ہر ایک انداز سے گھائل ہو رہا تھا۔

"بارہ دری چلتے ہیں۔ ہمیں بھی آپ سے بہت کچھ کہنا سننا ہے۔" وہ اس کے سراپا کو پُرشوق نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

بارہ دری کی مخصوص نشست گاہ میں پہنچ کر کیتھرائن کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ وہ بری طرح سسکتے ہوئے رونے لگی۔ شہامت علی کے کندھے پر گرتے یہ آنسو اسے مزید راحت دینے لگے۔

"کیا ہوا ہے کیتھرائن؟ اس طرح کیوں رو کر ہلکان ہو رہی ہو؟" شہامت نے اس کی زلفیں سہلائیں۔

"اس کم بخت محبت پر رو رہی ہوں۔ میری محبت آپ پر بہت گراں گزری ہے۔" وہ سسکی۔

"ایسا کس نے کہہ دیا؟ یوں سوچ کر ہمارے جذبات کی توہین تو نہ کرو۔" شہامت اب اس کے چہرے کے نقوش سہلانے لگا تھا۔

"جان نے اپنی اصلیت دکھا دی۔ اس نے طلاق کے عوض رقم کا مطالبہ کیا ہے۔ میں یہی سوچ کر ہلکان ہو رہی ہوں کہ بس یہ قیمت تھی میری اس کی نظر میں۔" اس نے شہامت کا ہاتھ زور سے بھینچ لیا۔

"تمہاری قدر و قیمت تو کوئی ہم سے پوچھ کر دیکھے کیتھرائن!" وہ بے خود ہوا۔ "ہم حلفیہ طور پر کہہ سکتے ہیں کہ تم سے شادی کے بعد ہمارے نکاح اور حرم میں کوئی عورت نہ آئے گی۔ ہماری کائنات تم سے شروع اور تمہی پر ختم ہو جایا کرے گی۔"

کیتھرائن مزید زور و شور سے آنسو بہانے لگی۔

شہامت علی اسے ایک اور کمرے میں لے آیا جہاں تپائی پر نفیس کپڑے تلے کچھ اشیا محسوس ہو رہی تھیں۔

"جب ہمیں علم ہوا کہ جان نے طلاق کا معاوضہ طلب کیا ہے تو ہم نے اسی وقت بندوبست کر لیا تھا۔" وہ نخوت سے بولا۔

کیتھرائن اس کا "بندوبست" دیکھ کر حیران رہ گئی۔ لاکھوں مالیت کی رقم اور قیمتی جواہرات کی دیدہ زیب خیرہ کیے دے رہی تھی۔ یہ سامان بلاشبہ اتنی مالیت کا تھا کہ وہ قرض کی ادائیگی کے بعد خود بھی شاہانہ زندگی بسر کر سکتے تھے۔

"کیا ہوا؟ کم ہے کیا؟ ہم مزید بندوبست کر دیں گے۔ تمہاری ذات سے اہم تو کچھ بھی نہیں ہے ہمارے لیے۔" شہامت علی نے اسے اپنی گرفت میں لے کر جذباتی پیش قدمی کی۔ جوابی طور پر کیتھرائن کو بھی بھرپور انداز میں اس کھیل کا حصہ بننا پڑا۔

"میں آپ کا یہ احسان کس طرح چکاؤں گی شہامت؟" اس نے نواب کی مزید پیش قدمی روکنے کے لیے ایک بار پھر سسکتے ہوئے کہا۔

"محبت میں احسان کہاں ہوتا ہے کیتھی؟ محبت تو بس محبت ہوا کرتی ہے۔ تمہیں اندازہ ہی نہیں کہ تمہاری اس محبت اور جنون نے ہمارے تشنہ وجود کو کیسی مسرتیں عطا کی ہیں۔ تمہارے سامنے سب ہیچ ہے کیتھی! ہم نے آج تک تم جیسی عورت نہیں دیکھی۔ تمہاری یہ محبت ہماری کمزوری بن چکی ہے۔ تم اسی روپ اور اداؤں میں ہمیں پسند ہو۔ تمہاری یہ بے باکی اور ناز ہی ہماری طلب ہیں اور کشش بھی۔ وعدہ کرو کہ زندگی بھر ہمیں یونہی چاہو گی۔ انہی مسرتوں اور خود سپردگی سے مالا مال کرتی رہو گی۔ وعدہ کرو کہ کبھی اس محبت میں کمی نہیں آنے دو گی۔" وہ عالم دیوانگی میں کہتا رہا۔

"میں وعدہ کرتی ہوں شہامت! بالکل وعدہ کرتی ہوں۔" کیتھرائن چہرے پر مسکراہٹ سجائے کچھ دیر اس کھیل کا حصہ بنی رہی اور پھر گہری سانس لے کر بولی۔

"اب مجھے اجازت دیجیے۔ کلکتہ سے واپسی پر آپ

www.pklibrary.com

سے ملاقات ہوگی۔اس کے بعد ہمارے درمیان کوئی رکاوٹ نہیں رہے گی۔''

''ہم تمہیں اس درندہ نما شخص کے ساتھ تنہا نہیں بھیجیں گے۔خدا بخش بھی ساتھ جائے گا۔وہ تمہاری حفاظت کے لیے اپنی جان پر بھی کھیل جائے گا۔''شہامت نے کہا۔

کیتھرائن جز بز تو ہوئی لیکن پھر کچھ سوچ کر خاموش ہو گئی۔شہامت نے اسے بہت جذباتی انداز میں رخصت کر دیا۔

☆☆☆

کلکتہ پہنچ کر جان اور کیتھرائن کی خوشی کا کوئی ٹھکانا ہی نہیں تھا۔انہیں یقین ہی نہ آ رہا تھا کہ سبھی مسائل بالآخر حل ہو گئے ہیں۔جان نے ملازمت سے استعفا دے دیا تھا اور اب انگلستان واپسی کے لیے پر تولنے لگا تھا۔

''ہماری روانگی کب ہے جان؟ میں اس گرم مرطوب ملک میں رہ کر اوب چکی ہوں۔''کیتھرائن نے پوچھا۔

''بس ایک روز کی بات ہے۔اس کے بعد ہم اپنے ملک اپنی جنت میں لوٹ جائیں گے۔''وہ محبت پاش نظروں سے بیوی کو دیکھنے لگا۔

''خداوند کا شکر ہے! میں اس ملک میں دوبارہ کبھی نہیں آؤں گی۔''وہ شدید تھکاوٹ اور انتشار کا شکار تھی۔

''میں تمہارا یہ احسان کیسے چکاؤں گا کیتھی؟ مجھے علم ہے کہ تم نے اپنے مزاج اور فطرت کے برعکس اس نواب سے تعلقات کا ڈھونگ رچایا تھا۔یقین مانو! میں ہر پل بحر ندامت میں غرق رہا کرتا تھا کہ تم محبت میں اس قدر ایثار کر رہی ہو اور میں کیا کر پایا ہوں تمہارے لیے؟''جان سخت آزردہ تھا۔

''محبت میں احسان کہاں ہوتا ہے جان! محبت تو بس محبت ہوا کرتی ہے۔ہماری رفاقت اور خوشیوں کے سامنے سب ہیچ ہے۔''وہ بے اختیار کہہ اٹھی۔

''کاش میں بھی تمہاری محبت کے لیے کچھ کر سکتا۔''جان مضطرب تھا۔

''کر سکتے ہو۔بالکل کر سکتے ہو۔''کیتھرائن نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔''ایک وعدہ کرو مجھ سے کہ عمر بھر یونہی چاہتے رہو گے۔میری وفا اور خلوص پر کبھی کوئی شک نہ کرو گے۔وعدہ کرو کہ یہ بات کبھی نہ بھولو گے کہ کیتھرائن ہمیشہ سے تمہاری تھی اور تمہاری ہی رہے گی۔''

''میں وعدہ کرتا ہوں۔''جان نے اسے سمیٹ لیا۔

''اس خدا بخش کا کیا کرنا ہے؟''کیتھرائن نے پوچھا۔

''اچھا یاد کروایا! اس سے بھی بات کیے لیتے ہیں۔''جان ہنسا اور اسے آواز دے کر طلب کر لیا۔

خدا بخش کچھ ہی لمحوں میں ان کے سامنے موجود تھا۔اس کا پُراعتماد انداز اور آنکھوں کی چمک حیران کن تھی۔

''کامیابی مبارک ہو صاحب! واپسی کب ہے پھر؟''اس نے شگفتگی سے پوچھا۔کیتھرائن اور جان اس سوال پر دنگ رہ گئے۔

''کیسی کامیابی؟ ہم نے تو یہاں تمہیں.....''جان نے کہنا چاہا۔

''اجی چھوڑیے صاحب!''خدا بخش نے نرمی سے ٹوکا۔''جتنی آپ کی عمر ہے اتنے ہی سالوں سے کمپنی کی ملازمت کر رہا ہوں۔بہت سے صاحب آتے جاتے دیکھے۔ہر ایک کے اپنے مسائل و مشکلات تھیں۔کچھ سال پہلے ایک جولیانا می بیگم صاحبہ بھی اسی طرح کی صورتِ حال کا شکار ہوئی تھیں، بس فرق صرف اتنا تھا کہ وہ واقعی ایک نواب صاحب سے محبت کر بیٹھی تھیں۔ان کے شوہر کو علم ہوا تو بہت جھگڑے ہوئے۔جب پانی سر سے اونچا ہوا تو ولیم صاحب نے ڈوئل لڑنے کا فیصلہ کر لیا۔نواب بدرالدین نے ڈوئل میں انہیں ہرا کر جولیا صاحبہ کو اپنے حرم میں شامل کر لیا۔تو صاحب! بات اتنی سی ہے کہ جو واقعی غیرت مند ہوں وہ محض باتوں کے تیر نہیں چلاتے بلکہ کوئی عملی قدم بھی اٹھاتے ہیں۔میں روز اول سے ہی آپ کا کھیل سمجھ چکا تھا۔''

''تو پھر اپنے نواب صاحب کو بتایا کیوں نہیں؟''جان اس انکشاف پر ذلت محسوس کرنے لگا۔

''جب کوئی شخص خود ہی گڑھے میں گرنے کے لیے بے تاب ہو تو کوئی کب اور کہاں تک زور لگا کر اسے بچا سکتا ہے۔محبت نے ان کی آنکھوں پر پٹی باندھ رکھی تھی۔میں نے بھی اس بہتی گنگا میں ہاتھ دھو لیے۔بس بات ختم!''وہ بے نیازی سے بولا۔

''اب واپس کس منہ سے جاؤ گے؟ نواب شہامت پوچھے گا نہیں کہ کیتھرائن کو واپس کیوں نہیں لائے؟''کیتھی نے طنز کیا۔

''واپس جائے گا ہی کون؟ میں یہیں ملازمت تلاش کروں گا۔زندگی بھر صاحب لوگوں کی ''خدمت'' کر کے اتنے تعلقات تو بنا ہی لیے ہیں کہ جس کو بھی کہوں وہ میری بھرپور سفارش کر دے گا۔کلکتہ میں میرے کئی واقف کار موجود ہیں۔نئی ملازمت ملتے ہی مشرق اور مغرب کی اس ازلی باہمی کشش اور ملاپ کا تماشا دیکھوں گا۔بس یونہی گزر جائے گی باقی زندگی بھی۔''اس نے بھی بڑی شائستگی

www.pklibrary.com

سے طنز کیا۔

جان اور کیتھرائن کے پاس اس کی بات کا کوئی جواب نہ تھا۔

☆☆☆

نواب شہامت اپنی بارہ دری میں محفل سجائے موجود تھا۔ اس کی رنگت میں شدید سرخی اور آنکھیں متورم تھیں۔ بکھرے بال اور چہرے کی وحشت اندرونی اضطراب کا بھرپور عکس تھیں۔ کیتھرائن کو کلکتہ گئے ہوئے دو ماہ بیت چکے تھے۔ اس کی جانب سے کوئی بھی اطلاع موصول نہیں ہوئی۔ خدا بخش نے بھی دوبارہ رابطہ نہیں کیا تھا۔ کیتھرائن کی غیر موجودگی اس کی کمی اور جان کی جانب سے کسی غیر متوقع ردعمل نے ہی اسے اعصابی طور پر منتشر کیا ہوا تھا۔ اس نے اپنی داخلی کیفیات کے اس انتشار سے نجات کے لیے محفل رقص و سرود سجالی۔ اس محفل میں اس کی مے نوشی بلانوشی کی حیثیت اختیار کرگئی۔ اسی وحشت زدہ کیفیت میں اس نے مغنیاؤں کو راگ چھیڑنے کا حکم دیا۔

سازندے اور مغنیائیں اسی حکم کی منتظر تھیں۔ انہی مغنیاؤں میں ''رباب'' بھی شامل تھی۔ خوبصورت، طرح دار اور بے باک۔ وہ ہمیشہ ایسی کسی بھی محفل میں اپنے شاعرانہ انتخاب سے آگ لگا دیا کرتی تھی۔ اس روز بھی رباب نے اودھ اور دہلی کی مجموعی ابتر سیاسی صورت حال دیکھ کر شاہ عالم کی ایک ولدوز تصنیف گانے کا فیصلہ کر رکھا تھا۔ سازندوں نے راگ چھیڑے اور فضا میں ایک مترنم، لوچ دار آواز گونجنے لگی۔

رباب کا گایا گیا ہوا کلام ذاتی و قومی انتشار کی بھرپور عکاسی تھی لیکن نواب شہامت کے زخم ایک انوکھے انداز میں ادھڑ گئے۔ کیتھرائن کی یاد مزید شدت سے حملہ آور ہوئی تھی۔

''کیتھی! آہ میری کیتھی! کہاں چلی گئی ہو تم؟ ہمیں تنہا چھوڑ کر کہاں چلی گئی ہو تم؟ ہم تمہارے بنا کیا کریں گے؟'' وہ اپنا وقار فراموش کیے آنسو بہانے لگا۔

مغنیائیں اور سازندے اس کی حالت پر حیرت زدہ تھے۔ شاہی کروفر کے حامل اس شخص کو یوں روتے دیکھنا نہایت مضحکہ خیز مرحلہ تھا۔

''لگتا ہے نواب صاحب پر شاہ عالم کی کمسپرسی نے کچھ زیادہ ہی اثر دکھا دیا ہے۔ اسی لیے یوں زار و قطار رو رہے ہیں۔'' ارجمند نامی ایک مغنیہ نے طنزیہ ہنستے ہوئے سرگوشی میں رباب سے کہا۔

''ہاں! وہ تو دکھائی دے ہی رہا ہے کہ غم عاشقی پر چوٹ لگی ہے۔'' رباب کے چہرے پر مسکراہٹ اور زبان زہر آلود تھی۔ ''ان نوابین کی یہی قومی غیرت تو ہمیں یہاں تک لے آئی ہے۔ ایسا کرو تم بھی اسی طرح کا کوئی کلام سنا دو۔ اچھا ہے! اپنا غبار آنسوؤں میں بہا کر پُرسکون ہو جائیں گے قبلہ نواب صاحب!''

ارجمند نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا اور سازندوں کے راگ چھیڑتے ہی اپنی خوبصورت آواز کا جادو بکھیرنے لگی۔

''جوں سبزہ رندے اگتے ہی پیروں تلے ہم
اس گردش افلاک سے پھولے نہ پھلے ہم
ارمان بہت رکھتے تھے ہم دل کے چمن میں
بیٹھے نہ خوشی سے کبھی سائے کے تلے ہم''

ارجمند نے ''وزیر علی'' نامی ایک بہادر سپاہی کا کلام پیش کیا تھا جسے کمپنی حکومت نے نہایت مشکلات کے بعد کسی اپنے کی غداری کے بعد گرفتار کر کے زنداں کے حوالے کر دیا تھا۔ اس قید تنہائی اور تشدد برداشت کرتے وزیر علی نے اپنی بپتا بہ زبان اشعار بیان کی تھی۔ نواب شہامت کو ان اشعار نے بھی جذباتی ہیجان میں مبتلا کر دیا۔

''آہ کیتھرائن! ہم تمہارے لیے دل کے چمن میں بہت ارمان رکھتے تھے۔ اب یہ ارمان کیونکر پورے کریں؟ اپنے دکھ کی اس گھڑی اور تنہائی کے زندان میں کس کا آسرا طلب کریں؟ تم ہمیں اکیلا کیوں چھوڑ گئیں؟ لوٹ آؤ کیتھرائن! ہمارے پاس لوٹ آؤ!'' وہ بلکنے لگا۔

اس کے بعد یہ سب ایک معمول بن گیا۔ نواب شہامت کی مے نوشی شدید بلانوشی میں ڈھلی۔ محفل رقص و سرود میں اضافہ ہونے لگا۔ اس نے مغنیاؤں اور کنیزوں میں کیتھرائن کو تلاشنا شروع کر دیا۔ کسی کے رخسار کیتھرائن کی یاد دلاتے تو کسی کے ہونٹ اس قتالہ جیسے محسوس ہوتے۔ نواب شہامت کے حرم میں خواتین کی تعداد میں ہوش ربا اضافہ ہونے لگا تھا۔

☆☆☆

برسہا برس بیت گئے۔ ہندوستان پر کمپنی کا قبضہ مضبوط سے مضبوط تر ہوتا گیا۔ انتشار اس قدر پھیلا کہ شاہ اودھ کی فوج سے سپاہیوں نے بغاوت کر دی۔ یہ خبریں کسی نہ کسی روپ اور انداز میں لندن بھی پہنچ جایا کرتی تھیں۔ آسودہ حال اور صاحب ثروت جان مل کی کاروباری اور ذاتی محافل میں یہ تذکرے عام تھے۔ احباب جانتے تھے کہ وہ عہد شباب میں کمپنی کی ملازمت کر چکا ہے۔ جوان اور وجیہہ

www.pklibrary.com

جان مل اب بڑھاپے کی حدود میں قدم رکھ چکا تھا۔ اس نے اپنی محبوب بیوی کیتھرائن کے سنگ زندگی سے ہر خوشی کشید کی تھی۔ ان کے احباب باہمی رفاقت، مثالی ذہنی ہم آہنگی اور پُرخلوص محبت کی مثالیں دیا کرتے۔ وہ ان کی محفل میں بصدِ شوق شریک ہوا کرتے تھے۔

''سنا ہے ایسٹ انڈیا کمپنی نے اودھ پر مکمل قبضہ کرلیا ہے۔'' جان کے ایک دوست فلپ نے بتایا۔

''یہ تو ہونا ہی تھا۔ ہندوستانیوں میں ایسی کوئی خوبی ہی نہیں دیکھی میں نے کہ وہ اپنا ملک سنبھال سکتے۔'' جان نے نفرت سے کہا۔

''شاہی محل، پارک اور خزانے بھی کمپنی کی دسترس میں ہیں۔ شاہ اودھ کے تازی، ایرانی اور انگریزی گھوڑے نیلام کردیے گئے ہیں۔ بیگمات اودھ بھی کمپنی کی خدمت کررہی ہیں۔'' فلپ نے اوباشانہ انداز میں کہا۔

''مجھے یہ سن کر بالکل افسوس نہیں ہوا۔'' کیتھرائن ہنسی۔ گزرے برس اس کی دلکشی اور خوبصورتی کو چھو کر بھی نہ گزرے تھے۔

''کمپنی کو چاہیے کہ یہ بیگمات اپنے ملازمین کو بطور اجرت عطا کردیں۔ یہ ملازمین ہندوستان میں جس قدر اذیت ومشقت سے گزرتے ہیں میں بخوبی واقف ہوں۔'' جان کی اس تجویز پر محفل قہقہوں سے گونج اٹھی۔

اس تائیدی قہقہے میں کیتھرائن کی صدا بھی نمایاں تھی۔

محفل برخاست ہوتے شب ڈھلنے لگی۔ جان اب بے حد مضطرب دکھائی دے رہا تھا۔ آخری مہمان کو رخصت کرنے کے بعد وہ دونوں اپنی خواب گاہ میں چلے آئے۔ محفل کے شرکاء کی بابت ہلکے پھلکے تبصرے کرتے کیتھرائن بہت جلد نیند کی وادی میں کھو گئی۔ جان کا اضطراب شدید ہونے لگا۔ کچھ ہی دیر گزری تھی کہ کیتھرائن نیند میں کروٹیں لینے لگی۔ وہ سخت بے چین دکھائی دینے لگی تھی۔ جان اس حالت پر مٹھیاں بھینچنے لگا۔

''ہندوستان..... اس کے موسم نہیں پسند مجھے.....'' وہ بڑبڑانے لگی۔ ''ہندوستان..... جادو کی سرزمین..... خوب صورت..... نواب صاحب!..... کہاں ہوں گے؟'' اس نے کروٹ لی..... بے چینی سوا تر تھی۔

''مجھے یاد تو کیا ہوگا۔ تلاش بھی کیا ہوگا۔'' وہ دوبارہ بڑبڑائی۔ ''آہ..... شہامت..... بہت بھولے تھے تم..... بہت سادہ تھے تم..... یہ کیسی محبت کی..... یہ کیسی محبت کی.....'' وہ ایک ہی بات دہرانے لگی۔

جان نے اذیت سے اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے۔ کیتھرائن کی یہ کیفیت اس کے لیے کوئی نئی بات نہ تھی۔ برسوں قبل لندن واپسی کے بعد انہوں نے ایک نئی اور بھرپور زندگی کا آغاز کیا تھا۔ قرض اور بے روزگاری کے عفریت سے پاک زندگی۔ جان نے نئے کاروبار میں بہت جلد قدم جما لیے۔ وہ اپنی زندگی میں بے حد مطمئن اور پُرسکون تھا کہ ایک رات ایسی ہی محفل کے بعد کیتھرائن کی یہ کیفیت سامنے آگئی۔ وہ عالم نیند میں نواب شہامت اور اس کی مہربانیاں یاد کررہی تھی۔ ہندوستان سے نفرت کے باوجود اس سرزمین کی خوبیاں دہرا رہی تھی۔ جان کے لیے وہ لمحہ سخت کرب ناک تھا۔

اس کے بعد یہ سلسلہ کبھی رک نہ سکا۔ ماہ وسال کی گردش میں کبھی نہ کبھی، کسی نہ کسی شب وہ اسی عالم مدہوشی میں نواب شہامت کو یاد کرتی رہی تھی۔ جان اذیت سے بل کھانے کے سوا کچھ بھی نہ کرپاتا۔ وہ کیتھرائن کو کبھی جتا بھی نہ سکا کہ اس کی ذہنی کیفیت کس نہج پر ہے۔ اس صورت میں وہ بھڑک کر اپنے احسانات گنواتے ہوئے اسے احباب کے سامنے طشت از بام بھی کرسکتی تھی۔ جان کو ''شکی مرد'' قرار دے کر علیحدگی کے بعد حلقۂ احباب میں بدنام کردیتی تو وہ کہیں منہ دکھانے کے قابل بھی نہ رہتا۔ کرب کی انتہا برداشت کرتے ہوئے جان نے بالآخر یہ حقیقت تسلیم کرلی تھی کہ اس نے اپنی غربت، کسمپرسی، قرضوں اور بے روزگاری کو تو مات دے دی تھی لیکن نواب شہامت کے جذبات کی شدت اور ہندوستان کے سحر نے اسے ''شہ مات'' دی تھی۔ یہ حقیقت بے حد عذاب ناک سہی لیکن اس نے اپنی روح وقلب کے نہاں خانوں میں قید کرلی تھی۔

''ہندوستان واقعی ایک جادوئی سرزمین ہے۔ یہ کسی مضبوط سے مضبوط ترین کھلاڑی کو بھی ''شہ مات'' دے دیا کرتی ہے۔ خداوند کمپنی کی حکومت سدا قائم رکھے ورنہ مجھے کسی مقام پر اس کے لیے بھی ایک ''شہ مات'' دکھائی دیتی ہے۔ کون یقین کرے گا میرا؟ آہ..... کوئی بھی تو نہیں۔'' جان نے حسبِ سابق خود کلامی کرتے ہوئے کیتھرائن کے متضاد کروٹ بدل لی۔

اسے اب اگلی صبح کے لیے اعصابی مضبوطی اور آہنی ہمت مجتمع کرنا تھی۔

ماخذات:

کمپنی کی حکومت۔ شاہان اودھ۔ اودھ کے نوابین۔

www.pklibrary.com

متبادل

تنویر ریاض

اپنے رشتوں کو بچانے کے لیے غیروں کو قربان کردینا ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے... ظلم سے بچنے کے لیے تھوڑا سا ظالم بن جانے میں کوئی حرج نہیں... یہ اس کا نظریہ تھا... لہٰذا اس پر دل و جان سے عمل کر بیٹھی اور اس وحشت میں شاید کسی کے ساتھ زیادتی بھی ہوگئی مگر ... اس ادراک پر خود غرضی نے پردہ ڈال دیا... گویا جرم کسی کا اور سزا کسی کو۔

جرائم کی دنیا میں متبادل مجرم کا انوکھا انداز اور انجام کا ماجرا

اینا نے اپنا بازو ایک جھٹکے سے ہٹایا اور چمچہ پھینکتے ہوئے چلائی۔

''اووا'' پھر اس نے اپنا سر گھمایا اور منہ بناتے ہوئے دادی سے بولی۔ ''میں مکئی کے دانے پیسنے سے تنگ آ گئی ہوں اور میرے ہاتھ میں درد ہو رہا ہے۔''

نانا ماریا نے اس کے احتجاج کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ''اسی طرح تم انہیں بنانا سیکھو گی۔'' اس نے اپنے سامنے رکھے ہوئے گملوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے

www.pklibrary.com

کہا۔ ''تم بڑی فیاضی سے کھمبیاں استعمال کر رہی ہو۔ اس طرح یہ کم پڑ جائیں گی۔''

اینا نے فرائی پان میں دیکھا۔ اس کی دادی ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ بلیک بین اور مشروم ٹامیلس (رول) ان کے خاندان کی خاص ڈشز تھیں اور کوئی دوسرا ٹامیل بنانے والا ان کا مقابلہ نہیں کرسکتا تھا۔ اس ذائقے دار ڈش کی ترکیب صرف اس کی دادی کے پاس تھی جو وہ اپنے گاؤں سے لے کر آئی تھی۔ اس رول میں بلیک بین، تھوڑی سی مشروم اور جڑی بوٹیاں شامل ہوتی تھیں۔

نانا ماریا چھوٹے قد کی دبلی پتلی عورت تھی لیکن اسے اپنی بات منوانا اور دوسروں پر حکم چلانا خوب آتا تھا۔ اس نے اینا کو کہنی مارتے ہوئے کہا۔ ''میں انہیں مکمل کرلوں گی۔ تم دوسرے رول بناؤ۔''

دوسرے رول سے اس کی مراد جو نسبتاً کم اثر انگیز تھے اور ان میں چکن، پورک اور پنیر ڈالا جاتا تھا۔ جیسے ہی اینا نے ایک رول اٹھا کر اسٹیم باسکٹ میں ڈالنا چاہا، وہ اس کے ہاتھ سے نکل کر زمین پر گر پڑا۔

''تم اتنی بدحواس کیوں ہو؟'' نانا ماریا نے پوچھا۔ اس کی نظریں اینا پر جم گئیں۔

اینا کے گالوں پر ہلکی سی سرخی آگئی۔ اس نے دادی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں بدحواس نہیں ہوں، بالکل بھی نہیں۔''

نانا ماریا اس کی ہچکچاہٹ کو محسوس کرتے ہوئے بولی۔

''تم ہو!'' اس نے چبھتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''وہ کوئی مرد ہے؟''

''شاید۔'' اینا نے اعتراف کیا لیکن اس سے زیادہ نہیں بولی۔ نانا ماریا، شمٹ جیسے دولت مند امریکن کی ان چاہی محبت کا رخ نہیں موڑ سکتی تھی۔ وہ عقل مند ہونے کے باوجود اس معاملے میں اس کی کوئی راہنمائی نہیں کرسکتی تھی۔ اینا نے ان خیالات کو جھٹکا اور دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہوگئی۔

اینا کا بھائی جارج اس سے ایک سال چھوٹا تھا۔ جب سامان تیار ہوگیا تو وہ دونوں ٹامیل بھرے ہوئے ایک ایک کولر کو کھینچتے ہوئے سفید پک اپ ٹرک تک لے گئے۔ دوپہر کے کھانے کا وقت ہو رہا تھا اور انہیں اپنا کام شروع کرنا تھا۔

''ہم جا رہے ہیں۔'' اینا نے چلا کر دادی سے کہا جو اپنے کاٹیج کے برابر والے باغ سے سبزی اور جڑی بوٹیاں توڑ رہی تھی۔

نانا ماریا نے ان کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ سپاٹ اور آنکھیں سکڑی ہوئی تھیں۔ ایک لمحے بعد اس نے اپنا ہاتھ اوپر اٹھایا لیکن اسے ہلانے کے بجائے ساکت رکھا۔

''تم نے ایسا کیا کردیا کہ وہ اتنی ناراض ہے؟'' جارج نے پوچھا۔ وہ خود بھی ناراض لگ رہا تھا یا پھر رات دیر سے آنے کی وجہ سے تھک گیا تھا۔ اس کی شیو بھی بڑھی ہوئی تھی۔

''وہ ناراض نہیں ہے۔'' اینا نے کہا۔

''محتاط رہو۔'' جارج نے ٹرک کی ڈرائیونگ سیٹ کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

''اگر تم نے اسے ناراض کیا تو وہ بددعا دے گی۔''

شہر کے قلب تک پہنچنے میں انہیں بیس منٹ لگے لیکن اینا کو وہ ایک مختلف دنیا لگی۔ وہ ایک بھرا ہوا شہر تھا۔ بہت سی عمارتیں، بہت سے مکانات، بہت سے لوگ اور پولیس بھی۔ اس کے باوجود ٹامیل نہیں بیچے جاسکتے جب تک کہ وہاں بہت سے بھوکے اور مصروف لوگ نہ ہوں جنہیں گرم کھانے کی طلب ہو رہی ہو۔

''چلو، پہلے فری مونٹ ہائٹس چلتے ہیں۔'' اینا نے کہا۔ یہ ایک اعلیٰ درجے کا رہائشی علاقہ تھا جہاں رہنے والی خواتین اینا کے ساتھ ہمدردی سے پیش آتی تھیں۔ بعض اوقات ایک عورت اسے ایک ووڈالرز زیادہ بھی دے دیتی تھی۔

''نہیں۔'' جارج نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ہم وہاں بعد میں بھی جاسکتے ہیں۔ شام میں کسی وقت ڈنر سے کچھ پہلے۔''

''جارج.....!'' اینا نے کچھ کہنا چاہا لیکن اس کے بھائی نے بات کاٹ دی۔

''نہیں اینا۔'' اس کی آواز تیز ہوگئی۔ ''تم جانتی ہو کہ دریا کے ساتھ واقع کارخانے اور ورک سائٹس بہت بہتر ہیں۔ وہاں ہمارے رول جلدی فروخت ہوجائیں گے اور ہمیں آسانی رہے گی۔''

اینا نے اپنے دونوں بازو سینے پر باندھے اور ہچکچاتے ہوئے بولی۔ ''ٹھیک ہے۔''

''تم جانتی ہو۔'' جارج نے مزید کہا۔ ''اس کے علاوہ میں باس سے ملازمت کے بارے میں بھی بات کرنا چاہتا ہوں۔'' اس نے اینا کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم شٹ سے میری تعریف کردینا۔''

''شاید میں اس سے نہ ملوں۔''

''لیکن اگر وہ تمہیں مل جائے۔''

جارج نے ٹرک کو انڈسٹریل ایریا جانے والی سڑک

www.pklibrary.com

پر ڈال دیا۔ ''پوائنٹ کی طرف چلو۔'' اینا نے کہا۔ ''وہاں کافی لوگ ہوں گے۔''

جارج نے پہلے اسے دیکھا پھر اپنی نظریں سڑک پر جما دیں۔ پوائنٹ ابھی کافی دور تھا لیکن اس نے مڑنے کا اشارہ دے دیا۔

''پوائنٹ نہیں جا رہے؟''

''نہیں۔'' جارج نے کہا۔ ''ہم یارڈ سے شروع کریں گے۔ وہاں دو پروجیکٹ چل رہے ہیں۔ شمٹ بھی وہیں ہوگا۔ اس سے میں ملازمت کی بات کروں گا۔ اس کے علاوہ اسے ہمارے رول بھی پسند ہیں۔''

ٹرک نے ایک موڑ کاٹا اور ریل کی پٹری سے گزرتا ہوا ایک بڑے میدان میں اتر گیا جو کبھی ایک جہاز بنانے والے کی ملکیت تھا۔ اب اس جگہ ایک بزنس اور انڈسٹریل پارک تعمیر ہو رہا تھا۔

جارج نے ٹرک شمٹ کنسٹرکشن کی سائٹ پر لگی باڑ کے باہر روک دیا جہاں کمپنی ایک غیر قانونی عمارت تعمیر کر رہی تھی۔ اینا اپنی طرف کا دروازہ کھول کر باہر آئی اور ٹرک کے عقبی حصے کی جانب چل دی۔ اس نے پیچھے لگا ہوا تختہ کھولا اور ایک چھوٹا کولر اتار کر نیچے زمین پر رکھ دیا۔ جارج نے دوسرا کولر بھی اتار دیا۔

''میں اس طرف جاؤں گی۔'' اینا نے جنوب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اور کولر کو گھسیٹنے لگی لیکن اس کے پہلے پتھریلی زمین پر بہ مشکل حرکت کر رہے تھے۔

وہ چند قدم ہی گئی ہوگی کہ جارج نے ٹرک کی کھلی کھڑکی میں ہاتھ ڈال کر تین مرتبہ ہارن بجایا جس پر وہاں کام کرنے والے کچھ لوگ اس کی جانب متوجہ ہو گئے۔ اس نے دونوں ہاتھ منہ پر رکھ کر زور سے آواز لگائی۔ ''ٹامیل لے لو۔ ٹامیل لے لو۔''

تقریباً نصف درجن لوگ گیٹ سے باہر آئے اور اینا کے گرد کھڑے ہو گئے۔

''ہائے..... پیاری لڑکی!''

''کیا ٹامیل کے ساتھ ایک بوسہ بھی ملے گا؟''

''تمہارا فون نمبر کیا ہے؟''

''کیا تم وہی ہو جس نے Abbys the Passion میں کام کیا تھا؟''

اینا نے اپنے کولہے پر زور سے ہاتھ مارا۔ وہ جانتی تھی کہ یہ لوگ اسے کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ اس کے باوجود اس نے غصے سے اپنے بھائی کی طرف دیکھا۔ یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ وہ اکیلی نہیں ہے۔ اس نے کولر کا ڈھکنا اٹھایا اور ٹامیل بیچنا شروع کر دیے۔ ایک رول کی قیمت ایک ڈالر اور پانچ ڈالر میں چھ عدد۔ مزید لوگ بھی باتیں کرتے اور قہقہے لگاتے ہوئے گیٹ سے باہر آ گئے۔ انہوں نے اینا کے گرد ایک دائرہ سا بنا لیا۔ جارج اس کی مدد کو آیا اور ان سے پیسے وصول کرنے لگا۔

ایک سیٹی کی آواز گونجی اور لوگوں کی باتوں اور قہقہوں کو بریک لگ گیا۔ گیٹ کے وسط میں شمٹ کھڑا ہوا تھا۔ اس کی دو انگلیاں منہ میں تھیں۔ اس نے اپنا ہاتھ نیچے کیا اور انگریزی میں بولا۔ ''میں نے تم سے کہا تھا کہ دوپہر سے پہلے اپنے ٹامیل بیچنا شروع نہ کرو۔'' یہ کہہ کر وہ اینا کو دیکھنے لگا۔

اینا نے دیکھا کہ اس کے بھائی کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا ہے۔ اس نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ بارہ بجنے میں پندرہ منٹ باقی تھے۔

''مجھے افسوس ہے مسٹر شمٹ!'' جارج نے زبردستی مسکرانے کی کوشش کی۔ ''میں نہیں جانتا تھا کہ ہم وقت سے پہلے آ گئے ہیں۔''

شمٹ چند قدم آگے بڑھ کر اپنے لوگوں سے مخاطب ہوا۔ ''تم سب کام پر واپس جاؤ۔ بیس منٹ بعد باہر آ سکتے ہو لیکن آدھے گھنٹے میں لنچ ختم کر لینا۔ ہمارے پاس کام زیادہ اور وقت کم ہے۔''

وہ سب لوگ مایوس ہو کر واپس چلے گئے۔

شمٹ نے جارج اور اینا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''میرا خیال تھا کہ تم میکسیکو کے لوگ ہمیشہ لیٹ ہو جاتے ہو۔''

''تم.....'' جارج نے کچھ کہنا چاہا لیکن اینا نے اسے روک دیا۔ ''یہ سچ نہیں ہے مسٹر شمٹ! میکسیکو کے لوگ کبھی لیٹ نہیں ہوتے۔''

''میں مذاق کر رہا تھا اینا!'' شمٹ نے جھینپتے ہوئے کہا۔ ''میں جانتا ہوں اور میرے پاس کئی میکسیکن کام کر رہے ہیں۔ وہ اچھے کارکن ہیں اور عموماً وقت پر آ جاتے ہیں۔''

''میں بھی وقت کا پابند ہوں۔'' جارج نے کہا۔ ''اور محنت بھی کرتا ہوں۔''

شمٹ نے اثبات میں سر ہلایا اور اس کی نظریں ایک بار پھر اینا پر جم گئیں۔

''ٹھیک ہے جارج! میں تمہارے لیے کام دیکھ رہا

www.pklibrary.com

ہوں اور اس بارے میں میرے پاس ایک اچھی خبر ہے۔"
جارج نے تعظیماً سر جھکا دیا۔
"جب بجلی کا کام شروع ہوگا تو ہمیں دیواروں پر تیزی سے کام کرنا ہوگا۔ کیا تمہیں ڈرائی وال میں کام کرنے میں دلچسپی ہے؟"
"یس سر!"
"مجھے سر مت کہو۔ میں کمپنی کا مالک ضرور ہوں لیکن ہم سب کارکن ہیں۔"
جارج نے ایک بار پھر سر ہلا دیا۔ "اس کے علاوہ مجھے گھر پر بھی کچھ اوپر کے کام والوں کی ضرورت ہوگی۔ کیا تم اس طرح کا کام کرنا چاہو گے؟"
"ضرور!"
"تم میرے ٹریلر پر کیوں نہیں آجاتے تاکہ میں ایک نظر اپنا شیڈول دیکھ سکوں۔" وہ واپس جانے کے لیے مڑا اور جارج کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔
جارج نے اینا کی طرف دیکھ کر نرم آواز میں کہا۔ "میں تھوڑی دیر میں واپس آجاؤں گا۔ تم یہیں میرا انتظار کرو۔"
شٹ مڑا اور پیچھے ہٹتے ہوئے بولا۔ "تم بھی اپنے ٹامیل لے کر آجاؤ اینا! میں اپنا فریج بھرنا چاہتا ہوں۔ بیوی کے مرنے کے بعد مجھے اچھا کھانا نصیب نہیں ہوا۔"
اینا اور جارج اپنے کولر کھینچتے ہوئے شٹ کے پیچھے چل دیے۔ اس کا ٹریلر گیٹ سے تقریباً بیس میٹر کے فاصلے پر کھڑا ہوا تھا۔ وہ سیاہ رنگ کی لوہے کی سیڑھیوں پر چڑھا، دروازہ کھولا اور اندر چلا گیا پھر اس نے چھت پر لگی ہوئی لائٹس جلائیں اور بولا۔ "اندر آجاؤ۔"
اینا اور جارج نے اپنے کولر اٹھائے اور بہ مشکل تمام سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچے۔ وہ ایک تنگ سی جگہ تھی جس میں دو ڈیسک اور ایک چھوٹی میز اور فائل کیبنٹ رکھے ہوئے تھے۔ دوسرے کونے میں بیٹھنے کی جگہ تھی۔ وہاں ایک چھوٹا کاؤچ، کافی ٹیبل، ٹی وی، مائیکرو ویو اوون اور ایک چھوٹا فریج رکھا ہوا تھا۔
شٹ ایک بڑی میز پر بیٹھ گیا اور کمپیوٹر پر کچھ دیکھنے لگا پھر اس نے دراز کھول کر ایک فائل نکالی اور اس کے صفحے پلٹنے لگا۔
جارج اور اینا نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔
"مجھے سائٹ پر جا کر اپنا سامان فروخت کرنا چاہیے۔" اینا نے سرگوشی میں کہا۔
"بس ایک سیکنڈ۔" شٹ فائل سے نظریں ہٹائے بغیر بولا اور اینا سوچنے لگی کہ کیا وہ ہسپانوی زبان سمجھتا ہے۔ اگلے لمحے اس نے پوچھا۔ "جارج! کیا تمہیں ڈرائی وال لگانے اور انہیں فنش کرنے کا تجربہ ہے؟"
"جی جناب!"
اینا جانتی تھی کہ یہ سچ نہیں ہے لیکن وہ کام کر کے مزید تجربہ حاصل کر سکتا ہے۔ کم از کم اسے ہتھوڑا چلانا تو آتا ہے۔
شٹ نے کرسی گھمائی اور جارج کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "جب تمہیں یہ کام آتا ہے تو ٹامیل نہیں بیچنے چاہئیں۔"
جارج نے مسکرانے کی کوشش کی۔ "میں کام تلاش کر رہا ہوں۔"
"ٹھیک ہے۔" شٹ نے کہا۔ "میرے آدمی سائٹ پر ڈرائی وال کا کام کر رہے ہیں۔ تم وہاں چلے جاؤ اور گونزا سے ملو۔ تم اسے جانتے ہو؟"
"ہاں۔" جارج نے کہا۔ اس کی آواز میں جوش جھلک رہا تھا۔
"اسے بتا دینا کہ میں نے تمہیں بھیجا ہے۔ وہ مجھ سے کہہ رہا تھا کہ اس کے پاس افرادی قوت کی کمی ہے۔ دیکھتے ہیں کہ وہ تمہیں کب کام پر لگاتا ہے۔"
"یس سر!" جارج جانے کے لیے مڑا لیکن اس کی نظریں اینا پر جم گئیں۔ "میں تھوڑی دیر میں واپس آتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ دروازے سے باہر چلا گیا۔
اینا نے جلدی سے اپنا کولر اٹھایا اور اسے سینے سے لگا لیا۔ شٹ کرسی سے اٹھ کر آیا اور اینا کے پاس کھڑا ہو گیا۔
"میں چند درجن ٹامیل خریدنا چاہتا ہوں، انہیں کافی کی میز پر رکھ دو۔"
اینا اس سودے سے انکار نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے کولر میز پر رکھا اور اس کا ڈھکنا کھولنے لگی۔ "تم نے میری پیشکش کے بارے میں کیا سوچا؟ کیا تم میرے گھر میں کام کرنے آسکتی ہو؟" شٹ نے پوچھا۔ اس نے گزشتہ ہفتے اینا کو یہ پیشکش کی تھی۔
"میں کچھ لڑکیوں کو جانتی ہوں جو گھروں کی صفائی کرتی ہیں۔" اینا نے کہا۔ اس نے صفائی کرنے والی بننے کے بارے میں کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔
شٹ کے چہرے پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ "تمہیں صفائی نہیں کرنا ہوگی۔"

www.pklibrary.com

''پھر میں کیا کروں گی؟''

وہ ایک قدم آگے بڑھا۔ ''میرا خیال ہے کہ تم جانتی ہو۔'' اس نے کہا۔ ''تم کھانا بنا سکتی ہو۔ مجھے تمہارے ٹامیل پسند ہیں اور تم میری ہاؤس مینجر بن سکتی ہو۔ بیوی کے مرنے کے بعد میرے گھر کا نظام بگڑ گیا ہے۔''

اینا نے کبھی ایسے کام کے بارے میں نہیں سنا تھا اور نہ ہی اس کے لیے تیار تھی۔ اس نے صاف انکار کر دیا اور پیچھے ہٹنے لگی۔

''مجھے نہ سننا پسند نہیں۔'' شمٹ غصے سے بولا۔ اس نے آگے بڑھ کر اینا کی کلائی پکڑ لی۔ ''میں نے تمہارے بھائی کو ملازمت دی اور اسے نکال بھی سکتا ہوں۔''

اینا نے ایک گہری سانس لی اور اپنا بازو پیچھے کر لیا۔ شمٹ تھوڑا سا ہچکچایا پھر اس نے اینا کی کلائی چھوڑ دی اور دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''گھبراؤ مت اینا! میں تمہیں نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔''

اینا نے سانس خارج کی اور سیدھی کھڑی ہو گئی۔ ''تمہیں کتنے ٹامیل چاہئیں؟''

''ہاں۔'' شمٹ نے اسے بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ ''مجھے پورک، چکن اور مشروم کے چھ چھ رول چاہئیں۔ ان کی کیا قیمت ہوگی؟''

اینا نے کولر کھول کر تین فوائل پیک نکالے۔ ان پر اجزاء کی نشاندہی کے لیے مختلف رنگوں کے ٹیپ لگے ہوئے تھے۔ اس نے انہیں کافی کی میز پر رکھا اور بولی۔ ''پندرہ ڈالر۔''

شمٹ نے پرس نکالنے کے لیے پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈالا ہی تھا کہ ٹریلر کے دروازے پر دستک ہوئی۔ شمٹ نے اینا کو چپ رہنے کا اشارہ کیا اور دروازہ کھول دیا۔ اینا نے دیکھا کہ وہاں شمٹ کا فورمین کھڑا ہوا تھا اور اس کے چہرے پر پریشانی کے آثار تھے۔ انہوں نے کچھ دیر نیچی آواز میں بات کی پھر شمٹ نے اینا سے کہا۔ ''تم یہیں رکو، میں ابھی واپس آتا ہوں۔''

اینا، شمٹ سے پندرہ ڈالر لینا چاہ رہی تھی لیکن اس سے بھی بڑھ کر وہ ٹریلر سے باہر جانے کی خواہش مند تھی۔ اس نے شمٹ کے لیے نکالے ہوئے ٹامیل وہیں کافی کی میز پر چھوڑے، اپنا کولر گھسیٹتی ہوئی دروازے کی طرف بڑھی۔ جارج بعد میں آ کر دوسرا کولر لے جا سکتا تھا۔

اس نے احتیاط سے دروازہ کھولا۔ سائٹ پر پراسرار خاموشی تھی۔ اس نے ٹریلر کے گرد ایک چکر لگایا اور پھر اپنی جگہ پر منجمد ہو گئی۔ شمٹ اور اس کا فورمین گیٹ کے قریب کھڑے ہوئے دو آدمیوں سے باتیں کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک پولیس کی وردی اور دوسرا گرے سوٹ میں تھا۔ دونوں نے دھوپ کے چشمے لگا رکھے تھے۔ گیٹ کے باہر دو کاریں کھڑی ہوئی تھیں۔ ان میں ایک سیاہ سیڈان اور دوسری شیرف کی گروزر تھی۔ شمٹ اپنا سر ہلا رہا تھا اور فورمین اس کی تائید کر رہا تھا۔ وردی والے نے دونوں ہاتھ سینے پر باندھ لیے۔ وہ بوریت محسوس کر رہا تھا جبکہ دوسرا شخص باتیں کرتا رہا۔ سائٹ پر کوئی کارکن نظر نہیں آ رہا تھا۔

سوٹ والے نے جب شمٹ کی بات سنی تو اس کے ہونٹ بھنچ گئے۔ وہ ایک قدم آگے بڑھا اور پوری طاقت سے بولنے لگا۔ اس نے ٹریلر کی طرف اشارہ کیا اور اس کی نظر سیدھی اینا پر گئی۔ شمٹ نے دوبارہ بولنا شروع کیا۔ اینا جلدی سے ٹریلر کے پیچھے چلی گئی۔

اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ وہ دونوں آدمی اس کی طرف نہیں آ رہے تھے لیکن ان کی وجہ سے اس پر گھبراہٹ طاری ہو گئی تھی۔ وہ نہیں سمجھتی تھی کہ شمٹ کسی میکسیکن کو ان کے حوالے کرے گا۔ اسے کارکنوں کی ضرورت تھی۔ اس نے اپنے ٹامیل سیڑھیوں کے پاس چھوڑے اور آخری کونے پر واقع ایک چھوٹی عمارت کی طرف بھاگی۔ دونوں کاریں وہاں سے روانہ ہو گئی تھیں۔ وہ سیدھی کھڑی ہو گئی۔ وہ چاہتی تھی کہ جارج جلدی سے واپس آ جائے تاکہ وہ یہاں سے جا سکیں۔

وہ اپنے کولر کی طرف واپس آئی۔ اس کا ہینڈل پکڑا اور گیٹ کی طرف جانے لگی۔ کچھ کارکن دوبارہ نمودار ہوئے لیکن ان کی نظریں جھکی ہوئی تھیں اور انہیں اپنے خوف کی وجہ سے شرمندگی ہو رہی تھی۔

شمٹ اور اس کا فورمین ٹریلر کی طرف واپس آ رہے تھے۔ دونوں کے چہروں پر ناخوشگوار تاثرات تھے۔ اینا اس طرف جانے لگی جہاں کچھ لوگ عمارتی لکڑی کے ڈھیر کے گرد کھڑے ہوئے تھے۔

''رک جاؤ اینا!'' شمٹ چلایا۔

وہ رک گئی لیکن اس نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔

''مجھے تمہارے پیسے دینا ہیں۔'' وہ اس کے پاس آتے ہوئے بولا پھر اس نے اپنے پرس سے ایک بیس ڈالر کا نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔

اینا نے پہلے نوٹ اور پھر شمٹ کی طرف دیکھا پھر اس نے وہ نوٹ تہ کر کے اپنے پرس میں رکھ لیا۔

www.pklibrary.com

''بقیہ پیسے تم رکھ لو۔'' شمٹ نے کہا۔

''شکریہ!''

''کوئی بات نہیں۔'' شمٹ نے پیچھے مڑ کر اپنے فورمین کی طرف دیکھا جو اس سے پانچ میٹر کے فاصلے پر کھڑا تھا۔ شمٹ، اینا کے قریب آ کر بولا۔

''تم نے ان آدمیوں کو دیکھا؟''

اس نے اپنی ٹھوڑی اوپر اٹھائی اور بولی۔ ''ہاں۔''

''تم جانتی ہو کہ وہ کون ہیں؟''

اینا نے سر ہلا دیا۔ ''وہ کسی شخص کی تلاش میں ہیں جو میکسیکن ہے یا کوئی گورا نہیں ہے۔ اس نے ایک بوڑھے شخص کو مارا۔ وہ اسے لوٹ رہے تھے۔ میرا خیال ہے کہ اس کی بہت پٹائی ہوئی ہے۔''

اینا نے بے اختیار اپنے سینے پر ہاتھ رکھ لیا۔

''انہوں نے اس کا جو حلیہ بتایا۔'' شمٹ نے نیچی آواز میں کہا۔ ''وہ تمہارے بھائی چارج سے بہت ملتا ہے۔''

اینا کی آنکھیں سکڑ گئیں اور وہ منہ بناتے ہوئے بولی۔ ''وہ میرا بھائی نہیں تھا۔''

''میں صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ امیگریشن والے کسی کو بھی پکڑ لیں گے۔ تم میری بات سمجھ رہی ہو نا؟''

اینا نے آہستہ سے سر ہلا دیا۔

''تم میری پیشکش کے بارے میں سوچو۔ میں تم جیسی خوب صورت لڑکی کو اپنے بڑے گھر میں دیکھنا چاہتا ہوں۔''

اینا نے اپنے پورے جسم میں ایک تھرتھری محسوس کی۔ یہ سچ ہے کہ امیگریشن والے کسی کو بھی کاغذات نہ ہونے کی بنا پر میکسیکو واپس بھیج سکتے تھے۔ اگر جارج کے ساتھ ایسا ہوا تو نانا ماریا یہ صدمہ برداشت نہیں کر سکے گی۔

شام ہونے تک اینا بری طرح تھک چکی تھی۔ مسلسل چلنے سے اس کے پیر دکھنے لگے تھے اور اسے بہت زور کی بھوک لگ رہی تھی۔ ایسے میں نانا ماریا کی بنائی ہوئی اسپیشل چائے اس کے لیے کارآمد ہو سکتی تھی۔

''تم ٹھیک نہیں لگ رہی ہو۔'' جارج نے گاڑی چلاتے ہوئے کہا۔

''میں تھک گئی ہوں۔'' اینا نے جواب دیا۔

''اب مجھے ملازمت مل گئی ہے اس لیے تمہیں ہر روز ٹامیل بیچنے کی ضرورت نہیں۔''

''اس کے باوجود مجھے کام کرنا ہے۔'' اینا بولی۔ ''میں سارا دن نانا ماریا کے ساتھ گھر پر نہیں بیٹھ سکتی۔'' وہ اپنی دادی سے محبت کرتی تھی لیکن اگر وہ سارا دن اس کے ساتھ رہتی تو ان کے درمیان جھگڑے شروع ہو سکتے تھے۔ اس کے علاوہ نانا ماریا کو اپنی دیگر مصروفیات کے لیے پرائیویسی کی ضرورت بھی تھی۔

جارج نے اپنے کاٹیج کی طرف جانے والے کچے راستے پر ٹرک موڑا۔ اینا کو امید تھی کہ نانا نے چکن یا بیف کا سوپ تیار کر لیا ہوگا اور اس کے ساتھ جارج کی پسند کے کوفتے بھی ہوں گے لیکن جب وہ اپنے گھر کے قریب پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ نانا کے پاس کوئی مہمان آیا ہوا ہے۔ ایک پرانی نسان کار ان کے باغ کے برابر میں کھڑی ہوئی تھی۔ جارج نے ٹرک کی رفتار کم کی اور اسے سڑک کے کنارے کھڑا کر دیا۔

''ہمیں کچن کی طرف سے اندر جانا چاہیے۔'' جارج نے آہستہ سے کہا۔

ان دونوں نے اپنے خالی کولر اٹھائے اور مکان کے گرد چکر لگاتے ہوئے کچن کی طرف گئے۔ جب جارج کولر رکھ رہا تھا تو اینا نے کچن کی کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ نانا نے دھیمی آنچ پر چولہا جلتا ہوا چھوڑ دیا تھا اور جڑی بوٹیوں کا بنڈل کاؤنٹر پر رکھا ہوا تھا۔ اسے بیرونی کمرے میں موم بتی کی روشنی نظر آئی۔ جارج دروازے کی طرف بڑھا تو اینا نے اس کا بازو پکڑ لیا اور اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ جارج نے اثبات میں سر ہلایا اور آہستہ سے دروازے کو دھکا دیا۔

کمرے سے جلے ہوئے لوبان کی تیز خوشبو اور ہلکی آواز میں گنگنانے کی آواز آ رہی تھی۔ یہ کوئی عام گنگناہٹ نہیں بلکہ سنجیدہ قسم کی مذہبی رسم تھی۔ ایک اور آواز آئی اور نانا اپنی گنگناہٹ روک کر غصے سے بولی۔ ''خاموش!'' پھر اس نے پہلے سے زیادہ بلند آواز میں گنگنانا شروع کر دیا۔ کسی کے رونے کی آواز آئی اور رک گئی پھر دوبارہ شروع ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی تین اور آوازیں آنے لگیں۔

''اینا!'' اس کی دادی زور سے چلائی۔ ''جلدی سے انڈا لے کر آؤ۔''

اینا نے سوچنے میں وقت ضائع نہیں کیا۔ وہ کچن میں گئی اور انڈا لے کر آ گئی۔ اس کی دادی ایک نوجوان عورت پر جھکی ہوئی تھی جس کا جسم اکڑا ہوا تھا۔ اس نے اپنے بازو سے اس عورت کے سینے کی ہڈی پر دباؤ ڈالا جبکہ ایک دوسری عمر رسیدہ عورت نے اس کے ٹخنے پکڑ لیے۔ کمرے میں موم بتیاں روشن تھیں اور ایک کونے میں صلیب رکھی ہوئی تھی۔ نانا نے اپنا ایک ہاتھ آگے بڑھایا اور اینا نے وہ انڈا اس

www.pklibrary.com

کے حوالے کر دیا۔

نانا نے انڈا پکڑا اور اس عورت کے سینے پر بیٹھ گئی۔ عورت نے ہانپنا شروع کر دیا اور آنکھیں کھول دیں۔ نانا نے اپنا چہرہ اس عورت پر رکھا اور ہسپانوی زبان میں گنگنانے لگی جو اینا کی سمجھ میں نہیں آیا۔ نانا نے اس عورت کے ہاتھ پر انڈا رکھا اور پہلے اس کے سر اور پھر ناک پر پھیرنے لگی۔ اس عورت نے ہلنے کی کوشش کی اور نانا اس کے جسم سے اتر کر اس کے دھڑ اور پسلیوں پر انڈا پھیرنے لگی۔

چند لمحوں بعد وہ عورت پُرسکون ہوگئی اور اس کا چہرہ نرم ہوگیا۔ نانا ماریا کھڑی ہوئی۔ اس نے اینا کو اشارہ کیا۔ دونوں نے مل کر اس عورت کو اٹھایا اور صوفے پر بٹھا دیا۔ دوسری عورت بھی مریضہ کے برابر میں بیٹھ گئی اور اس کا ہاتھ دیکھنے لگی۔ اینا نے دیکھا کہ وہ دونوں ماں بیٹی تھیں۔

''کیا وہ..... کیا وہ.....'' ماں نے پوچھنا شروع کیا۔

''تقریباً'' نانا ماریا نے کہا۔ ''اس کا خوف بہت مضبوط ہے۔ اس کا علاج بہت پہلے ہو جانا چاہیے تھا۔''

''میں نہیں جانتی تھی۔'' وہ عورت رونے لگی اور اس نے اپنا چہرہ بیٹی کے کندھے پر رکھ دیا۔

''میں ٹھیک ہوں ماما۔'' بیٹی نے سرگوشی میں کہا۔ ''اب میں پہلے سے زیادہ مضبوط ہو جاؤں گی۔ میں محسوس کر رہی ہوں کہ میرے سینے پر سے بوجھ ہٹ گیا ہے۔''

نانا ماریا نے سر ہلایا اور باری باری دونوں عورتوں کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ''میں صوفیہ کے لیے چائے بنا رہی ہوں اور تمہیں اس کی ترکیب بتاؤں گی تاکہ تم گھر پر بنا سکو۔'' پھر اس نے اینا سے کہا۔ ''کیتلی لاؤ۔''

اینا کچن میں گئی۔ اس نے کیتلی میں پانی ڈالا اور اسے چولہے پر رکھ دیا۔ تھوڑی دیر بعد اس کی دادی بھی آ گئی۔ اس نے جھک کر نیچے کے کیبنٹ سے خشک پتوں اور پھولوں کا پلاسٹک بیگ نکالا اور اس میں سے ایک تھوڑی مقدار لے کر ایک پیالے میں ڈال دی پھر اس نے اینا سے پوچھا۔ ''جارج کہاں ہے؟''

اس سارے ہنگامے میں اینا اپنے بھائی کو بھول ہی گئی تھی۔ اس نے چاروں طرف دیکھا جیسے وہ کچن کے کسی کونے میں چھپ کر بیٹھا ہو پھر کندھے اچکاتے ہوئے بولی۔ ''وہ اپنے کمرے میں چلا گیا ہوگا۔ ہم تمہارے کام میں خلل ڈالنا نہیں چاہتے تھے۔''

نانا ماریا نے بے پروائی سے ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا۔ ''وہ لڑکی بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔ وہ گھبرائی ہوئی ہے۔ اس

نامعلوم

ایک صحافی نے موقع واردات پر پہنچ کر تفتیشی افسر سے پوچھا۔

''آپ کو ملزمان کے سلسلے میں کوئی کامیابی ہوئی ہے؟''

''ہمیں سب معلوم ہوگیا ہے۔'' تفتیشی افسر نے کہا۔ ''چند نامعلوم افراد جو یقیناً مسلح تھے، ایک نامعلوم کار میں آئے اور ڈکیتی کر کے نامعلوم مقام کی طرف روانہ ہوگئے۔''

دیسی گھی کی طاقت

ایک دیہاتی دیسی گھی کا کنستر لے کر ٹرین میں سوار ہوا۔ کنستر رکھنے کے لیے ڈبے میں جگہ نہ ہونے کی وجہ سے اس نے ٹرین چلنے کے بعد گھی کا کنستر ٹرین رکوانے والی زنجیر کے ساتھ ٹانگ دیا۔ کنستر کے بوجھ سے زنجیر کھنچ گئی اور ٹرین رک گئی۔ چند لمحوں بعد ٹرین کا عملہ پہنچ گیا اور بلاضرورت ٹرین رکوانے کے جرم میں دیہاتی کو سو روپے جرمانہ کر دیا۔ دیہاتی نے جرمانہ ادا کر دیا لیکن بار بار وہ خوشی سے ہنستا تھا اور مونچھوں کو تاؤ دیتا تھا۔ کسی نے وجہ پوچھی تو وہ بولا۔ ''دیکھی دیسی گھی کی طاقت، اتنی بڑی ٹرین رکوا دی۔''

ترکیب

ایک اسٹیشن پر ٹرین رکی۔ ایک مسافر نے ریلوے گارڈ سے کہا۔ ''میں چائے پینا چاہتا ہوں۔ کوئی ایسی ترکیب بتایئے کہ میرے چائے پینے تک ٹرین نہ چلے، یعنی واپس آنے تک۔''

گارڈ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''بڑی آسان ترکیب ہے۔ آپ مجھے بھی چائے پلانے ساتھ لے چلیں۔''

مرسلہ: ریاض بٹ، حسن ابدال

www.pklibrary.com

کی حال ہی میں شادی ہوئی ہے اور اس کی ماں کو بچوں کی خواہش ہے۔'' پھر اس نے اینا سے پوچھا۔ ''کیا گونزا نے جارج کو ملازمت دے دی؟''

''ہاں!'' اینا نے جواب دیا۔ ''لیکن اسے کمپنی کے مالک مسٹر شمٹ نے ملازمت دی ہے۔''

نانا ماریا بولی۔ ''یہ سفید فام مالکان بچے ہیں۔ وہ خود کام نہیں کرتے یا لوگوں کی نگرانی نہیں کرتے۔ گونزا ہی عملے سے کام لیتا ہے۔''

''تمہیں معلوم ہونا چاہیے نانا کہ مسٹر شمٹ بہت طاقتور ہیں۔''

''مجھے اس پر یقین نہیں۔'' نانا ماریا نے کہا۔ ''میں ایسے لوگوں کو جانتی ہوں، وہ بہت کمزور ہے۔''

اینا نے سوچا کہ کاش اس کی دادی کی بات سچ ہو۔ اس نے کچن کے دروازے سے جھانک کر دیکھا۔ بوڑھی عورت اور اس کی بیٹی اپنی جگہ پر بیٹھی ہوئی تھیں اور جارج اپنے کمرے میں تھا۔ اس نے جلدی جلدی نیچی آواز میں شٹ کے ساتھ ہونے والی مڈبھیڑ کے بارے میں بتا دیا۔ شیرف کے ڈپٹی اور امیگریشن آفیسر کا ذکر کرتے ہوئے اس کے جسم میں ہلکی سی کپکپی طاری ہوگئی لیکن نانا ماریا کے چہرے کے تاثرات تبدیل نہ ہوئے۔ جب اینا کی کہانی ختم ہوئی تو اس کی دادی نے یوں سر ہلایا جیسے اینا ابھی تک ایک چھوٹی بچی ہو۔

''تمہیں شمٹ کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں جانتی ہوں اس کی ایک کمزوری ہے۔''

اینا غصے سے بولی۔ ''میں اور جارج وہاں نہیں جائیں گے۔ اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔''

دادی نے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ''جارج کے لیے یہ ملازمت بہت اہم ہے۔ وہ ہمیشہ ٹامیل نہیں بیچ سکتا۔''

اینا شدید صدمے اور مایوسی کی کیفیت میں تھی۔ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ دادی نے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔ ''مت رو دو اینا! تم دیکھنا سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

اینا نے اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور دونوں بازو سینے پر رکھ لیے۔ دادی نے اس کی حرکت کو نظر انداز کر دیا اور کاؤنٹر سے چائے اٹھاتے ہوئے بولی۔ ''یہ عورتیں چلی جائیں پھر ہم ساتھ بیٹھ کر کھانا کھائیں گے۔ میں نے کوفتوں کا سالن بنایا ہے۔ ہم جارج کی ملازمت کا جشن منائیں گے۔''

اگلے روز صبح جب اینا بیدار ہوئی تو اسے کچن سے لہسن، پیاز اور دوسرے مسالوں کی خوشبو آئی۔ اس نے جلدی سے منہ دھویا، بال سنوارے اور دادی کے پاس پہنچ گئی۔

''تم نے اتنی جلدی کام شروع کر دیا۔'' اینا نے گرم روٹی کا ٹکڑا منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔

اس کی دادی مسکراتے ہوئے بولی۔ ''میں جارج کی وجہ سے جلدی اٹھ گئی۔ آج اس کی ملازمت کا پہلا دن ہے۔''

اینا بھول ہی گئی تھی کہ جارج کو کام پر جانا ہے۔ اس نے کہا۔ ''کیا وہ.....''

''وہ جا چکا ہے۔''

اینا نے کچن کی کھڑکی سے دیکھا۔ اس کا ٹرک باہر کھڑا ہوا تھا۔

''میں نے اس کے لیے سواری کا بندوبست کر دیا تھا۔'' نانا نے وضاحت کی۔ ''ویگا کالڑ کا مارک اسے لینے آیا تھا۔ وہ ایک احمق نوجوان ہے لیکن اس کے پاس اپنی کار ہے۔ وہ بھی گونزا کے پاس کام کرتا ہے۔''

اینا نے سر ہلا دیا لیکن وہ اپنے آپ کو تصور وار سمجھ رہی تھی کہ مارک کا دفاع نہ کر سکی۔ نانا کا مشاہدہ بہت اچھا تھا لیکن بعض اوقات وہ کسی کے بارے میں صحیح رائے قائم نہیں کر سکتی تھی۔ ممکن ہے کہ مارک کی خواہشات محدود ہوں لیکن وہ نرم مزاج اور خوب صورت تھا۔ شاید اب اس سے ملنے کے زیادہ مواقع میسر آ سکیں کیونکہ وہ اور جارج ایک ہی جگہ کام کر رہے تھے۔

اینا نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ اسے عام دنوں کے مقابلے میں کچھ دیر ہو گئی تھی لیکن نانا نے کوئی ہنگامہ نہیں کیا۔ وہ اپنے کمرے میں لباس تبدیل کرنے گئی۔ اس نے کڑھے ہوئے بلاؤز اور پھول دار اسکرٹ کا انتخاب کیا۔ اس کا خیال تھا کہ روایتی لباس سے نامیل بیچنے میں مدد ملتی ہے۔

جب اینا کولر کھینچتے ہوئے ٹرک پر آئی تو دیکھا کہ نانا ماریا پہلے سے ہی پسنجر سیٹ پر بیٹھی ہوئی ہے۔ اس نے سرخ جیکٹ کے ساتھ سفید موتیوں کا نیکلس پہن رکھا تھا۔ اینا نے دونوں کولر ٹرک کے عقبی حصے میں رکھنے کے بعد کہا۔ ''تم یہاں کیا کر رہی ہو؟''

''میں تمہارے ساتھ جاؤں گی۔''

''تمہیں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اپنا کام بہت اچھی طرح کروں گی البتہ جارج کی غیر موجودگی میں کچھ دیر لگ سکتی ہے۔''

''میں تمہاری مدد کروں گی۔''

اینا نے نفی میں سر ہلایا اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئی۔

''اس کے علاوہ.....'' نانا نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''مجھے اپنے محبت کرنے والے لوگوں سے ملنے کا موقع ملے گا۔''

www.pklibrary.com

کھانے کے وقفے میں دیر تھی اس لیے اینا پہلے فری مونٹ ہائٹس کے رہائشی علاقے میں چلی گئی جہاں گھریلو خواتین اسے دادی کے ساتھ دیکھ کر خوش ہوگئیں اور تھوڑی ہی دیر میں اینا کا ایک کولر تقریباً خالی ہوگیا کیونکہ بڑے مکانات ایک دوسرے سے کافی فاصلے پر تھے اس لیے اینا کو کافی ڈرائیونگ کرنا پڑی۔ اس کی کمر اور بازوؤں میں درد شروع ہوگیا لیکن نانا بالکل بھی نہیں تھکی۔ وہ ٹرک سے اتر کر لوگوں کے دروازے تک جاتی اور انہیں سودا دے کر واپس آجاتی۔

وہ اس علاقے میں ایک گھنٹے تک رول بیچتی رہیں پھر اچانک نانا نے کہا۔ ''بس! اتنا کافی ہے۔ میں نے یہ ٹامیل کارکنوں کے لیے بنائے ہیں۔''

اینا نے کہا۔ ''ٹھیک ہے نانا۔ ویسے بھی دوپہر کے کھانے کا وقت ہونے والا ہے۔ ہم گلاس فاؤنٹین کی پارکنگ لاٹ کے قریب رک جائیں گے اور وہاں لوگوں کا انتظار کریں گے۔''

''تمہارے خیال میں گلاس فاؤنٹین اچھی جگہ ہے؟'' نانا ماریا نے پوچھا۔

''ہاں، وہاں ہم ہمیشہ ٹامیل بیچتے ہیں۔''

دادی نے گردن ہلائی لیکن منہ سے کچھ نہیں بولی۔

''ہم سوان کو، پر بھی اپنا سامان بیچ سکتے ہیں جہاں جارج اور گونزا کے آدمی کام کررہے ہیں۔''

''یہ ٹھیک رہے گا۔'' نانا نے کہا۔ ''لیکن گونزا نے اپنے آدمی شٹ کی سائٹ پر بھیج دیے ہیں۔''

''کیسے.....؟'' اینا نے پوچھنا چاہا لیکن رک گئی۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ نانا نے جو کہا وہ سچ ہی ہوگا۔ اب یہ ناگزیر دکھائی دیتا ہے۔ وہ شٹ کو نظر انداز نہیں کرسکتی۔ اس نے دادی کی طرف دیکھا جو کسی بات پر مسکرا رہی تھی۔

کھانے کا وقفہ ہوتے ہی لوگ باہر آنا شروع ہوگئے۔ نانا ماریا کولر کے پاس بالکل تیار کھڑی ہوئی تھی۔ اینا نے تین مرتبہ ہارن بجایا اور زور سے آواز لگائی۔ ''ٹامیل لے لو، ٹامیل۔''

لوگ تیزی سے باہر آنے لگے اور ٹرک کے پاس ایک چھوٹی سی قطار بن گئی لیکن وہ ہمیشہ کی طرح شور شرابا یا قہقہے نہیں لگا رہے تھے۔ اس کے بجائے انہوں نے نظریں نیچی رکھی ہوئی تھیں اور ہلکی آواز میں نانا کو آرڈر دے رہے تھے۔ اینا ان سے پیسے لے رہی تھی اور نانا کولر میں سے ٹامیل نکال کر انہیں دینے لگی۔

ایک آدمی آگے بڑھا اور اس نے آہستہ سے نانا سے کچھ کہا۔ نانا نے اس کی بات غور سے سنی اور زیر لب ایک مختصر سی دعا پڑھ کر اپنی دو انگلیاں اس کے ماتھے پر رکھ دیں۔ اس آدمی نے ٹامیل لینے کے بعد بیس ڈالر دیے اور بقیہ پیسے واپس نہیں لیے۔

''ہیلو اینا!'' جارج نے گیٹ سے باہر آکر ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا۔ اس کے کپڑے گرد آلود ہوگئے تھے گو کہ اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی لیکن بھویں تنی ہوئی تھیں۔

اینا چند قدم آگے بڑھی اور اس کا ہاتھ تھام کر بولی۔ ''تمہارا پہلا دن کیسا رہا؟''

''بہت اچھا۔ البتہ محنت بہت ہے۔'' پھر وہ اس کے قریب ہوتے ہوئے بولا۔ ''تم نانا کو کیوں لے کر آگئیں؟''

''وہ آنے پر اصرار کررہی تھی۔'' اینا نے آہستہ سے کہا۔ ''لیکن اس سے بہت مدد ملی۔ ہر کوئی اس سے محبت کرتا ہے۔''

جارج مطمئن نہیں ہوا۔ ''میں خود یہ کام کرسکتا ہوں۔ مجھے اس کی مدد کی ضرورت نہیں۔''

اس سے پہلے کہ اینا کوئی جواب دیتی، نانا کی آواز آئی۔ ''اینا! یہاں آؤ۔ ان لوگوں سے پیسے لو۔''

اینا دادی کے پاس چلی گئی اور جارج دوسرے لوگوں کے ساتھ قطار میں کھڑا ہوگیا۔ اس نے ٹامیل لینے کے بعد پانچ ڈالر کا نوٹ نکالا۔ اینا نے اسے گھورا تو وہ بولا۔ ''نانا نے کہا ہے کہ میں بھی دوسرے لوگوں کی طرح قیمت ادا کروں کیونکہ اب میں کام کررہا ہوں۔ مجھ سے کوئی رعایت نہیں ہوگی۔''

''باس کہاں ہے؟'' اینا نے پوچھا۔

''وہ ابھی تک اندر ہی ہے۔''

''نہیں۔ میرا مطلب ہے کہ مسٹر شٹ کہاں ہیں؟''

جارج نے کندھے اچکائے اور بولا۔ ''مجھے نہیں معلوم۔ میں نے صبح سے اسے نہیں دیکھا۔''

جب آخری آدمی نے ٹامیل لے لیا تو اینا جلدی جلدی رقم گننے لگی۔ آج کا دن بہت اچھا رہا۔ ایک کولر خالی ہوگیا تھا۔ اینا اسے لے کر ٹرک کے پیچھے جانے لگی جب واپس آئی تو دیکھا کہ نانا دوسرا کولر گھسیٹتے ہوئے گیٹ کی طرف جارہی ہے۔ اینا تیزی سے اس کی جانب لپکی۔ ''نانا! تم کہاں جارہی ہو؟''

نانا تیزی سے قدم بڑھانے لگی۔ اینا نے کہا۔ ''یہ تم کیا کررہی ہو؟ تم اس راستے سے نہیں جاسکتیں۔ اس گیٹ

www.pklibrary.com

سے لوگ باہر آتے ہیں۔"

نانا نے اپنا ہاتھ اس طرح ہلایا جیسے مکھی اڑا رہی ہو۔ وہ ٹریلر کی سیڑھیوں کے پاس پہنچی۔ اس سے پہلے کہ اینا اسے روکتی، اس نے کولر سیڑھیوں پر رکھ دیا۔ اینا نے اس کے بلاؤز کی آستین پکڑ لی۔ نانا نے مڑ کر دیکھا۔ اس کا چہرہ سخت اور سپاٹ تھا اور ہونٹ بھنچے ہوئے تھے۔ اینا نے جلدی سے اپنا ہاتھ نیچے کرلیا۔ نانا پلٹی اور اس نے دروازے پر دستک دی۔

"اندر آجاؤ۔"

اینا بھی دادی کے ساتھ اندر چلی گئی۔ شمٹ نے انہیں دیکھا اور اس کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا۔ "اینا! تم اپنے ساتھ ایک خاص مہمان لے کر آئی ہو۔"

"یہ میری دادی ماریا سوتو ہے۔"

"تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی مادام۔" شمٹ نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا اور نانا نے دونوں ہاتھوں سے اسے تھام لیا۔ شمٹ نے اینا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "تو یہ تمہارے ٹامیل کا راز ہے؟"

"ہم کچن میں ایک ساتھ کام کرتے ہیں۔" اینا نے وضاحت کی۔

نانا نے کولر سے تین پیکٹ نکالے اور ان میں سے دو ریفریجریٹر میں رکھ دیے۔ "میں نے تمہیں سب سے بہترین ٹامیل دیے ہیں۔" اس نے انگریزی میں کہا۔

اینا حیران رہ گئی۔ اس نے کبھی دادی کی زبان سے اتنی رواں انگریزی نہیں سنی تھی۔ وہ بہ مشکل چند الفاظ ہی ادا کر پاتی تھی۔

شمٹ نے بیس ڈالر کا نوٹ نکالا اور اینا کو دیتے ہوئے بولا۔ "بقیہ تم رکھ لو۔" اس کے بعد وہ واپس اپنی میز پر آیا۔ اس نے چابیاں نکالیں اور ایک کارڈ پر کچھ لکھ کر اینا کو دیا۔

"جارج نے صبح مجھے تمہارا پیغام دے دیا تھا کہ اب تم میرے گھر آنے کے لیے تیار ہو۔"

اینا کے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔ بالآخر اس نے سرگوشی میں کہا۔ "ہاں"..... اور دادی کی طرف دیکھا جس کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا۔

"میں نے اس پر اپنا پتا لکھ دیا ہے۔" شمٹ نے کارڈ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "تم کب سے کام پر آسکتی ہو؟"

"کل سے۔" نانا ماریا نے جواب دیا۔

شمٹ نے پہلے ماریا اور پھر اینا کی طرف دیکھا۔ "بہت خوب! وہاں اینا اور جارج کے لیے بہت کام ہے۔"

"میری پوتی خادمہ نہیں ہے۔" نانا ماریا نے کہا۔

"میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ اینا میرے گھر کا انتظام سنبھال لے اور کام کی نگرانی کرے۔ اس کے لیے مجھے ایک مضبوط عورت کی ضرورت ہے۔ باغ کی حالت بہت خراب ہے۔ قالین اور فرنیچر کی صفائی ہونی ہے۔ میرے کپڑے لانڈری بھیجنے ہیں اور یہ کھانا بھی بنا سکتی ہے۔"

نانا ماریا نے تائید میں سر ہلایا۔ "تمہارے لیے کھانا بن جائے گا۔ ہماری فیملی کو بہت سی خاص ڈشز بنانا آتی ہیں۔"

شمٹ نے اینا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں جانتا ہوں۔"

ٹرک کی طرف واپس آتے ہوئے اینا نے کہا۔ "نانا! تم نے مجھے شمٹ کے ہاتھ بیچ دیا، جارج کی ملازمت کے لیے؟ یہ تم نے اچھا نہیں کیا۔"

نانا ماریا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "وہ بہت جلد سدھر جائے گا۔ ایک سدھائے ہوئے گھوڑے کی طرح۔"

اینا جانتی تھی کہ اس کی دادی نے شوہروں کے ظلم و ستم سے بچانے کے لیے کئی عورتوں کی مدد کی ہے۔ وہ اچانک رک گئی اور دادی کا کندھا پکڑ کر بولی۔ "تم نے شمٹ کے ٹامیل میں کیا ملایا ہے؟"

بوڑھی عورت اپنا بازو چھڑاتے ہوئے بولی۔ "سب ٹھیک ہوگا۔"

"تم اسے نقصان نہیں پہنچا سکتیں۔ ہر کوئی جانتا ہے کہ ہم ٹامیل بیچتے ہیں۔ اگر کسی اور نے وہ ٹامیل کھالیے تو کیا ہوگا؟"

نانا اپنی آنکھیں گھماتے ہوئے بولی۔ "اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تم کہتی ہو کہ وہ ہر ہفتے بہت سے ٹامیل خریدتا ہے؟"

"ہاں! یہ سچ ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ لنچ اور ڈنر میں یہی کھاتا ہے کیونکہ اس کی بیوی مر چکی ہے اور اس کے گھر میں کھانا پکانے والا کوئی نہیں ہے۔"

"اور اب ہم اس کے لیے کھانا بنائیں گے۔" نانا نے کہا۔

شمٹ شہر سے باہر پانچ ایکڑ پر پھیلے ہوئے ایک بڑے مکان میں رہتا تھا۔ نانا اس کے لیے کھانا تیار کرتی اور اسے اس بات کی پروا نہیں تھی کہ اس نے اینا کو اس کے بستر کی زینت بنا دیا ہے۔ وہ اینا کے اعصاب کو پُرسکون رکھنے کے لیے سکون بخش چائے تیار کرتی۔ اینا کے خیال میں شمٹ شریف آدمی تھا۔ وہ اس سے نرم لہجے میں بات کرتا اور اسے عمدہ لباس خرید کر دیتا۔ جب لائٹ بجھ جاتی

www.pklibrary.com

تو وہ اپنے ذہن کو کھلا چھوڑ دیتی اور اس کے خیالوں میں کوئی دوسرا شخص آجاتا۔

بعض اوقات جب وہ شمٹ کے ساتھ ہوتی تب بھی وہ مارک کے بارے میں سوچنے لگتی جبکہ نانا ماریا نے ہمیشہ اسے بری نظر سے دیکھا اور اس کے لیے سخت الفاظ استعمال کیے جس کی وجہ سے اینا اس میں اور زیادہ کشش محسوس کرنے لگی۔ وہ ایک خوب صورت اور معزز شخص تھا اور اس کا واحد جرم جارج کا دوست ہونا تھا۔

اینا اور نانا ماریا، شمٹ کے مکان کو ٹھیک کرنے میں لگی رہتیں جبکہ وہ دن بھر سائٹ پر رہتا۔ اینا نے کئی کمپنیوں سے رابطہ کیا اور بہت جلد لان کی صفائی ہوگئی۔ قالین دھل گیا۔ سوئمنگ پول کا گدلا پانی نکال کر اسے دوبارہ بھرا گیا۔ دو عورتیں ہفتے میں دو مرتبہ آکر گھر کی صفائی کرنے لگیں۔

بعض اوقات جارج بھی مارک کے ساتھ مل کر مویشیوں کے باڑے اور اصطبل کی مرمت کا کام کرتا۔ اس نے گھر کے کئی کمروں پر رنگ کر دیا تھا اور تہ خانے کی صفائی بھی شروع کر دی تھی۔ وہ یہ کام شام میں یا چھٹی والے روز کیا کرتا تھا کیونکہ دن میں اسے شمٹ کی سائٹ پر کام کرنا ہوتا تھا۔ وہ بری طرح تھک جاتا تھا لیکن اسے اس بات کی خوشی تھی کہ وہ کچھ کمائی کر رہا ہے۔ شمٹ نے اسے کمپنی کا ٹرک استعمال کرنے کی اجازت بھی دے دی تھی۔

نانا ماریا نے پوری طرح کچن سنبھال لیا تھا۔ وہ گروسری کا سامان فریج میں رکھ دیتی اور شمٹ کے لیے ٹامیل کے علاوہ دوسری ڈشز بھی تیار کرتی رہتی۔ اس کا بڑا حصہ وہ اپنے ساتھ گھر لے جاتی اور جارج خوب پیٹ بھر کر کھاتا۔

ایک دوپہر شمٹ نے اینا سے کہا کہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور وہ اپنی دادی کے ساتھ گھر جاسکتی ہے۔ وہ فریج میں رکھا ہوا کھانا رات کو کھالے گا۔ جب اس کی طبیعت ٹھیک ہوجائے گی تو وہ اسے بتادے گا۔

لیکن جب اس نے دوبارہ فون کیا تو صرف یہ پوچھا کہ کیا جارج اور مارک سوئمنگ پول پر کام کرنے کے لیے پہنچے؟ اس کے لہجے میں سرد مہری تھی اور وہ پریشان لگ رہا تھا۔

ایک روز شام کے وقت جارج گھر آیا تو اس کے ساتھ مارک بھی تھا۔ دونوں مسکرا رہے تھے۔ ''ہیلو اینا!'' مارک نے کہا۔ ''تم سے مل کر بہت اچھا لگ رہا ہے۔''

''شکریہ!'' اینا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''تم بھی بہت اچھے لگ رہے ہو۔ میں تمہارے لیے ڈرنک لاتی ہوں۔''

وہ واپس کچن میں گئی اور فریج میں سے بیئر کی دو بوتلیں لے کر آئی۔

''ہمیں ہر روز محنت کرنا چاہیے۔'' جارج نے مارک سے کہا۔

''تم اتنے زیادہ تھکے ہوئے تو نہیں لگ رہے۔'' اینا نے انہیں بوتلیں دیتے ہوئے کہا اور مارک کی طرف دیکھ کر مسکرادی۔

جارج نے بیئر کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ ''تم غلط سمجھ رہی ہو۔ آج ہم نے بالکل کام نہیں کیا۔''

''ہمیں شمٹ کے گھر، صحن اور کنج میں رنگ کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا لیکن رنگ نہیں آیا اس لیے ہم ساری دوپہر تالاب میں نہاتے رہے۔'' مارک نے کہا۔

اینا کا منہ بن گیا۔ اسے اس پروجیکٹ کا علم نہیں تھا۔ شاید شمٹ نے اپنی جائداد کی دیکھ بھال میں دلچسپی لینا شروع کر دی تھی۔ اس نے کہا۔ ''تم سائٹ پر واپس کیوں نہیں گئے؟''

جارج نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ''ہم نے اسے فون کر کے بتادیا تھا کہ ہمیں رنگ نہیں ملا تو اس نے کہا کہ کوئی بات نہیں، گرمی بہت ہے۔ تم لوگ سوئمنگ پول میں تیراکی کرو۔''

''کیا یہ سچ ہے؟'' اینا نے پوچھا۔ وہ جانتی تھی کہ اس کا بھائی کام چور اور آرام طلب ہے۔

''ہاں۔'' مارک نے کہا۔ ''وہ خود شام کو رنگ لے کر آیا تھا لیکن اس نے کہا کہ اب بہت دیر ہوچکی ہے لہٰذا ہم تینوں ڈرنک کرتے اور تالاب میں نہاتے رہے۔''

''یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔'' جارج نے وضاحت کی۔ ''ہم پانی میں ایک گیم کھیل رہے تھے جس میں تالاب کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جانے والے کو روکنے کی کوشش کی جاتی ہے۔''

اینا نے اس بارے میں سوچنے کی ضرورت محسوس نہیں کی لیکن وہ خوش تھی کہ شمٹ کی صحت بحال ہو رہی ہے۔ وہ کچن جانے کے لیے مڑی تو دیکھا کہ نانا ماریا دروازے میں کھڑی ہوئی ہے۔ وہ ہمیشہ کی طرح مارک کو غصے سے دیکھ رہی تھی لیکن ساتھ ہی اس نے آہستہ سے سر ہلایا جیسے اس نے جو کچھ سنا، وہ اس سے مطمئن تھی۔

ایک ہفتے بعد جمعے کی شب ڈنر کے بعد اینا کے فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے اسکرین پر نام دیکھا اور بولی۔ ''جارج! کیا ہو رہا ہے؟'' اس روز وہ شام میں شمٹ کے گھر کام کر رہا تھا۔

ایک طویل وقفے کے بعد جارج نے آہستہ سے کہا۔

www.pklibrary.com

''مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ یہاں شمٹ کے گھر ایک خوفناک حادثہ ہوگیا ہے۔''

اینا چونکتے ہوئے بولی۔ ''کیسا حادثہ؟ کیا تم نے ایمبولینس بلائی؟''

''اینا! پلیز آجاؤ۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ کیا کروں؟''

اینا نے چلانا چاہا لیکن اس نے دیکھا کہ نانا ماریا دروازے میں کھڑی اسے دیکھ رہی تھی۔

''جارج کا فون تھا۔'' اینا نے کہا۔ ''ہمیں فوراً شمٹ کے گھر جانا چاہیے۔ وہاں ایک حادثہ ہوگیا ہے۔''

نانا ماریا بے حس و حرکت کھڑی رہی جیسے کچھ سوچ رہی ہو۔ اینا اس کے قریب آکر بولی۔ ''تم نے کیا کردیا ہے؟ تمہارے جادو کا الٹا اثر ہوا۔''

نانا نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''نہیں اینا۔ میں نے کچھ نہیں کیا لیکن میں شمٹ کی نقصانی خواہشات کے لیے جوابدہ نہیں ہوں۔''

اینا اپنے کمرے میں کوٹ اور پرس لینے گئی۔ جب وہ ٹرک پر سوار ہونے لگی تو دیکھا کہ دادی پہلے سے اس کا انتظار کررہی تھی۔ شمٹ کا مکان اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ ٹرک کی آواز سن کر جارج باہر آیا۔ اس نے جینز اور ٹی شرٹ پہن رکھی تھی لیکن پیروں میں جوتے نہیں تھے۔

''اس طرف۔'' یہ کہہ کر وہ واپس مکان میں چلا گیا۔ دادی اور اینا بھی اس کے پیچھے گئیں۔ اینا کا خیال تھا کہ وہ انہیں بیڈروم یا غسل خانے میں لے کر جائے گا لیکن وہ مکان میں سے گزر کر عقبی حصے کی طرف گیا جہاں تالاب میں ایک لاش تیر رہی تھی۔

''جارج!'' اینا نے سخت لہجے میں کہا۔ ''لائٹ جلاؤ۔''

جارج چھوٹے سے کمرے میں گیا اور اگلے ہی لمحے فلڈ لائٹ کی تیز روشنی پانی پر پڑی۔ اینا نے شمٹ کی لاش کو دیکھا اور ششدر رہ گئی۔ دوسرے ہی لمحے نانا ماریا تالاب میں اتری اور اس نے سیڑھیوں پر کھڑے ہوکر لاش کو اپنی جانب کھینچا اور پوری طاقت لگا کر اسے باہر نکال لیا۔

اینا نے دیکھا کہ شمٹ کا چہرہ نیلا پڑ چکا تھا اور زبان منہ سے باہر آگئی تھی۔ اس کے ماتھے پر ایک گہرا زخم تھا۔ اینا نے پلٹ کر جارج کی طرف دیکھا۔ اس کی کلائیوں پر بھی خراشیں تھیں۔

نانا ماریا نے شمٹ کی آنکھیں دیکھیں اور مطمئن ہونے کے بعد اس کے ہاتھ کے ناخنوں کا معائنہ کیا پھر انہیں اپنی شال سے صاف کرنے کے بعد لاش کو ایک طرف ہٹا دیا۔

''اب تمہارا علاج کیا مدد کرسکتا ہے؟'' اینا نے پوچھا۔

''وہ باس نہیں بھونرا تھا۔'' جارج نے تالاب کے کنارے پر تھوکتے ہوئے کہا۔

''نہیں۔ یہ نہیں ہوسکتا۔'' اینا نے کہا۔

''یہ سچ ہے۔ وہ مجھے چھونا چاہتا تھا۔ جب ہم پانی میں کھیل رہے تھے تو اس نے مجھے پکڑ لیا۔'' جارج نے وضاحت کی۔ ''مجھے بہت غصہ آیا لیکن تم مجھے الزام نہیں دے سکتیں۔''

اینا نے اپنی دادی کی طرف دیکھا اور بولی۔ ''تم نے سب کچھ تباہ کردیا نانا! اگر تم ہماری مدد کرنا چاہتیں تو جارج کا غصہ کم کرسکتی تھیں۔''

دادی نے اپنی آنکھیں اوپر اٹھائیں اور بولی۔ ''مت بھولو کہ تم بھی شمٹ سے خوفزدہ تھیں۔''

اینا نے دادی کا پرس اٹھایا۔ اس کی تہ میں کپڑے کا ایک چھوٹا بٹوا رکھا ہوا تھا۔ اینا کو اس میں صرف دو ہزار ڈالرز نظر آئے۔ اس نے جارج کو ایک ہزار ڈالرز دے کر کہا۔ ''تم جوتے پہنو۔ ریل سے مت جانا۔ ہم تمہیں بس اسٹیشن پر چھوڑ دیں گے۔ تم سوموار سے پہلے میکسیکو پہنچ جاؤ گے۔ اس سے پہلے شمٹ کی گمشدگی کا کسی کو پتا نہیں چلے گا۔''

جارج نے پیسے اپنی جیب میں رکھے اور بولا۔ ''میں جوتے پہن لوں۔'' یہ کہہ کر وہ مکان کے اندر چلا گیا۔

اینا نے دادی سے کہا۔ ''تمہارے جادو نے جارج کو میکسیکو جانے پر مجبور کردیا۔''

نانا ماریا نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ''یہ جلاوطنی عارضی ہے۔ وہ چند مہینوں میں واپس آسکتا ہے۔ ایک دفعہ یہ معاملہ ٹھنڈا ہوجائے تو اسے دوبارہ گونزا کے پاس ملازمت مل جائے گی۔''

اینا جانتی تھی کہ یہ اتنا آسان نہیں ہے۔ ''معاف کرنا دادی! اب جارج کو ہمیشہ وہیں رہنا ہوگا۔ وہ پولیس کو مطلوب ہے۔''

''نہیں۔'' نانا ماریا نے کہا۔ ''جارج چلا گیا تو پولیس کسی بھی سانولی رنگت والے شخص کو پکڑ لے گی۔ مارک ایک بے کار نوجوان ہے جس نے شمٹ کے ساتھ کئی گھنٹے گزارے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ بہت موزوں رہے گا۔ کیا تم اس سے متفق نہیں ہو، اینا؟''

اینا نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ بھائی کو بچانے کے لیے وہ یہ قربانی دینے پر تیار ہوگئی۔

⌘⌘⌘

www.pklibrary.com

اصل بات

نجمہ مودی

جب قانون اندھا ہونے کے ساتھ ساتھ بہرا بھی ہو جائے اور جہاں طاقتور کمزوروں پر ظلم ڈھاتے ہوں اور جہاں نیکی کرنے میں لوگ ڈر محسوس کرنے لگیں تو وہاں بے حسی راج کرتی ہے ... جیسے کہ یہاں... وہ چاہ کر بھی اس کی مدد نہیں کر سکا البتہ ظالم کا نہ چاہتے ہوئے بھی ساتھ دینا پڑا کیونکہ طاقت جب ظلم کا روپ دھارلے تو بے حسی ... واقعی دلوں پر راج کرتی ہے۔

انسانی اعضا کی

خوفناک تجارت

اور بے حرمتی کا ماجرا

سڑک پر کہیں کہیں گڑھے پڑے ہوئے تھے۔ شہزاد نے اچانک بریک لگائے تھے اگر اس کے برابر کی سیٹ پر عالیہ سنبھل کر نہ بیٹھی ہوتی تو شاید اس کا سر ڈیش بورڈ سے جا ٹکراتا۔ شہزاد کے اچانک بریک لگانے کی وجہ سڑک کا کوئی گڑھا نہیں تھا۔ عالیہ نے بھی اس ''وجہ'' کو دیکھ لیا تھا۔ وہ بڑا سا ایک جنگلی کتا تھا جو اچانک سڑک کے ایک طرف سے نمودار ہوا تھا اور دوڑتا ہوا سڑک عبور کر کے دوسری طرف جھاڑ جھنکاڑ کے عقب میں تاریکی اور ویرانے میں کہیں غائب ہو گیا تھا۔ اگر شہزاد نے بروقت بریک نہ لگائے ہوتے تو گاڑی ضرور کتے سے ٹکرا جاتی، شاید اس پر چڑھ جاتی یا پھر اسے کچلتی ہوئی گزر جاتی۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ شہزاد کی پرانی سی گاڑی کے بریک عمدگی سے کام کرتے تھے۔

''تم نے دیکھا.....؟'' شہزاد نے اپنی بیوی عالیہ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ اس کی آنکھیں ذرا پھیلی ہوئی تھیں۔ آنکھیں تو عالیہ کی بھی پھیلی تھیں لیکن صرف ایک لمحے کے لیے۔ دوسرے ہی لمحے وہ دوبارہ سنبھل کر یوں بیٹھ گئی تھی

www.pklibrary.com

جیسے اسے جھٹکا بھی نہیں لگا تھا۔ اسے کچھ ہوا بھی نہیں تھا اور نہ ہی اس نے کچھ دیکھا تھا۔

''ہاں، دیکھا تو تھا۔'' عالیہ نے بے پروائی سے کہا۔

''کوئی آوارہ کتا تھا..... لیکن تم اتنے حیران کیوں ہو رہے ہو؟ کیا تم نے اس سے پہلے کبھی کوئی آوارہ کتا نہیں دیکھا؟ آج کل تو ہر شہر، قصبہ، گاؤں آوارہ کتوں سے بھرا پڑا ہے۔ مجھے تو ڈر ہے کچھ دنوں میں کتوں کی تعداد انسانوں سے نہ بڑھ جائے۔ حد نہیں ہوگئی؟ اب یہ ایسے ویرانوں میں بھی آن پہنچے ہیں۔''

''ارے..... میں نے تم سے کتوں کی بڑھتی ہوئی تعداد پر تبصرہ کرنے کے لیے نہیں کہا تھا۔'' شہزاد ہلکی سی بیزاری سے بولا۔ ''میں تو یہ پوچھنا چاہ رہا تھا، کیا تم نے نہیں دیکھا کہ کتے کے منہ میں کچھ تھا؟''

''ہاں..... کچھ تھا، تو سہی.....!'' عالیہ نے نہایت معصومیت سے تسلیم کیا پھر سوالیہ انداز میں شہزاد کی طرف دیکھا، گویا چاہ رہی ہو کہ شہزاد خود ہی اپنی بات کی وضاحت کردے۔

''کتے کے منہ میں کسی انسان کا سر تھا۔'' شہزاد نے گویا اپنی چڑچڑاہٹ پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''لگا تو مجھے بھی کچھ ایسا ہی تھا۔'' عالیہ نے تسلیم کیا۔ ''لیکن میں یہی سمجھی کہ شاید میری آنکھوں نے دھوکا کھایا ہے۔ اس ویرانے میں بھلا کتے کو انسان کا کٹا ہوا سر کہاں سے مل سکتا ہے؟''

''یہ دنیا ہے۔ یہاں کسی بھی جگہ، کسی بھی وقت، کچھ بھی ہوسکتا ہے۔'' شہزاد نے گہری سنجیدگی سے کہا اور گردن موڑ کر اس طرف اندھیرے میں کچھ دیکھنے کی کوشش کرنے لگا جس طرف کتا دوڑتے ہوئے غائب ہوگیا تھا۔ عالیہ کی نظروں نے بھی اس کی تقلید کی لیکن دونوں ہی کو اس طرف کچھ نظر نہ آیا۔

عالیہ کو جیسے کوئی خیال آیا۔ گردن گھما کر دوبارہ شہزاد کی طرف دیکھتے ہوئے ذرا تیکھے لہجے میں بولی۔ ''اب تم شرلاک ہومز بننے کی کوشش نہ کرنا اور گاڑی سے اتر کر اس کتے کی تلاش میں نہ چل دینا۔ کچھ بعید نہیں، وہاں جھاڑ جھنکاڑ میں ڈاکو، لٹیرے چھپے بیٹھے ہوں۔ وہ تمہیں دبوچ لیں اور یہاں اکیلے گاڑی میں بیٹھے بیٹھے خوف سے میرا دم نکل جائے۔''

''آج کل ڈاکو، لٹیرے اندھیرے میں جھاڑ جھنکاڑ میں چھپ کر اپنے شکار کا انتظار نہیں کرتے۔'' شہزاد نے نرم لہجے میں گویا اس کی غلط فہمی دور کرنے کی کوشش کی۔ ''وہ تو اب دھڑلے سے ہائی ویز پر بھی کوئی رکاوٹ یا گاڑی آڑی ترچھی کھڑی کر کے، ایک قسم کا ناکا لگا کر ٹریفک روک لیتے ہیں اور ایک وقت میں بیس تیس گاڑیوں کے مسافروں کو لوٹ کر اطمینان سے فرار ہوجاتے ہیں۔''

''اس کے باوجود تم نے اچھا بھلا موٹر وے چھوڑ کر خوشاب کا بورڈ نظر آتے ہی گاڑی ریمپ پر اتار لی اور اس سڑک پر آن پہنچے کیونکہ اچانک ہی تمہیں اپنا آبائی قصبہ یاد آگیا تھا۔ اپنی بیوہ اور بے اولاد بہن سے ملنے کے لیے تمہارا دل تڑپ اٹھا تھا۔ یہ بھلا کوئی وقت ہے حاجرہ آپا کے گھر جانے کا؟ اگر ہم خیریت سے ان کے گھر تک پہنچ گئے تو وہ بے چاری ہمیں دیکھ کر خوش ہونے سے زیادہ حیران پریشان ہوجائیں گی۔'' عالیہ کے لہجے میں نہایت ہی خفیف سی ناگواری تھی۔ وہ شاید شعوری طور پر اپنا لہجہ نرم رکھنے کی ہر ممکن کوشش کر رہی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ رشتوں ناتوں کا موضوع شہزاد کے لیے ایک نازک موضوع تھا۔

ادھیڑ عمر شہزاد ایک سرکاری کالج میں لیکچرر تھا جبکہ عالیہ ایک اچھے پرائیویٹ اسکول میں ٹیچر تھی۔ وہ لاہور میں رہتے تھے لیکن اس وقت ایک قریبی عزیز کے جنازے اور تدفین میں شرکت کے بعد اسلام آباد سے موٹر وے کے راستے لاہور واپس جا رہے تھے۔ جب راستے میں ایک ذیلی سڑک کے سرے پر ''خوشاب'' کا بورڈ شہزاد کو گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس کی روشنی میں چمکتا نظر آگیا تھا اور اس نے گاڑی ریمپ سے اس طرف موڑ لی تھی۔

بورڈ دیکھ کر درحقیقت شہزاد کو اپنی بڑی بہن شاہینہ یاد آگئی تھی جو بدقسمتی سے جوانی میں ہی بیوہ ہوگئی تھی۔ اس کے ہاں کوئی اولاد نہیں تھی اور وہ شہزاد اور دیگر کئی قریبی رشتے داروں کے اصرار کے باوجود دوسری شادی پر تیار نہیں ہوئی تھی۔ تب سے وہ خوشاب میں ہی اپنے چھوٹے سے مکان میں تنہا رہ رہی تھی۔ شہزاد اور عالیہ کے خاصے اصرار کے باوجود وہ مستقل طور پر ان کے ساتھ رہنے کے لیے لاہور نہیں آئی تھی۔ آخر کار شہزاد نے گویا اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا تھا۔ تاہم سال چھ مہینے میں ایک مرتبہ شہزاد اور عالیہ دو چار دن کے لیے اس کے پاس چلے جاتے تھے اور واپسی میں اسے دو چار دن کے لیے اپنے ساتھ لے آتے تھے۔ اب تو وہ بڑھاپے کی حدود میں قدم رکھ چکی تھی اور تنہا رہنے کی اس کی عادت پختہ ہوچکی تھی۔ اپنی گلی اور آس پاس کے علاقے میں اس کی شہرت ایک دین دار عورت کی تھی۔ شام کو اس کے ہاں چند بچے سپارہ پڑھنے بھی آتے تھے۔

شہزاد نے گاڑی سڑک کے ایک طرف کر لی تھی لیکن ابھی وہیں رکا ہوا تھا جہاں اس نے کتے کو روڈ کراس کر کے

www.pklibrary.com

غائب ہوتے دیکھا تھا۔ گاڑی کا انجن اسٹارٹ تھا اور ہیڈ لائٹس آن تھیں۔ اس دوران دو تین گاڑیاں ان کے قریب سے گزریں۔ گاڑیوں میں موجود چند افراد نے گردن گھما کر شہزاد کی طرف دیکھا کہ شاید اسے کسی مدد کی ضرورت ہو لیکن شہزاد نے انہیں کسی قسم کا اشارہ نہیں کیا حالانکہ اس کا جی چاہا تھا کہ وہ کسی کو روک کر اس کتے کے بارے میں بتائے جسے اس نے انسانی سر کو منہ میں دبائے بھاگتے دیکھا تھا لیکن وہ ہچکچاہٹ کا شکار رہا اور کسی کو بھی رکنے کا اشارہ نہ کر سکا۔

اس نے ایک بار پھر آنکھیں سکیڑ کر اندھیرے میں گویا اس کتے کو تلاش کرنے کی کوشش کی اور خود کلامی کے سے انداز میں بڑبڑایا۔ ”نہ جانے کس بدنصیب کا سر ہوگا وہ..... اور کس ظالم نے اسے تن سے جدا کیا ہوگا۔“

پھر اس نے دائیں بائیں دونوں طرف نظر دوڑائی۔ دونوں طرف بہت دور کہیں اِکا دُکّا روشنیاں ٹمٹماتی سی دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ عالیہ کی طرف دیکھے بغیر اس سے مخاطب ہوا۔ ”اردگرد کئی چھوٹے چھوٹے قصبے اور گاؤں ہیں۔ نہ جانے مقتول کا تعلق ان میں سے کس جگہ سے ہوگا اور کہاں یہ واقعہ پیش آیا ہوگا۔“

”یہ معلوم کرنا آپ کی ذمے داری نہیں ہے۔“ عالیہ اب اپنے لہجے کی بے تابی کو نہ چھپا سکی۔ ”آپ گاڑی چلائیں۔ اس ویرانے میں اتنی دیر اس طرح کھڑے نہ ہوں۔ کہیں خدانخواستہ ہمارے ساتھ ہی کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہ آجائے۔ اگر آپ موٹروے چھوڑ کر ادھر نہ مڑتے تو شاید اس وقت ہم لاہور کے قریب ہوتے۔“

شہزاد نے شاید کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن پھر ارادہ ملتوی کر دیا اور نہایت آہستگی سے گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے رفتہ رفتہ اسے دوبارہ سڑک پر لے آیا لیکن اس کے بعد بھی کچھ دیر تک اس کی رفتار کم ہی رہی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کتے کو تلاش کیے بغیر اس کا آگے جانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا لیکن وہ مجبوراً جا رہا تھا۔ سڑک پر اب دور تک کوئی گاڑی آگے جاتی یا پیچھے سے آتی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ اب ان کے ذہنوں پر گویا کچھ زیادہ ہی ویرانی کا احساس پنجے گاڑ رہا تھا۔ حالانکہ وہ ایک قریبی عزیز کی آخری رسوم میں شرکت کر کے واپس آرہے تھے لیکن جب تک وہ موٹروے پر سفر کرتے رہے، تب تک ان کے دلوں پر ایسی افسردگی نہیں تھی جیسی اب محسوس ہو رہی تھی اور نہ ہی ویرانی کا احساس اس طرح بے چین کر رہا تھا۔

شاید شہزاد اب پہلے جیسی یکسوئی سے ڈرائیونگ نہیں کر پا رہا تھا۔ ایک گڑھے کو وہ بروقت نہ دیکھ سکا اور کار اس پر سے گزرتے وقت بری طرح اچھل پڑی۔ دوسرے ہی لمحے کار کے پیچھے کی طرف سے کھڑکھڑاہٹ کی سی آواز مسلسل سنائی دینے لگی۔

”اللہ خیر کرے.....“ شہزاد خود کلامی کے سے انداز میں بولا۔ ”کہیں سائلینسر ٹوٹ کر نہ لٹک گیا ہو۔“ مگر چند لمحے بعد آواز خود بخود ہی بند ہوگئی۔ گاڑی بدستور چلتی رہی اور انجن کی آواز میں بھی کوئی فرق نہ پڑا تب شہزاد نے یہ سوچ کر اطمینان کی سانس لی کہ اگر گاڑی کی کوئی چیز ٹوٹی بھی تھی تو وہ اہم نہیں تھی۔ اس کے بعد غیر ارادی طور پر اس نے گاڑی کی رفتار بڑھا لی۔

عالیہ فوراً بول پڑی۔ ”آہستہ چلاؤ۔ کوئی ہمارے پیچھے تو نہیں لگا ہوا ہے۔ سڑک کی حالت کچھ اتنی اچھی بھی نہیں ہے۔“

شہزاد نے ایکسلریٹر پر پاؤں کا دباؤ کچھ کم کر لیا۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد عالیہ نے پیشکش کی۔ ”اگر تم چاہو تو میں بھی ڈرائیو کر سکتی ہوں۔“

”تم نے تو اسلام آباد سے چلتے وقت کہا تھا کہ تم سخت تھکی ہوئی ہو اور تمہیں نیند بھی آرہی ہے۔“ شہزاد نے اسے یاد دلایا۔

”ہاں..... یہ بات تو ہے.....“ عالیہ نے تسلیم کیا۔ ”لیکن ڈرائیونگ تو میں پھر بھی کر سکتی ہوں۔“

”تم فی الحال مجھے اور اس گاڑی کو معاف ہی رکھو تو اچھا ہے۔“ شہزاد نے نرمی سے کہا۔ عالیہ نے اصرار نہیں کیا۔

شہزاد کے ذہن میں ابھی تک وہ کتا پھنسا ہوا تھا جسے اس نے انسانی سر اٹھائے بھاگتے دیکھا تھا۔ ہیڈ لائٹس کی روشنی میں کتا اسے صرف چند سیکنڈز کے لیے ہی نظر آیا تھا۔ اسے یہ بھی اندازہ نہیں ہو سکا تھا کہ سر عورت کا تھا یا مرد کا؟ تاہم اس نے یہ دیکھ لیا تھا کہ وہ مٹی میں لتھڑا ہوا تھا۔ اس کے بال زیادہ لمبے نہیں تھے۔ اتنے لمبے بال کسی مرد کے بھی ہو سکتے تھے اور عورت کے بھی۔

”ویسے ہم نے یہ اچھا نہیں کیا کہ وہاں اس کتے کو دیکھنے کے بعد ذرا سی دیر رک کر چل دیے۔ ہمیں ذرا ادھر ادھر دیکھنا چاہیے تھا یا جو دو تین گاڑیاں گزری تھیں، ان مسافروں ... میں سے کسی سے بات کرنا چاہیے تھی۔“ شہزاد نے ایک لمحے کے توقف کے بعد قدرے تاسف زدہ سے لہجے میں کہا۔

عالیہ کو گویا کوئی خدشہ محسوس ہوا۔ جلدی سے بولی۔ ”خدا کے لیے اب گاڑی موڑ کر کہیں واپس نہ چل دینا اور

www.pklibrary.com

وہاں پہنچ کر کتے کی تلاش شروع نہ کر دینا۔ اس طرح تو شاید ہم کبھی گھر واپس نہ پہنچ سکیں۔"

"نہیں..... خیر..... میرا ایسا تو کوئی ارادہ نہیں۔" شہزاد نے گویا اسے تسلی دی پھر ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ پُرخیال سے لہجے میں بولا۔ "لیکن میرا خیال ہے ہمیں خوشاب پہنچ کر سب سے پہلے پولیس کو اس واقعے کی اطلاع دینا چاہیے۔"

عالیہ پہلے سے بھی زیادہ گھبرا کر بولی۔ "یہ خیال بھی دل میں مت لائیے گا۔ پولیس والے ہمیں ہی پکڑ کر بٹھالیں گے اور نہ جانے کب تک بٹھائے رکھیں۔ اگر انہوں نے جائے وقوعہ پر آ کر تفتیش کرنے کی زحمت بھی کرنے کا ارادہ کر لیا تو شاید ہمیں بھی ان کے ساتھ گھسٹنا پڑے پھر اگر کہیں اس واقعے کی ایف آئی آر بھی درج ہو گئی تب تو اللہ ہی حافظ ہے۔ پھر تو ہمیں گواہی کے لیے عدالتوں میں بھی دھکے کھانا پڑیں گے۔ بیٹھے بٹھائے خوامخواہ کی مصیبت میں پڑ جائیں گے۔"

سانس لینے کے لیے ایک لمحے کو خاموش ہو کر عالیہ نے گویا اسے مزید سمجھانا ضروری سمجھا۔ "انسان جب ایک شہر سے دوسرے شہر سفر کرتا ہے، موٹروے یا بائی وے کے راستے جاتا ہے تو اسے بہت سے واقعات پیش آتے ہیں، بہت سی چیزیں نظر آتی ہیں۔ ضروری نہیں ہے کہ وہ ہر بات کی اطلاع پولیس کو دینے کے لیے دوڑا دوڑا چلا جائے۔"

"ارے بھئی..... اب ایسا بھی نہیں ہے۔ پولیس کے بارے میں سالوں سے جو باتیں مشہور چلی آ رہی ہیں، ان کی وجہ سے لوگ ابھی تک ڈرتے ہیں۔" شہزاد نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "پولیس والے بھی آدمی دیکھ کر اور وقوعہ دیکھ کر فیصلہ کرتے ہیں کہ کس کے ساتھ کیا سلوک کرنا ہے۔ اگر تمہیں اندیشے زیادہ ستا رہے ہیں تو میں اپنا ارادہ ملتوی کر دیتا ہوں۔"

عالیہ نے گویا سکھ کا سانس لیا۔ شہزاد مزید کچھ نہ بولا لیکن حقیقت یہ تھی کہ وہ چند سیکنڈ کے اس منظر کو ذہن سے نکال نہیں پا رہا تھا۔ اسے یہ منظر بہت عجیب لگا تھا۔ ویرانے میں ایک کتا ایک انسانی سر اٹھائے بھاگا چلا جا رہا تھا۔

اچانک گاڑی کی پچھلی طرف سے ایک بار پھر کھڑکھڑ کی بہت ہلکی سی آواز سنائی دینے لگی۔ شہزاد نے کان لگا کر سنا۔ اسے اندازہ ہوا کے پچھلے بمپر کے ایک طرف کے اسکرو شاید کچھ ڈھیلے ہو گئے تھے جن کی وجہ سے ہلکی سی کھڑکھڑاہٹ کی آواز پیدا ہونے لگی تھی۔ اس کے خیال میں یہ کوئی تشویش کی بات نہیں تھی اس لیے اس نے خاموشی سے ڈرائیونگ جاری رکھی۔ تاہم چند لمحے بعد وہ دھیمی آواز میں بول اٹھا۔ "سچی بات یہ ہے عالیہ..... کہ میں اس منظر کو ذہن سے نہیں نکال پا رہا۔ بار بار مجھے خیال آ رہا ہے کہ جس مرد..... یا جس عورت کا بھی وہ سر تھا..... اس کا دھڑ کہاں ہو گا؟"

"اللہ ہی جانے.....!" عالیہ نے ٹھنڈی سانس لے کر جواب دیا۔

عین اسی لمحے شہزاد کو احساس ہوا کہ عالیہ کی گردن تیزی سے گھومی تھی۔ اس نے ایک سیکنڈ کے لیے سڑک سے نظر ہٹا کر عالیہ کی طرف دیکھا۔ عالیہ نہ صرف گردن گھما کر بلکہ خود بھی تھوڑی سی گھوم کر پیچھے کی طرف دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"کیا ہوا؟" شہزاد نے پوچھا اور ساتھ ہی غیر ارادی طور پر رفتار بالکل کم کر دی۔

"مجھے یوں لگا ہے جیسے پیچھے ایک درخت کے قریب ایک انسانی ٹانگ پڑی ہوئی تھی۔" عالیہ کے منہ سے گویا غیر ارادی سے انداز میں نکلا۔ اس کی آواز میں ہلکی سی لرزش تھی۔

شہزاد اضطراری انداز میں اسی لمحے بریک لگانے لگا تھا لیکن فوراً ہی اسے کچھ خیال آ گیا۔ اس نے جلدی سے گاڑی ایک طرف کر کے چند قدم آگے جا کر روکی، تب عالیہ کو گویا اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ وہ تیزی سے بولی۔ "میں نے یہ بات تمہیں اس لیے نہیں بتائی کہ تم فوراً ہی گاڑی روک لو۔ ہو سکتا ہے یہ میرا وہم ہو۔ میری آنکھیں دھوکا کھا گئی ہوں۔"

شہزاد نے قدرے ملامت آمیز سی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ گویا کہہ رہا ہو۔ "تمہیں اچھی طرح معلوم ہے تمہاری آنکھوں نے دھوکا نہیں کھایا ہے۔ اب اگر یہ بات تمہارے منہ سے نکل ہی گئی ہے تو پیچھا کیوں رہی ہو؟"

"میں یہ اندیشہ محسوس کر رہی ہوں کہ تم ایک بار پھر گاڑی نہ روک لو اور اتر کر پیچھے نہ چلے جاؤ۔" عالیہ بولی۔ "میرے خیال میں ہمیں اس معاملے میں الجھنے کی ضرورت نہیں۔ یقیناً یہاں سے اور بھی کئی گاڑیاں گزری ہوں گی۔ کوئی بھی یہاں نہیں رکا۔"

"ہاں..... یہ ہمارا اجتماعی رویہ ہے۔" شہزاد دھیمے لہجے میں بولا۔ "پتا نہیں لوگ پولیس، تھانے، عدالت اور گواہیوں کے چکر میں پھنسنے سے گھبراتے ہیں یا محض اپنی بے حسی اور خود غرضی کو چھپانے کے لیے انہوں نے بہانے گھڑے ہوئے ہیں۔ ایک بات یہ بھی ہے کہ لوگوں کے پاس شاید ان چکروں میں الجھنے کے لیے وقت نہیں ہے۔ لوگوں کے پاس اپنی اپنی زندگی کے مسائل ہی کم نہیں ہیں۔ ہم بھی انہی لوگوں میں سے ہیں۔" شہزاد کے لہجے میں ایک

www.pklibrary.com

قسم کے احساسِ جرم کی جھلک تھی۔

''اب تم حقیقت پسند بن کر سوچ رہے ہو۔'' عالیہ نے گویا اطمینان کی سانس لی۔

''لیکن اس طرح کا حقیقت پسند بننے پر مجھے شرمندگی ہے۔'' شہزاد نے تسلیم کیا۔ شرمندگی اس کے لہجے سے بھی عیاں تھی۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بولا۔ ''کیسی سفاکی ہے کہ ایک انسان کو قتل کر کے، اس کی لاش کے ٹکڑے کر کے ویرانے میں پھینک دیے گئے ہیں..... اور یہ شاید اس سے بھی بڑی سفاکی ہے کہ ہم سمیت نہ جانے کتنے لوگ ان ٹکڑوں کو دیکھ کر گزرتے چلے جا رہے ہیں۔ کوئی بھی رکا نہیں۔''

ابھی اس نے بات مکمل ہی کی تھی کہ اسے یکدم تیزی سے اسٹیئرنگ گھمانا پڑ گیا۔ اس کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ اسے کسی چیز سے بچ کر گزرنے کے لیے گاڑی کو گھمانا پڑا تھا اور وہ چیز کوئی بڑا سا پتھر نہیں تھا۔ وہ تقریباً کندھے تک کٹا ہوا ایک گورا چٹا بازو تھا جو کہنی کی جگہ پر مڑا ہوا بھی تھا۔ شہزاد کی نظر جب ہیڈ لائٹس کی روشنی میں اچانک اس پر پڑی تھی تو وہ یکدم ڈر سا گیا تھا اور اس نے اضطراری انداز میں گاڑی موڑ دی تھی ورنہ شاید گاڑی اسے کچلتے ہوئے گزر جاتی۔

عالیہ نے بھی یقیناً وہ بازو دیکھ لیا تھا اور شاید اس کے منہ سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی تھی۔ اس کی چیخ شاید اس لیے رک گئی تھی کہ شہزاد نے بازو کو گاڑی تلے کچلے جانے سے بچا لیا تھا۔

وہ بازو ان دونوں کو محض ایک لمحے کے لیے نظر آیا تھا لیکن دونوں ہی کو اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کسی عورت کا بازو تھا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ اس سے پہلے انہوں نے جس سر اور ٹانگ کی جھلک دیکھی تھی، وہ بھی کسی عورت ہی کی تھی۔ شہزاد کو جھرجھری سی آ گئی۔ اس نے گاڑی واپسی کے لیے گھما لی۔

''یہ تم کیا کر رہے ہو؟'' عالیہ گھٹی گھٹی اور قدرے خوفزدہ سی آواز میں بولی۔

''میں اب اس طرح مزید آگے نہیں جا سکتا۔'' شہزاد نے گویا فیصلہ کن لہجے میں اعلان کر دیا۔ ''ایک نظر دیکھنا تو چاہیے، آخر کیا معاملہ ہے۔ انسانی اعضا اس طرح بکھرے پڑے ہیں۔ انسانی لاش کی بے حرمتی ہو رہی ہے۔''

عالیہ اب کچھ نہ بول سکی۔ یک ٹک شہزاد کو دیکھتی رہ گئی۔ اس کی آنکھیں ذرا پھیلی ہوئی تھیں۔

چند لمحوں میں وہ اس جگہ واپس پہنچ گئے جہاں بازو پڑا ہوا تھا۔ شہزاد نے اس طرح گاڑی روکی کہ وہ بازو ہیڈ لائٹس کی روشنی میں رہے۔ اب گاڑی سڑک کی رانگ سائڈ پر تھی لیکن فی الحال سڑک پر کوئی گاڑی نظر ہی نہیں آ رہی تھی اس لیے شہزاد نے اس بات کی کوئی پروا نہیں کی تھی۔ اس نے گاڑی کے دروازے میں بنے ہوئے ایک ریک سے وہ کپڑا نکالا جو گاڑی صاف کرنے کے کام آتا تھا۔ کپڑا ہاتھ میں لیے وہ گاڑی سے اتر گیا اور اس مڑے ہوئے انسانی بازو کی طرف بڑھا جو عجیب لاوارث سی حالت میں سڑک پر پڑا تھا۔

اس نے محسوس کیا کہ بازو کی جلد کی رنگت میں کچھ چمک سی تھی۔ ایک بار پھر شہزاد کو ایک عجیب سے خوف کا احساس ہوا۔ اس کا جی چاہا کہ پلٹ کر گاڑی میں جا بیٹھے اور اپنی منزل کی طرف روانہ ہو جائے۔ اسے بھلا کیا پڑی تھی اس معاملے میں ٹانگ اڑانے کی۔ اسے امید تھی کہ ایک دو دن بعد شاید اخبارات میں اور ٹی وی پر اس سلسلے میں کوئی خبر آ جائے جس سے کچھ اندازہ ہو سکے کہ معاملہ کیا تھا۔

یہ سب کچھ سوچتے سوچتے ہی وہ بازو کے بالکل قریب جا پہنچا۔ ہاتھ میں پکڑا ہوا کپڑا اس نے جھک کر بازو پر پھیلایا اور اسے کپڑے سمیت پکڑ کر اٹھا لیا۔ بازو اسے خاصا بھاری محسوس ہوا۔ پھر اسے خیال آیا کہ شاید بازو بے جان اور کٹا ہوا ہونے کی وجہ سے اسے بھاری لگ رہا تھا۔ شہزاد نے اسے ٹھیک طرح دیکھنے کی بھی زحمت نہیں کی اور گویا اس کی طرف سے نظر چراتے ہوئے، اسے اٹھائے گاڑی کی طرف چل پڑا۔

اسی دوران اس طرف دو بڑی ہیڈ لائٹس کی تیز روشنیاں نمودار ہوتی دکھائی دیں، جدھر سے وہ آئے تھے۔ ہیڈ لائٹس جس گاڑی کی بھی تھیں، وہ یقیناً بہت تیز رفتاری سے ان کی طرف آ رہی تھی۔ جب تک شہزاد اپنی گاڑی کے قریب پہنچتا، تب تک ہیڈ لائٹس بھی قریب آ گئیں۔ ان کی چکاچوند سے بچنے کے لیے اس نے ہاتھ سے آنکھوں پر چھجا سا بنا لیا۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں کٹا ہوا انسانی بازو تھا۔ اس نے اپنے آپ کو ایک عجیب سی پوزیشن میں محسوس کیا۔ وہ گاڑی کا دروازہ بھی نہ کھول پایا۔

اس دوران وہ گاڑی ان کی گاڑی کے عین برابر آ کر رکی۔ تب شہزاد کو اندازہ ہوا کہ وہ درحقیقت ایک ٹریلر تھا۔ زیادہ بڑا تو نہیں تھا لیکن بہرحال ٹریلر تھا۔ اس کے پچھلی طرف سے کھڑکھڑاہٹ کی سی آواز مستقل آ رہی تھی۔ انجن اسٹارٹ ہونے کے ساتھ شاید ٹریلر کا پچھلا دروازہ کھڑکھڑ کرنا شروع کر دیتا تھا۔

ٹریلر کے کیبن کا دروازہ کھلا اور ایک شخص کود کر نیچے اتر آیا۔ ڈرائیور اندر ہی بیٹھا رہا۔ اس نے انجن بند نہیں کیا۔ کیبن

www.pklibrary.com

سے نکلنے والا شخص لمبے لمبے ڈگ بھرتا شہزاد کی طرف آرہا تھا۔ وہ ایک لحیم شحیم آدمی تھا۔ گھنی ڈاڑھی اور مونچھوں کے ساتھ ساتھ اس کے بال بھی لمبے تھے۔ وہ گہرے رنگ کی شلوار قمیص میں تھا۔ پیروں میں پشاوری چپل تھے، کاندھے پر بڑا سا رومال پھیلا ہوا تھا۔ شاید خوش خلقی کے اظہار کے لیے وہ باچھیں پھیلائے ہوئے تھا لیکن شہزاد گم صم سا کھڑا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ درحقیقت وہ اندر ہی اندر نہ جانے کیوں خود کو تھوڑا سا خوفزدہ بھی محسوس کررہا تھا۔ شہزاد کی گاڑی اور ٹریلر کی ہیڈ لائٹس کی وجہ سے وہاں اب اتنی روشنی ضرور تھی کہ وہ سب ایک دوسرے کو آسانی سے دیکھ سکتے تھے۔ دونوں گاڑیاں برابر کھڑی ہونے سے سڑک تقریباً بلاک ہوگئی تھی۔

''بھائی صاحب! یہ بازو ہم کو دے دو۔'' لحیم شحیم آدمی نے شہزاد کے قریب آکر کہا اور ہاتھ اس کی طرف بڑھایا۔ یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ اس کی زبان اردو نہیں تھی اور اس نے اپنے اکھڑ لہجے کو شائستہ بنانے کی حتی الامکان کوشش کی تھی۔

''کیوں دے دوں؟ یہ میں پولیس کو دوں گا۔'' قطعی غیر ارادی طور پر شہزاد کے منہ سے نکلا اور اس نے ہاتھ میں اٹھائے ہوئے بازو کو ذرا پیچھے کرلیا۔ اپنے جواب پر وہ خود بھی حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اندر ہی اندر وہ قدرے خوفزدہ تھا لیکن یہ الفاظ گویا خود بخود ہی اس کے منہ سے نکل گئے تھے جو گویا اس کی بے خوفی کا اظہار کررہے تھے۔ عالیہ گاڑی میں بیٹھی قدرے پھیلی پھیلی سی آنکھوں سے یہ سارا منظر دیکھ رہی تھی۔

لحیم شحیم آدمی کو ایک لمحے کے لیے تو گویا جھٹکا سا لگا اور وہ کچھ حیران سا نظر آیا لیکن پھر گویا کوئی بات اس کی سمجھ میں آگئی۔ اس نے ایک بے ہنگم اور بلند آہنگ قہقہہ لگایا اور مزید کچھ کہے بغیر دوڑتا ہوا اپنے ٹریلر کے پچھلی طرف چلا گیا۔ ٹریلر کا ڈرائیور بڑے سے اسٹیئرنگ وہیل پر دونوں بازو ٹکائے، ذرا جھک کر، شیشے کے عقب سے یوں شہزاد کی طرف دیکھ رہا تھا جیسے شہزاد کوئی خلائی مخلوق ہو اور وہ اسے دیکھ کر محظوظ ہورہا ہو۔

لحیم شحیم شخص جلد ہی ٹریلر کے عقب سے برآمد ہوگیا۔ وہ بغل میں بڑی سی کوئی چیز دبائے ہوئے آرہا تھا۔ شہزاد تم صم سا کھڑا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ لحیم شحیم آدمی قریب آیا تو شہزاد نے دیکھا کہ اس کی بغل میں دبی ہوئی چیز، درحقیقت اس قسم کے ایک نسوانی مجسمے کا بالائی دھڑ تھا جو بڑے بوتیکس، گارمنٹ اسٹورز یا ڈیپارٹمنٹل اسٹورز میں سجاوٹ کے لیے شیشے کے شوکیس میں کھڑے کیے جاتے تھے اور کوئی لباس متوقع گاہکوں کو بہتر طور پر دکھانے کے لیے ان مجسموں کو پہنا دیا جاتا تھا تاہم بس مجسمے کا دھڑ اس لحیم شحیم شخص کی بغل میں تھا، اس پر کوئی لباس نہیں تھا اور وہ سر، بازوؤں اور ٹانگوں سے بھی محروم تھا۔

لحیم شحیم آدمی نے شہزاد کے قریب آکر ایک بار پھر باچھیں کھلائیں اور کوئی بات کرنے سے پہلے بظاہر اپنا پیٹ کھجانے کے لیے قمیص پر انگلیوں کو حرکت دی۔ پیٹ کھجانے کی کوشش میں اس کی قمیص ایک لمحے کے لیے ایک طرف کو ہٹ گئی۔ شہزاد نے دیکھے بغیر نہ رہ سکا کہ اس کے سینے میں ایک اچھی خاصی بڑی سی گن لگی ہوئی تھی۔ غالباً ماؤزر تھا۔ لحیم شحیم آدمی کا مقصد بھی غالباً پیٹ پر خارش کرنا نہیں بلکہ شہزاد کو اپنی اس گن کی جھلک دکھانا ہی تھا۔

اس نے اپنی بغل میں دبے ہوئے دھڑ کو آہستگی سے تھپتھپایا اور بلاوجہ ایک بے ہنگم سا قہقہہ لگا کر بولا۔ ''یہ ہماری گاڑی میں رکھا ہوا تھا۔ اس کا سر، بازو اور ٹانگیں بھی تھیں مگر الگ تھیں۔ ہم لوگ جہاں یہ مجسمہ اور دوسرا سامان لے کر جارہے ہیں، انہوں نے خود ہی اس کو جوڑنا تھا..... لیکن ہمیں پتا نہیں تھا کہ ہماری گاڑی کا پچھلا دروازہ خراب ہے۔ اس کا تالا کبھی بھی کھل جاتا ہے۔ راستے میں اس کے بازو، ٹانگیں اور سر گر گیا اور ہمیں پتا ہی نہیں چلا۔ جب پتا چلا تو ہم نے سوچا، چلو واپس جا کر ڈھونڈنے کی کوشش کرلیتے ہیں.....''

یہ کہہ کر اس نے شہزاد سے پوچھے بغیر ہی ہاتھ بڑھا کر نسوانی بازو اس کے ہاتھوں سے لے لیا اور اسے بھی مجسمے کے دھڑ کے نیچے بغل میں دبالیا اور بات جاری رکھی۔ ''شکر ہے یہ آپ کو مل گیا اور آپ ہمیں مل گئے۔ یہ بتائیں آپ کو اس ڈمی کا سر تو نہیں ملا؟''

شہزاد ابھی تک گم صم سا ہی کھڑا تھا۔ اس آدمی کا سوال سن کر اس نے تھوک نگلا اور نفی میں سر ہلاتے ہوئے دھیمی آواز میں بولا۔ ''کئی میل پہلے ہم نے ایک کتے کو ایک سر منہ میں دبائے سڑک کے اس طرف سے اس طرف جاتے ہوئے دیکھا تھا۔'' اس نے اشارے سے اس شخص کو سمجھایا۔

''کوئی بات نہیں..... ہم اس بے چاری کے اسپیئر پارٹس ڈھونڈنے کی ایک کوشش کرلیتے ہیں۔ آپ کی مہربانی، آپ نے ایک چیز تو ہمیں دے دی۔'' یہ کہہ کر اس نے خدا حافظ کہنے کے انداز میں ہاتھ ہلایا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا دوبارہ اپنے ٹریلر کے پچھلی طرف چلا گیا۔ شہزاد نے دیکھا کہ ٹریلر کا ڈرائیور اب بھی بڑے سے اسٹیئرنگ وہیل پر بازو ٹکائے، انگلیاں نچاتے ہوئے مسلسل اسی کی طرف دیکھے جارہا تھا۔ وہ بھی سرخ و سپید رنگت اور گھنی ڈاڑھی مونچھوں والا ایک

www.pklibrary.com

جسیم آدمی تھا۔

شہزاد کو گویا موقع غنیمت محسوس ہوا۔ وہ جلدی سے اپنی گاڑی میں جا بیٹھا۔ اس نے ٹریلر کا پچھلا دروازہ زور سے بند ہونے کی آواز سنی پھر لحیم شحیم آدمی ٹریلر کے پیچھے سے نکل کر کیبن کی طرف آتا دکھائی دیا۔ شہزاد کی گاڑی اسٹارٹ ہی تھی۔ اس نے گاڑی کو ریورس کیا اور پھر گھما کر واپس اسی سمت میں روانہ ہو گیا جدھر وہ پہلے جا رہا تھا۔ چند لمحوں میں اس نے گاڑی کی رفتار کافی تیز کر لی۔

عالیہ نے طمانیت کی گہری سانس لی۔ وہ غالباً اس وقت سے اعصابی تناؤ میں مبتلا تھی جب ٹریلر ان کے قریب آ کر رکا تھا۔ اب اس نے نہ صرف اطمینان کی سانس لی بلکہ ہلکا سا قہقہہ بھی لگایا۔ شہزاد نے کچھ یوں اس کی طرف دیکھا جیسے پوچھ رہا ہو ''یہ ہنسنے کا کون سا موقع ہے؟''

عالیہ گویا اس کے خاموش سوال کا جواب دیتے ہوئے بولی۔ ''کیسے بے وقوف بنے تھے ہم بھی۔ وہ مینی کوئین یا ڈمی کا بازو، ٹانگ اور سر تھا۔ ہم انہیں انسانی اعضا سمجھتے رہے اور خوامخواہ ہمارا خون خشک ہوتا رہا۔''

شہزاد نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کے چہرے پر گمبھیر سنجیدگی تھی۔ گاڑی کی رفتار لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جا رہی تھی اور عالیہ کے خیال میں شاید شہزاد کو اس کا احساس ہی نہیں تھا۔ آخر عالیہ بول اٹھی۔ ''گاڑی اتنی تیز کیوں چلا رہے ہو؟ کوئی ہمارے پیچھے تو نہیں لگا ہوا ہے۔''

شہزاد نے رفتار کچھ کم کی اور خود کلامی کے سے انداز میں بولا۔ ''ہاں..... یہ بھی غنیمت ہے کہ کوئی ہمارا پیچھا نہیں کر رہا۔ نہ جانے کیا سوچ کر انہوں نے شاید ہمیں معاف کر دیا۔ میرا خیال ہے ہمارے بارے میں یہی اندازہ لگایا ہوگا کہ شریف اور بے ضرر سے لوگ ہیں، انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکیں گے۔''

''اگر تم ٹریلر والوں کی بات کر رہے ہو تو انہیں بھلا ہمارا پیچھا کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ تم نے تو ان کی ڈمی کا ایک ہی بازو اٹھایا تھا جو تم نے انہیں واپس کر دیا۔'' عالیہ کے لہجے میں الجھن تھی۔

''تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں نے جو بازو اٹھایا وہ کسی ڈمی کا نہیں، سچ مچ کسی عورت کا کٹا ہوا بازو تھا۔'' شہزاد مرتعش سے لہجے میں بولا۔

عالیہ نے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا۔ ''یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟''

''میں نے اسے خواہ کپڑے سے پکڑ کر ہی سہی، لیکن بہرحال ہاتھ میں پکڑ کر اٹھایا تھا۔ مجھے محسوس ہو گیا تھا کہ وہ ایک انسانی بازو ہے۔ اس کی رنگت اور ساخت وغیرہ بتا رہی تھی کہ وہ عورت کا بازو تھا..... اس کے علاوہ ذرا یہ دیکھو.....''

اس نے ڈرائیونگ جاری رکھتے ہوئے اپنے پہلو میں، اپنی شرٹ کی طرف اشارہ کیا۔ اس کی سفید شرٹ پر ایسا نشان نظر آ رہا تھا جیسے اس پر کٹے ہوئے گوشت نے رگڑ کھائی ہو۔ نشان خاصا بڑا اور واضح تھا۔ اس میں خون کی ہلکی سی سرخی تھی اور کچھ ملغوبے کے ذرات بھی نظر آ رہے تھے۔ یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ بازو کے کٹے ہوئے حصے نے وہاں رگڑ کھائی تھی۔

''اوہ میرے خدا.....!'' عالیہ کے حلق سے سرسراتی سی آواز نکلی۔ ''اور ان لوگوں کے پاس اتفاق سے ایک یا شاید ایک سے زیادہ جعلی بھی موجود تھے۔ اس ڈمی کی آڑ لے کر انہوں نے خوب بات بنائی۔ ٹریلر کا دروازہ خراب ہونے کی وجہ سے یقیناً ان کی لاعلمی میں لاش کے ٹکڑے گرتے رہے۔ اب وہ انہیں جمع کرنے کی مہم پر واپس گئے ہیں۔''

''ہاں، کوئی خوفناک چکر ہے۔'' شہزاد کے لہجے میں بھی خوف کی آمیزش تھی۔

چند لمحے وہ گہرے سکوت کے عالم میں سفر کرتے رہے۔ گاڑی کی ہلکی سی گھرگھراہٹ کے سوا کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

''اب ہمیں کیا کرنا ہوگا؟'' عالیہ نے گویا وہ سوال کر ڈالا جو شاید ان دونوں کے ذہنوں میں چبھ رہا تھا۔

''اگر ہم بالکل ہی خاموش ہو کر بیٹھ گئے تو ہمارا ضمیر نہ جانے کب تک ہمیں کچوکے لگاتا رہے گا۔'' شہزاد گویا کچھ سوچتے ہوئے دھیمے لہجے میں بولا۔ ''لیکن براہِ راست پولیس کے پاس جانے کی بھی مجھ میں ہمت نہیں۔ میں تمہاری اس بات سے متفق ہو گیا ہوں کہ ہم اس معاملے میں الجھنے اور تھانے کچہری میں دھکے کھانے کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ آج کل پبلک ٹیلی فون تو تقریباً ختم ہی ہو گئے ہیں۔ ہر شخص کے پاس موبائل فون موجود ہے لیکن مجھے امید ہے کہ خوشاب پہنچ کر، تلاش کرنے پر کہیں نہ کہیں کوئی پبلک فون مل ہی جائے گا۔ میں اس کے ذریعے پولیس کو اس واقعے کی اطلاع دوں گا..... خود گمنام رہتے ہوئے..... آگے پولیس اور قانون کی مرضی ہے، وہ جو چاہیں کریں۔ ہمارے دل سے کچھ نہ کچھ بوجھ تو ہٹ جائے گا۔''

''ہاں، یہ ٹھیک ہے۔'' عالیہ فوراً اس تجویز سے متفق ہو گئی۔

⌘⌘⌘

www.pklibrary.com

قسط: 16

زندگی پیار کا گیت ہے مگر... صرف وہاں جہاں معاشرہ ناہمواریوں کا شکار نہ ہو... جہاں انصاف اور توازن عنقا نہ ہوں اور بدقسمتی سے وہ جس معاشرے میں رہتا تھا وہاں ناانصافیوں کی تندوتیز آندھیوں نے اسے محض سراپا انتقام بنا دیا تھا... ایک طرف فنون حرب و ضرب کے ماہر ہاتھوں نے اسے ناقابلِ شکست بنایا تو دوسری طرف ظلم و جبر کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے والے اس پُرعزم نوجوان کو حرف غلط کے مانند مٹائے جانے کے منصوبے بنائے جارہے تھے... اس کی زندگ جو المیوں کا شکار... اندھیروں کے قریب اور روشنی سے دور تھی لیکن... بے خبری میں جنم لینے والے عشق کی لو اسے تیرگی میں بھی راستہ دکھا رہی تھی... رفتہ رفتہ وہ ایک ایسے طوفان کا روپ دھار گیا جس میں شعلوں کی لپک اور بجلی کی چمک تھی... اس کی بے قراریوں کو قرار دینے کے لیے اس کا جنون، اس کا پیار اس کے ساتھ تھا... پھر وہ کیسے زمانے کی چیرہ دستیوں کے آگے ہار مان لیتا... اگرچہ تارِ عنکبوت نے طاقت اور گھمنڈ کے نشے میں چُور لوگوں پر پردہ ڈالا ہوا تھا لیکن وہ ہر وار کا توڑ کرتا حق و باطل کی ازلی جنگ یوں لڑتا رہا کہ وارداتِ قلب بھی اس کے فرض کی راہ میں حائل نہ ہو سکی...

اپنے حریفوں پر قہر بن کر نازل ہونے والے ایک سراپا انتقام نوجوان کی تحیر انگیز داستان

www.pklibrary.com

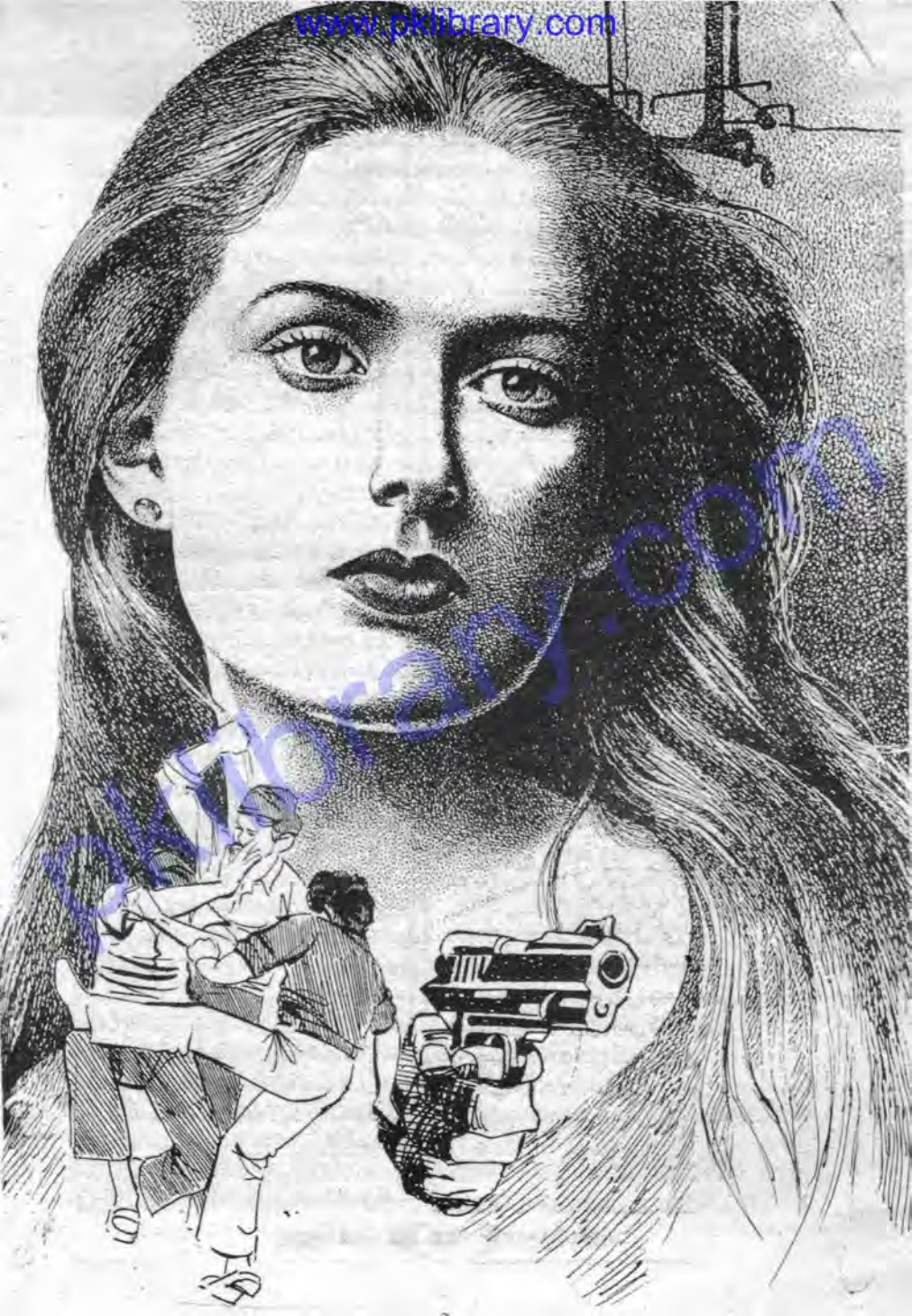

www.pklibrary.com

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

معاذ ایک ذہین لیکن متلون مزاج لڑکا یونیورسٹی کا طالب علم ہے لیکن ساتھ ساتھ اس نے دیگر کئی مشاغل بھی پال رکھے ہیں۔ آج کل اس پر مارشل آرٹ سیکھنے کا شوق سوار ہے اور اس نے باقاعدہ ایک ادارہ جوائن کیا ہوا ہے۔ معاذ کے والد سرکاری افسر ہیں اور اچھے عہدے پر فائز ہیں۔ ایک شام معاذ انسٹی ٹیوٹ سے واپس آرہا تھا تو وہ چند لڑکوں کو سڑک پر کھڑی ایک لڑکی کو اغوا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے دیکھ لیتا ہے۔ وہ لڑکی یونیورسٹی ہی میں پڑھتی ہے اور لڑکوں کا تعلق بھی وہیں سے ہے۔ اپنی نڈر فطرت کے باعث وہ اس معاملے میں کود پڑتا ہے اور بشریٰ نامی اس لڑکی کو بچانے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ بشریٰ ماس کمیونی کیشن کی طالبہ ہے اور ایک اخبار کے لیے کالم وغیرہ لکھتی ہے۔ اس ویران جگہ بھی وہ ایک زیر تعمیر رہائشی منصوبے کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے ہی آئی تھی۔ معاذ بشریٰ کو بہ حفاظت اس کے گھر پہنچادیتا ہے اور خود اس واقعے کو فراموش کردیتا ہے لیکن جن رئیس زادوں سے اس نے ان کا شکار چھینا تھا، وہ اس واقعے کو فراموش نہیں کرتے اور موقعے کی تلاش میں رہتے ہیں۔ یہ موقع انہیں یونیورسٹی ٹرپ کی صورت میں مل جاتا ہے اور ایک جنگل کی سیر کے دوران وہ فوٹوگرافی کے شوق میں سب سے الگ تھلگ ہوجانے والے معاذ کو بے خبری میں گھیر کر بری طرح زدوکوب کرتے ہیں اور بلندی سے اسے دھکا دیتے ہیں۔ معاذ کے واپس نہ آنے پر انتظامیہ کے افراد، پولیس اور ریسکیو ذرائع کی مدد سے اسے تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن وہ کامیاب نہیں ہوتے۔ ادھر معاذ کو ہوش آتا ہے تو وہ خود کو ایک جوگی کی جھونپڑی میں پاتا ہے۔ اپنی حالت سے اسے اپنے شدید زخمی ہونے کا اندازہ ہوجاتا ہے۔ جوگی اپنی خاص جڑی بوٹیوں کی مدد سے اس کا علاج کرتا ہے۔ معاذ کا موبائل جنگل میں ہی کہیں گر جاتا ہے اور جوگی کے پاس ایسا کوئی ذریعہ نہیں ہوتا جس سے باہر کی دنیا سے رابطہ کیا جاسکے۔ وہاں رہتے ہوئے جوگی کی شخصیت اس کے لیے دلچسپی کا باعث بن جاتی ہے۔ جوگی بھی اسے پسند کرنے لگتا ہے اور ایک دن اسے بتاتا ہے کہ وہ ان لوگوں میں سے ہے جنہیں قدرت کچھ خاص صلاحیتوں سے نواز کر دنیا میں بھیجتی ہے۔ معاذ سے خاصی بات چیت کے بعد وہ اسے پراسرار علم سکھانے کی ہامی بھر لیتا ہے اور معاذ واقعی اس سے یہ علم سیکھنے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ ادھر جائے وقوعہ سے ملنے والے معاذ کے کیمرے سے جب تصویریں نکلوائی جاتی ہیں تو بہت سے قدرتی مناظر کی تصویروں میں سے ایک ایسی تصویر بشریٰ کی نظر میں آجاتی ہے جس میں بہت دور ایک درخت کے پیچھے سے ایک چہرہ جھانکتا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ کافی کوشش کے بعد اس چہرے کو پہچان لیتی ہے۔ یہ وہی لڑکا ہوتا ہے جو اس کو اغوا کرنے کی کوشش کرنے والوں میں شامل تھا۔ اصل میں وہ لڑکا کامران اسی شخص کا بیٹا ہے جس کے پروجیکٹ کے غیر قانونی ہونے کے سلسلے میں بشریٰ تحقیق کررہی تھی۔ بشریٰ کے اپنے والد جرنلسٹ ہیں اور حق گوئی ان کے خون میں شامل ہے۔ اس انکشاف کے بعد وہ پولیس سے رابطہ کرتی ہے۔ اس کی پاداش میں بشریٰ کو کافی نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ اس کی ماں کو بے آبرو کر کے ماردیا جاتا ہے جبکہ باپ صدمے سے جان دے دیتا ہے۔ اس سب میں باذل نامی غنڈے کا ہاتھ ہوتا ہے۔ بشریٰ انتقام لینے کی ٹھان لیتی ہے۔ ان تکلیف دہ دنوں میں ہی معاذ واپسی کا ارادہ کرتا ہے تاہم دوسرے ڈاکوؤں کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ ڈاکو اسے پہچان کر اس کا سودا عرفان اللہ اور یزدانی سے کرنا چاہتے ہیں۔ معاذ کو وقاص نامی ایک لڑکا وہاں سے نکال لے جاتا ہے۔ ادھر باذل اچانک بشریٰ کو چھاپ لیتا ہے اور اسے بے آبرو کردیتا ہے۔ ڈی این اے رپورٹ سے باذل کی نشاندہی ہوجاتی ہے۔ ادھر معاذ کو واپس لانے کے لیے اوچھے ہتھکنڈے استعمال کرتے ہوئے اس کے بھائی کو اغوا کرلیا جاتا ہے اور اسے واپس آنے کا پیغام دیا جاتا ہے۔ معاذ دشمنوں کے پاس خود حاضر ہوجاتا ہے۔ وہ لوگ کسی دوسری پارٹی سے اس کا سودا کر کے اسے ان کے حوالے کردیتے ہیں۔ قید میں معاذ سے معلومات لی جاتی ہیں، نہ بتانے پر اس کے بھائی کا ایک گردہ نکال لیا جاتا ہے۔ مجبوراً معاذ کو سب بتانا پڑتا ہے۔ ادھر بشریٰ بھی انتقام کی آگ میں جلتی ہوئی سونیا خان سے مل جاتی ہے اور اس کی ٹریننگ شروع ہوجاتی ہے۔ معاذ کو بچانے والا لڑکا وقاص اپنے گروہ کے ساتھ ایک پارٹی میں جاتا ہے۔ وہاں اسے معاذ کے حوالے سے مشکوک ایک شخص نظر آتا ہے۔ وہ اس کے پیچھے جاتا ہے مگر اسے گھیر لیا جاتا ہے۔ بہرحال وقاص کو تنبیہ کے ساتھ چھوڑ دیا جاتا ہے۔ ادھر معاذ کے دوست عالم شاہ کے بہنوئی کو قتل کردیا جاتا ہے۔ معاذ کئی فنون میں مہارت حاصل کرلیتا ہے۔ اسے ہپناٹائز کر کے اس کے دماغ پر کنٹرول کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تاہم وہ فیفو سے حاصل انوکھے علم کی بدولت ان کا معمول نہیں بنتا۔ بشریٰ، کامران کو چھاپنے کا پروگرام بناتی ہے۔ ادھر عالم شاہ سراغ لگالیتا ہے کہ اس کے بہنوئی کا قتل کس نے کیا۔ وہ قاتل کو گھیرتا ہے اور اپنے تئیں اسے گولیاں مار کر قتل کردیتا ہے تاہم وہ بچ جاتا ہے۔ عالم شاہ اس کے بعد ڈاکوؤں کے سردار چاچڑ کو چھاپتا ہے اور اسے کیفرِ کردار تک پہنچاتا ہے تاہم اس کے پیچھے پولیس لگ جاتی ہے۔ عالم شاہ اور اس کا نوکر سرمد باذل کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں۔ ادھر معاذ جاسوس ماتھر کو ہپناٹائز کر کے اس کے ذریعے اسے نکالنے والوں پر حملہ کروادیتا ہے تاہم ان کی فائرنگ سے ماتھر مارا جاتا ہے اور الزام معاذ پر نہیں آتا مگر معاذ سے کام لینے والوں کو اس پر شک گزرتا ہے۔ ادھر مجل شاہ کے نومولود بیٹے کو اغوا کرلیا جاتا ہے اور اغوا کا الزام لطیف سومرو پر آتا ہے۔ عالم شاہ وہاں موجود ایک زخمی شخص کی مدد سے باذل کی قید سے چھٹکارا پالیتا ہے۔ ادھر بشریٰ دبئی پہنچ جاتی ہے۔ وہاں وقاص اسے باربی کے روپ میں پہچان لیتا ہے اور ان دونوں

www.pklibrary.com

کے درمیان اعتماد کا رشتہ قائم ہوجاتا ہے۔ وہ سلطان کو مارنا چاہتی ہے تاہم وقاص اسے ایسا کرنے سے روکتا ہے۔ ادھر عالم شاہ باذل کی قید سے نکل کر اس کا پیچھا کرتا ہے تاہم وہاں اچانک فائرنگ اور دھماکے ہونے لگتے ہیں۔ وہ وہاں معاذ کو دیکھتا ہے۔ صداقت شاہ، لطیف سومرو کو گھیرنے کے لیے اس کی خفیہ بیوی اور بچے کا کھوج لگاتے ہیں اور بچے کو اغوا کرلیتے ہیں۔ لطیف سومرو مجبور ہوجاتا ہے۔ معاذ کو اس کے گھر والوں سے ملنے کی اجازت دے دی جاتی ہے۔ عالم شاہ کو اس کے والد انڈیا روانگی کا عندیہ دیتے ہیں۔ ادھر معاذ بھی ایک مشن پر سونیا کے ساتھ انڈیا روانہ ہوتا ہے تاہم کچھ لوگ سکھ یاتریوں سے بھری بس کو یرغمال بنالیتے ہیں۔ عالم شاہ کو ایک جگہ آسیہ نظر آجاتی ہے جس کے پیچھے جاکر وہ اور سرمد دھر لیے جاتے ہیں۔ تاہم صداقت کے تعاون سے پولیس آجاتی ہے اور وہ خاموشی سے وہاں سے نکل جاتے ہیں۔ معاذ اور سونیا تہ خانے کے تمام افراد کو ٹھکانے لگادیتے ہیں تاہم باہر موجود دیگر اغوا کاروں سے مقابلہ ہوتا ہے اور معاذ زخمی ہوجاتا ہے۔ صداقت شاہ کے انڈیا میں موجود رشتے دار کے ہاں شادی ہوتی ہے۔ عالم شاہ، بجل اور سرمد انڈیا روانہ ہوجاتے ہیں۔ ائرپورٹ سے گھر روانگی پر راستے میں کچھ لٹیرے انہیں لوٹ لیتے ہیں۔ عالم شاہ ایکشن میں آنا چاہتا ہے تاہم اجالا نامی عالم شاہ کی کزن اس کا راستہ روک لیتی ہے۔ گھر پہنچنے پر پولیس کی ریڈ ہوتی ہے اور وہ عالم شاہ اور سرمد کو لے جاتے ہیں۔ ادھر بشریٰ اور وقاص باذل کو اسپتال میں مارنے کی کوشش کرتے ہیں مگر وہ بچ جاتا ہے۔ معاذ اور سونیا پناہ کی تلاش میں ہوتے ہیں اور بالآخر اپنے سہولت کاروں سے مل جاتے ہیں۔ عالم شاہ اور سرمد کو تشدد کا نشانہ بنا کر ویرانے میں پھینک دیا جاتا ہے جہاں عالم شاہ کو کتوں کے بھونکنے کی آواز آتی ہے۔ کتے ان کے بے حد قریب آجاتے ہیں اور انہیں دردناک موت کا احساس خوف میں مبتلا کردیتا ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

نہ لب آزاد تھے، نہ آنکھیں دیکھ سکتی تھیں لیکن کان کتوں کے وحشت ناک انداز میں بھونکنے کی آوازیں سن رہے تھے۔ یہ آوازیں ایسی تھیں کہ اچھے بھلے دل گردے والے آدمی کا بھی دم خشک ہوجائے۔ وہ اور سرمد بھی بزدل نہیں تھے لیکن جب آدمی بندھے ہوئے ہاتھ پیروں کے ساتھ ایک ویرانے میں ایسی حالت میں پڑا ہو کہ اپنے دشمن کو دیکھنے کا اختیار نہ ہو اور لب کسی کو اپنی مدد کے لیے پکار نہ سکیں تو بے بسی خوف کو جنم دے ہی دیتی ہے۔ ان کے بھی ہر مسام سے پسینا پھوٹ پڑا تھا۔ وہ سمجھ سکتے تھے کہ ان کتوں کی شکل میں ایک دردناک موت ان کے سامنے آکھڑی ہوئی ہے۔ گولی یا کسی تیز دھار آلے سے موت کا نوالہ بن جانا اتنا خوفناک نہیں تھا جتنا اپنے بدن کا بوٹی بوٹی ہوکر ان کتوں کے پیٹ میں منتقل ہوجانے کا تصور..... یہ خوفناک تصور ہی تھا جو انہیں بے بسی کی انتہا پر بھی مزاحمت کرنے پر اکسا رہا تھا۔ وہ اپنے سروں کی ٹکر اور بندھے ہوئے جسموں کو ممکنہ جھٹکے دے کر انہیں خود سے دور رکھنے کی کوشش کررہے تھے۔ اچھی بات یہ تھی کہ کتے ان کے نزدیک تو آرہے تھے لیکن ابھی تک ان میں سے کسی نے ان پر جارحانہ حملہ نہیں کیا تھا۔ حملہ آور ہونے سے زیادہ ان کا زور بھونکنے پر تھا۔

''یہ جنگلی یا آوارہ نہیں، پالتو کتے ہیں۔'' اچانک ہی عالم شاہ کو ادراک ہوا۔

''یہ ہم پر حملہ آور نہیں ہوئے۔ انہوں نے صرف ہمیں للکارا ہے اور اب اپنے مالک کو متوجہ کرنے کی کوشش کررہے ہیں۔'' وہ گاؤں کا پروردہ تھا۔ جاگیرداروں کے عمومی مزاج کے مطابق ان کی حویلی میں بھی کتے پالے جاتے تھے اس لیے خوف کے ابتدائی جھٹکے سے نکل کر حقائق کو سمجھنے میں زیادہ دیر نہیں لگی اور جسمانی تناؤ آہستہ آہستہ کم ہونے لگا۔ چند ساعتوں بعد سیٹی بجنے کے ساتھ ساتھ انسانی آوازیں بھی سنائی دینے لگیں تو اطمینان میں اضافہ ہوگیا۔

''کون ہے؟''

''روشنی ڈالو۔''

''یہ تو بندھے ہوئے ہیں۔''

''زخمی بھی ہیں۔''

وہ تین چار لوگ تھے جو ان کے اطراف کھڑے تبصرے کررہے تھے۔ ان کی آمد کے ساتھ ہی کتوں کے بھونکنے کی آوازیں بتدریج کم ہوتی چلی گئی تھیں۔ یقیناً وہ اپنی ڈیوٹی انجام دے کر مطمئن ہوچکے تھے۔

''ارے! یہ تو پاکستان سے آئے مہمان ہیں۔'' یکدم ہی ان کے اطراف کھڑے لوگوں میں سے ایک نے انہیں شناخت کرلیا اور پھر فوراً ہی صورتِ حال بدل گئی۔ انہیں بندشوں سے آزاد کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی آنکھوں اور لبوں کو بھی آزاد کیا گیا۔ کئی گھنٹوں سے آنکھوں پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں اس لیے وہ فوری طور پر اپنے اردگرد کے ماحول کو دیکھنے سے قاصر تھے۔ کچھ یہی حال منہ کا بھی تھا۔ حلق خشک پڑا ہوا تھا اور زبان گویا سوکھ کر چمڑا ہوگئی تھی۔ اچھی بات یہ تھی کہ کسی نے بھی فوری طور پر ان

www.pklibrary.com

سے پوچھ گچھ کی کوشش نہیں کی اور انہیں محفوظ مقام پر پہنچانے کو پہلی ترجیح دی گئی۔ یہ محفوظ مقام نیاز شاہ کا وہی وسیع و عریض حویلی نما گھر تھا جہاں سے قانونی کارروائی کے نام پر انہیں کھلم کھلا اغوا کر کے لے جایا گیا تھا۔

''کہاں سے ملے یہ لوگ؟ ان کا یہ حال کیسے ہوا؟''

لمحوں میں نیاز شاہ کے بیٹے ان کے اردگرد جمع ہو گئے۔

''یہ ساری باتیں بعد میں معلوم کرتے رہنا، پہلے فردوس کو بلاؤ۔ انہیں فوری ٹریٹمنٹ کی ضرورت ہے۔'' شکیل نے عقلمندی سے کام لیا اور چوتھے نمبر کے بھائی جلیل کی بیوی کو بلوانے کا مشورہ دیا۔ فردوس ڈاکٹر تھی اور ایک مقامی اسپتال میں ملازمت کرتی تھی۔ فردوس کے آنے تک ملازمین نے ابتدائی کارروائی شروع کر دی تھی۔ ان کے جسموں سے چپک جانے والی مٹی اور زخموں سے نکلنے والا خون صاف کیا جا رہا تھا۔

''ایسی درندگی..... میں بتا رہا ہوں بھائی صاحب! اس ظلم پر میں چپ نہیں بیٹھوں گا۔'' ان کی حالت پر رنجیدہ فیصل حسبِ مزاج جذباتی پن سے کہہ رہا تھا۔

''لازمی بات ہے ہم خاموش نہیں رہیں گے لیکن کسی جذباتی قدم سے پہلے ہمیں عالم شاہ اور سرمد سے حالات جاننے ہوں گے۔'' شکیل نے رسان سے جواب دیا۔

''میرے خیال میں ایس ایس پی صاحب کو اطلاع کر دینا چاہیے۔'' عقیل نے مشورہ دیا۔

''ہاں، یہ کام فوری طور پر کر ڈالو۔'' ان کی باہمی گفتگو اور صلاح مشورے جاری تھے۔ سب کچھ سنتے عالم شاہ اور سرمد فی الحال مہر بہ لب تھے۔ سرمد کے تو عالم شاہ کی اجازت کے بغیر کچھ بولنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا جبکہ عالم شاہ کچھ بولنے سے زیادہ اس بات پر غور کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ آخر ان کے ساتھ ہوا کیا ہے۔

''اف مائی گاڈ! انہیں تو بہت بری طرح ٹارچر کیا گیا ہے۔'' بلاوے پر آنے والی فردوس ان کی حالت دیکھ کر دنگ رہ گئی۔

''تم انہیں ٹریٹمنٹ دو۔ ان کی حالت کچھ بہتر ہو تو ابا جی اور سجل کو ان کے ملنے کی خوشخبری سنائیں گے۔'' جلیل نے سنجیدگی سے بیوی سے کہا تو وہ بھی پوری پیشہ ورانہ مہارت کے ساتھ حرکت میں آ گئی۔ دو ملازمین کے ساتھ فیصل بھی اس کی مدد کر رہا تھا۔ دونوں زخمیوں کی مرہم پٹی کرتے کرتے تقریباً پون گھنٹا لگ گیا۔ فردوس نے جلیل کو بھیج کر اپنے کمرے میں سے چند ٹیبلٹس اور کیپسول بھی منگوا لیے۔

''انہیں نیم گرم دودھ کے ساتھ کوئی بسکٹ وغیرہ کھلائیں پھر یہ دوائیں دیں۔ زخموں کو سکھانے اور درد کم کرنے کے لیے یہ دوائیں ضروری ہیں۔'' فردوس نے ہدایت دی، جس پر فوری عمل کیا جانے لگا۔

''آپ جا کر ذرا سلیقے سے سجل کو ان لوگوں کے ملنے کی خبر سنا دیں۔ وہ بے چاری بہت پریشان ہے۔'' فردوس اپنے کام سے فارغ ہو گئی تو فیصل نے اس سے کہا۔ فردوس سر ہلاتے ہوئے وہاں سے چلی گئی۔ آج کی رات اس گھر کے مکینوں پر بہت بھاری تھی۔ اتنے شوق کے ساتھ بلوائے گئے مہمانوں کے ساتھ جو کچھ بیتا تھا اس نے دماغ کی چولیں ہلا دی تھیں۔ بچوں کے علاوہ صرف نیاز شاہ تھے جو سو سکے تھے، وہ بھی صرف اس لیے کہ انہیں اعصابی دباؤ سے بچانے کے لیے فردوس نے انہیں ٹرنکولائزر دے رکھی تھی۔

''عالم! کیا تم اپنے اندر ہمت پا رہے ہو کہ ہمیں اپنے ساتھ بیتی سنا سکو۔'' فردوس کی حسبِ ہدایت انہیں دوائیں وغیرہ کھلائی جا چکیں تو شکیل نے عالم شاہ کے قریب بیٹھتے ہوئے نرمی سے اس سے پوچھا۔ اس کے پاس بھی مزید خاموش رہنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔

''عجیب بات ہے۔ ہماری پولیس یا خفیہ ایجنسیز اس انداز میں کام نہیں کرتیں۔ انہیں کسی کو پھنسانا ہو تو پھر آخری حد تک جاتے ہیں۔ یوں پکڑنا، ٹارچر کرنا اور پھر چھوڑ دینا بہت ہی عجیب ہے۔'' تفصیلات سن کر شکیل نے حیرت کا اظہار کیا۔

''کمال یہ بھی ہے کہ ہم پورا دن کوشش کرتے رہنے پر بھی تم لوگوں کا کوئی کھوج نہیں لگا پائے۔ ہمارے تقریباً سارے محکموں میں اچھے خاصے تعلقات ہیں لیکن ہمیں کہیں سے کوئی جانکاری نہیں مل سکی کہ تم لوگوں کو اریسٹ کیا گیا ہے یا کوئی سیکرٹ ایجنسی تمہارے خلاف کوئی انویسٹی گیشن کر رہی ہے۔'' حیرت کا یہ مظاہرہ کرنے والا عقیل تھا۔

''میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ یہاں کے سسٹم اور لوگوں کو آپ بہتر جانتے ہیں۔'' وہ پھیکے انداز میں مسکرایا۔

''مجھے تو لگتا ہے کہ پولیس کی آڑ میں کسی اور نے کارروائی کی ہے۔'' فیصل نے خیال ظاہر کیا۔

''لیکن کوئی ایسا کیوں کرے گا؟ کسی کو ان سے کیا دشمنی ہو سکتی ہے؟''

''ہو سکتا ہے دشمنی ہم سے نہیں آپ سے ہو اور ہمارے ساتھ یہ سلوک کر کے آپ کو کوئی پیغام دینے کی کوشش کی گئی ہے۔'' عالم شاہ نے بہت دیر سے ذہن میں

www.pklibrary.com

پہنچتا ایک خیال گوش گزار کیا۔ بھارت کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی ان کے ساتھ جو حادثات کا سلسلہ شروع ہوا تھا اس نے اسے ایسا سوچنے پر مجبور کیا تھا۔ وہ تو یہاں اجنبی تھے۔ ان کے ساتھ بھلا یہاں کسی کی کیا دشمنی ہونا تھی۔ ہاں یہ ممکن تھا کہ وہ اپنے میزبانوں کی کسی دشمنی کی بھینٹ چڑھ گئے ہوں۔ اسے ائرپورٹ سے یہاں آتے ہوئے پیش آنے والا ڈکیتی کا واقعہ بھی ایسی ہی کسی دشمنی کا سلسلہ لگ رہا تھا۔

"مجھے نہیں لگتا۔ ہم دوست بنانے والے لوگ ہیں۔ ہماری بھلا کسی سے کیا دشمنی ہوسکتی ہے۔" جلیل نے اس کے خیال کی تردید کی۔

"ہماری دشمنیوں کے سلسلے بھی اتنے دراز نہیں کہ یہاں تک چلے آئیں۔" نہ چاہتے ہوئے بھی عالم شاہ کا لہجہ قدرے تلخ ہوگیا۔ اسی وقت سجل کمرے میں چلی آئی۔ متورم پپوٹے اور ستا ہوا چہرہ گواہ تھا کہ وہ اس کے غیاب کے عرصے میں مستقل روتی رہی ہے۔

"ادا......!" عالم شاہ کو دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں نمی اتری۔ "آپ ٹھیک تو ہیں نا ادا؟" وہ قریب چلی آئی۔ فل آستینوں والے ڈھیلے ڈھالے کرتہ شلوار نے جسم کے زخموں اور پٹیوں کو تو چھپالیا تھا لیکن عالم شاہ اور سرمد کے چہروں پر بھی چند نشان تھے جس نے اسے یہ سوال کرنے پر مجبور کردیا تھا۔

"سب ٹھیک ہے سجل! بس پولیس والوں کو ذرا سی غلط فہمی ہوگئی تھی۔ اب سب ٹھیک ہوگیا ہے۔" اس نے بہن کے سر پر ہاتھ رکھ کر شفقت سے اسے تسلی دی۔

"ہم واپس پاکستان چلتے ہیں ادا! ہم نہیں رہیں گے یہاں۔ جہاں آتے ہی ہم پر ایک کے بعد ایک مصیبت ٹوٹتی چلی جارہی ہے۔" وہ متحمل مزاج تھی لیکن پے در پے پیش آنے والے حادثات نے اسے بہت حساس کردیا تھا۔ ایسا لگتا تھا جو کھو چکا اس کے بعد مزید کچھ کھونے کا حوصلہ نہیں رہا ہے، اسی لیے ایسی بات کررہی تھی۔

"انسان اپنی قسمت سے بھاگ کر کہیں نہیں جاسکتا سجل! انسان پر مشکل وقت کبھی بھی اور کہیں بھی آسکتا ہے۔ تم اس بات پر شکر ادا کرو کہ ہم اس مشکل سے نکل آئے ہیں۔" عالم شاہ اسے سمجھانے لگا۔ باقی حاضرین ذرا شرمندہ شرمندہ سے نظر آتے تھے۔ جو پیش آیا اس میں ان کا کوئی قصور نہیں تھا لیکن بحیثیت میزبان وہ خود پر ذمے داری محسوس کررہے تھے۔

"کسی وہم کو اپنے دل میں جگہ مت دو۔ ہم یہاں فیصل کی شادی میں شریک ہونے آئے ہیں۔ شریک ہوکر ہی جائیں گے اور ان شاء اللہ واپسی کے سفر میں ہمارے ساتھ بہت سی خوشگوار یادیں ہوں گی۔" وہ اپنے الفاظ سے بہن کو سمجھانے کے ساتھ ساتھ میزبانوں کی دلجوئی کی بھی کوشش کررہا تھا۔

"ایس ایس پی صاحب تشریف لائے ہیں۔" ملازم نے آکر اطلاع دی تو سجل اٹھ کر باہر نکل گئی۔ وہ قریبی اعزاء اور ملازمین سے پردہ نہیں کرتی تھی لیکن ان کے ہاں غیر اور انجانے لوگوں سے پردے کا رواج تھا اور اس رواج کی پوری پاسداری کرتی تھی۔

سجل کے جانے کے بعد چوڑے چکلے چہرے والا ایس ایس پی کمرے میں داخل ہوا۔ اسے بہت احترام سے بیٹھنے کے لیے کرسی پیش کی گئی اور شکیل نے اب تک کی ساری صورت حال دھیرے سے اس کے گوش گزار کی۔

"میں اغوا کے پورے واقعے کو آپ دونوں کی زبانی سننا چاہتا ہوں۔ بہت وچار کے ساتھ ڈیٹیلی سارا کچھ سنائیں۔ ان لوگوں کی آپس کی باتیں، آپ سے ڈائیلاگ، آس پاس کا ماحول، کچھ بھی مس نہیں کرنا ہے۔" ایس ایس پی نے فرمائش کی اور روئے سخن پہلے سرمد کی طرف کیا۔ سرمد سارا قصہ سناتا چلا گیا لیکن اس کا زیادہ وقت بے ہوشی میں گزرا تھا اس لیے اس کے پاس بتانے کو بہت زیادہ نہیں تھا۔ ایس ایس پی نے اس سے چند ایک سوالات کیے اور پھر عالم شاہ کی طرف متوجہ ہوگیا۔ عالم شاہ چونکہ اغوا کاروں کی قید میں ہی ہوش میں آچکا تھا اس لیے اس کے پاس بتانے کے لیے سرمد کے مقابلے میں زیادہ باتیں تھیں۔ ایس ایس پی نے ہوش کے عالم میں اس کی سنی جانے والی گفتگو میں خاصی دلچسپی لی اور اتنے کرید کرید کر سوالات کیے کہ عالم شاہ اگر کوئی بات وقتی طور پر بھول بھی گیا تھا تو اسے یاد آتی چلی گئی۔

"اس شخص نے یہ کیوں کہا کہ وہ تمہاری اتنی خاطر کردیتا ہے کہ اس جنم میں تو کیا، اگلے سات جنموں میں بھی بھارت آنے کا نہ سوچو۔" سب سن کر ایس ایس پی نے نکتہ اٹھایا۔

"پاکستان اور پاکستانیوں سے رنجش کے علاوہ کیا بات ہوسکتی ہے۔ میں نے آپ کو بتایا نا کہ راستے بھر بھی وہ لوگ پاکستان اور پاکستانیوں کے خلاف زہر اگلتے رہے تھے۔"

"وہ الگ بات تھی۔ اس وقت وہ جانتے تھے کہ تم ان کی باتیں سن رہے ہو لیکن جس وقت یہ جملہ کہا گیا انہیں تمہارے ہوش میں آنے کی جانکاری نہیں تھی۔ وہ آپس میں

www.pklibrary.com

بات کررہے تھے اور ان باتوں سے یہ بھی لگتا ہے کہ پولیس کی وردی میں تم لوگوں کو یہاں سے اریسٹ کر کے لے جانے والا آدمی اس دوسرے آدمی کے لیے کام کررہا تھا۔'' ایس ایس پی نہایت باریک بینی سے حالات کا تجزیہ کررہا تھا۔

''کیا آپ کے خیال میں ہمیں یہاں سے گرفتار کر کے لے جانے والے جعلی پولیس والے تھے؟'' عالم شاہ اس کے تجزیے پر چونکا۔

''لگتا تو یہی ہے۔ میں نے نیاز شاہ صاحب کی ریکویسٹ پر اس سارے معاملے کو بہت اچھی طرح چیک کیا تھا۔ کہیں سے کوئی معمولی سی سن گن بھی نہیں ملی تھی کہ پولیس یا کسی دوسری سیکرٹ ایجنسی نے تم لوگوں کو اریسٹ کیا ہو۔ پاکستان میں ہمارا بہت برا امیج سہی اور کچھ کیسز میں ہماری ہی غلطی بھی سہی لیکن اب ایسا بھی نہیں ہے کہ ہم انڈیا کی دھرتی پر قدم رکھنے والے ہر پاکستانی کی جان کے دشمن بن جاتے ہوں۔ ہاں، ہم پاکستانیوں پر سخت چیک ضرور رکھتے ہیں اور وہ ہمارا سیکیورٹی ایشو ہے۔'' ایس ایس پی خاصے کھلے ذہن کا بندہ معلوم ہوتا تھا لیکن بہرحال اس پر اپنے ملک کا دفاع کرنے کی ذمے داری عائد ہوتی تھی اس لیے وہ اپنے لوگوں کے خراب رویّے کی توجیحات بیان کررہا تھا۔

''جو بھی بات ہے جناب! میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میں تو یہاں آ کر گھن چکر ہی بن گیا ہوں۔ مجھ پر اور میرے ساتھی پر نہایت پروفیشنل انداز میں تشدد کیا گیا ہے اور عموماً ایسا تشدد آپ کی اور ہمارے ہاں کی پولیس ہی کرتی ہے۔'' عالم شاہ کے لہجے میں بیزاری اتری۔

''عالم ٹھیک کہہ رہا ہے ایس ایس پی صاحب! فردوس نے بھی ان دونوں کے زخموں کو دیکھنے کے بعد یہی کہا تھا کہ بے شک دونوں کو سخت چوٹیں لگائی گئی ہیں اور کوشش کی گئی ہے کہ یہ شدید تکلیف سے گزریں لیکن کوئی بھی چوٹ ایسی نہیں جو جان لیوا ہو۔ ایسا ٹارچر عام طور پر پولیس والے ہی کرتے ہیں۔'' جلیل نے بھی اُس کی حمایت میں آواز اٹھائی۔

''میں اس معاملے کو مزید ڈیپلی دیکھتا ہوں۔ آپ لوگ ایسا کریں کہ ان کے سامان اور کاغذات کی روبری سے لے کر اغوا تک کے سارے پراہلمز کی ایف آئی آر کٹوائیں تاکہ ایک لیگل پروسیس شروع ہوسکے اور آپ کے مہمان مزید کسی کٹھنائی میں نہ پڑیں۔'' ایس ایس پی چند ہدایات دے کر روانہ ہوگیا تو عالم شاہ اور سرمد کو بھی مہلت ملی کہ وہ آرام کرسکیں۔ فردوس کی دی گئی پین کلرز میں یقیناً کوئی ایسا جز بھی تھا جس نے بستر پر لیٹنے کے ساتھ کام دکھایا اور وہ نیند کی وادیوں میں اترتے چلے گئے۔

☆☆☆

''کیسے ہو معاذ؟'' وہ ایک آرام دہ بستر پر لیٹا ہوا لایعنی خیالات میں غرق تھا کہ سونیا کی نرم پکار نے اسے متوجہ کیا۔

''مچ بیٹر۔''

''کام کے لیے ریڈی ہو؟''

''کیا میرے پاس انکار کا اختیار ہے؟'' اس کا لہجہ زہریلا ہوا۔

''اگر تم بہتر فیل نہیں کررہے ہو تو ہم کچھ دن مزید انتظار کرسکتے ہیں۔''

''انجان مت بنو۔ تم جانتی ہو میں اپنی جسمانی نہیں، ذہنی حالت کے بارے میں بات کررہا ہوں۔''

''تمہیں تمہارے مطلب کا ٹاسک دیا گیا ہے تب بھی تم ایسی بات کررہے ہو۔ ہم تمہارے دشمن ملک کو زک پہنچانے جارہے ہیں تب بھی تم خوش نہیں ہو۔'' سونیا نے شکوہ کیا۔

''خوشی سے مرنہ جاتے جو تیرا اعتبار ہوتا۔'' وہ طنزیہ سی ہنسی ہنسا۔

''مطلب؟'' سونیا نے اسے گھورا۔

''مطلب صاف ظاہر ہے۔ مجھے یہ مشن میرے وطن کے کسی قابل اعتبار ادارے نے نہیں بلکہ ایسے لوگوں نے سونپا ہے جن کی بے ضمیری کا میں خود گواہ ہوں۔ ایسے میں کوئی اچھی امید رکھنا نری خوش فہمی ہے۔'' اس نے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔

''تم ایسی باتیں اس لیے کررہے ہو کہ تم ابھی ہمیں سمجھے نہیں ہو۔ ہم کسی کے دوست یا دشمن نہیں ہیں۔ تم ہمیں فری لانسر سمجھو۔ ہم سب کے لیے کام کرتے ہیں۔ جو کام تم ہمارے لیے کرنے جارہے ہو وہ تمہارے ملک کے مفاد میں ہے اس لیے تمہیں اس کو انجام دینے میں کوئی جھجک نہیں ہونا چاہیے۔'' سونیا اسے نہایت نرمی سے قائل کرنے کی کوشش کررہی تھی۔

''اس بحث کو چھوڑو۔ جو کرنا ہے اس پر بات کرتے ہیں۔'' معاذ نے خود ہی بحث سمیٹ دی۔ سونیا کے کرم فرماؤں کی مہیا کی گئی اس پناہ گاہ میں قیام کیے کئی روز گزر چکے تھے۔ یہاں اسے بہترین علاج، طعام اور قیام کی سہولیات میسر تھیں اس لیے اس نے بہت تیزی سے ریکور کیا تھا اور وہ جانتا تھا کہ ڈاکٹر کے ذریعے یہ ساری معلومات سونیا کو بھی حاصل ہوچکی ہوں گی اس لیے بہانے بنا کر ٹال

www.pklibrary.com

مثول سے کام لینا بے مقصد سی حرکت تھی۔

''ہم عام سے مسافروں کے حلیے میں سندر نگر میں داخل ہوں گے۔ یہ شام کے بعد کا وقت ہوگا اور اس وقت کا فائدہ اٹھا کر کسی نہ کسی طرح وہاں قیام کا بندوبست کرنا ہوگا۔ رات کے اس قیام میں ہی ہمیں ساری کارروائی.....'' سونیا بھی بحث کو طول دیے بغیر اس کے ساتھ آ بیٹھی تھی اور لیپ ٹاپ کھولے اسے سندر نگر کا نقشہ بھی ساتھ ساتھ دکھاتی جا رہی تھی۔ یہ ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جس کی آبادی بھی چند سو سے زیادہ نہیں تھی لیکن سرحد کا قریبی گاؤں ہونے کی وجہ سے اس کی اہمیت کافی زیادہ تھی۔

سونیا اسے گاؤں کے حدود اربع سے آگاہ کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے ٹاسک کے حوالے سے بھی معلومات فراہم کرتی جا رہی تھی۔ معاذ غور سے اس کی ہر بات سن رہا تھا۔ یہاں روانہ ہوتے وقت اسے صرف اتنا بتایا گیا تھا کہ بھارت میں اسے کچھ ایسے کام انجام دینا ہوں گے جو اس کے وطن کے ازلی دشمنوں کے لیے کاری ضرب ثابت ہوں گے۔ ان ٹاسک کے حوالے سے معلومات موقع پر فراہم کی جاتیں اور اب ایسا ہو رہا تھا۔

''اتنی بڑی کارروائی کے بعد ری ایکشن تو زبردست آئے گا اور ہمیں ٹریس کرنے کی بھرپور کوشش بھی کی جائے گی۔''

''ڈونٹ وری۔ ہم کچھ بھی ہونے سے بہت پہلے وہاں سے نکل چکے ہوں گے اور وہ بھی اپنے قدموں کے نشان چھوڑے بغیر اس لیے ہمارے پکڑے جانے کا کوئی امکان نہیں۔'' سونیا پوری طرح بے فکر تھی۔ اس کی یہ بے فکری اس کی تیاری اور باڈی لینگویج سے بھی جھلک رہی تھی۔ آج اس نے مغربی طرز کا لباس پہنا ہوا تھا۔ تیز سرخ ٹاپ لیس شرٹ نما چیز کے ساتھ گھٹنوں سے ذرا اوپر ہی ختم ہو جانے والا شارٹ اس کے قیامت خیز حسن کو بڑا نمایاں کر کے دکھا رہا تھا۔ لمبی سڈول ٹانگیں، سنہری اور گلابی کے خوبصورت امتزاج والی جلد اور دل آویز نقوش والی اس عورت کو نظر انداز کر دینا کسی مرد کے لیے آسان نہیں تھا۔ معاذ کے پہلو میں بیٹھی وہ مسلسل اس کے لیے امتحان بنی ہوئی تھی۔ اس کی زلفوں اور جسم سے اٹھتی بھینی بھینی مہک بار بار اس کی توجہ کھینچ لیتی تھی لیکن وہ اپنی پوری قوت ارادی سے کام لے کر اس حسین فتنے سے بچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ اس بات کو محسوس کر چکا تھا کہ سونیا بہت غیر محسوس طور پر اسے اپنے حسن کے تیر سے گھائل کرنے کی کوشش کرتی رہتی ہے لیکن یہ کوششیں اتنی محتاط تھیں کہ انہیں اس کی فطری بے باکی یا ہلکا پھلکا فلرٹ کہہ کر بھی نظر انداز کیا جا سکتا تھا۔ جیسا کہ اس وقت وہ اس کے ساتھ اس کے بستر پر ہی بیٹھی بظاہر ''کام'' کی باتیں کر رہی تھی لیکن اس کے بدن کا ریشمی لمس اور بھینی بھینی خوشبو بار بار معاذ کی توجہ بھٹکا دیتے تھے۔

''چائے تو منگواؤ یار! سر کچھ بھاری بھاری سا ہو رہا ہے۔'' کام کی بہت سی معلومات اسے منتقل کر دینے کے بعد اس نے ایک تو بہ شکن انگڑائی لی اور اس کے بستر پر ہی نیم دراز ہوتے ہوئے فرمائش کی۔

''چائے.....؟'' معاذ نے حیرت کا مظاہرہ کیا۔ ''تم جیسوں کی تھکن تو دوسری چیزوں سے دور ہوتی ہے۔''

''سوتو ہے لیکن تمہارا ساتھ تو صرف چائے کی حد تک ہی مل سکتا ہے اس لیے چائے کی فرمائش کی ہے۔'' اس نے مسکرا کر وجہ بیان کی تو معاذ نے مزید بحث مناسب نہیں سمجھی اور انٹر کام پر دو کپ چائے بھیجنے کا کہہ دیا۔

''میں ذرا واش روم سے ہو کر آتا ہوں۔'' سونیا کا دہکتا ہوا قرب اس کے لیے آزمائش بن رہا تھا اس لیے بہانہ بنا کر اس سے دور ہٹ گیا۔ دو چار منٹ بعد واپس آیا تو چائے آ چکی تھی۔

''تم بناؤ۔'' سونیا نے ایک بار پھر لیٹے ہی لیٹے انگڑائی لیتے ہوئے اس سے فرمائش کی۔ انگڑائی لینے کے اس عمل میں اس کا جسم کمان کی طرح تن گیا تھا اور سارے نشیب و فراز پوری طرح عیاں ہو گئے تھے۔ معاذ اس حسنِ بلاخیز سے نظریں چرا کر پیالیوں میں چائے انڈیلنے لگا۔ اس نے بیٹھنے کے لیے جان بوجھ کر ایک سنگل صوفے کا انتخاب کیا تھا تاکہ یہ حسین بلا کسی اور طرح اس کے لیے آزمائش نہ بنے۔

''چینی کتنی؟''

''نو شوگر۔ اپنا فیگر پرفیکٹ رکھنے کے لیے مجھے احتیاط کرنا پڑتی ہے۔'' اس نے مسکرا کر جواب دیا تو معاذ نے بغیر چینی کی چائے اس کی طرف بڑھا دی۔ وہ اب تک بستر پر ہی قابض تھی لیکن اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ معاذ کی نہایت احتیاط سے بڑھائی چائے کی پیالی اس نے شرافت سے تھام لی پھر ہنس کر بولی۔

''تم تو اس طرح بی ہیو کر رہے ہو جیسے کسی سولہ سال کی کنواری دوشیزہ کے کمرے میں کوئی مرد گھس آیا ہو اور اسے اپنی عزت سخت خطرے میں محسوس ہو رہی ہو۔''

''عزت مرد کی بھی خطرے میں پڑ سکتی ہے اور باکردار مرد اپنی عزت کی اتنی ہی پروا کرتا ہے جتنی کوئی باکردار عورت۔'' معاذ نے اسے کھردرے سے لہجے میں جواب دیا

www.pklibrary.com

اور اپنے لیے تیار کردہ چائے کی پیالی ہونٹوں سے لگالی۔

''تم مشرقیوں کی اخلاقیات نری منافقت ہے۔'' سونیا نے منہ بنایا۔

''تو تم کیا کوئی یورپین ہو؟'' معاذ نے اس کی بات پکڑی۔

''ذہنی طور پر تو کہہ سکتے ہو۔'' اس نے ناک چڑھا کر ایک ادا سے جواب دیا۔

''تم دیکھنے میں بھی خاصی یورپین ہی لگتی ہو۔'' معاذ نے چائے کا ایک اور گھونٹ لیتے ہوئے اس کی طرف دیکھا اور ایک بار پھر اعتراف کیا کہ وہ زہد شکن حسن کی مالک ہے۔

''شمالی علاقہ جات اور افغانستان وغیرہ سے تعلق رکھنے والے افراد میں یہ خصوصیت پائی جاتی ہے۔''

''تم کہاں سے ہو؟'' اس کا تجسس جاگا۔

''سوات سے۔ داراب میرے گھر والوں کی غربت کا فائدہ اٹھا کر مجھے وہاں سے خرید لایا تھا اور پھر اسی نے مجھے تراش خراش کر یہ روپ دیا۔'' خلافِ توقع اس نے جواب دے دیا۔

''کیا داراب بھی ان لوگوں کے لیے کام کرتا ہے جن کے لیے تم کر رہی ہو؟''

''یہ ایک لمبی کہانی ہے اور اس کہانی کو دہرا کر میں خود کو اذیت میں مبتلا نہیں کرنا چاہتی۔'' وہ یکدم ہی اداس دکھائی دینے لگی۔ اداسی کی کیفیت نے اس کی حسین آنکھوں کی خوبصورتی کو مزید بڑھا دیا تھا اور وہ پہلے سے زیادہ پُرکشش محسوس ہو رہی تھی۔ معاذ نے بے اختیار ہی خود کو اس کی طرف کھنچتا ہوا محسوس کیا۔

''اب تو داراب نہیں رہا ہے اور تم اس کی دولت کی واحد وارث ہو، تو نکل جاؤ ان سارے چکروں سے اور کہیں دور جا کر ایک اچھی زندگی گزارو۔'' وہ اب سونیا کے لیے ہمدردی سے سوچ رہا تھا۔

''کیوں مذاق کرتے ہو۔ تم نہیں جانتے کیا کہ ان لوگوں کے چنگل سے نکلنا کتنا مشکل ہے؟'' اس بار اس کی آنکھوں سے آنسو ہی بہہ نکلے۔ معاذ ان حسین آنکھوں سے بہتے آنسو دیکھ کر گویا تڑپ ہی اٹھا اور بے ساختہ اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے قریب جا بیٹھا۔

''آئی ایم سوری سونیا! میں شاید انجانے میں تمہیں تکلیف دے بیٹھا ہوں۔ اصل میں تم جن لوگوں کے نمائندے کی حیثیت سے مجھ سے ملی ہو، وہ میرے لیے نہایت قابلِ نفرت ہیں اور تمہیں ان کا ساتھی جان کر میں تمہارے متعلق بھی منفی انداز میں سوچتا رہا ہوں۔'' اسے خود بھی اندازہ نہیں تھا کہ سونیا کے آنسو اتنے طاقتور ہوں گے کہ وہ اس کے لیے اپنے دل میں مثبت جذبات محسوس کرے گا۔

''فرق صرف سینئر اور جونیئر کا ہے ورنہ حقیقت میں ہم تم ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔ بس تم بول بال کر اپنا غصہ نکالتے رہتے ہو اور میں نے حالات سے مکمل سمجھوتا کر لیا ہے۔'' اس نے اپنا سر معاذ کے شانے پر رکھ لیا اور افسردگی سے بولی تو معاذ نے بے ساختہ ہی تسلی دینے والے انداز میں اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دبایا۔ جذبات پہلے ہی اتھل پتھل کا شکار ہو رہے تھے۔ سونیا کے لمس نے پورے جسم میں سنسنی سی دوڑا دی۔

''میں اکیلی تھی اس لیے شکست تسلیم کر لی۔ اگر تم میرا ساتھ دو تو ہم مل کر اپنی آزادی کی کوئی راہ نکال سکتے ہیں۔'' اس نے خود کو معاذ کے ساتھ مزید پیوست کیا۔ معاذ جو پہلے ہی اپنے جذبات میں خاصی ہلچل محسوس کر رہا تھا، مزید اس کی طرف کھنچنے لگا۔

''اگر ایسی کوئی راہ نکل سکتی ہے تو میں دل و جان سے تمہارے ساتھ ہوں۔'' سونیا کو اثبات میں جواب دیتے ہوئے اس کا لہجہ بے حد بوجھل تھا۔

''سو سویٹ۔ تم نے میرا دل خوش کر دیا معاذ۔'' اس نے چٹاچٹ معاذ کے کئی بوسے لے ڈالے۔ ان بوسوں نے یکدم ہی ہر بند توڑ ڈالا اور معاذ کے اندر دھاڑتا جذبات کا طوفان یکدم ہی بے قابو ہو گیا۔ ان بے قابو جذبات کی دوسری طرف سے خوب خوب پذیرائی کی جا رہی تھی، سو موجیں بلند سے بلند ہوتی چلی گئیں۔ ان طوفانی موجوں کے ساتھ ساتھ بہتے وہ نفوس کب تھک ہار کر سوئے، انہیں خود بھی پتا نہیں چلا۔ صبح پہلے معاذ کی ہی آنکھ کھلی۔

''یہ.....'' اپنے بازو پر سر رکھے سوتی سونیا کو دیکھ کر اسے زور کا جھٹکا لگا اور اسے دھکیل کر تیزی سے بستر سے اترنے کی کوشش کی لیکن سر بری طرح چکرا گیا۔

''کیا بات ہے معاذ! کیا ہوا ہے، تم اتنے پریشان کیوں ہو؟'' جھٹکے سے سونیا کی آنکھ کھل چکی تھی اور اب وہ اس کی طرف تشویش سے دیکھتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

معاذ نے اپنے چکراتے سر کو تھام کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن اس کا حلیہ دیکھ کر نظریں چرا گیا۔ عین اسی وقت پہلی بار اسے اپنی ہیئت کذائی کا بھی احساس ہوا اور وہ جیسے زمین میں گڑ گیا۔ یہ ادراک کہ وہ اپنی پارسائی کا بھرم کھو چکا ہے، نہایت باعثِ تکلیف تھا۔ وہ جو صرف پارسائی کو عورت تک محدود نہیں سمجھتا تھا، خود

www.pklibrary.com

کیسے اپنے معیار سے نیچے چلا گیا۔ یہ بات کسی طور اس کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ شدید جھنجلاہٹ میں اس نے سونیا کو کینہ توز نظروں سے دیکھا اور پھنکار کر بولا۔

"یو...... یو بچ۔ تم نے مجھے ٹریپ کیا۔"

"پلیز معاذ! ایسی زبان استعمال مت کرو۔ جو کچھ ہوا اس میں تم پوری طرح انوالو تھے۔" سونیا نے انگلی اٹھا کر اسے ٹوکا تو وہ اسے بس گھور کر رہ گیا اور پیر پٹختا ہوا باتھ روم میں جا گھسا۔ خاصا طویل شاور لینے پر اس کے سر کا بھاری پن تو خاصی حد تک دور ہو گیا لیکن دل پر آ جانے والے بوجھ کا کوئی علاج نہیں تھا۔ اپنے پستی میں گر جانے کا احساس اسے کسی طور چین نہیں لینے دے رہا تھا۔ اسی احساس کے ساتھ وہ کمرے میں واپس آیا تو سونیا وہاں سے جا چکی تھی۔ کمرا سمیٹا جا چکا تھا اور بستر پر بچھی نئی بے شکن چادر کو دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ رات اس کمرے میں مرد و زن کی ازلی کہانی دہرائی گئی ہے۔ وہ بے دم سا ہو کر صوفے پر آ بیٹھا۔ میز پر سے رات پی جانے والی چائے کے برتن بھی غائب تھے۔ پورے کمرے میں ایسی کوئی نشانی نہیں تھی جو گزری رات کا افسانہ سنا سکے لیکن ایک داغِ ندامت تھا جو اس کے اپنے دل پر لگ گیا تھا۔

"مانا کہ سونیا بہت حسین ہے لیکن رات ایسا کیا ہوا تھا جو میں اس کے حسن کے جال میں پھنس گیا۔ کیا اس کے حسن میں میری تربیت اور اقدار سے زیادہ طاقت تھی؟" خود سے سوال جواب کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ تھا جس نے اس کو اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔ ان سوالوں کے حصار میں گھرا وہ خود کو اتنا بے بس محسوس کر رہا تھا کہ جب کچھ سجھائی نہیں دیا تو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ ہاں، وہ رو رہا تھا۔ ایک توانا مرد ہونے کے زعم کے باوجود رو رہا تھا کہ پارسائی کے زعم کو کھو دینا صرف عورت ہی نہیں باکردار مرد کے لیے بھی تکلیف دہ ہوتا ہے۔

☆☆☆

"کیا حال ہے دیور جی!" وہ لان میں ہلکی پھلکی ورزش کر رہا تھا کہ چہل قدمی کرتی فردوس اس کے قریب چلی آئی۔

"الحمد للہ! بہت بہتر ہوں۔ گھر کا ڈاکٹر مل جانے کا یہی فائدہ ہوتا ہے کہ کسی بھی بیماری یا تکلیف کو لمبا کھینچ کر بل بڑھانے کی ترکیبیں نہیں لڑائی جاتیں۔" عالم شاہ نے خوشگوار لہجے میں اسے جواب دیا تو وہ ہنس پڑی۔

"ڈاکٹروں سے بڑے بدگمان لگتے ہو۔"

"سب سے نہیں لیکن جو اپنے پیشے سے بددیانتی کرتے ہیں ان پر ضرور افسوس ہوتا ہے۔" وہ فردوس کے ساتھ چلتا ہوا لان چیئر پر آ بیٹھا۔ مختلف پودوں اور رنگ برنگے پھولوں سے سجا یہ لان اس گھر میں اس کا پسندیدہ مقام تھا۔ اپنی جسمانی تکلیف اور کاغذات کی عدم موجودگی کے باعث باہر جا کر گھومنا پھرنا یوں بھی ممنوع تھا اس لیے یہ لان اور بھی اچھا لگتا تھا۔

"واقعی! بددیانتی تو کسی بھی شعبے میں اچھی نہیں لگتی۔ بہرحال اس وقت اس سنجیدہ موضوع پر گفتگو کرنے کا سمے بالکل بھی نہیں ہے۔ میں صرف تمہیں اباجی کا یہ میسج دینے آئی تھی کہ آج فیصل کی مہندی پر تم بھی ہمارے ساتھ دلہن والوں کے ہاں چلو گے۔ اباجی نے ساری ضروری کارروائی کرلی ہے اس لیے تمہارے مہندی میں شریک ہونے میں کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔"

"یہ تو اچھی خبر سنائی آپ نے۔ ہم تو آئے ہی فیصل کی شادی میں شریک ہونے کے لیے ہیں۔ اس شادی کی کوئی تقریب مس ہو جاتی تو مجھے بڑا افسوس ہوتا۔" وہ فردوس کی دی اطلاع سن کر خوش ہو گیا۔

"بس تو پھر ٹائم پر تیار رہنا۔ تمہارا ڈریس تمہارے کمرے میں پہنچ جائے گا۔ آج کا ڈریس کوڈ بلیک کرتہ شلوار پر یلو اور گرین کلر کا پٹکا ہے۔" فردوس نے اس کی معلومات میں اضافہ کیا اور اسی وقت ملازم کا پہنچایا ہوا اورنج جوس بوتل سے گلاس میں انڈیل کر اسے پیش کیا۔

"تھینک یو بھابی! آپ بھی لیجیے نا!" اس نے اصرار کیا۔

"نہیں، بس اب میں جاؤں گی۔ شام کے لیے بہت ساری تیاریاں کرنا ہیں اور فی الحال ناشتے ہی کا دور چل رہا ہے۔ سارے چھوٹوں کو ڈانٹ کی ڈوز دے کر ایکٹیو کرنا ہوگا تاکہ ٹائم پر روانہ ہو جائیں۔ اباجی ٹائم کے معاملے میں بڑے اصول پسند ہیں۔" فردوس نے اسے آگاہ کیا اور اپنی جگہ چھوڑ کر اندر کی طرف بڑھ گئی۔ عالم شاہ صبح کی تازہ ہوا، پھول پودوں کی مہک اور اورنج جوس سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ ابھی اس کا جوس ختم نہیں ہوا تھا کہ اس نے اجالا کو لان کی طرف آتے ہوئے دیکھا۔ وہ اسے وہاں پا کر ذرا سا ٹھٹکی لیکن پھر بالوں کو بے نیازی سے جھٹکتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ عالم شاہ نے بھی خود کو اس کی طرف سے بے نیاز ظاہر کرنا شروع کر دیا لیکن بہرحال وہ اس کی طرف متوجہ تھا اور کن انکھیوں سے اسے وہاں چہل قدمی کرتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات تھے اور یوں لگ

www.pklibrary.com

رہا تھا کہ وہ عالم شاہ کی یہاں موجودگی سے بدمزہ ہو رہی ہے لیکن اس کی وجہ سے اپنا مشغلہ ترک کرنے میں بھی سکی محسوس کر رہی ہے اس لیے وقتاً فوقتاً اس کی طرف کھا جانے والی نظروں سے گھورنا نہیں بھولتی۔

اس کے اس بچکانہ انداز پر عالم شاہ کو ہنسی آگئی۔ پتا نہیں کیوں وہ ان کی یہاں آمد کے ساتھ ہی اس کی دشمن بن گئی تھی اور اسے دیکھتے ہی ناک بھوں چڑھا لیتی تھی، یہاں تک کہ اس نے اس کے اور سرمد کے اتنے بُرے حالات سے گزر کر واپس آنے کے بعد بھی اس کی خیریت دریافت نہیں کی تھی۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ اپنی اس لاڈلی بیٹی کے معاملے میں نیاز شاہ بھی بے بس سے دکھائی دیتے ہیں اور انہیں اس کی شدید محبت کسی معاملے میں اس سے اختلاف کرنے ہی نہیں دیتی۔ گھر کے سربراہ کا یہ حال تھا، اس لیے باقی افراد بھی اس کے ناز نخرے اٹھانے پر مجبور تھے۔

''یہ آپ نے مجھے کس ٹیڑھی کھیر سے متھا مارنے کی ذمے داری سونپ دی بابا سائیں!'' اجالا کے بارے میں سوچتے سوچتے اس کی ذہنی رو صداقت شاہ کی فرمائش کی طرف چلی گئی اور وہ دل ہی دل میں انہیں مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ انہوں نے اس سے کہا تھا۔

''نیاز شاہ میرا چچازاد ہے پٹ! ہمارے بیچ دو ملکوں کی سرحدیں آگئی ہیں لیکن رگوں میں دوڑتا خون ایک ہی ہے اور اس خون کی کشش کہتی ہے کہ ہمارے درمیان رابطے کا سلسلہ ہماری نسل پر ہی ختم نہ ہو جائے۔ ادا نیاز شاہ کی چھوٹی دھی کنواری ہے اور تیرا اس سے جوڑ بھی بنتا ہے۔ تو میرے کہنے پر ایک بار اسے اس نظر سے دیکھنا ضرور۔ وہ تیری دلہن بن کر ہماری حویلی میں آجائے گی تو تعلقات اور رشتوں کے سلسلے اگلی نسلوں تک بھی جانے کی امید بندھ جائے گی۔''

اسے بابا سائیں کی اس خواہش پر غور کرنے میں عار نہیں تھا لیکن یہاں آتے ہی وہ عجیب وغریب حالات میں پھنس گیا تھا، اس پر مستزاد اجالا کا رویہ تھا۔ اس نے تو سرے سے اسے گھاس ہی نہیں ڈالی تھی پھر وہ کس بنیاد پر اس سے نئے رشتے جوڑنے کا سوچتا۔

''ویسے اگر یہ اپنے ان خوبصورت ہاتھوں سے مجھے گھاس ڈالے تو کیا میں گدھا بن کر اس گھاس کو چر لوں گا؟'' ترچھی نظروں سے ایک پتے کو مسلتی اجالا کو دیکھتے ہوئے اس کے دل میں عجیب سا خیال آیا تو ہونٹوں پر بے ساختہ ہی بہت گہری مسکراہٹ آگئی۔

''ایڈیٹ! ایک تو چوری چوری لڑکیوں کو دیکھتا ہے پھر ہنستا بھی ہے۔ میں ابا جی سے کہہ کر ابھی ایسے گدھے کو یہاں سے نکلواتی ہوں۔'' اس کی مسکراہٹ اجالا سے پوشیدہ نہیں رہی اور وہ براہ راست اسے مخاطب کرنے کے بجائے بلند آواز میں بڑبڑاتی غصے سے دھپ دھپ کرتی وہاں سے چلی گئی۔

''گدھا.....'' عالم شاہ خود کو دیے گئے خطاب پر پہلے تو تلملایا پھر یہ سوچ کر ہنس دیا کہ ابھی وہ خود بھی اپنے بارے میں ایسا ہی کچھ سوچ رہا تھا۔

رات نیاز شاہ کے گھر رنگ و نور کی برات سی اتر آئی۔ گھر کی سجاوٹ، ڈھول تاشے، بلند قہقہے اور روانگی سے قبل کی مخصوص ہلچل..... سب کچھ دیکھ کر ایسا لگتا تھا دنیا میں غم اور پریشانی کا نام ونشان بھی نہیں ہے۔ وہ خود کو دیے گئے وقت پر تیار ہونے کے بعد آئینے میں اپنا تنقیدی جائزہ لے رہا تھا کہ تجل اس کے کمرے میں چلی آئی۔ وہ سیاہ رنگ کے قمیص شلوار میں تھی اور سر پر سیاہ رنگ کا ہلکی سی سلور کناری والا دوپٹا نہایت سلیقے سے اوڑھ رکھا تھا۔ چہرے پر میک اپ بالکل نہیں تھا البتہ کانوں میں چھوٹے چھوٹے ٹاپس اور ناک میں ایک ست رنگی نگینے والی لونگ دمک رہی تھی۔ اتنی سی تیاری نے بھی اسے گویا سجا ڈالا تھا۔

''اچھا تو خواتین بھی بلیک کلر ہی پہن رہی ہیں؟'' اسے دیکھ کر عالم شاہ نے تبصرہ کیا۔

''جی، لیکن وہ سب ساڑیاں پہن رہی ہیں۔ مجھے عادت نہیں ہے اس لیے میں نے انکار کر دیا۔'' اس نے بتایا۔

''چلو ٹھیک ہے، تمہاری مرضی۔'' عالم شاہ نے اس کی گود میں موجود بچے کو لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ ڈریس کوڈ پر اتنی سختی سے عمل کیا جا رہا تھا کہ اس ننھے سے بچے کو بھی اسی رنگ کا لباس پہنایا گیا تھا۔

''مرضی تو میری ساتھ جانے کی بھی نہیں تھی لیکن سب کے اصرار پر تیار ہونا پڑا۔''

''اچھا کیا نا..... یہاں اکیلی گھر میں رک کر کیا کرتیں۔ وہاں چل کر سب کے ساتھ انجوائے کرنا۔'' وہ بھانجے کے نرم نرم گالوں کو ہولے سے چھوتے ہوئے بولا۔

''چاچا سائیں کی فیملی ضرورت سے زیادہ ماڈرن ہے۔ مہندی کی یہ تقریب کمبائنڈ ہوگی اور میں وہاں کمفرٹیبل فیل نہیں کروں گی۔'' تجل نے اپنا مسئلہ بتایا۔

''ہم یہاں چند دن کے مہمان ہیں تجل اور ہمارا کسی کے لائف اسٹائل پر تنقید کرنا مناسب نہیں ہے۔ ہاں تم یہ

www.pklibrary.com

کرسکتی ہو کہ تقریب میں بھی اپنی چادر اوڑھی رہو اس طرح تمہیں بے پردگی کا مسئلہ نہیں ہوگا۔'' اس نے مشورہ دیا۔

''جی ادا! میں نے بھی ایسا ہی سوچا ہے۔'' اس نے جواب دیا پھر بچے کو لینے کے لیے ہاتھ آگے بڑھائے۔

''آپ اسے مجھے دے دیں ادا! ایسا نہ ہو کہ یہ آپ کی اتنی شاندار تیاری کو خراب کردے۔''

''کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ویسے بھی میں کون سا شہزادہ گلفام لگ رہا ہوں۔''

''لگ تو رہے ہیں۔ اگر اماں سائیں یہاں ہوتیں تو کالے بکرے کا صدقہ دیے بغیر باہر نہ نکلنے دیتیں۔'' سجل دھیرے سے مسکرا کر بولی تو اس نے بھی ایک چھوٹا سا قہقہہ لگایا۔ اس کی والدہ اپنے اکلوتے بیٹے کے لیے واقعی اتنی ہی جذباتی تھیں۔

''اماں سائیں اور مومل کو تم نے یہاں کے حالات کے بارے میں کچھ بتایا تو نہیں ہے نا؟ میرا مطلب ہے میرے اور سرمد کی عجیب و غریب گرفتاری کے بارے میں؟''

''اگر بتا دیا ہوتا تو اب تک ہم پاکستان واپس پہنچ چکے ہوتے۔''

''صحیح کہہ رہی ہو۔ اسی احتیاط میں، میں نے بابا سائیں کو بھی کچھ زیادہ تفصیل نہیں بتائی۔ جو ہونا تھا ہو چکا۔ بات کو زیادہ پھیلا کر چاچا سائیں کو شرمندہ کرنے سے کیا حاصل ہوتا۔''

''میں بھی چاچا سائیں کی خاطر ہی خاموش ہوگئی ہوں ورنہ میں خود اتنے بڑے واقعے کے بعد یہاں نہیں رکنا چاہتی تھی۔'' اس نے بچے کو عالم شاہ کی گود سے لے لیا۔

''جا کر دیکھتی ہوں کہ کیا ہو رہا ہے۔ بڑی بھابی کہہ رہی تھیں کہ بس دس پندرہ منٹ میں نکل جائیں گے۔ آپ بھی اپنی تیاری مکمل کر کے جلدی باہر آجائیں۔'' وہ کہہ کر باہر نکل گئی تو عالم شاہ نے بھی اپنے کھسے پہنے اور ہرا اور پیلا سنہرے تاروں والا پٹکا (دوپٹا) سیٹ کر کے باہر آگیا۔ سب ہی لوگ تقریباً تیار تھے۔

''آج کتنی بھارتی ناریوں کو گرانے کا ارادہ ہے دیور جی!'' فردوس جو باقی خواتین کی نسبت اس سے زیادہ بے تکلف ہو چکی تھی، اسے دیکھ کر بے ساختہ ہی بولی۔

''آپ اپنا میڈیکل باکس ساتھ رکھ لیں۔ گرنے والیوں کو ساتھ ساتھ ہوش میں لاتی رہیے گا۔'' اس نے بھی شوخی سے جواب دیا اور باہر کی طرف جانے کے لیے پلٹا لیکن سیڑھیاں اترتی اجالا نے اس کے قدموں کو ساکت کر دیا۔ اس کی دراز قامت پر ساڑی بے حد جچ رہی تھی اور ساڑی کا سیاہ رنگ تو گویا غضب ہی ڈھا رہا تھا۔ سلیولیس بلاؤز سے جھانکتے اس کے اجلی رنگت والے بازو لباس کی سیاہی میں کچھ زیادہ ہی نمایاں ہو رہے تھے۔ شولڈر کٹ بالوں کو نہایت جدوجہد کے ساتھ سمیٹ کر جوڑے کی شکل دی گئی تھی۔ بال پنوں اور جیل کے بے دریغ استعمال کے باوجود اس کے بال پوری طرح قابو میں نہیں آئے تھے اور کئی لٹیں نکل کر اس کے چہرے پر لہرا رہی تھیں۔ ساڑی کی مناسبت سے میک اپ اور جیولری کا انتخاب بھی خوب تھا۔ حقیقتاً وہ پورے ہیل کانٹوں سے لیس تھی اور کسی کے بھی دل پر غضب ڈھا سکتی تھی۔ عالم شاہ بھی اگر اس غضب ڈھاتے روپ کو دیکھ کر مسحور ہو گیا تھا تو یہ کوئی انہونی بات نہیں تھی۔

''سب ریڈی ہیں بھئی تو چلو جلدی سے گاڑیوں میں بیٹھو۔ مونا کے گھر والے ہماری راہ دیکھ رہے ہیں۔ کئی بار وہاں سے فون آچکا ہے۔'' بڑی بھابی نسرین نے اجالا کو آتے دیکھ کر بلند آواز میں کہا تو اپنی ہی دھن میں سیڑھیاں اترتی وہ وہاں جمع جملہ افراد کی طرف متوجہ ہوئی۔ اب یہ اتفاق تھا کہ نظر سب سے پہلے سحر زدہ سے کھڑے عالم شاہ سے جا ٹکرائی اور اس کی وارفتگی کو محسوس کر کے ناگواری کا تاثر دینے کے لیے فوراً ہی چھوٹی سی ناک کو سکیڑا۔ اس کی اس حرکت پر ناک میں پڑے کوکے نے لشکارہ مارا اور اس کے حسن کو مزید تابانی بخش گیا۔ عالم شاہ، حسن کی اس ادا پر دھیرے سے مسکرایا اور قصداً اس پر سے نظر ہٹا کر دیگر لوگوں کا جائزہ لینے لگا۔ سب ہی نے خوب تیاری کی تھی لیکن اجالا والی بات بھلا کس میں تھی۔ وہ اس کے قریب سے گزر کر خارجی راستے کی طرف بڑھ گئی تو اس نے اس پر دوبارہ نگاہ جمادی لیکن سامنے آنے والے منظر نے اسے شدید ناگواری کے احساس کے تحت ہونٹ بھینچ لینے پر مجبور کر دیا۔ اجالا کا بلاؤز بیک لیس تھا اور صرف دو ریشمی ڈوریوں نے اس کے بلاؤز کو تھاما ہوا تھا۔ دائیں ہاتھ کی انگلیوں میں نزاکت سے دبا ساڑی کا مہین سا پلو بھی اس عریانیت کو چھپانے میں قطعی ناکام تھا۔

''کمبخت، خود کو بالی وڈ کی ہیروئنوں سے بھی اونچی شے سمجھتی ہے۔'' بلائے گئے مہمانوں میں سے پتا نہیں وہ کون تھی جس نے اجالا کے چلنے پر تبصرہ کیا تھا۔ عالم شاہ کو اچھا نہیں لگا لیکن تبصرہ کرنے والی کا کوئی قصور نہیں تھا۔ اس نے وہی کہا تھا جو نظر آرہا تھا۔

''چاچا سائیں نے تو لاڈ میں لڑکی کو بالکل برباد ہی

www.pklibrary.com

کر دیا ہے۔'' ناگواری سے سوچتا ہوا وہ کسی کے پکارنے پر آگے بڑھا اور مختلف گاڑیوں میں بیٹھنے والوں کے ساتھ شامل ہو گیا۔

''یہاں میرے ساتھ آجاؤ عالم!'' فیصل نے اسے دیکھ کر پکارا۔ وہ باقی لوگوں کے برخلاف اجلی سفید رنگت کا کرتہ پاجامہ زیب تن کیے ہوئے تھا البتہ گلے میں سب ہی کی طرح زرد اور سبز رنگ کا دوپٹا تھا۔

''بچ رہے ہو۔'' عالم شاہ نے خوش دلی سے اس کی تعریف کی۔

''بچ تو تم رہے ہو۔ ہمیں تو بس دلہا ہونے کا مارجن حاصل ہے۔'' فیصل نے جواباً اسے سراہا۔

''آج کا دن تمہارا ہے بھائی! ہم کوّوں کی برات میں تم اکیلے کبوتر دکھائی دے رہے ہو۔'' عالم شاہ نے ملبوسات کی رنگت کے حوالے سے فقرہ چست کیا۔

''ہاہاہا..... اجالا! دیکھو عالم کیا کہہ رہا ہے۔ تمہارے سجیٹ کیے ہوئے ڈریس کوڈ کو اس نے کوّوں سے ملا دیا ہے۔'' فیصل نے نہ صرف لطف اندوز ہوتے ہوئے قہقہہ لگایا بلکہ عقیل کے ساتھ اگلی سیٹ پر براجمان اجالا کو بھی مخاطب کیا۔ اس کے مخاطب کرنے پر عالم شاہ کو پہلی بار وہاں اجالا کی موجودگی کا علم ہوا۔ وہ اور فیصل ابھی تک گاڑی کے باہر ہی کھڑے باتیں کر رہے تھے اور اس نے توجہ نہیں دی تھی کہ اندر کون کون بیٹھا ہوا ہے۔

''پاکستان کے ایک گوشے سے نکل کر آنے والے کو کیا معلوم کہ فیشن کس چڑیا کا نام ہے ورنہ ان کی تو شوبز سیلیبر ٹیز بھی انڈین فیشن کو فالو کرتی ہیں اور انہیں دیکھ کر وہ محاورہ یاد آجاتا ہے..... کیا تھا وہ.....؟'' اس نے ایک ادا سے شہادت کی انگلی سے اپنی کنپٹی کو بجایا اور چہک کر بولی۔

''ہاں، وہ تھا نا..... کوا چلا ہنس کی چال، اپنی بھی بھول گیا۔ تو جو کوّے ہیں ان کو کوّے ہی یاد آئیں گے نا۔'' وہ بولنے پر آئی تو بولتی چلی گئی۔ اس کے ان الفاظ پر عالم شاہ کا چہرہ سرخ پڑ گیا لیکن اس نے اپنے ضبط کو کھونے نہیں دیا۔

''اسے کہاں چھیڑ دیا یار تم نے؟ اباجی کی یہ لاڈلی بولنے پر آئے تو بڑے بڑوں کے کان کترتی ہے۔'' ڈرائیونگ سیٹ پر موجود عقیل میں بہن کو سرزنش کر کے ماحول کو بدمزہ کرنے کی ہمت تو شاید نہیں تھی اس لیے فیصل ہی کو ہلکے پھلکے انداز میں ٹوکا اور پھر فوراً ہی موضوع بدلتے ہوئے بولا۔

''چلو اب بیٹھ جاؤ گاڑی میں۔ ہم پہلے ہی کافی لیٹ ہو چکے ہیں۔'' اس کے ٹوکنے پر وہ دونوں گاڑیوں میں بیٹھ گئے۔ تقریباً آدھے گھنٹے کا سفر تھا۔ اس آدھے گھنٹے میں وہ بظاہر فیصل سے گفتگو میں مصروف رہا لیکن نگاہ بار بار اگلی نشست پر بیٹھی اجالا کی طرف جاتی رہی۔ زندگی میں پہلی بار اسے حسن کی طاقت کا اندازہ ہو رہا تھا۔ نخوت، بے باکی اور بدلحاظی اجالا کے کردار کے وہ پہلو تھے جن کی وجہ سے وہ کبھی اسے پسند نہیں کر سکتا تھا لیکن پھر بھی آج جانے کیا ہوا تھا کہ وہ خود کو اس کی طرف متوجہ ہونے سے روک نہیں پایا تھا۔

دلہن والوں کے ہاں پہنچ کر بھی اس کی کچھ یہی کیفیت رہی۔ پاکستان سے آئے ہوئے مہمان ہونے کی وجہ سے اسے یہاں خصوصی حیثیت دی جا رہی تھی اور چاچا سائیں اور سارے کزنز اپنی اپنی جان پہچان کے لوگوں سے اس کا تعارف کروا رہے تھے لیکن ملنے ملانے کے اس سلسلے میں بھی اس کی نگاہیں بھٹک بھٹک کر اجالا کی طرف جا رہی تھیں۔ وہ تو آج شعلہ جوالہ بنی ہوئی تھی اور شاید تقریب میں موجود صنفِ مخالف پر اپنے حسن کی بجلیاں گرا رہی تھی۔ دلہن والوں کے ہاں کا ماحول بھی کھلا ڈلا تھا اور مہندی کی اس مخلوط محفل میں مرد و زن بنا کسی تخصیص کے ایک دوسرے کے ساتھ گھل مل گئے تھے۔ اس ماحول میں عقل جیسے لوگوں کا گزارہ نہیں تھا۔ وہ دیکھ چکا تھا کہ عقل اپنی چادر کے پلو میں چہرہ چھپائے کچھ عمر رسیدہ خواتین کے ساتھ ایک طرف پڑے ہوئے صوفوں میں سے ایک صوفے پر بیٹھی ہوئی ہے۔ یقینی طور پر وہ اس ماحول کو انجوائے نہیں کر رہی تھی جبکہ وہ خود مرد ہونے کی رعایت کے ساتھ آرام سے ایڈجسٹ کر گیا تھا۔

زرد اور سبز امتزاج کے لباس میں پھولوں سے سجی دلہن نے محفل میں قدم رکھا تو گویا بھونچال ہی آ گیا۔ آتش بازی، تیز میوزک، تالیاں، سیٹیاں..... عجیب ایک ہلڑ بازی تھی جس سے دلہن کا استقبال کیا گیا۔ دلہن بھی کوئی روایتی دلہن نہیں تھی جو شرما لجا کر ایک کونے میں بیٹھ جاتی۔ وہ سب کے ساتھ شامل ہو گئی اور فیصل کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے اس بے تکے رقص میں شامل ہو گئی جو تیز میوزک پر ہر شخص اپنی اپنی بساط کے مطابق کر رہا تھا۔

''آؤ یار.....!'' کسی نے عالم شاہ کو بھی ہاتھ پکڑ کر رقص کرنے والوں کے درمیان کھینچ لیا۔ اسے رقص کا سلیقہ نہیں تھا چنانچہ اپنے ہی جیسے چند اناڑیوں کی طرح الٹے سیدھے ہاتھ پیر مارنے لگا۔ رقص کرتے ہوئے بھی اس کی نظریں بار بار اجالا کی طرف جا رہی تھیں۔ وہ بڑی مہارت کا

www.pklibrary.com

مظاہرہ کررہی تھی اور اس کے لچکدار جسم کی ہر حرکت میں دیکھنے والوں کو اپنی طرف کھینچ لینے کی تاثیر تھی۔ عالم شاہ کو اس کا اس بے باکی سے رقص کرنا اچھا نہیں لگ رہا تھا لیکن وہ اپنی نگاہ کو روک لینے پر بھی قادر نہیں تھا۔ خلاف توقع اجالا نے زیادہ دیر رقص میں حصہ نہیں لیا اور خاموشی سے پیچھے ہٹ گئی۔ عالم شاہ نے بھی سرک جانے میں عافیت سمجھی لیکن اس کی آنکھیں گویا سورج مکھی کے دو پھول تھے جن کا رخ ہر صورت اجالا ہی کی طرف تھا۔ نگاہوں کی اس بے اختیاری نے ہی اسے یہ منظر دکھایا کہ اجالا بہت خاموشی سے محفل چھوڑ کر باہر کی طرف جارہی ہے۔ کہاں؟ اس تجسس نے اسے بھی اجالا کے پیچھے جانے پر مجبور کردیا۔ وہ جو بہت خاموشی سے محفل سے سرکی تھی، اب تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے پارکنگ کی طرف جارہی تھی۔ پارکنگ میں روشنی کم تھی لیکن اجالا کے جھلملاتے آویزے اور چوڑیوں کی کھنک اس کا سراغ بہ آسانی دے رہے تھے۔ وہ محتاط بھی تھا اور اس کا سیاہ لباس بھی اس کا مددگار بنا ہوا تھا اس لیے اجالا اس کے اپنے پیچھے موجود ہونے سے قطعی لاعلم گاڑیوں کی قطاروں کے ساتھ آگے بڑھتی جارہی تھی۔ یکدم ہی اس کے جسم کو ہلکا سا جھٹکا لگا اور وہ ایک بڑی سی گاڑی کے پیچھے یوں غائب ہوئی جیسے کسی نے اچانک ہاتھ پکڑ کر اسے اپنی طرف کھینچ لیا ہو۔ عالم شاہ اضطراری طور پر بھاگ کر اس سمت جانے ہی لگا تھا کہ خیال آیا اجالا اپنی مرضی سے یہاں آئی ہے اور یقیناً کسی شناسا سے ہی ملنے آئی ہے جب ہی تو یوں کھنچے جانے پر بھی اس نے کوئی چیخ پکار نہیں کی۔ وہ کون تھا؟ یہ جاننے کا تجسس اسے دبے قدموں آگے لے گیا۔

''تم باز نہیں آتے سنیل.....! میں نے تمہیں منع بھی کیا تھا یہاں آنے سے۔'' درمیانی فاصلہ سمٹا تو اس کی سماعتوں سے اجالا کی ناز اور جذبات بھری آواز ٹکرائی۔

''تم نے یہ جو اپنی تہلکہ خیز پلس وائس ایپ کی تھیں..... انہیں دیکھنے کے بعد میں رک سکتا تھا کیا؟'' جواب میں سنائی دینے والی مردانہ آواز میں جذبات کی تپش تھی۔ اس کے بعد عالم شاہ کو بے چین کردینے والا ایک خاموش لمحہ گزرا۔

''بس کرونا..... میرا سارا میک اپ خراب ہوجائے گا۔'' خاموش لمحے کے بعد سنائی دینے والی اجالا کی آواز میں خمار سا تھا۔

''کیا کروں، تم سندر ہی اتنی لگ رہی ہو۔''

''سو تو ہے۔ وہ میرا پاکستانی کزن بھی آج مجھ پر سے نظریں نہیں ہٹا پارہا تھا۔'' وہ کھلکھلائی۔

''نہ کرو اس کی بات۔ ایک بار بچ گیا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اب کے مارا ہی جائے۔''

''اتنے بھی جیلس نہ ہو۔ چلا جائے گا بے چارہ شادی کے بعد۔''

''جاتے جاتے تمہارا ہاتھ مانگ گیا تو.....؟ تمہارے ابا جی ویسے ہی اس پر فدا ہیں۔ کہیں پچھلوں کی محبت میں ہاں ہی نہ کہہ بیٹھیں۔''

''نہیں مانگے گا ہاتھ۔ میں اس کی بہن کو جھوٹے سچے قصے سنا کر اتنا ڈرا رہی ہوں کہ وہ دوبارہ کبھی اپنے بھائی کو انڈیا کا رخ نہیں کرنے دے گی۔ وہ تو شاید اس سورما کی زخمی حالت میں واپسی کے بعد ہی اسے لے کر پاکستان لوٹ جاتی لیکن ابا جی اور بھائیوں کے اصرار کی وجہ سے شادی تک رکنے پر مان گئی۔ اب دیکھنا شادی کے بعد کیسے دونوں بہن بھائی دم دبا کر بھاگتے ہیں۔'' اجالا کے پُراعتماد لہجے میں شوخی تھی۔

''شادی کے بعد اگر وہ چار چھ دن بھی اور مجھے دکھائی دیا تو سمجھ لو کہ اس بار ایسا اسے غائب کروں گا کہ تمہاری سفارش پر بھی واپس نہیں آئے گا۔''

''شما کردو ڈارلنگ اپنے رقیب کو۔ جب میں تمہاری ہوں تو تمہیں ایسے کسی بندے کی چنتا کرنے کی کیا ضرورت ہے۔'' اجالا کی ہنسی اس کے اعصاب پر ہتھوڑا بن کر برس رہی تھی۔ اسے اپنے ساتھ گزرنے والے واقعے کا سرا مل گیا تھا کہ دیارِ غیر میں اس پر ایسا عذاب آخر کیوں نازل ہوا تھا۔

''تم بھی بس نام کی ہی میری ہو۔ تمہارا وہ اتنا لبرل پریوار شادی کے سے سارا لبرل ازم بھول جاتا ہے۔ مجھے سب خبر ہے کہ تمہارے ابا جی نے جلیل کو اس کی پسند کی ہندو لڑکی سے شادی کی اجازت نہیں دی تھی۔ بیٹی کے معاملے میں وہ کہاں راضی ہوں گے؟''

''انہیں راضی کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے جب میں تم سے کورٹ میرج پر راضی ہوں۔ بس ذرا یہ شادی نمٹنے دو پھر جس دن کہو گے آجاؤں گی۔'' اجالا کے ارادے خطرناک تھے۔

''ٹھیک ہے، تم انجوائے کرو اپنے بھائی کی شادی۔ میں بھی اس عرصے میں بہتر پلاننگ کرلوں گا۔ تمہارے کزن کے پاس سے ملنے والے مال سے شروع کا خرچہ پانی تو ہو ہی جائے گا۔ آگے کے لیے بعد میں کوئی ارینجمنٹ کرلیں گے۔'' اس بار عالم شاہ نے اس کی آواز شناخت کرلی۔

www.pklibrary.com

ائرپورٹ سے نیاز شاہ کے گھر آتے ہوئے انہیں جن ڈاکوؤں نے لوٹا تھا، یہ اس کا سربراہ تھا۔ پولیس والوں (یا جو بھی وہ تھے) کے ٹھکانے پر ہوش میں آجانے پر بھی اس نے یہی آواز سنی تھی اور اب اس پر انکشاف ہو رہا تھا کہ یہ شخص اجالا کا عاشق تھا۔ اس کا دل چاہا کہ درمیانی فاصلہ طے کر کے ان دونوں تک جا پہنچے اور اس خبیث سنیل کی گردن دبوچ لے لیکن پھر خود پر قابو پا گیا۔

''خرچے کے لیے اتنا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں کوئی خالی ہاتھ تو تمہارے پاس آؤں گی نہیں۔ تم بس میرے لیے کوئی اچھا سا گھر رینٹ پر لے کر اسے سیٹ کر دو۔ ہم کورٹ میرج کر کے پہلے ہنی مون کے لیے دبئی جائیں گے اور پھر واپس آ کر اس گھر میں مزے سے رہیں گے۔'' اسے قطعی فکر نہیں تھی کہ اس کے اس مکمل سے اس پر جان چھڑکنے والے باپ پر کیا بیتے گی۔ وہ بس اپنے سنہرے خوابوں میں جکڑی ہوئی تھی۔

''مائی سویٹ ہارٹ..... میں کتنا لکی ہوں کہ مجھے تم جیسی لڑکی پریم کرتی ہے۔'' اجالا کے جواب نے اس کے عاشق کا دل خوش کر دیا تھا اور یقیناً اب وہ اس خوشی کا عملی اظہار کرنے میں مصروف تھا۔

''بس اب مجھے جانے دو۔ زیادہ دیر گزر گئی تو مجھے کوئی بہانہ بنانا بھی مشکل ہو جائے گا۔'' تھوڑی دیر بعد اجالا کی ہانپی ہوئی سی آواز سنائی دی۔

''من تو نہیں کرتا لیکن تمہیں کشٹ میں بھی نہیں ڈال سکتا۔ جاؤ..... لیکن یاد رکھنا کہ تمہیں میرے پاس ہی آنا ہے۔'' وہ بڑی جذباتیت کا اظہار کر رہا تھا۔

''آؤں گی..... ہمیشہ ہمیشہ کے لیے آجاؤں گی۔'' اجالا نے بھی جذباتی لہجے میں یقین دہانی کروائی اور اس گاڑی کے پیچھے سے نکل آئی جہاں وہ دونوں خود کو پوشیدہ کیے ہوئے تھے۔ عالم شاہ نے خود کو مزید سمیٹ لیا کہ اجالا کی اس پر نظر نہ پڑے۔ ویسے وہ اتنی مدہوش ہو رہی تھی کہ اسے ارد گرد دیکھنے کا بھی دھیان نہیں تھا۔ مئے عشق کا جادو اس کی چال تک سے چھلک رہا تھا۔

وہ پارکنگ سے نکل گئی تو عالم شاہ نے پیش قدمی کا فیصلہ کیا، وہ کوئی جذباتی قدم اٹھا کر نیاز شاہ اور ان کے خاندان کی رسوائی کا انتظام کرنے کے بجائے بہت خاموشی سے اس بندے سے نمٹنا چاہتا تھا اسی لیے اجالا کے وہاں سے نکل جانے کا انتظار کرتا رہا تھا۔ اس احتیاط اور انتظار میں اس سے تھوڑی سی چوک ہو گئی جس کا خمیازہ اسے اپنے سر پر ٹوٹنے والی قیامت کی صورت میں بھگتنا پڑا۔

☆☆☆

وہ دونوں ایک کھٹارا سی موٹر سائیکل پر سفر کر رہے تھے اور ان کے جسموں پر دیہاتی طرز کے معمولی لباس تھے۔ انہیں دیہاتیوں کا روپ دینے کے لیے ان کے چہرے مہرے میں بھی تبدیلیاں کی گئی تھیں اور وہ سونیا اور معاذ کی حیثیت سے قطعی نہیں پہچانے جا رہے تھے۔

''یہ ادھر جھاڑیوں میں گھسا دو موٹر سائیکل۔'' پیچھے ایک بوسیدہ سا بیگ تھامے بیٹھی سونیا نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

''جو کرنا ہے کر لوں گا۔ تم تو پیچھے ہٹ کر بیٹھو۔'' معاذ نے ناگواری سے اسے جواب دیا۔ بہت کوشش سے خود کو سنبھال لینے کے باوجود وہ سونیا کے لیے اپنے دل میں پیدا ہو جانے والی ناگواری کے احساس کو نکالنے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ اس کے ساتھ کام کرنا مجبوری نہ ہوتی تو وہ کبھی اسے اپنے پیچھے موٹر سائیکل پر نہیں بٹھاتا۔

''کیوں پیچھے ہٹ کر بیٹھوں۔ گھر والی ہوں تمہاری۔ میرا تم پر حق ہے۔'' سونیا پر اس کی پھٹکار کا کوئی اثر نہیں ہوا اور شوخ لہجے میں کہتے ہوئے کچھ اور بھی اس کے قریب ہو گئی۔ اس کی اس حرکت پر جھنجلا کر معاذ نے یکدم ہی موٹر سائیکل کو جھاڑیوں میں گھسا دیا۔ وہ کانٹے دار جھاڑیاں تھیں۔ توقع کے مطابق موٹر سائیکل کے دونوں ٹائر پنکچر ہو گئے۔ سونیا بھی دو چار سریلی چیخوں کے ساتھ نیچے گر گئی۔ معاذ موٹر سائیکل ایک طرف ڈال کر تشویش سے اس کی طرف بڑھا۔ یہ دیکھ کر اس نے اطمینان کی سانس لی کہ گرنے کے باوجود سونیا نے ہاتھ میں موجود بیگ کو بہت احتیاط سے سنبھال رکھا ہے۔

''مینوں سب پتا ہے۔ تسی دوجی وڈھی لانے کے لیے پہلی کو مارنا چاہندے ہو۔'' معاذ کو اپنی طرف متوجہ دیکھ کر اس نے بلند آواز میں خالصتاً بیویوں کے انداز میں دہائی دی اور سی سی کرتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھنے کی کوشش کی۔ اس وقت معاذ نے دیکھا کہ اس کے بازو اور ایک ہتھیلی میں کئی کانٹے چبھ گئے ہیں اور کانٹوں کے چبھنے کے مقامات سے خون نکل رہا ہے۔ اسے تھوڑا سا افسوس ہوا۔ اپنی جھلاہٹ میں وہ سونیا کے ساتھ زیادتی کر گیا تھا۔

''اب ادھر ہی کھڑے کیا تک رہے ہو۔ میرے پاؤں وچ موچ آ گئی ہے۔ پاس آ کر ذرا سہارا دو۔'' اس نے اعلان کرنے والے انداز میں اپنی موچ کی خبر دی تو

www.pklibrary.com

ملک بھر میں جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز کے

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

ملنے میں اگر دشواری ہے تو مندرجہ ذیل نمبرز پر ہمارے نمائندوں سے رابطہ کیجیے۔

کراچی	03002680248	گجرات	03016215229	منڈی بہاؤالدین	03460827027
لاہور	03004009578	وزیرآباد	03456892591	سیالکوٹ	0524568440
ملتان	03006301461	لالہ موسیٰ	03216203640	میرپور AK	03460397119
حیدرآباد	03213060477	خان پور	03337472654	اٹک سٹی	057210003
سرگودھا	03447475344	کوہاٹ	03325465062	دیپالپور	03004059957
پشاور	03005930230	ساہیوال	03446804050	لیہ	03002373988
کوئٹہ	03337805247	پاک پتن	03006946782	قصبہ ڈنگہ	03083360600
فیصل آباد	03006698022	مظفرآباد	03469616224	عارف والا	03008758799
راولپنڈی	03335205014	بورےوالہ	03347193958	لورالائی	03023844266
نواب شاہ	03003223414	وہاڑی	03136844650	کوٹلہ ارب علی خان	03016299433
سکھر	03009313528	تونسہ شریف	03346712400	جلالپور پیروالا	03338303131
رحیم یار خان	03009672096	ڈیرہ غازی خان	03336481953	ہری پور	03321905703
بہاولپور	0622730455	بہاولنگر	03336320766	چکوال	03348761952
گوجرانوالہ	03316667828	بنوں شہر	03329776400	وہوا	03346383400
جہلم	03235777931	رائے ونڈ	03004719056	حافظ آباد	03006885976
سیالکوٹ	03008711949	ہڑپہ	03317400678	کوہاٹ	03325465062
جھنگ	0477626420	ڈیرہ اسماعیل خان	03349738040	ایبٹ آباد	0992335847
بھکر	03337979701	چشتیاں	03348761952	چتوکی	03454678832
منڈی بہاؤالدین	0331-7619788	منچن آباد	0301-7681279	مانسہرہ	0333-5021421
ڈسکہ	0300-9463975	سمڑیال	0333-8604306	کوٹ رادھا کشن	03004992290
حجرہ شاہ مقیم	03006969881	ٹوبہ ٹیک سنگھ	0315-6565459	قصور	0300-6575020

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی فون: 35895313

E-mail:jdpgroup@hotmail.com

www.pklibrary.com

معاذ کو بادل ناخواستہ اس کی مدد کے لیے آگے بڑھنا پڑا۔ اس نے راستے کے اطراف میں پھیلے کھیتوں میں کام کرنے والے کسانوں کو پہلے ہی دیکھ لیا تھا اور قوی امید تھی کہ ان میں سے کسی نہ کسی نے یہ "حادثہ" ہوتے ہوئے ضرور دیکھا ہوگا اور احوال پرسی کے لیے دوڑا آئے گا اس لیے ضروری تھا کہ سونیا جس ڈرامے کا آغاز کر چکی ہے، وہ خود بھی اس میں اپنا کردار ادا کرنا شروع کر دے۔

"ذرا سی گل وچ ہنگامہ نہ کیا کر۔ ذرا سی گری ہے، کوئی تیرا ہتھ منہ نئیں ٹٹ گیا جو اتنا شور مچا رہی ہے۔" اب وہ ایک شوہر تھا۔ ایسا شوہر جسے بیوی کی بڑی سے بڑی تکلیف بھی ڈراما لگتی ہے۔

"کی گل اے بھرا...... سب خیر تو ہے؟" اسی وقت کسی نے آواز لگا کر اس سے دریافت کیا تو وہ سونیا کو سہارا دینے کے بجائے آواز کی سمت متوجہ ہوگیا۔ گدلی سی دھوتی اور بنیان میں ملبوس ایک دیہاتی اس کے سامنے کھڑا تھا۔ دیہاتی کے چہرے پر خوب بڑھی ہوئی ڈاڑھی مونچھیں اور گلے میں گرہیں لگی سیاہ ڈوری موجود تھی۔

"کچھ نہیں بھرا۔ بس سالی موٹر سائیکل دھوکا دے گئی۔ ہور یہ میری گھر والی ادھر گر گئی۔ اب موٹر سائیکل اور گھر والی دونوں کا حال کھراب ہے۔" اس نے مسکین سی صورت بنا کر جواب دیا۔

"تسی مینو کوئی اناڑی ڈرائیور لگدے ہو۔ چنگے بھلے راستے وچ موٹر سائیکل ڈگمگا دی ہور وچاری بھرجائی سمیت جھاڑیوں میں جا گرے۔" اس شخص نے مضحکہ اڑانے والے انداز میں تبصرہ کیا تو معاذ نے یوں کھسیانی ہنسی چہرے پر سجالی جیسے وہ ان ریمارکس کا صحیح حقدار ہو۔

"تسی دونوں ایتھے کھڑے باتیں ای بناتے رہنا۔ اینا بھی کھیال نئی کہ وچاری نوں اٹھا ہی لیو۔" مرد کے پیچھے سے جھلک دکھاتی وہ نیلے کپڑوں والی عورت سامنے آکر تیز لہجے میں بولی تو مونچھوں کو تاؤ دیتے مرد کے چہرے کے تاثرات تیزی سے بدل گئے اور وہ معاذ سے بھی زیادہ مسکین شکل بنا کر کھڑا ہوگیا۔ اس کے چہرے کے تاثرات نے معاذ کو بتادیا کہ نیلے لباس والی وہ لحیم شحیم عورت اس کی بیوی ہے۔

"آؤ بھین۔ میرے سہارے وچ ہمت کر کے تھوڑا چلو۔ ادھر ساڈی بیل گاڑی کھڑی ہے۔ اس پر بٹھا کر میں تسی ساڈے گھر وچ لے جاؤں گی۔" معاذ اور اپنے شوہر کو ایک مشترکہ پھٹکار پلانے کے بعد وہ سونیا کی طرف متوجہ ہوگئی اور اسے سہارا دے کر اس کی جگہ سے اٹھایا۔ کھڑے ہوتے ہوئے سونیا نے کئی درد بھری سسکیاں اور کراہیں منہ سے نکالیں اور اپنا تقریباً تمام بوجھ اس عورت پر ڈال دیا لیکن بیگ کو سنبھالنا نہیں بھولی۔

"یہ مینو دے دو۔" عورت نے ہمدردی سے کہا۔

"نہیں، ایسے ہی ٹھیک ہے۔" سونیا نے بیگ کو یوں دبوچا جیسے اس میں ہیرے جواہرات بھرے ہوں۔ اس کے اس انداز پر عورت نے مزید اصرار نہیں کیا اور شوہر کو معاذ اور موٹر سائیکل سمیت گھر پہنچنے کی ہدایت کر کے سونیا کو یوں سنبھال کر آگے بڑھی کہ سونیا کا تقریباً تمام وزن اس نے اپنے مضبوط بازوؤں میں سنبھال رکھا تھا۔

"آؤ بھرا۔ اسیں ان زنانیاں نال مقابلہ نئی کر سکدے۔" سونیا اور اس عورت کی روانگی کے بعد مرد نے جھینپے ہوئے انداز میں معاذ کو مخاطب کیا۔ معاذ نے جواباً چہرے پر کھسیانی سی مسکراہٹ سجائی اور نیچے گری موٹر سائیکل کو اٹھا کر کھڑا کیا۔

"یہ تو دونوں ہی پہیے پھس ہو گئے ہیں۔" پنکچر ٹائروں کو دیکھ کر تبصرہ کیا گیا۔

"یہ تو وڈی مشکل پڑ گئی۔" معاذ نے اپنا چہرہ لٹکالیا۔

"کوئی گل نئی اے یار۔ ادھر اک بندہ ہے، وہ ٹھیک کر دے گا پر اس کا تھوڑا انتظار کرنا ہوگا۔ جب تک تسی میرے نال میرے گھر چلو۔ کوئی روٹی شوٹی کھاؤ فیر دیکھ لیں گے۔" اس نے نہایت دوستانہ انداز میں پیشکش کی جسے معاذ کو قبول کرنا ہی تھا۔ اب وہ دونوں مل کر موٹر سائیکل کو گھسیٹتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے اور ساتھ ساتھ گفتگو کا سلسلہ جاری تھا۔ معاذ نے اسے اپنا نام امرجیت سنگھ اور سونیا کا رجنی بتایا تھا اور جواب میں اسے معلوم ہوا کہ ان کے لیے اتنی کشادہ دلی کا مظاہرہ کرنے والا وہ شخص مسلمان ہے جس کا نام تو رشید ہے لیکن کہلاتا شیدا ہے۔ شیدے کی بیوی کا نام مختار بی بی تھا۔ گاؤں دیہاتوں کے عمومی رواج کے خلاف ان کا صرف ایک ہی بیٹا تھا جسے انہوں نے اسکول کے بعد آگے پڑھنے کے لیے کسی قریبی شہر بھیجا ہوا تھا۔

"پتر کو پڑھا لکھا کر وڈا افسر بنانا ہے۔" شیدے کی آنکھوں میں بھی وہی عام سے خواب تھے جو شاید سارے ماں باپ دیکھتے ہیں۔ شیدے کی زبانی اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ گاؤں میں اکثریت ہندوؤں اور سکھوں کی ہے اور مسلمانوں کے چند خاندان ہی وہاں رہتے ہیں۔ مذاہب کے فرق کے باوجود ان لوگوں کے آپس کے تعلقات برے نہیں تھے اور عام حالات میں کوئی کسی کے مذہبی معاملات

www.pklibrary.com

میں دخل نہیں دیتا تھا لیکن بعض اوقات اختلافات بھی ہوجاتے تھے جن کے نتیجے میں زیادہ تر مسلمانوں ہی کو نقصان اٹھانا پڑتا تھا۔

کچے پکے راستوں پر موٹر سائیکل کو گھسیٹتے معاذ، شیدے سے گفتگو بھی کررہا تھا اور اطراف کا جائزہ بھی لیتا جارہا تھا۔ ڈھلتی شام کا منظر وہی تھا جو چند بار پاکستان کے کسی گاؤں دیہات جانے کا موقع ملنے پر وہ دیکھتا رہا تھا۔ معمولی لباس والے بے فکرے بچے، دن بھر کی محنت کا پسینا اور تھکن ساتھ لیے گھروں کو لوٹتے مرد و زن، ہوا کا شہروں کے برخلاف ستھرا پن، کچے پکے گھر..... سب کچھ ویسا ہی تھا لیکن وہ یہ حقیقت فراموش نہیں کرسکتا تھا کہ وہ اس وقت دیس کے بجائے پردیس میں ہے، وہ بھی جبراً اور ایک ایسے مشن پر جسے اس کے دل و ذہن نے مکمل طور پر قبول نہیں کیا تھا لیکن دیس میں بیٹھے اپنے گھر والوں کے تحفظ کے لیے وہ اس مشن میں حصہ لینے پر مجبور تھا۔

''آؤ جی آؤ۔ آرام نال بیٹھو۔ پردہنے تو رب دی نعمت ہوندے ہیں ہور تسی تو مسافر وی ہو۔ مسافر دا تو ہور بھی حق ہوندا ہے۔'' ایک کچے پکے سے گھر کے سامنے موٹر سائیکل کھڑی کروا کر شیدا اسے اپنے ساتھ اندر لے گیا اور صحن میں رکھی چارپائیوں میں سے ایک اسے بیٹھنے کے لیے پیش کی۔ دوسری چارپائی پر سونیا مزے سے گاؤ تکیے کے سہارے پیر پھیلائے بیٹھی تھی۔ اس کے ایک پاؤں پر کس کر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ پٹی کی پیلی ہوتی رنگت سے اندازہ ہورہا تھا کہ پیر پر ہلدی وغیرہ کا لیپ کیا گیا ہے۔ گھر کی مالکن مختار بی بی ایک چھپر تلے بنے چھوٹے سے باورچی خانے میں مصروف تھی۔

''تسی روٹی شوٹی کھالو فیر تہاڈی موٹر سائیکل کو ڈاکٹر کو دکھانے لے چلدے ہیں۔'' معاذ کا ہاتھ منہ دھلوا کر شیدے نے اس سے کہا۔

''دیر نہ ہوجائے بھرا۔ رات میں سفر کرنا مشکل ہوجائے گا۔'' معاذ نے تشویش کا اظہار کیا۔ طے شدہ منصوبے کے مطابق اس نے شیدے کو بتایا تھا کہ وہ اور رجنی (سونیا) پیچھے ایک گاؤں میں رجنی کے بیمار چاچے کو دیکھنے آئے تھے۔ حال احوال لینے اور اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے میں انہیں تھوڑی دیر ہوگئی پھر بھی وہ اپنے میزبانوں کے اصرار کے باوجود وہاں ٹھہرنے پر راضی نہیں ہوئے۔ خیال تھا کہ رات پڑتے پڑتے اپنے گاؤں پہنچ ہی جائیں گے لیکن موٹر سائیکل کے ساتھ ہونے والے حادثے نے سارے اندازے غلط ثابت کردیے۔

''تسان نو رات وچ سفر کرنے ہی کون دے گا۔ آرام نال اتھے ہی رات گزارو۔ سویرے کسی روٹی کھا کر نکل جانا۔'' شیدے نے بڑے حق سے فیصلہ سنایا۔

''تہاڈی وڈی مہربانی بھرا پر تساں نو تکلیف نہ ہو۔'' معاذ نے ظاہری تکلف دکھایا۔

''اوئے نئی ہوتی کوئی تکلیف شکلیف..... کیوں مختاراں؟'' اس نے معاذ کو جواب دینے کے ساتھ ساتھ رسوئی سے باہر آتی مختار بی بی سے بھی تائید چاہی۔

''رب دی نعمت نو کسے تکلیف ہوندی ہے۔'' مختاراں نے جواب دیا اور سونیا کے قریب بیٹھ کر اس سے دھیمی آواز میں باتیں کرنے لگی۔ باتونی شیدا ابھی کم نہیں تھا۔ اس نے معاذ کو بتایا کہ دو گھر چھوڑ کر بڑا اچھا مکینک رہتا ہے جسے اس کی مہارت کی وجہ سے لوگ ''گڈیوں دا ڈاکٹر'' کہہ کر پکارتے ہیں لیکن وہ دن کے اوقات میں گاؤں میں نہیں ملتا تھا۔ گاؤں میں اتنی گاڑیاں ہی نہیں تھیں کہ اس کی روزی روٹی چل پاتی اس لیے اس نے شہر میں اپنی ورکشاپ کھول رکھی تھی اور روزانہ وہاں آتا جاتا تھا۔ اخلاق کا اچھا آدمی تھا اس لیے گاؤں میں کسی کی موٹر سائیکل یا دوسری کوئی سواری خراب ہونے پر اپنی تھکن کی پروا کیے بغیر ہنگامی بنیادوں پر اس کی پریشانی دور کردیتا تھا۔ شیدے نے معاذ کو تسلی دی کہ ''ڈاکٹر'' سے وہ اس کی موٹر سائیکل کا پنکچر بنوانے کے ساتھ ساتھ کوئی چھوٹی موٹی خرابی ہوئی تو وہ بھی دور کروادے گا۔ معاذ نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ پھر تیلی سی مختاراں نے جلد ہی دسترخوان چن دیا۔ دیسی گھی کے بگھار سے تیار کی گئی ماش کی دال، پنجاب کے میٹھے پانیوں کا ذائقہ سموئے اودے بینگنوں کا بھرتا بلسوڑے کا اچار اور گھر کے صحن میں ہی موجود تندور پر پکائی گئی گرم گرم روٹیوں پر مشتمل وہ سادہ سا کھانا شاید خلوص کی فراوانی کے باعث اتنا لذیذ بنا تھا کہ نہ نہ کرتے بھی ان دونوں نے اپنے میزبانوں کے ساتھ خوب سیر ہوکر کھایا۔ کھانے کے بعد شیدا اسے موٹر مکینک کلدیپ عرف ڈاکٹر کے پاس لے گیا جس نے انہیں یقین دہانی کروائی کہ ایک گھنٹے میں موٹر سائیکل بالکل ٹھیک حالت میں مل جائے گی۔ یہ ایک گھنٹا معاذ اور سونیا نے دونوں میاں بیوی کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے گزارا۔ وہ دونوں دن بھر کی مشقت سے تھکے ہوئے تھے پھر بھی ذرا احساس نہیں ہونے دیا کہ انہیں کوئی زحمت ہورہی ہے۔ موٹر سائیکل ٹھیک ہوکر آنے کے بعد ہی وہ سب سونے کے لیے لیٹے۔

www.pklibrary.com

موسم خوشگوار تھا اور گاؤں میں بجلی کی سہولت بھی موجود تھی اس لیے سونے کا انتظام اندر کمروں میں کیا گیا تھا۔ کمرے کی تنہائی میں وہ دونوں کچھ دیر چپ چاپ بستروں پر لیٹے رہے۔ بند کمرے کے اندر کی یہ تنہائی معاذ کے لیے اعصابی کشیدگی کا باعث تھی۔ سونیا اور اس کے درمیان جو کچھ ہو چکا تھا اس کے بعد وہ اس خطرناک عورت کے ساتھ ایسی کسی خلوت سے خائف رہنے لگا تھا لیکن خیر گزری کہ موقع کا فائدہ اٹھا کر سونیا نے اس کے ساتھ کوئی چھیڑ چھاڑ نہیں کی اور خاموش پڑی رہی۔

''لگتا ہے دونوں سو گئے ہیں۔'' آہستہ آہستہ آوازیں معدوم ہو گئیں تو سونیا نے سرگوشی میں کہا۔

''ہوں.....'' معاذ محض ایک ہنکارا بھر کر رہ گیا۔

''تم جائزہ لے کر آؤ۔ اتنے میں، میں دوسرے کام نمٹاتی ہوں۔'' سونیا نے اسے ہدایت کی تو وہ خاموشی سے باہر نکل گیا۔ مختار بی بی اور شیدا قطار سے بنے تین کمروں میں سے تیسرے کمرے میں سونے کے لیے لیٹے تھے۔ وہ دبے قدموں چلتا ہوا تیسرے کمرے کے دروازے تک پہنچا۔ دروازہ اندر سے بند تھا لیکن بند دروازے کے پیچھے گونجتے خراٹوں کی آواز باہر تک آ رہی تھی۔ یہ آوازیں بڑے ردھم اور ترتیب میں تھیں۔ پہلے ایک بڑا اور بھاری بھرکم خراٹا گونجتا تھا پھر دوسرا نسبتاً چھوٹا اور نیچے سروں والا خراٹا سنائی دیتا تھا۔ یعنی دونوں میاں بیوی نے مل کر خراٹوں کا یہ سرتال سجایا ہوا تھا۔

''کلیئر رپورٹ ہے؟'' وہ کمرے میں واپس پہنچا تو سونیا نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔

''دونوں گہری نیند سوئے ہوئے ہیں۔'' اس نے سونیا کی مصروفیت پر نظر ڈالتے ہوئے جواب دیا۔ اسے اس کام کے حوالے سے بہت اطمینان دلایا گیا تھا پھر بھی وہ اپنے اندر ایک بے چینی سی محسوس کر رہا تھا۔

''آدھا گھنٹا اور گزر جائے تو پھر نکلتے ہیں۔'' سونیا نے بیگ سے نکالے ہوئے سامان کی ایک پوٹلی سی بنالی تھی۔ ان کی اپنے ٹھکانے سے روانگی سے لے کر یہاں پہنچنے تک بیگ مسلسل سونیا کی تحویل میں ہی رہا تھا اور وہی جانتی تھی کہ اس بیگ میں کیا کچھ موجود ہے۔ معاذ تو صرف اتنا جانتا تھا کہ اس بیگ میں ہلاکت خیزی کا جو سامان بند ہے، اسے اس کو اپنی پوری مہارت اور صلاحیت کے ساتھ استعمال کرنا ہے۔

''اب چلنا چاہیے۔'' سست روی سے گزرتا وہ بوجھل سا آدھا گھنٹا ختم ہوا تو سونیا اٹھ کھڑی ہوئی۔ معاذ نے بھی اس کی پیروی کی۔ دونوں دبے پاؤں باہر نکلے۔ دن بھر کے تھکے ہارے مکین بے خبری کی نیند سوئے ہوئے تھے۔ صحن میں کوئی بلب روشن نہیں تھا اور ستاروں کی مدھم روشنی میں چیزیں ہیولوں کی شکل میں نظر آ رہی تھیں۔ ان ہیولوں میں ایک ہیولا موٹر سائیکل کا بھی تھا لیکن وہ اسے استعمال کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے تھے۔ احتیاط سے بیرونی دروازہ کھول کر باہر نکلنے کے بعد اسے بہ آہستگی بند کر دیا گیا اور پیدل سفر شروع ہوا۔ گاؤں کی گلیاں خاموش تھیں اور راستے نیم تاریک پڑے تھے۔ وہ دونوں ہی پہلی بار اس گاؤں میں آئے تھے لیکن پھر بھی پورے اعتماد سے آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ جی پی ایس کے ہوتے انہیں اپنی سمت کا تعین کرنے میں کوئی دشواری نہیں تھی۔ جلد ہی وہ ایک چوڑے پاٹ کی نہر کے کنارے کھڑے تھے۔

''لیٹس اسٹارٹ!'' سونیا نے کہا اور اپنے جسم پر موجود دیہاتی طرز کے لباس کو جلدی جلدی اتارنے لگی۔ نیچے اس نے تیراکی کا مختصر اور واٹر پروف سوٹ پہن رکھا تھا۔ معاذ نے بھی اس کی تقلید کی۔ دونوں نے اپنے اتارے ہوئے لباس ایک خشک جگہ پر بڑے سے پتھر کے نیچے دبا کر رکھ دیے اور سونیا نے ساتھ لائی جانے والی پوٹلی کی گرہ کھولی۔ اندر دو واٹر پروف بیگ موجود تھے۔

ایک بیگ میں سے کچھ سامان نکال کر سونیا نے اسے اپنے اور معاذ کے درمیان تقسیم کیا اور تیاری کے آخری مرحلے سے گزر کر ایک ایک بیگ اپنی اپنی پشت پر باندھ لیا۔

''کام ہو جانے کے بعد سب کچھ نہر میں بہا دینا ہے۔'' سونیا نے اسے یاد دہانی کروائی۔

''او کے!'' اس کا جواب مختصر تھا۔ ذرا دیر بعد ہی وہ دونوں نہر میں چھلانگ لگا چکے تھے اور تیرتے ہوئے اس چوڑے سے ستون کی طرف جا رہے تھے جس نے نہر پر سے گزرنے والے پل کا خاصا بوجھ اٹھا رکھا تھا۔ کسی آبی مخلوق کی طرح تیرتے ہوئے انہوں نے ستون تک کا فاصلہ بہت تیزی سے طے کر لیا۔ اس جگہ پانی خاصا گہرا تھا۔ دونوں نے پہلے اپنے سروں پر موجود ہیڈ لائٹس کو روشن کیا پھر اپنی اپنی کمر کے ساتھ بندھے رسی کے گچھوں کے سرے کھول کر ایک دوسرے کو تھمائے۔

سونیا کی کمر سے بندھی رسی کا ایک سرا معاذ نے جبکہ معاذ والی رسی کا سرا سونیا نے تھاما اور دونوں نے ایک دوسرے کے مخالف سمت میں تیرتے ہوئے ستون کے گرد ایک چکر کاٹنے کے بعد رسیوں کو گرہ دے دی۔ اب وہ پانی

www.pklibrary.com

میں خود کو آسانی سے قائم رکھ سکتے تھے اور انہیں پانی کے بہاؤ کے ساتھ بہہ جانے کا کوئی خدشہ نہیں رہا تھا۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد معاذ نے اپنی پشت پر بندھا نسبتاً بڑا بیگ اتارا اور اسے کھول کر وہ فتنہ نکالا جو اپنے اندر ایک قیامت برپا کردینے کی پوری صلاحیت رکھتا تھا۔ اچھی خاصی طاقت کے اس ٹائم بم کو ہاتھوں میں تھامے ایک بار تو اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ ہی دوڑ گئی۔ وہ جس موت کو دوسروں کا مقدر بنانے کے لیے لایا تھا، وہ اسے بھی اپنے بے رحم پنجوں میں دبوچ سکتی تھی۔

''ہری اپ معاذ!'' قریب سے سنائی دیتی سونیا کی سرگوشی نے اسے زیادہ سوچنے نہیں دیا۔ اگلے ہی لمحے وہ چوڑے ستون کے ساتھ اس ٹائم بم کو فکس کررہا تھا۔ سونیا اس کام میں اس کی بھرپور معاونت کررہی تھی۔ اس کی انگلیوں نے صبح گیارہ بجے کا وقت سیٹ کیا تو ٹک ٹک چلتی سوئی نے موت کی طرف سفر شروع کردیا۔ بم ایسے زاویے سے فکس کیا گیا تھا کہ کسی کی نظر نہ پڑ سکے۔

''گو بیگ۔'' کام ہوجانے کا اطمینان ہونے کے بعد سونیا نے کہا اور اپنے پاس موجود اپنے چہیتے خنجر سے دونوں کے جسموں کے ساتھ بندھی رسیوں کو کاٹ ڈالا۔ حسب پروگرام وہ کچھ بھی اپنے ساتھ لے کر نہیں جارہے تھے۔ سب سے پہلے ہیڈ لائٹس اتار کر پانی میں پھینکی گئیں پھر باری باری پشت پر موجود تھیلوں اور کمر سے بندھی بیلٹوں سے بھی نجات حاصل کرلی گئی۔ اب وہ پہلے ہی کی طرح مہارت سے تیرتے ہوئے کنارے کی طرف واپس پلٹے اور اس جگہ کی طرف بڑھے جہاں انہوں نے اپنے لباس پتھر تلے دبا رکھے تھے۔ ابھی معاذ اپنا لباس اٹھا کر سیدھا نہیں ہوا تھا کہ اس کے چہرے پر روشنی پڑی۔ اس نے سٹپٹا کر روشنی کے منبع کی طرف دیکھا۔ وہ ایک ٹارچ تھی جس کو تھاما ہوا شخص واضح نظر نہیں آرہا تھا البتہ اتنا اندازہ ہورہا تھا کہ وہ پینٹ شرٹ میں ملبوس، لمبی قامت کا دبلا پتلا آدمی ہے۔

''کون ہو بھائی تم؟ اس پنڈ کے تو نہیں ہو؟'' حیرت میں ڈوبی آواز بتا رہی تھی کہ وہ کوئی نوجوان لڑکا ہے۔

''میں یہاں مہمان ہوں۔ تم بتاؤ، تم کون ہو؟'' معاذ نے بہت تیزی سے خود کو سنبھال لیا تھا اور اب بھرپور اعتماد کے ساتھ پوچھ رہا تھا۔ لڑکے کے پنجابی نہ بولنے سے اسے لگا تھا کہ وہ بھی اس گاؤں کا مکین نہیں ہے۔ اب اسے لڑکے کی پشت پر موجود سفری بیگ بھی دکھائی دے رہا تھا۔

''میں یوسف ہوں، رشید آرائیں کا بیٹا۔ آخری بس سے گھر آنے کے لیے نکلا تھا۔ بیڈ لک کہ بس راستے میں ہی خراب ہوگئی۔ فالٹ بڑا تھا۔ ڈرائیور نے کہا ٹھیک ہوتے ہوتے صبح ہوجائے گی۔ میں نے سوچا بس ٹھیک ہونے کا انتظار کرنے کے بجائے پیدل چل پڑتا ہوں۔ صبح ہونے سے پہلے گھر پہنچ ہی جاؤں گا۔'' اپنی بات کے اختتام پر لڑکا دھیرے سے ہنسا لیکن اس کی یہ ہنسی ادھوری ہی رہ گئی۔ معاذ نے اس کی پشت سے ایک برق سی کوندتی دیکھی اور اگلے ہی پل اپنی ہنسی ادھوری چھوڑ کر وہ زمین پر گر چکا تھا۔

''جلدی کرو۔ اسے فوری طور پر اٹھا کر نہر میں پھینکنا ہوگا۔'' یوسف کے پیچھے سے نمودار ہونے والی سونیا نے اسے پکارا تو وہ غائب دماغی کی کیفیت میں کسی معمول کی طرح حرکت میں آگیا۔ اس نے یہ تو محسوس کرلیا تھا کہ اس پر روشنی پڑتے ہی سونیا نے خود کو نیچے گرالیا تھا اور اندھیرے میں کسی سانپ کی طرح سرک گئی تھی لیکن وہ یہ کر گزرے گی، اس کا تو اسے گمان بھی نہیں تھا۔

''دو تین بھاری پتھر اٹھا کر اس کے بیگ میں ڈال دو تاکہ لاش فوری طور پر اوپر نہ آسکے۔'' نہر کنارے پہنچ کر سونیا نے نیا حکم صادر کیا جس پر معاذ نے ایک بار پھر خاموشی سے عمل درآمد کیا۔ اس طرف سے مطمئن ہوکر سونیا نے لڑکے کے پہلو میں دھنسا اپنا خنجر زور لگا کر کھینچا۔ لاش ابھی گرم تھی۔ یوسف کا جوان خون اچھل کر اس کے بے جان جسم سے باہر آیا۔ اگلے ہی پل وہ نہر کے پانیوں میں نیچے ہی نیچے جارہا تھا۔ وہ لڑکا جو اپنے ماں باپ کی امنگوں اور امیدوں کا مرکز تھا، دل میں پیوست ہونے والے بے رحم خنجر کی دھار نے اسے اتنی تیزی سے موت سے ہمکنار کیا تھا کہ مرتے دم اسے اپنی بے جرم سزائے موت پر حیران ہونے کا موقع بھی نہیں ملا تھا۔

یوسف کی لاش کو ٹھکانے لگا کر اپنے لباس پہننے کے بعد وہ دونوں واپس لوٹے تو ان کے دونوں میزبان ابھی تک بے خبر سوئے ہوئے تھے۔ ان بے چاروں کو کیا معلوم تھا کہ انہوں نے جن دو مسافروں کو اپنی چھت تلے پناہ دی ہے، وہ ان کی دنیا ہی اجاڑ بیٹھے ہیں۔ معاذ دل پر ڈھیروں بوجھ لیے خاموشی سے کمرے کے ایک کونے میں بیٹھ گیا۔

''اتنا گلٹی فیل نہ کرو۔ جو کچھ ہوا، مجبوری کے تحت ہوا۔ بڑے مقاصد کے حصول کے لیے کبھی کبھی ایسی قربانیاں دینا پڑتی ہیں۔'' سونیا نے اس کی کیفیت سمجھتے ہوئے اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔

''کرائے کے قاتلوں کے کوئی بڑے مقاصد نہیں

www.pklibrary.com

ہوتے اور رہی قربانی کی بات، تو تم کیا جانو کہ قربانی کیا ہوتی ہے۔ دوسروں کے گھر ویران کرنے والوں کے منہ سے تو یہ لفظ سننا بھی اچھا نہیں لگتا۔'' اس کا موڈ خراب تھا۔ سونیا نے دوبارہ اسے نہیں چھیڑا۔ رات کا بقیہ حصہ دونوں نے خاموشی سے کاٹا۔ سورج کی پہلی کرن کے ساتھ باہر چہل پہل کا آغاز ہوا تو وہ دونوں بھی باہر نکل آئے۔ شیدے اور مختار بی بی نے حسب سابق فرائض میزبانی ادا کرنا شروع کر دیے۔ ان کے منہ ہاتھ دھو کر فارغ ہونے تک فضا میں دیسی گھی کے پراٹھے سینکے جانے کی خوشبو پھیلنا شروع ہو گئی تھی۔ ذرا دیر میں مختار بی بی نے دسترخوان چن دیا۔ پراٹھے، دیسی انڈوں کا آملیٹ، دہی کی میٹھی لسی..... سب کچھ دسترخوان پر سج گئے لیکن یہ خوشبوئیں بھی معاذ کو راغب کرنے میں ناکام تھیں۔ دکھ اور شرمندگی کا گہرا احساس تھا جو اسے اپنے میزبانوں کے سامنے نظریں بھی نہیں اٹھانے دے رہا تھا۔

''آجاؤ بھرا۔'' شیدے نے اسے پکارا لیکن اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''کی گل ہے سوہنیو! سویرے سے چپ چپ ہو۔ بھرجائی سے پھڈا شڈا ہو گیا ہے کیا؟'' شیدے نے بے تکلفی سے پوچھا۔

''ایسی کوئی گل نئی اے بھاجی! نئی جگہ تھی نا اس لیے رات ٹھیک سے نیند نئی آئی۔ ہور جی بھاری بھاری سا ہو رہا ہے۔'' سونیا نے صفائی دینے کے انداز میں معاذ کے رویے کی وضاحت کی۔ خود وہ ہلکی سی لنگڑاتی، دسترخوان پر آبیٹھی تھی۔ مختار بی بی کی باندھی ہوئی پٹی جو رات مشن پر جاتے ہوئے کھول دی گئی تھی، اب دوبارہ اس کے پیر پر بندھی دکھائی دے رہی تھی۔

''تہاڈا کی حال ہے بھرجائی؟'' شیدے نے اسے لنگڑاتے دیکھ کر پوچھا۔

''کل سے کم درد ہے۔'' اس نے جواب دیا اور زور شور سے دونوں میاں بیوی کا شکریہ ادا کرنے لگی کہ انہوں نے ان کی اس قدر مدد کی۔ وہ صرف دیکھنے میں خوبصورت نہیں تھی۔ خوبصورتی سے باتیں بنانے کا ہنر بھی جانتی تھی۔ ان دونوں کو اپنی باتوں میں الجھا کر اس نے انہیں معاذ سے زیادہ گفتگو کا موقع ہی نہیں دیا۔ معاذ نے ناشتے کے نام پر ان لوگوں کے بے حد اصرار پر مشکل سے لسی کے چند گھونٹ لیے تھے اور سونیا نے انہیں قائل کر لیا تھا کہ وہ واقعی اس وقت پیٹ بھر کر کھانے پینے کے لائق نہیں ہے۔ ناشتے کے فوراً بعد وہ لوگ روانگی کے لیے تیار ہو گئے۔

''موقع لگے تہ فیر آنا بھین!'' دروازے پر انہیں رخصت کرتے ہوئے مختار بی بی نے سونیا کو گلے لگاتے ہوئے بڑے خلوص سے کہا۔

''یہ ڈائن ایک بار ہی آکر تمہارا دل اجاڑ گئی ہے۔ اسے دوبارہ بلا کر کیا کرو گی۔'' معاذ نے اپنے دل میں سوچا اور موٹر سائیکل کو کک لگائی۔ وہ اس لمحے کو نہیں بھول سکتا تھا جب سونیا نے جیتے جاگتے یوسف کے پہلو میں خنجر اتار کر اس سے اس کی زندگی ہی نہیں شیدے اور مختار سے ان کے خواب بھی چھین لیے تھے۔ سونیا الوداعی الفاظ ادا کرتی اپنے بیگ سمیت اس کے پیچھے آکر بیٹھی تو اس نے تیزی سے موٹر سائیکل دوڑا دی۔ شیدے اور مختار بی بی کے سامنے مزید رکنے کا حوصلہ نہیں تھا اس میں۔

☆☆☆

''لالہ کا موڈ کیسا ہے؟''

''یہ کون بتا سکتا ہے۔'' وقاص کے سوال کا جواب شانے اچکا کر دیا گیا تو اس نے بھی جواب میں سر جھٹکا۔ بڑے دنوں بعد لالہ نے اسے اپنے روبرو طلب کیا تھا اور اسے لگ رہا تھا کہ اس بلاوے کی وجہ کاروبار سے ہٹ کر ہے اس لیے باہر موجود شخص سے سن گن لینے کی کوشش کی تھی لیکن وہ شخص واقعی ٹھیک کہہ رہا تھا کہ لالہ عیسیٰ جیسے گہرے آدمی کے موڈ کا اندازہ لگانا واقعی ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں تھی۔

''کوئی اور بھی ہے لالہ کے ساتھ؟'' لالہ کے کمرے کی طرف قدم بڑھاتے بڑھاتے وہ ایک سوال اور کر گیا۔

''گلو استاد ہے۔'' اطلاع دی گئی جو اس کے لیے حوصلہ افزا تھی۔ گلو استاد کی موجودگی کا مطلب تھا کہ کوئی کاروباری معاملہ ہی درپیش ہے۔ وہ قدرے ریلیکس ہو کر کمرے کی طرف بڑھا اور دروازے پر دستک دے کر اندر داخل ہوا۔ حسب معمول لالہ کے سامنے مے نوشی کے لوازمات سجے تھے اور وہ ایک جام تھامے چسکیاں لے رہا تھا۔ اس کے مقابل بیٹھے گلو استاد کے ہاتھ میں بھی جام تھا۔ اس نے دونوں کو سلام کیا۔

''آج کل کیا مصروفیت ہے لاڈلے؟'' گلو استاد نے اس کے ایک نشست سنبھال لینے کے بعد خوشگوار موڈ میں پوچھا۔

''کچھ خاص نہیں۔ لالہ کی طرف سے جو چھوٹا موٹا کام ملتا ہے، کر لیتا ہوں ورنہ آرام یا بھی کبھار سرکس کا چکر لگا لینے کے سوا کوئی خاص مصروفیت نہیں ہے۔'' اس نے محتاط انداز میں جواب دیتے ہوئے لالہ کی طرف کن انکھیوں سے دیکھا۔

www.pklibrary.com

وہ اس سے بے نیاز شغل مے نوشی میں مصروف تھا۔

''مصروفیت تو ہے کاکے...... ابھی پچھلے دنوں تُو نے اسپتال سے باذل کو اغوا کرنے کی کوشش کی ہے، وہ بھی دو کمزور لڑکیوں کے سہارے۔ وہ تو ان دونوں کی قسمت اچھی تھی کہ بچ نکلیں ورنہ تُو نے تو انہیں مروا دیا تھا۔'' گلو کے الفاظ نے اس کے چہرے کا رنگ اڑا دیا۔ تمام تر احتیاط کے باوجود لالہ تک خبر پہنچ گئی تھی اور اب گلو استاد کے ذریعے اس کی گوشمالی کروائی جا رہی تھی۔

''اپن مانتے ہیں یار کہ تُو بڑا اسمارٹ ہے۔ اپنے ایسے بہت سے کام ہیں جو تو چٹکی بجاتے میں کر ڈالتا ہے لیکن لالہ نے تجھے ان لوگوں سے دور رہنے کا بولا تھا تو اس کا کوئی ریزن تھا نا یار! تجھے لالہ کی بات سمجھنے کی تھی۔'' گلو بڑے نرم لہجے میں اس سے مخاطب تھا لیکن پھر بھی وہ اپنی پیشانی سے پسینا پھوٹتا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ اس کے لیے یہ احساس ہی کافی تھا کہ لالہ اس کی حرکت سے نالاں ہے، وہ بھی اس حد تک کہ خود بات کرنے کے بجائے گلو کو یہ ذمے داری سونپی ہے۔

''آئی ایم سوری! میں لالہ کی نافرمانی نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن میں اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہوں۔'' اس نے جھکی نظروں کے ساتھ جواب دیا۔

''کیا مطلب......؟ کیا تیرا اس لڑکی بشریٰ گلزار سے کوئی معاملہ چل رہا ہے؟'' گلو استاد چونکا۔

''ایسا کچھ نہیں ہے استاد!'' وکی سٹپٹایا۔ ''وہ مظلوم لڑکی ہے اور میں صرف اس کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔ باذل کے ہاتھوں اس بے چاری کا بہت نقصان ہوا ہے۔'' ساتھ ہی وضاحت دی۔

''باذل، عرفان اللہ اور یزدانی کا پٹھو ہے اور اس کے ہاتھوں ورجنوں لوگوں پر ظلم ہوا ہے تو کیا خدائی فوجدار بن کر ان سارے لوگوں پر ہونے والے ظلم کا حساب لینا چاہتا ہے؟'' گلو نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔

''ایسا تو نہیں ہے۔ بس میں صرف اس لڑکی کا ساتھ دے رہا ہوں۔'' اس نے اپنے ہونٹ کاٹے۔

''بشریٰ گلزار سے پہلے تو اس لڑکے معاذ کا بھی ساتھ دیتا رہا تھا۔ تو نے نہ صرف اسے یزدانی کی قید سے چھڑوایا تھا بلکہ اسے کئی روز تک اپنے پاس پناہ دینے کے ساتھ ساتھ اس کا علاج معالجہ بھی کرواتا رہا تھا۔ بعد میں معاذ تجھے چھوڑ کر چلا گیا تھا تو بھی تو یزدانی اور عرفان اللہ کے آس پاس اس کی ٹوہ لگانے کی کوشش کرتا رہا تھا۔'' وہاں ساری خبریں تھیں۔ وکی کسی بات کی تردید نہیں کر سکتا تھا۔

''تیرا ان لوگوں سے کیا تعلق ہے، ابھی اپنے کو یہ سمجھنے کا ہے۔ تعلق سمجھ آجائے گا تو باقی سب بھی سمجھ میں آجائے گا۔'' گلو استاد نے اس سے سب سے نازک سوال کیا۔ وکی جانتا تھا کہ گل نواز عرف گلو استاد پڑھا لکھا بندہ ہے جو حادثاتی طور پر جرم کی دنیا میں آنے کے بعد یہاں کا لب ولہجہ اپنا بیٹھا ہے لیکن اس کی ذہانت اپنی جگہ قائم ودائم ہے۔

''کچھ خاص وجہ نہیں ہے۔ معاذ بھائی سے بس اتفاقاً ہی ملاقات ہوگئی تھی پھر ان کے حالات نے ان سے ہمدردی کرنے پر مجبور کر دیا۔ بشریٰ گلزار بھی ان ہی کی ساتھی نکلی تو میں اس کا بھی ساتھ دیتا چلا گیا۔''

''بات اتنی سادہ نہیں ہوسکتی شہزادے! ابھی تُو نے خود اعتراف کیا تھا کہ تو اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہے۔'' گلو ایسے بہلنے والا نہیں تھا۔ وکی خود کو عجیب بے بس سا محسوس کرنے لگا۔

''اگر ہم پر اعتبار نہیں ہے تو، تُو ہمارا ساتھ چھوڑ کر جا سکتا ہے۔'' خاموشی کے اس چھوٹے سے لمحے پر لالہ عیسیٰ کی آواز نے ضرب لگائی۔ وکی نے بے پناہ حیرت اور بے یقینی سے لالہ عیسیٰ کی طرف دیکھا۔

''شاک لگا ہے نا کاکے! ایسے ہی لالہ کو بھی تیرے رویّے سے شاک لگتا ہے۔ لالہ نے تجھے ہمیشہ اولاد کی طرح سینے سے لگا کر رکھا ہے لیکن اب تو ان سے باتیں چھپانے لگا ہے تو ان کو دکھ تو ہوگا۔ لالہ تیرے سامنے بیٹھے ہیں۔ آج تو ان کے سامنے اپنے دل کی ساری مجبوری کھول دے اور اگر انہیں اس لائق نہیں سمجھتا تو انہیں چھوڑ کر چلا جا۔''

''کیسی باتیں کر رہے ہو استاد!'' وقاص سن کر تڑپا۔

''لالہ کے دل کی باتیں کر رہا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ لالہ تیرے لیے کتنے پریشان ہیں۔ تو نہیں جانتا کہ تو ان سے چھپ چھپ کر جن لوگوں کے چکر میں پڑا ہے وہ کتنے خطرناک ہیں۔ جس لڑکی بشریٰ گلزار کے غم کا مداوا کرنے کے لیے تو باذل کو اغوا کرنے کی کوشش کر رہا تھا، جانتا ہے وہ آج کل خان ہاؤس میں رہ رہی ہے اور خان ہاؤس والے خود بڑی پہنچ والے لوگ ہیں۔ جب وہ اسے پناہ دے سکتے ہیں تو اس کے انتقام میں ساتھ کیوں نہیں دے سکتے۔ تو ان باتوں کو سوچ ورنہ وہ بات بتا جس نے تیری عقل ماری ہے۔'' گلو کا انداز دوٹوک تھا۔ وکی نے اپنا سر جھکا لیا۔

''لالہ سے زیادہ دنیا میں کوئی تیرا بھلا نہیں سوچ سکتا۔ جو بھی تیرے دل میں ہے، لالہ کو بول دے اور پھر دیکھ لالہ تیرے لیے کیا کرتے ہیں۔'' گلو نے ہمدردانہ لہجے

www.pklibrary.com

میں اسے مشورہ دیا اور دھیرے سے اس کا شانہ تھپک کر باہر نکل گیا۔ اس کے باہر جانے کے بعد بھی وقاص کچھ دیر تک ویسے ہی سر جھکائے بیٹھا رہا۔ لالہ نے بھی ایک لفظ کہے بغیر اپنا شغل جاری رکھا لیکن اس کی گہری اور پُرسوچ نظریں وقاص پر ٹکی ہوئی تھیں۔ کچھ دیر کے تذبذب کے بعد بالآخر وکی نے اپنی خاموشی توڑ دی اور کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔

''وہ ایک لڑکی ہے۔ چھوٹی سی، نازک سی۔ بہت زیادہ خوبصورت نہیں لیکن میرے دل کو اچھی لگتی ہے۔ اتنی اچھی کہ میں اس سے ملے بغیر، اس سے کوئی بات کیے بغیر بھی بس اسے خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔ مجھے اس کی آنکھوں میں آنسو اچھے نہیں لگتے۔ لیکن اس کے حالات اسے مسلسل رلاتے رہتے ہیں۔'' وہ آہستہ آہستہ لالہ کو سب بتاتا گیا کہ کب، کیسے اسے معاذ کی چھوٹی بہن علینہ اچھی لگی اور اس کی خاطر وہ معاذ اور پھر بعد میں بشریٰ کا ساتھ دیتا چلا گیا۔ لالہ عیسیٰ نے اس کی پوری بات نہایت توجہ سے سنی۔ وہ اپنی کہہ کر خاموش ہو گیا تو بھی لالہ کچھ دیر خاموش بیٹھا سوچوں میں مستغرق رہا۔ وقاص نہیں جانتا تھا کہ لالہ کیا سوچ رہا ہے لیکن ہمیشہ کی طرح لالہ سے دل کی بات کہہ کر وہ خود کو پُرسکون محسوس کر رہا تھا۔ یوں جیسے اس کا بوجھ لالہ کے شانوں پر منتقل ہو گیا ہو۔

''اس لڑکی کے باپ کے پاس تیرا رشتہ لے کر جاتے ہیں۔'' خاموشی کے ایک وقفے کے بعد لالہ نے جو کہا اسے سن کر وقاص ایسے چونکا جیسے برقی جھٹکا لگا ہو۔

''نہیں۔ نہیں لالہ..... میں اس سے شادی نہیں کرنا چاہتا۔''

''اس سے عشق کا راگ الاپتا بیٹھا ہے تو پھر شادی کیوں نہیں کرنا چاہتا؟'' لالہ نے ڈپٹنے والے انداز میں پوچھا لیکن اس کی اندر تک اتر جانے والی نگاہیں بڑی سنجیدگی سے وقاص کو ٹٹول رہی تھیں۔

''وہ عزت دار گھر کی لڑکی ہے لالہ! میں نے معاذ بھائی کے ساتھ جو وقت گزارا ہے، اس میں مجھے اندازہ ہوا ہے کہ ان کا گھرانا صرف نام نہاد عزت دار نہیں ہے، خصوصاً ان کے ہاں رزقِ حلال پر بے حد زور دیا جاتا ہے۔ ایسے میں وہ لوگ میرا رشتہ کیسے قبول کر سکتے ہیں۔ کسی دھوکے میں کر بھی لیں تو وہ میرے ساتھ گزارہ کیسے کرے گی۔'' اس نے نظریں جھکا کر جواب دیا اسے سن کر پہلے تو لالہ کے چہرے کی رنگت متغیر ہوئی لیکن پھر وہ خود کو سنبھال کر دھیرے سے مسکرایا اور بولا۔

''تو اس کو چھوڑ دینے کا آپشن کیوں اختیار کر رہا ہے۔ تجھے اس سے محبت ہے تو اس کے لیے رزقِ حلال کمانے کی جدوجہد کیوں نہیں کرتا؟''

''جی.....؟'' لالہ کی بات سن کر وہ حیران ہوا۔

''اس میں حیران ہونے کی کیا بات ہے؟ میری طرف سے تجھ پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ تو جو چاہے وہ کام کر سکتا ہے۔''

''آپ مجھ سے خفا ہو گئے ہیں لالہ.....؟'' وہ پریشان ہوا۔

''بالکل نہیں۔ میں بالکل کھلے دل سے تجھے آفر کر رہا ہوں اور یہ نہ سمجھ کہ تیرے ساتھ چھوڑ کر چلے جانے کے بعد میں تیرے سر پر سے اپنا ہاتھ اٹھالوں گا۔ میں تجھے بھی سپورٹ کروں گا اور اس لڑکی اور اس کے گھر والوں کو بھی کیونکہ مجھے اندازہ ہو گیا ہے کہ وہ لڑکا معاذ کسی بہت بڑے چکر میں پھنس گیا ہے اور اس کے گھر والے بھی اس کی وجہ سے مصیبت میں پھنسے ہوئے ہیں۔ بعض مصیبتیں ایسی ہوتی ہیں جن میں ہم جیسے بُرے لوگ زیادہ اچھا سہارا ثابت ہوتے ہیں۔ میں ملوں گا اس لڑکی کے باپ سے اور بات کروں گا۔ تو اس معاملے میں اب بالکل بے فکر ہو جا۔ اب یہ معاملہ میرے ہاتھ میں ہے۔'' لالہ عیسیٰ کے الفاظ نے وقاص پر شادیِ مرگ کی سی کیفیت طاری کر دی۔ اس نے لالہ کی اس مہربانی کے جواب میں کچھ کہنا چاہا لیکن جذبات کی شدت کے باعث ہونٹ پھڑک کر رہ گئے اور وہ منہ سے ایک لفظ ادا نہ کر سکا۔

''جا، اب جا کر آرام سے لائف انجوائے کر۔ میں اس معاملے کو خود سنبھال لوں گا۔'' لالہ نے اس کی جذباتی کیفیت کو محسوس کیا لیکن اس حوالے سے اسے مزید چھیڑنے کے بجائے اپنی کہنہ کربے نیازی سے نیا جام تیار کرنے لگا۔ لالہ کی طرف سے چلے جانے کا حکم ملنے کے بعد وقاص میں ہمت نہیں تھی کہ وہاں مزید رکتا چنانچہ اپنی جذباتی کیفیت کو قابو میں کرتا ہوا باہر جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

''کاش! میں تجھے بتا سکتا کہ تو مجھے کتنا عزیز ہے۔'' لالہ نے اس کی پشت کو گھورتے ہوئے غمزدہ سے انداز میں سوچا اور پھر سر جھٹک کر جام ہونٹوں سے لگا لیا۔

☆☆☆

عالم شاہ کی آنکھ ٹھنڈک کے احساس سے کھلی تھی۔ یہ ٹھنڈک اس یخ پانی کی تھی جو اسے ہوش میں لانے کے لیے اس کے سر اور چہرے پر انڈیلا گیا تھا۔ آنکھ کھلتے ہی روشنی سے واسطہ پڑنے پر اس نے فطری ردعمل کے طور پر دوبارہ

www.pklibrary.com

پپوٹوں کو بند کرلیا۔

''اٹھ جا او ڈشکرے! ادھر تیری سیوا کے لیے رات بھر رکے رہنے کا سمے نہیں ہے میرے پاس۔'' جانی پہچانی آواز سماعتوں سے ٹکرائی تو اس نے ایک بار پھر آنکھوں کو کھولا اور آواز کی سمت دیکھا۔ اس کے سامنے تقریباً اسی کا ہم عمر ایک اسمارٹ سا جوان کھڑا ہوا تھا۔ کھلتی ہوئی رنگت والے اس دراز قد جوان نے جینز کی پینٹ کے ساتھ آدھی آستینوں کی سیاہ ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ آستین سے جھانکتے اس کے مضبوط بازوؤں پر ٹیٹوز بنے ہوئے تھے جبکہ ہیئر اسٹائل کسی فلمی ہیرو جیسا خوبصورت تھا۔

''ایسے ٹکر ٹکر کیا دیکھ رہا ہے۔ رقیب ہوں تیرا اور میرے ہوتے ہوئے وہ تجھے چٹکی بھر گھاس بھی نہیں ڈالنے والی۔'' وہ تعارف نہ بھی کرواتا تو عالم شاہ اسے اس کی آواز کے ذریعے شناخت کر چکا تھا۔

''وہ کیا ہے نا کہ بھگوان نے اپنے کو پرسنالٹی ہی کچھ ایسی دی ہے کہ جو لڑکی دیکھتی ہے، سالی مرمٹتی ہے۔ پر ان مرمٹنے والیوں میں اجالا نیاز شاہ جیسی کوئی کوئی ہی ہوتی ہے۔ اس لیے میں نے سوچا کہ اسے ہاتھ سے نہ جانے دوں۔ سالی نند بھی ہے اور روپے پیسے والی بھی۔ آدمی کیسا ہی راجا اندر ہو، کسی نہ کسی کے ساتھ پھیرے لگوا ہی لیتا ہے تو اچھا ہے اس لڑکی کے ساتھ لگوائے جو آپ کا لائف اسٹائل بدل دے۔ میں بھی یہی کرنے جارہا تھا کہ تم بیچ میں اجالا کے امیدوار بن کر کود پڑے۔ ٹھیک ہے یہ تمہارے انجانے کی غلطی (غلطی) تھی اس لیے میں نے اپنے طریقے سے تمہیں واپس پلٹنے کا چانس دیا لیکن تم ایسے کھالی (خالی) کھوپڑی کے بندے نکلے کہ چپ چاپ واپس لوٹ جانے کے بجائے اجالا کی جاسوسی کرتے ہوئے اس کے پیچھے پارکنگ تک پہنچ گئے۔ آئی ایم شیور کہ تم نے وہاں ہماری کھاسی (خاصی) باتیں بھی سن لی تھیں اس لیے جب وشنا نے تمہیں پکڑا تو میں نے سوچا کہ تمہارے واپس جانے میں میرے فیوچر کو بہت کھترہ (خطرہ) ہے اس لیے میں اور وشنا تمہیں یہاں لے کر آگئے۔'' وہ عالم شاہ کو کوئی سوال کرنے کا موقع دیے بغیر خود ہی اسے ساری تفصیل بتاتا چلا گیا۔

''یہ وشنا کون ہے؟'' وہ خاموش ہوا تو عالم شاہ کے منہ سے سوال پھسلا۔

''وہی جس نے تمہیں اور تمہارے ساتھی کو الٹا لٹکا کر تم دونوں کی کھوب (خوب) کھاتر (خاطر) کی تھی۔ اس نے شاید اجالا کے گھر میں اپنا کوئی جعلی نام بتایا تھا لیکن بس

قارئینِ بیرون ملک متوجہ ہوں!

محکمہ ڈاک نے دوسری مرتبہ بیرون ملک ڈاک خرچ پر تقریباً 200 سے 250 فیصد اضافہ کردیا ہے جس کی وجہ سے ہم بحالت مجبوری بیرون ملک ڈاک خرچ میں اضافہ کررہے ہیں۔

جو کہ اس ماہ نومبر 2020 سے لاگو ہوگا جس کی تفصیل تمام رسائل میں فراہم کردی گئی ہے۔

سرکولیشن منیجر
جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

www.pklibrary.com

نام ہی جعلی تھا، پولیس والا پکا اصلی تھا۔ اس کی مار کھا کر پتا تو لگ گیا ہوگا تمہیں؟'' اس کے چہرے پر ایک لطف اٹھانے والی مسکراہٹ پھیلی۔

''مطلب، وہ بھی تمہارے جیسا کوئی چیٹر بندہ ہے۔ تم اجالا کی معصومیت کا فائدہ اٹھا کر اسے محبت کا دھوکا دے رہے ہو اور وہ سرکاری وردی پہن کر غیر سرکاری کام کرتا پھر رہا ہے۔'' عالم شاہ کو اس سے اس گفت و شنید کی کوئی خواہش نہیں تھی لیکن ٹائم حاصل کرنے کے لیے گفتگو کا سلسلہ جاری رکھنا بھی ضروری تھا۔ بے ہوشی کی حالت میں اس کے ہاتھ پیروں کو رسیوں سے باندھ دیا گیا تھا اور وہ کوشش کر رہا تھا کہ کسی طرح ان بندشوں سے خود کو آزاد کروالے۔ پہلی بار کے برخلاف سنیل کا یوں کھل کر سامنے آجانا اور اطمینان سے سارے اعترافات کر لینا اسے شدید خطرے کا احساس دلا رہا تھا۔ سنیل کی اتنی بے خوفی اور بے پروائی کا مطلب تھا کہ اسے اس سے کوئی خطرہ نہیں محسوس ہو رہا۔ کیوں.....؟ یہ سوال اہم تھا اور اس سوال کا ایک ہی جواب تھا کہ سنیل کو یہ خطرہ نہیں رہا ہے کہ وہ واپس جا کر کسی کو اس کے اور اجالا کے تعلق سمیت کوئی بات بتا سکے گا۔ یعنی اس بار اس نے اسے کبھی واپس نہ بھیجنے کے لیے اغوا کیا تھا اور یہ بالکل سادہ سی بات تھی کہ وہ اسے ہمیشہ اپنے پاس نہیں رکھ سکتا تھا۔ اس کے پاس اس سے جان چھڑانے کا آسان ترین طریقہ یہی تھا کہ اسے ہلاک کر دے اور اپنا یہ انجام بہرحال اس کے لیے قابلِ قبول نہیں تھا۔

''ویل سیڈ۔'' سنیل اس کا طنز سن کر برا ماننے کے بجائے کھلکھلا کر ہنسا پھر بولا۔

''ایسا کوئی کھاس (خاص) غیر سرکاری کام نہیں کر رہا میرا یار! تم ہمارے دشمن دیش کے شہری ہو اور وردی والے دشمنوں کو ختم (ختم) کرنے کا ہی وچن دیتے ہیں۔''

''میرے خیال میں اصل بات یہ ہے کہ تم لوگ ہو ہی گھٹیا نسل اور ایسی حرکتیں کر کے اپنے گھٹیا پن کا ثبوت دیتے ہو۔'' وہ کوشش کے باوجود اپنی بندشوں کو ڈھیلا کرنے میں خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں کر سکا تھا اس لیے جھنجلاہٹ کا شکار ہونے لگا تھا۔

''جتنا بولنا ہے بول لو۔ آج تمہارے بیک بیک کرنے کا آخری دن ہے اس لیے میں تمہیں چھوٹ دے رہا ہوں ورنہ خود سے ایسے لہجے میں بات کرنے والوں کی زبان کھینچ لیتے ہیں میں اور وشا۔''

''کیا بات ہے یار! یہ میرا نام کیوں لیا جا رہا ہے؟''

اسی وقت دروازہ کھول کر ایک سانولی رنگت کا شخص اندر داخل ہوا اور سنیل سے پوچھنے لگا۔

''بس، میں اس کو بتا رہا تھا کہ اپنا یار وشا وہ ہے جس کا نام لے کر مائیں اپنے بگڑے بچوں کو ڈراتی ہیں۔'' سنیل کے جواب دینے کے دوران عالم شاہ، وشا کا جائزہ لیتا رہا تھا اور اس کے دماغ نے اس بات کی تائید کر دی تھی کہ وشا وہی پولیس افسر تھا جو نیاز شاہ کے گھر سے اسے اور سرمد کو گرفتار کر کے لے گیا تھا۔ اس وقت یقیناً اس نے اپنی شناخت کو چھپانے کے لیے میک اپ کا سہارا لیا تھا اس لیے اس کی شخصیت قدرے مختلف نظر آ رہی تھی۔

''یہ بھی بتانا تھا کہ مائیں ایسے ہی نہیں ڈراتیں۔ وشا اس بندے کا نام ہے جس کے آگے بڑے بڑے بدمعاش کے لالوں کا موت نکل جاتا ہے۔'' اس نے اپنی مونچھیں مروڑیں۔

''صرف موت کیوں، بدن سے آتما بھی نکل جاتی ہے۔ یمراج کا رائٹ ہینڈ ہے اپنا وشا۔'' سنیل نے قہقہہ لگایا۔

''ایسے طرم خان ہو تو میرے ہاتھ پاؤں کھول کر مجھ سے مقابلہ کرو۔ چھٹی کا دودھ یاد نہ دلا دیا تو میرا نام بدل دینا۔'' عالم شاہ نے دشمن کو جوش دلا کر ہوش گنوانے کی پرانی ترکیب لڑائی۔

''کیوں اپنا فالودہ بنانے کا سوچ رہا ہے سالے! تو اپنی معشوق کا کزن ہے اس کی کھاتر (خاطر) تجھے آسان موت دینے کو سوچ رکھا ہے۔ ایک گولی کھوپڑی یا سینے میں مارو تو بندے کا آسانی سے دم نکل جاتا ہے۔ وشا سے مقابلہ کر کے مرے گا تو یہ تیری ایک ایک ہڈی توڑ کر تجھے قسطوں میں مارے گا اور یہ بڑی دردناک موت ہوگی۔ اس لیے میں تو کہتا ہوں باز آجا۔'' اس کے چیلنج کا جواب وشا کے بجائے سنیل نے دیا۔

''لگتا ہے تجھے ڈرا کر اپنے یار کی ہڈیاں ٹوٹنے سے بچانے کی کوشش کر رہے ہو۔'' عالم شاہ نے تمسخر اڑانے والے لہجے میں کہا اور وشا پر ایک حقارت بھری نظر ڈالی۔

''کھول دے اسے سنیل! میرے ہاتھوں اس کا قیمہ بننے کے بعد تجھے لاش ٹھکانے لگانے میں آسانی رہے گی۔''

''مگر یار.....!'' سنیل نے اس کے فیصلے پر اعتراض کرنا چاہا۔

''تمہارا دوست اچھا بھلا مرد ہے۔ تم اگر مگر کر کے اسے ہیجڑا بنانے کی کوشش کیوں کر رہے ہو؟'' سنیل کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی عالم شاہ نے زبان سے ایسا کاری وار کیا کہ وشا کے رخساروں کے عضلات پھڑکنے لگے۔

www.pklibrary.com

"میں نے تجھ سے کہا ہے نا سنیل کہ اسے کھول دے۔ ابھی پانچ منٹ میں اس کی چتا تیار کر دیتا ہوں۔" وشنا کے سرد انداز نے سنیل کو مزید حیل حجت نہیں کرنے دی اور وہ طوہاً و کرہاً عالم شاہ کی بندشیں کھولنے کے لیے آگے بڑھا۔

"مجھے تجھ پر ترس آرہا ہے۔ تو قسمت والا تھا جو اجالا کی سفارش کی وجہ سے ایک بار وشنا کے چنگل سے نکل کر چلا گیا تھا لیکن اب تو تیرا اتنا برا حال ہونے والا ہے کہ تیری آتما بھی کئی جنموں تک بلبلاتی رہے گی۔" بظاہر سنیل اس سے ہمدردی کا اظہار کر رہا تھا لیکن حقیقت میں اس کا انداز چسکا لینے والا تھا۔ عالم شاہ نے اس کو کوئی جواب نہیں دیا اور خاموشی سے اسے اپنی بندشیں کاٹتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اس کے ہاتھ میں چھوٹے پھل کا چاقو تھا جس سے اس نے پہلے اس کے پیروں کی بندشیں کاٹیں پھر اسے الٹا لیٹنے کا حکم دیتے ہوئے اس کے پشت کی جانب بندھے ہوئے ہاتھوں کی بندشیں کاٹنے لگا۔ عالم شاہ ہاتھ کی بندشیں کٹتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن اس کی ساری حسیات اسی طرف مبذول تھیں چنانچہ جیسے ہی اس کے آپس میں جوڑ کر باندھے گئے ہاتھوں کو ایک خفیف سا جھٹکا لگا، اس نے کسی سانپ کی سی پھرتی سے حرکت کی اور زمین کو چھوڑ کر یوں سنیل سے ٹکرایا کہ وہ لمحہ بھر کے لیے ہکا بکا ہی رہ گیا اور پھر اس کے منہ سے ایک غلیظ گالی نکلی۔ اس گالی کا جواب عالم شاہ نے اس کے جبڑے پر مکا رسید کر کے دیا لیکن خود اس کی آنکھوں کے آگے بھی تارے ناچ گئے۔ یہ وشنا تھا جس نے پوری قوت سے لات گھما کر اس کے پہلو میں ضرب لگائی تھی۔

اس کے بعد تو گویا اس کمرے میں بھونچال ہی آگیا۔ وہ دو تھے اور عالم شاہ اکیلا لیکن وہ جانتا تھا کہ یہ زندگی موت کی جنگ ہے جس میں ایک لمحے کی غفلت کا مطلب تھا ہمیشہ کی نیند سو جانا۔ وہ ان دو بپھرے ہوئے سانڈوں کی وحشت کا جواب اسی وحشت سے دے رہا تھا اور اس ذرا سی دیر کی لڑائی میں ان تینوں ہی کے حلیے بگڑ کر رہ گئے تھے۔ خصوصاً سنیل کو خاصی سخت چوٹیں لگی تھیں۔ اس کا نچلا ہونٹ پھٹ چکا تھا اور دائیں آنکھ بھی ایک لگنے والے پنچ کے نتیجے میں لہو رنگ نظر آرہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں موجود چھوٹے پھل کا چاقو عالم شاہ کے پہلے ہی حملے میں اس کے ہاتھ سے نکل گیا تھا اس لیے وہ خالی ہاتھ لڑ رہا تھا لیکن اس کے منہ سے گالیاں اس طرح ابل رہی تھیں جیسے کوئی بھری ہوئی بندوق کارتوس اگل رہی ہو۔ اس کے مقابلے میں وشنا خاموشی سے ہاتھ پیر چلا رہا تھا اور زیادہ بھرپور حملے کر رہا تھا۔ حقیقتاً عالم شاہ کو جتنی کاری ضربیں لگی تھیں، وہ وشنا ہی نے اسے لگائی تھیں۔ وہ سنیل کی طرح یونیورسٹی میں غنڈا گردی کرنے والا عام سا لونڈا نہیں بلکہ تربیت یافتہ پولیس والا تھا۔ وہ بھی یقیناً ایسا پولیس والا جو اپنی متشددانہ فطرت کے باعث خاصی شہرت رکھتا تھا۔

وشنا کی صلاحیتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے عالم شاہ کا زیادہ فوکس اسی پر تھا اسی لیے جب سنیل پیچھے ہٹا تو اس نے زیادہ دھیان نہیں دیا۔ اس کی اس بے دھیانی کا سنیل نے فائدہ اٹھایا اور گر کر کمرے کے ایک کونے میں چلا جانے والا اپنا چاقو اٹھا لایا۔ وشنا کے ایک وار کا جواب دیتے عالم شاہ کا رخ ایسا ہو گیا تھا کہ سنیل کی طرف اس کی پشت ہو گئی تھی۔ سنیل نے موقع کا فائدہ اٹھایا اور چاقو پوری قوت سے اس کی پشت میں گھونپنے کی کوشش کی۔ اس نازک لمحے میں عالم شاہ کی خوش نصیبی نے ساتھ دیا۔ وشنا سے برسرپیکار اس کا رخ عین وقت پر ذرا سا بدلا اور سنیل کا چلایا ہوا چاقو اس کی پشت کے بجائے بازو میں اتر گیا۔ عالم شاہ کے حلق سے بے ساختہ ہی ایک کراہ نکلی جبکہ وشنا نے حلق کے بل دھاڑتے ہوئے اس کے بازو میں گھپے چاقو پر ہاتھ ڈال دیا۔ اس کے حرکت میں آنے، چاقو بازو سے نکالنے اور اس چاقو سے دوبارہ عالم شاہ پر حملہ کرنے میں اتنی پھرتی اور مستعدی تھی کہ عالم شاہ کو بالکل آخری لمحے میں اپنے آپ کو نیچے گرا لینے کے سوا کوئی حل سجھائی نہیں دیا۔ نیچے گر کر دوبارہ سنبھلنے کے مختصر دورانیے میں اس نے ایک تیز خرخراہٹ سنی۔ ایسی خرخراہٹ جیسے کسی جانور کو ذبح کرتے وقت سنائی دیتی ہے۔ اگلے ہی لمحے سنیل کسی ذبح کیے جانے والے جانور ہی کی طرح زمین پر گرا بری طرح تڑپ رہا تھا۔

عالم شاہ نے ایک نظر زمین پر تڑپتے سنیل اور دوسری وشنا پر ڈالی۔ وشنا، عالم شاہ پر کیے گئے وار کی زد میں اس کے بجائے سنیل کے آجانے کی وجہ سے سکتہ زدہ سا رہ گیا تھا۔ عالم شاہ نے اس کی اس کیفیت کا فائدہ اٹھایا اور اس کی کنپٹی پر پوری قوت سے ایک جچا تلا مکا رسید کر دیا۔ سخت جان ہونے کے باوجود وشنا اس مکے کو نہیں جھیل سکا اور تیورا کر نیچے گرا۔ اس کی بے ہوشی کو یقینی بنانے کے لیے عالم شاہ نے اس کے سر پر پاؤں سے ٹھوکر لگائی اور ایک بار پھر سنیل کی طرف دیکھا۔ اس کے جسم کو ہلکے ہلکے جھٹکے لگ رہے تھے اور یہ بات واضح تھی کہ وہ اپنی بچی کھچی آخری سانسیں پوری کر رہا ہے۔ اسے اس کے حال پر چھوڑ کر عالم شاہ کمرے سے باہر جانے والے راستے کی طرف بڑھا۔ اتنے ہنگامے

www.pklibrary.com

کے باوجود ابھی تک کسی نے مداخلت نہیں کی تھی اور ایسا لگ رہا تھا کہ وہاں کوئی اور ذی نفس موجود نہیں ہے۔ عالم شاہ محتاط قدموں سے چلتا ہوا اندازے سے اخراجی راستے کی طرف بڑھنے لگا۔ اس کا ایک ہاتھ اپنے زخمی بازو پر جما ہوا تھا۔ چاقو چھوٹے پھل کا تھا لیکن دھار خاصی تیز تھی اس لیے ٹھیک ٹھاک زخم آیا تھا اور زخم سے مسلسل خون بہہ رہا تھا۔ خون کے اس بہاؤ کو روکنے کے لیے ہی اس نے زخمی بازو کو مضبوطی سے تھاما ہوا تھا اور جلد از جلد یہاں سے نکل جانے کی فکر میں تھا۔ ابھی وہ بیرونی دروازے سے چند فٹ کے فاصلے پر تھا کہ دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا اور ایک شخص تیزی سے اندر داخل ہوا۔ روشنی کم تھی لیکن عالم شاہ نے فوراً ہی آنے والے کو پہچان لیا اور اس کے مختصر دورانیے کے لیے تن جانے والے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔

''سائیں!'' آنے والا اسے شناخت نہ کرتا، یہ کیسے ممکن تھا۔

''آپ ٹھیک تو ہیں سائیں!'' وہ بے تابی سے اس کی طرف بڑھا۔

''میں زخمی ہوں سرمد..... لیکن تم..... تم یہاں کیسے پہنچے؟'' اس نے حیرت کا اظہار کیا۔

''آپ کا تو بہت خون بہہ رہا ہے سائیں!'' روشنی کی کمی اور عالم شاہ کے سیاہ لباس کی وجہ سے سرمد پہلی نظر میں اس کا بہتا ہوا خون نہیں دیکھ سکا تھا لیکن اب قریب سے دیکھا تو تشویش میں مبتلا ہو گیا اور اپنی جیب سے بڑا سا رومال نکال کر اس کے زخمی بازو پر باندھتے ہوئے بتانے لگا۔

''میں ایک ملازم کے ساتھ شکیل سائیں کی گاڑی سے کچھ سامان نکالنے پارکنگ کی طرف گیا تھا کہ وہاں سے نکلتی ایک گاڑی کی پچھلی سیٹ پر آپ کو بند آنکھوں کے ساتھ بیٹھا دیکھا۔ مجھے فوراً ہی اندازہ ہو گیا کہ آپ بے ہوش ہیں۔ میں نے کچھ بھی سوچے سمجھے بغیر ایک موٹر سائیکل جھپٹی اور اس گاڑی کے پیچھے دوڑا دی۔ گاڑی دور نکل گئی تھی پھر بھی میں اسے پانے میں کامیاب ہو گیا لیکن بدقسمتی سے اس علاقے میں داخل ہوتے وقت موٹر سائیکل کا ٹائر پنکچر ہو گیا اور آخری لمحوں میں، میں تعاقب جاری نہ رکھ سکا جس کی وجہ سے مجھے اس بات کا اندازہ نہیں ہو سکا کہ آپ کو کس بنگلے میں لے جایا گیا ہے۔ میں کافی دیر سے پورے علاقے میں چکر لگاتا اس گاڑی کو ڈھونڈنے میں لگا ہوا تھا جس میں آپ کو لایا گیا تھا۔ اس بنگلے میں جھانکنے پر گاڑی دکھائی دی لیکن بنگلے کا چوکیدار راہ میں آ گیا۔ اس سے نمٹ کر اندر آ رہا تھا کہ آپ سے سامنا ہو گیا۔''

''ہمیں یہاں سے جلد از جلد نکلنا ہو گا سرمد! اندر ایک لاش پڑی ہے اور ساتھ ہی ایک پولیس والا بھی بے ہوش پڑا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ یہاں رک کر ہم کسی مزید بڑی مصیبت میں پھنس جائیں۔'' سرمد کے بازو پر رومال باندھ دینے سے خون کا بہاؤ تقریباً رک گیا تھا۔ اس طرف سے مطمئن ہو کر اس نے سرمد کو کسی قدر حالات سے آگاہ کیا۔

''کس کی لاش سائیں! یہاں آخر کیا ہوا ہے؟'' سرمد کی تشویش میں اضافہ ہوا۔

''ساری تفصیل میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا، پہلے یہاں سے نکلنے کی کرو۔''

''ہمیں سواری کی ضرورت پڑے گی۔''

''فی الحال تو ان ہی کی گاڑی استعمال کرنا پڑے گی۔ تم اندر جا کر دونوں کی جیبیں چیک کر لو۔ دونوں میں سے کسی ایک کے پاس گاڑی کی چابی ہونا چاہیے۔'' عالم شاہ اس سے کہہ کر باہر نکل گیا۔ باہر کھلے حصے میں گاڑی کھڑی تھی اور اس گاڑی کے قریب ہی ایک بندہ بے ہوش پڑا تھا۔ وہ گاڑی سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ سرمد نے باہر آنے میں اس کی توقع سے زیادہ وقت لگایا۔

''اندر والے بندے کو باندھ کر آیا ہوں۔ اس کے ساتھ بھی یہی کرتا ہوں۔'' اس نے عالم شاہ کو اطلاع دی اور چوکیدار کی مشکیں کسنے کے ساتھ ساتھ اس کے منہ میں بھی کپڑا ٹھونس دیا۔ اس مقصد کے لیے اس نے یقیناً کسی بستر کی چادر اتار کر پھاڑی تھی۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد وہ دونوں وہاں سے روانہ ہو گئے۔ ڈرائیونگ سیٹ پر سرمد تھا۔ عالم شاہ نے اسے راستے میں سارے حالات سے آگاہ کر دیا۔

''یہ بہت خطرناک سچویشن ہے سائیں۔ وشنا انتقامی کارروائی پر اتر آیا تو بہت مشکل ہو جائے گی۔ وہ سنیل کے قتل کے کیس میں ہمیں پھنسا بھی سکتا ہے۔ اس بنگلے میں فنگر پرنٹس اور خون کے نمونوں سمیت بہت سے ایسے شواہد ہیں جو ہماری وہاں موجودگی کا ثبوت ہوں گے۔ ان ثبوتوں کی مدد سے وشنا کوئی بھی کہانی بنا سکتا ہے اور ہمارا سب سے ویک پوائنٹ یہ ہے کہ ہم پاکستانی ہیں۔ بھارتی حکومت اور ادارے کسی بھی مرحلے پر ہم سے ہمدردی کا سلوک نہیں کریں گے۔'' سارے حالات سن کر سرمد مضطرب ہو گیا۔

''تمہاری بات غلط نہیں ہے لیکن میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ ہمارا نیکسٹ اسٹیپ کیا ہونا چاہیے؟'' عالم شاہ نے

www.pklibrary.com

اپنی پیشانی رگڑی۔

''ہمیں فوری طور پر پاکستان واپس جانا ہوگا لیکن ظاہر ہے اس سے پہلے یہاں کسی کو اعتماد میں لے کر تعاون حاصل کرنا ہوگا۔ اب یہ فیصلہ آپ کو کرنا ہوگا کہ اس مقصد کے لیے کسے منتخب کرتے ہیں۔'' حسبِ معمول سرمد اس کا بھرپور ساتھ دے رہا تھا۔

''چاچا سائیں سے بات کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ان کی عمر ایسی نہیں ہے کہ وہ اس قسم کے مسائل کا سامنا کریں۔'' عالم شاہ نے اردگرد دوڑتے مناظر کو دیکھتے ہوئے کہا۔ جیسے جیسے گاڑی آگے بڑھ رہی تھی شہر کی روشنیاں اور رونقیں کم ہوتی جارہی تھیں جو اس بات کی علامت تھی کہ وہ سفر کرتے ہوئے مضافات کی طرف جارہے ہیں۔ نیاز شاہ کی رہائش گاہ مضافات میں ہی تھی اور وہ اس کے سوا کہیں نہیں جاسکتے تھے۔

''شکیل سائیں کے بارے میں کیا خیال ہے۔ وہ مجھے خاصے سلجھے ہوئے اور سمجھ دار انسان معلوم ہوتے ہیں۔''

''میرے خیال میں شکیل بھائی سے بات کرنا ہی مناسب رہے گا۔'' عالم شاہ نے اس سے اتفاق کیا۔ باقی کا راستہ خاموشی سے کٹا۔ منزل پر پہنچنے سے قبل انہوں نے ایک جگہ گاڑی چھوڑ دی اور پیدل نیاز شاہ کے گھر کی طرف روانہ ہوگئے۔

''یہ کیا ہوا جناب؟'' وہ دونوں گھر کے گیٹ پر پہنچے تو گیٹ پر موجود گارڈ عالم شاہ کی حالت دیکھ کر پریشان ہوگیا۔

''ایک چھوٹا سا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے۔ میں اپنے کمرے میں جارہا ہوں۔ تم اختر کو وہاں بھیج دو..... اور ہاں دیکھو، کسی کو کچھ بتا کر پریشان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' گارڈ کو ہدایات دیتے آخر میں اس کا لہجہ سخت ہوگیا۔

''اختر سے کہنا اپنے ساتھ فرسٹ ایڈ باکس بھی لے کر آئے۔'' عالم شاہ آگے بڑھ گیا تو سرمد نے گارڈ کو یہ ضروری ہدایت دی اور خود بھی عالم شاہ کے پیچھے چل پڑا۔ وسیع و عریض گھر کی خاموشی سے ظاہر تھا کہ مہندی کی تقریب کے لیے جانے والے ابھی تک لوٹ کر نہیں آئے ہیں۔ ان کی جلد آمد متوقع بھی نہیں تھی کیونکہ یہ پہلے ہی طے ہو چکا تھا کہ فنکشن رات بھر جاری رہے گا۔

''آپ اپنی قمیص اتار دیں سائیں! فرسٹ ایڈ باکس آنے تک میں آپ کا زخم دھو کر صاف کر دیتا ہوں۔'' سرمد کو اس کے زخمی بازو کی فکر تھی۔ عالم شاہ نے بنا پس و پیش کے اس کی بات مان لی۔ چند منٹوں میں ہی ملازمین کے انچارج کی حیثیت رکھنے والا اختر فرسٹ ایڈ باکس سمیت وہاں آگیا۔ اس کے چہرے پر تشویش گھنڈی تھی۔

''شکیل بھائی کو اطلاع دو کہ میں اور سرمد گھر پہنچ چکے ہیں۔ وہ کسی بہانے سے فوری طور پر یہاں پہنچ جائیں۔'' اختر کو کسی سوال جواب کا موقع دیے بغیر اس نے اسے حکم دیا۔ اس دوران سرمد، اختر سے فرسٹ ایڈ باکس لے کر اپنا کام شروع کر چکا تھا۔

''زخم گہرا ہے سائیں! میں بینڈیج کر رہا ہوں لیکن میرے خیال میں ٹانکے لگانا پڑیں گے۔'' زخم کی ڈریسنگ کرتے ہوئے سرمد نے اپنی رائے دی۔

''بعد میں دیکھ لیں گے۔ ابھی تم ڈریسنگ کر کے مجھے کوئی پین کلر دے دو۔'' عالم شاہ نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے اسے جواب دیا۔

''شکیل صاحب کو اطلاع دے دی ہے، وہ گھر واپس آرہے ہیں۔ میرے لیے کوئی اور حکم؟'' تھوڑی دیر میں اختر نے آکر اطلاع دی۔

''بس ایک گلاس نیم گرم دودھ لادو۔'' جواب سرمد نے دیا۔ اختر کے دودھ لانے تک وہ ڈریسنگ کا کام مکمل کر چکا تھا۔ نیم گرم دودھ کے ساتھ پین کلر لے کر عالم شاہ سرمد کی درخواست پر بستر پر دراز ہوا تو اس پر غنودگی سی طاری ہوگئی۔ گفتگو کی آواز سن کر آنکھیں کھولیں تو پتا چلا شکیل آچکا ہے۔

''یہ سب کیا ہے عالم! تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ میں اتنی دیر سے کتنا پریشان ہوں۔ مجھے واسو (ملازم) نے بتایا تھا کہ سرمد اچانک ہی ایک بندے کی موٹر سائیکل چھین کر کہیں چلا گیا ہے۔ واسو نے بڑی مشکل سے اس بندے کو شور ہنگامہ کرنے سے روکا اور مجھے اطلاع دی۔ اس بندے کو تو میں نے کسی نہ کسی طرح ڈیل کر لیا لیکن سرمد کے ساتھ ساتھ تمہیں بھی غائب پا کر مجھے جتنی پریشانی ہوئی اسے میں بیان نہیں کرسکتا۔ فیصل کی سسرال میں، میں کوئی سین بھی کری ایٹ نہیں کرسکتا تھا اس لیے خود پر جبر کر کے بیٹھنا پڑا اور اب میں اختر کی کال پر بہانے سے محفل چھوڑ کر آیا ہوں۔ کیا تم مجھے بتاؤ گے کہ یہ سب کیا ہے؟'' شکیل کے چہرے پر الجھن تھی۔

''بتانے کے لیے ہی آپ کو زحمت دی ہے شکیل بھائی! لیکن میری آپ سے درخواست ہے کہ جو کچھ بھی میں

www.pklibrary.com

آپ کو بتاؤں، اسے بہت تحمل اور ٹھنڈے دل و دماغ سے سنیے گا۔'' عالم شاہ جو بستر پر اٹھ بیٹھا تھا، سنجیدگی سے بولا۔

''ٹھیک ہے، میں پورے تحمل سے تمہاری بات سنوں گا لیکن اس سے قبل تمہارے زخم کا معائنہ ضروری ہے۔ اختر کی زبانی تمہارے زخمی ہونے کی اطلاع سن کر میں فردوس کو بھی اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ فردوس کے علاوہ سجل بھی میرے ساتھ ہی آئی ہے۔ وہ وہاں ان کمفرٹیبل تھی اس لیے میں نے اسے واپس لے آنا مناسب سمجھا لیکن اسے تمہارے بارے میں کچھ علم نہیں۔''

''ابھی اسے کچھ بتایئے گا بھی نہیں۔ بہت حساس ہے، پریشان ہوجائے گی۔''

''مجھے اندازہ ہے۔ بہرحال میں فردوس کو بلواتا ہوں۔ وہ تمہارے زخم کو دیکھ لے تو پھر تفصیل سے بات کرتے ہیں۔'' شکیل کمرے سے باہر نکل گئے اور فردوس وہاں آگئی۔ زخم کا معائنہ کرکے اس نے سرمد کے اس خیال کی توثیق کردی کہ ٹانکے لگانے پڑیں گے۔ سرمد کی مدد سے اس نے تیزی اور مہارت سے یہ کام نمٹا دیا۔ شاید اسے شکیل کی طرف سے کوئی ہدایت ملی تھی جو خلافِ مزاج خاموش تھی اور زخم کے بارے میں کوئی باز پرس نہیں کی تھی۔ اس کے فارغ ہونے تک شکیل لباس تبدیل کرکے آگیا۔ فردوس اور سرمد خاموشی سے باہر نکل گئے۔ سرمد اگرچہ واقفِ حال تھا لیکن گفتگو کی نزاکت کے پیشِ نظر اس نے اس موقع پر موجود نہ رہنا ہی مناسب سمجھا تھا۔

''بات بہت نازک ہے شکیل بھائی اور یقیناً آپ کے مزاج پر گراں گزرے گی لیکن میرے پاس بھی آپ کو آگاہ کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔'' جو کچھ بتانا تھا، اسے ایک بھائی کے سامنے بیان کرنا مشکل تھا اس لیے اسے تمہید باندھنا پڑ رہی تھی۔

''تم کہو عالم! میرا وعدہ ہے کہ میں پورے تحمل سے سب سنوں گا۔'' شکیل نے اسے حوصلہ دیا۔ اس حوصلے کے سہارے اس نے اول تا آخر سب کچھ بتانا شروع کردیا۔ وہ حسبِ وعدہ تحمل سے سنتے رہے لیکن چہرے کے تاثرات سے ظاہر تھا کہ اس داستان میں اجالا کے کردار پر انہیں حیرت اور دکھ ہے۔ داستان سنیل کی موت والے حصے تک پہنچی تو ان کے چہرے پر گہری تشویش کے بادل چھا گئے۔

''سرمد کا خیال ہے کہ ان حالات میں مزید کسی پریشانی سے بچنے کے لیے ہمیں فوری طور پر پاکستان واپس چلے جانا چاہیے۔ فیصل کی شادی میں شرکت نہ کرسکنے پر مجھے بھی افسوس رہے گا لیکن میرا بھی یہی خیال ہے کہ سرمد کی رائے درست ہے۔'' سب کچھ کہنے کے بعد اس نے آخر میں انہیں اپنے فیصلے سے بھی آگاہ کردیا۔

''شاید تم ٹھیک سوچ رہے ہو لیکن اتنی جلدی بھی نہ کرو۔ میں پہلے اس سلسلے میں کسی سے مشورہ کرلیتا ہوں۔'' شکیل نے تجویز دی۔ اس موقع پر ان کی بردباری قابلِ تحسین تھی۔ انہوں نے اپنا ہر ردِعمل گویا اپنے ہی اندر روک لیا تھا اور عالم شاہ سے صرف اس کے مسئلے کے متعلق بات کررہے تھے۔

''آپ کس سے مشورہ کریں گے؟''

''ایس ایس پی صاحب اس موقع پر ہمارے کام آسکتے ہیں۔'' شکیل نے رائے دی۔ اسی وقت پُرسکون فضا میں ایک ہنگامہ سا جاگ اٹھا۔ پو پھٹنے کا وقت ہوچلا تھا اور مہندی کے فنکشن کے لیے جانے والوں کی واپسی ہوگئی تھی۔ ہنستے مسکراتے واپس آنے والوں کو اندازہ ہی نہیں تھا کہ اس گھر میں کچھ لوگ کتنے پریشان ہیں۔ عالم شاہ بے اختیار ہی کمرے کی کھڑکی میں جا کھڑا ہوا۔ خوش گپیاں کرتے ہوئے اندر داخل ہونے والے افراد میں اجالا بھی شامل تھی۔ رات بھر کی جگار نے اس کے چہرے پر تھوڑی سی تکان طاری کردی تھی لیکن حسن کا بانکپن جوں کا توں تھا۔ وہ کسی کی بات پر کھلکھلا کر ہنس رہی تھی۔

''اگر یہ جان جائے کہ اس کا محبوب سنیل اب اس دنیا میں نہیں رہا ہے تو یہ کیا کرے گی؟'' عالم شاہ کے ذہن میں سوال ابھرا۔ اس سے قبل کہ وہ اپنے سوال کا ممکنہ جواب سوچتا، موبائل کی گھنٹی نے اس کی توجہ اجالا پر سے ہٹادی۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ شکیل اپنے موبائل پر آنے والی کال ریسیو کرچکا تھا۔ کال کرنے والے نے جانے انہیں کیا اطلاع دی کہ ان کے چہرے کی رنگت متغیر ہوگئی۔ عالم شاہ نے ان کے چہرے کے تاثرات کو تشویش سے دیکھا۔

''آپ کسی طرح اسے تھوڑی دیر کے لیے روکے رکھیں ایس ایس پی صاحب! مجھے اپنے مہمانوں کو محفوظ کرنے کے لیے تھوڑی سی مہلت درکار ہے۔'' شکیل کے منہ سے ادا ہونے والے الفاظ نے گواہی دی کہ ملنے والی بری اطلاع ان ہی کے لیے تھی۔

ظلم و جبر کے سامنے سینہ سپر نوجوان
کی داستان جو غلط کاروں کے لیے
غضب ناک تھا باقی واقعات آیندہ ماہ پڑھیے

www.pklibrary.com

عفیفہ کے گمان میں بھی نہ تھا کہ ایک ایسے شخص سے جو طب کی تعلیم کے دوران کئی سال اس کا ہم جماعت بھی رہا تھا، رشتہ ٹوٹنا اس درجہ کربناک ہوگا کہ وہ نفسیاتی طور پر بالکل پارہ پارہ ہوکر رہ جائے گی۔ خود کو سمیٹنا بہت مشکل ہو رہا تھا اسے..... اور اس کی اس کیفیت سے اس کی بڑی بہن عریشہ سے زیادہ کوئی واقف نہ تھا۔ عریشہ اس کے لیے اسم بامسمّیٰ تھی..... دھوپ سے بچنے کے لیے سایہ دار جگہ.....! عریشہ اس کی بہن ہی نہیں دوست، ہمراز، غمگسار،

نقطۂ آغاز اور ... نقطۂ انجام... کے درمیان ایک طویل سفر حائل ہے۔ یہی سفر درحقیقت ہمارے انجام کو ترتیب دے رہا ہوتا ہے جبکہ کام کی اس بات کو اکثر ہم بھول جاتے ہیں... وہ بھی بھول گئی اور ایک چھوٹے سے پڑاؤ کو ہی اپنی منزل سمجھ بیٹھی... اب انسان چاہے سمجھے یا نہ سمجھے مگر قدرت کو ہر بات سمجھوانا اور منوانا خوب آتا ہے... لہٰذا وہ بھی قدرت کے اشاروں کو نہ صرف سمجھنے بلکہ ماننے پر بھی مجبور ہوگئی کیونکہ... دھوپ چھاؤں کے اس کھیل میں انسان کو اپنا سفر تو مکمل کرنا ہی ہوتا ہے۔

بابِ محبت

ناہید سلطانہ اختر

حالات کی کڑی دھوپ اور محبت کے سائے کے درمیان رسا کشی کا دلچسپ احوال

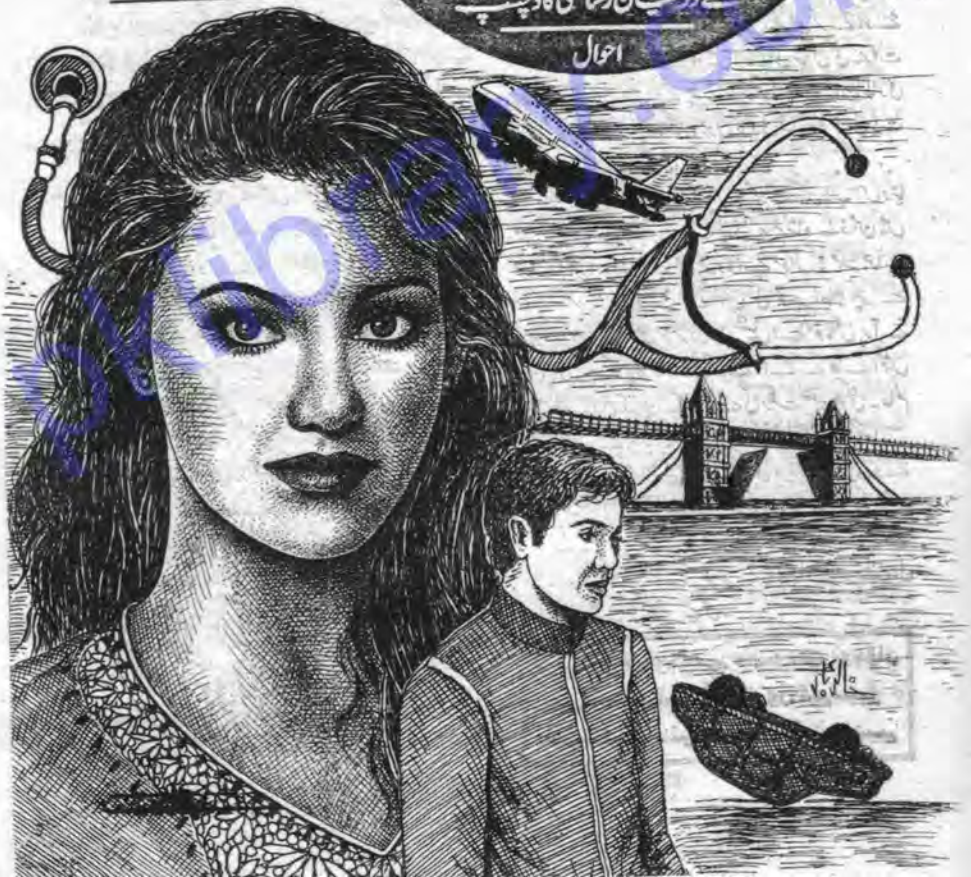

www.pklibrary.com

سبھی کچھ تھی...... اب تو ماں باپ حیات نہ رہے تھے، جب حیات تھے تب بھی عریشہ سے اس کی قربت والدین سے بھی بڑھ کر تھی۔

عریشہ اس سے سات سال بڑی تھی۔ پہلی اولاد کے بعد کئی سال دوسری اولاد کی کوئی امید نہ ہونے پر امی ابو تو عریشہ کو ہی اپنی اکلوتی اولاد مان کر بیٹھ گئے تھے مگر اللہ نے پھر امید بندھا دی۔ عریشہ کو کھیلنے کے لیے جیتی جاگتی گڑیا عفیفہ مل گئی۔ اس جیتی جاگتی گڑیا کے دم سے گھر میں گویا بہار آگئی۔

عریشہ نے بزنس ایڈمنسٹریشن میں ماسٹرز ڈگری لی تھی۔ اس کی شادی ٹیلی کام انجینئر عمران سے ہوئی تھی۔ اولاد سے محرومی کے باوجود دونوں کی اچھی نبھ رہی تھی۔ عفیفہ نے ایم بی بی ایس کیا تھا۔ شادی اس کے اپنے ایک ساتھی ڈاکٹر قائم حسین سے ہوئی تھی۔ دونوں کی لو میرج تھی۔ ایک دوسرے پر جان چھڑکتے تھے مگر چھوٹی سی بات پر ان بن ہوئی جو اتنی بڑھی کہ قائم نے عفیفہ کو طلاق دے دی۔ عفیفہ کے لیے یہ ایک صدمۂ جانکاہ تھا جس نے اسے دنوں بے اوسان رکھا۔ عریشہ اس کی ہمدرد اور غمگسار نہ ہوتی تو شاید یہ صدمہ اسے کہیں کا نہ رہنے دیتا۔ بہ مشکل وہ اپنے حواسوں میں لوٹ پائی لیکن روح پر لگا گھاؤ نہایت گہرا تھا۔ ٹیسیں اٹھتی رہیں۔

عریشہ کے شوہر عمران کی بہن اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ انگلستان میں مقیم تھیں۔ عریشہ اور عمران شادی کے بعد بارہا ان کے پاس جاچکے تھے۔ بہت اچھا وقت گزرا تھا۔ اس مرتبہ دونوں کے پھر انگلستان جانے کی تیاری ہوئی تو عریشہ نے عفیفہ کو بھی اپنے ہمراہ چلنے پر آمادہ کرلیا۔ عفیفہ جو قائم سے علیحدگی کے بعد بہت ٹوٹی ہوئی تھی، ان کے ہمراہ جانے پر آمادہ ہوگئی بشرطیکہ اس کے پاسپورٹ پر ویزا لگ جاتا۔ عریشہ کو امید تھی کہ عفیفہ کو ویزا ملنے میں دشواری نہیں ہوگی اور ایسا ہی ہوا...... بہن اور بہنوئی کے ساتھ عفیفہ بھی سیر وتفریح کے لیے پہلی بار انگلستان جارہی تھی۔

بورڈنگ کارڈز لے کر جب وہ تینوں جہاز میں پہنچے تو عریشہ اور عمران کو پہلو بہ پہلو نشستیں ملیں۔ عفیفہ کو ایک مرد مسافر کے ساتھ بیٹھنا پڑا۔ عریشہ نے چاہا کہ اسے کسی خاتون مسافر کے ساتھ ایڈجسٹ کرادے لیکن عفیفہ نے منع کردیا۔ وہ کوئی نوعمر دوشیزہ تو تھی نہیں جو اسے کسی مرد کے ساتھ بیٹھنا مسئلہ ہوتا۔ سینتیس سال کے لگ بھگ عمر، طب کے پیشے سے وابستگی اور بلاتخصیص مرد و زن مریضوں سے براہِ راست تعلق، قائم کے ساتھ تقریباً دو سالہ ازدواجی زندگی اور اس تعلق کے ٹوٹنے پر نفسیاتی اکھاڑ پچھاڑ نے عفیفہ کو جذباتی طور پر اس کی عمر کی اکثر خواتین سے کہیں زیادہ سنجیدہ کردیا تھا۔

جہاز میں بیشتر مسافر اپنی اپنی نشستوں پر جگہ سنبھال چکے تھے۔ اِکّا دُکّا مسافروں کی آمد جاری تھی اور فضائی میزبان خواتین خوش رنگ تتلیوں کی طرح ادھر سے اُدھر لپکتی پھر رہی تھیں۔ جہاز میں ایئر فریشنر کی مہک پھیلی ہوئی تھی۔ زمین سے جہاز کے اٹھنے اور فضاؤں کے دوش پر اڑنے میں بس کچھ ہی دیر تھی۔

ایک خوبرو فضائی میزبان نے مسافروں کے سامنے آکر حفاظتی بیلٹ باندھنے، موبائل فونز آف کردینے اور خدانخواستہ کسی ہنگامی صورتِ حال میں حفاظتی اقدامات سے آگاہ کرنے کا فریضہ سرانجام دیا۔

جہاز زمین سے آسمان کی وسعتوں میں تھا۔ مسافروں کو تازہ اخبار فراہم کیے جانے لگے۔ بعض نے موسیقی سے محظوظ ہونے کے لیے ایئر فونز لگالیے۔ بعض نے اپنی نشست کی پشت سے سر ٹکا کر یوں آنکھیں موندلیں جیسے پہلی بار آرام کا موقع میسر آیا ہو۔ عفیفہ نے بھی آنکھیں موندلیں۔

کچھ دیر بعد جہاز کی فضا میں اشتہا انگیز خوشبو پھیل گئی۔ دھیمی دھیمی آوازیں بتارہی تھیں کہ فضائی میزبانوں نے مسافروں کی خاطر مدارات شروع کردی تھی۔ عفیفہ نے ذرا کی ذرا آنکھ کھول کر دیکھا۔ فضائی میزبان انتہائی تندہی سے اپنے فرائض کی انجام دہی میں مصروف تھے۔ چاق و چوبند نوجوان خواتین اور ان کے ساتھ مرد بھی۔ عفیفہ کے برابر بیٹھا ہمسفر اپنے سامنے لگی سیٹ بیک اسکرین پر مووی دیکھنے میں محو تھا۔ عفیفہ نے دوبارہ آنکھیں موندلیں۔

''ایکسکیوزمی!'' کچھ دیر بعد اسے اپنے نزدیک سے آواز سنائی دی۔ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ فضائی میزبان خاتون ناشتے کی ٹرے اس کی جانب بڑھائے کھڑی تھی۔ اس نے ٹرے سنبھالی اور اپنے سامنے رکھ کر مشروب لینے کو گلاس آگے کردیا۔

''کیا لیں گی میم؟''

''اورنج جوس۔''

اسے اور اس کے ہمسفر کو ناشتا فراہم کرکے فضائی میزبان آگے بڑھ گئے۔ کچھ دیر بعد ہاٹ ڈرنکس کی فراہمی شروع ہوئی۔ عفیفہ کو کافی مرغوب تھی سو اس نے کافی لی۔ ناشتے کے بعد وہ سوگئی۔ جاگی تو اس کا ہمسفر بدستور فلم بینی میں مصروف تھا۔

www.pklibrary.com

عریشہ اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے پاس آئی۔ ”سب ٹھیک ہے؟“ عریشہ نے پوچھا۔

”ہاں۔“ عفیفہ نے جواب دیا۔

”ہم نے اپنے آگے بیٹھے ایک صاحب کو راضی کرلیا ہے سیٹ چینج کے لیے..... تم ادھر آنا چاہو تو آجاؤ۔“ عریشہ نے کہا۔

”نہیں..... ٹھیک ہے۔“ عفیفہ نے کہا۔

”شیور؟“

”یس۔“

”اوکے۔“

عریشہ واپس اپنی نشست کی جانب چلی گئی۔ عفیفہ نے اپنی سیٹ کے آرم ریسٹ سے ریموٹ نکالا جو اس کی دانست میں اس کا ریموٹ تھا اور بٹن دبا دیا۔ اس کے سامنے لگی اسکرین پر مطلق اثر نہ ہوا۔

”ایکسکیوزمی!“ اس کے ساتھ بیٹھے مسافر نے کہا۔ ”آپ نے میرا ریموٹ لے لیا ہے۔“

عفیفہ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اس نے اپنی نشست کے ریموٹ کے بجائے اپنے ساتھ بیٹھے مسافر کا ریموٹ دبا کر اس کے سامنے لگی اسکرین پر چلتی مووی روک دی تھی۔

”اوہ، سوری سر!“ عفیفہ نے شرمندگی سے کہا۔

وہ مسکرا دیا۔ ”ملکۂ عالیہ نے ابھی یہ خطاب نہیں دیا ہے اس خاکسار کو۔“

”ملکۂ عالیہ؟“ عفیفہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”جی..... وہی جن کے دیس ہم رواں دواں ہیں۔“ وہ بولا۔

”اوہ، کوئین! اور خطاب؟“

”سر.....! آپ نے مجھے سر کہا نا۔“

”سمجھی۔“ عفیفہ نے کہا۔ ”ہمارے ہاں تو ہر ایرے غیرے نتھو خیرے کو سر کہا جاتا ہے۔“

”خیر میں اتنا بھی نتھو خیرا نہیں ہوں۔“ وہ دھیرے سے مسکرایا۔

”خدانخواستہ میرا یہ مقصد ہرگز نہیں تھا۔“ عفیفہ خفت سے بولی۔

”آپ کا جو بھی مقصد ہو۔“ اس کے لبوں پر اب گہری مسکراہٹ تھی۔

”سوری۔“

”فار وہاٹ؟“

”غلطی سے آپ کا ٹی وی جو آف کردیا تھا میں نے۔“

”کوئی بات نہیں..... اب آن کرسکتا ہوں؟“ اس نے اپنے آگے والی نشست کی پشت پر لگی اسکرین کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

”جی..... ضرور۔“

”پوچھ سکتا ہوں کہاں جارہی ہیں؟“ اس نے ٹی وی آن کرتے ہوئے پوچھا۔

”ظاہر ہے وہیں جو اس جہاز کی منزل ہے۔“ عفیفہ بولی۔

”سوری..... مجھے یہ پوچھنا چاہیے تھا کہ آپ انگلینڈ کیوں جارہی ہیں؟ وہاں رہتی ہیں یا.....؟“

”جی نہیں..... گھومنے پھرنے..... رہتی تو میں پاکستان میں ہوں..... آپ؟“

”میں انگلینڈ میں رہتا ہوں۔ پاکستان اپنے گھر والوں سے ملنے آیا تھا۔ اب واپس اپنے گھر جارہا ہوں..... گھر پیارا گھر..... آدمی جہاں رہے وہیں کا عادی ہوجاتا ہے۔ کیا خیال ہے؟“

”ہاں..... ہوتا جاتا ہے۔“ قائم کے گھر کی یاد مرغ بسمل کی طرح عفیفہ کے سینے میں پھڑ پھڑا کر رہ گئی۔ ”مگر عادت نہ چاہتے ہوئے بھی کبھی کبھی چھوڑنا پڑ جاتی ہے۔“

”ہاں..... ایسا ہوتا ہے..... مگر بہت مشکل ہوتی ہے۔“

”ایسی ویسی مشکل!“

”لگتا ہے ایسے کسی تجربے سے گزری ہیں۔“

عفیفہ کو اپنا سینہ بوجھل محسوس ہوا۔

”باتیں کرتے ہوئے آپ مووی پر کیسے توجہ رکھ سکتے ہیں۔“ اس نے موضوع بدلنے کو کہا۔

”لیجیے آف کردیتا ہوں۔“ اس نے ریموٹ کا بٹن دبا دیا۔

”ارے نہیں..... میرا یہ مقصد تو نہیں تھا۔“

”مقصد پر آپ کا خاصا زور دکھائی دیتا ہے۔“ وہ مسکرایا۔

”آپ مطلب بھی کہہ سکتے ہیں۔“

”ٹھیک..... اچھا یہ بتائیں اکیلی گھومنے پھرنے جارہی ہیں؟“

”جی نہیں..... میری بہن اور بہنوئی بھی ساتھ ہیں۔“

”یہ جو خاتون ابھی تھوڑی دیر پہلے آپ کے پاس آئی تھیں، آپ کی بہن ہی تو نہیں؟“

”جی، بہن ہیں۔“

”ذاتی سوال ہے مگر اتنا لمبا سفر خاموش رہ کر بھی نہیں کیا جاسکتا۔ پاکستان میں آپ کے مشاغل کیا ہیں؟“

”گھر..... ملازمت..... اور ملازمت۔“

”کیا ملازمت کرتی ہیں؟“

www.pklibrary.com

''فزیشن ہوں۔''

''کیا واقعی؟''

''آپ کو کچھ شک ہے؟''

''لگتا تو نہیں کہ آپ ڈاکٹر ہیں۔ دیکھنے میں تو آپ بہت سادہ سی دکھتی ہیں۔''

''آپ کے خیال میں ڈاکٹر کو کیسا دکھنا چاہیے؟'' عفیفہ مسکرائی۔

''ویسا ہی جیسی آپ ہیں۔'' وہ دھیرے سے ہنسا۔ ''بات بنانا جانتے ہیں آپ۔''

''شکریہ۔''

''آپ کیا کرتے ہیں؟''

''مزدوری۔''

''نوعیت؟''

''میرا دیسی کھانوں کا ریسٹورنٹ ہے برمنگھم میں۔''

''اوہ!''

''پسند ہیں آپ کو دیسی کھانے؟''

''بہت تیز مسالوں والے۔''

''کتنے تیز؟''

''آدمی سی سی تو کرنے لگے۔''

''برمنگھم آنا ہو تو آیئے گا۔ کھلائیں گے آپ کو تیز مسالوں والے کھانے..... ویسے ڈاکٹرز کھاتے تو نہیں ہیں تیز مسالوں والے کھانے؟''

''آپ کو کیا معلوم۔''

''ہاں واقعی مجھے کیا معلوم۔'' اس نے توقف کیا پھر بولا۔ ''برا مت مانیے گا۔ جب آپ میرے ساتھ آ کر بیٹھی تھیں اور جس انداز سے آپ نے اپنا ہینڈ بیگ پٹخا تھا..... میں تو ڈر گیا تھا۔''

''کیوں؟''

''ہمسفر ہم مزاج نہ ہو تو مشکل ہو جاتی ہے اسی لیے میں نے موو ی لگا لینے میں عافیت جانی تھی۔''

''مگر میری غلطی نے آپ کی موو ی کا مزہ کرکرا کر دیا۔'' عفیفہ معذرت خواہانہ لہجے میں بولی۔

''دوبالا کہیے۔''

''کیا مطلب؟''

''آپ غلطی نہ کرتیں تو ہم باتیں کیسے کر پاتے۔ ایک ذاتی سوال پوچھ سکتا ہوں؟''

''جی..... پوچھیے۔''

''شادی شدہ ہیں آپ؟''

''تھی۔''

''یعنی؟''

''شادی چل نہیں سکی۔''

''کیوں؟''

''اللہ کی مرضی۔''

''عجیب بات ہے کہ جب نتائج ہماری مرضی کے موافق ہوتے ہیں تو ہم کہتے ہیں ہماری کوشش، ہماری قسمت..... اور نتائج ہماری مرضی کے برخلاف ہوں تو ہم اسے اللہ کی مرضی قرار دینے میں ایک لمحہ نہیں لگاتے۔ بھئی نتائج آپ کی مرضی کے موافق ہونے میں اللہ کی رحمت ہوتی ہے اور برخلاف ہونے میں آپ کی غلطی۔''

''میری کوئی غلطی نہیں تھی۔'' عفیفہ نے احتجاجاً کہا۔

''پھر کس کی تھی؟''

''وہی اپنی ماں کے کہنے میں تھا۔''

''سعادت مند ہوگا۔''

''بیوی کا کوئی حق نہیں تھا۔'' عفیفہ تلملا کر بولی۔

''کتنا وقت ساتھ گزارا؟''

''یہی کوئی دو سال۔''

''بس!''

''ہاں۔''

''عمر کتنی تھی اس کی؟''

''شادی کے وقت تقریباً چھبیس سال۔''

''ماں کا وہ چھبیس سال سے تھا، اس میں شادی کے بعد کے دو سال اور جمع کر لو یعنی اٹھائیس سال..... اٹھائیس سال سے وہ ماں کا تھا، دو سال سے تمہارا..... وقت لگتا ہے بھئی دوسرے کا اپنا بننے میں۔ ویسے ہوا کیا تھا؟''

''میری دوست کی شادی تھی۔ اس نے ہم دونوں کو بلا رکھا تھا۔ میں چاہتی تھی وہ میرے ساتھ جائے لیکن اسے اپنی ماں کے ساتھ بہن کی ساس کی عیادت کے لیے اسپتال جانا تھا۔ میں نے چاہا کہ وہ میرے ساتھ چلے۔ میری عزیز ترین دوست کی شادی تھی۔ ماں نے کہا بہن کی بیمار ساس کو دیکھنے کے لیے جانا زیادہ ضروری ہے کیونکہ بڑی بی اگر گزر گئیں تو ان کی بیٹی کو ساری زندگی طعنہ رہے گا۔ وہ میری دل شکنی اور ناراضگی کی پروا کیے بغیر ماں کے ساتھ چلا گیا۔ جاتے ہوئے کہا۔ ''تیار رہنا، جلدی آ جاؤں گا۔'' مگر وہ اس وقت واپس آیا جب مجھے اپنی ایک اور دوست کے ذریعے شادی والی دوست کے رخصت ہونے کی خبر مل چکی تھی۔ وہ آیا تو اس نے دیر سے لوٹنے پر معذرت کی مگر میں اس سے بہت ناراض

www.pklibrary.com

تھی۔ میں نے اس سے کہا چونکہ تمہیں میری فیلنگز، میری خوشی غمی کی کوئی پروا نہیں، ہم ساتھ نہیں چل سکتے۔ اس نے کہا او کے..... نارائنگی بڑھ گئی یہاں تک کہ ہم نے علیحدہ ہونے کا فیصلہ کرلیا۔ اس نے مجھے طلاق دے دی۔"

"ہوں۔" عفیفہ کے ہمسفر نے ایک لمبی سانس کھینچی پھر بولا۔ "عدم برداشت صرف تمہارا نہیں، بہت سوں کا مسئلہ ہے۔"

"تمہارا خیال ہے کہ میں قصور وار تھی..... کیوں بھلا..... میں کیوں قصور وار تھی؟"

"تم نے اس کی ترجیح، اس کی مجبوری سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ اسے ماں کو لے جانا تمہارے ساتھ جانے سے زیادہ ضروری تھا۔ یہ اس کی ترجیح تھی اور شاید وہ ماں کو نہ سمجھا سکتا ہو کہ تمہارے ساتھ اس کا جانا کتنا ضروری تھا لیکن اسے یہ اعتبار ہو کہ وہ تمہیں اپنی مجبوری سے آگاہ کر کے تمہیں سمجھا بجھا لے گا مگر تم بھی ڈٹ گئیں۔"

"ڈٹ نہ جاتی تو کیا کرتی؟ وہ لائف پارٹنر تھا میرا۔ اسے میری خوشی کا خیال ہونا چاہیے تھا۔"

"تم دونوں ہی کو ماں کا خیال ہونا لازم تھا۔ بیٹی کی ساس بیمار تھی۔ اس کی عیادت تمہاری دوست کی شادی میں جانے سے زیادہ ضروری تھی۔"

"تم فضول میں ماں بیٹا کی حمایت کررہے ہو۔" عفیفہ منہ پھلا کر بولی۔

"ایسی بات نہیں۔ میں اس کی جگہ خود کو رکھ کر سوچ رہا ہوں۔ میں ہوتا تو میں بھی یہی کرتا۔ ماں کو لے جاتا، بیوی کو سمجھانے بجھانے کی کوشش کرتا۔"

"بڑی روایتی سی سوچ ہے تمہاری۔"

"غیر روایتی سوچ تمہارے خیال میں کیا ہوسکتی ہے؟"

"ایک لڑکی اپنے ماں باپ کا گھر اور اپنے سارے رشتوں کو پیچھے چھوڑ کر تمہارے نام سے وابستگی کے بعد تمہارے پاس آتی ہے اور تم کہتے ہو تمہارے لیے تمہاری ماں زیادہ اہم ہے۔"

"بات اہم یا غیر اہم ہونے کی نہیں، وقت کے تقاضے کی ہے۔ اس وقت تمہارے شوہر کا اپنی ماں کو لے کر جانا ہی زیادہ ضروری تھا۔"

"شوہر مت کہو۔ اب وہ میری زندگی میں نہیں ہے۔ عرصہ ہوا اسے مجھ سے اپنا تعلق توڑے ہوئے۔"

"شادی تمہارے گھر والوں کی مرضی سے ہوئی تھی؟ میرا مطلب ہے کیا وہ ان کا انتخاب تھا؟"

"نہیں..... میرا اپنا..... ہم میڈیکل کالج میں کلاس فیلو تھے۔ ہماری لو میرج تھی۔"

"نہ جانے محبت کرنے والوں کے دل میں بیگانگی کیسے در آتی ہے۔ کیسے حوصلہ کرلیتے ہیں محبت کرنے والے ایک دوسرے سے قطع تعلقی کا..... ایک دوسرے کو چھوڑ دینے کا..... ایک دوسرے کو بھلا دینے کا۔" اس کے لہجے میں دل گرفتگی تھی۔

"وہی بے وفا تھا۔ میں تو نہیں بھلا پائی اسے..... اتنے سال ہوگئے..... کوئی دن ایسا نہیں گزرتا جب میں اسے یاد نہ کرتی ہوں۔"

وہ دھیرے سے کچھ اس طرح ہنسا جیسے اس نے کوئی احمقانہ بات کردی ہو پھر بولا۔ "محبت تھی تو برداشت کا حوصلہ بھی پیدا کرتیں۔ مانا کہ اس نے تمہیں تمہاری دوست کی شادی میں لے جانے کے بجائے اپنی ماں کو بیٹی کی بیمار ساس کی عیادت کے لیے لے جا کر تمہارا مان توڑا۔ تمہیں اس سے محبت تھی تو درگزر کرتیں۔ جن سے محبت کی جاتی ہے ان کی تو ہر خطا، ہر سہو، ہر کوتاہی سے نظر پوشی کی جاتی ہے۔ تم نے تو اس سے اپنی محبت کو اپنی انا کی سولی پر چڑھا دیا۔ یہ کیسی محبت تھی یار؟"

"اچھا چھوڑو..... وہ قصہ تو کب کا تمام ہوا۔" عفیفہ نے توقف کیا پھر بولی۔ "تم نے اپنا نام نہیں بتایا اب تک۔"

"تم نے کب بتایا..... میں تو لیڈیز فرسٹ کا قائل ہوں۔"

عفیفہ دھیرے سے ہنسی۔ "بہت چالاک ہو۔ لیڈیز فرسٹ بھی تم مردوں نے ہم عورتوں کے استحصال کا اچھا نعرہ گھڑ رکھا ہے۔ جہاں ہمیں مسابقت ملنا چاہیے وہاں تو تم مرد ہمیں پیچھے کردیتے ہو اور جہاں تمہاری اپنی مطلب برآری ہوتی ہے وہاں ہمیں آگے کردیتے ہو۔"

"مثلاً؟"

"جانے دو..... تم نے اپنا نام نہیں بتایا اب تک۔"

"تم نے کب بتایا؟"

"مجھے عفیفہ کہتے ہیں..... عفیفہ رحمان..... اور تم؟"

"سید محمد رافع۔"

"تمہاری مووی۔" عفیفہ نے اس کے سامنے لگی مٹی اسکرین کی جانب انگلی اٹھائی۔ "سوری! میں خلل انداز ہوئی..... دیکھ لو۔"

"اب کون دیکھتا ہے۔"

"کیوں؟" عفیفہ نے پوچھا۔

"تم سے باتیں کرنے میں جو مزہ آرہا ہے، وہ مووی

www.pklibrary.com

دیکھنے میں کہاں۔ میں تو سوچ رہا تھا کہ دوران پرواز میرا زیادہ وقت یا تو سوتے گزرے گا یا پھر مووی دیکھتے مگر..... تمہاری ہمسفری نے میرے سفر کو خوشگوار بنا دیا۔"

"میں بھی اس خیال سے بیزار ہو رہی تھی کہ ایک اجنبی شخص کے ساتھ اتنا لمبا سفر کیسی اکتاہٹ میں گزرے گا۔"

"سفر کی شوقین ہو؟"

"بہت..... سوچتی تھی شادی کے بعد اس کے ساتھ دنیا گھوموں گی مگر....."

"مگر؟"

"اس بے وفا، بے مروت نے مجھ سے جینے کی ترنگ ہی چھین لی۔"

"زندگی کا سفر کبھی رکتا نہیں۔"

"تم نے چوٹ کھائی ہوتی تو ایسا نہ کہتے..... مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے آج بھی میں اس سے جدائی کے لمحے میں قید ہوں۔" عفیفہ کی آواز میں بھراہٹ تھی۔

"تمہیں بہت محبت تھی اس سے؟"

"تھی کیا..... اب بھی ہے..... اکثر خواب میں دیکھتی ہوں اسے۔"

"پھر کبھی ملیں اس سے؟"

"ایک ہی پروفیشن تھا، ایک ہی جائے ملازمت..... جب تک وہ پاکستان میں رہا، اکثر سامنا ہو جاتا تھا۔"

"اب کہاں ہے؟"

"سنا ہے کینیڈا چلا گیا۔ وہ لڑکی جس سے اس نے میرے بعد شادی کی، کینیڈا میں رہتی ہے۔"

"شادی بھی کر لی اس نے؟"

"ہاں۔ مرد انتظار کب کرتے ہیں۔ وہ تو عورت کو چھوڑنے کے بعد اسی دن دوسری شادی رچا سکتے ہیں۔"

"تم نے کی؟"

"تمہیں لگتا ہے کہ میں نے کی ہوگی؟" عفیفہ شاکی لہجے میں بولی۔

"کر لیتیں۔"

"ہرجائی نہیں تھی..... بس اسی کے نام لکھ دی تھی اپنی ساری زندگی۔" عفیفہ کی آنکھیں نم ہو گئیں اور آواز پھر بھرا گئی۔

"اتنی حماقت کی کیا ضرورت تھی؟ جب اس نے دوسری شادی کر لی تھی تو تم بھی کر لیتیں۔ کسی کے پیچھے خود کو یوں ضائع کر دینا عقلمندی تو نہیں ہوتی۔ خوب صورت ہو، تعلیم یافتہ ہو، گفتگو کا سلیقہ ہے۔ کسی بھی ہم پلہ آدمی کا ہاتھ تھام لیتیں؟"

"تم نے کبھی کسی سے محبت کی؟"

"کی تھی..... شادی کے بعد..... اپنی بیوی سے..... دھوکا دے گئی۔"

"کیسے؟" عفیفہ نے چونک کر اسے دیکھا۔

"ایسے کہ مجھے پتا بھی نہیں چلا۔"

"کیا مطلب؟"

اس نے عفیفہ کی طرف دیکھا۔ عفیفہ کو اس کی سیاہ آنکھوں میں سرخی گھلتی دکھائی دی۔

"بیوی جب شوہر کو دھوکا دیتی ہے تو شوہر کو سب سے آخر میں خبر ہوتی ہے۔"

"یہ کیا بات ہوئی؟"

"تجربے کی بات ہے۔ میں تو سارے جہان کی خوشیاں اور آرام اس کے قدموں میں ڈھیر کر دینے کی تگ و دو میں تھا۔ اس نے کسی اور سے پینگیں بڑھا لیں۔ مجھے کسی تیسرے فرد سے پتا چلا۔ اس سے پوچھا تو اس نے کہا مجھے طلاق دے دو، میں اس سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔"

"پھر؟"

"پھر کیا..... میری ماں کہا کرتی ہیں..... عورت رہے تو اپنے آپ سے، نہ رہے تو اپنے باپ سے۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ عورت اگر گمراہ ہو جائے تو اپنے باپ کی بھی نہیں سنتی۔"

"تو پھر تم نے کیا کیا؟"

"کیا کرتا..... چھوڑ دیا اسے۔ جس دیس میں رہتا ہوں وہاں عورت کے ساتھ مرد زور زبردستی نہیں کر سکتا۔"

"اب کہاں ہے وہ؟"

"فرانس چلی گئی تھی۔"

"اس سے شادی کر کے؟"

"اس نے شادی کہاں کرنا تھی۔ وہ تو پہلے ہی شادی شدہ تھا۔ بیوی اس کی کزن تھی۔ اسے پتا چلا تو اس نے ایک رات گھر میں پیٹرول چھڑک کر گھر کو آگ لگا دی۔ تین معصوم بچوں کے ساتھ خود بھی جل مری اور اسے بھی عدم کا راستہ دکھا دیا۔"

"میرے خدا!" عفیفہ نے جھرجھری لی۔ "تمہارے بچے ہیں؟"

"ایک بیٹا ہے۔ ماں اسے اپنے ساتھ فرانس لے گئی۔"

"ملتا ہے تم سے؟"

www.pklibrary.com

''عدالت نے شیئرڈ کسٹڈی دی تھی۔ وہ ماں کے ساتھ بھی رہ سکتا تھا، میرے ساتھ بھی لیکن ماں نے اسے مجھ سے اتنا متنفر کیا کہ اس نے میرے منہ پر کہہ دیا کہ مجھے تم سے نفرت ہے۔'' وہ ایک لمحہ رکا۔ گہری اور ٹھنڈی سانس بھری پھر بولا۔ ''میں سب کچھ برداشت کرسکتا ہوں، نفرت نہیں۔ میرا دل اتنا ٹوٹا کہ میں نے پھر اس سے ملنے کی کوشش نہیں کی۔''

''کوشش تو کرتے۔ شاید وہ اپنے کہے پر شرمندہ ہوتا۔ کتنا بڑا تھا وہ؟''

''مجھ سے اپنی نفرت کے اظہار کے وقت بارہ برس کا۔''

''ارے! بارہ سال کے بچے کو نفرت کا کیا پتا؟ اس نے یونہی کہہ دیا ہوگا۔'' عفیفہ بولی۔

''نہیں۔'' رافع نے اس کی بات کو رد کیا۔ ''اس دیس کا بارہ سال کا بچہ نفرت اور محبت کے مفہوم سے بخوبی آگاہ ہوتا ہے۔ اس نے ایسے ہی نہیں کہا تھا۔''

''تم باپ تھے، درگزر کردیا ہوتا۔ رابطہ رکھتے اس سے۔''

''کوشش کی تھی فون پر رابطہ رکھنے کی مگر اس نے پھر وہی کہا..... پھر وہی کہا..... میں نے فون پر رابطہ کرنا بھی چھوڑ دیا۔''

''اب کتنا بڑا ہے وہ؟''

''سترہ سال کا۔''

''مس تو کرتے ہوگے اسے؟''

''باپ ہوں اس کا..... دشمن تو نہیں..... دعا کرتا ہوں اس کے لیے۔''

''میں سمجھتی تھی صرف مرد بے وفا اور ظالم ہوتا ہے۔''

''عورت جب بے وفائی اور ظلم پر آتی ہے تو ساری حدیں عبور کرجاتی ہے۔''

''تم نے دوسری شادی کی؟''

''ہمت نہیں ہوئی۔''

''کیا شادی کے لیے بھی ہمت کی ضرورت ہوتی ہے؟''

''جب آپ زخم کھائے ہوئے ہوں تب تو ہوتی ہے۔''

''ہاں۔'' عفیفہ نے لمبا سانس کھینچا۔ ''تم ٹھیک کہتے ہو شاید۔''

عریشہ کتنا سمجھاتی تھی اسے دوسری شادی کے لیے مگر وہ ہمت ہی نہ کرپاتی تھی۔ پہلا زخم ہی اتنا گہرا تھا کہ اسے دوبارہ خطرہ مول لیتے ڈر لگتا تھا۔ قائم تو اس سے شادی سے پہلے بھی محبت کرتا تھا مگر محبت کرنے والے نے یوں نظریں بدلی تھیں تو انجانے کا وار تو نہ جانے کتنا کاری ہوتا ہوگا۔

طاہر جاوید مغل کے سحر انگیز قلم کا جادو

کانچ محل

خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ

ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ

حساس معاشرتی پہلوؤں پر ایک جراح کی نشتر کاری.....

رنگین و سنگین احساسات و جذبات کی جنگ اور

عبرت اثر انجام پر مشتمل ایک خوبصورت داستان

بہت جلد سسپنس کے صفحات کی زینت

www.pklibrary.com

''مجھے تم سے ہمدردی محسوس ہو رہی ہے۔'' اس نے اپنے ہمسفر رافع سے کہا۔ وہ دھیرے سے نہایت کرب سے ہنسا۔

''کبھی کبھی الفاظ بے معنی اور بے اثر ہو جاتے ہیں۔ میرے بہت سے جاننے والوں اور بہی خواہوں نے یہی کہا جو تم نے کہا ہے مگر کسی کے ہمدردی کرنے سے اس درد کی شدت کم نہیں ہوتی جس نے کئی برسوں سے میرے دل میں بسیرا کر رکھا ہے۔''

عفیفہ کو یوں لگا جیسے وہ اور اس کا ہمسفر درد مشترک کی زنجیر میں بندھے ہوئے تھے۔ قائم سے اس کا رشتہ ٹوٹنے پر کتنوں نے اس سے ہمدردی کا اظہار کیا تھا مگر ان کی ہمدردی سے اس درد کی شدت میں کمی نہیں آئی تھی جو اس کے دل کو دبوچ بیٹھا تھا۔

سفر بھر وہ دونوں باتیں ہی کرتے رہے۔ ان کے دوسرے ہمسفر سو رہے تھے، جاگ رہے تھے۔ دورانِ پرواز تفریحی سہولتوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ بعض آتی جاتی فضائی میزبانوں کو تک رہے تھے۔ کھڑکیوں کے نزدیک بیٹھے کچھ مسافر پردے ہٹائے بادلوں کی دنیا میں گم تھے مگر ان دونوں کو باتوں کے سوا کچھ مصروفیت نہ تھی۔ اختتامِ سفر تک وہ ایک دوسرے کے بارے میں بہت کچھ جان چکے تھے۔

ہیتھرو کے ارائیولز لاؤنج میں عفیفہ نے رافع کو اپنی بہن عریشہ اور اس کے شوہر عمران سے متعارف کرایا۔ لہراتی، بل کھاتی سامان بردار، خودکار بیلٹس پر اپنے سامان کی وصولی کا انتظار کرتے ہوئے رافع نے ان تینوں کو برمنگھم آنے کی دعوت دی۔

''وقت ملا تو ضرور۔'' عمران نے اس کی دعوت کے جواب میں کہا اور عریشہ نے اس کی تائید میں سر ہلایا۔

''یہ لوگ آئیں یا نہ آئیں، میں ضرور آؤں گی۔ تمہارے ریسٹورنٹ کے مسالے دار دیسی کھانوں کا چٹخارا لینے کے لیے۔'' عفیفہ نے کہا۔ عریشہ نے اسے قدرے حیرت اور تجسس سے دیکھا۔

''برمنگھم میں ان کا دیسی کھانوں کا ریسٹورنٹ ہے۔'' عفیفہ نے بہن اور بہنوئی کو بتایا۔

''پھر تو شاید ہمیں بھی آنا ہی پڑے۔'' عمران نے کہا۔

''سر آنکھوں پر۔'' رافع گرمجوشی سے بولا۔ ''ویسے دو دن میں لندن ہی میں ہوں۔ آپ پسند کریں تو آج یا کل میں آپ لوگوں کو لندن کی سیر کرا سکتا ہوں۔ پاکستان جاتے ہوئے اپنی کار میں اپنے کزن کے گھر چھوڑ گیا تھا۔ یہاں نزدیک ہی رہتا ہے، مجھے پک کرنے آیا ہوگا۔ دو دن میں اس کے گھر ہی ٹھہروں گا۔''

''عفیفہ سے پوچھ لیں۔'' عریشہ نے بہن کو معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''عمران اور میں تو شاید آپ کی مخلصانہ دعوت سے مستفید نہ ہو پائیں۔ عمران کانفرنس کے بعد اپنی بہن اور ان کی فیملی سے ملیں گے۔ اچھا نہیں لگے گا کہ ہم پہلے یا دوسرے دن ہی انہیں چھوڑ کر سیر سپاٹے کو نکل جائیں۔''

''بجا۔'' رافع نے نہایت خوش دلی سے عریشہ کی بات سے اتفاق کیا۔ ''آپ کیا کہتی ہیں؟'' اس کا روئے سخن اب عفیفہ کی جانب تھا۔ عفیفہ کچھ ہچکچائی۔

''چلی جانا..... تم نے کون سا عمران کی طرح کسی کے ساتھ بیٹھ کر برسوں کے قصے سنانے ہیں۔'' عریشہ مسکرا کر بولی۔

''ٹھیک ہے۔'' عفیفہ نے قدرے تردد سے کہا۔

''کیا ٹھیک ہے؟'' رافع مسکرایا۔

''عریشہ ٹھیک کہتی ہے۔ عمران بھائی کو شروع کے دو تین دن تو اپنی بہن اور ان کی فیملی کے ساتھ ہی گزارنے چاہئیں۔''

''اور آپ کیا کریں گی؟''

''چلوں گی..... آپ کے ساتھ..... سیر و تفریح کے لیے ہی تو آئی ہوں..... مگر کیا آپ مجھے پک کر سکیں گے؟'' عریشہ اور عمران کی موجودگی کا لحاظ رکھتے ہوئے وہ دونوں قدرے تکلف سے ایک دوسرے سے بات کر رہے تھے۔

''ضرور..... مجھے خوشی ہوگی۔ ایڈریس بتا دیں مجھے۔'' عمران نے اسے بہن کے گھر کا پتا بتایا۔ سامان لے کر وہ لوگ باہر نکلے تو عمران کی بہن اپنے بیٹے کے ہمراہ انہیں ریسیو کرنے کے لیے آئی ہوئی تھیں۔ رافع ابھی لاؤنج ہی میں اپنے سامان کا منتظر تھا۔

حسبِ توقع عمران کی بہن نے بھائی اور بھاوج کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ عفیفہ بھی ان کے لیے انجان نہ تھی۔

''اچھا ہوا تم بھی آ گئیں..... چینج ملے گا..... خوب گھومنا پھرنا..... فریش ہو کر جانا..... زندگی سے کسی ایک شخص کے نکل جانے سے زندگی کا سفر رک نہیں جاتا۔ اسے جاری رہنا چاہیے۔''

''جی۔'' عفیفہ نے کہا۔ اسے ایسے جملے اکثر سننے کو ملتے تھے اپنے شناساؤں اور بہی خواہوں سے۔ کسی سے ہمدردی کے بول بولنا آسان ہوتا ہے۔ انسان جب خود ویسے ہی دکھ، کرب اور اذیت سے گزرے تو پتا چلتا ہے کہ کبھی کبھی کسی ایک شخص کے زندگی سے نکل جانے سے زندگی

www.pklibrary.com

کا سفر تو کیا، ساری کائنات ہی ایک مقام پر ٹھہر جاتی ہے۔

☆☆☆

شام کو رافع اسے اپنے ساتھ لے جانے کے لیے عمران کی بہن کے گھر کے دروازے پر پہنچ گیا۔ عفیفہ تیار تھی۔ عمران کی بہن نے چائے کی دعوت دی مگر رافع نے نہایت شائستگی سے معذرت کرلی۔ عفیفہ مرسیڈیز کی اگلی نشست پر رافع کے ساتھ بیٹھ گئی۔

''کہاں چلنا پسند کرو گی؟'' اس نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے پوچھا۔

''تم شاید بھول رہے ہو کہ میں پہلی مرتبہ آئی ہوں یہاں۔''

''اوہ، سوری.....! ویسے میرا خیال ہے تم نے مجھے یہ بات نہیں بتائی تھی کہ یہ تمہارا پہلا سفر ہے انگلینڈ کا۔''

''اب تو پتا چل گیا۔''

''ہاں..... چلو، سب سے پہلے تمہیں ملکۂ معظمہ کا محل دکھاتا ہوں..... بکنگھم پیلس۔''

بکنگھم پیلس کا دور ہی دور سے نظارہ کرانے کے بعد وہ اسے لندن کے چند قابلِ دید مقامات کا طوفانی نظارہ کرانے کے لیے اپنی مرسیڈیز بے تکان لندن کی سڑکوں پر دوڑاتا اور ان مقامات کے بارے میں ضروری تفصیل اس کے گوش گزار کرتا رہا۔

''اچھے بھلے گائیڈ ہو۔'' ایک موقع پر عفیفہ نے کہا۔

''مادام! وقت کم ہے اس لیے تیز رفتاری سے جا رہا ہوں اور مختصراً بتا رہا ہوں۔ وقت ہوتا تو میں تمہیں لندن کا چپا چپا گھماتا اور تفصیل سے بتاتا۔ بہت لطف اندوز ہوتیں تم۔''

''میں اب بھی کچھ کم نہیں ہو رہی ہوں۔ لندن واقعی لندن ہے۔'' عفیفہ نے کہا۔

''تبھی تو دنیا بھر سے لوگ یہاں امڈے چلے آتے ہیں۔''

لنڈن آئی کے بلوری کیپسول سے ٹیمز پر تقریباً ساڑھے چار سو فٹ کی بلندی سے شہر کا نظارہ کرنا بھی کیا خوب سماں تھا۔

رات کا کھانا رافع نے اسے ایک انڈین ریسٹورنٹ میں کھلایا۔ واپسی کافی دیر سے ہوئی مگر عجیب بات یہ تھی کہ جب وہ سونے کے لیے بستر پر لیٹی تو نہ اسے لمبے فضائی سفر کی تکان تھی نہ رافع کے ساتھ کئی گھنٹے گھومنے پھرنے کی۔

رافع اگلے دن پھر آنے کا کہہ گیا تھا، مادام تساؤ اور چند اور قابلِ دید جگہیں دکھانے کے لیے۔

☆☆☆

اگلی صبح وہ دیر تک سوتی رہی۔ جاگی اور منہ ہاتھ دھونے کے بعد اسی کمرے میں آئی جو عمران کی بہن نے اس کے قیام کے لیے مخصوص کر رکھا تھا تو عریشہ کو موجود پایا۔

''تھکن اتر گئی؟'' عریشہ نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں..... خوب اچھی نیند آئی۔''

''ناشتا کرلو۔''

''کرتی ہوں..... تم لوگوں نے کرلیا؟''

''ہضم بھی ہو گیا۔ تم ناشتا کرلو تو کہیں باہر چلتے ہیں۔''

''کہاں؟''

''کہیں بھی۔ گھر میں بیٹھنے کے لیے تھوڑی آئے ہیں۔ تم کل کہاں کہاں گھومیں؟''

''اللہ جانے۔''

''کیا مطلب؟'' عریشہ نے چونک کر پوچھا۔

''وہ عمارتیں اور جگہیں دکھاتا رہا اور ساتھ کنٹری بھی کرتا رہا۔ یہ بکنگھم پیلس ہے..... یہ ٹرافلگر اسکوائر..... یہ برٹش میوزیم..... یہ ہائیڈ پارک..... میں بس دیکھتی اور سنتی رہی۔ لنڈن آئی سے شہر کو دیکھتے ہوئے عجیب احساس تھا..... کچھ حیرت، کچھ خوف۔''

''خوف کیوں؟'' عریشہ بولی۔

''بلندی سے نیچے دیکھتے ہوئے مجھے ہمیشہ ڈر محسوس ہوتا ہے۔ پتا نہیں کیوں؟ شاید ہائٹ فوبیا ہے۔'' عفیفہ نے جھرجھری لی۔

''ڈرپوک ہو۔ مجھے تو بلندی پر جا کر نیچے دیکھنا ہمیشہ اچھا لگتا ہے۔''

''تم ٹھیک کہتی ہو۔ میں واقعی ڈرپوک ہوں۔''

''بہادر بنو۔''

''بہادر بنا نہیں جاتا۔ بہادری بندے کی خو میں ہوتی ہے۔''

''اچھا اٹھو، ناشتا کرو پھر باہر چلتے ہیں۔''

''واپسی کب تک ہوگی؟''

''کچھ پتا نہیں۔''

''میرا خیال ہے تم اور عمران بھائی جاؤ۔''

''تم کیوں نہیں؟''

''وہ آج پھر آئے گا۔''

''کون؟'' عریشہ چونکی اور اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر بولی۔ ''رافع؟''

''ہاں! آج اور ہے وہ یہاں..... پھر بکنگھم چلا جائے گا۔''

''لگتا ہے گڑبڑ ہوگئی ہے اس کے ساتھ۔''

''کیسی گڑبڑ۔''

www.pklibrary.com

”انٹرسٹڈ لگتا ہے تم میں۔“

”میں نے اسے بتادیا ہے کہ میں مطلقہ ہوں۔“

”کیا فرق پڑتا ہے۔“

”کیوں فرق نہیں پڑتا؟“

”جب دل آجائے تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔“

”ایسی کوئی بات نہیں۔ سفر کے دوران لمبی گپ شپ رہی۔ میں نے اسے بتایا کہ بس سیر و تفریح کے لیے آئی ہوں۔ رہتا تو وہ برمنگھم میں ہے لیکن دو دن اسے لندن میں اپنے کزن کے پاس رکنا تھا۔ اس نے سوچا ہوگا بے چاری کو گھما پھرا دوں۔“

”بے چاری!“ عریشہ نے مسکراتے ہوئے اسے معنی خیز نگاہوں سے دیکھا۔

”ہاں اور کیا...... میں نے بتادیا تھا اسے کہ میں گھومنے پھرنے انگلینڈ جارہی ہوں۔ اس نے سوچا ہوگا بے چاری مطلقہ ہے...... بہن اور بہنوئی کے اسپانسر کرنے پر جارہی ہے۔ میں بھی اس کارِخیر میں کچھ ہاتھ بٹادوں۔“

عریشہ زور سے ہنسی۔

”کیوں! ہنسنے کی کیا بات ہے؟“

”اسے یہ پتا نہیں ہوگا کہ بہن اور بہنوئی کو ریٹرن ٹکٹس بھی اسی بے چاری نے ان کی شادی کی سالگرہ کے تحفے کے طور پر دیے ہیں۔“

”عمران بھائی کے سامنے نہ کہہ دینا یہ بات۔“

”عمران کو معلوم نہیں ہے کیا۔ بہرحال اتنی بے وقوف نہیں ہوں کہ پھر یہ بات دہراؤں۔“

”ہو تو۔“ عفیفہ کو خوش دلی سوجھی۔

”ہاں...... آخر کو تمہاری بہن جو ہوں۔“

”عریشہ!“ عفیفہ نے اسے آنکھیں دکھائیں۔ وہ ہنس دی۔

”بائی دی وے آج کیا پروگرام ہے اس کا؟“

”کہہ رہا تھا مادام تساؤ دکھانے لے جائے گا پھر شاید کہیں اور۔“

”مادام تساؤ میں ہلتی جلتی رہنا۔“ عریشہ مسکراتے ہوئے بولی۔

”کیا مطلب؟“

”ایسا نہ ہو کہ لوگ تمہیں بھی مجسمہ سمجھ کر چھو کر دیکھنے لگیں۔“

”فکر مت کرو۔ میں چھونے والے کی کلائی مروڑ سکتی ہوں۔“

”یار! یہ پاکستان نہیں، ملکہ کا دیس ہے۔ یہاں لوگوں کو عمل کی آزادی ہے۔“ عریشہ نے مذاقاً کہا۔

”تم نے سنا نہیں...... ہر شخص کی آزادیٔ عمل وہاں ختم ہوجاتی ہے جہاں کسی دوسرے فرد کی ناک شروع ہوتی ہے۔“

عریشہ زور سے ہنسی۔ ”اچھا چلو، ناشتا کرلو۔ ایسا نہ ہو کہ وہ تمہیں لینے آجائے اور تم نہار منہ اس کے ساتھ چل دو۔“

”کوئی بات نہیں۔ یہاں قدم قدم پر ٹیک اویز اور فضا میں کافی کی مہک تو ہے۔“ عفیفہ بولی۔

”لندن، لندن ہے بھئی اور صرف لندن ہی کیا، یہاں تو چپا چپا بندے کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ یونہی تو نہیں دوڑی آتی ہے دنیا یہاں۔ ہر سال لاکھوں لوگ سیر و تفریح کے لیے یہاں آتے ہیں اور یہ کہتے ہوئے واپس جاتے ہیں...... ایک بار دیکھا ہے، دوبارہ دیکھنے کی ہوس ہے۔“

”سچ کہتی ہو عریشہ! کل جب رافع مجھے اپنی کار میں گھما پھرا رہا تھا تو مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں کوئی حسین خواب دیکھ رہی ہوں۔“

”ذرا ہمت کرلو تو یہ خواب حقیقت بھی بن سکتا ہے۔“ عریشہ کی آنکھوں میں چمک اور لہجے میں کھنک تھی۔

”کیا مطلب؟“ عفیفہ اس کا مطلب سمجھتے ہوئے بھی انجان بن گئی۔

”تم کل بتا تو رہی تھیں کہ اکیلا ہے...... بیوی کو طلاق دے دی۔“

”تو؟“

”تو...... تو...... تو......“ عریشہ سے کوئی معقول جواب نہ بن پایا۔

”ناشتا کہاں ہے؟“

”نیچے کچن کم ڈائننگ میں۔ ناشتا، کھانا سب وہیں بنایا اور کھایا جاتا ہے۔ عمران کی بہن کی فیملی بہت کمپیکٹ ہے۔ ایک دوسرے کے بغیر رہ نہیں سکتے۔“ عریشہ نے بتایا۔

”ہاں۔ مجھے اندازہ ہورہا ہے۔“

”ویسے ہم دونوں بھی کچھ کم کمپیکٹ نہیں...... رہ سکتے ہیں ہم ایک دوسرے کے بغیر بھلا؟“

”تم تو شاید عمران بھائی کے ساتھ رہ لو البتہ میں مرجاؤں گی تمہارے بغیر۔“ عفیفہ بولی۔

دونوں باتیں کرتی گھر کی بالائی منزل سے نیچے اتر آئی تھیں۔

”تم بیٹھو، میں ناشتا دیتی ہوں۔“ کچن میں پہنچنے کے بعد عریشہ نے کہا۔

”تم مجھے بتاؤ، میں خود لے لیتی ہوں۔“

”مانوس ہوجاؤ گی تو لے لینا۔ ابھی تو تمہیں یہی معلوم

www.pklibrary.com

نہیں کہ کون سی چیز کہاں رکھی ہے۔"

"ایسے کہہ رہی ہو جیسے میں سدا یہیں رہنے کے لیے آئی ہوں۔"

"یہاں تو نہیں، آس پڑوس میں کہیں مستقل قیام ہو سکتا ہے۔ بندے کو اچھے برے وقت کے لیے تیار رہنا چاہیے۔"

"جتنا برا وقت میں گزار چکی ہوں اس سے برا وقت اور کیا ہوگا عریشہ۔" شدتِ جذبات سے عفیفہ کی آواز رندھ گئی۔ "یقین کرو مجھے لگتا تھا میں گھپ اندھیرے میں ڈوب گئی ہوں۔ گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے میں اکثر غلط راستے پر نکل جاتی تھی۔ شروع کے دن تو بہت مشکل تھے۔"

عریشہ جانتی تھی کہ عفیفہ اپنے سابقہ شوہر سے طلاق کے بعد اپنی ذہنی کیفیت کا حال بیان کر رہی تھی۔

"مت یاد کیا کرو عفیفہ۔" اس نے بہن سے کہا۔

"اپنا دل دولخت ہونا کوئی کیسے بھول سکتا ہے عریشہ۔" عفیفہ نے سرد آہ کھینچی۔

"قدرت زخم کو بھرنے پر قادر ہے۔ شروع کے برسوں میں تم جتنی دکھی تھیں اب اتنی نہیں ہو۔ ان شاء اللہ وقت مرہم کا کام کرے گا۔" عریشہ نے عفیفہ کے لیے ناشتا میز پر چنتے ہوئے کہا۔

"یا اللہ! کتنے لوگوں نے ناشتا کرنا ہے جو تم اتنی چیزیں میز پر رکھ رہی ہو۔"

"صرف تم..... باقی لوگ تو کر چکے۔"

"میں صرف چائے اور ایک توس لوں گی بس۔"

"آپا نے مجھے ہدایت کی تھی کہ اپنی بہن کو اچھی طرح ناشتا کرانا۔" عریشہ اپنی نند کو احتراماً آپا کہتی تھی۔

"خلوص ہے ان کا۔"

"آپا واقعی بہت اچھی ہیں۔ عمران کو تو بیٹوں کی طرح عزیز رکھتی ہیں۔"

عفیفہ کو ناشتے سے فارغ ہونے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ عریشہ اس کے ساتھ ہی رہی تاکہ وہ اکیلی اجنبیت محسوس نہ کرے۔ دونوں کچن ہی میں تھیں کہ عمران بھی آ گیا۔

☆☆☆

دن چڑھے رافع اسے اپنے ساتھ لے جانے کے لیے آ گیا۔ اس نے گھر میں آنے کے بجائے باہر ہی سے اس کے موبائل پر فون کیا۔

"مادام! میں گھر کے باہر تمہارا منتظر ہوں۔"

"بس آئی..... میری بہن عریشہ سے ملو گے؟"

"اگر انہیں کوئی اعتراض نہ ہو تو ضرور۔"

"وہ اعتراض کرنے والوں کے قبیلے سے نہیں ہے۔"

"بہت اچھی بات ہے۔"

"بس دو منٹ انتظار کرو، میں آ رہی ہوں۔"

"ساری زندگی انتظار کر سکتا ہوں۔"

عفیفہ کا دل زور سے دھڑکا۔ یہ کیا کہہ گیا تھا وہ۔

عریشہ اور عمران دونوں ہی رافع سے ملنے کے لیے عفیفہ کے ساتھ گھر سے باہر نکل آئے۔

عمران نے رافع کو گھر کے اندر آنے کی دعوت دی تو وہ بولا۔ "آپ لوگ برا نہ منائیے گا۔ اصل میں وقت کم ہے۔ آج مجھے اپنے تھر برمنگھم جانے کے لیے بھی نکلنا ہے۔ میں چاہتا ہوں عفیفہ کو مادام تساؤ اور آس پاس چند جگہوں کی سیر کرا دوں۔ دو تین گھنٹے بلکہ اس سے زائد تو ہمیں مادام تساؤ ہی میں لگ جائیں گے۔ اگر موڈ ہو تو آپ دونوں بھی ساتھ چلیں۔"

عریشہ اور عمران نے ایک دوسرے کو دیکھا۔

"شکریہ! میرا خیال ہے آپ دونوں جائیں۔ ہمارا کہیں اور کا پروگرام ہے۔" عمران نے کہا۔

"جیسے آپ کی مرضی۔ ہاں برمنگھم آنا ہو تو آپ لوگ مجھے میزبانی کا موقع دیجیے گا۔ جگہ کی کوئی تنگی نہیں..... اوپر، نیچے تین تین بیڈ روم کا دو منزلہ گھر ہے میرا۔ ایک حصہ کرائے پر اٹھا رکھا ہے، دوسرے میں، میں خود رہتا ہوں..... تنہا۔"

"برمنگھم آنا ہوا تو آپ سے ملنے ضرور آئیں گے۔" عمران نے کہا۔

"ملنے نہیں..... مجھے میزبانی کا شرف دینے۔"

"اوکے۔"

"شام کو ملاقات ہوگی۔" عفیفہ نے عریشہ اور عمران کو خدا حافظ کہا۔ رافع نے گاڑی اسٹارٹ کی۔

مادام تساؤ کا مومی عجائب خانہ واقعی عجائب خانہ تھا۔ مومی مجسموں میں بس جان پڑنے کی دیر تھی۔ جی اٹھتے۔ عفیفہ کشاں کشاں رافع کی ہمراہی میں مومی مجسمے دیکھتی اور حیران ہوتی چلی گئی۔ انسانی ہاتھوں کی صناعی اوجِ کمال کو پہنچی دکھائی دیتی تھی۔ ایک موقع پر جب رافع برطانوی تاریخ کا موم سے تراشیدہ ایک منظر دیکھنے میں ہمہ تن محو تھا، ایک انگریز بڑے میاں عفیفہ کے روبرو آ کھڑے ہوئے اور اپنی گول شیشوں والی عینک کو ناک پر جماتے ہوئے اسے بہت نزدیک ہو کر گھورنے لگے تو وہ گھبرا کر الٹے قدموں پیچھے ہٹی۔

"اوہ! آئی ایم سوری۔" گورے بڑے میاں نے معذرت چاہی پھر ہنستے ہوئے شستہ انگریزی میں کہا۔ "خاتون! میں آپ پر کسی ہندوستانی عورت کا مجسمہ ہونے کا

www.pklibrary.com

گمان کر بیٹھا تھا۔'' بڑے میاں اتنا کہہ کر آگے چل دیے۔

''کیا ہوا؟'' رافع چونک کر عفیفہ کی طرف پلٹا۔

''وہ بڑے میاں مجھے بھی موی مجسمہ سمجھ بیٹھے تھے۔'' عفیفہ نے آگے جاتے بڑے میاں پر نظر ڈالتے ہوئے بتایا۔

''ایسا ہوتا ہے۔ لوگ یہاں آکر کبھی کبھی زندہ انسانوں کو بھی مجسمہ سمجھ بیٹھتے ہیں۔''

''زبردست صناعی ہے رافع۔ تم اگر مجھے یہاں نہ لاتے تو میں ایک شاندار اور شاہکار جگہ دیکھنے سے محروم رہتی۔ تمہارا شکریہ۔''

''شکریہ تمہارا کہ تم نے مجھے، میرے ساتھ ہونے کا اعزاز بخشا۔''

''ویسے تم بہت پُرتکلف زبان بولتے ہو۔ میں تو سیدھے الفاظ میں اپنا مطلب ظاہر کرتی ہوں اور کام چلاتی ہوں۔''

''کفایت شعاری سے کام مت لو۔ تمہاری زبان دانی کا اندازہ ہے مجھے۔''

''اچھا!'' عفیفہ مسکرائی۔ ''اور کیا اندازہ ہے تمہیں؟''

''اور؟'' وہ چلتے چلتے ٹھٹک گیا پھر کچھ سوچ کر اسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''اور یہ کہ..... تم بہت اچھی ہو۔''

''کتنی اچھی؟''

''اتنی اچھی کہ پچھلی رات..... میں رات بھر تمہی کو خواب میں دیکھتا رہا۔''

''ڈرے تو نہیں۔''

''ارے نہیں..... جاگا تو افسوس ہوا کہ خواب کیوں تھا۔ پتا ہے میں نے تمہیں اپنے گھر کے کچن میں کھڑے دیکھا تھا۔''

''خواب میں!'' عفیفہ مسکرائی۔

''ہاں..... سچ۔''

''میں نے تو تمہارے گھر کا راستہ بھی نہیں دیکھا۔ کچن میں کیسے پہنچ گئی؟''

''میں نے تو دیکھا ہے نا تمہیں۔ میرا تصور تمہیں میرے گھر کے کچن میں کھینچ لے گیا۔''

''مسٹر فلاسفر! تم مجھے مادام تساؤ کی سیر کرانے کے مشن پر ہو۔ وقت بھاگا جا رہا ہے۔ تمہیں برمنگھم جانے کے لیے بھی نکلنا ہے۔''

''جی تو یہ چاہتا ہے کہ ساری زندگی تمہیں سیر کرانے کے مشن پر ہی رہوں۔''

''اچھا تو پھر تمہارے اس ریسٹورنٹ کا کیا ہوگا جہاں آکر مجھے تیز مسالوں والا کھانا کھانا ہے۔''

''ہاں۔'' وہ گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''یہ تو بہت اہم بات ہے..... تو پھر آرہی ہو برمنگھم؟''

''ہوں!'' عفیفہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

''دل خوش کر دیا۔''

عفیفہ نے مسکراتے ہوئے اسے آگے بڑھنے کا اشارہ دیا۔ وہ دونوں باہر نکلے تو رافع نے کہا۔ ''میرا خیال ہے اب کہیں اور جانے سے پہلے کچھ کھا پی لیا جائے۔''

''ایک شرط پر۔'' عفیفہ بولی۔

''وہ کیا؟'' رافع ٹھٹک گیا۔

''ادائیگی میں کروں گی۔''

''خاتونِ معظم! آپ یہاں سیر و تفریح کے لیے وزیٹرز ویزا پر آئی ہیں۔ بینک سے ملا زرِمبادلہ دیکھتے ہی دیکھتے اڑ جاتا ہے۔ ویسے بھی آپ خواتین کی سیاحت بنا شاپنگ تو مکمل نہیں ہوتی۔ پیسے سنبھال کر رکھیے۔''

''مجھے پیسے سنبھال کر رکھنے کا کوئی شوق نہیں۔ جو اللہ دیتا ہے، دل کھول کر خرچ کر دیتی ہوں۔''

''شوق مجھے بھی نہیں تھا۔ پہلی بار جب اس ملک میں آیا تو جیب خالی تھی۔ ویزا لگ گیا تھا۔ گھر والوں نے فضائی سفر کے ٹکٹ کے پیسے بھی بڑی مشکل کے بعد پورے کیے تھے۔ میں گھر کے حالات سے تنگ آکر کسی بھی طرح روزگار کے لیے باہر جانا چاہتا تھا۔ قسمت کی بات، جھوٹ موٹ اپلائی کیا تو ٹچ ویزا لگ گیا۔ بینک سے زرِمبادلہ حاصل کرنے کے لیے بھی جیب میں پیسے نہیں تھے۔ چہرے مہرے اور انداز و اطوار سے ہم نسل دکھائی دیتے ایک شخص سے مدد چاہی تو اس نے نہ صرف بیس پاؤنڈ کا نوٹ دیا بلکہ اپنے ساتھ گھر لے گیا۔ کھانا کھلایا اور یہاں قیام پذیر ہونے کے لیے مختلف راستے بھی سمجھا دیے۔ آج بھی یاد ہے..... بیس پاؤنڈ نے مجھے کتنے دن سہارا دیے رکھا۔ راستے بھی ملتے چلے گئے۔ آج بہت کچھ ہے میرے پاس..... شکر کرتا ہوں رب کا.....''

''آج برمنگھم جانے کے لیے نکل رہے ہو؟'' عفیفہ نے موضوع بدل دیا۔

''ان شاء اللہ!'' رافع نے کہا پھر پوچھا۔ ''تم آؤ گی نا برمنگھم؟''

''عریشہ اور عمران بھائی نے ساتھ دیا تو ضرور۔''

''میں ان سے رابطے میں رہوں گا۔ مجبور کروں گا

www.pklibrary.com

انہیں برمنگھم آنے کے لیے۔"

"اور مجھ سے؟"

"کیا مطلب؟"

"مجھ سے رابطے میں نہیں رہو گے؟"

"سچ کہوں؟"

"سچ ہی کہو۔"

"تم سے ملنے کے بعد مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے میں تمہیں جنم جنم سے جانتا ہوں۔ میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ اس بار جب میں پاکستان سے انگلینڈ جانے کے لیے جہاز میں سفر کروں گا تو یہ سفر میرے لیے زندگی کے ایک نئے دور کا آغاز ہوگا۔ جہاز میں تمہارے ساتھ گزارے ہوئے وہ چند گھنٹے اور کل سے آج تک تمہارے ساتھ گزارا ہوا ایک ایک پل مجھے اپنی زیست کا حاصل محسوس ہوتا ہے۔ آئی لو یو عفیفہ..... آئی لو یو۔"

عفیفہ دھیرے سے مسکرائی۔ اس کی مسکراہٹ میں کرب کا تاثر تھا۔ "صرف دو دن کا ساتھ رافع..... کل ہم پہلی بار ایک دوسرے سے ملے اور آج تم اظہار محبت کر رہے ہو..... قائم اور میں تو میڈیکل کالج میں اکٹھے پڑھتے رہے..... ہاؤس جاب بھی ایک ہی اسپتال میں کی پھر شادی کے بعد اس نے اور میں نے کتنی صبحیں، کتنی شامیں اور کتنی راتیں اکٹھے بسر کیں..... ہزاروں مرتبہ اس نے بھی یہی کہا..... آئی لو یو عفیفہ..... لیکن جب نظریں بدلنے پر آیا تو ساٹھ سیکنڈز بھی نہ لگائے..... مجھے محبت پر یقین نہیں رہا ہے۔"

"لوگوں کو اتنا بے بھروسا نہ جانو۔ کبھی نہ کبھی، کہیں نہ کہیں، کسی نہ کسی پر تو اعتبار کرنا پڑے گا تمہیں۔"

"مجھے خوف آنے لگا ہے۔"

"خوف! کس سے؟"

"لوگوں پر اعتبار کرنے سے۔"

"اعتبار کیے بنا زندگی نہیں چلتی عفیفہ..... تم اور میں ایک دوسرے کے لیے یکسر اجنبی تھے۔ تم نے اعتبار ہی تو کیا نا مجھ پر جو سفر کے دوران اپنی نجی زندگی کے حالات مجھ سے شیئر کیے۔"

"وقت گزارنے کے لیے کچھ تو کرنا ہی تھا۔" پھر اس نے مزید کہا۔ "مجھے شوق نہیں لوگوں کو اپنے زخم دکھانے کا۔"

"تو گویا تم نے مجھ پر اعتبار ہی کیا نا..... اور دو دن سے جو تم میرے ساتھ وقت گزار رہی ہو، یہ اعتبار نہیں تو اور کیا ہے..... اور یہ اعتبار اوپر والے کا پیدا کردہ ہے۔"

عفیفہ لاجواب سی ہو کر اس کا منہ دیکھنے لگی۔

"ہمارا ملنا ہماری قسمت میں لکھا تھا۔" رافع بولا۔

"مجھے قسمت پر یقین نہیں رہا۔"

"کیوں؟"

"قائم بھی یہی کہا کرتا تھا کہ ہم ایک دوسرے کی قسمت میں لکھے تھے۔"

"تو اس میں غلط کیا تھا..... لکھے تھے نا تم اور وہ، ایک دوسرے کی قسمت میں..... تبھی تو ملن ہوا۔"

"ٹوٹ بھی تو گیا۔" عفیفہ کی آواز بھرا گئی۔

"تمہیں اس سے بہت محبت تھی؟"

"میرا خیال ہے تم نے مجھ سے یہ سوال پہلے بھی پوچھا تھا۔"

"شاید۔"

"شاید نہیں..... واقعی۔"

"اوکے!" اس نے توقف کیا۔ "میرے سوال کا جواب نہیں ملا مجھے۔"

"کون سا سوال؟"

"تمہیں قائم سے محبت تھی؟"

"اتنی کہ میں اس کے بغیر جینے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔" عفیفہ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

"مگر جی رہی ہو۔"

"مجبوری۔"

"یہی زندگی ہے..... ملنا، بچھڑنا..... بچھڑ کر ملنا۔"

"اب کیسے مل سکتی ہوں..... اس نے تو مجھ سے رشتہ ہی توڑ لیا۔"

"ضروری نہیں کہ وہی ہو..... کسی اور سے بھی تو مل سکتی ہو..... کسی اور سے بھی رشتہ جڑ سکتا ہے۔"

"میں نے کہا نا تم سے..... میں اعتبار کھو چکی ہوں۔"

"ڈھونڈو۔"

"کیا؟ کیا ڈھونڈوں؟" وہ حیرانی سے اس کا منہ تکنے لگی۔

"اعتبار!"

وہ ہنس دی۔ "اعتبار کوئی ڈھونڈنے والی چیز ہے بھلا؟"

"ہاں نا..... کسی پر بھروسا کرو گی تو اعتبار آجائے گا۔"

"اچھی منطق ہے۔"

"آزما کر دیکھ لو۔"

"کسے آزماؤں؟"

"مجھے!"

"احمق ہو۔"

"ہوں تو۔" وہ مسکرایا۔ "پر اتنا بھی نہیں، جتنا تم سمجھ

www.pklibrary.com

رہی ہو۔"

"اچھا، اب اٹھو۔"

"اٹھتے ہیں..... جلدی کیا ہے۔"

"تمہیں جانا بھی تو ہے۔"

"کہاں؟"

"برمنگھم۔"

"چلا جاؤں گا..... جلدی کیا ہے..... ویسے بھی برمنگھم جا کر مجھے تمہارا انتظار ہی تو کرنا ہے..... میں تمہارا انتظار کروں گا عفیفہ..... ساری زندگی انتظار کرسکتا ہوں تمہارا۔"

☆☆☆

اگلے چند دن وہ عریشہ اور عمران لندن اور اس کے مضافات کی سیر و تفریح کرتے رہے۔ برکسٹن، چیلسی، نائٹس برج، کینسنگٹن، کووینٹ گارڈن، ہمپسٹڈ، فلہیم، ویمبلے، کرسٹل پیلس..... عمران کو کھانے پینے سے زیادہ رغبت تھی، عریشہ کو شاپنگ سے اور خود عفیفہ کو حسین اور دلکش نظارے کیمرے کی آنکھ سے دیکھنے اور محفوظ کر لینے میں..... وہ تینوں دن بھر گھومتے پھرتے اور کبھی شام ڈھلے کبھی رات کو تھکے ماندے واپس لوٹتے۔

رافع اس سے فون پر رابطہ رکھے ہوئے تھا۔ دن میں ایک دو مرتبہ ہیلو ہائے کرتا اور رات کو لمبی ٹیلی فون کال۔ دونوں دن بھر کی روداد ایک دوسرے کو سناتے۔ باتوں باتوں میں قائم کا ذکر نکل آتا اور رافع نہایت دلسوزی سے اظہارِ ہمدردی کرتا۔

"میں سوچتی ہوں لوگوں کو تعلق توڑنا ہوتا ہے تو جوڑتے ہی کیوں ہیں؟" عفیفہ ملول ہو کر کہتی۔

"جہاں توقعات زیادہ ہوتی ہیں وہاں تعلق کمزور ہوتا ہے عفیفہ..... تعلق کو مضبوط رکھنے کے لیے توقعات کم سے کم ہونا چاہئیں۔" رافع سمجھاتا۔

"میں تو بس اس کی توجہ چاہتی تھی..... وہ، وہ بھی نہیں دے سکا۔ اس سے کم توقع اور کیا ہوسکتی تھی؟"

"تعلق عزیز تھا تو یہ توقع بھی نہ رکھتیں۔" رافع کہتا۔

"عورت ہوں..... اپنے شوہر کی توجہ تو ہر عورت کی چاہت ہوتی ہے۔"

"عورت کو اپنے شوہر کی وسعتِ دل کا اندازہ بھی ہونا چاہیے..... چاہت ہو تو قربانی کا حوصلہ بھی رکھنا چاہیے..... تعلق برقرار رکھنا ہو تو سمجھوتا کرنا پڑتا ہے ورنہ....."

"ورنہ؟"

"ورنہ یہی ہوتا ہے..... تعلق ٹوٹ جاتا ہے۔"

وہ چپ رہتی۔

"زندگی میں کوئی محبت آخری نہیں ہوتی عفیفہ!"

"میرے لیے تھی..... قائم میری پہلی اور آخری محبت تھا۔"

"پہلی محبت کہہ سکتی ہو، آخری مت کہو۔"

"کیوں نہ کہوں؟"

"ہوسکتا ہے کوئی نئی محبت تمہاری منتظر ہو۔"

☆☆☆

بالآخر برمنگھم جانے کا پروگرام بھی بن گیا۔ عمران کی بہن نے چاہا کہ ان کا بیٹا ان تینوں کو کار میں بہ سہولت برمنگھم لے جائے لیکن عمران کے یہ کہنے پر کہ وہاں ان کے ایک دو دن قیام کا امکان بھی تھا، عمران کے بھانجے کے ساتھ کار میں جانے کا پروگرام نہ بن سکا کیونکہ اس کی جاب کا معاملہ تھا۔ تینوں نے بذریعہ ٹرین برمنگھم جانے کا فیصلہ کیا۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے کا سفر تھا اور نہایت خوشگوار..... نہ آپا دھاپی، نہ دھکم پیل..... لوگ اخبار یا کتاب پڑھتے ہوئے یا پھر موبائل اور لیپ ٹاپ پر مصروف رہتے ہوئے سفر کرتے رہے۔ عفیفہ دورانِ سفر بہن اور بہنوئی سے باتیں کرنے کے ساتھ اردگرد بیٹھے مسافروں اور ٹرین سے باہر تیزی سے نظروں سے گزرتے مناظر کا جائزہ لیتی رہی۔

رافع انہیں ریسیو کرنے کے لیے اسٹیشن پر موجود تھا۔ اس نے نہایت تپاک سے ان کا استقبال کیا۔ اسٹیشن کے باہر اس کی کار موجود تھی۔ راستے میں اس نے انہیں کافی پلائی پھر اپنے گھر لے گیا۔ خاصا کشادہ اور پُرسہولت گھر تھا۔ اس نے مہمانوں کو ٹھہرانے کے لیے کمرے تیار کر رکھے تھے جہاں ضرورت کی ہر سہولت موجود تھی۔

"اب آپ لوگ آرام سے ہفتہ دو ہفتہ میرے پاس رہیں۔" رافع نے کہا۔

"ہفتہ دو ہفتہ؟" عمران مسکرایا۔ "دو ہفتے بعد تو ہماری واپسی ہے۔" اس نے کہا۔

"اتنی جلدی؟"

"ہالی ڈیز بس اتنی ہی ہوتی ہیں۔ ہم سب اپنی اپنی ملازمت سے ایک ایک ماہ کی رخصت پر ہیں۔ ابھی صرف لندن گھومے ہیں۔ میں اور میری بیوی تو خیر پہلے بھی آتے رہے ہیں، عفیفہ پہلی بار آئی ہیں۔ کم وقت میں انہیں انگلینڈ کی زیادہ سے زیادہ سیر کرانا ہے تاکہ یہ واپس جا کر یہ نہ کہیں کہ گھومنے پھرنے گئے تھے، دیکھا کیا..... ہماری بیگم کو تو یہاں کاسمیٹکس، جوتوں اور گرم کپڑوں کی خریداری ہی سے فرصت نہیں۔"

www.pklibrary.com

''اپنی بھی تو سنائیں۔ برک لین کے تو ساؤتھ ایسٹین کھانوں پر ٹوٹ پڑے۔'' عریشہ بولی۔

''عمران صاحب! ہم آپ کو اپنے ریسٹورنٹ کا کھانا کھلائیں گے۔ کھانے کا وقت ہو رہا ہے، کھانا گھر پر منگوالوں یا ریسٹورنٹ چلیں گے؟'' رافع نے پوچھا۔

''خواتین سے پوچھیے۔''

رافع نے عریشہ اور عفیفہ کی طرف دیکھا۔

''ظاہر ہے ریسٹورنٹ میں..... باہر ذرا تفریح بھی ہو جائے گی۔'' عریشہ نے کہا۔

''تفریح کے لیے یہاں بہت کچھ ہے عریشہ بہن!'' رافع نے توقف کیا پھر کہا۔ ''لندن کے بعد برمنگھم اس ملک کا دوسرا بڑا شہر ہے اور یہاں کی دیرینہ ثقافت کا امین ہے۔ انگلینڈ کی صنعت و تجارت میں برمنگھم کا بہت اہم کردار ہے۔ سیر و سیاحت کے لیے آنے والوں کو یہاں بہت کچھ دیکھنے کو ملتا ہے۔ دیکھنے والی آنکھوں کے لیے سرسبز مناظر سے لے کر باذوق سامعین کی سماعت کو گرمانے والی موسیقی تک اور خریداری کا شوق رکھنے والوں کے لیے کھوے سے کھوا چھلتے شاپنگ سینٹرز سے لے کر انواع و اقسام کے کھانوں تک..... کیڈبری چاکلیٹ کا آغاز برمنگھم ہی سے ہوا تھا۔ جان کیڈبری نامی شخص نے چائے، کافی اور چاکلیٹ ڈرنک سڑکوں پر بیچتے ہوئے کیڈبری کمپنی کی شروعات کی اور آج کیڈبری چاکلیٹ کی دنیا بھر میں شہرت ہے۔''

''رافع! تم ہمیں کھانا کھلانے کے لیے لے جا رہے تھے؟'' عفیفہ نے مسکراتے ہوئے رافع کو گویا یاد دہانی کرائی۔

''اوہ، سوری!'' وہ جھینپ گیا۔ ''چلیں۔''

عفیفہ کا خیال تھا کہ رافع کا ریسٹورنٹ ڈھابا نما کوئی چھوٹا سا ریسٹورنٹ ہوگا مگر ایسا نہیں تھا۔ وہ نہایت شاندار ریسٹورنٹ تھا جہاں ڈیلیوری، ٹیک اوے اور ڈائننگ ان کی سہولت موجود تھی۔ ڈائننگ ہال میں دو تین میزوں کے علاوہ تمام میزوں کے گرد لوگ بیٹھے یا تو کھانا کھا رہے تھے یا کھانا میز پر آنے کے منتظر تھے۔ رافع کو دیکھتے ہی ریسٹورنٹ کا عملہ چوکنا ہو گیا۔ رافع نے اپنے مہمانوں کو بٹھایا اور میز پر موجود مینیو کتابچہ ان کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔ ''حکم کیجیے..... کیا لینا پسند کریں گے؟ میں حاضر ہوتا ہوں۔''

رافع واپس آیا تو منیجر اور ایک ویٹر بھی اس کے ہمراہ تھے۔

''پالٹی۔'' عمران نے بلا تکلف اپنی پسند کا اظہار کیا۔

''ٹھٹی دال، رائس اور تلی مرچیں۔'' عفیفہ بولی۔

''میں تو ڈائٹ پر ہوں..... صرف سلاد۔'' عریشہ نے کہا۔

''جب تک یہاں ہیں، ڈائٹنگ چھوڑ دیجیے۔'' رافع مسکرایا۔

''چلیے تو پھر عمران کے ساتھ شیئر کرلوں گی۔''

''نہیں بھئی اپنا اپنا۔'' عمران نے ہری جھنڈی دکھائی۔

''تو پھر گرم نان اور سالن کوئی سا بھی۔''

رافع نے ویٹر کو اشارہ دیا۔ وہ تیزی سے پلٹا اور ذرا سی دیر میں کھانا میز پر آ گیا۔ تازہ، گرما گرم اور لذیذ کھانے نے خوب لطف دیا۔ ایک ویٹر تمام وقت ان کی خدمت کو مستعد رہا۔

☆☆☆

عفیفہ اور اس کے بہن بہنوئی صرف ایک رات رافع کے گھر میں قیام کی نیت سے برمنگھم آئے تھے مگر رافع نے انہیں چار دن اور تین راتیں اپنا مہمان رکھا۔ شہر کے طول و عرض میں انہیں خوب سیر کرائی۔ ایک رات انہیں میوزک کنسرٹ میں لے گیا پھر تھیٹر بھی لے گیا۔ کھانے کے لیے انہیں محض اپنے ریسٹورنٹ ہی کا کھانا نہیں کھلایا بلکہ دوسری جگہوں پر بھی کھانا کھلایا۔ ان کے ہزار تردد اور انکار کے باوجود اصرار کر کے ان کی پسند سے ان کے لیے تحائف خریدے۔ ان کی مہمانداری میں اس نے کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ ان کی واپسی پر اس نے انہیں ٹرین سے نہ جانے دیا بلکہ خود انہیں اپنی کار میں لے جانا چاہا مگر عمران نے کہا۔

''آپ ہمیں شرمندہ نہ کیجیے..... ہم ایک دن کے ارادے سے آئے تھے مگر آپ نے ہماری خاطر چار دن سے اپنے ریسٹورنٹ کو بھی چھوڑ رکھا ہے..... آپ کا خلوص ہمیشہ یاد رہے گا..... پاکستان آئیں تو ہمیں میزبانی کا شرف بخشیے گا۔ اب آپ ہمیں خود لندن چھوڑ کر آنے پر اصرار نہ کریں، ہمیں خود جانے دیں۔''

''اچھا تو پھر ایک شرط پر۔''

''وہ کیا؟''

''آپ ٹیکسی سے جائیں گے اور ادائیگی میں کروں گا۔''

''آپ کی شرط کا پہلا حصہ قبول ہے مگر اس سے آگے معذرت۔''

''مان لیں..... مجھے خوشی ہوگی۔''

''مان لیا۔'' عفیفہ بولی۔

''تھینک یو..... تھینک یو سو مچ۔'' رافع نے عفیفہ کو ممنونیت سے دیکھا۔

ٹیکسی کا بندوبست رافع نے خود کیا۔

لندن واپسی کے سفر کے دوران عمران نے شگفتہ لہجے

www.pklibrary.com

میں عفیفہ سے کہا۔ ''عفیفہ! تم نے تو کمال ہی کر دیا۔''

''کیا عمران بھائی؟''

''جہاز میں ایسے اچھے آدمی سے دوستی کر لی۔''

''محض اتفاق تھا عمران بھائی.....! میں نے غلط فہمی میں اس کی سیٹ کا ریموٹ دبا کر چلتی مووی روک دی تھی۔''

''خوب اتفاق تھا۔'' عمران کے لہجے میں معنی خیزی تھی۔

''مجھے تو وہ پوری طرح عفیفہ میں انٹرسٹڈ لگتا ہے عمران۔'' عریشہ بولی۔

''کیا آدھی طرح بھی انٹرسٹڈ ہوتا ہے کوئی؟'' عمران کو مذاق سوجھا۔

''تم تھے نا..... آج تک آدھی طرح ہی انٹرسٹڈ ہو۔'' عریشہ نے عمران کو مسکراتے ہوئے دیکھا۔

''یار! آدھی طرح انٹرسٹڈ ہونے میں تو اتنا فرمانبردار شوہر ہوں، پوری طرح انٹرسٹڈ ہوتا تو جان ہی سے جاتا۔'' عمران نے اپنی ہی بات پر زور سے قہقہہ لگایا۔ گورا ٹیکسی ڈرائیور چونک کر اپنے سامنے لگے آئینے میں عمران کا عکس کچھ حیرانی سے دیکھنے لگا پھر خود بھی دھیرے سے مسکرایا۔

☆☆☆

رات کو رافع نے عفیفہ کو فون کر کے اس کا شکریہ ادا کیا۔

''شکریہ کس بات کا؟''

''برمنگھم آنے اور میرے غریب خانے کو رونق بخشنے کا۔''

''تمہارا شکریہ رافع کہ تم نے ہمیں اتنی عزت دی، اتنا وقت دیا۔''

''ایک بات کہوں؟''

''کہو۔''

''میں تمہیں بری طرح مس کر رہا ہوں۔ میں تمہیں پروپوز کرنا چاہتا ہوں۔''

عفیفہ اب زور سے ہنسی۔

''کیوں؟ اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟''

''میں طلاق یافتہ ہوں رافع!''

''تو کیا ہوا..... وہ تو میں بھی ہوں..... تمہیں قائم نے دغا دی..... مجھ سے میری بیوی نے وفا نہیں کی..... ہم دونوں زخم کھائے ہوئے ہیں۔''

''ہاں تو ایک کو تو ایسا ہونا چاہیے جو دوسرے کے زخم کا مرہم بن سکے..... اگر دونوں ہی زخم خوردہ ہوں تو کون کس کا مرہم بنے گا؟''

''میں..... میں عفیفہ..... میں تمہارے زخم کا مرہم بنوں گا۔''

''رافع! ہم طویل فاصلے پر رہنے والے دوست تو بن سکتے ہیں..... زندگی کے رشتے میں نہیں جڑ سکتے۔''

''کیوں؟ کیوں نہیں جڑ سکتے؟'' رافع کے لہجے میں بے تابی تھی۔

''کیونکہ تم یہاں رہتے ہو..... میں ہزاروں میل دور..... وہاں میرا گھر ہے، میری بہن ہے..... اور رشتے دار ہیں۔''

''تو کیا ہوا؟ شادی کے بعد ان گنت عورتیں اپنے ماں باپ، بہن بھائیوں اور رشتے داروں سے اور اپنے وطن سے دور دنیا کے دور دراز ملکوں میں رہ رہی ہیں۔'' رافع بولا۔

''وہاں میری جاب ہے رافع!''

''جاب کی تمہیں ضرورت ہی نہیں ہوگی۔ میرے پاس خدا کا دیا سب کچھ ہے۔''

''میں پیسے سے زیادہ انسانوں کی خدمت کے لیے جاب کر رہی ہوں۔''

''وہ تم یہاں بھی کر سکتی ہو۔''

''اپنے لوگوں، اپنے وطن کو چھوڑنے کا تصور بھی مشکل ہے میرے لیے۔''

''مجھے مایوس مت کرو عفیفہ! میں بہت محبت اور خلوص سے تمہیں پروپوز کر رہا ہوں..... وقت کم ہے..... میں تمہاری واپسی سے پہلے تمہاری بہن اور بہنوئی سے بات کرنا چاہتا ہوں۔''

''ایسی غلطی بھی مت کرنا۔ اہم فیصلے عجلت میں کرنا عقلمندی نہیں ہوتی۔'' عفیفہ نے کہا۔

''مجھے عقلمندی تم ہی سمجھاؤ۔''

''وقت کو گزرنے دو..... ہو سکتا ہے چند دن گزرنے کے بعد تمہیں خود ہی احساس ہو جائے کہ تم اپنی زندگی کا اہم ترین فیصلہ کتنا غلط کرنے جا رہے تھے۔''

''ایسا نہیں ہوگا۔ میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں۔ تم میرے گھر سے گئی ہو تو مجھے اپنا گھر ویران لگ رہا ہے..... آئی لو یو عفیفہ..... کیا تمہارے دل میں میرے لیے کوئی فیلنگ نہیں۔''

''قائم کے بعد میں کسی اور مرد کا تصور بھی نہیں کرنا چاہتی رافع!''

''قائم تمہاری زندگی سے نکل چکا ہے۔''

''مشکل تو یہی ہے کہ وہ میری زندگی سے نکل کر بھی سائے کی طرح میری زندگی میں ہے۔''

www.pklibrary.com

''اس سائے سے اپنا پیچھا چھڑالو۔''

''میں تمہیں کوئی آس نہیں دینا چاہتی۔ سفر سے گھر واپس لوٹ کر میں تمہارے پروپوزل پر غور کرنے کی کوشش کروں گی۔''

''میرے لیے اتنی آس بھی کافی ہے۔ تمہارے مثبت جواب کا انتظار کروں گا۔'' رافع نے کہا۔

''اور ہاں سنو..... ایک ریکویسٹ ہے تم سے..... میرا جواب اگر نفی میں ہی رہے تو یہ نہ سوچنا کہ میں کوئی فلرٹ تھی جس نے محض وقت گزاری کے لیے تم سے دوستی گانٹھی اور اپنا مطلب نکال کر چلتی بنی۔'' عفیفہ کا لہجہ معذرت خواہانہ تھا۔

''نہیں، نہیں عفیفہ.....! میں ایسا کبھی نہیں سوچوں گا۔ پردیس میں زندگی گزارنے کا ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ بندے کو دوسرے بندے کی پہچان کا سلیقہ آجاتا ہے۔ تم ایک اچھی، نیک دل اور وفا پرست عورت ہو ورنہ قائم کو اب تک کیوں یاد رکھتیں..... کاش! کبھی اس سے ملاقات ہو تو اس سے کہوں..... تم لوزر ہو..... تم نے محبت کرنے والی عورت کو کھو دیا..... بہرحال، عفیفہ! میں تمہاری طرف سے مثبت جواب کا منتظر رہوں گا۔ وعدہ کرو کہ مایوس نہیں کرو گی۔''

''آئی ایم سوری رافع! میں تم سے کوئی وعدہ نہیں کرنا چاہتی۔''

''تمہاری اسی شفافیت نے تو میرا دل پکڑ لیا ہے عفیفہ.....! مرد جب عورت کو چھوڑتا ہے تو عورت سارا ملبا اسی پر ڈالنے کی کوشش کرتی ہے۔ ہزار ہا عیب لگاتی ہے اسے..... اور مرد بھی عورت کے لیے ایسا ہی کرتا ہے..... لیکن ہم نے جتنا وقت اکٹھے گزارا، میں نے قائم کے بارے میں تمہیں کچھ ایسا ویسا کہتے نہیں سنا..... یہ تمہاری شفافیت ہے۔''

''محبت کچھ نہیں دیکھتی رافع!''

''محبت کو اتنا اندھا بھی نہیں ہونا چاہیے۔''

''بہرحال.....!'' عفیفہ اتنا ہی کہہ سکی۔

''تمہارے جانے سے پہلے میں تم سے پھر ملنے کے لیے آؤں گا۔ اگر تمہارے پاس وقت ہوا اور تمہارے سفری دستاویزات نے اجازت دی تو میں تمہیں چینل ٹنل سے فیری میں فرانس لے جانے کی کوشش کروں گا۔ چلو گی نا؟''

''عریشہ اور عمران بھائی کا ارادہ بھی تھا مگر بدقسمتی سے میرے پاسپورٹ پر سنگل انٹری ویزا کی مہر لگی ہوئی ہے۔''

''اوہ!'' اس نے تاسف کا اظہار کیا پھر بولا۔ ''کوئی بات نہیں پھر کبھی سہی۔ دوبارہ تو آؤ گی؟''

''بار بار آؤں گی رافع! انگلینڈ مجھے اچھا لگا ہے۔ گھومنے پھرنے اور نئی نئی جگہیں دیکھنے کا مجھے بہت شوق ہے۔ سوچا کرتی تھی..... شادی کے بعد قائم کے ساتھ ساری دنیا گھوموں گی مگر.....''

''قائم کا پیچھا چھوڑ دو عفیفہ..... میں اور تم مل کر دنیا گھوم سکتے ہیں۔'' رافع بولا۔

''کس حیثیت میں؟''

''حیثیت دینا تمہارے اختیار میں ہے۔ میں نے دست سوال دراز کیا ہے تمہاری طرف..... دباؤ ڈالنے کا مجھے اختیار نہیں..... مرد اور عورت کے درمیان زندگی اکٹھے گزارنے کا رشتہ کسی جبر، دباؤ، مجبوری یا مصلحت کے بغیر جڑنا چاہیے۔ البتہ دوستی کا رشتہ کسی ضرورت کے تحت بھی قائم کیا جاسکتا ہے..... گھومنے پھرنے کا شوق تمہیں بھی ہے، مجھے بھی..... ہم دونوں دوستوں کی حیثیت سے دنیا گھوم پھر سکتے ہیں۔ میں سال بھر کے دوران کم سے کم تین چار مرتبہ مختصر دورانیے ہی کے لیے سہی، انگلینڈ سے باہر کسی دوسرے ملک کی سیر و تفریح کے لیے ضرور جاتا ہوں۔ تم اگر پسند کرو گی تو ہم اکٹھے پروگرام بنا سکتے ہیں۔''

''دیکھوں گی رافع! پاکستان میں رہ رہی ہوں جہاں عورت، بالخصوص اکیلی عورت کو بہت سی پابندیوں کا سامنا رہتا ہے۔ منہ اٹھا کر کسی اجنبی مرد کے ساتھ کسی دوسرے ملک نکل لینا آسان نہیں ہوتا۔ عریشہ اور عمران بھائی نے ساتھ دیا تو شاید ہم اکٹھے سیاحت کر سکیں۔''

''میری بات مان کر تم ان پابندیوں سے آزاد ہو سکتی ہو پھر ہم دونوں اکٹھے دنیا گھومیں گے۔ سفر کے دوران ایک دوسرے کا ریموٹ غلط استعمال کیے بغیر۔'' وہ بولا۔

''تم اب تک میری وہ غلطی بھولے نہیں۔''

''تمہاری وہی غلطی تو ہماری آشنائی کا سبب بنی۔ اسے میں کیسے بھول سکتا ہوں۔''

''میں اب بھی اپنی اس حماقت کو یاد کر کے شرمندہ ہو جاتی ہوں۔ ذرا سوچو تو ایک کنسلٹنٹ ڈاکٹر اور اسے یہ معلوم نہیں کہ اس کے ہاتھ میں جو ریموٹ ہے وہ اس کا نہیں، ساتھ بیٹھے دوسرے مسافر کا ہے۔''

''کاش! ہم بار بار اکٹھے سفر کریں اور تم یہ خوب صورت غلطی بار بار دہراؤ۔'' رافع بولا۔

☆☆☆

ان کی پاکستان واپسی سے قبل رافع اس کے اور عریشہ و عمران کے لیے علیحدہ علیحدہ کیڈبری چاکلیٹ کے

www.pklibrary.com

ڈبے لے کر حسب وعدہ عفیفہ سے ملنے کے لیے آیا۔

''رافع! تم نے اتنی ساری چاکلیٹ پہلے دے تو دی تھی۔'' عفیفہ بولی۔

''وہ یہاں کھانے کے لیے تھی، یہ سوغات ہے پاکستان لے جانے کے لیے۔'' اس نے کہا۔

دن بھر وہ اس کے ساتھ رہا۔ لمبی ڈرائیو، نئی جگہیں، کھانا پینا، ڈھیروں باتیں اور مستقبل کے ارادے۔ اس نے عفیفہ کے ہزار انکار کے باوجود اسے کلائی پر باندھنے والی ایک بیش قیمت گھڑی بھی خرید کر دی۔

''کیوں فضول خرچی کر رہے ہو؟'' عفیفہ نے کہا۔

''یہ فضول خرچی نہیں..... تمہاری یادوں میں رہنے کی تدبیر ہے۔'' وہ مسکرایا۔

''تم ویسے بھی مجھے یاد رہو گے۔''

''میں تمہارے سامنے اپنا دل ہار کر تمہارے قدموں میں بیٹھ گیا ہوں۔ تمہارے قصیدے پڑھ رہا ہوں مگر..... تم نے میرے بارے میں کبھی ایک جملہ بھی ایسا نہیں کہا جو میری امید بندھائے رہے۔''

''تم بہت اچھے آدمی ہو۔'' عفیفہ بولی۔

''بس؟''

''اور کیا کہوں؟''

''مت کہو..... میں انتظار کروں گا۔'' اس کا لہجہ ذومعنی تھا۔

جس دن وہ عریشہ اور عمران کے ساتھ پاکستان واپس جانے کے لیے بیتھرو سے روانہ ہو رہی تھی، رافع خدا حافظ کہنے کے لیے غیر متوقع طور پر ائرپورٹ پر موجود تھا۔

''عمران صاحب! دوبارہ کب آ رہے ہیں؟'' رافع نے عمران سے پوچھا۔

''یار! میرا اور عریشہ کا یہاں تو میری بہن کی وجہ سے آنا جانا ہو ہی جاتا ہے۔ کل رات یہ دونوں بہنیں کہیں اور کا پروگرام بنا رہی تھیں۔''

''بہت عمدہ!'' رافع نے عفیفہ کو معنی خیز نگاہوں سے دیکھا۔

''شاید جلد ہی ہم تینوں کا ترکی کا پروگرام بن جائے۔'' عریشہ بولی۔

''اپنے گروپ میں اس خاکسار کو بھی شامل رکھیے گا۔'' رافع نے کہا۔

''مذاق کر رہے ہو یا سچ مچ؟'' عریشہ نے رافع کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''سو فیصد سچ مچ۔''

''یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ چار کا ٹولا ہو گا تو کورم پورا رہے گا۔ ہمیں عفیفہ کو اپنے پروں میں لے کر چلنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔'' عریشہ مسکرائی۔

جہاز میں ان تینوں کو پہلو بہ پہلو تین نشستیں مل گئیں۔ عریشہ درمیان میں تھی، دائیں جانب عفیفہ اور بائیں جانب عمران۔

''میرا ریموٹ نہ اٹھا لینا کہیں۔'' عریشہ نے مذاقاً عفیفہ سے کہا۔

''کیا حماقت ہوئی تھی مجھ سے۔'' عفیفہ جھینپ گئی۔

''حماقت یا ہزاروں فٹ کی بلندی پر ایک لو اسٹوری کا اوپننگ سین۔'' عریشہ نے اپنا منہ اس کے کان کے نزدیک کر کے سرگوشی کی۔

''کیا مطلب؟'' عفیفہ نے اپنے سر کو جھٹکا دیا۔

''اب بھی مطلب بتانے کی ضرورت ہے؟'' عریشہ نے پھر سرگوشی کی۔ ''جہاز سے اترنے کے بعد وہ اسی شام تمہیں گھمانے پھرانے کے لیے اپنی گاڑی لے کر آ گیا۔ دو دن تمہارا شوفر بنا رہا..... تمہارے ساتھ ہمیں بھی برمنگھم بلایا..... اپنے گھر میں ٹھہرایا..... ہماری خاطر تواضع کی..... گھمایا پھرایا..... تحائف دیے..... پھر تم سے ملنے لندن آیا اور آج ائرپورٹ پر موجود..... کوئی آدمی یہ سب کچھ بیکار میں تو نہیں کرتا..... کچھ نہ کچھ مطلب ہوتا ہے اس کا..... اس نے تم سے کچھ کہا؟''

عفیفہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

''کیا؟'' عریشہ چونکی۔

''وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔''

''ریلی؟''

''ہاں۔''

''بڑی خبر ہے..... عمران کو بتاؤں؟''

''نہیں۔''

''کیوں؟''

''کیونکہ میں تیار نہیں ہوں۔''

''وجہ؟'' عریشہ کا منہ لٹک گیا۔

''وہ یہاں سیٹلڈ ہے۔ اس کا گھر ہے، بزنس ہے۔ اس کا بیٹا کبھی نہ کبھی تو اس سے ملنے کے لیے آ ہی سکتا ہے..... رافع باپ ہے اس کا..... اس نے پردیس میں جدوجہد سے اپنا کچھ مقام بنایا ہے..... اسے اس ملک کو چھوڑ کر پاکستان میں نئے سرے سے جدوجہد کرنے کو تو نہیں کہا جا سکتا۔''

''اسے انگلینڈ چھوڑنے کو کون کہے گا۔ تم آ سکتی ہو

www.pklibrary.com

انگلینڈ۔"

"میری جاب ہے..... سینئر پوزیشن ہے..... دوست اور رشتے دار ہیں..... سب سے بڑھ کر تم ہو وہاں..... میرے دکھ سکھ کی ساتھی..... پردیس میں میرا کون ہوگا؟" عفیفہ بولی۔

"وہ ہوگا نا۔"

"قائم بھی تو تھا۔" عفیفہ نے دل گرفتگی سے کہا۔

"سارے انسان ایک جیسے نہیں ہوتے۔"

"سب مٹی ہی کے بنے ہیں عریشہ!"

"مگر مٹی، مٹی میں فرق ہوتا ہے۔ کہیں پتھریلی، کہیں ریتیلی، کہیں چکنی۔"

"آدم کا خمیر ایک ہی مٹی سے اٹھا ہے..... سڑے، کھنکھناتے گارے سے۔"

عمران نے عریشہ کو ٹھوکا دے کر اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی۔ "تم دونوں بہنیں بھول گئی ہو کیا کہ میں بھی تمہارے ساتھ ہوں؟"

"اطمینان رکھیں۔" عریشہ نے سر گھما کر مسکراتے ہوئے عمران کو دیکھا۔ "ہم دونوں بہنیں آپ کے خلاف کوئی سازش نہیں کر رہیں۔"

جہاز فضا میں تھا۔ کھڑکیوں کے نزدیک بیٹھے بعض مسافروں نے سلائیڈنگ پٹ کھول دیے تھے۔

☆☆☆

عفیفہ کی پاکستان واپسی کے بعد بھی رافع نے اس سے اپنا رابطہ برقرار رکھا۔

"آئی مس یو عفیفہ!" وہ اکثر کہتا۔

جواباً عفیفہ ایسی کوئی بات نہ کہہ پاتی۔ اول تو پاکستان واپسی کے بعد وہ پہلے کی طرح اپنے پیشہ ورانہ اور ذاتی نوعیت کے روزمرہ معمولات میں بری طرح مصروف ہو چکی تھی۔ صبح اسپتال، سہ پہر کو کچھ وقت کے لیے گھر واپسی، شام سے رات تک نجی کلینک میں پریکٹس۔ رات کو گھر واپسی کے بعد بھی کسی مریض، دوست یا رشتے دار کا فون آجاتا یا بنفسِ نفیس اس کا انتظار کیا جا رہا ہوتا۔ رافع کو بھی اس کی مصروفیات کا بخوبی علم ہو چکا تھا اس لیے یا تو رات کو دیر سے فون کرتا یا چھٹی والے دن۔ چھٹی کے دن بھی اسے فرصت تھوڑی ہوتی۔ ڈھیروں کام انجام دہی کے منتظر ہوتے۔ کبھی کسی رشتے دار کے ہاں خوشی، غمی میں شرکت لازم ہوتی۔ ڈھیروں مصروفیات میں رافع کو مس کرنے کا وقت کہاں تھا اس کے پاس۔ دوسری بات یہ کہ رافع کے لیے اب تک اس کے دل میں کوئی ایسا جذبہ جڑ نہ پکڑ سکا تھا جسے وہ انسیت، احساسِ وابستگی یا محبت قرار دے سکتی۔

عریشہ اکثر اس سے رافع کے بارے میں پوچھتی رہتی اور اسے رافع کی جانب مائل کرنے کی کوشش کرتی۔

"تم وقت ضائع کر رہی ہو عفیفہ.....! وہ آخر کب تک تمہارے جواب کا انتظار کرے گا؟"

"دیکھتی تو ہو کتنی مصروف رہتی ہوں۔"

"تمہاری ساری مصروفیت ایک طرف اور تمہارا دوبارہ نارمل زندگی کی طرف لوٹنا دوسری جانب..... پلہ تمہاری مصروفیت کا نہیں، دوسرا بھاری ہے۔ کب تک تنہا رہو گی؟ قائم سے علیحدگی ہوئے پانچ سال گزر چکے ہیں..... اب تک تو تمہارے دو تین بچے بھی ہو جانے چاہیے تھے۔"

"بچے قسمت سے ملتے ہیں عریشہ!" اگلے ہی لمحے

خوش اخلاقی

جس طرح ریت میں قطرے جذب ہو جاتے ہیں اور ان کا احساس بھی باقی نہیں رہتا، اسی طرح ہمارے چند جملے کسی کے دل میں نشتر بن کر اتر سکتے ہیں اور دوسروں کے دل میں دکھ کا احساس پیدا کر سکتے ہیں۔ اس لیے جب بھی کسی سے بات کرو تو یہ سوچ کر زبان سے الفاظ نکالو کہ جس طرح پانی کے چند قطرے ریت سے نہیں نکالے جا سکتے، اسی طرح ایک دفعہ منہ سے نکلی ہوئی بات کا اثر بھی دل سے دوبارہ نہیں نکالا جا سکتا۔ چنانچہ ہمیں کوئی بھی بات کرنے سے پہلے ضرور غور کرنا چاہیے۔ یاد رکھیے! الفاظ ہی سب کچھ ہوتے ہیں۔ دل جیت بھی لیتے ہیں اور دل چیر بھی دیتے ہیں۔

(مرسلہ: محمد انور ندیم، حویلی لکھا، اوکاڑہ)

لاٹری

شوہر بیوی سے کہتا ہے۔ "فرض کرو تمہاری ایک کروڑ کی لاٹری لگ جائے اور اسی دن مجھے کوئی اغوا کر لے اور تم سے ایک کروڑ تاوان مانگ لے تو تم کیا کرو گی؟"

بیوی مسکراتے ہوئے بولی۔ "ناممکن، ایک دن میں دو دو لاٹریاں لگ ہی نہیں سکتیں۔"

(مرسلہ: وزیر محمد خان، بغل ہزارہ)

www.pklibrary.com

عفیفہ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ عریشہ بھی تو اس سے پہلے شادی شدہ ہونے کے باوجود ہنوز بے اولاد تھی۔ اس کی یہ بات وہ اپنے دل پر بھی تو لے سکتی تھی۔ ''سوری عریشہ!'' اس نے کہا۔

''تم ٹھیک کہتی ہو۔'' عریشہ نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ''بچے واقعی قسمت سے ملتے ہیں..... خیر! تمہیں سوچنا چاہیے۔ دیکھو نا میں اور عمران اولاد سے محرومی کے باوجود کتنی اچھی زندگی گزار رہے ہیں۔ دونوں کام کرتے ہیں، گھومتے پھرتے ہیں..... سال میں ایک آدھ بار ملک سے باہر بھی کہیں جاتے ہیں..... تازہ دم ہو کر لوٹتے ہیں۔''

''ترکی کا پروگرام کب بن رہا ہے؟'' عفیفہ نے موضوع بدلنے کی کوشش کی۔

''اس کا مطلب ہے تم جلد اس سے ملنا چاہتی ہو؟''

''سنا ہے کسی شخص کو پرکھنا ہو تو اس کے ساتھ سفر کیا جائے..... آزما لینے میں کیا حرج ہے؟''

''گڈ! مثبت اشارہ ہے۔'' عریشہ خوش ہو کر بولی۔

☆☆☆

عریشہ، عمران اور عفیفہ پاکستان سے ترکی گئے اور رافع برطانیہ سے وہاں پہنچا۔

''سفر کے دوران کسی نے غلطی سے تمہارا ریموٹ تو نہیں لے لیا تھا؟'' عفیفہ نے ہنس کر رافع سے پوچھا۔

''میں کسی کو ہاتھ بھی نہ لگانے دیتا..... اس حسین غلطی کو میں صرف تمہارے نام محفوظ رکھنا چاہتا ہوں۔''

''ریسٹورنٹ کیسا چل رہا ہے؟''

''الحمدللہ! دوڑ رہا ہے..... تمہاری جاب؟''

''فٹ ہے۔''

''تم نے کیا سوچا؟''

''کس بارے میں؟''

''میرے بارے میں۔''

''فرصت ہی نہیں ملی۔''

''میں انتظار کروں گا۔'' اس نے کہا۔

ترکی کے تاریخی و تہذیبی ورثے، دلکش ساحلی مقامات، اشتہا انگیز کھانے، ترکش کافی اور آئس کریم، لائیو میوزک اور زندگی سے بھرپور مناظر نے ان چاروں کو امروز میں مسحور اور فگار فردا سے بے نیاز رکھا۔ کبھی وہ چاروں اکٹھے ہوتے کبھی دو دو کے ٹولے میں بٹے..... عریشہ اور عمران ایک ساتھی..... عفیفہ اور رافع ایک دوسرے کے ساتھ..... رافع اس سے اپنے دل کی ہر بات شیئر کر رہا تھا۔

''کیوں صبر آزما رہی ہو بے چارے کا؟'' عریشہ نے عفیفہ سے کہا۔ ''تمہاری خاطر وہ اتنی دور چلا آیا ہے۔ کیا ضرورت تھی اسے اپنا بزنس چھوڑ کر ترکی آنے کی جبکہ وہ پہلے بھی دو مرتبہ ترکی گھوم چکا ہے۔ صرف تمہارے لیے آیا ہے وہ یہاں..... اسے ہاں کہہ دو۔''

''ابھی نہیں عریشہ!''

''تو پھر کب؟''

''مجھے دیکھنے دو کہ وہ کتنی دور اور کتنی دیر میرے ساتھ چل سکتا ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''میں وہ غلطی نہیں دہراؤں گی جو میں نے قائم کے بارے میں کی تھی..... اس نے کہا شادی کرو گی مجھ سے اور میں نے ہاں کرنے میں دیر نہیں لگائی۔''

''قائم کا اور تمہارا ساتھ تو بہت پرانا تھا۔''

''میڈیکل کالج میں اس کا اور میرا تعلق دوستی کا تھا بس! شادی کے لیے ہاں کرنے سے پہلے مجھے دیکھنا چاہیے تھا کہ وہ میرے ساتھ کتنا مخلص ہے..... وہ اگر مخلص ہوتا تو چھوٹی سی بات کو ایشو بنا کر میری زندگی یوں برباد نہ کرتا۔''

''رافع تو مخلص لگتا ہے۔''

''لگتا تو ہے۔''

''بہرحال، میری خواہش ہے کہ تم یہ موقع نہ کھوؤ۔''

''خدا پر یقین ہے تمہیں؟'' عفیفہ نے بہن کو گہری نظروں سے دیکھا۔

''کسے نہیں عفیفہ..... ! خدا پر یقین کرنے پر تو وہ بھی مجبور ہیں جن کا کوئی دین مذہب نہیں۔''

''تو یقین رکھو کہ اگر خدا کو منظور ہے تو میں یہ موقع کھونا بھی چاہوں گی تو نہ کھو سکوں گی۔''

''آئی وش یو آل دی بیسٹ عفیفہ!''

''تھینک یو۔'' عفیفہ فرطِ جذبات سے عریشہ سے لپٹ گئی۔

ترکی سے اپنی اپنی منزل کی طرف روانگی سے قبل رافع نے اس سے کہا۔ ''میں تمہیں بہت مس کروں گا۔'' وہ ڈیپارچر لاؤنج میں تھے۔

''میں کیا کر سکتی ہوں۔'' وہ دھیرے سے مسکرائی۔

''ہاں کر دو..... پلیز!'' وہ گڑگڑایا۔ ''تم سے دور مجھے کچھ اچھا نہیں لگتا۔''

''مین ایجرز کی طرح ایکٹ مت کرو۔'' عفیفہ کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

www.pklibrary.com

''یہ میرے دل کی آواز ہے عفیفہ..... جس ملک میں رہتا ہوں وہاں ایسی عورتوں کی کمی نہیں جو مرد کے ایک اشارے پر مرمٹنے کو تیار رہتی ہیں مگر..... یقین کرو، جب سے تم سے ملا ہوں، میں ہر عورت میں تمہارا ہی عکس دیکھنے کی کوشش کرتا ہوں جو مجھے ڈھونڈے نہیں ملتا۔''

''اچھا..... فی الحال تو تم جاؤ..... ایسا نہ ہو کہ جہاز نکل جائے۔''

''نکل جائے..... مجھے پروا نہیں۔''

''ارے ارے! اتنی دیوانگی بھی اچھی نہیں۔''

''آئی لو یو عفیفہ!''

''جاؤ۔'' عفیفہ نے اسے آنکھیں دکھائیں۔

''بہت ظالم ہو..... کچھ تو کہو۔''

''بائے!'' عفیفہ نے مسکراتے ہوئے اپنے ہاتھ کی انگلیاں نچائیں۔ ''خدا کرے تمہارے ساتھ بیٹھی ہمسفر تمہاری سیٹ کا ریموٹ دبا دے۔''

''یہ حرکت دنیا میں صرف ایک ہی عورت کر سکتی تھی اور وہ تم ہو۔'' رافع اسے محبت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

رافع کی فلائٹ سے ہیتھرو جانے والے مسافروں کی بورڈنگ کا اعلان کیا جا رہا تھا۔

☆☆☆

ترکی سے واپس ہونے کے بعد بھی عفیفہ سے اس کے رابطے میں کوئی کمی نہ آئی۔ راتوں کو لمبی ٹیلی فون کالز اور عفیفہ سے رشتۂ زندگی جوڑنے کے لیے اس کا اصرار بدستور رہا۔

''تم جو چاہو گی میں وہی کروں گا عفیفہ.....! اگر تم پاکستان میں رہنا چاہتی ہو تو میں اپنا کاروبار سمیٹ کر وہاں بھی شفٹ ہونے کو تیار ہوں۔'' اس نے کہا۔

عفیفہ نے یہ بات عریشہ کو بتائی تو وہ بولی۔ ''کوئی بھی عقلمند شخص جو تمہارا اور اس کا ہمدرد ہو، ایسا کرنے کا مشورہ نہیں دے گا۔ لوگ بہتر حالات کی تلاش میں باہر جاتے ہیں اور وہ اچھا بھلا سیٹ کیا ہوا بزنس سمیٹ کر یہاں آنے کی بات کر رہا ہے۔''

''سمجھ میں نہیں آتا کیسے اس سے پیچھا چھڑاؤں؟ بری طرح جان کو آیا ہوا ہے۔'' عفیفہ بولی۔

''پیچھا چھڑانے نہیں، رشتہ جوڑنے کی بات کرو۔ خوش قسمت ہو کہ کوئی شخص تم میں اس حد تک انٹرسٹڈ ہے۔''

''کہہ رہا تھا میں نے اپنی ماں کو بھی بتا دیا ہے۔''

''اچھا! پھر؟''

''ماں نے کہا اتنی پڑھی لکھی عورت کے بجائے کوئی سیدھی سادی عورت دیکھ جو تیرا گھر بسائے۔''

''پھر؟''

''ماں نے اس کے اپنے ہی خاندان کی کئی لڑکیاں بتا دیں جن کے ماں باپ ایک اشارے پر انگلینڈ کے نام پر لڑکی دینے کو تیار ہیں۔''

''ایسا ہی ہے۔ میرے اپنے آفس میں چوبیس سال کی ایک لڑکی نے امریکا جانے کے لالچ میں اڑسٹھ سال کی عمر کے بابے سے خوشی خوشی شادی کی ہے..... ہاں تو پھر اس نے ماں سے کیا کہا؟''

''ماں سے تو اس نے جو کہا ہوگا، کہا ہوگا۔ مجھ سے کہا..... میں تمہارے سوا کسی اور کے بارے میں نہیں سوچنا چاہتا۔''

''بے چارہ! عشق کا مارا! اسے کہتے ہیں سچی محبت..... بے لوث عشق۔'' عریشہ مسکرائی۔

''اس کے بہانے ترکی تو ہم گھوم آئے۔ اگلا ٹور کہاں کا ہے؟''

''آفس والے میری اور عمران کی اور اسپتال والے تمہاری مستقل چھٹی کر دیں گے۔ تم تو اپنی پرائیویٹ پریکٹس سے دال دلیا کر لوگی، ہم میاں بیوی کیا کریں گے۔''

''تم نے سنا نہیں..... ملک خدا تنگ نیست۔''

''اس بار تم اکیلی جاؤ اس کے ساتھ۔ میں اور عمران اپنی اتفاقی چھٹیاں ختم کر بیٹھے ہیں۔''

''پاگل ہوئی ہو؟ اکیلی! ایک غیر مرد کے ساتھ؟''

''اسے آزمانا چاہتی ہو تو اس طرح بھی آزما کے نا..... دیکھو کہ وہ کتنا راست ہے..... کہتے ہیں کسی کو آزمانا ہو تو اس کے ساتھ سفر کر کے آزماؤ۔''

''مجھے ایسی آزمائش کا کوئی شوق نہیں۔''

''تو پھر شادی کر لو اس سے..... کیوں لٹکا رکھا ہے اسے؟''

''میں نے کوئی نہیں لٹکایا، وہ خود ہی.....''

''او کے..... مانا کہ وہ خود ہی تمہارے پیچھے پڑ گیا ہے..... سینتیس کی تم ہو چکی ہو، دو چار سال اور گزر گئے تو احترام تو ملے گا تمہیں لوگوں سے کیونکہ میسحا ہو لیکن ایسی محبت، عشق اور دیوانگی شاید نہ ملے جس کا وہ مظاہرہ کر رہا ہے۔''

عفیفہ بہن کا منہ دیکھنے لگی۔

''ایسے کیا دیکھ رہی ہو..... ہمدرد ہوں تمہاری..... کوئی اور ایسی باتیں نہیں کرے گا تم سے۔''

عفیفہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''جانتی ہوں، تم سے بڑھ کر کوئی اور ہمدرد نہیں میرا اس دنیا میں۔''

''تم سے اس کا عشق ایک سفر ہی سے شروع ہوا تھا نا..... جاؤ اکیلی سفر کرو اس کے ساتھ اور آزماؤ اسے کہ وہ

www.pklibrary.com

تمہارے لیے کتنا بے لوث رفیق ثابت ہوسکتا ہے زندگی کے لمبے سفر کے لیے۔'' عریشہ نے توقف کیا۔ ''لیکن مجھے پتا ہے تم ایسا نہیں کرو گی..... کم ہمت، کم حوصلہ جو ہو ورنہ قائم کے بعد یوں خول میں دبک کر اور اس کے دیے دکھ کو اپنے گلے کا طوق بنا کر نہ بیٹھ جاتیں..... اسے دکھاتیں کہ وہ، تمہارے لیے اس دنیا کا آخری شخص نہیں تھا..... تم اس سے الگ ہو کر بھی جی سکتی ہو، خوش رہ سکتی ہو۔''

''للکار رہی ہو؟'' عفیفہ نے بہن کو شاکی نگاہوں سے دیکھا۔

''نہیں..... تمہیں راہ سجھانے کی کوشش کر رہی ہوں۔ قائم کے ظلم نے مرد پر تمہارے اعتماد کو بے بھروسا کر دیا ہے۔ رافع کو پرکھنے کے لیے ضروری ہے کہ تمہارے اور اس کے درمیان کچھ وقت کو کوئی تیسرا فرد نہ ہو۔ قائم کے بعد گزرے برسوں میں کوئی اور تم سے رشتہ جوڑنے میں اتنا سنجیدہ ہوا جتنا رافع ہے؟''

عفیفہ چپ رہی۔

''جواب دو اور سچ سچ بتانا۔''

عفیفہ نے دھیرے سے نفی میں سر ہلا دیا۔

''یاد رکھنا، تم نے اگر سنجیدگی نہ دکھائی تو رافع مایوس ہو کر اپنی راہ لے گا اور تم نسخے لکھتے لکھتے اپنے سیاہ بالوں کو سفید کر لو گی۔''

عفیفہ اس کا منہ تکنے لگی۔

''سچ کہہ رہی ہوں عفیفہ! اکیلی عورت کی زندگی گزر تو جاتی ہے مگر بہت مشکل ہوتی ہے۔ عمران کا کیا بھروسا۔ ایک ہی بہن ہے اس کی اور وہ مصر ہے کہ عمران کو انگلینڈ میں سیٹل ہونے کی کوشش کرنا چاہیے۔ جس دن عمران کے دماغ میں سمائی، وہ بور یا بستر باندھ لے گا۔ تم کیا کرو گی پھر؟''

عفیفہ متفکر سی دکھائی دینے لگی۔

☆☆☆

مصر! فراعین کے حنوط شدہ تابوتوں، صحرائے سحارا اور رود نیل کی سرزمین عفیفہ اور رافع کی اگلی منزل ٹھہری۔ اپنے مختصر سے اسباب سفر کے ساتھ وہ قاہرہ ائرپورٹ سے باہر نکلی تو رافع کو اپنا منتظر پایا۔

''تمہاری فلائٹ کب پہنچی؟'' عفیفہ نے پوچھا۔

''پہنچ گئی۔'' رافع نے گول مول جواب دیا۔

''بہت انتظار تو نہیں کرنا پڑا؟''

''ساری زندگی کر سکتا ہوں۔'' رافع کی گہری نگاہوں نے اس کے چہرے کا نہایت چاہت سے طواف کیا۔

''اب؟''

''چلتے ہیں کسی اچھے ہوٹل کی تلاش میں۔''

''ہمیں پہلے بکنگ کرا لینی چاہیے تھی۔''

''کوئی مسئلہ نہیں۔ گراؤنڈ پر رہتے ہوئے ہم بہتر جگہ ڈھونڈ سکتے ہیں۔'' رافع نے کہا۔

ائرپورٹ کے نزدیک ہی انہیں ایک عمدہ ہوٹل مل گیا۔ رافع نے استقبالیہ کے بکنگ کاؤنٹر پر موجود نوجوان خاتون سے دو علیحدہ علیحدہ کمرے بک کرنے کو کہا تو اس نے ایک نظر ان دونوں کو دیکھا پھر دھیمی سی مسکراہٹ کے ساتھ معنی خیز لہجے میں بولی۔ ''اچھا آئیڈیا ہے۔''

''کیا؟'' رافع چونکا۔

''اگر آپ دونوں پکے پکے کسی رشتے میں جڑے ہیں تو اور اگر محض دوست ہیں تو بھی علیحدہ علیحدہ کمرے میں رہنے کا فیصلہ خوب ہے۔ آدمی کو کچھ وقت صرف اپنے ساتھ بھی گزارنا چاہیے۔''

''کیا آپ ذاتی معاملات میں غیر ضروری مداخلت کی مجاز ہیں؟'' رافع قدرے ناگواری سے بولا۔

''سوری سر! میں مجاز تو نہیں مگر اپنی عادت سے مجبور ہوں۔''

اپنے اپنے کمرے میں سامان رکھ کر وہ کچھ دیر ستائے، فریش ہوئے پھر سیر سپاٹے کو نکل کھڑے ہوئے۔ مصر عجائبات، کھنڈرات اور تاریخی مقامات کی دنیا۔ اہرام مصر نے انہیں متحیر کر دیا۔

عریشہ کا مشورہ خاصا کارگر ثابت ہوا۔ وہ دونوں صبح سویرے ہوٹل سے نکلتے اور رات کو شب بسری کے لیے واپس لوٹتے۔ ہفتہ بھر میں انہوں نے قاہرہ اور اسکندریہ کے بیشتر قابلِ دید مقامات دیکھ ڈالے۔ قاہرہ سے بذریعہ ٹرین اسکندریہ جاتے ہوئے رافع نے اس سے پوچھا۔ ''کیا سوچا تم نے؟''

''کس بارے میں؟'' عفیفہ تجاہلِ عارفانہ سے بولی۔

''میرے بارے میں؟''

''تمہاری والدہ تو منع کر رہی ہیں؟''

''منع نہیں کر رہیں..... انہیں خدشہ ہے کہ ایک ڈاکٹر مجھ جیسے ان پڑھ، جاہل آدمی کے ساتھ گزارہ نہ کر پائے شاید۔''

''تم کیا کہتے ہو؟''

''میں نے کیا کہنا ہے۔ تمہارے قدموں میں ڈھیر ہوں میں تو۔''

''ہم اسکندریہ جا رہے ہیں۔'' عفیفہ نے موضوع بدل دیا۔

''ہاں..... عظیم فاتح سکندرِ اعظم نے اس شہر کی بنیاد

www.pklibrary.com

رکھی تھی اور ملکہ قلوپطرہ نے اس پر حکمرانی کی..... اسی شان و شوکت سے جیسے تم میرے دل پر حکمرانی کر رہی ہو۔"

اسکندریہ سے قاہرہ واپسی پر ان کے پاس فقط ایک دن تھا واپسی میں۔ سات دن پلک جھپکتے میں گزر گئے تھے۔ اب ان دنوں کی خوشگوار یادیں تھیں یا وہ تصویریں جو انہوں نے اپنے اپنے اسمارٹ فون کے کیمروں میں محفوظ کر رکھی تھیں۔ ان سات دنوں میں وہ اکٹھے گھومتے پھرتے رہے تھے، ایک ساتھ کھایا پیا تھا، گرم کافی سے اٹھتے مرغولوں سے ایک دوسرے کو دیکھا تھا، ڈھیروں باتیں کی تھیں، ہنسے تھے، مسکرائے تھے..... کئی مواقع پر صرف وہ دو تھے تیسرا کوئی نہیں مگر رافع نے ہمیشہ تہذیب و حدود کا پاس رکھا تھا۔ واپسی سے قبل آخری شب ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں کھانا کھاتے ہوئے رافع نے اس سے پوچھا۔ "اب کب اور کہاں ملیں گے؟"

"اگلے سال سے پہلے ممکن نہیں۔"

"کیوں؟"

"کیونکہ نہ مجھے اتنی جلدی چھٹی مل سکتی ہے نہ تمہیں اپنا بزنس بار بار دوسروں کے رحم و کرم پر چھوڑنا چاہیے۔ میرے ایم ایس مینٹنگز میں اپنے ماتحتوں سے اکثر کہا کرتے ہیں: آپ کی موجودگی اہمیت رکھتی ہے۔"

"بات تو ٹھیک ہے۔" رافع نے اثبات میں سر ہلایا۔

"بات ٹھیک ہے تو..... اچھے بچوں کی طرح اپنے کام میں دل لگاؤ۔"

"دل!" رافع اپنے سینے پر دل کے مقام کو ٹٹولتے ہوئے بولا۔ "وہ تو میں کب کا تمہیں دے چکا۔"

"تم پاگل ہو۔" عفیفہ نے مسکراتے ہوئے اپنے سر کو جھٹکا۔

"آئی لو یو عفیفہ!" اس نے اپنا ہاتھ بڑھا کر آہستگی سے عفیفہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ عفیفہ اسے دیکھنے لگی۔

"کیا دیکھ رہی ہو؟"

"سوچتی ہوں جاب کا کیا ہوگا..... نئے سرے سے دوسری جگہ اپنی جڑیں جمانے کے لیے مجھے نہ جانے کیا کچھ کرنا ہوگا۔"

"تمہارا مطلب ہے..... انگلینڈ؟"

عفیفہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

"نو وریز..... کوئی مسئلہ نہیں..... میں ہوں نا..... تمہارے ساتھ کھڑا ہونے کے لیے..... تمہیں جہاں میری ضرورت ہوگی، مجھے اپنے ساتھ کھڑا پاؤ گی عفیفہ.....! آئی لو یو۔" اس نے پھر اظہارِ الفت کیا۔

"مجھے سوچنے دو۔"

"خدایا! میں قریب المرگ ہوا جا رہا ہوں..... کتنا سوچو گی اور؟"

"بس تھوڑا وقت اور رافع..... اگلے برس۔"

"اگلے برس؟" رافع نے پریشان ہو کر کہا۔

"دسمبر شروع ہو چکا ہے..... اگلا برس بس کچھ ہی دور ہے۔"

رافع نے اطمینان بھری سانس لیتے ہوئے اسے دیکھا اور کرسی پر ڈھیر ہو جانے کی اداکاری کی۔

عفیفہ مسکرا دی۔

☆☆☆

قاہرہ سے واپسی پر عمران اور عریشہ کے ساتھ ان کی گاڑی میں گھر جاتے ہوئے عمران کی گاڑی کو نہایت خوفناک حادثہ پیش آیا۔ گاڑی چھت کے بل الٹ گئی۔ اگلی نشستوں پر موجود عمران اور عریشہ سیٹ بیلٹ بندھی ہونے کے باعث معجزانہ طور پر محفوظ رہے مگر عقبی نشست پر بیٹھی عفیفہ کو چہرے پر گہرے زخم آئے۔ دونوں بازو اور ایک ٹانگ ٹوٹ گئی۔ عریشہ نے عفیفہ کے موبائل پر رافع کی کال آنے پر اسے حادثے کی اطلاع دی تو وہ سخت پریشان ہو گیا۔

"وہ ہوش میں تو ہے؟" اس نے عریشہ سے انتہائی تشویش سے پوچھا۔

"ہاں، مگر شدید تکلیف میں ہے۔"

"اس کا خیال رکھنا عریشہ بہن.....! اسے کچھ ہونا نہیں چاہیے۔"

"وہ اسی اسپتال میں ہے جہاں وہ خود جاب کرتی ہے۔ ڈاکٹرز، نرسز سب اسے بھرپور توجہ دے رہے ہیں۔"

اگلے دن وہ عریشہ سے عفیفہ کے اسپتال، وارڈ اور بیڈ نمبر کی معلومات لے رہا تھا۔

"خیریت؟" عریشہ نے اسے تفصیل فراہم کرنے کے بعد پوچھا۔ اس نے کوئی جواب دیے بغیر کال منقطع کر دی اور عریشہ کی کئی مرتبہ واٹس ایپ کالز کے باوجود جواب نہیں دیا۔

زیادہ نہیں، حد سے حد گھنٹے سوا گھنٹے بعد وہ عفیفہ کے سرہانے موجود تھا اور بیڈ پر لیٹی مجروح و مضروب عفیفہ اپنی کھلی آنکھوں سے اسے بے یقینی سے دیکھ رہی تھی۔

"کیسی ہو؟" اس نے جھک کر پوچھا۔

"تم..... یہاں..... کیسے؟" وہ تھکی تھکی آواز میں بولی۔

"میں نے کہا تھا نا کہ تم مجھے ہر مقام پر اپنے ساتھ کھڑا پاؤ گی۔"

www.pklibrary.com

"یقین نہیں آرہا کہ تم یہاں ہو۔" اس کی آواز میں نقاہت تھی۔

"میں یہیں ہوں..... تمہارے پاس..... تمہارے ساتھ۔"

عفیفہ نے لیٹے لیٹے اپنے سر کو تکیے سے ذرا اونچا کر کے اپنی پلاسٹر شدہ ٹانگ اور بازوؤں کو دیکھا پھر آہستہ سے بولی۔

"اب تو شاید..... اگلے برس سے بھی آگے بات جائے۔"

وہ پھر جھکا اور سرگوشی میں بولا۔ "اگلے برس سے آگے..... اس سے بھی آگے..... میں انتظار کروں گا عفیفہ!"

عفیفہ کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ آنسو اس کی آنکھوں سے کنپٹیوں پر ڈھلکنے لگے۔

"آئی ول ویٹ۔" رافع نے جذبات سے معمور لہجے میں کہا۔ "مجھے صبر سے کام لینا آتا ہے۔"

عفیفہ کے لب آہستگی سے ہلے۔ "رافع!" پھر اس نے رنجور ہو کر کہا۔ "میرا چہرہ!"

"ڈونٹ وری! انگلینڈ میں ایک سے بڑھ کر ایک کرشماتی سرجن موجود ہے اور..... نہ بھی ہو تو کیا..... آئی لو یو..... آئی لو یو عفیفہ!"

"می ٹو!" عفیفہ کو یہ کہے بنا چارہ نہ تھا۔

☆☆☆

اسپتال سے عفیفہ کے ڈسچارج ہونے کے بعد وہ چند دن اور پاکستان میں رہا۔ جانے سے پہلے اس نے گھر ہی میں سادہ سی تقریب میں اس سے نکاح کیا اور اسے اپنے شریکِ زندگی کی حیثیت سے اپنے ساتھ انگلینڈ لے جانے کے لیے ویزا کے حصول کے لیے درخواست جمع کروادی۔

مناسب دیکھ بھال اور علاج سے عفیفہ کی صحت یابی میں توقع سے کم وقت لگا۔ پلاستر اترنے کے بعد بازوؤں اور ٹانگ کی فزیوتھراپی نے اسے دوبارہ اپنے بازوؤں کے استعمال اور ٹانگ پر چلنے میں مدد دی۔ رافع ہزاروں میل دور سے اس کی قوت بنا رہا۔ اسے یقین تھا کہ اس کا بزنس اور معقول آمدن عفیفہ کے لیے ویزا کے جلد حصول میں معاون ہوں گے۔ درمیانی عرصے میں وہ ایک مرتبہ پھر اس سے ملنے کے لیے پاکستان آیا۔

"تمہاری محبت اور ثابت قدمی نے مجھے میرے خول سے باہر نکلنے کا حوصلہ دیا ہے رافع!" عفیفہ نے اعتراف کیا۔

"قائم کے بارے میں اب بھی سوچتی ہو؟" وہ مسکرا کر بولا۔

"جہنم میں جائے قائم۔"

"رئیلی؟" رافع نے قدرے تعجب سے کہا۔

عفیفہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

عفیفہ کو رافع کی شریکِ زندگی کی حیثیت سے برطانیہ جانے کا پروانہ مل گیا۔ عفیفہ نے ملازمت کو خیرباد کہا۔ ذاتی کلینک اپنی ایک ساتھی کے حوالے کیا۔ رافع اسے اپنے ساتھ برطانیہ لے جانے کے لیے پاکستان آیا۔ عریشہ اور عمران نے عفیفہ کی رخصتی ایک شاندار تقریب میں کی جس میں رافع کے گھر والے بھی نہایت گرمجوشی سے شریک ہوئے۔

☆☆☆

ہیتھرو جانے والی پرواز روانگی کے لیے تیار تھی۔ عفیفہ اور رافع پہلو بہ پہلو اپنی اپنی نشست پر بیٹھے ہوئے تھے۔ عفیفہ کسی گہری سوچ میں ڈوبی دکھائی دیتی تھی۔

"کیا سوچ رہی ہو مائی لو؟" رافع نے سرگوشی میں کہا۔

"آں ہاں....." عفیفہ چونکی پھر بولی۔ "سوچ رہی ہوں بعض سفر بھی انسان کی تقدیر بدل دیتے ہیں۔"

"ٹھیک کہتی ہو..... سفر اکثر وسیلۂ ظفر ہوتا ہے۔ میں سفر نہ کرتا تو شاید آج کہیں چھوٹی موٹی نوکری کر رہا ہوتا..... تم جیسی ڈاکٹر کو اپنا بنانے کا خیال بھی اپنے دل میں نہیں لاسکتا تھا میں۔" اس نے توقف کیا پھر بولا۔ "خوش تو ہو نا میرے ساتھ؟"

"بہت۔" عفیفہ نے اپنا سر اس کے شانے سے لگاتے ہوئے کہا۔

خوبرو فضائی میزبان مسافروں کو سگریٹ بجھا دینے، موبائل فونز آف کر دینے اور سیٹ بیلٹ باندھ لینے کی ہدایات دے رہی تھی۔

عفیفہ نے غلطی سے رافع کی سیٹ بیلٹ کھینچ لی۔ رافع نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے والہانہ نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ "اب یہ نہیں ہوگا مادام! اپنی اپنی سیٹ بیلٹ، اپنا اپنا ریموٹ۔"

"سوری!" عفیفہ جھینپ کر بولی۔

"اٹس اوکے..... ویسے بھی اب تو ہمیں مل جل کر ایک ہی موووی دیکھنا ہے۔"

"سچ کہا۔" عفیفہ مسکرا دی۔

"لو یو ڈارلنگ۔" رافع اسے محبوبیت سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"می ٹو۔" عفیفہ نے کھل کر اعتراف کیا۔

جہاز رن وے پر دوڑ رہا تھا اور فضا میں دل پذیر سی گنگناہٹ تھی..... سفر وسیلۂ ظفر تو ہے ہی..... بعض محبتوں کے باب بھی دورانِ سفر وا ہوتے ہیں!

⌘⌘⌘

www.pklibrary.com

باتدبیر

سلیم انور

سمندر پار کی دنیا نے ہمیشہ اپنے مختلف اور منفرد ہونے کا احساس دلایا ہے۔ خاص طور پر جرم چھپانے کے لیے کیسے کیسے رستے تلاش کرلیے جاتے ہیں اس کا اندازہ جرم سرزد ہونے اور مجرم کے بچ جانے کے بعد ہوتا ہے۔

ایک ذہین وفطین مجرم کی کارروائیوں کا دلچسپ احوال

صبح سویرے نیشنل فارمرز بینک کے پریذیڈنٹ موسیو بے آؤٹ نے اپنے سیکریٹری فلبرٹ کو کمرے میں طلب کیا۔

''مجھے ایک بات تو بتاؤ فلبرٹ۔'' پریذیڈنٹ نے کہا۔ ''ہماری پیگنین برانچ میں فلوریٹ نامی شخص کون ہے؟''

''فلوریٹ؟..... وہ کیشیئر ہے اور عارضی طور پر منیجر کا کام کررہا ہے۔ آپ کو یاد ہوگا سر کہ ہمارے پرانے

www.pklibrary.com

منیجر باؤچر کا انتقال ہو چکا ہے اور ہم نے ابھی تک ان کی جگہ کسی کو تعینات نہیں کیا ہے۔ اس دوران فلوریٹ تمام معاملات کی دیکھ بھال کر رہا ہے۔ ویسے پرپیگنین میں بہت زیادہ بزنس بھی نہیں ہے۔"

موسیو بے آؤٹ نے اپنی میز کی دراز سے ایک لیٹر نکالا اور بولا۔ "ویل، بہ ظاہر وہ شخص ہمیں لوٹ رہا ہے۔ میرے پاس پرپیگنین سے یہ لیٹر آیا ہے جو کسی نامعلوم شخص نے بھیجا ہے۔ میں مانتا ہوں لیکن......"

یہ کہہ کر انہوں نے فلبرٹ کو ایک کاغذ تھما دیا جس پر کسی قدر ناپختہ انداز میں مندرجہ ذیل سطریں تحریر تھیں۔

بنام پریذیڈنٹ نیشنل فارمرز بینک

جناب عالی!

ہم کسان اپنی سخت محنت کی کمائی کی بچت آپ کے پرپیگنین بینک میں رکھوا رہے ہیں اور ایک دن جب صبح ہم بیدار ہوں گے تو پتا چلے گا کہ بینک دوالیا ہو چکا ہے اور ہم اپنی تمام بچت گنوا چکے ہیں۔ یہاں جو کچھ ہو رہا ہے تو یہ ہونا یقینی ہے۔ آپ غالباً اس حقیقت سے بے خبر ہیں کہ آپ کا کیشیئر فلوریٹ کئی مہینوں سے رقم میں خورد برد کر رہا ہے اور اب تک اچھی خاصی رقم پس انداز کر چکا ہے۔ بلاشبہ جب تک پیرس کے آپ اعلیٰ اور بااختیار جنٹلمین کو اس معاملے کا احساس ہوگا اس وقت تک تمام رقم جا چکی ہوگی۔"

جب ان کے سیکریٹری نے یہ لیٹر پڑھ لیا تو پریذیڈنٹ نے اس سے مخاطب ہو کر کہا۔ "کل صبح ایک انسپکٹر کو پرپیگنین روانہ کر دو، فلبرٹ۔ لیکن اس کو بتا دینا کہ وہ خوش تدبیری سے کام لے۔ ہم اس کیشیئر کو اپ سیٹ نہیں کرنا چاہتے۔ ہو سکتا ہے کہ اس داستان کی کوئی بنیاد ہی نہ ہو۔"

☆☆☆

پرپیگنین برانچ کے عارضی منیجر فلوریٹ نے حیرانی سے پیرس سے آئے ہوئے انسپکٹر کو تکنا شروع کر دیا۔ "میرے کھاتوں کا معائنہ کریں گے؟" اس نے انسپکٹر کی بات کو دہرایا۔ "کیوں؟ ابھی تو مہینے کا وسط ہے۔ اور وہ بھی کسی اطلاع کے بغیر؟ کیا یہ خلافِ معمول نہیں ہے؟"

انسپکٹر کو اس کیشیئر کی جھلاہٹ پر ترس آ رہا تھا۔ "اس میں پریشان ہونے والی کوئی بات نہیں ہے فلوریٹ۔ ہم اپنی تمام برانچوں میں وقتاً فوقتاً اس طریقے سے کھاتوں کا معائنہ کرتے رہتے ہیں۔ پریذیڈنٹ پر اس قسم کی اضطراری کیفیت طاری ہوتی رہتی ہے۔ یہ ایک رسمی کارروائی ہے۔ مجھے اسے نمٹانے میں صرف آدھا گھنٹا لگے گا۔"

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن لوگ باتیں بنائیں گے۔ خاص طور پر اس چھوٹی سی جگہ پر۔" فلوریٹ نے بین کرتے ہوئے کہا۔ "ہر کوئی یہ کہہ رہا ہوگا کہ میں نے کوئی مشتبہ حرکت کی ہے۔ ذرا میری بے عزتی کے بارے میں تو سوچو۔"

"اس بارے میں کسی کو بھی کچھ پتا نہیں چلے گا۔" انسپکٹر نے قدرے بے صبری سے کہا۔ "ہاں، یہ الگ بات ہے اگر تم نے اس بارے میں کسی کو خود سے کچھ بتا دیا تو...... ویل، کیا اب میں کھاتے دیکھ سکتا ہوں؟"

☆☆☆

دو دن بعد فلبرٹ پریذیڈنٹ کے کمرے میں داخل ہوا۔

"میں پرپیگنین برانچ کے دورے کی انسپکٹر کی رپورٹ پیش کرنا چاہتا ہوں، سر! وہاں ہر چیز آرڈر میں ہے۔ ایک چھوٹا سکہ تک غائب نہیں ہے۔"

"گڈ! حقیقت میں کسی کو بھی ان گھناؤنے نامعلوم خط لکھنے والوں پر کوئی توجہ نہیں دینی چاہیے۔ شکریہ، فلبرٹ!"

ابھی اس واقعے کو ایک ماہ بھی نہیں گزرا تھا کہ پریذیڈنٹ نے اپنے سیکریٹری کو ایک بار پھر اپنے دفتر میں طلب کیا۔

"یہ خاصی مضحکہ خیز بات ہے۔" انہوں نے زودرنج لہجے میں کہا۔ "مجھے پرپیگنین برانچ سے متعلق ایک اور گمنام خط موصول ہوا ہے۔ خط لکھنے والے نے اس بات کا اظہار کیا ہے کہ کھاتوں کا صحیح طریقے سے جائزہ نہیں لیا گیا تھا۔ بہ ظاہر کیشیئر فلوریٹ نے اس پورے معاملے میں اس طرح اچھل کود کی کہ انسپکٹر کو الجھائے رکھا اور اس دوران اس کے ساتھی کو چوری شدہ رقم واپس رکھنے کا وقت مل گیا۔ اب ہمیں حقیقت میں اس معاملے کی زیادہ باریکی سے چھان بین کرنا ہوگی۔"

"کیا ہم ایک بار پھر تحقیقات کرائیں گے؟" فلبرٹ نے جاننا چاہا۔

www.pklibrary.com

پریذیڈنٹ نے اپنی انگلیاں میز کی سطح پر بجاتے ہوئے کہا۔ ''میں ذاتی طور پر تو یہ نہیں کرنا چاہتا لیکن اس کے ساتھ ہی یہ ہمارا فرض بنتا ہے کہ ہم اپنے کلائنٹس کے مفادات کا خیال رکھیں۔ اگر دال میں کچھ کالا ہے اور لوگوں کو بعد میں اس بارے میں پتا چل جاتا ہے تو وہ کہیں گے کہ انہوں نے ہمیں پہلے ہی ہوشیار کر دیا تھا۔ تب ہمیں ایک ناخوشگوار اسکینڈل کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اب ہمیں یہی کرنا ہوگا کہ انسپکٹر کو دوبارہ وہاں بھیج دیں اور اس مرتبہ اس سے کہنا کہ اس معاملے کی پوری احتیاط اور تفصیل کے ساتھ جانچ پڑتال کرے۔ میں اس معاملے کو ایک ہی بار اور ہمیشہ کے لیے حل کرنا چاہتا ہوں۔''

اسی روز بینک کے تین نہایت بااعتبار انسپکٹروں کو پرپیگنین برانچ کے معاملات کی چھان بین کے لیے روانہ کر دیا گیا۔

اس مرتبہ بینک برانچ کا کیشیئر فلوریٹ ان کی اس غیر متوقع آمد پر ششدر رہ گیا۔ ان انسپکٹرز میں سے ایک فلوریٹ کی نگرانی کے لیے اس کے سر پر سوار رہا جبکہ بقیہ دو انسپکٹرز اس کے کھاتوں کا تفصیل سے جائزہ لینے لگے۔

یہ چھان بین چار گھنٹے تک جاری رہی۔ انہیں کھاتوں میں کسی قسم کی ہیر پھیر نہیں ملی۔ رقم بھی پوری کی پوری اپنی جگہ موجود تھی۔

''میری یہی خواہش ہے کہ ہماری تمام برانچوں میں صورتِ حال اسی طرح تسلی بخش ہو۔'' چیف انسپکٹر نے رخصت ہوتے وقت فلوریٹ سے کہا جس کی کیفیت ایک بری طرح سے بکھرے ہوئے شخص کی سی تھی۔

☆☆☆

ایک ہفتے بعد۔

''پرپیگنین برانچ کے کیشیئر مسٹر فلوریٹ آپ سے ملاقات کرنے کے منتظر ہیں، سر!'' سیکریٹری فلبرٹ نے بینک کے پریذیڈنٹ کو مطلع کیا۔

یہ سن کر پریذیڈنٹ خلافِ عادت اپنی کرسی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور مصافحے کے لیے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ فلوریٹ نے قدرے تسلیم بجالاتے ہوئے مصافحہ کیا اور بولا۔ ''میں اپنا استعفا پیش کرنے کے لیے حاضر ہوا ہوں، سر۔''

''استعفا؟ تمہارا یہ مطلب ہرگز نہیں ہو سکتا مائی ڈیئر فلوریٹ..... تم ایسا کیوں کر رہے ہو؟''

''آپ نے دوبار یہ ضروری سمجھا کہ میرے کھاتوں کا تفصیلی معائنہ ہونا چاہیے، سر۔ قدرتی طور پر اس بارے میں بہت باتیں ہوئیں۔ اس کے باوجود کہ میں ایک ایماندار شخص ثابت ہو گیا، اس معاملے نے میرے بارے میں ایک بُرا تاثر چھوڑ دیا۔ لوگ کہہ رہے ہیں اس کی کوئی نہ کوئی صحیح وجہ تو ہو گی جو ہیڈ آفس نے میرے معاملات کی تحقیقات کے لیے دو مرتبہ انسپکٹروں کو بھیجا۔ میری عزت تو خاک میں مل گئی۔ میں کوئی نوجوان نہیں ہوں اور مجھے اپنی بیوی کا بھی خیال ہے۔''

پریذیڈنٹ موسیو بے آؤٹ جذباتی طور پر متاثر دکھائی دے رہا تھا۔ ''یہ میری ذاتی ذمے داری ہوگی کہ تمہارے نام پر لگے تمام داغ دھبے دور کر دیے جائیں۔ البتہ ایک منٹ رک جاؤ..... ہماری پرپیگنین برانچ میں منیجر کی پوسٹ ابھی تک خالی پڑی ہے۔ کیا تم اس عہدے پر کام کرنا پسند کرو گے؟ تب تمہاری ایمانداری پر کوئی بھی شک نہیں کرے گا۔ ہے نا؟ ہاں اور تمہاری تنخواہ میں بھی معقول اضافہ ہو جائے گا۔''

''آپ کا واقعی یہ مطلب ہے.....'' فلوریٹ کی زبان لڑکھڑانے لگی اور اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''بے شک، بے شک مائی ڈیئر۔ یہ بینک کی خوش نصیبی ہوگی کہ تم جیسے دیانت دار، محنتی اور بااصول کارکن کی خدمات سے مستفید ہوتا رہے۔''

☆☆☆

پرپیگنین میں اپنے گھر واپس پہنچ کر فلوریٹ نے جوتے اتار دیے اور آرام دہ سلیپرز پہن لیے جو اس کی بیوی نے اسے لا کر دیے تھے۔

''بالآخر!'' اس نے خوشی سے بھرپور لہجے میں کہا۔ ''ایسا ایماندار آدمی ہونے کا کیا فائدہ جب اس ایمانداری کی کسی کو کوئی خبر بھی نہ ہو؟ میں برسوں تک یوں ہی کیشیئر بنا رہتا اور ہیڈ آفس کے لوگوں کو کبھی اس بات کا علم نہیں ہوتا کہ میں کتنا ایماندار ہوں۔''

''اب انہیں پتا چل گیا ہے۔'' فلوریٹ کی بیوی نے اپنے شوہر کی جانب ستائشی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''بینک کے صدر کے نام تمہارے وہ بے نام خطوط ایک شاندار آئیڈیا تھا جس کا پھل تمہیں مل گیا۔''

⌘⌘⌘

www.pklibrary.com

ابنُ الحرص

مرزا امجد بیگ

کبھی کبھی لوگ ہلکی پھلکی پسندیدگی کو بھی محبت کا نام دے کر تمام عمر خود کو ایک فریب میں مبتلا کیے رکھتے ہیں اور عشق کے دھوکے میں بے شمار آزار اٹھاتے ہوئے ایک ایسے شخص کے لیے زندگی تباہ کرلیتے ہیں جو انہیں ایک نگاہ ... کے قابل بھی نہیں سمجھتا... ایسی محبت کا انجام... سوائے تباہی کے اور کیا ہوسکتا ہے... کچھ یہی حال اس کا بھی ہوا جو یک طرفہ چاہت کے فریب میں دل پر جانے کتنے ہی زخم سہہ گیا مگر زبان سے اف تک نہ کی لیکن آخر کب تک... بالآخر درد جب حد سے بڑھا تو ایک آہ نکل ہی گئی... اور اس آہ نے اس بار عرش کو بھی ہلا دیا... کیونکہ بے بسی اور بے حسی میں بس چند ہی قدم کا فاصلہ رہ گیا تھا۔

حرص و ہوس کی بساط پر کھیلنے والے چند فریب کاروں کا

عبرت اثر انجام

اس کیس میں میرے مدمقابل ایک چیتا قسم کا نامی گرامی پبلک پراسیکیوٹر جاوید ہمدانی کھڑا تھا۔ اس وکیل استغاثہ کے بارے میں عدالتی حلقوں میں یہ تاثر پایا جاتا تھا کہ ہمدانی جس ملزم کے پیچھے پڑ جائے پھر وہ بدقسمت، مجرم ثابت ہو کر عدالت سے سیدھا جیل ہی جاتا ہے۔ اسی نوعیت کی اور بھی بہت ساری باتیں اس وکیلِ سرکار کے حوالے سے مشہور تھیں۔

ملزم فاروق سے میری ابھی تھوڑی دیر پہلے عدالت ہی میں ملاقات ہوئی تھی۔ یہ کیس میں نے ہنگامی بنیادوں پر اپنے ہاتھ میں لیا تھا کیونکہ اس کیس کو ریفر کرنے والا ایک ایسا شخص تھا جس کا کہا میں ٹال نہیں سکتا تھا۔ میرا وہ دوست جمیل اختر شام کے ایک اخبار کا نیوز ایڈیٹر تھا۔ انسان کی زندگی میں بعض ایسے لوگ ہوتے ہیں جن کے لیے زبان سے انکار کا لفظ نکل ہی نہیں سکتا۔ جمیل اختر بھی ایک ایسا ہی شخص تھا۔

''جناب عالی!'' تگڑے پبلک پراسیکیوٹر نے جج کی جانب دیکھتے ہوئے پُراعتماد انداز میں کہا۔ ''ملزم پولیس کی گرفت میں ہے۔ ملزم اور مقتولہ کے بیچ چپقلش کا بڑا مضبوط بیک گراؤنڈ ہے۔ ملزم کچھ عرصے سے مقتولہ کو بلیک میل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس امر کا گواہ موجود ہے۔ وقوعہ کی شام ملزم، مقتولہ کے گھر کے نزدیک منڈلاتا دیکھا گیا ہے۔ اس حقیقت کا عینی شاہد عدالت میں آکر بیان دینے کے لیے تیار ہے۔ سب سے بڑی بات..... آلۂ قتل پر ملزم کی انگلیوں کے نشانات پائے گئے ہیں۔ ملزم کے پاس مقتولہ کو موت کے گھاٹ اتارنے کا مضبوط محرک تھا..... ویٹس آل یور آنر!''

''جناب عالی! میرے فاضل دوست نے ایک سمپل اینڈ انسٹنٹ فارمولے کے ذریعے جس طرح ملزم کو مجرم ثابت کرنے کا فلسفہ بیان کیا ہے، وہ خاصا متاثر کن ہے۔'' میں نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ''لیکن ابھی یہ سب قبل از وقت ہے۔ جب اس کیس کی باقاعدہ سماعت شروع ہوگی تو ان معاملات کو دیکھ لیا جائے گا۔ فی الوقت معزز عدالت

www.pklibrary.com

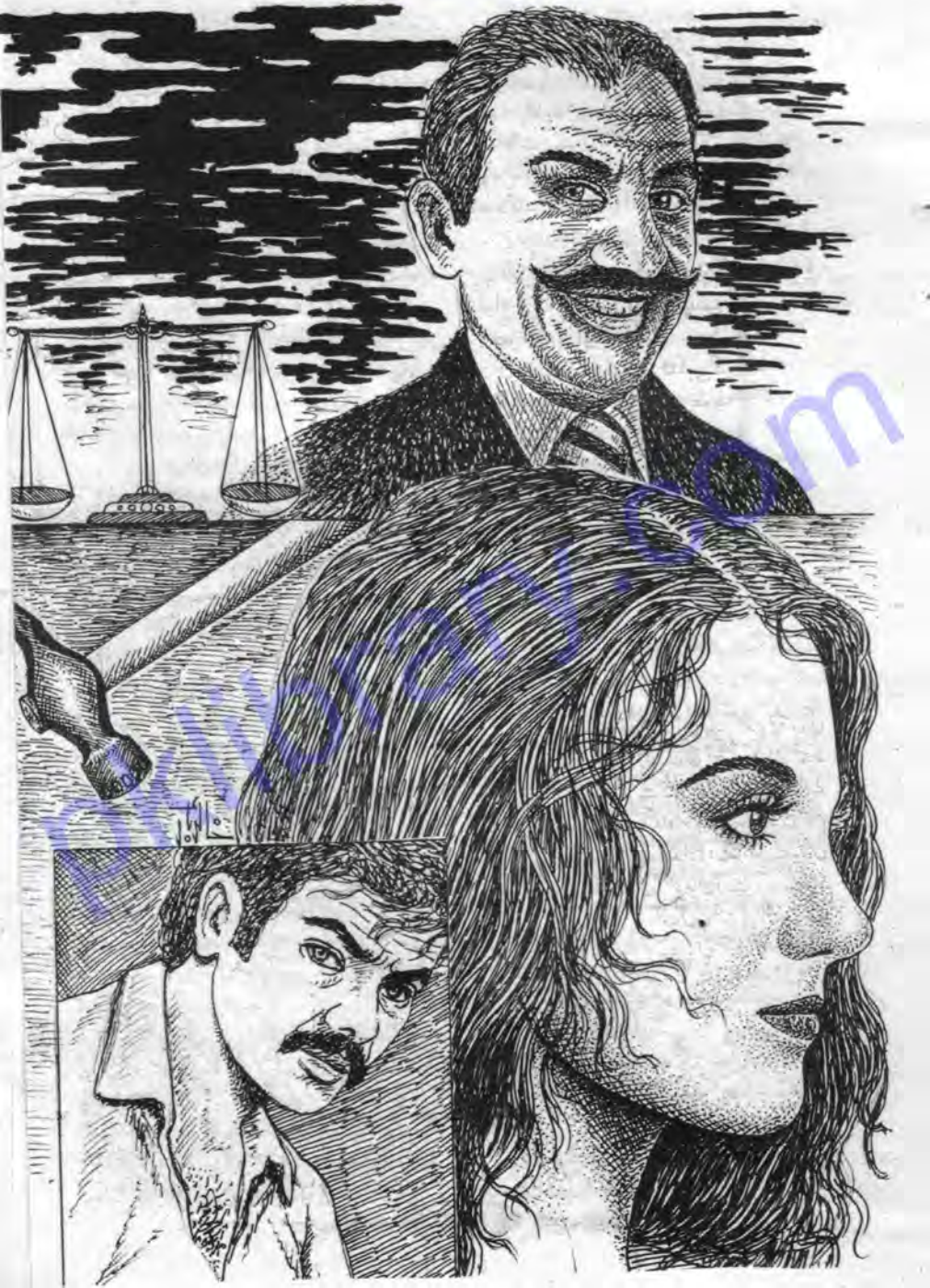

www.pklibrary.com

سے میری درخواست ہے کہ ملزم کی ضمانت کو منظور کر کے اس غریب شخص پر احسان کیا جائے۔''

آج اپریل کی ستائیس تاریخ تھی۔ ملزم کو جو کہ اب میرا مؤکل تھا، اسے انیس اپریل کی شام اس کے گھر سے گرفتار کیا گیا تھا اور بیس اپریل کی صبح عدالت میں پیش کر کے پولیس نے اس کا سات دن کا ریمانڈ حاصل کرلیا اور آج کیس کا چالان پیش کر دیا گیا تھا۔ اس کیس کے حوالے سے میری معلومات صرف اتنی تھیں کہ ملزم فاروق پیشے کے اعتبار سے ایک بڑھئی تھا اور جمیل اختر کی نگاہ میں ایک معصوم اور بے ضرر انسان۔ اس پر فائزہ نامی ایک خوبصورت عورت کے قتل کا الزام تھا اور جمیل اختر کو اس بات کا یقین تھا کہ فاروق بے گناہ ہے اسی لیے انہوں نے یہ کیس میرے سپرد کیا تھا۔ فاروق کے لیے جمیل اختر نے شخصی ضمانت کا بندوبست کر دیا تھا۔

''یہ عدالت کوئی فلاحی، خیراتی ادارہ نہیں کہ غریبوں اور مسکینوں پر احسانات کے ڈونگرے برسائے جائیں۔'' وکیل استغاثہ نے ضمانت کو رکوانے کی غرض سے کڑوے لہجے میں کہا۔ ''میں نے جن پوائنٹس کا ذکر کیا ہے وہ ایک تلخ سچائی ہے اور سچائی ہر حال میں سچائی ہی رہتی ہے۔ قبل از وقت یا بعد از وقت سے اس کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ یہ کیس اتنا واضح اور کھلا ہے کہ ڈیفنس کو ذرا سی بھی محنت نہیں کرنا پڑے گی۔ استغاثہ کے پاس ملزم کے خلاف اتنے ٹھوس ثبوت موجود ہیں کہ جب ملزم میری جرح کا سامنا کرے گا تو اس کے پاس اقبالِ جرم کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ہوگا۔ یہ کیس ایک آدھ پیشی سے زیادہ نہیں چلنے والا۔''

''یور آنر! کسی شے کو بیان کرنا اور اسے ثابت کرنا دو مختلف باتیں ہیں۔'' میں نے جج کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ تو آنے والا وقت ہی بتائے گا کہ زیرِ سماعت کیس کی عمر کیا ہوگی، یعنی وہ وکیل سرکار کے بقول ایک آدھ پیشی میں نمٹ جائے گا یا عدالت کا فیصلہ آنے میں مہینوں لگ جائیں گے۔'' میں سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''جنابِ عالی! میرا مؤکل اس معاشرے کا ایک پُرامن فرد ہے۔ اس کا کوئی کرمنل ریکارڈ نہیں۔ اس بے چارے مزدور پیشہ شخص کو کسی گہری سازش کے تحت اس مقدمے میں پھنسایا گیا ہے۔ میں وقت آنے پر اس کی بے گناہی کو ثابت کردوں گا۔ معزز عدالت سے میری استدعا ہے کہ ملزم کی درخواستِ ضمانت قبول کی جائے۔''

وکیل استغاثہ بڑھ چڑھ کر ضمانت کے خلاف بولنے لگا۔ اس امر میں کسی شک کی گنجائش نہیں کہ پولیس کے پیش کردہ چالان کے مطابق فاروق کی پوزیشن خاصی کمزور تھی۔ حالات و واقعات اس کے فیور میں ہرگز نہیں تھے۔ قتل کے ملزم کی ضمانت ویسے بھی ناممکن کی حد تک مشکل ہوتی ہے اور یہاں تو ملزم گردن تک اس جرم کی دلدل میں دھنسا دکھائی دے رہا تھا۔ جج نے وہی کیا جس کی میں توقع کر رہا تھا۔

ملزم کی درخواستِ ضمانت کو رد کرتے ہوئے جج نے پندرہ روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کرنے کا اعلان کر دیا۔

''دی کورٹ از ایڈجارنڈ!''

میں عدالت کے کمرے سے باہر نکلا تو کوریڈور میں جاوید ہمدانی سے سامنا ہوگیا۔ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''ہمدانی صاحب! مبارک ہو۔''

''مبارک.....!'' اس نے الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھا اور پوچھا۔ ''کس بات کی مبارک بیگ صاحب؟''

''آپ یہ کیس ایک آدھ پیشی سے بھی پہلے ہی جیت گئے۔''

اس کی الجھن حیرت میں بدل گئی۔ ''وہ کیسے؟''

''آپ کے بارے میں عدالتی حلقوں میں یہ بات مشہور ہے کہ جس کیس میں آپ وکیل استغاثہ ہوتے ہیں، اس کیس کا ملزم عدالت سے سیدھا جیل جاتا ہے۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے اس پر چوٹ کی پھر ملزم کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بڑی سادگی سے کہا۔ ''وہ دیکھیں، اس کیس کا ملزم فاروق عدالت سے نکل کر جیل وین کی طرف جا رہا ہے جو یقیناً اسے سینٹرل جیل لے جائے گی..... آپ کی جیت پکی!''

وہ ایک چالاک اور ہوشیار وکیل تھا۔ میری معصومیت کے اندر چھپی ہوئی شرارت کو اس نے فوراً سے پیشتر محسوس کرلیا پھر وہ اپنے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ سجاتے ہوئے بولا۔

''آپ کو مذاق کرنے کے لیے کوئی اور نہیں ملا؟''

''بخدا میں سچ کہہ رہا ہوں۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

وہ خشمگیں نظر سے مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ ''آپ سے عدالت میں ملاقات ہوگی۔''

''اچھا.....'' میں نے بے یقینی سے گردونواح میں نگاہ دوڑاتے ہوئے کہا۔ ''کیا اس وقت ہم عدالت کے باہر کھڑے ہیں؟''

اس نے میری اس بات پر نرم گرم کوئی بھی تبصرہ نہیں کیا اور پاؤں پٹخ کر آگے بڑھ گیا۔ میں لمبے ڈگ بھرتے

www.pklibrary.com

ہوئے جیل وین کی سمت چلا گیا۔

میرا موکل ایک پولیس والے کی نگرانی میں جیل وین کے نزدیک کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑی لگی ہوئی تھی جس کا دوسرا سرا پولیس والے کی گرفت میں تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

''تم لوگ کتنی دیر میں یہاں سے روانہ ہوگے؟''

''ایک گھنٹا لگ جائے گا وکیل صاحب۔'' اس نے جواب دیا۔ ''مگر آپ یہ کیوں پوچھ رہے ہیں؟''

''میں تمہارا بھلا کرنا چاہتا ہوں۔'' میں نے اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

فائدے کی بات ہر کسی کو اچھی لگتی ہے۔ وہ دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے بولا۔ ''مثلاً کیا بھلا؟''

''تمہارے پاس ایک گھنٹا فالتو ہے۔'' میں نے بدستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اس میں سے اگر تم آدھا وقت مجھے دے دو تو میں تمہاری خدمت کرنے کے لیے تیار ہوں۔''

کسی وکیل کے منہ سے ''خدمت کرنے'' کے الفاظ سن کر سامنے والے کو یقین نہیں آتا اور کسی پولیس والے کو تو ہرگز نہیں۔ اس نے دائیں بائیں محتاط انداز میں دیکھنے کے بعد پوچھا۔

''وکیل صاحب! میں سمجھا نہیں، آپ کہنا کیا چاہ رہے ہیں؟''

میں نے اپنے والٹ میں سے پچاس روپے کا ایک کرارا نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''اسے جیب میں رکھ لو۔ میں تمہیں سمجھاتا ہوں۔''

ذرا سی ہچکچاہٹ کے بعد اس نے نوٹ کو میرے ہاتھ سے اچک لیا۔ اگلے ہی لمحے وہ نوٹ اس کی پتلون کی جیب میں منتقل ہو چکا تھا پھر اس نے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''جی سمجھائیں وکیل صاحب!''

''اس مصیبت زدہ شخص کو دیکھ رہے ہو؟'' میں نے فاروق کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ بے چارہ مزدور پیشہ انسان قتل کے مقدمے میں پھنسا ہوا ہے اور میں اس کا وکیل ہوں۔ یوں سمجھو کہ یہ کیس آج ہی میرے پاس آیا ہے۔ میں تھوڑی دیر اس سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ معاملہ سمجھ میں آگیا یا نہیں.....؟''

''جی، معاملہ میں سمجھ گیا وکیل صاحب! آپ اس سے بات کرلیں۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''مگر میں آپ کو یہ بتادوں کہ مجھے دو قیدیوں کا انتظار ہے۔ وہ جیسے ہی آگئے، ہم وین لے کر جیل کی جانب روانہ ہوجائیں گے۔ میں نے آپ کو اندازاً ایک گھنٹا بتایا ہے۔ وہ دونوں اس سے پہلے بھی عدالتی کارروائی سے فارغ ہوکر یہاں آسکتے ہیں۔''

''تم بالکل بے فکر ہوجاؤ۔'' میں نے تسلی آمیز انداز میں کہا۔ ''میں وہاں درخت کے نیچے کھڑے ہوکر اپنے موکل سے بات چیت کرلیتا ہوں۔ تم ان دونوں قیدیوں کی راہ دیکھو۔ وہ جیسے ہی تمہیں دور سے آتے نظر آئیں، تم مجھے اشارہ کردینا۔ میں اپنے موکل کو چھوڑ کر آگے بڑھ جاؤں گا۔''

میرے مشورے میں اسے کوئی خرابی محسوس نہیں ہوئی۔ وہ مجھ سے تعاون کرنے کے لیے راضی ہوگیا۔ وہ تعاون جس کا معاوضہ میں اسے پیشگی ادا کرچکا تھا۔ آج کل پچاس روپے میں انسان ایک معیاری چائے ہی پی سکتا ہے لیکن پچاس سال پہلے اس رقم کی اچھی خاصی اہمیت ہوا کرتی تھی۔ ان دنوں ایک عام ملازم کی ماہانہ تنخواہ پانچ چھ سو روپے ہوتی تھی اور آج سے پچاس سال بعد عین ممکن ہے اس رقم میں ایک فانٹا ٹانی ہی خریدی جاسکتی ہو۔

میں نے فاروق کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔ ''دیکھو، میں عموماً اس انداز میں کیس نہیں لیتا لیکن میں نے جمیل صاحب کے کہنے پر تمہارے کیس میں ہاتھ ڈالا ہے۔ باقی باتیں بعد میں..... سب سے پہلے تم مجھے صاف صاف بتاؤ، کیا تم کسی بھی زاویے سے فائزہ کے قتل میں ملوث ہو؟ مجھ سے سچ بولوگے تو اس میں تمہارا ہی فائدہ ہے۔ اگر غلط بیانی سے کام لوگے تو یہ بات زیادہ دیر تک مجھ سے چھپی نہیں رہے گی اور جب بھی ایسا ہوگا میں ایک لمحہ سوچے بغیر تمہارے کیس سے دستبردار ہوجاؤں گا۔ یہ بات تم بھی جانتے ہو کہ پولیس نے تمہارے خلاف بڑا مضبوط مقدمہ بنایا ہے اور وکیل استغاثہ بھی ملزموں کو پھانسی کے پھندے تک پہنچانے کا اسپیشلسٹ مانا جاتا ہے۔''

''میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ فائزہ کے قتل سے میرا دور کا بھی واسطہ نہیں۔ میں نہیں جانتا اس کی موت کا ذمے دار کون ہے۔'' فاروق نے بے حد جذباتی مگر مستحکم لہجے میں جواب دیا۔ ''میرے پاس ایسا کوئی طریقہ یا ذریعہ نہیں ہے جسے اختیار کرکے میں آپ کے سامنے اپنی بے گناہی کو ثابت کرسکوں۔''

''ٹھیک ہوگیا۔'' میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ''میں تمہارے جواب سے مطمئن

www.pklibrary.com

ہوگیا۔ اب آگے بولو۔''

اپنے اطمینان کی بات میں نے ایسے ہی خوامخواہ نہیں کردی تھی۔ فاروق کی آنکھوں و چہرے کے تاثرات اور آواز کے اتار چڑھاؤ نے بڑے واضح انداز میں مجھے باور کرادیا تھا کہ اس نے مجھ سے کسی قسم کی دروغ گوئی نہیں کی تھی۔ وہ واقعتاً ایک بدنصیب اور مصیبت زدہ شخص تھا۔

آئندہ آدھے گھنٹے میں فاروق نے میرے سوالات کے جوابات میں جو کچھ بتایا، میں اس کا خلاصہ آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں تاکہ آپ اس کیس کے پس منظر سے اچھی طرح آگاہ ہوجائیں۔ ایک بات کی وضاحت کرتا چلوں کہ اس میں سے بہت ساری باتیں مجھے بعد میں تحقیق کرنے پر معلوم ہوئی تھیں لیکن واقعات کے تسلسل کو برقرار رکھنے کے لیے میں نے انہیں بھی شاملِ بیان کرلیا ہے۔ اسی طرح چند باتیں میں نے دانستہ آپ سے چھپالی ہیں۔ ان کا ذکر بعد میں عدالتی کارروائی کے دوران میں مناسب مقامات پر آئے گا۔

☆☆☆

مقتولہ سے ملزم کی پہلی ملاقات کم و بیش ڈیڑھ سال پہلے ایک مارکیٹ میں ہوئی تھی۔ ملزم اس مارکیٹ میں نئی کھلنے والی ایک دکان میں لکڑی کا کام کررہا تھا کہ اس نے دیکھا سڑک کے کنارے ایک حسین و جمیل عورت سے کوئی بندہ بدتمیزی کررہا تھا۔ پہلے تو اس نے اس منظر سے نگاہ چرانے کی کوشش کی کہ پرائے پھٹے میں ٹانگ پھنسانا دانشمندی نہیں لیکن پھر اس سے رہا نہ گیا۔ وہ خوب صورت عورت خاصی لاچار اور بے یارومددگار دکھائی دے رہی تھی اور افسوس کا پہلو یہ تھا کہ لوگ بے حسی سے تماشا دیکھ رہے تھے۔ کسی نے بھی اتنی اخلاقی جرأت نہیں دکھائی کہ اس لوفر کو عامیانہ حرکتوں سے روکنے کی کوشش کرتا۔ فاروق کے ضمیر نے ملامت کی اور وہ دکان سے نکل کر جائے وقوعہ پر پہنچ گیا۔

''تم اس خاتون کو کیوں تنگ کررہے ہو؟'' فاروق نے اس بدتمیز شخص سے کڑے لہجے میں پوچھا۔

''تم کون؟'' اس غنڈا ٹائپ بندے نے فاروق کو گھورتے ہوئے سوال کیا۔

''میں کون ہوں، یہ جاننا تمہارے لیے ضروری نہیں۔'' فاروق نے ترکی بہ ترکی کہا۔ ''اس عورت کے راستے سے ہٹ جاؤ ورنہ.....''

فاروق دکان سے نکلا تو ہتھوڑی اس کے ہاتھ میں تھی۔ بات کو نامکمل چھوڑ کر اس نے خطرناک انداز میں اس ہتھوڑی کو حرکت دی تو وہ لفنگا استہزائیہ انداز میں بولا۔

''ابے ہتھوڑا گروپ کی اولاد..... کیا اس ہتھوڑی سے مجھے مارو گے؟''

''اگر تم اوچھی حرکتوں سے باز نہیں آئے تو مجھے مجبوراً یہ بھی کرنا ہی پڑے گا۔'' فاروق نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیا تم اس کے بھائی لگتے ہو جو تمہیں اتنی تکلیف ہورہی ہے؟'' اس نے برہمی سے کہا۔ ''جاؤ، اپنا راستہ ناپو..... اگر میں نے دو چار لگادیں تو اپنے قدموں پر چل کر گھر جانے کے قابل بھی نہیں رہو گے۔''

''مطلب..... شرافت کی زبان تمہاری سمجھ میں نہیں آرہی؟''

''مجھے بدمعاشی کی زبان میں سمجھاؤ تو شاید سمجھ جاؤں۔'' وہ فاروق کا مذاق اڑاتے ہوئے بولا۔

''ٹھیک ہے، بدمعاش کے ساتھ بدمعاشی ہی کرنا پڑے گی۔'' فاروق یہ کہتے ہوئے اس کمینے پر حملہ آور ہوگیا۔

اس بدتمیز شخص کو توقع نہیں تھی کہ ایک مزدور پیشہ شخص یوں اس کے معاملے میں کود پڑے گا۔ فاروق نے اس کی توقعات اور خوش فہمیوں کو چند منٹ میں دھوڈالا۔ جب غنڈے کے منہ اور ناک سے خون جاری ہوا تو وہ راہِ فرار اختیار کرنے پر مجبور ہوگیا۔

''شکریہ..... آپ نے میری جان بچائی۔'' فائزہ نے فاروق کی طرف دیکھتے ہوئے ممنونیت بھرے لہجے میں کہا۔ ''میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر یاد رکھوں گی۔''

''اس میں احسان والی کوئی بات نہیں میڈم۔ میں نے جو کیا وہ میرا فرض تھا۔'' فاروق نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سرسری انداز میں کہا۔ ''اگر میں اس معاملے میں نہ پڑتا تو مجھ جیسا کوئی اور آگے آجاتا۔ ویسے وہ بدذات تھا کون؟''

''اس کا نام شاکر ہے۔'' فائزہ نے بتایا۔ ''خود کو وہ بہت بڑا غنڈا سمجھتا ہے لیکن آج آپ نے اس کی ساری بدمعاشی ناک منہ سے نکال دی۔ امید ہے اب وہ میرے راستے میں نہیں آئے گا۔''

''اس کا مطلب ہے وہ پہلے بھی آپ کو پریشان کرتا رہا ہے؟'' فاروق نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''ہاں، دو تین مرتبہ پہلے بھی وہ اس قسم کی نیچ حرکتیں کرچکا ہے۔''

www.pklibrary.com

''بہرحال اب آپ اطمینان سے اپنے گھر جائیں۔'' فاروق نے گہری نظر سے اس کے حسن بے مثال کا نظارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''شاکر جیسے گھٹیا اور کم ظرف لوگ آپ کو ہر گلی کے نکڑ پر مل جائیں گے۔ انسان کو اپنا خیال خود ہی رکھنا پڑتا ہے۔''

فائزہ اس کے فلسفے پر تبصرہ کیے بغیر آگے بڑھ گئی تو فاروق بھی دکان میں آ گیا لیکن اب کام میں اس کا دل نہیں لگ رہا تھا۔ فائزہ اپنے ساتھ ہی اس کا چین بھی لے گئی تھی۔ اس نے اتنی دلکش اور حسین عورت زندگی میں اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ بقول کسے، اسے فائزہ سے محبت ہو گئی تھی۔

یہ فاروق کی زندگی کا بڑا عجیب موڑ تھا۔ وہ ایک ایسی عورت سے دل لگا بیٹھا تھا جس کا وہ نام، پتا کچھ بھی نہیں جانتا تھا اور اس کا یہ معاملہ تھا بھی یک طرفہ۔ بہرحال اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ اس طرح دار عورت کو تلاش کرنے کی کوشش کرے گا۔ جب وہ مل جائے گی تو وہ اس کے بارے میں معلومات حاصل کرے گا۔ اگر وہ کسی کی منکوحہ یا کسی سے منسوب نکلی تو وہ اپنی محبت کو دل میں چھپا کر ذہن سے اس کا خیال نکال دے گا۔ وہ اس کی خانگی زندگی میں انتشار پیدا کرنے کے حق میں ہرگز نہیں تھا کیونکہ وہ ایسے معاملات کی حساسیت اور نزاکت کو اچھی طرح سمجھتا تھا۔ اس کا اپنا گھر اجڑے ابھی زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔

فاروق نے لگ بھگ دو سال پہلے اپنی بیوی کو طلاق دے دی تھی۔ ریحانہ سے اس کی دو اولادیں تھیں۔ آٹھ سالہ بیٹی مہک اور پانچ سالہ بیٹا کامران۔ دونوں بچے ریحانہ اپنے ساتھ لے گئی تھی اور فاروق اس افسوس ناک واقعے کے بعد سے اپنے گھر میں اکیلا ہو کر رہ گیا تھا۔

ریحانہ کے ساتھ فاروق نے ازدواجی زندگی کے دس کٹھن سال گزارے تھے کیونکہ اس عرصے میں ان کی ایک دن بھی بن کر نہیں دی تھی۔ فاروق ٹھنڈے مزاج کا مالک ایک امن پسند انسان تھا جبکہ ریحانہ انتہائی غصہ ور اور زبان کی تیز تھی۔ اگر اس کے لیے بدزبان کا لفظ استعمال کیا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا۔ جب تک فاروق کی ہمت اور صبر نے ساتھ دیا، یہ رشتہ جیسے تیسے چلتا رہا۔ جب پانی سر سے اوپر ہو گیا تو فاروق کی برداشت جواب دے گئی لہٰذا ان کی دس سالہ لولی لنگڑی رفاقت طلاق کی شکل میں ان کی دائمی جدائی کا سبب بن گئی۔ اس ٹریجڈی کے چھ ماہ بعد فائزہ والا واقعہ پیش آیا تھا۔

وہ ایک مختصر حادثاتی ملاقات تھی۔ فاروق نے ایک اجنبی حسینہ کو شاکر نامی غنڈے کی غنڈا گردی سے بچایا تھا۔ اس چند منٹ کے ''آمنے سامنے'' نے فائزہ کی صورت کو فاروق کے اجڑے پجڑے دل میں جاگزیں کر دیا تھا۔ وہ جذبات کی شدت کے ساتھ اسے چاہنے لگا تھا۔ اس کی دلی خواہش تھی کہ وہ اسے دوبارہ نظر آئے اور وہ اس سے چند باتیں کر سکے۔ فاروق کی یہ تمنا تین ماہ بعد پوری ہو گئی لیکن اس کے نتائج اس کی توقع کے برعکس برآمد ہوئے۔

وہ ایک بس سے اترا ہی تھا کہ سڑک کی دوسری جانب اس کا چین چرانے والی مہ جبیں دکھائی دی۔ اس نے ٹریفک کی پروا کیے بغیر تقریباً دوڑتے ہوئے سڑک پار کی اور دوسری طرف پہنچ گیا۔ وہ اپنی جان کو داؤ پر لگا کر رواں ٹریفک کے احتجاجی ہارنز کے شور میں سڑک عبور کرنے میں تو کامیاب ہو گیا تھا لیکن اس دوران میں وہ طرح دار عورت ایک شاپنگ مال میں داخل ہو چکی تھی۔ وہ اپنی منزل کے اتنا نزدیک آ جانے کے بعد مایوس نہیں لوٹنا چاہتا تھا لہٰذا وہ بھی مذکورہ شاپنگ مال میں گھس گیا۔

جلد ہی فاروق کی بے قرار متلاشی نظر نے اسے کھوج لیا۔ وہ ایک کاسمیٹکس شاپ پر کھڑی تھی۔ فاروق اس کے قریب چلا گیا اور دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اسے پکارا۔

''میڈم.....!''

فاروق ابھی تک فائزہ کے نام سے ناواقف تھا اس لیے اس نے مخاطب کرنے کے لیے لفظ ''میڈم'' کا سہارا لیا تھا۔ فائزہ نے اس کی پکار پر پلٹ کر دیکھا اور گہری سنجیدگی سے بولی۔

''جی.....فرمایئے؟''

''میڈم! آپ نے مجھے پہچانا؟'' وہ اضطراری لہجے میں مستفسر ہوا۔

فاروق کے سوال نے فائزہ کے چہرے پر الجھن ابھار دی۔ وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے قدرے سخت لہجے میں بولی۔ ''میں تمہیں نہیں جانتی۔ کون ہو تم.....؟''

''تین ماہ پہلے ہماری ملاقات ہوئی تھی.....'' فاروق نے اسے یاد دلانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''شاکر نام کا ایک غنڈا آپ کو تنگ کر رہا تھا اور میں نے اس کی پٹائی کر کے آپ کی جان بچائی تھی.....؟''

فائزہ کے چہرے پر ایسے تاثرات نمودار ہوئے جیسے اس نے فاروق کو پہچان لیا ہو اور وہ واقعہ بھی اسے یاد آ گیا ہو۔ فاروق نے جذبات سے مغلوب آواز میں خود کو متعارف کرانے کی ایک اور کوشش کی۔

www.pklibrary.com

''میرا نام فاروق ہے۔ میں کارپینٹر ہوں۔ اس روز میں نے اپنی ہتھوڑی کی مدد سے شاکر کی دھلائی کی تھی اور میرے اس کارنامے پر آپ نے میرا شکریہ بھی ادا کیا تھا.....''

''کیا مجھ سے بے تکلف ہونے کے لیے یہ تمہاری کوئی چال ہے؟'' فائزہ نے غصیلے انداز میں استفسار کیا۔

''نہیں میڈم!'' وہ بڑی شدت سے نفی میں گردن جھٹکتے ہوئے وضاحتی لہجے میں بولا۔ ''میں سچ کہہ رہا ہوں۔ آپ یاد کرنے کی کوشش تو کریں۔ میں نے.....''

''بس، بس!'' وہ ہاتھ کے اشارے سے فاروق کو خاموش کراتے ہوئے برہمی سے بولی۔ ''میں نے بہت سن لی تمہاری بکواس۔ تم جو کوئی بھی ہو، میں تمہیں بالکل نہیں جانتی اور نہ ہی جاننا چاہتی ہوں۔ اگر تم نے دوبارہ کبھی مجھے پریشان کرنے کی کوشش کی تو میں تمہیں پولیس کے حوالے کردوں گی۔ اپنی شکل گم کرو.....'' لمحاتی توقف کرکے اس نے ایک آسودہ سانس خارج کی پھر خود کلامی کے انداز میں بڑبڑائی۔ ''پتا نہیں کہاں کہاں سے آجاتے ہیں۔''

فائزہ کے رویے سے فاروق کے دل پر ایک گھونسا سا لگا تھا۔ ان کی باہمی تکرار نے آس پاس موجود دوسرے لوگوں کو اس طرف متوجہ کردیا تھا۔ فائزہ سے مزید کوئی بات کرنے کا فائدہ نہیں تھا لہٰذا اجل اس کے کہ چاروں طرف سے خشم آلود نظروں سے گھورنے والے افراد فاروق کی عزت کا فالودہ بناڈالتے، اس نے وہاں سے کھسک لینے ہی میں عافیت جانی۔

فائزہ کے غیر اخلاقی بلکہ غیر انسانی طرزِ عمل نے فاروق کو ذہنی اذیت سے دوچار کردیا تھا۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ ایسی اجنبیت دکھائے گی۔ تین ماہ کا عرصہ کچھ زیادہ نہیں ہوتا۔ اگر بفرضِ محال یہ بھی سوچ لیا جاتا کہ فائزہ حافظے کی کمزور واقع ہوئی تھی تو یہ ممکن نہیں تھا کہ فاروق کے یاد دلانے پر بھی اس کی یادداشت نے انگڑائی نہ لی ہو۔ اس کا ایک ہی مطلب تھا اور وہ یہ کہ فائزہ نے اسے دانستہ طور پر نظر انداز کیا تھا مگر فاروق ''دل ہے کہ مانتا نہیں'' ایسی کیفیت کا شکار تھا۔

دو ڈھائی ماہ کے بعد وہ ایک بار پھر فاروق کو دکھائی دی۔ اب کی مرتبہ اس کے ساتھ دو لڑکیاں اور بھی تھیں۔ یہ ان کی تیسری اور آخری ملاقات تھی۔ چند ماہ پہلے شاپنگ مال میں فائزہ نے اس کے ساتھ جو سلوک کیا تھا وہ اس امر کا متقاضی تھا کہ وہ غلطی سے بھی پلٹ کر فائزہ کی طرف نہ دیکھے مگر معاملاتِ دل ایسے تقاضوں کی کہاں پروا کرتے ہیں۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ وہ فائزہ کو پہلے سے زیادہ چاہنے لگا تھا۔

وہ تینوں طارق روڈ پر واقع ایک جوس کی دکان میں بیٹھی تھیں۔ فاروق کسی غیر مرئی طاقت کے زیرِ اثر ان کے نزدیک پہنچ گیا۔ قبل اس کے کہ وہ زبان کھولتا، فائزہ کی اس پر نگاہ پڑگئی۔ فاروق نے اس کا چہرہ متغیر ہوتے دیکھا۔

''تم یہاں بھی چلے آئے.....!'' فائزہ نے اس پر انگلی اٹھاتے ہوئے برہمی سے کہا۔ ''تم مجھے فالو کرنے سے باز نہیں آؤ گے، گھٹیا انسان۔ تمہیں پولیس کے حوالے کرنا ہی پڑے گا۔''

''فائزہ! کون ہے یہ؟'' فائزہ کی ایک دوست نے فاروق کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''میں اس لفنگے کو بالکل نہیں جانتی مریم!'' فائزہ نے فاروق کو نفرت بھری نظر سے گھورتے ہوئے اپنی دوست کو جواب دیا۔ ''پتا نہیں، یہ میرے پیچھے کیوں پڑگیا ہے۔ کہتا ہے اس نے کسی غنڈے سے میری جان بچائی تھی۔ خوامخواہ مجھ سے فری ہونے کی کوشش کرتا ہے۔''

''تمہیں شرم آنا چاہیے یوں لیڈیز سے بدتمیزی کرتے ہوئے۔'' فائزہ کی دوسری دوست صدف نے فاروق کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''کیا تمہارے گھر میں کوئی ماں، بہن یا بیٹی نہیں ہے؟''

''میں کوئی لچا، لفنگا اور آوارہ انسان نہیں ہوں۔'' فاروق نے ہمت سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ''میرا نام فاروق ہے۔ میں ترکھان کا کام کرتا ہوں۔ میں نے میڈم سے کبھی کوئی بدتمیزی نہیں کی۔ میں تو ان کا نام تک نہیں جانتا تھا۔ ابھی معلوم ہوا کہ میڈم کا نام فائزہ ہے۔ میں تو ان سے بس دو چار باتیں کرنا چاہتا تھا۔''

''اور تمہارا دعویٰ ہے کہ تم نے کسی غنڈے سے فائزہ کی جان بچائی تھی؟'' مریم نے فاروق سے پوچھا۔

''ہاں..... یہ پانچ چھ ماہ پہلے کی بات ہے۔'' فاروق نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ''میں ایک دکان میں لکڑی کا کام کررہا تھا کہ میں نے میڈم کو سڑک پر کسی غنڈے سے الجھتے دیکھا۔ میں کام چھوڑ کر وہاں چلا آیا اور اپنی ہتھوڑی کی مدد سے میں نے اس غنڈے کے ناک منہ سے خون جاری کردیا تھا۔ جب وہ اوباش شخص اپنی جان بچا کر موقع سے فرار ہوگیا تو میڈم نے مجھے بتایا کہ اس بدمعاش کا نام شاکر ہے.....''

فاروق کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی صدف نے فائزہ سے پوچھ لیا۔ ''کہیں یہ وہی شاکر تو نہیں جو اکثر تمہیں

www.pklibrary.com

تنگ کرتا رہتا ہے؟''

''ہاں ہاں..... بالکل وہی۔'' فاروق نے اضطراری لہجے میں کہا۔ ''میڈم نے مجھے یہی بتایا تھا کہ شاکر ہاتھ دھو کر ان کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔''

''شاکر کی کہانی الگ ہے۔'' فائزہ نے زچ ہوتے ہوئے کہا۔ ''مگر یہ کون ہے؟'' اس نے فاروق کی سمت انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے حتمی انداز میں کہا۔ ''اس بارے میں مجھے کچھ معلوم نہیں۔ یہ جہاں مجھے دیکھتا ہے، کسی نہ کسی بہانے مجھ سے بے تکلف ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ پچھلی مرتبہ میں نے اسے وارننگ بھی دی تھی کہ اگر آئندہ تم میرے آس پاس دکھائی دیے تو میں تمہیں پولیس کے حوالے کردوں گی مگر اس کی ڈھٹائی نما دیدہ دلیری دیکھو، یہ پھر اپنی منحوس شکل لے کر یہاں چلا آیا۔ کمینگی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔''

''دیکھو مسٹر! تم جو کوئی بھی ہو، میری بات دھیان سے سنو.....'' مریم نے فاروق سے مخاطب ہوتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''فائزہ کا خیال اپنے دل و دماغ سے نکال دو۔ اگلے ماہ اس کی شادی ہونے والی ہے۔ تم اس سے جو بھی بات کرنا چاہتے ہو، اس کی کوئی اہمیت ہے اور نہ ہی ضرورت۔ میرے پاپا ایک سینئر پولیس آفیسر ہیں۔ اگر آئندہ تم نے کسی بھی انداز میں فائزہ کو ہراساں کرنے کی کوشش کی تو پھر مجبوراً مجھے اپنے پاپا سے بات کرنا پڑے گی۔ اس کے بعد تم سیدھے جاؤ گے جیل میں۔ میری بات سمجھ میں آئی یا نہیں؟''

''میں سمجھ گیا۔'' وہ حسرت بھری نظر سے فائزہ کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ''میڈم! مجھے معاف کردیں۔ آپ نے مجھے غلط سمجھا تھا۔''

''اچھا اچھا، ٹھیک ہے۔'' فائزہ نے ناگواری سے کہا۔ ''اب نکلو یہاں سے۔''

فاروق اس جوس سینٹر سے تو گردن جھکا کر باہر نکل گیا تھا لیکن اس کا دماغ یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ فائزہ نے اس کے ساتھ ایسا برتاؤ کیوں کیا۔ اسے صحیح معنوں میں اپنی ذلت کا احساس ہوا تھا اور اس خفت کے علاوہ مریم کا یہ انکشاف بھی اس کے دل میں کسی میخ کے مانند پیوست ہوگیا تھا کہ اگلے ماہ فائزہ کی شادی ہونے والی تھی۔ اس نے گھر آکر فائزہ کے معاملے پر بہت سوچا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ فائزہ نے اس کے ساتھ جو بھی سلوک کیا، وہ سب رہا ایک طرف..... بہرحال اسے اپنے دل و دماغ کو فائزہ کے خیال سے خالی کردینا چاہیے۔ اس نے ایک بار فیصلہ کرلیا تو پھر اس پر ڈٹ گیا۔

یہ تھا وہ پس منظر جس کے حوالے سے وکیل استغاثہ نے عدالت میں کہا تھا کہ ملزم اور مقتولہ کے بیچ چپقلش کا بڑا مضبوط بیک گراؤنڈ ہے۔ اس نے فائزہ کے قتل کا محرک اور جواز یہ بتایا تھا کہ ملزم، مقتولہ کا پیچھا کرکے اسے پریشان کرنے کی کوشش کرتا رہتا تھا۔ مجبوراً مقتولہ نے اسے ایک دو بار بری طرح ذلیل کیا۔ ملزم اپنی اس بے عزتی کو بھولا نہیں اور موقع ملتے ہی اس نے مقتولہ کا کام تمام کردیا..... وغیرہ وغیرہ۔

وکیل سرکار نے ایک پوائنٹ یہ بھی اٹھایا تھا کہ وقوعہ کی شام ملزم، مقتولہ کے گھر کے نزدیک منڈلاتا دیکھا گیا تھا اور یہ غیر معمولی بات تھی کیونکہ ملزم پاپوش نگر میں رہتا تھا اور مقتولہ کی رہائش شاہ فیصل کالونی میں تھی۔ دونوں کے گھروں کے درمیان اچھا خاصا فاصلہ موجود تھا۔ علاوہ ازیں آلۂ قتل پر ملزم کے فنگر پرنٹس کا پایا جانا بھی اس کی پوزیشن کو کمزور بناتا تھا۔

آئندہ پیشی سے پہلے میں نے کڑی دوڑ دھوپ کے بعد اپنے مؤکل کی فیور میں کافی سے زیادہ مواد جمع کرلیا تھا۔ آگے بڑھنے سے پہلے میں پوسٹ مارٹم رپورٹ اور آلۂ قتل کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

مقتولہ فائزہ کی لاش گھر کے اندر کچن میں پڑی ملی تھی۔ اس کی موت پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق اٹھارہ اپریل کی شام پانچ اور سات بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ میڈیکولیگل آفیسر کے مطابق مقتولہ کی کھوپڑی کے عقبی حصے میں کسی آہنی شے سے کاری ضرب لگائی گئی تھی جس کے بعد وہ زمیں بوس ہوگئی تھی۔ بعدازاں کسی تیز دھار آلے کی مدد سے اس کی کلائی کی نس کاٹ دی گئی تھی جس کی وجہ سے اس کا خون خطرناک حد تک بہہ گیا تھا۔ کچن کے فرش پر لاش کے نزدیک مقتولہ کا خون پھیلا ملا تھا۔ موت کا سبب یہی خون کا اخراج بتایا گیا تھا۔

پولیس نے جائے وقوعہ سے آلۂ قتل بلکہ آلاتِ قتل برآمد کرلیے تھے یعنی ایک ہتھوڑی اور ایک چیزل (چھینی)۔ ان دونوں اوزار کے چوبی دستوں پر ملزم کے فنگر پرنٹس پائے گئے تھے۔ بعدازاں یہ بھی معلوم ہوگیا تھا کہ یہ دونوں اوزار ملزم فاروق کی ملکیت تھے۔

☆☆☆

اس کیس کی باقاعدہ کارروائی کا آغاز ہوا۔ جج نے

www.pklibrary.com

فردِ جرم پڑھ کر سنائی۔ ملزم نے صحتِ جرم سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد ملزم کا حلفیہ بیان ریکارڈ کیا گیا اور وکیل استغاثہ جرح کے لیے ایکوزڈ باکس کے نزدیک چلا گیا۔ میں نے اپنے مؤکل کو اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ اس نے اپنے بیان میں کون سی بات کرنا ہے اور کون سی نہیں۔ اس نے میری ہدایات پر من وعن عمل کیا تھا۔

وکیل استغاثہ نے ملزم کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ''کیا تم مقتولہ کو پسند کرتے تھے؟''

''ہاں..... یہ درست ہے۔'' ملزم نے اثبات میں جواب دیا۔

''لیکن مقتولہ تمہاری شکل دیکھنے کی روادار نہیں تھی۔'' وکیل استغاثہ نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''کیا تم نے اس کا تعاقب کیا لیکن اس نے ہر بار تمہاری حوصلہ شکنی کی۔ تم ایسی ڈھیٹ مٹی کے بنے ہوئے ہو کہ مقتولہ کی ڈانٹ پھٹکار کا تم پر ذرا اثر نہ ہوا۔ بالآخر تنگ آ کر اس نے اپنی دوستوں کے سامنے ایک جوس سینٹر پر تمہیں بری طرح ذلیل کیا..... کیا تھا یا نہیں؟''

''وکیل صاحب! آپ ایک سیدھے سادے واقعے کو غلط رنگ دے رہے ہیں۔'' ملزم نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''میڈم فائزہ مجھے اچھی طرح جانتی اور پہچانتی تھیں لیکن پتا نہیں کیوں وہ اجنبیت کا تاثر دیتی تھیں۔ ہاں، یہ درست ہے کہ انہوں نے اپنی دوستوں کی موجودگی میں مجھ سے قطعی لاتعلقی کا اظہار کرتے ہوئے واشگاف الفاظ میں کہا تھا کہ آئندہ میں کبھی ان سے ملنے کی کوشش نہ کروں اور اس واقعے کے بعد سے میں نے اپنے دل و دماغ سے انہیں ہمیشہ کے لیے نکال دیا تھا۔ یہی سچائی ہے۔ باقی آپ کا جو دل چاہے، سمجھیں.....''

''تم نے اپنے دل سے مقتولہ کا خیال اس لیے نکال دیا تھا کہ اس کی ایک دوست کی زبانی تمہیں پتا چلا تھا کہ آئندہ ماہ اس کی شادی ہونے والی ہے لہٰذا کسی بھی صورت میں تمہاری دال گلنے والی نہیں۔'' وکیل استغاثہ نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ''لیکن بے عزتی کا منظر گویا تمہارے دماغ پر نقش ہو کر رہ گیا تھا۔ تم اپنی ذلت کا بدلہ لینے کے لیے وقت اور مناسب موقع کا انتظار کرنے لگے اور بالآخر ایک سال کے بعد تمہیں یہ موقع میسر آ گیا اور تم نے نہایت ہی ہوشیاری کے ساتھ اپنے انتقام کی آگ کو بجھا لیا.....''

''آپ جو کچھ بھی فرما رہے ہیں، اس میں کوئی صداقت نہیں ہے۔'' ملزم نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔ ''جس روز مجھے پتا چلا تھا کہ میڈم فائزہ کی ایک ماہ کے اندر شادی ہونے والی ہے، میں نے اسی دن میڈم کو اپنی یادداشت سے مٹا دیا تھا کیونکہ میرا میڈم کی جانب راغب ہونا، ان سے بات کرنے کی کوشش کرنا..... یہ سب کچھ محض اس لیے تھا کہ میں ان سے شادی کی خواہش رکھتا تھا۔''

''ایک ناکام شادی کے بعد دوسری کوشش.....!'' وکیل استغاثہ نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''کیا تم اس حقیقت سے انکار کرو گے کہ دو سال قبل تمہاری بیوی تمہیں چھوڑ کر چلی گئی تھی اور دونوں بچے بھی ساتھ لے گئی تھی؟''

''میں اس واقعے سے انکار نہیں کروں گا مگر جس طرح آپ بیان کر رہے ہیں، اس سے میں اتفاق نہیں کرتا۔'' ملزم نے رسان بھرے لہجے میں کہا۔ ''ریحانہ مجھے چھوڑ کر نہیں گئی تھی بلکہ میں نے اس کی نافرمانی اور بدزبانی سے تنگ آ کر اسے طلاق دے دی تھی اور جہاں تک دونوں بچوں کا معاملہ ہے تو میری بیٹی مہک آٹھ سال کی اور بیٹا کامران صرف پانچ سال کا تھا۔ ایسے کم عمر بچوں کی پرورش کے لیے ماں کا ساتھ ضروری ہے پھر ریحانہ کی ضد بھی تھی کہ وہ دونوں بچوں کو اپنے پاس ہی رکھے گی، اس لیے میں نے بچوں کی کسٹڈی کے لیے کسی قسم کی قانونی چارہ جوئی کا سہارا نہیں لیا۔ جب کامران اور مہک سمجھ دار ہو جائیں گے اور وہ اپنی مرضی سے جہاں بھی رہنا چاہیں گے، میں مخالفت نہیں کروں گا۔ باقی جہاں تک میری ذلت اور بے عزتی کا معاملہ ہے تو.....'' وہ سانس ہموار کرنے کے لیے رکا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''جب میڈم فائزہ نے مجھے پہچاننے سے انکار کیا تو مجھے حیرت کے ساتھ تکلیف بھی ہوئی تھی۔ جب انہوں نے نہایت ہی برہمی سے مجھے پولیس کے حوالے کرنے کی بات کی تو یقین جانیں مجھے ان کی دماغی صحت پر شک ہوا تھا اور جب یہ صاف ہو گیا کہ آئندہ ماہ ان کی شادی ہونے والی ہے تو یہ قصہ ہی تمام ہوا۔ میں تو میڈم کو بھول بھال بھی گیا تھا کہ ایک سال کے بعد مجھے انہی کے قتل کے کیس میں دھر لیا گیا۔ میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں کہ میڈم فائزہ کی موت سے میرا کوئی تعلق واسطہ نہیں۔ ہاں البتہ ان کے ساتھ جو بھی افسوسناک واقعہ پیش آیا، مجھے اس کا دلی رنج ہے۔''

''تمہارے چھوٹی یا بڑی قسم کھانے سے کیس کی سنگینی میں کوئی کمی واقع ہوگی اور نہ ہی تمہاری رنجیدگی سے کوئی فائدہ حاصل ہونے والا ہے۔'' وکیل استغاثہ نے کہا۔ ''عدالت انسانی جذبات سے مغلوب ہو کر نہیں بلکہ ٹھوس شواہد اور مضبوط ثبوتوں کی بنیاد پر اپنے فیصلے صادر فرماتی

www.pklibrary.com

ہے۔ تمہاری اس بات میں کوئی دم نہیں کہ ایک کمال پہلے تم نے مقتولہ کو اپنے دل و دماغ سے مٹا دیا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس دوران میں تم مسلسل اس کی تلاش میں رہے تھے۔ جب تم نے اس کا پتا ٹھکانا کھوج نکالا تو تم نے اسے بلیک میل کرنے کی کوشش کی مگر وہ تمہاری کسی دھونس میں نہ آئی بلکہ ایک موقع پر تو اس نے تمہارے منہ پر ایک زناٹے دار طمانچہ بھی رسید کر دیا تھا۔ جب تمہی سیدھی انگلی سے نکلتا دکھائی نہ دیا تو تم نے انگلی کو ٹیڑھا کر لیا۔ تم نے مقتولہ کے سامنے والے گھر میں لکڑی کے کام کا ٹھیکا پکڑا اور مقتولہ کی زندگی کا چراغ گل کر کے چلتے بنے۔ اب تم کہو گے کہ میں نے ایک فرضی کہانی سنا دی ہے۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں وکیل صاحب.....!'' ملزم نے اطمینان بھرے انداز میں کہا۔

''مطلب..... تم تسلیم کرتے ہو کہ مقتولہ کو موت کے گھاٹ اتارنے میں تمہارا ہی ہاتھ ہے؟''

''آپ غلط سمجھے۔'' وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ ''میرا اشارہ آپ کی سنائی ہوئی فرضی کہانی کی جانب تھا۔ یہ درست ہے کہ میں نے شاہ فیصل کالونی کے ایک مکان میں کچن کا کام پکڑا تھا مگر خدا گواہ ہے مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ جس مکان میں، میں کام کر رہا تھا، اس کے عین سامنے میڈم فائزہ کی رہائش ہے۔ میں تین دن تک وہاں کچن کے کام میں مصروف رہا اور جب میں کام ختم کر کے واپس آ گیا تو پولیس نے مجھے میڈم کے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا۔''

وکیل استغاثہ ملزم کو چھوڑ کر اس چوبی میز کی جانب بڑھا جہاں آلۂ قتل سیلوفین بیگ میں رکھا ہوا تھا۔ دراصل اس بیگ کے اندر دو اوزار محفوظ کیے گئے تھے جن میں ایک ہتھوڑی اور دوسری چھینی تھی۔ اس چھینی کے پھل پر مقتولہ کا خون بھی لگا ہوا تھا جو خشک ہونے کے بعد سیاہ رنگت اختیار کر چکا تھا۔ مذکورہ چھینی اور ہتھوڑی کے دستے پر ملزم کی انگلیوں کے نشانات پائے گئے تھے۔ وکیل استغاثہ ایک بار پھر اکیوزڈ باکس کے قریب پہنچا اور سیلوفین بیگ کو ملزم کی آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے جارحانہ انداز میں بولا۔

''اس ہتھوڑی اور چیزل (چھینی) پر تمہارے فنگر پرنٹس ملے ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ تم نے انہی کا استعمال کر کے مقتولہ کو فنا کے گھاٹ اتارا ہے۔ یہ دونوں اوزار تمہاری ہی ملکیت ہیں نا.....؟''

ایک بات کی وضاحت کرتا چلوں کہ ترکھان کی چھینی اور پلمبر یا لوہار کی چھینی میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ بڑھئی کی چھینی

موسم گرما کی ابتدائی نرمیاں
مئی 2021ء کے
شمارے کی انہونی کہانیاں

اولین صفحات
عشق کے ہزار رنگ ہیں..... اپنے قریبی لوگوں سے ہونے والی محبت جب عشق کا روپ دھارتی ہے تو نئی حیرتوں کو جنم دیتی ہے..... محبت اور نفرت کی شدتوں کا اظہار **شبنم شفیق** کے قلم کا افتخار

انا گیر
سنہری ریت کے سرابوں میں بھٹکتے خوابوں کے سوداگر کی دل فگار داستان..... **امجد جاوید** کے زور آور قلم کا امتحان.....

الاؤ
مسیحاؤں کے بھیس میں شاطر مجرموں کا کھیل..... زندہ انسانوں کے لیے دہکتے الاؤ کی صورت موت تیار کی جا رہی تھی..... **ڈاکٹر عبدالرب بھٹی** کے قلم سے نیا سنسنی خیز سلسلہ

سرورق کے رنگ
پہلا رنگ
آشنا ناآشنائی کے مراحل طے کرتی کہانی کے سنگین حقائق
دوسرا رنگ
دولت کے پیچھے بھاگتے بھاگتے منزل کھو دینے والوں کا امتحان

چینی نکتہ چینی
آپ کے تبصرے... مشورے... محبتیں... شکایتیں... اور نئی نئی دلچسپ باتیں... کتھائیں

www.pklibrary.com

کی دھار نسبتاً زیادہ تیز ہوتی ہے۔ ایک کارپینٹر اپنی چھینی کی مدد سے فرنیچر کے مختلف جوڑوں کو صاف کرتا ہے اور آرمی کی کٹنگ سے لکڑی کی سطح پر جو کھردرا پن نمودار ہوتا ہے، اسے بھی اسی چھینی کے ذریعے ہموار کیا جاتا ہے۔ اس چھینی کا بنیادی کام لکڑی کو چھیلنا ہے، اسی مقصد کے لیے اس کی دھار خطرناک حد تک تیز ہوتی ہے۔

''جی بالکل.....!'' ملزم نے وکیل استغاثہ کے سوال کے جواب میں کہا۔ ''یہ ہتھوڑی اور چھینی میری ہی ہیں۔''

وکیل استغاثہ نے آلاتِ قتل والے سیلوفین بیگ کو دوبارہ چوبی میز پر سجا دیا پھر روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے کراری آواز میں بولا۔

''یور آنر! جس ہتھوڑی سے مقتولہ کی کھوپڑی کے عقبی حصے کو نشانہ بنا کر اسے دنیا و مافیہا سے بے خبر کیا گیا اور عالم بے ہوشی میں جس چھینی کی تیز دھار سے مقتولہ کی کلائی پر واقع نس کو کاٹ کر اسے موت کے منہ میں دھکیلا گیا، وہ دونوں اوزار ملزم کی ملکیت ہیں اور ان کے ہینڈلز پر ملزم کے فنگر پرنٹس کا پایا جانا اس امر کی دلیل ہے کہ ملزم نے اپنی محرومی، ناکامی، ذلت اور رسوائی کا بدلہ لینے کے لیے مقتولہ کو دردناک موت سے ہمکنار کیا ہے..... دیٹس آل۔''

اپنی باری پر میں ایکوزڈ باکس کے نزدیک چلا گیا پھر اپنے مؤکل سے مخاطب ہوتے ہوئے معتدل انداز میں پوچھا۔ ''تم نے تین روز تک جن صاحب کے کچن میں لکڑی کا کام کیا تھا، ان کا نام کیا ہے؟''

''منظور حسین!''

''اچھی طرح یاد کر کے بتاؤ۔'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جما کر کہا۔ ''تم نے کن تاریخوں میں منظور حسین کی کچن کیبنٹس تیار کی تھیں؟''

''پندرہ سے سترہ اپریل تک۔'' اس نے جواب دیا۔ ''یعنی پندرہ، سولہ اور سترہ اپریل کے تین دن۔''

''کیا ان تین دنوں میں وہ ہینڈ ٹیمپر (ہتھوڑی) اور چیزل (چھینی) تمہارے استعمال میں رہی تھیں جو فائزہ کے قتل میں استعمال ہوئی ہیں؟''

''میں اس بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔'' وہ صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔ ''بات دراصل یہ ہے کہ میری ٹول کٹ میں دو ہتھوڑیاں اور تین چار چھینیاں رکھی رہتی ہیں۔ بس، جو ہاتھ میں آجائے، میں اسی سے کام شروع کر دیتا ہوں۔''

''تمہیں کب اس بات کا احساس ہوا کہ تمہارے اوزار والے تھیلے (ٹول کٹ) میں ایک ہتھوڑی اور چھینی غائب ہے؟''

''میں سترہ اپریل کی شام منظور حسین کے کچن کا کام مکمل کر کے اپنے گھر چلا گیا تھا۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''اگلی صبح جب میں کسی اور جگہ کام پر جانے لگا تو میں نے ٹول کٹ میں ایک ہتھوڑی اور چھینی کو غائب پایا۔ میرے ذہن میں یہی خیال آیا کہ یہ دونوں اوزار منظور حسین کے کچن ہی میں رہ گئے ہیں چنانچہ اٹھارہ اپریل کی سہ پہر میں انہی اوزاروں کے لیے دوبارہ منظور حسین کے گھر پہنچ گیا مگر میرے اوزار نہیں ملے۔ میں مایوس ہو کر واپس چلا آیا تھا۔ میں نے نیا کام ڈرگ روڈ کے علاقے میں پکڑا تھا اس لیے میں ہتھوڑی اور چھینی کی تلاش میں شاہ فیصل کالونی چلا بھی گیا۔ اگر دور کا معاملہ ہوتا تو میں ان اوزاروں کے لیے یہ تکلیف نہ اٹھاتا۔ اب یہی بات سمجھ میں آرہی ہے کہ جن دنوں میں منظور حسین کے گھر میں کام کر رہا تھا، کسی نے میری ہتھوڑی اور چھینی کو چرا لیا ہوگا۔ جب ہم کام میں مصروف ہوتے ہیں تو ہمارے بیشتر اوزار ٹول کٹ کے باہر زمین پر پڑے رہتے ہیں۔ انہیں چوری کرنا زیادہ مشکل ثابت نہیں ہوتا۔ ہمارا دھیان تو کام میں لگا ہوتا ہے۔ ایسے میں کوئی ہوشیار انسان بہ آسانی اپنے فن کا مظاہرہ کر سکتا ہے۔''

ایک فوری خیال کے تحت میں نے پوچھا۔ ''منظور حسین کے گھر میں کل کتنے افراد رہائش پذیر ہیں؟''

''ابھی اس گھر میں باقاعدہ رہائش اختیار نہیں کی گئی تھی۔ میرا مطلب ہے، جب میں وہاں کام کر رہا تھا۔ آج کل کا مجھے پتا نہیں۔'' ملزم نے بتایا۔ ''دراصل منظور حسین نے وہ گھر خریدا تھا اور شفٹنگ سے پہلے مختلف نوعیت کے کام کروا رہا تھا۔''

''اس سے تو ظاہر ہوتا ہے کہ تمہارے علاوہ اور لوگ بھی اس گھر میں کام کر رہے تھے؟''

''الیکٹریشن اور پلمبر اپنا کام نمٹا کر جا چکے تھے۔'' ملزم نے جواب دیا۔ ''میں اور زاہد علی لگے ہوئے تھے۔ میں تو سترہ اپریل کو فارغ ہو گیا تھا لیکن زاہد کا دو تین دن کا کام ابھی باقی تھا۔''

''زاہد نامی وہ بندہ کیا کام کرتا ہے؟''

''زاہد رنگ روغن کا کام کرتا ہے۔'' ملزم نے بتایا۔ ''زاہد مجھ سے پہلے وہاں پہنچ جایا کرتا تھا اور میرے چھٹی کرنے کے بعد بھی وہ کام میں لگا رہتا تھا۔ اس کا گھر شاہ فیصل کالونی ہی میں ہے اس لیے وہ میری بہ نسبت زیادہ دیر

www.pklibrary.com

تک کام کرلیتا تھا۔ منظور حسین نے گھر کی ایک چابی بھی زاہد کو دے رکھی تھی۔ وہی صبح گھر کو کھولتا تھا اور شام میں بند کرکے اپنے گھر چلا جاتا تھا۔ منظور حسین کسی سرکاری محکمے میں ملازم تھے۔ وہ روزانہ دوپہر کے بعد ہمارے کام کا معائنہ کرنے چلے آتے تھے۔''

''ٹھیک ہوگیا۔'' میں نے اطمینان بھری سانس خارج کرنے کے بعد سوال کیا۔ ''کیا تم چھٹی کے بعد اپنی ٹول کٹ کو منظور حسین کے گھر پر ہی چھوڑ جایا کرتے تھے؟''

''جی وکیل صاحب.....!'' اس نے اثبات میں جواب دیا۔

''یعنی اگر رنگ ساز زاہد علی چاہتا تو تمہاری ٹول کٹ میں سے بہ آسانی ہتھوڑی اور چھینی نکال کر ادھر ادھر کرسکتا تھا؟''

''جی بالکل.....اس کے لیے یہ مشکل نہیں تھا۔''

''تم تین دن تک منظور حسین کی کچن کیبنٹس بنانے میں مصروف رہے تھے۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''اس دوران میں غیر متعلقہ لوگ بھی وہاں آتے رہے ہوں گے؟''

''جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، منظور حسین سے ملنے دو افراد آئے تھے جنہیں منظور حسین نے اپنا پورا گھر دکھایا تھا۔'' ملزم وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''ان میں سے ایک تو ان کا سامنے والا پڑوسی دانش تھا اور دوسرا ڈرگ روڈ کار رہائشی فیض احمد تھا۔ دانش نے زاہد علی کے کام کی تعریف کرتے ہوئے اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ جب زاہد یہاں سے نمٹ جائے تو وہ اس سے اپنے ہوٹل میں رنگ و روغن کا کام کروائے گا جبکہ.....'' وہ تھوڑی دیر کے لیے متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔ ''فیض احمد کو میرا کام بہت پسند آیا تھا۔ وہ مجھ سے اپنے گھر کے کچن میں کام کروانا چاہتا تھا۔ میں منظور حسین کی طرف سے فارغ ہونے کے بعد ڈرگ روڈ پر فیض احمد کے گھر میں کام پر لگ گیا تھا مگر میں وہاں پر دو دن سے زیادہ کام نہیں کرسکا، یعنی اٹھارہ اور انیس اپریل۔ انیس اپریل کی شام جب میں اپنے گھر آیا تو پولیس نے مجھے میڈم فائزہ کے قتل کے الزام میں گرفتار کرلیا تھا۔''

میں نے پچھلے پندرہ منٹ گھما پھرا کر اپنے مؤکل سے ایسے سوال کیے تھے جن کی روشنی میں یہ ثابت کیا جاسکے کہ ملزم کی ہتھوڑی اور چھینی چرانا نہایت ہی آسان کام تھا۔ شاطر قاتل نے فاروق کوئل کے اس مقدمے میں پھنسانے کے لیے اس کے فنکر پرنٹس والے اوزار کو چرایا اور فائزہ کو موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد ہتھوڑی اور چھینی کو جائے وقوعہ پر چھوڑ گیا تھا تاکہ پولیس کا کام آسان ہوجائے اور ایسا ہی ہوا بھی تھا۔ مجھے اس چالباز شخص کو بے نقاب کرنا تھا تاکہ ملزم کی بے گناہی کو ثابت کیا جاسکے۔

یہ بات تو طے تھی کہ قاتل، مقتولہ سے بے پناہ نفرت کرتا ہوگا۔ علاوہ ازیں اس امر میں بھی شک کی گنجائش دکھائی نہیں دیتی تھی کہ قاتل کے دل میں ملزم کے لیے بھی عناد اور کدورت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی لہٰذا اس نے ''ایک تیر سے دو شکار'' کے مصداق ایسی سازش بنی تھی جس کے نتیجے میں فائزہ اپنی جان سے گئی اور فاروق قتل کے ملزم کی حیثیت سے عدالتی جھمیلے میں پھنس گیا تھا۔

''تم دانش کے بارے میں کیا جانتے ہو؟'' میں نے ملزم کے چہرے پر نگاہ جما کر سرسراتی ہوئی آواز میں استفسار کیا۔

''بس یہی کہ.....'' وہ سادگی سے بولا۔ ''وہ منظور حسین کے گھر کے سامنے والے گھر میں رہتا ہے اور طارق روڈ پر اس کا ہوٹل ہے جس میں وہ زاہد سے رنگ روغن کا کام کروانے کا ارادہ رکھتا تھا۔''

''اور کچھ.....؟''

''نہیں.....!'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

''آبجیکشن یور آنر!'' وکیل استغاثہ نے یہ آواز بلند کہا۔ ''ملزم اور ڈیفنس مل کر معصومیت کا کوئی عالمی ریکارڈ بنانے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ ملزم کو اتنا بھی معلوم نہ ہو کہ جس دانش نامی بندے کا ذکر وہ سرسری انداز میں کررہا ہے، وہ مقتولہ کا شوہر ہے.....!''

''سادہ مزاج لوگ اسی ٹائپ کے ہوتے ہیں میرے فاضل دوست!'' میں نے وکیل استغاثہ کی طرف دیکھتے ہوئے معتدل انداز میں کہا۔ ''میرا مؤکل واقعتاً اس حقیقت سے واقف نہیں تھا کہ جس دانش نے زاہد علی کے کام کی تعریف کرکے اپنے ہوٹل میں اسی سے رنگ کروانے کا ارادہ ظاہر کیا تھا، وہ میڈم فائزہ کا شوہر تھا۔ یہ بے چارہ تو اتنا بھی نہیں جانتا تھا کہ منظور حسین کے گھر کے سامنے والے گھر میں وہی فائزہ رہائش پذیر تھی، ایک سال پہلے وہ جس کی محبت میں گرفتار ہوگیا تھا۔ بہرحال، آپ نے میرے مؤکل کی معلومات میں گراں قدر اضافہ فرمایا ہے۔ اس کیس سے باعزت بری ہونے کے بعد وہ شکریہ ادا کرنے آپ کی خدمت میں ضرور حاضر ہوگا۔ میں دوں گا اسے آپ کے آفس کا ایڈریس.....!''

میرے ترش اور تیکھے بلکہ نکیلے جملوں کی چبھن نے

www.pklibrary.com

وکیل استغاثہ جاوید ہمدانی کو تلملانے پر مجبور کر دیا۔ قبل اس کے کہ وہ مجھ پر کوئی جوابی حملہ کرتا، میں نے روئے سخن جج کی جانب پھیرتے ہوئے پُراعتماد انداز میں کہا۔

''جنابِ عالی! میری نگاہ میں ملزم بے گناہ ہے۔ ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت اسے زیرِ ساعت کیس میں پھنسایا گیا ہے۔ وقت آنے پر میں اپنے مؤکل کو اسی عدالت میں بے قصور ثابت کر کے دکھاؤں گا۔ سر دست میں معزز عدالت سے ایک چھوٹی سی درخواست کرنا چاہتا ہوں.....'' لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''اس کیس کی بیس لائن تو یہی ہے کہ میرے مؤکل نے دانش ہوٹل والے کی منکوحہ میڈم فائزہ کو موت کے گھاٹ اتارا ہے لیکن انصاف اور عدل اس بات کے متقاضی ہیں کہ دیگر پہلوؤں کو کسی بھی قیمت پر نظر انداز نہ کیا جائے۔ عین ممکن ہے کہ کسی عیار قاتل نے میرے مؤکل کے اوزار چرا کر اپنے شکار کو ٹھکانے لگا دیا ہو لہٰذا میں تین افراد کا ٹرائل ضروری سمجھتا ہوں۔ نمبر ایک، فیض احمد۔ نمبر دو، زاہد علی۔ نمبر تین، دانش۔ ان تینوں کو یہ موقع میسر تھا کہ وہ بہ آسانی ملزم کے اوزار چرا سکتے تھے۔ مقتولہ کے شوہر دانش کا نام تو استغاثہ کے گواہان کی فہرست میں شامل ہے۔ معزز عدالت سے میری استدعا ہے کہ زاہد علی اور فیض احمد کو گواہی کے لیے عدالت میں حاضر ہونے کے احکامات صادر کیے جائیں۔''

''ایک اہم نام تو آپ بھول ہی گئے میرے فاضل دوست!'' وکیل استغاثہ نے مجھ پر چوٹ کرتے ہوئے کہا۔ ''اسے ایسی آسانی حاصل تھی کہ وہ جب چاہتا، ملزم کا کوئی بھی ٹول چرا لے جاتا.....!''

''ازراہِ کرم اس آدمی کا نام بھی بتا دیں۔'' میں نے کہا۔

''منظور حسین!'' وہ انکشاف انگیز لہجے میں بولا۔

''منظور حسین اور نا منظور حسین کی کوئی تخصیص نہیں مائی ڈیئر کونسلر!'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''انصاف کے حصول کی خاطر ہر اس شخص کا ٹرائل ہوگا جو کسی بھی حوالے سے شک کے دائرے کے اندر کھڑا ہوگا۔ آپ خاطر جمع رکھیں۔ اگر ضرورت محسوس ہوئی تو منظور حسین کو بھی شاملِ تفتیش کر لیا جائے گا۔''

میں نے جج سے جو درخواست کی، اس میں معقولیت پائی جاتی تھی لہٰذا اس نے اس کیس کے انکوائری آفیسر سب انسپکٹر فرید پاشا کو ہدایت دی کہ آئندہ پیشی پر میرے مطلوبہ دونوں افراد زاہد علی اور فیض احمد کو گواہی کے لیے عدالت میں لانے کا بندوبست کرے۔ اس کے بعد اگلی پیشی کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کر دی۔

ہم عدالت سے باہر آئے تو ہتھکڑی لگے ہوئے ملزم فاروق نے مجھ سے پوچھا۔ ''وکیل صاحب! کیا دانش واقعی فائزہ کا شوہر تھا.....؟''

اس کے استفسار سے بے یقینی جھلکتی تھی۔ میں نے جواب میں بتایا۔ ''ہاں، یہی حقیقت ہے۔''

''اچھا.....!'' وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔

''کیا تمہیں یقین نہیں آ رہا؟''

''بات یقین کی نہیں وکیل صاحب.....!'' وہ ہونٹ بھینچ کر بولا۔

میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔ ''پھر کیا بات ہے؟''

''یقین تو کرنا ہی پڑے گا لیکن بس..... یہ بات مجھے ہضم نہیں ہو رہی۔'' اس نے کہا۔ ''دونوں کا کوئی جوڑ نہیں۔ کیا فائزہ کو شادی کرنے کے لیے یہی بندہ ملا تھا؟''

فاروق کے آخری جملے سے ایک خاص قسم کا دکھ جھلکتا تھا۔ اس نے بقول اس کے، فائزہ کو اپنے دل و دماغ سے خارج کر دیا تھا لیکن محبت کے جذبے کو ختم کرنا ممکن نہیں۔ اس کی جڑیں دل کے اندر بہت گہرائی تک اتر جاتی ہیں۔ محبت میں ناکامی کے بعد انسان دوسروں کو دھوکا دینے کے لیے ایسا ظاہر کر سکتا ہے کہ اس نے اپنے محبوب کو بھلا دیا ہے لیکن اس نوعیت کے بیانات سے وہ دراصل خود کو دھوکا دے رہا ہوتا ہے۔ محبت ایک لاعلاج مرض ہے۔

''فائزہ کو شادی کے لیے دانش کے علاوہ کوئی اور ملا تھا یا نہیں، اس سوال کا جواب تو فائزہ ہی دے سکتی تھی۔'' میں نے فاروق کی تکلیف کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔ ''لیکن اس کی موت کے بعد یہ ممکن نہیں رہا البتہ.....'' لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات پوری کرتے ہوئے کہا۔

''جب مقتولہ کا شوہر وٹنس باکس میں آ کر کھڑا ہوگا تو میں اس سے اگلوا لوں گا کہ ان کی شادی کن حالات میں فکس ہوئی تھی اور جب اللہ نے اسے اس کی اوقات سے بڑھ کر نواز دیا تو پھر وہ قدرت کی اس نوازش کی حفاظت کیوں نہیں کر سکا؟''

مجھے ایسا لگا کہ فاروق، دانش کے حوالے سے میری باتوں پر دھیان نہیں دے رہا تھا لہٰذا میں نے بھی اس موضوع پر مزید لب کشائی سے پرہیز کیا۔ وہ کورٹ پولیس کی نگرانی میں جیل وین کی جانب بڑھا تو میں نے پارکنگ

www.pklibrary.com

لاٹ کا رخ کیا۔

اگر فاروق اور دانش کو مردانہ وجاہت کے ترازو کے پلڑوں میں تولا جاتا تو یقیناً فاروق والا پلڑا ہی جھکتا۔ دانش، فاروق کے مقابلے میں بس ایویں سا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ فاروق کو فائزہ کے انتخاب پر سخت افسوس ہو رہا تھا۔ بہر حال، اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔

☆☆☆

آئندہ پیشی سے پہلے جمیل اختر نے مجھے فون کر کے یہ خوشخبری سنائی۔ ”بیگ صاحب! میں نے آپ کا کام کر دیا۔ بتائیں، ملاقات کب ہو رہی ہے؟“

جمیل اختر، جیسا کہ میں آپ کو بتا چکا ہوں شام کے ایک اخبار میں نیوز ایڈیٹر تھا۔ فاروق کا کیس اسی کے اصرار پر میں نے لیا تھا۔ اس کا دعویٰ تھا کہ فاروق بے گناہ ہے اور مجھے جمیل اختر پر کامل بھروسا تھا اسی لیے بلا سوچے سمجھے میں نے اس کیس میں ہاتھ ڈال دیا تھا۔ جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ میرا فوری فیصلہ غلط نہیں تھا۔

”جیسے آپ کو آسانی ہو۔“ میں نے کہا۔

”بھئی مجھے تو آسانی ہی آسانی ہے۔“ جمیل اختر نے بے فکری سے کہا۔ ”آپ کا جب موڈ ہو، چلے آئیں۔ میں نے اپنے ذرائع استعمال کر کے وہ ساری معلومات جمع کر لی ہیں جن کی آپ نے فرمائش کی تھی۔“

”ویری گڈ!“ میں نے توصیفی لہجے میں کہا۔ ”ٹھیک ہے۔ میں آج آفس سے اٹھنے کے بعد آپ کی طرف چکر لگاتا ہوں۔“

”آجائیں...... میں پوری رات ادھر ہی ہوں۔“ اس نے کہا۔

اس کیس سے تعلق رکھنے والے تمام کرداروں میں سے، میں سب سے کم مقتولہ فائزہ کے بارے میں جانتا تھا جبکہ وہ اس مقدمے کا انتہائی اہم کردار تھی۔ فاروق نے فائزہ کے حوالے سے مجھے جو معلومات فراہم کیں، وہ میرے خیال میں ناکافی تھیں اسی لیے میں نے اس سلسلے میں جمیل اختر سے تعاون کی درخواست کی تھی۔ میں فائزہ کے پس منظر سے مکمل آگاہی چاہتا تھا۔

اس شام میں نے اخبار کے آفس جا کر جمیل اختر سے تفصیلی ملاقات کی۔ اس نے تسلی بخش انداز میں میری ضرورت پوری کر دی تھی۔ فائزہ کا ماضی ایکشن، سسپنس اور تھرل سے بھرپور تھا۔ اسے ایک مہم جو لیڈی کہا جا سکتا تھا۔ میں لگ بھگ ایک گھنٹا جمیل اختر سے گفتگو میں

بہترین تحریریں، لاجواب روداد اور اعلیٰ داستانیں پڑھنے والوں کے لیے
سرگزشت کا مطالعہ ضروری ہے

ماہنامہ سرگزشت کراچی

شمارہ جون 2021ء کی جھلکیاں

نوائے حق
اس مردِ حق کا زندگی نامہ جو
پاکستانی صحافت کی آبرو ٹھہرا

انمول
پاکستانی فلم نگری کے تین
انمول رتن کی کہی ان کہی داستان

بحری قزاق
بحری قزاقوں کے چنگل میں
پھنسے جہازرانوں کے شب و روز

ناطی، ایک پہیلی
قیامِ پاکستان کے وقت کی ایک عجیب سی
سچ بیانی، اس لڑکی کا مذہب کیا تھا؟

روسیاہ
اس نوجوان کی طویل سرگزشت
جس کی بہن اغوا ہو گئی تھی

اس کے علاوہ
سفرنامہ ”ملکہ سبا کے دیس میں“، خطرناک مجرم، پُراسرار خزانہ، خونخوار لڑکیاں اور اس بدقسمت شاعر کی مختصر داستان جو فٹ پاتھ پر بسیرا کرتا تھا مگر اس کے اشعار ایوانوں میں گونجتے تھے
بیس سے زائد سچے قصے، انوکھے واقعات، سچ بیانیاں

www.pklibrary.com

مصروف رہا۔ مجھے میرے مطلب کی تمام چیزیں مل گئی تھیں اور میں سوچ رہا تھا کہ اگر فاروق کو فائزہ کی ان ''خصوصیات'' کا علم ہوتا تو وہ اس کی محبت میں گرفتار ہونے کے بجائے اس سے میلوں دوری پر رہنا پسند کرتا۔

جمیل اختر کی ریسرچ مقتولہ فائزہ تک ہی محدود نہیں رہی تھی بلکہ اس نے مجھے دانش کے بارے میں بھی مفید معلومات فراہم کی تھیں۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور جانے کے لیے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ وہ مجھے باہر تک چھوڑنے آیا اور بہ وقتِ رخصت اس نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

''بیگ صاحب! میں فاروق کے لیے جو کچھ کر رہا ہوں اس کا ایک پس منظر ہے۔ آج سے کئی سال پہلے اس نے مجھ پر ایک عظیم احسان کیا تھا۔ اگر میں زندہ سلامت ہوں تو میری اس زندگی میں فاروق ہی کا ہاتھ ہے۔''

پھر میرے استفسار پر جمیل اختر نے بتایا کہ برسوں پہلے اس کے ویسپا اسکوٹر کا ایکسیڈنٹ ہوگیا تھا۔ وہ رات کا وقت تھا اور سڑکوں پر سناٹا۔ ان دنوں آج کل کی طرح ٹریفک کا ازدحام نہیں ہوا کرتا تھا پھر وہ موسم سرما کی ایک یخ بستہ رات تھی۔ کوئی نشئی ٹرک والا جمیل اختر کے ویسپا کو ٹکر مار کر بے حسی سے آگے بڑھ گیا تھا اور یہ زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا سڑک کے کنارے اپنے الٹے ہوئے ویسپا کے پاس بے یارومددگار پڑا تھا۔ ایسے میں فاروق کا ادھر سے گزر ہوا تو اس نے جمیل اختر کو ایک رکشا میں ڈال کر اسپتال پہنچایا تھا۔ اس کے بعد بھی کبھار ان کی ملاقات ہوجاتی تھی۔

''انسان کی قسمت ہر وقت اس کا ساتھ نہیں دیتی جمیل صاحب!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''فاروق نے آپ کی جان بچانے کے لیے برسوں پہلے جو کوشش کی تھی، اس کے نتیجے میں آپ دونوں کے درمیان ایک اخلاص بھرا بے لوث رشتہ استوار ہوگیا تھا۔ ایسی ہی ایک پُرخلوص کوشش اسی بے چارے نے مقتولہ کو شاکر نامی غنڈے کے شر سے بچانے کے لیے بھی کی تھی مگر یہ کوشش الٹی پڑ گئی اور وہ ایک بن بلائی مصیبت میں پھنس گیا۔''

''مجھے صد فیصد یقین ہے کہ فاروق بے گناہ ہے۔'' جمیل اختر نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''اور کمرائے عدالت میں آپ نے اس کی بے گناہی کو ثابت کرنا ہے۔''

''ان شاء اللہ، ضرور.....!'' میں نے صدقِ دل سے کہا۔ ''آپ کا تعاون اور میری کوشش بہت جلد رنگ لے آئیں گی۔''

وہ اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔ میں اس سے الوداعی مصافحہ کرنے کے بعد اپنی کار کی جانب بڑھ گیا۔

اگلی پیشی پر عدالتی کارروائی کا آغاز ہوا تو استغاثہ کے گواہ کے وٹنس باکس میں پہنچنے سے پہلے ہی میں نے جج سے مخاطب ہوتے ہوئے مؤدبانہ انداز میں کہا۔

''جنابِ عالی! میں اس کیس کے انکوائری آفیسر سے چند اہم سوال کرنا چاہتا ہوں۔''

کسی بھی مقدمے میں تفتیشی افسر کی حیثیت استغاثہ کے ایک گواہ ایسی ہوتی ہے اور ہر پیشی پر آئی او کو عدالت میں حاضر رہنا پڑتا ہے۔ جج کے حکم پر سب انسپکٹر فرید پاشا وٹنس باکس میں آکر کھڑا ہوگیا۔

انکوائری آفیسر کی عمر چالیس اور پینتالیس کے درمیان رہی ہوگی۔ وہ درمیانے قد کا مالک ایک فربہ اندام پولیس والا تھا۔ اس کے سر کا مرکزی حصہ فارغ البال تھا۔ اس نے اپنی آنکھوں پر نظر کا چشمہ لگا رکھا تھا۔

''آئی او صاحب!'' میں نے نپے تلے انداز میں جرح کا آغاز کرتے ہوئے سوال کیا۔ ''آپ کو اس واقعے کی اطلاع کب اور کس نے دی تھی؟''

''ہمارے روزنامچے کے مطابق، اٹھارہ اپریل کی رات آٹھ بجے اس واقعے کی اطلاع دی گئی تھی۔'' اس نے جواب دیا۔ ''اور اطلاع کنندہ مقتولہ کا شوہر دانش تھا۔''

''آپ جائے وقوعہ پر کتنے بجے پہنچے تھے؟''

''یہی کوئی ساڑھے آٹھ بجے۔''

''مقتولہ کی لاش کچن کے فرش پر پڑی پائی گئی تھی۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اس کی کلائی والی نس کو بڑی بے دردی سے کاٹ دیا گیا تھا جس کے باعث اس کے جسم کا بیشتر خون بہہ نکلا تھا۔ خون کا بے تحاشا اخراج ہی اس کی موت کا سبب بنا تھا۔ جب آپ جائے وقوعہ پر پہنچے تو مقتولہ کو زندگی کی قید سے آزاد ہوئے لگ بھگ دو گھنٹے گزر چکے تھے۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا.....؟''

میں نے بات مکمل کر کے سوالیہ نظر سے تفتیشی افسر کی طرف دیکھا تو وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

''آپ بالکل درست فرما رہے ہیں وکیل صاحب! پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق مقتولہ کی موت پانچ اور سات بجے کے درمیان ہی واقع ہوئی تھی جبکہ میں ساڑھے آٹھ بجے موقع واردات پر پہنچا تھا۔''

''پبلک پراسیکیوٹر نے اپنے بیان میں دھواں دھار طریقے سے ملزم کو ایک عیار، مکار، کینہ پرور، بلیک میلر، منتقم

www.pklibrary.com

المزاج..... یہاں تک کہ ایک سفاک قاتل ڈکلیئر کیا ہے۔''
میں نے آئی او کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ''آپ کا اس بارے میں کیا خیال ہے؟''

''میں وکیل استغاثہ کے خیال سے اتفاق کرتا ہوں۔'' اس نے اٹل لہجے میں جواب دیا۔

''بہت خوب!'' میں نے تیکھے انداز میں کہا۔ ''سنا ہے اتفاق میں بڑی برکت ہوتی ہے۔ آپ کیا کہتے ہیں؟''

''جی..... میں نے بھی ایسا ہی سنا ہے۔''

''او کے.....'' میں نے سرسری انداز میں کہا پھر یکا یک سوال کیا۔ ''آلۂ قتل تلاش کرنے میں آپ کو زیادہ کشٹ تو نہیں اٹھانا پڑا؟''

''نہیں!'' اس نے نفی میں گردن ہلائی اور بتایا۔ ''خانہ تلاشی کے دوران میں وہ ہتھوڑی اور چھینی ہمیں داخلی دروازے کی اندرونی جانب رکھے ہوئے ڈسٹ بن میں پڑی مل گئی تھیں.....''

''اور ان دونوں اوزاروں کے دستے پر ملزم کے فنگر پرنٹس موجود تھے بلکہ چھینی کے تیز دھار پھل پر تو مقتولہ کا خون بھی لگا ہوا تھا جس سے آپ کو یہ سمجھنے میں کوئی دقت محسوس نہیں ہوئی کہ مقتولہ کو اسی چھینی سے، کلائی والی نس کاٹ کر موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟''

''نہیں جناب!'' وہ جلدی سے بولا۔ ''آپ تو حقیقت بیان کر رہے ہیں۔''

''کیا وجہ ہے کہ ملزم نے آپ کو خاص طور پر فیورڈ تھی؟''

میرے اس اچانک سوال پر وہ اچھل پڑا اور اضطراری لہجے میں بولا۔ ''آپ کی بات میری سمجھ میں نہیں آئی وکیل صاحب!''

''ملزم، استغاثہ کی نظر میں ایک شاطر، چالاک اور عیار شخص ہے.....'' میں نے بدستور تفتیشی افسر کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''پھر وہ اپنی ساری مکاری اور چالبازی کی ناک کٹا کر آلۂ قتل کو ڈسٹ بن میں کیوں ڈال گیا۔ یہ تو اس کے ٹیلنٹ کی توہین ہے۔ ایک اناڑی سے اناڑی مجرم بھی اس قسم کی بچکانہ غلطی نہیں کرتا۔ کہیں یہ سب اس نے آپ کی محبت میں تو نہیں کیا تاکہ آپ کا کام آسان ہو جائے؟''

''ایسی کوئی بات نہیں وکیل صاحب!'' وہ جز بز ہوتے ہوئے بولا۔ ''میں سمجھتا ہوں ملزم بوکھلاہٹ میں اپنی ہتھوڑی اور چھینی کو ڈسٹ بن میں پھینک گیا تھا۔''

''استغاثہ کے مطابق ملزم اٹھارہ اپریل کی شام مقتولہ کے گھر میں داخل ہوا، اس کے کچن میں پہنچا، اسے موت کے گھاٹ اتارا اور چپ چاپ رخصت ہو گیا۔'' میں نے انکوائری آفیسر کے چہرے پر نگاہ گاڑ کر قدرے تیز آواز میں کہا۔ ''اس دوران میں گھر کے داخلی دروازے سے لے کر کچن تک اس نے مختلف مقامات کو چھوا ہوگا۔ آپ کو گھر کے کس کس حصے پر اس کی انگلیوں کے نشانات ملے تھے؟ میں نے عدالت کے روبرو آپ سے یہ سوال اس لیے کیا ہے کہ میرے مؤکل کے خلاف پیش کیے جانے والے چالان میں ایسا کوئی ذکر موجود نہیں۔ اب یا تو آپ نے گھر کے مختلف حصوں خصوصاً کچن کے دروازے، کھڑکی، دیواروں اور دیگر مقامات پر فنگر پرنٹس اٹھانے کو ضروری نہیں جانا اور یا پھر آپ اپنی رپورٹ میں اس کا تذکرہ کرنا بھول گئے تھے؟''

''نہیں جناب!'' اس نے نفی میں گردن ہلائی پھر معتدل انداز میں بتانے لگا۔ ''میں نے جائے وقوعہ کے تمام اہم مقامات پر سے فنگر پرنٹس کو اٹھانے کی کوشش کی تھی لیکن حیرت انگیز طور پر کہیں بھی مقتولہ اور اس کے شوہر کی انگلیوں کے نشانات کے علاوہ کسی تیسرے شخص کے فنگر پرنٹس نہیں ملے۔''

''تو اس میں حیرت انگیزی والا کون سا معاملہ ہے پاشا صاحب؟'' میں نے قدرے بے تکلفی سے آئی او کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''بھئی! ان کی شادی کو محض ایک سال ہوا تھا۔ وہ ابھی تک دو سے تین نہیں ہوئے تھے اور ان کے علاوہ اس گھر میں کوئی تیسرا فرد رہائش پذیر نہیں تھا لہٰذا اس گھر میں انہی میاں بیوی کی انگلیوں کے نشانات ثبت ہونا تھے۔ کہیں آپ یہ تو نہیں سوچ رہے کہ.....'' میں نے دانستہ ڈرامائی انداز میں توقف کیا پھر رازدارانہ لہجے میں استفسار کیا۔ ''..... کہ ملزم نے قتل کی یہ سنگین واردات گلوز پہن کر کی تھی۔ اس کی ہوشیاری اور چالاکی کے تو پبلک پراسیکیوٹر بہت معترف ہیں؟''

''ہاں.....'' وہ بے دھیانی میں بول گیا۔ ''ایسا ہو سکتا ہے۔ ملزم نے دستانے پہن کر یہ واردات کی ہو کی تاکہ جائے وقوعہ پر اس کی انگلیوں کے نشانات نہ پائے جائیں۔''

میں انکوائری آفیسر کو دھکیلتے ہوئے فائٹنگ رنگ کے کارنر تک لے آیا تھا۔ اس کے دماغ سے کھیلنے میں مجھے بہت مزہ آ رہا تھا۔ میں ہلکے پھلکے انداز میں انجوائے کرتے ہوئے اس کیس پر اپنی گرفت کو مضبوط سے مضبوط تر بناتا چلا جا رہا تھا۔

''مجھے تو یہ کوئی اور ہی چکر لگ رہا ہے پاشا صاحب!'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

www.pklibrary.com

''وہ کیا؟'' وہ ٹٹولتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

''اب یہ تو ہو نہیں سکتا کہ ملزم بیک وقت انتہائی شاطر بھی ہو اور اول درجے کا احمق بھی۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اس نے عقل مندی کا ثبوت دیتے ہوئے ہاتھوں پر دستانے پہن کر مقتولہ کی زندگی کا چراغ گل کر دیا اور اپنی غیر ذمے داری ظاہر کرتے ہوئے وہ ہتھوڑی اور چھینی کو ڈسٹ بن میں ڈال گیا۔ میں سمجھتا ہوں، آپ ہی کی بات درست ہے۔''

وہ مزید الجھ گیا اور متذبذب نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے مستفسر ہوا۔ ''میری کون سی بات وکیل صاحب؟''

''بوکھلاہٹ والی بات.....'' میں نے ٹھوس انداز میں کہا۔ ''آپ کے مطابق وہ بے وقوف نہیں اسی لیے اس نے دستانے پہن کر قتل کی واردات کی مگر بوکھلاہٹ میں آلاتِ قتل کو جاتے ہوئے اس نے ڈسٹ بن میں ڈال دیا۔ انسان بندہ بشر ہے، مٹی کا پتلا ہے، خطا اس کی سرشت میں شامل ہے۔ وہ کسی وقت سہواً یا ارادتاً کوئی بھی غلطی کر سکتا ہے۔ آپ اس کی ٹینشن نہ لیں اور مجھے یہ بتائیں کہ ملزم کی گرفتاری سے لے کر اب تک اس کے بیوی بچوں میں سے کوئی اس سے ملنے آیا؟''

''نہیں!'' وہ دوٹوک انداز میں بولا۔

''اور مقتولہ کے میکے والوں میں سے کوئی.....؟''

''بالکل نہیں!'' اس نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

''ریحانہ، مہک اور کامران کا یا ملزم کی سسرال میں سے کسی اور کا اس سے ملنے نہ آنا تو سمجھ میں آتا ہے کیونکہ ملزم نے اپنی بیوی ریحانہ کو طلاق دے دی تھی لہٰذا وہ تمام لوگ ملزم کی شکل دیکھنے کے روادار نہیں تھے لیکن مقتولہ کے میکے والوں کو کیا ہوا؟''

''یہ سوال آپ انہی لوگوں سے کریں تو زیادہ مناسب ہوگا۔'' وہ رکھائی سے بولا۔

''آپ کے اس قیمتی مشورے کا شکریہ پاشا صاحب!'' میں نے کھلے الفاظ میں کہا۔ ''آپ کی اطلاع کے لیے ایک بات واضح کر دوں کہ میں کسی بھی غیر متعلق شخص سے کوئی سوال کرنے کا عادی نہیں ہوں۔ آپ اس کیس کے روحِ رواں ہیں اسی لیے میں نے آپ سے پوچھ لیا اور جہاں تک مقتولہ کے والدین یا بہن بھائیوں کا معاملہ ہے تو اس سلسلے میں ہر سوال میں مقتولہ کے شوہرِ دانش سے کروں گا۔'' لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک آسودہ سانس خارج کی پھر جج کی جانب دیکھتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔

''جنابِ عالی! مجھے آئی او صاحب سے اور کچھ نہیں پوچھنا۔''

اپنے مؤکل کی بے گناہی کے حوالے سے میں جو اہم نکتہ عدالت کے علم میں لانا چاہتا تھا، اس سلسلے میں، میں نے بڑی بھرپور کوشش کر ڈالی تھی اور میں اپنی کارکردگی سے کلی طور پر مطمئن بھی تھا۔

اس کے بعد استغاثہ کی جانب سے وحید قریشی نامی ایک گواہ کو پیش کیا گیا۔ وحید قریشی کی عمر پینتیس کے اریب قریب رہی ہوگی۔ مقتولہ کی گلی کے کونے پر وحید کی پان سگریٹ کی ایک چھوٹی سی دکان تھی۔ جب وحید قریشی سچ بولنے کا حلف اٹھانے کے بعد اپنا بیان ریکارڈ کرا چکا تو وکیل استغاثہ جرح کے لیے اس کے نزدیک چلا گیا۔

''کیا تم اس شخص کو جانتے ہو؟'' وکیل استغاثہ نے ملزم کی جانب اشارہ کر کے گواہ سے پوچھا۔

وہ جلدی سے بولا۔ ''جی، کافی حد تک جانتا ہوں۔''

''اس شام کو اچھی طرح یاد کرنے کی کوشش کرو جب دانش ہوٹل والے کی بیوی کو وحشیانہ انداز میں قتل کر دیا گیا تھا۔'' وکیل استغاثہ نے گواہ کی یادداشت کو جھنجوڑنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''میرا اشارہ اٹھارہ اپریل کی شام کی طرف ہے۔''

''جی بالکل، میں آپ کی بات کو سمجھ رہا ہوں وکیل صاحب!'' وہ خاصے مضبوط لہجے میں بولا۔ ''اس شام دانش کی بیوی فائزہ کو اس شقی القلب شخص نے فنا کے گھاٹ اتار دیا تھا۔'' بات کے اختتام پر اس نے انگلی سے اکیوزڈ باکس میں کھڑے ملزم کی نشاندہی بھی کر دی تھی۔

''وحید قریشی! تم نے پولیس کو بیان دیا تھا کہ وقوعہ کی شام ملزم مقتولہ کے گھر کے سامنے منڈلا رہا تھا؟''

''میں اپنے بیان پر قائم ہوں وکیل صاحب۔'' گواہ بڑے وثوق سے بولا۔ ''میں نے خود اپنی آنکھوں سے اسے وہاں کھڑے دیکھا تھا۔''

''دیٹس آل یور آنر!'' ان الفاظ پر جاوید ہمدانی نے اپنی جرح موقوف کر دی۔

اپنی باری پر میں جج کی اجازت حاصل کر کے وٹنس باکس کے قریب چلا گیا اور گواہ کو مخاطب کرتے ہوئے اپنی جرح کا آغاز کر دیا۔

''وحید صاحب! تھوڑی دیر پہلے آپ نے وکیل سرکار کے ایک سوال کے جواب میں معزز عدالت کو بتایا ہے کہ آپ ملزم کو کافی حد تک جانتے ہیں۔ اس ''شناسی کافی حد'' کی کچھ وضاحت کریں گے۔ کیا ملزم آپ کا رشتے دار یا

www.pklibrary.com

محلے دار ہے؟''

''نہیں وکیل صاحب!'' وہ اپنی گردن کو نفی میں جھٹکتے ہوئے بولا۔ ''یہ بندہ شاہ فیصل کالونی میں رہتا ہے اور نہ ہی اس سے میرا کسی قسم کا تعلق یا رشتہ ہے۔ میں نے اس سے جان پہچان کی جو بات کی اس سے میری مراد یہ تھی کہ وقوعہ سے پہلے چند روز تک یہ میری دکان سے سگریٹ اور سونف سپاری وغیرہ خرید تا رہا تھا اسی لیے میں اس کا چہرہ شناس ہو گیا تھا۔''

''وحید قریشی صاحب! آپ نے بڑے وثوق کے ساتھ وکیل استغاثہ کو بتایا ہے کہ اٹھارہ اپریل کی شام ملزم نے دانش کی بیوی فائزہ کو بڑی بے دردی سے موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ آپ کے لہجے میں موجود اعتماد تو بتاتا ہے کہ یہ قتل آپ نے اپنی آنکھوں کے سامنے ہوتے دیکھا تھا..... ہیں نا؟''

''نہیں جناب.....! ایسی بات نہیں ہے۔'' وہ گڑبڑائے ہوئے لہجے میں جلدی سے بولا۔ ''محلے میں قتل ہوا ہے، یہ بات تو اسی شام سب کو پتا چل گئی تھی اور یہ بھی کہ کس کی موت واقع ہوئی ہے مگر قاتل کے بارے میں اگلے روز ہی معلوم ہو سکا تھا۔ ہاں، البتہ میں نے اٹھارہ اپریل کی شام ملزم کو مقتولہ کے دروازے کے سامنے کھڑے ضرور دیکھا تھا۔''

''میں نے آپ کی بات کا یقین کر لیا۔'' میں نے استغاثہ کے گواہ کو اپنی جرح کے گھیرے میں لاتے ہوئے دوستانہ انداز میں کہا۔ ''اب آپ مجھے یہ بتائیں کہ اس وقت ملزم نے کس قسم کا لباس پہن رکھا تھا؟''

وہ جلدی سے بولا۔ ''شلوار قمیص۔''

''لگ بھگ وقت کتنا ہو گا؟''

''یہی کوئی..... شام کے چھ بجے ہوں گے۔''

میں نے غیر محسوس انداز میں اپنا نادیدہ جال سمیٹنا شروع کر دیا۔ ''اور اس روز آپ نے کون سا لباس زیب تن کر رکھا تھا؟''

''میں تو ہمیشہ شلوار قمیص ہی پہنتا ہوں وکیل صاحب!'' وہ اپنے کپڑوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''آپ خود دیکھ لیں۔''

میں نے اس کی وضاحت کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی سوچ کے مطابق اگلا سوال داغ دیا۔

''وحید صاحب! کیا اس شام آپ نے ملزم کے ہاتھ میں کوئی توپ یا کوئی تلوار بھی دیکھی تھی؟''

اس نے الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھا اور بولا۔

''نہیں تو.....!''

''مطلب..... اس کے دونوں ہاتھ خالی تھے؟''

''جی ہاں۔''

''آپ نے وکیل استغاثہ کے ایک سوال کے جواب میں حتمی لہجے میں کہا کہ آپ اپنے بیان پر قائم ہیں۔'' میں نے اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے استفسار کیا۔ ''مطلب، یہ بیان کہ آپ نے ملزم کو وقوعہ کی شام مقتولہ کے گھر کے سامنے منڈلاتے دیکھا تھا؟''

''میں نے کچھ بھی غلط نہیں کہا۔'' وہ چٹانی لہجے میں بولا۔ ''یہی سچائی ہے وکیل صاحب!''

''گواہ صاحب! میں آپ کی بیان کردہ اسی سچائی کا پوسٹ مارٹم یعنی چیر پھاڑ کرنا چاہتا ہوں۔'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو.....!''

میرے اس پراسرار انداز پر وکیل استغاثہ جاوید ہمدانی کے کان کھڑے ہو گئے۔ وہ سوچتی ہوئی چوکنا نظر سے مجھے گھورنے لگا۔ گواہ نے میرے استفسار کے جواب میں کہا۔ ''مجھے کوئی اعتراض نہیں۔''

''مقتولہ والی گلی کی چوڑائی کتنی ہو گی؟'' میں نے پوچھا۔ ''میرا مطلب ہے، وہ گلی جس میں تمہاری دکان ہے۔''

''تقریباً آٹھ سے دس فٹ۔'' اس نے جواب دیا۔

''اگر آپ کی دکان کے سامنے کوئی دوسری پان سگریٹ کی یا سبزی پھل کی دکان کھل جائے اور کوئی گاہک گلی میں کھڑا ہو تو..... یعنی دونوں دکانوں کے درمیان تو آپ اسے کس دکان کا گاہک تصور کریں گے؟''

''جب تک وہ خاموش کھڑا رہے گا تو اسے یا تو دونوں دکانوں کا کسٹمر سمجھا جائے گا یا پھر کسی کا بھی نہیں۔'' گواہ نے جواب دیا۔ ''جب وہ کسی ایک دکان سے کچھ خریدے گا تو پھر اسی دکان کا کسٹمر تصور کیا جائے گا۔''

''عقل و دانش سے بھرپور معقول جواب دینے کا شکریہ وحید صاحب!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

وکیل استغاثہ پھٹ پڑا۔ ''اس سوال و جواب کی لوجک سمجھ میں نہیں آئی۔''

''میرے فاضل دوست!'' میں نے جاوید ہمدانی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''یہ لوجک کا نہیں، میجک کا معاملہ ہے۔ آپ لوجک کا خیال اپنے دل سے نکال دیں اور میرا میجک دیکھیں۔ ابھی میں آپ کے گواہ کے ساتھ مل کر جو میجک دکھانے جا رہا ہوں وہ آپ کی طبیعت کو باغ و بہار کر دے گا۔'' میں نے وکیل استغاثہ کو

www.pklibrary.com

تکلیف کی حالت میں چھوڑا اور استغاثہ کے گواہ کی جانب متوجہ ہوگیا۔

''وحید قریشی صاحب! آپ کی وضاحت نے مجھے متاثر کیا ہے۔ کیا آپ کسی منظور حسین کو جانتے ہیں؟''

''ہاں، بالکل جانتا ہوں۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''منظور صاحب اس محلے میں نئے آئے ہیں۔ پچھلے دنوں وہ اپنے مکان میں مختلف کام کروا رہے تھے۔''

''کیا ان کی فیملی اپنے گھر شفٹ ہو چکی ہے؟''

گواہ نے اثبات میں جواب دیا۔

''کہیں یہ وہی منظور حسین تو نہیں جو سرکاری ملازم ہیں۔'' میں نے پُرخیال انداز میں کہا۔ ''ان کے گھر پر چند روز ملزم نے بھی کام کیا تھا؟''

''جی، آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' وہ تصدیقی انداز میں بولا۔ ''منظور صاحب نے دانش ہوٹل والے کے بالکل سامنے والا گھر لیا ہے۔''

''پھر تو آپ کے بیان کردہ فلسفے کے مطابق اگر کوئی شخص منظور حسین کے گھر کے سامنے منڈلا رہا ہو تو اسے مقتولہ کے گھر کے سامنے منڈلاتا ہوا بھی تصور کیا جاسکتا ہے، الّا یہ کہ وہ کسی کا دروازہ کھول کر گھر کے اندر داخل نہ ہوجائے۔'' میں نے اپنی جرح کو منطقی انجام تک لاتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا آپ نے وقوعہ کی شام ملزم کو مقتولہ کے گھر میں داخل ہوتے دیکھا تھا؟''

اس نے متذبذب نظر سے مجھے دیکھا پھر نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''نہیں..... میں نے بس اسے وہاں کھڑے دیکھا تھا۔''

''میں جانتا ہوں کہ میرا مؤکل اٹھارہ اپریل کی شام منظور حسین کے گھر اپنی گمشدہ ہتھوڑی اور چھینی تلاش کرنے آیا تھا۔'' میں نے سپاٹ آواز میں کہا۔ ''لیکن آپ ٹینشن نہ لیں۔ بس، میں آپ کو فارغ کر رہا ہوں۔'' میں گواہ کو چھوڑ کر اس چوبی میز کی جانب بڑھ گیا جہاں آلاتِ قتل سیلوفین بیگ کے اندر محفوظ تھے۔ میں نے وہ بیگ اٹھالیا اور واپس گواہ کے پاس آکر کہا۔

''وحید قریشی صاحب! آپ جس استغاثہ کی طرف سے گواہی دینے اس عدالت میں تشریف لائے ہیں، اس کا دعویٰ ہے کہ میرے مؤکل نے اس ہتھوڑی سے مقتولہ کی کھوپڑی کے عقبی حصے پر خطرناک وار کرکے اسے زمیں بوس کردیا تھا۔ جب وہ کچن کے فرش پر گر کر بے سدھ ہوگئی تو ملزم نے چھینی کے تیز دھار پھل سے اس کی کلائی والی نس کاٹ ڈالی تھی۔ آپ اس بارے میں کیا کہیں گے؟''

''مم..... میں بھلا..... کیا کہہ سکتا ہوں.....'' وہ بکھری ہوئی آواز میں بولا۔ ''میں کون سا کچن میں کھڑا اس کارروائی کو دیکھ رہا تھا۔''

''آپ خوامخواہ گھبرا رہے ہیں قریشی صاحب!'' میں نے اپنایت بھرے انداز میں کہا۔ ''آپ کا تعلق کی اس واردات سے کچھ لینا دینا نہیں ہے۔ بس آپ میرا ایک چھوٹا سا کام کردیں اور اس کے بعد اپنے گھر چلے جائیں۔''

''کون سا کام؟'' وہ پریشان دکھائی دینے لگا۔

''میں ملزم کے ان دونوں اوزاروں کو سیلوفین بیگ سے نکال کر آپ کو دیتا ہوں۔'' میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''آپ اس ہتھوڑی اور چھینی کو اپنی قمیص کی جیبوں میں رکھ لیں، وہ بھی اس طرح کہ آپ کو دیکھ کر کسی کو یہ پتا نہ چلے کہ آپ نے اپنے لباس کے اندر سولہ انچ لمبی ہتھوڑی اور بارہ انچ لمبی چھینی کو چھپا رکھا ہے۔''

میں نے مذکورہ دونوں اوزاروں کی لمبائی انداز آبتائی تھی۔ اس میں ایک آدھ انچ کی کمی بیشی ہوسکتی ہے۔ استغاثہ کے گواہ نے الجھن زدہ نظر سے سیلوفین بیگ کے اندر محفوظ، ملزم سے تعلق رکھنے والے اوزاروں کو دیکھا پھر نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

''یہ ممکن نہیں ہے۔''

''کیوں ممکن نہیں ہے؟'' میں نے جارحانہ انداز میں پوچھا۔

اس نے جواب دیا۔ ''قمیص کی فرنٹ پاکٹ ہو یا سائڈ پاکٹ، ان میں اس سائز کے اوزاروں کو نہیں رکھا جاسکتا۔''

''آپ کے جواب نے مجھے متاثر کیا ہے قریشی صاحب!'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ''اب ذرا اس بات کی بھی وضاحت کردیں کہ وقوعہ کی شام ملزم اپنے ان اوزاروں کو کیسے لے کر مقتولہ کے کچن تک پہنچا ہوگا کیونکہ.....'' لمحاتی توقف کرکے میں نے تیکھی نظر سے جاوید ہمدانی کی طرف دیکھا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''کیونکہ اس شام آپ کے بقول ملزم شلوار قمیص میں ملبوس تھا اور آپ نے تھوڑی دیر پہلے معزز عدالت کو یہ بھی بتایا ہے کہ وقوعہ کی شام آپ نے جب ملزم کو مقتولہ کے گھر کے سامنے منڈلاتے دیکھا تو اس کے دونوں ہاتھ خالی تھے؟''

گواہ کے پاس میرے اس استفسار کا کوئی جواب نہیں تھا لہٰذا وہ خجالت آمیز انداز میں بغلیں جھانک کر رہ گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس موقع پر وکیل استغاثہ کچھ

www.pklibrary.com

کہنے کے لیے پرتول رہا تھا۔ اس کے اڑان بھرنے سے پہلے ہی میں نے جج سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

''جناب عالی! استغاثہ کے گواہ وحید قریشی پر میں نے جو جرح کی ہے، وہ عدالت کے ریکارڈ کا حصہ بن چکی ہے۔ یہ سچ ہے کہ گواہ نے وقوعہ کی شام ملزم کو مقتولہ کے دروازے کے سامنے کھڑے دیکھا تھا لیکن گواہ یہ نہیں جانتا کہ ملزم وہاں کیوں موجود تھا جبکہ ملزم اپنے حلفیہ بیان میں بتا چکا ہے کہ وہ اپنی گمشدہ چھینی اور ہتھوڑی کی تلاش میں منظور حسین کے گھر گیا تھا جس کا دروازہ مقتولہ کے گھر کے دروازے کے سامنے پڑتا ہے۔ ملزم کے بیان کی تصدیق کے لیے منظور حسین کو عدالت میں بلایا جاسکتا ہے۔ ویسے میں اپنے طور پر منظور حسین سے اس موضوع پر بات کر چکا ہوں۔ اس نے مجھے بتایا ہے کہ اٹھارہ اپریل کی شام ملزم اپنے اوزار ڈھونڈتا ہوا اس کے گھر آیا تھا اور مایوس واپس چلا گیا تھا۔ اس کے بعد کیا ہوا، منظور حسین اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ ہاں، البتہ استغاثہ کا گواہ وحید قریشی بتا چکا ہے کہ اس نے وقوعہ کی شام ملزم کو خالی ہاتھ مقتولہ کے گھر کے دروازے کے سامنے کھڑے دیکھا تھا لیکن اس نے ملزم کو مقتولہ کے گھر میں داخل ہوتے یا وہاں سے نکلتے نہیں دیکھا۔ اس بحث سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ.....'' میں نے دانستہ توقف کر کے حاضرین عدالت پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''نمبر ایک..... جب گواہ وحید قریشی نے میرے مؤکل کو وقوعہ کی شام مقتولہ کے گھر کے سامنے کھڑے یا منڈلاتے دیکھا تو وہ خالی ہاتھ تھا۔ نمبر دو..... ملزم، مقتولہ کے گھر میں داخل نہیں ہوا تھا۔ نمبر تین..... ملزم نے مقتولہ کو موت کے گھاٹ نہیں اتارا اور نمبر چار..... کسی شرپسند کائیاں شخص نے منظور حسین کے گھر کے کچن سے ملزم کی ہتھوڑی اور چھینی کو چرایا تھا۔ وہ جو کوئی بھی تھا اسے مقتولہ سے شدید نفرت رہی ہوگی یا مقتولہ کی موت اس کے لیے فائدہ مند ثابت ہوئی ہوگی۔ علاوہ ازیں وہ شخص ملزم سے بھی خدا واسطے کا بیر رکھتا ہوگا اسی لیے اس نے ایک پنتھ دو کاج کے فارمولے پر عمل کرتے ہوئے ایک طرف مقتولہ کا کام تمام کیا اور دوسری جانب میرے سادہ دل مؤکل کو قتل کے مقدمے میں پھنسا دیا۔ یہ تو ماننا پڑے گا کہ قاتل ماسٹر مائنڈ انسان ہے لیکن یہ بھی ایک اٹل حقیقت ہے کہ قدرت نے ہر سیر کے لیے ایک سوا سیر بھی پیدا کیا ہوا ہے۔ ان شاء اللہ میں اس شاطر قاتل کے لیے سوا سیر ثابت ہوں گا..... دیٹس آل یور آنر!''

اس کے ساتھ ہی عدالت کا مقررہ وقت ختم ہوگیا۔ اگلی پیشی دس روز بعد تھی۔

☆☆☆

جب میں نے یہ کیس اپنے ہاتھ میں لیا تھا تو میرا مؤکل بہت زیادہ مایوس اور گھبرایا ہوا تھا لیکن جیسے جیسے عدالتی کارروائی آگے بڑھتی گئی تو کیس کی ایک شکل نکلنا شروع ہوگئی تھی اور اسی صورت کو دیکھ کر فاروق کے تن بدن میں ایک نئی پُرامید زندگی جاگ اٹھی تھی۔ وہ اگرچہ ابھی تک جیل کسٹڈی میں تھا مگر اب وہ اپنے چہرے، رویے اور گفتگو سے مایوس نظر نہیں آتا تھا۔ آپ اسے میری جزوی کامیابی سمجھ لیں اور کلی کامیابی کے لیے میں ایک بار پھر کمرۂ عدالت میں موجود تھا۔ اس روز استغاثہ کی جانب سے مقتولہ کا شوہر دانش ہوٹل والا گواہی کے لیے عدالت میں پیش ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ہی انکوائری آفیسر نے میرے مطلوبہ مزید دو افراد زاہد علی اور فیض احمد کو بھی عدالت حاضر کر دیا تھا۔ میں نے جرح کے لیے باری باری انہیں وٹنس باکس میں بلالیا۔

رنگ ساز زاہد علی کی عمر پینسٹھ سے متجاوز تھی۔ وہ ایک دبلا پتلا درمیانہ قد شخص تھا۔ اس کے سر کے بال آدھے سے زیادہ سفید ہو چکے تھے جبکہ فیض احمد بھی اپنی زندگی کی ساٹھ بہاریں دیکھ چکا تھا۔ وہ منظور حسین کا پرانا تعلق دار تھا۔ میں زاہد علی اور فیض احمد پر کی جانے والی جرح کی تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ بس اتنا بتادوں کہ میرے اندازے کے مطابق ان میں سے کسی نے ملزم کے اوزاروں کو چوری نہیں کیا تھا۔

میں نے زاہد علی اور فیض احمد کو فارغ کیا تو استغاثہ کا سب سے اہم گواہ وٹنس باکس میں پہنچ گیا یعنی مقتولہ فائزہ کا شوہر دانش۔ دانش کی عمر پینتیس کے آس پاس رہی ہوگی۔ وہ بھاری تن و توش کا مالک ایک واجبی سی صورت والا شخص تھا۔ فاروق کے بیان کے مطابق فائزہ اور دانش کی جوڑی کہیں سے بھی مناسب نہیں تھی۔ یہ ''پہلوئے حور میں لنگور'' سے ملتی جلتی مثال تھی۔

دانش کے بیانِ حلفی کے بعد وکیل استغاثہ جرح کے لیے وٹنس باکس کے نزدیک چلا گیا اور مقتولہ کے شوہر سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

''دانش صاحب! آپ کی شادی لگ بھگ ایک سال تک رہی۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا اور پھر

www.pklibrary.com

اچانک ملزم نے آپ لوگوں کی زندگی میں ایک بھونچال سا پیدا کر دیا۔ اس فتنہ پروری کے ایسے بھیانک نتائج برآمد ہوں گے، کیا آپ نے کبھی اس بارے میں سوچا تھا؟''

''بالکل بھی نہیں۔'' وہ ایک جھرجھری لینے کے بعد اداس لہجے میں بولا۔ ''مجھے ابھی تک یقین نہیں آرہا کہ فائزہ ہمیشہ کے لیے مجھ سے جدا ہو چکی ہے۔ میں آپ کو بتا نہیں سکتا کہ ہمارے درمیان محبت اور اعتماد کا کتنا مضبوط رشتہ قائم تھا۔ ہم ایک دوسرے کے بارے میں مکمل طور پر جانتے تھے۔ ہمارا کچھ بھی کسی سے چھپا ہوا نہیں تھا لیکن اس بدذات کی نظر ہماری خوشیوں کو کھا گئی۔'' بات کے اختتام پر اس نے نفرت بھرے انداز میں میرے مؤکل کی طرف دیکھا۔

''آپ نے پولیس کو بیان دیتے ہوئے بتایا تھا کہ آپ کی بیوی نے ملزم کو سامنے والے گھر میں کام کرتے دیکھ لیا تھا اور اس نے آپ سے اس کا ذکر بھی کیا تھا؟''

''جی بالکل!'' وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''وقوعہ سے دو دن پہلے جب میں ہوٹل سے واپس آیا تو میں نے فائزہ کو بہت الجھا ہوا پایا۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ ایک سال پہلے جو بندہ اس کا پیچھا کرتا رہا تھا، وہ سامنے والے گھر میں کچن کا کوئی کام کر رہا ہے۔ میں نے فائزہ سے پوچھا، کیا اس کی اس بندے سے کوئی بات بھی ہوئی ہے؟ فائزہ نے مجھے بتایا کہ بات تو نہیں ہوئی لیکن ان کی نگاہیں چار ہوئی ہیں اور اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں خطرناک نتائج کی خاموش دھمکی دی ہے۔ فائزہ خاصی ڈری ہوئی تھی۔ میں نے اسے تسلی دی کہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں خود اس کمینے سے نمٹ لوں گا۔ اگلے روز ہوٹل جانے سے پہلے میں رنگ کرنے والے زاہد علی سے ملنے کے بہانے سامنے والے گھر چلا گیا۔ اس وقت اس گھر کا نیا مالک منظور حسین بھی وہاں موجود تھا۔ میں نے زاہد علی سے اپنے ہوٹل میں رنگ کروانے کی بات کی اور واپس چلا آیا۔ اس وزٹ سے میرا مقصد صرف اس کارپینٹر کو اچھی طرح دیکھنا تھا تاکہ اس کا کوئی مستقل بندوبست کیا جا سکے۔ اگلے دو روز میں ہوٹل کے معاملات میں بہت مصروف رہا اور اس طرف دھیان نہیں دے سکا پھر پتا چلا کہ یہ بندہ منظور حسین کے کچن کا کام مکمل کر کے جا چکا ہے اور اس کے اگلے دن ہی.....'' اس نے رک کر خونخوار نظر سے ملزم کی طرف دیکھا پھر اپنی بات پوری کرتے ہوئے بولا۔ ''یہ درندہ میری بیوی کا قاتل ہے۔ اسے عبرت ناک سزا ملنا چاہیے۔''

''عدالت آپ کے جذبات کو سمجھ سکتی ہے دانش صاحب!'' وکیل استغاثہ نے اپنے گواہ کے زخموں پر مرہم رکھتے ہوئے ہمدردی بھرے لہجے میں کہا۔ ''آپ فکر نہ کریں، اس عدالت سے آپ کو انصاف ملے گا۔ دنیا کی کوئی بھی طاقت آپ کی شریک حیات کو تو واپس نہیں لا سکتی لیکن اس کی موت کے ذمے دار کو کڑی سے کڑی سزا لازمی دی جائے گی۔''

''میں سمجھتا ہوں وکیل صاحب!'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''میرے دل کو اسی وقت قرار آئے گا جب ملزم پھانسی کے پھندے میں لٹکتا ہوا نظر آئے گا۔ یہ کتنی عجیب بات ہے نا..... میری بیوی اس بدکردار انسان کے ساتھ فری ہونے کے لیے تیار نہیں ہوئی تو پہلے یہ اسے اپنی گھٹیا حرکتوں سے ٹارچر کرتا رہا اور بالآخر اس کی زندگی کا چراغ گل کر دیا۔''

''واقعی، یہ انتہائی افسوس ناک اور قابل تعزیر معاملہ ہے۔'' وکیل استغاثہ نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''وقوعہ سے دو روز پہلے مقتولہ نے ملزم کو منظور حسین کے گھر میں دیکھ لیا تھا جس کی وجہ سے وہ حد درجہ پریشان ہو گئی تھی لیکن اس سے پہلے بھی تو گاہے بہ گاہے ملزم آپ کی بیوی کو پریشان کرتا رہتا تھا؟''

''جی بالکل! ایسا ہی ہے۔'' وہ ٹھوس انداز میں بولا۔ ''اس ایک سال کے عرصے کے دوران میں ملزم نے کئی بار میری بیوی کو بلیک میل کرنے کی بھی کوشش کی لیکن وہ اس کی دھونس میں نہیں آئی۔''

''مقتولہ، ملزم کی اوچھی حرکتوں کے بارے میں مسلسل آپ کو بتاتی رہتی تھی۔'' وکیل استغاثہ نے اپنے الفاظ گواہ کے منہ میں ڈالنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''بلکہ آپ نے پولیس کو بتایا تھا کہ اس ذلیل میں مقتولہ کی ایک دوست بھی اس کی رازدار تھی؟''

وکیل استغاثہ نے معنی خیز انداز میں جملہ ادھورا چھوڑا تو گواہ نے جلدی سے کہا۔ ''فائزہ کی اس دوست کا نام تانیہ ہے۔''

''یور آنر!'' وکیل استغاثہ نے جج کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تانیہ کا نام استغاثہ کے گواہوں کی فہرست میں شامل ہے اور وہ اس وقت کمرۂ عدالت میں موجود بھی ہے۔ میں معزز عدالت کی اجازت سے اسے گواہی کے لیے بلانا چاہوں گا۔ تانیہ کا تعلق درس و تدریس سے ہے۔ سہ پہر میں اسے کلاسز لینا ہوتی ہیں۔ اگر انہیں جلدی فارغ کر دیا

www.pklibrary.com

جائے تو نوازش ہوگی۔''

جج نے بھاری بھرکم آواز میں کہا۔ ''اجازت ہے۔''

تانیہ وٹنس باکس میں آکر کھڑی ہوگئی۔ اس سے پہلے مقتولہ کا شوہر وہاں استادہ تھا۔ دانش اب حاضرین عدالت میں سب سے آگے والی قطار میں جا بیٹھا تھا۔ دانش پر جرح کا عمل ابھی مکمل نہیں ہوا تھا۔ وکیل استغاثہ نے اپنی باری لے لی تھی تاہم میرے حصے کا کام باقی تھا۔

تانیہ کی عمر تیس کے قریب رہی ہوگی۔ وہ دبلی پتلی اور دراز قد عورت تھی۔ اس نے اپنی آنکھوں پر نظر کا چشمہ لگا رکھا تھا۔ وہ گندمی رنگت کی مالک ایک قبول صورت خاتون تھی۔

تانیہ نے سچ بولنے کا حلف اٹھانے کے بعد اپنا بیان ریکارڈ کرا دیا تو وکیل استغاثہ جرح کے لیے اس کے نزدیک چلا گیا۔ آئندہ بیس پچیس منٹ میں تانیہ نے اپنے وکیل کے سوالات کے جواب میں جو کچھ بتایا اس کا خلاصہ کچھ اس طرح ہے۔

تانیہ کے بقول مقتولہ سے اکثر اس کی ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ وہ مقتولہ کی ایک رازدار دوست تھی لہٰذا مقتولہ اس کے سامنے اپنا دکھڑا بیان کرتی رہتی تھی جس کے مطابق مقتولہ اپنے شوہر کے ساتھ بڑی پُرسکون زندگی گزار رہی تھی لیکن اس سکون کی تہ میں ایک طوفان بھی چھپا ہوا تھا اور اس طوفان کا ذمے دار تھا ملزم..... ملزم گاہے بہ گاہے اس سے رابطہ کر کے فضول قسم کی باتیں کرتا تھا۔ وہ مقتولہ سے ملنے کے لیے بھی اصرار کرتا اور اس بات کی دھمکی بھی دیتا کہ اگر مقتولہ نے اس کے ساتھ تعلقات استوار نہ کیے تو وہ اس کے شوہر کے سامنے ایسا راز ہرا گلے گا کہ اس کی ہنستی مسکراتی زندگی نمونہ جہنم بن کر رہ جائے گی۔ ملزم کی ایسی گھٹیا حرکتوں کی وجہ سے مقتولہ ہر وقت ذہنی دباؤ کا شکار رہتی تھی۔ اس کی زندگی میں کسی شے کی کمی نہیں تھی سوائے سچی خوشی کے اور اس کی خوشیوں کا قاتل تھا..... ملزم فاروق..... وغیرہ ہم۔

''یور آنر! حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہے۔'' وکیل استغاثہ نے روئے سخن جج کی جانب پھیرتے ہوئے کہا۔ ''ملزم نے دو سال پہلے جب پہلی مرتبہ مقتولہ کو دیکھا تو اسی روز سے وہ ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑ گیا تھا۔ اس کی ڈھٹائی کا عالم یہ ہے کہ اس بات کا علم ہونے کے باوجود بھی کہ مقتولہ کی شادی فکس ہو چکی ہے، اس نے اپنی اوچھی حرکتیں جاری رکھیں۔ اگر اس کے اندر ذرا سی بھی انسانیت ہوتی تو مقتولہ کی شادی کے بعد وہ اس کا پیچھا چھوڑ دیتا مگر وہی بات کہ بدفطرت لوگ کمینگی سے باز نہیں آیا کرتے۔ یہ بدطینت بھی مقتولہ کی زندگی کو کسی زہریلے ناگ کے مانند لپٹ گیا تھا۔ اس نے کس کس انداز میں مقتولہ کا جینا دوبھر کر رکھا تھا، اس کی تفصیل استغاثہ کی گواہ تانیہ کی زبانی معزز عدالت کے ریکارڈ پر آچکی ہے۔ جب کسی بھی طور ملزم اپنا مقصد حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا تو اس نے مقتولہ کی زندگی کا چراغ ہی بجھا دیا۔ ایسے بدذات، سفاک اور ننگِ انسانیت شخص کو عبرت ناک سزا ملنا چاہیے..... وٹس آل یور آنر!'' پھر اس نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے خشک لہجے میں کہا۔

''یور ونس پلیز!''

وکیل استغاثہ کی پیشکش کے جواب میں، میں چپ چاپ اپنی جگہ بیٹھا رہا تو جج نے ٹھہرے ہوئے انداز میں مجھ سے پوچھا۔

''بیگ صاحب! آپ استغاثہ کی گواہ سے کچھ پوچھنا چاہیں گے؟''

''غیر متعلقہ افراد سے سوال و جواب کرنا اگرچہ مجھے پسند نہیں ہے لیکن میں اپنے فاضل دوست کو مایوس نہیں کروں گا۔'' میں نے اپنی سیٹ سے اٹھتے ہوئے معنی خیز انداز میں کہا پھر وٹنس باکس کی سمت پیش قدمی کرتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔ ''یہ بھی کیا یاد کریں گے، کس ڈیفنس سے واسطہ پڑا تھا۔''

''استغاثہ کی گواہ محترمہ تانیہ کوئی غیر متعلق فرد کیسے ہو سکتی ہے؟'' وکیل مخالف جاوید ہمدانی نے تیکھے لہجے میں مجھ سے استفسار کیا۔

''ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے.....!'' میں نے وکیل استغاثہ کے سوال کے جواب میں سرسری انداز میں کہا پھر وٹنس باکس میں موجود استغاثہ کی گواہ تانیہ کی جانب متوجہ ہو گیا۔

''کیا میں آپ کو مس تانیہ یا میڈم تانیہ کہہ سکتا ہوں؟'' میں نے گواہ کے چہرے پر نگاہ گاڑ کر پوچھا۔

''جو آپ کو ٹھیک لگے وکیل صاحب!'' وہ معتدل انداز میں بولی۔ ''مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن میں بھی آپ سے ایک سوال کرنا چاہتی ہوں۔''

''جی پلیز..... ضرور!'' میں نے کہا۔ ''پہلے آپ کی باری، لیڈیز فرسٹ!''

''آپ نے مجھے غیر متعلق کیوں کہا؟'' اس نے پوچھا۔

''کیا آپ خود کو اس کیس سے متعلق سمجھتی ہیں؟''

''اس کیس سے میرا کچھ لینا دینا نہیں۔'' وہ عام سے لہجے میں بولی۔ ''ہاں، البتہ مرحومہ فائزہ سے میری بڑی

www.pklibrary.com

گہری دوستی تھی اور اسی دوستی کا تقاضا نبھانے کے لیے میں اس وقت عدالت میں موجود ہوں لہٰذا آپ مجھے غیر متعلق نہیں کہہ سکتے وکیل صاحب!"

اگر میں نے تانیہ کی ہسٹری نہ کھود نکالی ہوتی تو میں اتنے اعتماد کے ساتھ اس کی "درگت" نہ بنا پاتا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سپاٹ آواز میں کہا۔

"میں عارضی طور پر اپنے الفاظ واپس لیتے ہوئے آپ کو اس کیس کا ایک تعلق دار فرد تسلیم کر لیتا ہوں۔"

وہ تیز آواز میں مستفسر ہوئی۔ "عارضی طور پر کیوں؟"

"اس لیے کہ میری جرح کے سامنے آپ کی حیثیت پانی کے بلبلے سے زیادہ نہیں ہے۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "اور آپ بھی جانتی ہیں بلبلے کی زندگانی عارضی ہوتی ہے۔"

اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا تاہم اس نے جلد ہی اپنی اندرونی کیفیت پر قابو پا لیا اور ٹھوس انداز میں بولی۔ "دیکھتے ہیں۔"

"آپ کے وکیل موصوف نے معزز عدالت کو بتایا ہے کہ آپ کا تعلق درس و تدریس کے شعبے سے ہے۔" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "آپ نے اپنا مدرسہ کہاں پر کھول رکھا ہے؟"

"آبجیکشن یور آنر!" وکیل استغاثہ نے فوراً اعتراض جڑ دیا۔ "ڈیفنس، استغاثہ کی معزز گواہ کا تمسخر اڑانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ انہیں اس قسم کی عامیانہ حرکتوں سے باز رہنے کی تلقین کی جائے۔ گواہ اپنے گھر میں ایک چھوٹا سا کوچنگ سینٹر چلاتی ہیں۔ مختلف کلاسز کے اسٹوڈنٹ ان کے پاس ٹیوشن پڑھنے آتے ہیں۔"

"جناب عالی!" میں نے وکیل استغاثہ کے اعتراض کو رد کرتے ہوئے تحمل انداز میں کہا۔ "لفظ مدرسہ معیوب ہے اور نہ ہی عامیانہ۔ آسان الفاظ میں آپ اسے درس گاہ یا تعلیمی مرکز کہہ سکتے ہیں اور اگر کسی کے ذہن میں انگلش کا وائرس قیام پذیر ہو تو اسے کوچنگ سینٹر بھی کہا جا سکتا ہے۔"

"بیگ صاحب!" جج نے معتدل انداز میں کہا۔ "آپ مدرسے کی جگہ کوچنگ سینٹر کے الفاظ استعمال کرتے ہوئے اپنی جرح جاری رکھیں۔"

"تانیہ صاحبہ! آپ اپنے کوچنگ سینٹر میں عموماً کس کلاس کے بچوں کو ٹیوشن پڑھاتی ہیں؟" میں نے گواہ کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے سوال کیا۔

"میرے پاس زیادہ تر میٹرک لیول کے اسٹوڈنٹس ہیں۔" اس نے جواب دیا۔

"میٹرک سائنس یا آرٹس؟"

بے دھیانی میں اس کے منہ سے نکل گیا۔ "سائنس۔"

"ویری گڈ!" میں نے اس کی بے دھیانی کو اپنے دھیان میں رکھتے ہوئے ستائشی انداز میں کہا۔ "سائنس کے کون سے مضمون میں آپ کو زیادہ مہارت حاصل ہے؟ فزکس، میتھ، بائیولوجی یا کیمسٹری؟"

"کیمسٹری!" وہ بے ساختہ بولی۔

"اس کا مطلب ہے آپ نے کیمسٹری میں ایم ایس سی کر رکھا ہوگا؟" میں نے اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "یا کم از کم بی ایس سی...... میٹرک کے بچوں کو پڑھانا کوئی آسان کام تو نہیں۔ اس کے لیے ٹیچر کا تعلیم یافتہ ہونا ضروری ہے...... ہے نا؟"

اس نے ایم ایس سی اور بی ایس سی کے ذکر کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے گول مول جواب دیا۔ "جی وکیل صاحب! آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔"

اس بے چاری کو اندازہ نہیں تھا کہ میں جب "بالکل ٹھیک" کہنے پر آتا ہوں تو اپنے مدمقابل کا کیا حشر کرتا ہوں۔ اس کے گول مول جواب کا بم بنا کر میں نے اس کے ہوش و حواس پر پھوڑ ڈالا۔

"تانیہ صاحبہ! میٹرک کے کیمسٹری سلیبس میں ایک ڈبل سالٹ یا سلفیٹ سالٹ کا ذکر ہے جو دو دھاتوں پوٹاشیم اور ایلومینیم کے چوبیس واٹر مالیکیولز کے ساتھ اشتراک کے بعد وجود پاتا ہے۔" میں نے نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔ "آپ میٹرک کے اسٹوڈنٹس کو کیمسٹری پڑھاتی ہیں۔ یقیناً آپ اس سلفیٹ سالٹ یعنی ڈبل سالٹ سے گہری واقفیت رکھتی ہوں گی۔ معزز عدالت جاننا چاہتی ہے کہ پانی کے چوبیس مالیکیولز کو پی کر تشکیل پانے والے اس سلفیٹ سالٹ کو عرفِ عام میں کیا کہا جاتا ہے۔ آپ کی سہولت کے لیے اشارہ دے دوں کہ میٹرک لیول تک پڑھائی جانے والی کیمسٹری میں اس سالٹ کا فارمولا سب سے طویل ہے۔"

وٹنس باکس میں کھڑی استغاثہ کی گواہ تانیہ کی حالت دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ میرے اس کیمیائی استفسار نے اس کے دماغ کا فیوز اڑا دیا تھا۔ اس کی جگہ وٹنس باکس میں اگر میٹرک سائنس کا کوئی ہونہار طالب علم کھڑا ہوتا تو وہ نہ صرف میرے سوال کے جواب میں کہتا "ایلم یعنی پھٹکری" بلکہ وہ اس سلفیٹ سالٹ پھٹکری کا کیمیکل فارمولا "...

ایس او فور، اے ایل ٹو ایس او فور تھری، ٹوئنٹی فور ایچ ٹو او'' بھی فرفر سنا ڈالتا مگر تانیہ کا چونکہ کیمسٹری سے دور کا واسطہ بھی نہیں تھا اس لیے وہ گڑبڑائے ہوئے لہجے میں بولی۔

''اس وقت مجھے...... یاد نہیں...... آرہا......''

وکیل استغاثہ فوراً اپنی گواہ کی مدد کو لپکا۔ ''مجھے سخت اعتراض ہے جناب عالی!'' اس نے احتجاجی لہجے میں کہا۔ ''اس وقت فائزہ مرڈر کیس زیر سماعت ہے جس کا کیمسٹری کے فارمولاز سے کچھ لینا دینا نہیں لیکن میرے فاضل دوست کمرۂ عدالت کو کیمسٹری کلاس روم بنا کر عدالت کا قیمتی وقت برباد کررہے ہیں۔''

''اس کیس کا علم کیمیا (کیمسٹری) سے بھلے کوئی تعلق نہ ہو لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ استغاثہ کی معزز گواہ مس تانیہ کیمسٹری کی ٹیچر ہیں اور میں نے یہ سوال بھی انہی سے کیا ہے میرے فاضل دوست!'' میں نے ترکی بہ ترکی کہا۔ ''اگر استغاثہ کی گواہ میرے سوال کا جواب نہ دے سکیں اور یقیناً یہ جواب نہیں دے سکتیں تو ان کی دروغ گوئی مسلّم ہو جائے گی۔ مجھے فی الحال یہی ثابت کرنا ہے کہ تانیہ کی گواہی کسی بھی طور لائق اعتبار نہیں۔ اسے ایک خاص قسم کا ''مقتولہ دوستی'' سبق رٹوا کر عدالت میں لایا گیا ہے۔ درحقیقت یہ نام نہاد مس کیمسٹری مقتولہ فائزہ کے ''ف'' کے بارے میں بھی کچھ نہیں جانتی۔''

''بی بی! کیا وکیل صاحب ٹھیک کہہ رہے ہیں؟'' جج نے تانیہ سے پوچھا۔

''سر......!'' وہ تھوک نگلتے ہوئے بولی۔ ''میں یہاں پر اپنی دوست مرحومہ فائزہ کے بارے میں گواہی دینے آئی تھی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میرا کیمسٹری کا امتحان شروع ہو جائے گا۔ بس اسی پریشانی میں ڈبل سالٹ کا نام میرے ذہن سے نکل گیا۔ باقی...... میں نے آپ سے کوئی جھوٹ نہیں بولا......''

''آبجیکشن سسٹینڈ!'' جج نے گواہ کی وضاحت کے جواب میں کہا پھر مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کردیا۔ ''بیگ صاحب! آپ ذکر کیمسٹری کو فی الحال ایک طرف رکھ کر زیر سماعت کیس کے حوالے سے استغاثہ کی گواہ پر اپنی جرح جاری رکھیں۔''

تانیہ نے بڑی ہوشیاری سے سچویشن کو سنبھالنے کی کوشش کی تھی لیکن میں اس کی کسی کوشش کو کامیابی سے ہمکنار ہوتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ جن کا ہوم ورک مکمل ہوتا ہے وہ کسی میدان میں مار نہیں کھاتے اور میں نے مقتولہ کی زندگی پر گویا پی ایچ ڈی کررکھا تھا۔

''مس تانیہ! آئی ایم ویری سوری۔'' میں نے وٹنس باکس میں کھڑی استغاثہ کی گواہ کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے معتدل انداز میں کہا۔ ''میں نے مقتولہ کو نظر انداز کرکے خوامخواہ آپ کو ایلم یعنی پھٹکری کے چکر میں ڈال دیا۔ آپ اس سلفیٹ سالٹ کو بھول جائیں اور مجھے بتائیں...... مجھے بھی نہیں بلکہ معزز عدالت کو بتائیں کہ مقتولہ کے ساتھ آپ کی دوستی کا عرصہ کتنے سالوں پر محیط ہے؟''

''یہی کوئی......'' وہ متذبذب انداز میں بولی۔ ''آٹھ سے دس سال۔''

''یہ تو واقعی اچھا خاصا عرصہ ہے۔'' میں نے سرسری لہجے میں کہا۔ ''آپ کو مقتولہ کی رازدار دوست ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ میں پچھلے ساڑھے پانچ سال کے دوران میں پیش آنے والے نہایت ہی اہم واقعات کا ذکر کرکے آپ سے چند سوالات کرنا چاہوں گا...... اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو......؟''

وہ چونکنا نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''مثلاً کس قسم کے سوالات، وکیل صاحب؟''

''ارے! آپ تو خوامخواہ ہی پریشان ہوگئیں۔'' میں نے دوستانہ انداز میں کہا۔ ''بس، یہ مقتولہ کی زندگی کے حوالے سے عام سے سوالات ہیں۔ آپ تو مقتولہ کی رازدار دوست ہیں۔ جب مقتولہ کی دوسری عام دوست یعنی مریم اور صدف اس بارے میں سب کچھ جانتی ہیں تو بھلا آپ کیسے بےخبر ہوں گی؟''

وہ چند لمحے تک شک زدہ نظر سے مجھے تکتی رہی پھر قدرے مضبوط لہجے میں بولی۔ ''ٹھیک ہے وکیل صاحب! آپ پوچھیں۔''

میں نے پوچھا۔ ''اپنی موت سے لگ بھگ چار سال پہلے مقتولہ ایک لڑکے کے ساتھ اپنے گھر سے بھاگ گئی تھی لیکن مقتولہ کے بڑے بھائی شکیل نے اپنے چند دوستوں کے ساتھ کمانڈو ایکشن کا مظاہرہ کرکے دو گھنٹے کے اندر نہ صرف مقتولہ کو بازیاب کرلیا تھا بلکہ وہ جس لڑکے کے ساتھ بھاگی تھی، اس کی بھی ہڈی پسلی ایک کرکے رکھ دی تھی۔ معزز عدالت اس لڑکے کا نام آپ کی زبان سے سننا چاہتی ہے۔''

پھر میں نے روئے سخن جج کی سمت موڑتے ہوئے حد درجہ سنجیدگی سے کہا۔

''جناب عالی! قبل اس کے کہ میرے فاضل دوست اچانک ''آبجیکشن یور آنر'' کا نعرۂ مستانہ بلند کرکے میرے

www.pklibrary.com

کام میں کوئی رکاوٹ کھڑی کرنے کی کوشش فرمائیں، میں وضاحت کرتا چلوں کہ میں استغاثہ کی گواہ مس غیر کیمیا سے جو بھی سوال کروں گا، اس کی تصدیق مقتولہ کے میکے والوں اور اس کی عزیز از جان دوستوں مریم اور صدف سے کی جاسکتی ہے۔ اگر میری کوئی بھی بات غلط یا فرضی یا من گھڑت ثابت ہوتو میں اس قریب الجیت کیس سے دستبردار ہوجاؤں گا۔"

جج نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "بیگ صاحب! پلیز پروسیڈ فردر۔"

میں دوبارہ تانیہ کی جانب متوجہ ہوگیا۔ "یس مس! اس لفنگے کا نام بتائیں جس کے ساتھ چار سال پہلے مقتولہ نے بھاگنے کی ناکام کوشش کی تھی؟"

وہ بری طرح پھنس چکی تھی۔ اس کے سان وگمان میں بھی نہیں تھا کہ میں یوں بند گلی میں گھیر کر اس کے جھوٹ کا پول کھول دوں گا۔ وہ الجھن زدہ لہجے میں بولی۔

"جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، اس لڑکے کا نام کاشف تھا۔"

یہ جواب برائے جواب ایک بے تکا "تکا" تھا جو جان چھڑانے کے لیے لگایا گیا تھا مگر میں اتنی آسانی سے بھلا کہاں اس کی جان چھوڑنے والا تھا۔

"غلط!" میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔ "اس نابکار کا نام تھا...... نبیل!"

تانیہ کے چہرے پر خفت کے آثار پیدا ہوئے جیسے اسے چوری کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑا گیا ہو۔ میں نے اپنی جرح میں تیزی لاتے ہوئے اگلا سوال کیا۔

"مقتولہ کے والدین اس کی شادی کے لیے خاصے پریشان رہتے تھے اور نبیل کے ساتھ بھاگنے والے واقعے نے تو ان کی پریشانی کو ہزار گنا بڑھا دیا تھا۔ کسی سیانے نے مشورہ دیا کہ مقتولہ کا نام بہت بھاری اور ناموافق ہے۔ اگر ستاروں کے حساب سے اس کا نام تبدیل کردیا جائے تو ایک سال کے اندر ہی اس کی شادی ہوجائے گی۔ مقتولہ کے والدین نے اس سیانے کے مشورے پر صاد کیا اور مقتولہ کا نام بدل کر فائزہ رکھ دیا گیا۔ معزز عدالت مقتولہ کی ہم راز دوست، مس تانیہ سے یہ جاننا چاہتی ہے کہ مقتولہ کا پیدائشی نام کیا تھا۔"

میرے اس جارحانہ استفسار پر استغاثہ کی گواہ کی حالت ایسی ہوگئی کہ کاٹو تو بدن میں خون نہیں۔ اس نے جھنجلاہٹ آمیز انداز میں جواب دیا۔

"میں جب سے اسے جانتی ہوں، اس کا نام فائزہ ہی تھا۔ پتا نہیں آپ کون سی نئی کہانی سنا رہے ہیں!"

"یہ کہانی تو چار، ساڑھے چار سال پرانی ہے۔" میں نے "آپ" سے "تم" پر آتے ہوئے کڑوے لہجے میں کہا۔ "لیکن افسوس کہ تمہاری اور مقتولہ کی غائبانہ دوستی کو ابھی چھ آٹھ ماہ ہی گزرے ہیں۔ مجھے بتاؤ، اس جھوٹی گواہی کے لیے تم نے کتنی رقم لی ہے؟"

"یہ...... یہ......" اس کا چہرہ فق ہوگیا۔ "آپ کیسی...... باتیں کررہے ہیں۔" اس نے لکنت زدہ لہجے میں مجھ سے پوچھا۔ "آخر...... آپ کہنا کیا...... چاہ رہے ہیں؟"

"اب جو کچھ بھی کہنا ہے، وہ تم سے عدالت ہی نے کہنا ہے۔" میں نے کاٹ دار آواز میں کہا۔ "میرا کام تو پورا ہوچکا۔" پھر میں استغاثہ کی جھوٹی گواہ مس تانیہ کو چھوڑ کر کرسیِ انصاف پر براجمان جج کی جانب مڑا۔

"جناب عالی!" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "استغاثہ کی گواہ مقتولہ کی کتنی گہری اور راز دار دوست ہے، اس بھید کا بھانڈا تو سر اجلاس پھوٹ چکا ہے۔ تانیہ نامی یہ عورت کیمسٹری کے بارے میں کچھ جانتی ہے اور نہ ہی مقتولہ کی زندگی سے اسے کسی قسم کی واقفیت ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس نے صریحاً غلط بیانی سے کام لیا ہے جو کہ قانون کی نظر میں ایک سنگین جرم ہے۔ اس دروغ گو عورت کی گواہی میرے مؤکل کو سزا دلوانے کے سلسلے میں تو کسی بھی زاویے سے مفید ثابت نہیں ہوئی البتہ اس کا بیان خود اس کے لیے کسی مصیبت سے کم نہیں ہے۔ میں آئندہ پیشی پر مقتولہ کے بھائی، بہن اور دوستوں میں سے ایک یا ایک سے زیادہ افراد کو حاضر عدالت کرکے استغاثہ کے تابوت میں آخری کیل بھی ٹھونک دوں گا۔ سردست میں معزز عدالت کی توجہ ایک اہم نکتے کی جانب مبذول کرانا چاہتا ہوں۔" لمحاتی توقف کرکے میں نے ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

"اس امر میں تو کسی شک وشبے کی گنجائش تلاش نہیں کی جاسکتی کہ استغاثہ کی گواہ تانیہ نے غلط بیانی سے کام لیتے ہوئے اس کیس کو خراب کرنے کی کوشش کی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ گواہ نے کس مقصد کی خاطر یہ حرکت کی ہے کیونکہ انسان عموماً جھوٹ اس وقت بولتا ہے جب اس نے کوئی بڑا مالی فائدہ حاصل کرنا ہوتا ہے، یا کسی بڑے مالی نقصان سے بچنا ہوتا ہے، یا اپنے کسی جرم کی پردہ پوشی کرنا ہوتی ہے، یا کسی کے جرم کو چھپانا مقصود ہو...... یہ جاننا اور عدالت کے ریکارڈ پر لانا ازحد ضروری ہے کہ استغاثہ کی گواہ کی دروغ گوئی کس خانے میں فٹ بیٹھتی ہے۔ ڈیٹس آل یور آنر!"

www.pklibrary.com

اس کے ساتھ ہی عدالت کا مقررہ وقت ختم ہوگیا۔ جج نے میرے بیان کردہ دلائل کو پورے انہماک سے سنا تھا اور میرے خاموش ہونے پر اس نے سرکی اثباتی جنبش کے ساتھ پندرہ روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کرنے کا اعلان کردیا تھا۔

''دی کورٹ از ایڈ جارنڈ!''

☆☆☆

منظر اسی عدالت کا تھا اور گواہوں والے کٹہرے میں مقتولہ کا شوہر دانش کھڑا تھا۔ گزشتہ پیشی پر میں اس سے سوال و جواب نہیں کرسکا تھا لہٰذا عدالتی کارروائی کا آغاز ہوا تو میں جج کی اجازت حاصل کرنے کے بعد وٹنس باکس کے نزدیک چلا گیا۔

''دانش صاحب! میں نے استغاثہ کے سب سے اہم گواہ کی طرف دیکھتے ہوئے تعزیت بھرے انداز میں کہا۔ ''مجھے آپ کی بیوی کو پیش آنے والے اندوہ ناک واقعے کا سخت افسوس ہے۔''

''میں بھلا آپ کی بات کا کیسے یقین کرلوں وکیل صاحب؟'' وہ تڑخ کر بولا۔ ''جو شخص اس افسوس ناک واقعے کا ذمے دار ہے، آپ تو اسے بچانے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔''

''میری تمام تر کوششیں حق اور سچ کو بچانے کے لیے ہیں۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''میرا مؤکل آپ کی بیوی کی موت کا ذمے دار نہیں ہے۔ ہاں، البتہ وہ اس مرڈر کیس میں پھنسا ہوا ضرور دکھائی دے رہا ہے۔ خیر..... اسے تو میں باعزت بری کروا ہی لوں گا۔ آپ یہ بتائیں کیا آپ مقامی ہیں؟''

میرے سوال پر وہ چونک اٹھا اور الجھن زدہ لہجے میں پوچھا۔ ''اس کا کیا مطلب ہوا؟''

''مطلب یہ کہ آپ کے آباؤ اجداد کا تعلق کراچی ہی سے ہے یا.....!''

''میں سمجھ گیا۔'' وہ میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی بول اٹھا اور بتایا۔ ''ہم لوگ تیس پینتیس سال پہلے یہاں آکر آباد ہوئے تھے۔ کراچی میں رہائش اختیار کرنے کے پہلے سال ہی میں، میری پیدائش عمل میں آئی تھی۔''

''بنیادی طور پر آپ کا تعلق پاکستان کے کس علاقے سے ہے؟'' میں ایک خاص مقصد کی خاطر دانش کے ماضی کو کھنگالنے کی کوشش کررہا تھا۔

اس نے جلدی سے جواب دیا۔ ''پنجاب سے۔''

''پنجاب میں کہاں؟''

''کچا کھوہ.....!''

''خانیوال والا کچا کھوہ.....؟''

''جی..... جی..... وہی۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

''دانش صاحب! آپ ہوٹل لائن میں کب سے ہیں؟'' میں نے یکا یک اپنا انداز و یہ سوالات تبدیل کردیا۔

''اپنا ہوٹل بنائے کم و بیش دس سال ہوگئے ہیں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''اس سے پہلے میں دوسرے ہوٹلوں پر اس کام کا تجربہ حاصل کرتا رہا تھا۔''

''میں نے سنا ہے آپ کا طارق روڈ والا یہ ہوٹل ماشاء اللہ خوب چلتا ہے۔'' میں نے دوستانہ انداز میں اسے گھسنا شروع کردیا۔

''جی..... اللہ کا بڑا کرم ہے۔''

''آپ کا ہوٹل کب سے کب تک کھلا رہتا ہے؟''

''صبح سات سے رات بارہ، ساڑھے بارہ بجے تک۔'' اس نے جواب دیا۔

''لگ بھگ سترہ گھنٹے۔'' میں نے مصنوعی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''بڑی لمبی ڈیوٹی ہے آپ کی تو۔''

''میں تمام وقت ہوٹل میں موجود نہیں ہوتا۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''صبح میں ایک اور بندہ ڈیوٹی دیتا ہے۔ وہ میرے بھروسے کا آدمی ہے۔ میں دوپہر کے بعد ہوٹل پر جاتا ہوں۔''

دانش کے بھروسے کے اس بندے کا نام نوید خان تھا۔ وہ اس کے ہوٹل کا ایک سینئر ملازم تھا۔ دانش نے مجھے بتایا کہ صبح سات سے دوپہر دو بجے تک نوید ہوٹل کا کاؤنٹر سنبھالتا تھا اور پھر دو بجے سے نصف شب تک دانش خود کاؤنٹر پر موجود رہتا تھا۔ گویا دانش کے حصے میں کم و بیش دس گھنٹے کی ڈیوٹی تھی۔ یہ تفصیل فراہم کرتے ہوئے دانش نے کہیں بھی ڈنڈی نہیں ماری تھی۔ جمیل اختر کی زبانی بھی اسی قسم کی معلومات مجھ تک پہنچی تھیں۔

''وقوعہ کے دن کو اپنے ذہن میں تازہ کرنے کی کوشش کریں دانش صاحب!'' میری جرح کی ٹرین پٹری پر پٹڑی بدلنے لگی۔

''پولیس کے مطابق مقتولہ کو پیش آنے والے واقعے کی اطلاع دینے آپ خود تھانے پہنچ گئے تھے۔ پولیس کے روزنامچے کے مطابق اٹھارہ اپریل کی شام آٹھ بجے آپ اپنی بیوی کے قتل کی رپورٹ لکھوانے متعلقہ تھانے پہنچے

www.pklibrary.com

تھے۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟''

''آپ بالکل درست فرما رہے ہیں۔''

''آپ کو یہ بات کب پتا چلی کہ آپ کی نصف بہتر کو کسی نے بڑی بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا ہے؟'' میں نے غیر محسوس انداز میں اسے اپنی جرح کے جال میں پھنساتے ہوئے پوچھا۔ ''اور یہ اطلاع آپ کو کس نے دی تھی؟''

''اس وقت لگ بھگ شام کے ساڑھے چھ یا سات بجے ہوں گے۔'' وہ معتدل انداز میں بولا۔ ''اور اس واقعے کی اطلاع مجھے کسی اور نے نہیں دی تھی بلکہ میں نے خود اپنی آنکھوں سے فائزہ کو کچن کے فرش پر، اپنے ہی خون میں لت پت مُردہ پڑے دیکھا تھا پھر میں فوراً اس واقعے کی رپورٹ لکھوانے تھانے چلا گیا تھا۔''

''گویا آپ یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ اس روز آپ کے ہوٹل کی چھٹی تھی؟'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جما کر پوچھا۔

''نن..... نہیں.....'' وہ گڑبڑا گیا۔ ''ہوٹل تو کھلا ہوا تھا۔''

''پھر آپ اپنے گھر پر کیا کر رہے تھے؟'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔ ''اس وقت تو آپ کو ہوٹل پر ہونا چاہیے تھا۔ بیکاز، اٹ واز یور ڈیوٹی ٹائم؟''

''آپ درست فرما رہے ہیں وکیل صاحب!'' وہ خود کو سنبھالتے ہوئے بولا۔ ''میں روزانہ رات کو بارہ بجے کے بعد ہی ہوٹل سے لوٹتا ہوں مگر اس روز ایک ضروری کام کے لیے مجھے جلدی آنا پڑ گیا تھا۔ میں نے اپنے ایک ملازم فیروز کو کاؤنٹر پر کھڑا کیا اور گھر آ گیا لیکن.....'' اس کی آواز بھرا گئی۔ لمحاتی توقف کے بعد اس نے بس اتنا کہا۔ ''مجھے کیا پتا تھا کہ گھر میں مجھے فائزہ کی لاش کو دیکھنا پڑے گا۔''

''دانش صاحب! میں آپ کی ذہنی کیفیت کو اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔'' میں نے ہمدردی بھرے لہجے میں کہا۔ ''لیکن عدالت کو یہ تو آپ ہی بتائیں گے کہ وقوعہ کے روز کس ضروری کام سے آپ کو قبل از وقت گھر آنا پڑا تھا؟''

اس نے بتایا۔ ''میرے پاس بی سی (کمیٹی) ڈلتی ہے۔ پانچ ہزار روپے مہینا سے ایک لاکھ روپے کی بی سی یعنی بیس ممبرز والی بی سی۔ یہ خاصی تگڑی بی سی ہے جو ہر ماہ کی بیس تاریخ کو متعلقہ شخص کے حوالے کر دی جاتی ہے۔ اپریل میں عبدالوہاب صاحب کی بی سی تھی۔ عبدالوہاب کو کسی فوری ضرورت کے تحت پیسوں کی طلب ہوئی تو انہوں نے مجھ سے کہا جتنی بی سی جمع ہو چکی ہے وہ مجھے دے دیں، باقی میں بعد میں لے لوں گا۔ اس وقت تک سولہ بی سی آ چکی تھیں یعنی میرے پاس اسّی ہزار روپے جمع ہو گئے تھے۔ حفظ ماتقدم کے طور پر میں نے وہ رقم اپنے گھر پر رکھی ہوئی تھی۔ عبدالوہاب کا کام کرنے کے لیے یعنی وہ رقم لینے میں اپنے گھر آیا تھا۔''

جس زمانے کا واقعہ ہے اس وقت پانچ ہزار روپے ماہانہ کی کمیٹی کو خاصا ہینڈسم سمجھا جاتا تھا اسی لیے دانش نے اسے تگڑی بی سی کہا تھا۔ اس کی وضاحت کے جواب میں، میں نے کہا۔

''دانش صاحب! مجھے امید رکھنا چاہیے کہ اگر آپ کے بیان کی تصدیق کے لیے عبدالوہاب صاحب کو گواہی کی غرض سے یہاں لانے کی ضرورت محسوس ہوئی تو آپ اس سلسلے میں بھرپور تعاون کریں گے، ہیں نا.....؟''

میرے معنی خیز استفسار کے جواب میں اس نے اثبات میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔ میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''دانش صاحب! وقوعہ کے روز آپ بی سی کی رقم لینے کے لیے ہوٹل سے کتنے بجے روانہ ہوئے تھے؟''

''لگ بھگ چھ یا ساڑھے چھ بجے۔''

''آپ کے ہوٹل کا کچن غلام حسین نے سنبھال رکھا ہے اور تندور پر فیروز کی ڈیوٹی ہے جسے آپ کاؤنٹر پر کھڑا کر کے بی سی لینے گھر گئے تھے۔ اس کے علاوہ دو ویٹرز اعجاز اور سعید بھی ہوٹل کے اسٹاف میں شامل ہیں لیکن.....'' میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کیا پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ان میں سے کسی کو گواہی کے لیے بلانا تو فضول ہی ہے کیونکہ وہ تو آپ ہی کی زبان بولیں گے لہٰذا میں نے شعیب خان کو گواہی کے لیے تیار کر لیا ہے۔ کیا آپ شعیب خان کو جانتے ہیں؟''

اس نے ٹٹولتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھا اور کہا۔ ''آپ نے تو میرے ہوٹل کے ملازمین کی کنڈلیاں نکال رکھی ہیں۔''

''شعیب خان.....؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔

''کیا آپ اسی شعیب خان کی بات کر رہے ہیں جس کی دکان میرے ہوٹل کے سامنے ہے؟''

''صحیح پہنچے.....!'' میں نے ایک ایک لفظ پر دباؤ ڈالتے ہوئے کہا۔ ''شعیب خان کی دکان میں ضروریاتِ زندگی کی تقریباً ہر چیز موجود ہے لیکن آپ نے وہاں سے چیونگم کا ایک بار خریدا تھا۔''

کراچی میں کسی خان صاحب کی دکان عمرو عیار کی زنبیل کے مانند ہوتی ہے۔ کچھ بھی خریدنے چلے جاؤ، خان صاحب کی زبان میں انکار نہیں۔ وہ چھوٹی سی دکان میں سے آپ کی

www.pklibrary.com

مطلوبہ شے نکال کر آپ کے سامنے کاؤنٹر پر رکھ دے گا۔

''جی ہاں۔'' گواہ نے اثبات میں جواب دیا۔ ''اس روز میں نے شعیب خان کی دکان سے چیونگم خریدی تھی۔''

''یور آنر.....!'' میں نے روئے سخن جج کی جانب کرتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''اس وقت شعیب خان کمرائے عدالت کے باہر موجود ہے۔ میں اسے گواہی کے لیے اندر بلانا چاہتا ہوں۔ شعیب خان کا کہنا ہے کہ وقوعہ کے روز دانش صاحب نے سہ پہر چار بجے اس کی دکان سے چیونگم خریدی تھی۔ اس کے بعد دانش صاحب اپنے گھر کی جانب روانہ ہو گئے تھے۔''

جج نے ٹھوس انداز میں کہا۔ ''یو آر پرمیٹڈ!''

آئندہ دس منٹ میں شعیب خان نے صفائی کے گواہ کی حیثیت سے عدالت میں اس امر کی تصدیق کر دی کہ دانش نے وقوعہ کے روز چھ، ساڑھے چھ بجے نہیں بلکہ چار بجے سہ پہر اس کی دکان سے چیونگم کا ایک بار خریدا تھا۔

''دانش صاحب! آپ نے اٹھارہ اپریل یعنی وقوعہ کے روز ہوٹل سے گھر آنے کے وقت میں جو دو ڈھائی گھنٹے کی ڈنڈی ماری ہے، میں فی الحال اسے ایشو بنا کر عدالت کا قیمتی وقت ضائع نہیں کروں گا کیونکہ اس سے بھی زیادہ اہم پوائنٹس کو ڈسکس کرنا ابھی باقی ہے لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ میں آپ کی ''ڈنڈی'' کو ہمیشہ کے لیے پس پشت ڈال دوں گا۔'' میں نے استغاثہ کے گواہ اور مقتولہ کے شوہر کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے دھمکی آمیز انداز میں کہا اور پھر پوچھا۔ ''گزشتہ پیشی پر آپ نے وکیل سرکار کے سوالات کے جواب میں معزز عدالت کو بتایا تھا کہ آپ کے اور مقتولہ کے بیچ محبت اور اعتماد کا بڑا مضبوط رشتہ قائم تھا۔ آپ دونوں ایک دوسرے کے ہم راز تھے۔ آپ میاں بیوی کی زندگی آئینے کے مانند ایک دوسرے کے سامنے عیاں تھی۔ آپ ایک دوسرے کے بارے میں ماضی و حال کے ہر چھوٹے بڑے معاملے سے واقف تھے؟''

''جی..... ایسا ہی تھا۔'' اس نے مختصر جواب دیا۔

''پھر تو آپ کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ مقتولہ کا پیدائشی نام فائزہ نہیں بلکہ شائستہ تھا؟''

''جی ہاں۔ فائزہ نے مجھے نام کی تبدیلی کے بارے میں بتا دیا تھا۔'' اس نے سمجھ داری کا مظاہرہ کرتے ہوئے جواب دیا۔

''اور یہ حقیقت بھی آپ سے ڈھکی چھپی نہیں ہوگی کہ ساڑھے چار سال پہلے مقتولہ شائستہ (فائزہ) اپنے محبوب وکیل.....!''

''وکیل صاحب! غلطی کس سے نہیں ہوتی اور پھر جوانی تو دیوانی ہوتی ہے۔'' میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی وہ بول پڑا۔ ''فائزہ نے اس وقت جذبات کی رو میں بہہ کر جو قدم اٹھایا تھا، اسے نادانی کے سوا کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ بعد میں اسے اپنی اس حرکت پر بہت زیادہ شرمندگی بھی محسوس ہوئی تھی۔ آپ سے میری درخواست ہے کہ مرحومہ کے ماضی کو کریدنے کے بجائے آپ مجھ سے کوئی اور سوال کریں۔ میں نے فائزہ کی اس بے وقوفی کو اپنے دل و دماغ میں جگہ نہیں دی تھی۔ جب اللہ انسان کی خطاؤں کا پردہ رکھتا ہے تو انسان کو بھی اس وصف کو دھیان میں رکھنا چاہیے۔''

''آئی ایم سوری دانش صاحب! میرے استفسارات سے آپ کو کوفت ہوئی لیکن کمرائے عدالت ایک ایسا اکھاڑا ہے جہاں نہ چاہتے ہوئے بھی انتہائی ناپسندیدہ اور تکلیف دہ سوالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ''میں کوشش کروں گا کہ میرے کسی سوال سے آپ کی دل آزاری نہ ہو لہٰذا میں آپ کے نکاح نامے کی طرف آتا ہوں۔''

''نکاح نامہ.....!'' وکیل استغاثہ نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ ''یہ کون سی نئی کہانی شروع کر رہے ہیں آپ؟''

وکیل مخالف نے ''آبجیکشن یور آنر'' کی صدا بلند کرنے کے بجائے براہِ راست مجھ سے سوال کیا تھا لہٰذا میں نے جواباً ذومعنی انداز میں کہا۔

''کہانی تو پرانی ہی ہے میرے فاضل دوست لیکن لگتا ہے آپ کی یادداشت آمادۂ بغاوت ہے جو آپ کو نئی نئی سوجھ رہی ہے۔''

''کیا مطلب ہے آپ کا؟'' وہ غصہ ناک نظر سے مجھے گھورتے ہوئے مستفسر ہوا۔

''ویری سمپل مائی ڈیئر کونسلر!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''زیرِ سماعت کیس فائزہ مرڈر سے متعلق ہے اور گواہ مقتولہ کا شوہر تھا۔ یہ تو آپ کو پتا ہی ہوگا کہ ایک مرد اور عورت کو ایک دوسرے کا شوہر اور بیوی بننے کے لیے باقاعدہ نکاح کرنا پڑتا ہے اور نکاح نامہ ایک ایسی قانونی و شرعی دستاویز ہے جو ایک مرد اور ایک عورت کی شادی کی تصدیق کرتا ہے۔ استغاثہ کے گواہ دانش اور مقتولہ فائزہ کی شادی کے موقع پر بھی ایک نکاح نامہ تیار کیا گیا تھا۔ میں اسی دستاویز کا ذکر کر رہا ہوں۔ اگر آپ کو کوئی دقت نہ ہو تو میں آگے بڑھوں.....؟''

www.pklibrary.com

میری اس وضاحت نے جاوید ہمدانی کی بولتی بند کردی تھی۔ میرے نکیلے استفسار کا جواب دینے کے بجائے وہ بے بسی سے کندھے اچکا کر رہ گیا۔ میں گواہ کی جانب متوجہ ہوا۔

''دانش صاحب! ابرار حسین سے آپ کا کیا تعلق ہے؟''

''وہ میرا دوست ہے۔'' بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔

''تم دونوں کی دوستی کی عمر کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

اس کے چہرے پر ایسے تاثرات نمودار ہوئے جیسے انجانے میں اس سے کوئی غلطی سرزد ہوگئی ہو۔ ''آپ اقرار حسین کی بات کر رہے ہیں نا.....؟'' وہ چالاکی سے بولا۔ ''ہماری دوستی کافی پرانی ہے مگر..... آپ تو میرے نکاح نامے کے بارے میں سوال کرنے والے تھے پھر..... پھر اقرار حسین بیچ میں..... کہاں سے آگیا.....؟''

دانش کی گھبراہٹ آمیز ہوشیاری سے صاف نظر آرہا تھا کہ وہ دراڑ زدہ صورت حال کو الفاظ کی لیپا پوتی سے ناقابل گرفت بنانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن میں بھی پوری طرح چوکنا اور مستعد تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑ کر سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''اقرار نہیں ابرار..... ابرار حسین!''

''نہیں.....'' وہ نفی میں گردن جھٹکتے ہوئے بولا۔

''میں کسی ابرار حسین کو نہیں جانتا۔''

''چلیں، ابرار حسین کو فی الحال سائڈ پر رکھ دیتے ہیں۔'' میں نے بدستور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ''آپ یہ بتائیں کہ مقتولہ کے ساتھ آپ کی ازدواجی رفاقت کا عرصہ کتنا طویل رہا؟''

''ایک سال۔'' اس نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔

''مقتولہ کا ماضی آپ کے سامنے ایک کھلی ہوئی کتاب کے مانند تھا۔'' میں نے اپنی جرح کے جال کو رفتہ رفتہ سمیٹنا شروع کردیا۔ ''مقتولہ کے والدین مرحومین صادق علی اور بلقیس فاطمہ نے کسی سیانے کے کہنے پر اس کا نام شائستہ سے بدل کر فائزہ رکھ دیا تھا۔ اس سیانے نے یہ بھی کہا تھا کہ نام کی تبدیلی کے بعد ایک سال کے اندر ہی مقتولہ کی شادی ہوجائے گی۔''

''جی بالکل!'' وہ قطع کلامی کرتے ہوئے جلدی سے بولا۔ ''نام تبدیل کرنے کے پانچ چھ ماہ بعد ہی اس کی شادی ہوگئی تھی۔''

''گویا سیانے کا کہا حرف بہ حرف درست ثابت ہوا تھا؟''

''جی ہاں!'' اس نے اثبات میں جواب دیا۔

''کیا مقتولہ کے ساتھ یہ آپ کی پہلی شادی تھی؟''

''بالکل.....!''

''اور مقتولہ کی آپ سے.....؟''

''اس کی بھی یہ پہلی ہی شادی تھی۔'' اس نے بتایا۔ ''ہمارے نکاح نامے میں فائزہ کے آگے کنواری اور میرے آگے عقد اول لکھا ہوا تھا۔ شاید میں بتانے میں الفاظ کو آگے پیچھے کر رہا ہوں۔ آپ تو یقیناً سمجھ ہی گئے ہوں گے..... یہ ہم دونوں کی پہلی ہی شادی تھی۔''

''عقد اول کا ذکر کر کے آپ نے ایک پیچیدہ مسئلے کو چٹکی بجاتے میں حل کردیا ہے دانش صاحب!'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''اب نکاح نامے کے موضوع پر کچھ کہنا بے معنی ہے۔ چند لمحات کے لیے یہ ثابت ہوگیا کہ آپ واقعتاً ابرار حسین کو نہیں جانتے۔''

''میں سمجھا نہیں وکیل صاحب!'' وہ ہونقوں کی طرح میری صورت دیکھتے ہوئے بولا۔ ''آخر آپ کہنا کیا چاہ رہے ہیں؟ آپ نے تو کئی چیزوں کو خلط ملط کردیا ہے۔''

''ہر بات کو سمجھنے کے لیے دماغ کو زحمت دینے کی ضرورت نہیں ہوتی دانش صاحب!'' میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''ابھی آپ کے حساب سے جو بہت ساری چیزیں گڈمڈ ہوگئی ہیں، وہ اللہ کے حکم سے ایک ایک کر کے جدا ہوجائیں گی۔ بس آپ اپنے بیان پر ڈٹے رہیں..... ڈٹے رہیں گے نا؟''

''کک..... کون سا بیان.....؟'' وہ جز بز ہوتے ہوئے بولا۔

''ارے آپ تو خوامخواہ پریشان ہوگئے۔'' میں نے تشفی آمیز انداز میں کہا۔ ''میرا اشارہ سیانے کی پیش گوئی کی جانب تھا۔ آپ اس بات پر قائم ہیں نا کہ مقتولہ کا نام تبدیل کرنے کے بعد، پانچ چھ ماہ میں اس کی شادی ہوگئی تھی۔ یہ بات تھوڑی دیر پہلے آپ ہی نے معزز عدالت کو بتائی ہے۔''

''جی..... جی میں قائم..... ہوں.....!'' وہ ہکچاہٹ بھرے لہجے میں بولا۔

''دانش صاحب! پچھلے ایک گھنٹے میں آپ نے میرے سوالات کے جواب میں جو کچھ بتایا وہ اس عدالت کے ریکارڈ کا حصہ بن چکا ہے۔'' میں نے استغاثہ کے گواہ کے گرد اپنی جرح کے حلقے کو تنگ کرتے ہوئے کہا۔ ''مثلاً آپ بنیادی طور پر خانیوال کے ایک علاقے کچا کھوہ سے تعلق رکھتے ہیں مگر کسی ابرار حسین کو بالکل نہیں جانتے۔ وقوعہ کے روز آپ عبدالوہاب کی بی سی کی رقم لینے کے لیے ہوٹل سے گھر کی جانب روانہ ہوئے تو اس وقت شام کے

www.pklibrary.com

ساڑھے چھ بجے تھے جبکہ شعیب خان کا دعویٰ ہے کہ آپ اس روز سہ پہر چار بجے اپنے ہوٹل سے نکلے تھے۔ آپ مقتولہ کے ماضی اور حال سے مکمل واقفیت رکھنے کے دعوے دار ہیں اور اس امر کی گواہی دیتے ہیں کہ سیانے کی پیش گوئی کے مطابق مقتولہ کی شادی نام تبدیل کرنے کے پانچ چھ ماہ بعد ہوگئی تھی لیکن اس کے ساتھ ہی آپ نے اپنی ازدواجی رفاقت کا عرصہ محض ایک سال بتایا ہے.....'' لمحاتی توقف کرکے میں نے گہری نظر سے اسے گھورا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''اگر میں نے کچھ غلط کہا ہو تو آپ اس کی نشاندہی کرسکتے ہیں یا اگر آپ نے اپنے بیان کے کسی حصے کو تبدیل کرنا ہو تو.....؟''

میں نے دانستہ اپنے آخری جملے کو ادھورا چھوڑ کر سوالیہ نظر سے استغاثہ کے گواہ کی جانب دیکھا تو وہ خود کو پُراعتماد ظاہر کرتے ہوئے بولا۔

''میں نے عدالت میں حاضر ہونے کے بعد سچ بولنے کا حلف اٹھایا تھا اور میں نے ہر قدم پر سچ ہی بولا ہے لہٰذا بیان بدلنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

''مگر جواب پیدا ہونے کو بے تاب ہے۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر دباؤ ڈالتے ہوئے کہا۔ ''مجھے اس کیس میں ہاتھ ڈالے کم وبیش نو ماہ چند دن ہوگئے ہیں یعنی کسی انسان کی پیدائش کے لیے مقررہ قدرتی اور فطری مدت پوری ہوچکی چنانچہ اب ڈیلیوری کا وقت سر پر آن پہنچا ہے۔ زچگی کے لیے تیار ہوجائیں.....'' پھر میں جج کی سمت مڑا اور بڑے ٹھوس انداز میں دلائل دینے لگا۔

''جناب عالی! مقتولہ فائزہ آج سے لگ بھگ پونے پانچ سال پہلے اپنے محبوب نبیل کے ساتھ گھر سے فرار ہوئی تھی اور اس شرمناک واقعے کے چھ سات ماہ بعد کسی سیانے کے مشورے پر اس کا نام شائستہ سے فائزہ کردیا گیا۔ کچھ عرصے بعد یعنی آج سے کم وبیش چار سال پہلے اس کی شادی ابرار حسین نامی ایک زمیندار سے ہوگئی۔ ابرار حسین کا تعلق کچا کھوہ، خانیوال سے ہے لیکن بدقسمتی سے یہ شادی محض دو سال چل سکی اور وہ بھی اس طرح کہ مقتولہ گاؤں میں جاکر رہنے کو تیار نہیں تھی اور اس کی خواہش تھی کہ ابرار حسین کاشت کاری کو خیرباد کہہ کر کراچی میں آبسے لیکن ابرار حسین کو یہ کسی بھی طور گوارا نہیں تھا۔ دونوں خاندانوں میں تناؤ بڑھا تو مقتولہ کے والدین نے اس رشتے کو ختم کرنے کا فیصلہ کرلیا مگر ابرار حسین، مقتولہ کو طلاق دینے پر راضی نہ ہوا۔ اس نے اس معاملے کو اپنی انا کا مسئلہ بنالیا تھا۔ اس کی ضد تھی کہ مقتولہ کچا کھوہ جاکر اس کے ساتھ رہے یا پھر یونہی ہوا میں معلق اپنے میکے میں بیٹھی رہے۔ اس صورت حال کے پیش نظر مقتولہ کے والدین نے خلع کا کیس دائر کردیا۔ مقتولہ کے وکیل نے اوچھے ہتھکنڈے استعمال کرکے ابرار حسین کو ایک بدکردار، اوباش، عیاش اور پتا نہیں کیا کیا ظاہر کرکے مقتولہ کو عدالت سے خلع دلوادی۔'' میں سانس ہموار کرنے کی غرض سے تھما پھر سلسلۂ دلائل کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''یہ مقتولہ کی جیت اور ابرار حسین کی بدترین شکست تھی۔ ابرار حسین نے اپنی ذلت اور رسوائی کا بدلہ لینے کے لیے اپنے ایک وفادار دوست کو میدان میں اتارا۔ اس دوران میں مقتولہ کے والدین کا یکے بعد دیگرے انتقال ہوچکا تھا۔ صادق علی نے اپنی زندگی ہی میں جائیداد کا بٹوارا کردیا تھا۔ وراثت کے قانون کے مطابق اس تقسیم سے مقتولہ کے حصے میں ایک اپارٹمنٹ آیا۔ بہادر آباد کے علاقے میں واقع اس اپارٹمنٹ کی اچھی خاصی قیمت ہے۔ ابرار حسین نے اپنے دوست کے ساتھ ایک ڈیل کی.....''

''میرے فاضل دوست.....!'' وکیل استغاثہ نے مجھے ٹوکتے ہوئے کہا۔ ''کیا آپ اپنے ابرار حسین کے اس دوست کا نام بتانا پسند کریں گے؟''

''دھیرج مہاراج.....!'' میں نے زہر میں بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ٹھنڈا کرکے کھانے سے زبان نہیں جلتی اور آپ کی اطلاع کے لیے عرض کرتا چلوں کہ ''اپنے ابرار حسین'' کا استعمال آپ نے بالکل غلط کیا ہے۔ میں آج تک مقتولہ کے پہلے شوہر سے کبھی نہیں ملا پھر اپنے پرائے کا کیا سوال.....؟''

وکیل استغاثہ خجل سا ہوکر معاندانہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔ میں دوبارہ جج کی جانب متوجہ ہوگیا۔

''جناب عالی! ابرار حسین اپنی سابقہ بیوی یعنی مقتولہ سے بھیانک انتقام لینا چاہتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی وہ اپنے دوست کو مالی فائدہ پہنچانے کا بھی تمنائی تھا لہٰذا ابرار حسین اور اس کے دوست میں یہ ڈیل طے پائی کہ وہ مقتولہ کو اپنی محبت کے فریب میں پھنسا کر اس سے شادی کرلے گا۔ اس طرح بہادر آباد والا اپارٹمنٹ اس کے قبضے میں آجائے گا مگر ایسا ہو نہیں سکا.....'' میں تھوڑی دیر کے لیے رکا پھر وٹنس باکس میں کھڑے دانش کی سمت اشارہ کرنے کے بعد اپنا بیان جاری رکھا۔

www.pklibrary.com

''یہ شخص مقتولہ سے شادی کرنے میں تو کامیاب ہوگیا مگر مقتولہ اپنا اپارٹمنٹ اس کے حوالے کرنے کو تیار نہ ہوئی۔ جب ایک سال کی کوشش بھی بارآور ثابت نہ ہوئی تو ابرار حسین کے صبر کا اور دانش کے ضبط کا پیمانہ چھلک اٹھا لہٰذا مقتولہ کی زندگی کا چراغ گل کرنے کا فیصلہ کرلیا گیا۔ مقتولہ کی موت کے بعد اس کی ملکیت میں موجود ہر شے اس کے شوہر کی ہوجاتی۔ اس طرح دونوں دوستوں کے مقاصد پورے ہوجاتے۔ یعنی ابرار حسین، مقتولہ کی تباہی و بربادی پر دلی سکون محسوس کرتا اور مقتولہ کے حریص شوہر کی لاٹری نکل آتی۔ مقتولہ نے ملزم کی ذات کے حوالے سے اپنے شوہر کو جو کچھ بتا رکھا تھا اس نے ان معلومات کے سہارے میرے مؤکل کو قربانی کا بکرا بنا کر اس سچویشن میں فٹ کردیا..... دیٹس آل یور آنر!''

''آپ نے استغاثہ کے معزز گواہ اور مقتولہ کے خاوند کو اس کیس میں گھسیٹنے کے لیے جو سنسنی خیز کہانی گھڑی ہے، اسے ثابت کیسے کریں گے؟'' وکیل استغاثہ نے طنزیہ لہجے میں مجھ سے پوچھا۔

''سب سے جید ثبوت تو اس وقت وٹنس باکس میں موجود ہے۔'' میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''اگر یہ بندہ تعاون کے لیے آمادہ نہ ہوا تو پھر میں مقتولہ کے بڑے بھائی شکیل اور چھوٹی بہن فرحانہ کو گواہی کے لیے عدالت میں لاؤں گا جو اس امر کی تصدیق کریں گے کہ میں نے مقتولہ کے ماضی خصوصاً ابرار حسین سے اس کی شادی اور خلع کے حوالے سے جو کچھ کہا، وہ صد فیصد درست ہے۔ میں مقتولہ کی ایک دیرینہ دوست مریم کو بھی یہاں آنے کی زحمت دوں گا۔ مریم ایک سینئر پولیس آفیسر کی بیٹی ہے۔ مقتولہ، مریم کے ساتھ اپنا دکھ شیئر کرتی رہتی تھی۔ وہ اس شادی سے خوش نہیں تھی۔ مقتولہ نے مریم کو بتایا تھا کہ اس کا شوہر ایک لالچی اور بدتمیز شخص ہے۔ اس کی نگاہ بہادر آباد والے اپارٹمنٹ پر لگی ہوئی ہے جسے ہتھیانے کے لیے وہ مقتولہ سے اکثر مار پیٹ بھی کرتا ہے اور استغاثہ کا تعزیہ ٹھنڈا کرنے کے لیے میں موضع کچا کھوہ، خانیوال سے بھی چند افراد کو بلوا سکتا ہوں جو ابرار حسین اور دانش کی دوستی کی تصدیق کردیں گے۔ ویسے تو.....'' میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کرکے جج کی جانب دیکھا پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''جناب عالی! اب تک استغاثہ کے گواہوں کی جتنی غلط بیانیاں، انکوائری آفیسر کی جتنی کوتاہیاں اور اپنے فاضل دوست کی جتنی بے مقصد قلابازیاں منظر عام پر آچکی ہیں، ان کی روشنی میں میرا مؤکل بے گناہ دکھائی دیتا ہے۔ ملزم کے اوزار چرا کر کسی سفاک شخص نے اسے قربانی کا بکرا بنانے کی کوشش کی ہے۔ میرے مؤکل کا فائرہ مرڈر کیس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ مجھے اور کچھ نہیں کہنا.....''

جج نے اپنے سامنے پھیلے ہوئے کاغذات پر کچھ تحریر کرنے کے بعد وٹنس باکس میں کھڑے مقتولہ کے شوہر دانش کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔

''ابھی ڈیفنس نے جو کچھ کہا ہے اس کے رد میں تم کچھ کہنا چاہو گے؟''

''پپ..... پانی.....'' وہ اپنے حلق پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اضطراری لہجے میں بولا۔ ''میرا گلا سوکھ رہا ہے.....''

''تم جیسے دیوثوں کو پانی نہیں، زہر پینا چاہیے۔'' میں نے نفرت انگیز لہجے میں کہا۔ ''تاکہ اس دھرتی کا کچھ بوجھ کم ہوجائے۔''

دانش کا چہرہ سیاہ پڑ گیا۔ اس کے پاس اپنے بچاؤ میں بولنے کے لیے کچھ بھی نہیں بچا تھا۔ وہ رحم طلب نظر سے جج کو دیکھنے لگا۔ جج ایک زیرک اور مردم شناس شخص تھا۔ میرے مشاہدے اور تجربے کے مطابق اس نے معاملے کی تہ تک رسائی حاصل کرلی تھی۔

''تو کیا.....'' جج نے غصیلی نظر سے استغاثہ کے گواہ دانش کو گھورا پھر اتمام حجت کے طور پر کہا۔ ''تمہاری اس مجرمانہ خاموشی کو اقبال جرم تصور کیا جائے؟''

''میرا دماغ کام نہیں کررہا۔'' وہ دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو تھامتے ہوئے نحیف آواز میں بولا۔ ''مجھے چکر آرہے ہیں.....''

قبل اس کے کہ استغاثہ کے گواہ کے چکروں کا کچھ کیا جاتا، وہ سر کو تھامے تھامے لڑکھڑایا پھر کسی کٹے ہوئے شہتیر کے مانند دھڑام سے کٹہرے کے فرش پر جا گرا۔

جج نے مقتولہ کے بے ہوش شوہر کو پولیس کسٹڈی میں دیتے ہوئے عدالت برخاست کرنے کا اعلان کردیا۔ آئندہ پیشی تین روز بعد تھی۔

جن حالات میں دانش کٹہرے میں زمین بوس ہوا تھا اس کی تشریح اور تفسیر کے لیے تین دن نہیں، تین گھنٹے بھی کافی تھے۔ پولیس کی تحویل میں اس نے زبان کھول دی۔ اس طرح ایک ابن الوقت شخص اپنے منطقی انجام کو پہنچ گیا۔

یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ اگلی پیشی پر عدالت نے میرے مؤکل کو باعزت بری کردیا تھا.....!

(تحریر حسام بٹ)

www.pklibrary.com

شلپا کی خالہ کا اصرار تھا کہ وہ اس بار اس کے ساتھ اُس کے گاؤں دیپالپور میں دیوالی منائے کیونکہ دیوالی کے فوراً بعد شلپا کی شادی ہونے والی تھی اور خالہ کو یقین تھا کہ شادی کے بعد بیٹیاں یوں میکے آتی ہیں جیسے ہوا کے جھونکے۔

شلپا کے ماتا پتا نے بہن بہنوئی کا دل نہیں توڑا۔ تھوڑی سی رد و کد کے بعد شلپا کو جانے کی اجازت دے دی۔

شلپا نے تیزی ..... سے اپنی تیاری کی۔ جوتے، چپل، کپڑے جلدی جلدی ایک بکسے میں رکھے اور خالہ خالو

ہندو معاشرے میں اپنے پرائے کی ظالمانہ تقسیم کا دل سوز قصہ

اگر غور کیا جائے تو دنیا کے بیشتر واقعات اور ظلم کی بنیاد "دولت" ہی نظر آتی ہے۔ اس کے بعد اقتدار مگر... اقتدار کا حصول بھی تو دولت کے گرد ہی گھومتا ہے۔ وہ جو اس کے حسن کا دیوانہ ہو چلا تھا... عشق میں سب کچھ وار بیٹھنے کے دعوے کر رہا تھا کہ ایک ذرا سی بھول چوک پر اس کی ہی زندگی کو دار پر چڑھا بیٹھا... کیونکہ حسن کے ساتھ ساتھ انہیں دولت کے انبار بھی تو درکار تھے۔

بہو بیٹی

آصفہ ضیا احمد

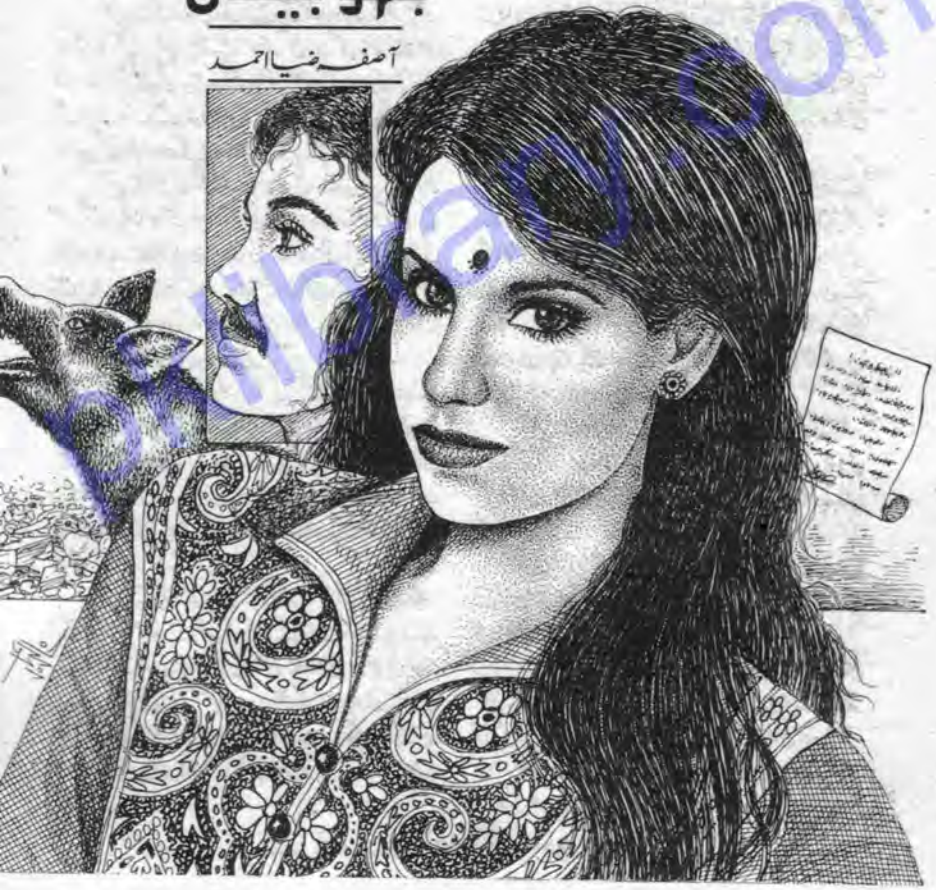

www.pklibrary.com

کے ساتھ دیپالپور پہنچ گئی۔ خالہ کے گھر پہنچ کر اسے فرحت بخش طمانیت کا احساس ہوا کیونکہ شہروں کی طرح یہاں شور، ہنگامہ آرائی اور افراتفری نہیں تھی مگر خالہ کے گھر کا سونا پن اسے کھلنے لگا لیکن ننھی بلا کی ذہین اور شوخ و چنچل۔ جلد ہی اڑوس پڑوس کی لڑکیاں جو کہ اس کی ہم عصر تھیں، ان سے دوستی گانٹھ لی۔

اس وقت بھی وہ اپنی نئی نویلی ہم جولیوں کے سنگ پر بھات پھیری (صبح کی چہل قدمی) پر نکلی ہوئی تھی۔ ہرے بھرے کھیت، ٹیڑھی میڑھی پگڈنڈیاں اور مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو اس کی آنکھوں کے راستے سے سیدھے دل میں اتر رہے تھے۔ اس خوابناک ماحول میں وہ تتلی کی طرح اڑی اڑی پھر رہی تھی۔ دفعتاً اس کی نظر ایک خستہ حال عمارت پر پڑی جو گاؤں کے کچے پکے مکانوں سے ہٹ کر تعمیر کی گئی تھی۔

عمارت کی زبوں حالی اپنی جگہ لیکن وہ قدیم طرز تعمیر کا شاہکار تھی۔ شلپا چلتے چلتے ٹھٹک گئی اور گردن باندھے اس عمارت کو دیکھنے لگی۔ اس کے ساتھ چلنے والی دوسری لڑکیاں بھی وہیں رک گئیں۔ رادھیکا نامی ایک لڑکی اس کی دلچسپی بھانپ گئی۔ عمارت کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

”یہ چودھری رگھونندن کی حویلی ہے۔ اگر اندر والا حصہ بھی دیکھنا چاہتی ہو تو پھر دیوالی کی رات ہم لوگوں کے ساتھ چلنا۔ چودھری صاحب کی بہو اور بیٹی دیوالی کی خوشی میں اپنا نرتیہ (ناچ) اور گیت سنگیت پیش کریں گی۔ جل پان (ریفریشمنٹ) کا بھی انتظام ہوتا ہے۔ بہت مزہ آتا ہے۔ ہم لوگ تو ہر سال آتے ہیں۔“

اس کے برابر میں کھڑی لڑکی آنکھیں مٹکاتے ہوئے بولی۔ ”اری شلپا! اس سال تو چودھری صاحب کی بہو شیفالی کی پہلی دیوالی ہے اس لیے اس دیوالی پر یہاں کی سج دھج دیکھنے کے لائق رہے گی۔ بس تو اپنی موسی اور موسا سے اجازت لے لینا کیونکہ گیت سنگیت کا یہ کاریہ کرم آدھی رات کو ہی ختم ہوتا ہے۔“

شلپا کے دل میں شوق اور تجسس انگڑائیاں لینے لگا۔ لڑکیوں کا یہ جھنڈ اسی طرح کی باتیں کرتے ہوئے اپنے اپنے راستے ہولیا۔ سب کا موضوع گفتگو چودھری کی حویلی تھا۔ جب شلپا گھر پہنچی تو وہ مصمم ارادہ کر چکی تھی کہ وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ جا کر حویلی بھی دیکھے گی اور رنگ منچ (اسٹیج) پر ہونے والا دیوالی منورنجن (دیوالی تفریح) کا بھی لطف اٹھائے گی۔

جوں ہی وہ گھر میں داخل ہوئی اسے یوں محسوس ہوا گھر میں بھونچال آ گیا ہو۔ دراصل شہر میں رہائش پذیر اس کے دونوں خالہ زاد بھائی مع بیوی بچوں سمیت ماں باپ کے ساتھ دیوالی منانے آن پہنچے تھے۔ سب نہایت گرمجوشی سے ایک دوسرے سے ملے اور ایک دوسرے کو پیتی دیوالی کہا۔ شلپا نے اپنے پروگرام میں اپنی دونوں بھابیوں کو بھی شامل کر لیا۔ اپنے بڑوں سے اجازت ملتے ہی تینوں تیاریوں میں مصروف ہو گئیں۔ ساری شاپنگ تو شہر سے ہی کر کے لائی تھیں، بچی کھچی گاؤں کی گجری (گاؤں میں لگنے والا ہفتہ وار بازار) سے کر لائیں۔

دیوالی کی رات دراصل روشنیوں اور اجالوں کی رات تھی۔ قطار اندر قطار مٹی کے ننھے منے دیے یوں جگمگا رہے تھے جیسے آسمان سے کہکشاں اتر آئی ہو۔ بغیر کسی تفریق اور بھید بھاؤ کے سارا گاؤں اس رنگ و نور کے سمندر میں ڈوبا ہوا تھا۔ سب ایک دوسرے کو مبارک بادیاں اور بدھائیاں دے رہے تھے۔ فضا میں پٹاخوں کا شور تھا۔ لوگ جوق در جوق چودھری کی حویلی کی جانب جا رہے تھے۔ ان ہی جانے والوں میں شلپا، اس کی سہیلیاں اور دونوں بھابیاں بھی شامل تھیں۔

جیسے ہی وہ لوگ حویلی میں داخل ہوئے، گیندے کے پھولوں کی زرد زرد پتیاں نچھاور کر کے ان کا استقبال کیا گیا۔ سنگی وسیع و عریض چبوترے پر چودھری اور چودھرائن اپنی اپنی قیمتی اور قیمتی مسندوں پر متمکن تھے۔ سب ان کے پیر چھوتے، ان کا آشیرواد لیتے اور وہ اپنا دست شفقت ان کے سروں پر رکھتے اور پھر لان میں بچھے ہوئے قالین پر جا بیٹھتے جہاں بڑا سا اسٹیج بنایا گیا تھا۔

شلپا نے پیر چھوتے ہوئے دونوں میاں بیوی کو غور سے دیکھا تو اسے احساس ہوا کہ دونوں میاں بیوی کی جوڑی اپنے وقت کی حسین ترین جوڑی ہو گی۔ اس بڑھاپے میں بھی حسن، شباب، رنگ روپ تھا۔

اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھنے کے بعد شلپا نے رادھیکا کے کان میں سرگوشی کی۔ ”رادھیکا! سارے انتظامات باہر ہی باہر ہیں، حویلی کے اندر جانے کی اجازت نہیں ہے؟“

رادھیکا نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”نہیں، ایسی کوئی بات نہیں لیکن ایک بار میں اپنی ماں اور بابوجی کے ساتھ آئی تھی تو مجھے یہ حویلی یوں لگی جیسے یہاں بھوتوں کا بسیرا ہو۔“

شلپا نے حیرانی سے پلکیں جھپکائیں اور بولی۔ ”پھر تو، تو کسی طرح مجھے اندر کے درشن ضرور کروا دے۔“

www.pklibrary.com

ایک اور لڑکی دونوں کی باتوں میں مداخلت کرتے ہوئے بولی۔ ”اوئے شلپا! اس حویلی میں ان گنت کمرے ہیں۔ میں نے اور میرے بھائی نے ایک بار گنتی کی تھی لیکن ہم دونوں تھک گئے لیکن کتنا ٹوٹل ہے آج تک نہیں معلوم ہوسکا۔“

رادھیکا نے اس لڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے جواباً کہا۔ ”ہائے میّا! زمین کے اوپر جو کمرے بنے ہیں تو اسے رو رہی ہے۔ میرے بابو جی نے بتایا تھا کہ اس حویلی میں بڑے بڑے چور زینے اور چور دروازے بھی ہیں جو تل گھر (تہ خانے) کی طرف جاتے ہیں۔“

وہ سب لڑکیاں حویلی کے جغرافیہ پر بحث کرتی رہیں۔ شلپا سب کی آنکھوں میں دھول جھونک کر وہاں سے کھسک گئی۔ رادھیکا بھی اس کے پیچھے چلی آئی۔ لان کو عبور کر کے حویلی کے آہنی اور مضبوط گیٹ سے گزر کر اندر قدم رکھا تو شلپا کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اسے یوں لگا جیسے وہ کسی ماورائی دنیا میں آگئی ہو۔ پوری حویلی میں ایک عجیب سی پراسراریت اور وحشت طاری تھی۔ مرے پر سو درّے، وہاں کا فرنیچر، ساز و سامان، تصاویر وغیرہ بھی عہدِ رفتہ سے تعلق رکھتا تھا۔

شلپا نے جلدی سے رادھیکا کا ہاتھ پکڑا اور گھبرا کر بولی۔ ”چلو یہاں سے۔“

رادھیکا اسے حویلی کا کچن دکھانے لے گئی جہاں گیس سلینڈر کا بھی استعمال ہو رہا تھا اور بڑے بڑے دہکتے ہوئے کوئلے کے چولہوں پر تیل اور گھی کے کڑھاؤ چڑھے ہوئے تھے اور مہمانوں کے لیے مٹھائیاں تیار ہو رہی تھیں۔

شلپا نے سرگوشیانہ انداز میں رادھیکا کو مخاطب کیا اور بولی۔ ”پرانے زمانے کے رجواڑے کی راج رسوئی میں پہنچ گئے ہیں شاید۔“ رادھیکا بے ساختہ ہنس پڑی۔

جب دونوں اپنی چنڈال چوکڑی میں واپس آئیں تو ڈانس ٹیبلو اور مزاحیہ خاکے پیش کیے جا رہے تھے۔ شلپا حویلی کی سیر سے کچھ متوحش سی ہوگئی تھی لیکن پھر اس نے اپنی تمام تر توجہ پروگرام کی جانب کردی اور ذرا سی دیر میں وہ بھی اور لوگوں کی طرح اس تفریحی پروگرام سے لطف اندوز ہونے لگی۔ سب سے آخری آئٹم چودھری صاحب کی بہو شیپالی اور بیٹی ارونا چودھری پیش کرنے والی تھیں اور وہاں آنے والی ساری پبلک چاند کی طرح دونوں کا انتظار کر رہی تھی۔

جوں ہی دونوں اسٹیج پر جلوہ افروز ہوئیں، لوگوں نے دل تھام لیے۔ ارونا کا حسن تو میک اپ کا کمال تھا لیکن شیپالی کو دیکھ کر تو شلپا آنکھیں جھپکانا ہی بھول گئی۔ ایسا حسن پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ شیپالی کی آنکھیں اور بال شہد کی سی رنگت لیے ہوئے تھے۔ رنگ بالکل دودھیا سفید موتی کی طرح شفاف۔ یوں لگتا تھا دودھ اور شہد کا سنگم ہوا اور نام رکھ دیا گیا ”شیپالی“۔

شلپا نے آہستگی سے کہا۔ ”میں نے ایسی سندرتا کہیں نہیں دیکھی۔“

رادھیکا اس کے قریب سرک کر بولی۔ ”اس کی سندرتا پر تو ڈاکٹر بھیا مرمٹے اور ماں باپ کے سامنے ڈٹ گئے کہ شادی کروں گا تو شیپالی سے ورنہ کنوارا ہی مرجاؤں گا۔ کسی کالج کے فینسی ڈریس شو کی کیٹ واک میں جب یہ چلتی ہوئی پبلک کے سامنے سے گزری تو لوگ بے ہوش ہوتے ہوتے رہ گئے۔ ڈاکٹر بھیا جن کا نام روی نندن چودھری ہے، انہوں نے بھی اسے وہیں دیکھا تھا۔“

شلپا نے پُراشتیاق لہجے میں استفسار کیا۔ ”وہ ڈاکٹر بھیا کدھر ہے؟ اس روپ سندری کے ساتھ بچتے بھی ہیں یا نہیں؟“

رادھیکا نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے کہا۔ ”ڈاکٹر بھیا کو دیکھ لے گی نا تُو، تو اپنے منگیتر دیپک ورما کو بھول جائے گی۔ کسرتی بدن کے ایسے ہینڈسم جوان ہیں کہ گاؤں کی ہر لڑکی ان کے لیے اپنا دل لیے بیٹھی تھی لیکن انہوں نے کسی کو گھاس ڈالی نہ چارا ڈالا۔“

رادھیکا نے چونک اس کے منگیتر پر چھینٹے مارے تھے اس لیے اب باری تھی شلپا کی۔ اینٹ کے جواب میں اس نے بھی پتھر پھینکا۔ ”اوئے رادھیکا! جسے آکاش کی پری مل رہی ہو، وہ زمین کی مینڈکیوں کو کیوں پوچھے گا۔“

رادھیکا نے جل کر زور سے اس کی کلائی مروڑی۔ شلپا کی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ اسی اثناء میں شیپالی اور ارونا دونوں ایکشن میں آگئیں۔ دونوں کے ڈریس بھی بالکل ایک جیسے تھے۔ زعفرانی رنگ کے چوڑی دار پاجاموں کے ساتھ ارغوانی رنگ کے راجستھانی فراک، منقش رنگ کے جودھپوری گھاگرے جس پر نقشی دبکی اور جھلمل ستاروں کا کام خوب بہار دکھا رہا تھا اور اسی شیڈ کا کٹ ورک سونے پر سہاگے کا کام کر رہا تھا۔ فراکوں کی ارغوانی چولی پر ہلکے نقشی ستاروں کی نفیس کامدانی نے لباس کو چار چاند لگا دیے تھے۔ لباس سے ہی میچنگ کرتی ہوئی قیمتی جیولری بھی تھی جو دونوں کے رنگ روپ کے ساتھ خوب اٹھ رہی تھی۔ پیروں کی پازیب ہر ٹھمکے، ہر لچک، ہر تان کے ساتھ چھم چھم

www.pklibrary.com

یوں بجتی جیسے جنگل کی خاموش فضا میں بے شمار گھنگرو ایک دوسرے سے ٹکرا گئے ہوں۔

سارے لوگ محویت اور وارفتگی کے ساتھ اس نرتیہ کو دیکھ رہے تھے۔ ساتھ آرکسٹرا کا بھی انتظام تھا۔ گیت بھی دیوالی کے حوالے سے تھا۔ شیپالی اور ارونا صرف ہونٹ چلا رہی تھیں۔ جیسے ہی موسیقی کی ہلکی سی جھنکار گونجی، دونوں نے اپنی کمر کو خم دے کر جھکایا اور ڈانس شروع کیا۔ گیت کے بول فضا میں بکھرنے لگے۔

میلے ہیں چراغوں کے رنگین دیوالی ہے
مہکا ہوا گلشن ہے ہنستا ہوا مالی ہے!
اس رات کوئی دیکھے دھرتی کے نظاروں کو
شرماتے ہیں یہ دیپک آکاش کے تاروں کو
اس رات کا کیا کہنا یہ رات نرالی ہے
میلے ہیں چراغوں کے.....

دونوں کی حرکات وسکنات اور بدن کی ایک ایک جنبش سے اس بات کا اظہار ہو رہا تھا کہ دونوں اس فن کی ماہر ہیں۔ ان کا کندنی بدن سیماب کے مانند تھرک رہا تھا۔ کمر پر نظر نہیں ٹھہر رہی تھی۔ رقص اپنے عروج پر پہنچ چکا تھا۔ ماحول پر مستی اور بے خودی چھائی ہوئی تھی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا ان دونوں کے ساتھ سارا جہاں ناچ رہا ہے۔ کیف اور سرور کا یہ عالم تھا کہ کسی کو کسی کی خبر ہی نہیں تھی۔ مدہوشی اس وقت ٹوٹی جب یہ خوب صورت گیت ختم ہوا اور ایک جھنکار کے ساتھ آرکسٹرا تھم گیا۔ ناظرین کی محویت بھلے ہی ٹوٹ چکی تھی لیکن گیت، رقص، سُر اور تان کا سحر اب بھی سب پر طاری تھا۔

اس کے بعد کھانے پینے کا پروگرام شروع ہوا۔ مٹھائی، نمکین فوڈ آئٹمز کے ساتھ بہترین انگلش مشروب کا بھی انتظام تھا۔ شوقین مزاجوں کی بن آئی تھی۔ پانی کی طرح پی رہے تھے اور پھر لڑکھڑاتے قدموں سے اپنے گھروں کو جا رہے تھے۔ جوں جوں رات گزر رہی تھی اس کا حسن اور تابندگی بڑھتی جا رہی تھی۔

شلپا اور اس کا تمام گروپ جب گھر پہنچا تو کافی رات بیت چکی تھی مگر فضائے بسیط میں آتش بازی کی بہار دیکھنے کے لائق تھی۔ پٹاخوں کے شور سے کان پڑی آواز نہیں سنائی دے رہی تھی۔ رادھیکا، شلپا اور دوسری لڑکیوں نے بھی اپنا آتش بازی کلیکشن نکالا اور ہاتھوں میں پھلجھڑیاں لے کر تھرکنے لگیں۔ ہر طرف رنگ ہی رنگ اور روشنیاں ہی روشنیاں تھیں۔

اسی اثناء میں اچانک شلپا کا خالو اپنی پلنگڑی سے اچھلا اور زور سے دہاڑا۔ ”اری لڑکیو! چپ ہو جاؤ ذرا۔ مجھے کچھ عجیب سی آوازیں آ رہی ہیں جیسے باہر کوئی حادثہ ہو گیا ہو۔“

ساری ہنگامہ آرائی کو یکدم بریک لگ گیا۔ جو جہاں تھا، وہیں تھم گیا۔ پل ہی پل میں سناٹا چھا گیا اور پھر وہاں موجود تمام لوگوں نے محسوس کیا کہ بوڑھا کیشو ناتھ غلط نہیں کہہ رہا ہے۔ بہت سے بھاگتے ہوئے قدموں کی آوازیں تھیں۔ خوف اور دہشت بھری چیخوں کا شور تھا اور پٹاخوں کی دنا دن کو یکدم ہی بریک لگ گیا تھا۔ کیشو کے بیٹے، بہوئیں، پوتا پوتی اور تمام لڑکیاں گھر کے صحن سے باہر کی جانب بھاگے تو ان کی آنکھوں نے ایک انتہائی ہیبت ناک منظر دیکھا۔ چودھری کی حویلی سے آگ کی لپٹیں نکل رہی تھیں۔ آگ کے لپکتے شعلے آسمان سے باتیں کر رہے تھے۔ پورا گاؤں حویلی کی طرف دوڑ رہا تھا۔ آگ کس طرح لگی؟ کب لگی؟ کسی کو علم نہیں تھا۔

گاؤں کے سادہ لوح لوگ آگ بجھانے کے لیے اپنے اپنے گھروں سے پانی کی بالٹیاں بھر بھر کے حویلی کی طرف دوڑ رہے تھے۔ گاؤں کے باحیثیت اور بارسوخ لوگوں نے فوراً شہر کی کارپوریشن کو فائر بریگیڈ کے لیے کالز دیں لیکن چونکہ دیوالی کی رات تھی اس لیے فوری طور پر زیادہ فائر بریگیڈز وقت پر نہیں پہنچ سکیں۔

کیونکہ یہ رات صرف دیوالی کی ہی نہیں بلکہ حادثات کی بھی رات ہوتی ہے۔ آتش بازی اور ننھے ننھے دیوں سے لگنے والی آگ اس تہوار کا خاص الخاص حصہ ہے۔ گورنمنٹ کی ساری احتیاطی تدابیر دھری کی دھری رہ جاتی ہیں اور ہر سال ہر دیوالی نامعلوم کتنے انسانوں کو نگل جاتی ہے، کتنے گھروں کو خاکستر کر جاتی ہے۔ اس سال شاید دیپالپور کا نمبر تھا۔ چودھری کی آدھی حویلی راکھ کا ڈھیر بن چکی تھی۔ سب سے بڑی قیامت تو یہ ٹوٹی تھی کہ اس آگ میں چودھری کی بہو شیپالی اور بیٹی ارونا بھی جل کر خاک ہو چکی تھیں۔

چودھری، چودھرائن اور ڈاکٹر روی کی آہ و فغاں آسماں کا کلیجا چیر رہی تھیں۔ گاؤں کے کسی فرد میں ہمت اور ساہس نہیں تھا کہ آگے بڑھ کر انہیں دھیرج کی تلقین کرتا۔ گاؤں کا ہر انسان اپنی جگہ ساکت اور جامد تھا۔ یوں لگتا تھا کہ سارا گاؤں پتھر کا بن گیا ہو۔

ڈاکٹر روی چیخ چیخ کر علی الاعلان کہہ رہا تھا۔ ”میں مہانگر پایکا کی اینٹ سے اینٹ بجادوں گا۔ چھوڑوں گا نہیں کسی کو۔ ایک پلانگ کے ساتھ میری پتنی اور بہن کو

www.pklibrary.com

موت کے گھاٹ اتارا گیا ہے۔ عین وقت پر سوچی بھی اسکیم کے تحت ہر آگ بجھانے والی گاڑی کو اسپاٹ سے ہٹا دیا گیا تاکہ جانی اور مالی دونوں نقصانات کر کے میرے دل و دماغ کو ایسا دھچکا پہنچایا جائے کہ میری پریکٹس، میرا کام سب تباہ و برباد کر دیا جائے۔ جلتے ہیں میری آمدنی سے، میری عزت اور شہرت سے۔ یہ سب پیشہ ورانہ رقابت ہے۔ میں سب سمجھ رہا ہوں، میری پرکھوں کی حویلی، میری سوشیل اور سندر بیوی، میری کنواری بہن، سب کو ایک ہی تیر سے شکار کیا گیا ہے۔ میرے دل پر سب کے نام نقش ہیں۔ میں نے باری باری سب کو چھید کر گاؤں میں الٹا نہ لٹکایا تو میرا نام روی نندن چودھری نہیں۔''

اس کا بین اس کے نالے سن کر سارا گاؤں آنسو بہا رہا تھا۔ چودھری اور چودھرائن کی حالت مُردوں سے بدتر تھی۔ دونوں اپنے اپنے ہوش و حواس میں نہیں تھے۔ آگ بجھانے والی صرف دو گاڑیاں دستیاب تھیں جبکہ اس ہولناک آگ کو ٹھنڈا کرنے کے لیے کئی گاڑیاں درکار تھیں۔ یہ دو گاڑیاں اونٹ کے منہ میں زیرا کے مترادف تھیں۔ شہر سے ایمبولینس گاڑیاں بھی آئیں لیکن اب ان کا کوئی کام نہیں تھا کیونکہ بجھی ہوئی آگ میں سے کوئلے کے مانند جلی ہوئی دو لاشیں نکالی گئیں جن کے چہرے، نین نقش، صورت شکل کی شناخت مشکل ہی نہیں، ناممکن تھی۔ دونوں لاشیں اس قابل بھی نہیں تھیں کہ آخری رسومات ادا کی جائیں۔ معمولی سی پوجا پاٹ کے بعد ڈاکٹر روی نے اپنا اثر رسوخ استعمال کرتے ہوئے دونوں لاشوں کا کریا کرم کروا دیا۔ خانہ پری کے لیے رسمی طور پر پولیس کارروائی ہوئی اور پھر سارا معاملہ سرد پڑ گیا۔

اس سانحے نے سارے گاؤں کی زندگی مفلوج کر دی تھی۔ دیوالی کی قندیلیں اور دیے پھر کسی گھر کے آنگن اور دریچے میں نہیں جلے۔ گاؤں کے بڑے اور بچے سب اس قدر متوحش اور خوفزدہ تھے کہ ان کی راتوں کی نیند اور دن کا چین سب حرام ہو گیا تھا۔ اس جان لیوا غم نے چودھری کی کمر توڑ دی تھی۔ اس واقعے کے بعد ہی چودھری پر فالج کا اٹیک ہوا۔ بیٹا ڈاکٹر تھا اس لیے بھاگ دوڑ کر کے کافی حد تک سنبھال لیا لیکن اس کی متحرک لائف ختم ہو چکی تھی۔ چودھرائن کو بھی بالکل چپ لگ گئی تھی۔ ویسے گاؤں کے عام لوگوں کا خیال تھا کہ چودھری خاندان کو کسی مظلوم کی آہ لگی ہے یا پھر دیوی دیوتاؤں کا قہر آگ کی شکل میں ان کے خاندان کی خوشیاں نگل گیا۔

پولیس انکوائری کے دوران ڈاکٹر روی نے اپنی اس غلطی کا کھلے دل سے اعتراف کیا کہ حویلی کے جس حصے میں گیس سلینڈر کا اسٹاک رکھا گیا تھا، وہیں آتش بازی کا بڑا ذخیرہ بھی تھا۔ اس جانب کسی نے اس کی توجہ مبذول بھی کروائی تو اس نے سنی ان سنی کر دی اور پھر اس نے یہ بھی بتایا کہ حویلی کے سارے نوکر چاکر سگریٹ، چلم اور بیڑی کا استعمال کرتے ہیں۔ اس پر بھی حویلی میں کوئی روک ٹوک نہیں تھی لیکن اپنے دل و دماغ میں پلنے والے اندیشوں اور وسوسوں کا اظہار کرتے ہوئے اس نے سارا ملبا اپنے ساتھی ڈاکٹرز پر ڈالا جو اس کی صلاحیتوں اور تعلیمی قابلیت سے خار کھاتے تھے۔ انہوں نے ہی آگ بجھانے والی گاڑیوں کو بروقت حویلی تک نہیں پہنچنے دیا۔ یقیناً تگڑی رشوت ان کے حلق میں ٹھونسی گئی ہوگی۔

شہر کی کارپوریشن اور ڈاکٹرز کی ٹیم نے اس بیان کو مسترد کرتے ہوئے کہا کہ ''ڈاکٹر روی بدحواسی اور ذہنی انتشار کا شکار ہے۔ ہتک عزت کا کیس ہم بھی دائر کر سکتے ہیں لیکن صرف انسانیت کا فرض نبھا رہے ہیں کہ جو صورت حال روی اور اس کے ماں باپ کے ساتھ ہے، وہ انتہائی کٹھن، ہولناک اور سوگوار ہے اس لیے ڈاکٹر کی بدکلامی اور بدتمیزی کو درگزر کر رہے ہیں۔'' لیکن ڈاکٹر روی ان ہی شکوک و شبہات میں غوطہ زن رہا کہ اس کے اپنے ساتھ کام کرنے والوں نے یہ منظم سازش اس کے اور اس کے خاندان کے لیے بنائی اور کامیاب رہے۔

شلپا دیوالی منانے دیپالپور آئی تھی۔ حویلی میں دیوالی کی وہ حسین رات اس کے لیے ایک یادگار رات تھی۔ کیف و سرور کا یہ عالم تھا کہ وہ بن پیے بہک رہی تھی۔ شیالی کا سحر انگیز رقص، اس کا دلکش سراپا اور قیامت خیز حسن سے وہ اس قدر متاثر ہوئی تھی کہ اس کا ذہن اس سارے منظر میں جا اٹکا تھا۔ اس کا دل چاہا کہ اس رنگا رنگ محفل کے اختتام پر جا کر تنہائی میں شیالی سے ملاقات کرے۔ اس کے اس خوب صورت ترتیبہ پر اسے مبارک باد پیش کرے لیکن وہ بہوت سی بس اسے تکتی رہی۔ اس کے بے پناہ حسن کو من ہی من میں نہارتی رہی اور ایک انجانی سی کسک لیے چلی آئی اور پھر یکا یک غیر متوقع طور پر وہ سب کچھ ہو گیا جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔

جب شلپا نے اپنی سہیلیوں کے ساتھ دو سیاہ کوئلے کے مانند ڈیڈ باڈیز دیکھیں تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے ساری دنیا میں زلزلہ آ گیا ہو، اس کے قدم اکھڑ گئے ہوں، وہ منہ کے بل گر گئی ہو اور کائنات کی ہر چیز گھوم رہی ہے، چکرا رہی ہے

www.pklibrary.com

اور بھڑکتے ہوئے آگ کے شعلے نہ صرف پر شکوہ حویلی کو خاکستر کر رہے ہیں بلکہ سارے سنسار کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ اس بھڑکتی ہوئی آگ نے صرف شیپالی اور ارونا کو ہی نہیں بلکہ اسے بھی جلا کر تہس نہس کر دیا ہے۔

چند لمحے تو وہ بھونچکی دیکھتی رہی اور اس کے بعد وہ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھی۔ اس کے دونوں خالہ زاد بھائی اسے شہر لے کر دوڑے۔ فوری طبی امداد سے اس نے آنکھیں تو کھول دیں لیکن خوف، حیرت اور صدمے نے اسے ذہنی طور پر مفلوج کر دیا تھا۔ وہ پتھرائی ہوئی آنکھوں سے ایک ایک کو تک رہی تھی۔ اس کے خالہ خالو اس وقت کو رو پیٹ رہے تھے جب وہ بڑے چاؤ چونچلوں سے اسے گاؤں لے کر آئے تھے۔

ماں باپ، بہن بھائی سب پریشان اور متفکر تھے کہ اچھی خاصی ہنستی مسکراتی لڑکی کو یہ کون سی بلا چمٹ گئی۔ ڈاکٹرز نے ممبئی لے جانے کا مشورہ دیا اور یہ مشورہ اتنا کارگر ثابت ہوا کہ وہاں باہر سے آئے ہوئے ایک نیورو سرجن نے شلپا کا مائنر آپریشن کیا اور نتیجہ انتہائی امید افزا اور اطمینان بخش رہا۔ وہ زندگی کی طرف لوٹ گئی۔ اب اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بھی نمودار ہونے لگی۔ دماغی پیچیدگی دور ہوتے ہی یادداشت میں بھی بہتری آئی اور پھر پردۂ ذہن پر وہی دیوالی کی رات، شیپالی اور ارونا کا ناقابل فراموش ڈانس، گیت کے خوب صورت بول اور وہی بھگدڑ، وہی قیامت خیز سماں، سب ابھر آیا۔ اس کی آنکھوں سے پھر خوف و ہراس جھلکنے لگا، چہرے پر زردی چھانے لگی۔ ڈاکٹر نے فوراً اسے سکون آور انجکشن لگا کر گہری نیند سلا دیا۔ جب وہ نیند مکمل کر کے اٹھی تو اس کی آنکھوں میں صحت اور زندگی کی چمک تھی۔ سارا پریوار اوپر والے کا شکر ادا کر رہا تھا۔

اس سارے واقعے کو شلپا کے خاندان والوں نے خفیہ رکھا تھا۔ خاص طور سے اس کے سسرال والوں کو تو کانوں کان خبر نہیں ہونے دی۔ ایک ہفتے تک ڈاکٹرز نے اسے کڑی نگرانی میں رکھا۔ اس کے بعد وہ اپنے گھر چلی آئی اور پھر چند روز بعد ہی اس کے سسرال والے آ کر شادی کی تاریخ پکی کر گئے اور جلد ہی دیپک ورما اور شلپا شادی کے بندھن میں بندھ گئے۔

☆☆☆

ناگپور سے ممبئی جانے والی گاڑی تیار کھڑی تھی۔ سب انسپکٹر دیپک ورما اپنی نوبیاہتا پتنی کے ساتھ جلدی جلدی لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا گاڑی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کا یہ سفر ہنی مون کا تھا لیکن تھا بہت اہم۔ اسے ہر صورت ممبئی پہنچنا تھا۔ اپنی دفتری مصروفیات کی وجہ سے شادی کے بعد وہ ابھی تک شلپا کو کہیں نہیں لے جا سکا تھا اس لیے اچانک اس نے شلپا کو بھی ممبئی چلنے کے لیے راضی کر لیا۔ اتنی عجلت اور قلیل وقت میں ریزرویشن ملنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ دو مہینے پہلے سے مسافروں کی برتھیں ریزرو ہو چکی ہوتی ہیں اس لیے ریزرویشن ملنا ناممکن تھا۔ کوشش کے باوجود دیپک کو مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ بالآخر اس نے فیصلہ کیا کہ اکانومی کلاس میں ہی اسے دو برتھ مل جائیں تو یہ طویل سفر کشتم پشتم کٹ ہی جائے گا۔ جانا اشد ضروری تھا ورنہ شاید وہ جانا ہی ملتوی کر دیتا۔ کافی پریشانی کے بعد وہ دو برتھیں حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ بغیر ریزرویشن والے مسافر اسی قسم کی بوگیوں میں ٹھسے ہوئے تھے۔

شلپا شوہر کے ساتھ اس بوگی میں سوار تو ہو گئی تھی لیکن پریشان کن نظروں سے اطراف کا جائزہ لے رہی تھی۔ بے چین اور مضطرب تو دیپک بھی تھا لیکن اول تو وہ مرد تھا، دوسرے پولیس ڈیپارٹمنٹ سے تعلق تھا اس لیے سخت کوش اور مشکل پسند تھا۔ اچھے بُرے حالات سے نمٹنا جانتا تھا۔ شلپا کے چہرے پر ہوائیاں اڑتے دیکھیں تو اس نے بیوی کو تسلی تشفی دیتے ہوئے برتھ پر بٹھایا اور خود بھی اپنی نشست پر ٹک گیا۔ اس بوگی میں سکون تھا نہ اطمینان۔ غل غپاڑا، شور، افراتفری اور اٹھا پٹخ کی بے ہنگم آوازوں سے کان پڑی آواز نہیں سنائی دے رہی تھی۔ اسی اثناء میں مسافروں کی بھیڑ میں ایک نوجوان ایک برقع پوش عورت کے ساتھ داخل ہوا۔ نوجوان چھریرے بدن، درمیانہ قد اور متناسب جسم کا مالک تھا۔ چہرے سے گھبراہٹ اور پریشانی عیاں تھی۔ قلی کی مٹھی گرم کی گئی تھی اس لیے ساتھ آنے والا قلی متلاشی نظروں سے ان کے لیے جگہ بنانے کے چکر میں تھا۔ عورت کا برقع ریشمی اور سیاہ تھا، چہرے پر ڈھاٹا بندھا ہوا تھا۔ دونوں دیپک اور شلپا کے مدمقابل بیٹھے تھے۔ ان کے سامان میں ایک اٹیچی کیس، دستی بیگ اور سیاہ رنگ کا بڑا سا بریف کیس تھا۔

گاڑی نے جیسے ہی وسل دی اور رینگنا شروع کیا تو ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں نے مسافروں کا استقبال کیا۔ گاڑی کے حرکت میں آتے ہی ڈبے میں کافی حد تک خاموشی چھا گئی۔ مسافروں کی توجہ اب باہر گزرتے ہوئے مناظر کی جانب تھی۔

دفعتاً برقع پوش عورت نے اپنے چہرے کا نقاب ہٹا

www.pklibrary.com

کر ایک طویل گہری سانس لی اور بولی۔ ''ہائے بھگوان! کتنی گرمی ہے۔''

اس کے اس طرح کہنے پر دیپک اور شلپا نے چونک کر اسے دیکھا اور پھر شلپا کی نظریں اس کے چہرے پر منجمد ہوگئیں۔ دل کی دھڑکن اتنی تیز ہوگئی کہ اس کی دھمک وہ اپنی کنپٹیوں میں محسوس کرنے لگی۔ حقیقتاً اس کے سامنے مُردہ زندہ ہوگیا تھا۔ ارونا چودھری اور اس عورت میں حیرت انگیز مشابہت تھی۔ اس عورت کو بھی شاید اپنی غلطی کا احساس ہوگیا تھا۔ ہاتھ میں پکڑے ہوئے پنکھے سے اللہ اللہ کا ورد کرتے ہوئے وہ زور زور سے پنکھا جھلنے لگی۔ شوہر نے ہلکے سے کہنی کا دھکا دے کر اسے چہرہ ڈھانپنے کے لیے کہا۔ اس نے بُرا سا منہ بناتے ہوئے چہرہ ڈھانپا اور کھڑکی کی جانب کھسک گئی تاکہ تازہ ہوا اپنے پھیپھڑوں میں بھر سکے۔ لگ رہا تھا کہ وہ گرمی کی شدت سے بے چین اور مضطرب ہے۔ گاڑی کی رفتار میں اب اضافہ ہو چکا تھا۔ وہ مرد اور عورت بھی اپنا بے ترتیب سامان قرینے سے رکھ کر مطمئن ہو کر اپنی اپنی سیٹوں پر براجمان تھے لیکن شلپا کا سکون و اطمینان رخصت ہو چکا تھا۔ بدقت تمام وہ اپنے آپ کو کنٹرول کر پا رہی تھی۔

دو ماہ پہلے جس کی لاش کو کوئلہ بنے دیکھا تھا، وہی لاش زندہ سلامت اس کے ساتھ سفر کر رہی تھی۔ خوف، حیرانی اور گھبراہٹ کے باوجود اس نے اپنے اعتماد کو بحال رکھا۔ ایک بار سے دوسری بار اس جوڑے پر نظر بھی نہیں ڈالی۔ وہ دیپک کو بتانا چاہتی تھی لیکن مجبور تھی۔ دیپک اگر برابر میں بیٹھا ہوا تھا تو وہ دونوں بھی کہیں دور نہیں بلکہ آمنے سامنے تھے۔

ٹرین کی دھکڑ پکڑ کی آوازیں تو سب کی سماعتوں سے ٹکرا رہی تھیں لیکن شلپا کے دل و دماغ میں جو شور برپا تھا اسے صرف وہ اکیلی ہی سن رہی تھی۔ جب دن ڈوبنے لگا اور شام کے دھندلکے ٹرین میں اتر آئے تو بوگی میں ہلچل سی مچ گئی۔ ہر طرف کھانے پینے کا شور تھا۔ ریلوے ڈائننگ کار کے لڑکے کافی مسافروں سے آرڈر لے کر جا چکے تھے اور اب وہ بہت تیزی سے کھانا سرو کر رہے تھے۔ ان دونوں نے بھی کھانے کی بکنگ کروائی ہوئی تھی اور اس وقت وہ بھی کھانے پینے میں مصروف تھے۔ ہنگامہ، افراتفری اور شور و غل کی وجہ سے طوفان برپا تھا۔ چونکہ اسی ٹریک پر دوسری ٹرین آ رہی تھی اس لیے اس ٹرین کا پڑاؤ یہاں تقریباً ایک گھنٹے کے لیے تھا۔ حالانکہ یہ ایک چھوٹا سا اسٹیشن تھا۔

شلپا نے موقع غنیمت جانا اور شوہر کو کھلی ہوا میں سانس لینے کا مشورہ دیا جو دیپک نے فوراً مان لیا۔ پرائیویسی ملتے ہی مختصراً اس نے سارا واقعہ شوہر کے گوش گزار کر دیا۔ دیپک کے لیے یہ انکشاف انتہائی سنسنی خیز تھا۔ اس کے اندر کا پولیس والا جاگ اٹھا اور اس کی چھٹی حس بیدار ہوگئی تھی۔

اس نے شلپا کو خبردار کرتے ہوئے ہدایت کی۔ ''تم ابھی تک جس طرح چپ بیٹھی رہیں، اسی طرح کا رویہ باقی سفر میں بھی رکھنا ہے۔ انہیں شک نہ ہونے پائے کہ تم نے اس عورت کو شناخت کر لیا ہے۔''

شلپا نے آہستہ سے اثبات میں سر ہلا کر اقرار کیا۔ لمحاتی توقف کے بعد دیپک نے مزید اپنی بات آگے بڑھائی اور بولا۔ ''جب اس نے ''ہائے بھگوان'' کہا تھا، اسی وقت میرے دماغ میں شکوک و شبہات سر سرانے لگے کہ یہ عورت مسلمان نہیں ہے لیکن صرف اپنے آپ کو چھپانے کے لیے اس نے برقعے کا سہارا لیا ہے بلکہ یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے اس نے پہلی بار برقع پہنا ہے اور وہ اسے بہت بھاری بوجھ لگ رہا ہے۔ اس کی حرکات و سکنات سے بے چینی اور بے قراری جھلک رہی ہے۔ بہرحال تمہیں کچھ کھانا پینا ہو تو سامنے والے ہوٹل سے کچھ کھا پی لو، میں تب تک اپنے ایک دوست سے بات کر لوں۔'' یہ کہتے ہوئے دیپک وہیں ایک بینچ پر ٹک گیا۔

شلپا نے دو گرما گرم پکوریاں کھائیں اور کولڈ ڈرنک کی بوتل منہ سے لگا لی۔ دیپک اپنی بات ختم کر چکا تھا۔ سفر کے دوران وہ کھانے پینے سے گریز کرتا تھا۔ اس نے دو گلاس ٹھنڈے ٹھار پانی کے چڑھائے اور دونوں گاڑی کی طرف لپکے کیونکہ گاڑی وسل دے چکی تھی۔

تمام راستے دیپک اور شلپا چوکنا اور چوکس رہ کر دونوں کی نگرانی کرتے رہے۔ اس مرد اور عورت کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ ایک پولیس والا ان کے ساتھ نہ صرف سفر کر رہا ہے بلکہ ممبئی پولیس کو بھی خبردار کر چکا ہے۔ ان کے حلیے، کپڑوں کے رنگ، سامان کی تعداد اور لباس کی تراش خراش تک وہ پولیس کو نوٹ کروا چکا ہے۔

دونوں آرام کی نیند سو رہے تھے۔ ہوا کی اٹکھیلیوں نے عورت کے چہرے کا نقاب ہٹا دیا تھا۔ اس وقت دیپک نے اسے بغور دیکھا۔

شلپا نے بھی ٹکٹکی لگا کر چند لمحوں کے لیے اس کا بھرپور جائزہ لیا اور پھر سرگوشیانہ انداز میں بولی۔ ''مجھے پورا یقین ہے کہ یہ ارونا چودھری ہی ہے۔''

دیپک نے فوراً ہاتھ دبا کر بیوی کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا کیونکہ ارونا نے خمار آلود نظروں سے انہیں دیکھتے

www.pklibrary.com

ہوئے ایک انگڑائی لی اور فوراً اٹھ بیٹھی۔ اپنے بکھرے بالوں کو سمیٹتے ہوئے ہیئر پن لگائے پھر اپنا برقع ٹھیک کرنے لگی۔ اس کا ساتھی مرد بھی جاگ گیا تھا۔

ممبئی شہر کی روشنیاں نظر آنا شروع ہوگئی تھیں۔ ساری بوگی میں پھر وہی ہڑبونگ مچی ہوئی تھی جو کہ روانگی کے وقت تھی۔ انسانوں کا ایک ریلا تھا جو ٹرین رکتے ہی ابل پڑا۔ دیپک اور شلپا بھی اس بھیڑ میں شامل تھے۔ دیپک نے ٹیکسی کی اور دونوں عقبی سیٹ پر بیٹھ گئے اور ٹیکسی فراٹے بھرتی ہوئی وہاں سے نکل گئی۔ دیپک اور شلپا نے یہ تاڑ لیا تھا کہ وہ مرد اور عورت بھی کسی ٹیکسی کی تلاش میں تھے۔

شلپا نے دبی دبی زبان سے صرف اتنا کہا۔ ''دیپک! تم تو کہہ رہے تھے کہ تم نے پولیس والوں کو ہوشیار کر دیا ہے لیکن لگتا ہے وہ دونوں ٹیکسی میں بیٹھ کر ہوا ہو جائیں گے۔ ان دونوں کے اردگرد تو کوئی پولیس والے نظر نہیں آرہے ہیں۔''

دیپک نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ دیپک کے بھائی کا فلیٹ اسٹیشن سے کافی فاصلے پر تھا لیکن ڈرائیور نے تیز رفتاری سے ٹیکسی چلاتے ہوئے انہیں فوراً ہی منزل پر پہنچا دیا۔

دیپک نے گاڑی سے اترتے ہی بیوی سے آہستگی سے کہا۔ ''ابھی بھیا اور بھابی سے اس واقعے کا کوئی تذکرہ نہیں کرنا۔''

شلپا نے آہستہ سے گردن ہلا دی۔ گھر کے سب افراد نے نوبیاہتا جوڑے کا سواگت پھول نچھاور کر کے کیا۔ جب دونوں فریش ہو کر کھا پی کر اپنے بیڈ روم میں گئے تو شلپا نے پھر اپنا سوال دہرایا اور بولی۔

''دیپک! ارونا اور اس کا پتی کتنی آسانی سے ہماری آنکھوں کے سامنے سے نکل گئے۔ اب ہم کہاں انہیں چھانتے پھریں گے۔''

دیپک نے ہنستے ہوئے اس کے سارے بال بکھرا دیے اور بولا۔ ''تمہاری سوئی ناگپور سے ممبئی تک ارونا پر ہی اٹکی ہوئی ہے۔ کیا ثبوت ہے تمہارے پاس کہ وہ ارونا ہی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اس کی ہم شکل کوئی اور عورت ہو یا ارونا کی کوئی جڑواں بہن یا کزن ہو اور وہ آدمی ہوسکتا ہے اس کا بھائی یا دوست ہو یا صرف دونوں میں جان پہچان ہو۔''

شلپا نے زور زور سے اپنا سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''نہیں نہیں، میری آنکھیں دھوکا نہیں کھا سکتیں۔ وہ ارونا چودھری ہی تھی۔ میں نے بہت قریب سے اسے دیکھا تھا۔ آپ نے پولیس کو مطلع کر دیا تھا لیکن وہاں تو دور دور تک پولیس کا پتا نہیں تھا۔''

دیپک نے ایک گہری سانس لی اور بولا۔ ''شلپا! آج کا سفر بڑا تکلیف دہ اور تھکا دینے والا تھا۔ اس وقت زوروں کی نیند آرہی ہے لیکن تمہارے تابڑ توڑ سوالوں نے میرا دماغ ہلا کے رکھ دیا ہے۔ تمہارے اطمینان کے لیے میری جان میں صرف تمہیں اتنا بتا دوں کہ گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اسٹیشن پر پولیس والے سادہ لباس میں تھے۔ انہوں نے ان دونوں کی ٹیکسی کا تعاقب کر کے ان کا پتا ٹھکانا بھی دیکھ لیا ہے۔ پورا جال بچھا کر پولیس انکوائری کرے گی۔ ٹھوس ثبوت حاصل کر کے پولیس دیپارٹمنٹ میں لگنے والی آگ کی چھان بین کرے گی تب جا کر نتائج اخذ کر سکتے ہیں۔ تم کیا سمجھ رہی ہو کیا یہ گھنٹے دو گھنٹے کا کام ہے۔ تم نے کہا اور پولیس نے مان لیا۔ اس طرح نہیں ہوتا۔ میں آن ڈیوٹی نہیں ہوں، آج کل چھٹیوں پر ہوں۔ صرف اپنے ڈیپارٹمنٹ کا اثر رسوخ استعمال کرتے ہوئے میں نے پولیس کو ان کے پیچھے لگا دیا ہے۔ اب یہاں کی پولیس اسٹیپ بائے اسٹیپ کام کر کے اوپر سے آرڈرز آنے پر اس کیس کو ری اوپن کر سکتی ہے۔''

شلپا نے ایک ہنکاری بھری اور شوہر کو محبت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے معذرت خواہانہ لہجے میں بولی۔ ''میں نے آپ کو پریشان کر دیا۔ مُردہ ارونا کو زندہ دیکھ کر میں بالکل ہی حواس باختہ ہوگئی۔ اپنے ہوش و حواس ہی کھو بیٹھی۔''

دیپک نے ایک طویل جمائی لیتے ہوئے کہا۔ ''تمہاری اس ارونا چودھری پر Re-animation of the dead کا عمل تو نہیں آزمایا گیا؟''

شلپا نے حیران کن انداز میں اپنی آنکھیں پٹپٹائیں اور تحیر آمیز لہجے میں بولی۔ ''یہ کیا ہوتا ہے؟''

دیپک نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ ''مُردے کو دوبارہ جگانے کا عمل۔''

شلپا نے ایک جھرجھری لی اور سہمی ہوئی آواز میں بولی۔ ''آج سارے سفر میں ویسے ہی ڈر اور خوف سے میری جان پر بنی ہوئی تھی اور اب آپ اس طرح کی الٹی سیدھی باتیں کر کے میری رات کی نیند بھی اڑا دیں گے۔ اب مجھے نیند آرہی ہے اور آپ کی بھی آنکھیں بند ہو رہی ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے تکیے پر سر رکھا اور لمبی تان دی۔ تھوڑی دیر میں دیپک کے بھی خراٹے کمرے میں گونجنے لگے۔

www.pklibrary.com

دیپالپور میں چودھری کی حویلی میں لگنے والی آگ کے شعلے ممبئی پولیس کے صدر دفتر کی عمارت تک پہنچ چکے تھے۔ اس روز دیپک اگر اکیلا سفر کرتا تو شاید یہ سارا معاملہ ہمیشہ کے لیے دیپالپور میں ہی دفن ہو جاتا۔ اشد ضرورت کے تحت دونوں نے طویل سفر کھچا کھچ مسافروں سے بھرے ہوئے ڈبے میں کیا، اوپر سے گرمی کی شدت، حبس اور پسینے کی بدبو۔ دونوں میاں بیوی نے جس طرح یہ کٹھن سفر طے کیا، وہی جانتے تھے لیکن اس وقت ان کی خوشی کی انتہا قابلِ دید تھی جب ممبئی پولیس ہیڈ کوارٹر سے انہیں اطلاع ملی کہ دیپک ورما نے جس جوڑے پر اپنے شکوک وشبہات کا اظہار کیا ہے، وہ غلط نہیں ہے۔ حقیقتاً دونوں مشتبہ اور پراسرار ہیں۔ ممبئی کا رہائشی علاقہ جہاں رنگ رنگ کی بولیاں بولنے والے اور مختلف مذاہب اور مختلف زبان بولنے والے لوگ آباد تھے، وہیں ایک سالخوردہ بلڈنگ کے چھوٹے سے فلیٹ میں یہ جوڑا بھی رہائش پذیر تھا۔

پولیس نے اپنی تفتیشی کارروائی اس بلڈنگ میں رہنے والوں سے ہی شروع کی جو کہ ان دونوں کے پڑوسی تھے لیکن کوئی بھی خاطر خواہ معلومات فراہم نہیں کر سکا۔ صرف اتنا معلوم ہوا کہ مرد کا نام روشن خان اور بیوی کا نام کرن ہے۔ شوہر ٹیکسی ڈرائیور ہے بلکہ ٹیکسی اس کی اپنی ہے۔ دونوں میاں بیوی صبح سات آٹھ بجے ٹیکسی میں بیٹھ کر نکل جاتے ہیں اور رات گئے گھر لوٹتے ہیں۔ ممبئی شہر کا ماحول بھی اس طرح کا ہے کہ کسی کو کسی کی خبر نہیں ہوتی۔ روشن اور کرن کے نام اور کام کا پتا بھی خفیہ پولیس والوں نے ایک سوئپر کو نوٹوں کی جھلک دکھا کر حاصل کیا۔

پولیس پارٹی حرکت میں آچکی تھی۔ چھان بین شروع ہو چکی تھی لیکن کوئی سرا ہاتھ نہیں آرہا تھا۔ بس سارے ہوا میں ٹامک ٹوئیاں مار رہے تھے کیونکہ دونوں کے خلاف کوئی ٹھوس ثبوت نہیں تھا لیکن خفیہ پولیس اس روز سرگرم عمل ہوئی جب روشن خان اور کرن ریلوے پلیٹ فارم پر پھر سے مسافروں کے ہجوم میں دھکے ...کھاتے ہوئے سیٹیں تلاش کر رہے تھے۔

کرن اب بھی برقعے میں لپٹی لپٹائی تھی۔ سادہ لباس میں ملبوس خفیہ پولیس بھی اسی ڈبے میں براجمان تھی لیکن روشن خان اور کرن دونوں قطعاً بے خبر تھے۔ روشن خان نے ڈائننگ کار کے ایک ویٹر کو مخاطب کرتے ہوئے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ ''اوئے، اگت پوری پر دو آدمیوں کا کھانا بھجوا دینا۔''

لڑکا اثبات میں سر ہلاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ حسبِ ہدایت کھانا آیا۔ دونوں نے کھایا پیا اور نیم دراز ہو کر ایک ہی برتھ پر آڑے ترچھے لیٹ گئے۔ آگے ایک مضافاتی چھوٹا سا ریلوے اسٹیشن آیا جہاں ٹرین نہیں رکتی تھی پھر بھی انجن کی رفتار بتدریج گھٹنے لگی۔ موسم میں یکدم تغیر آگیا تھا۔ آسمان پر بادلوں کے ٹکڑے بڑے ہو کر پھیلتے جا رہے تھے، بجلی بھی زوروں سے چمک رہی تھی۔ سگنل کی سرخ روشنی ٹرین کو ٹھہرنے کا اشارہ دے رہی تھی۔ اسی وقت سیاہ بادلوں نے مکمل طور پر چاند کو چھپا لیا اور ہلکی ہلکی رم جھم شروع ہو گئی۔ اسی تاریکی میں روشن خان اور کرن اترے اور پٹری پھلانگتے ہوئے تیزی سے ڈھلوان کی جھاڑیوں میں غائب ہو گئے۔

ٹرین کے کسی مسافر کی نظروں میں بھی وہ اس لیے نہیں آئے کہ مسافروں نے خرابی موسم کی وجہ سے دروازے اور کھڑکیاں بند کر لی تھیں لیکن ممبئی خفیہ پولیس کے دو آدمی سائے کی طرح ان کا پیچھا کر رہے تھے اور اتنی مہارت سے اپنا کام کر رہے تھے کہ ان دونوں کی روح کو بھی وہم وگمان نہیں تھا کہ ان کا تعاقب کیا جا رہا ہے۔

اسی اثناء میں سگنل نے سبز روشنی دکھائی اور گاڑی چند جھٹکے کھانے کے بعد چل پڑی۔ ادھر روشن خان اور کرن تیزی سے قدم اٹھاتے ہوئے بس اسٹینڈ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے یہ راستے ان دونوں کے لیے جانے پہچانے ہیں جبکہ خفیہ پولیس کے دونوں آدمی اس پگڈنڈی پر چلتے ہوئے کافی محتاط تھے۔ جب پکی سڑک شروع ہوئی تب ان کی چال میں تیزی آئی۔

روشن اور کرن نے ٹکٹ ونڈو پر جا کر پوچھ گچھ کی اور پھر منہ لٹکا کر بیٹھ گئے۔ خفیہ پولیس کے کرمچاریوں نے فوراً بھانپ لیا کہ صبح تک کوئی گاڑی ملنے کی امید نہیں ہے تب ہی دونوں پنچھی اداس اور پریشان ہیں۔ رات بھر ہلکی پھلکی بوندا باندی جاری رہی تھی اس لیے موسم سرد ہو گیا تھا۔

جوں ہی بادلوں کو ہٹا کر سورج نے جھانکا اور دیپالپور جانے والی بس نے اپنے درشن دیے، روشن خان اور کرن سب سے پہلے اچھل کر اس میں بیٹھ گئے۔ خفیہ پولیس کے آدمیوں نے بھی چھلانگ لگائی اور ان دونوں کے عقب میں ٹک گئے۔ روشن اور کرن سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے اس لیے ان کا تعاقب کرنے والوں کے پلے کچھ نہیں پڑا۔ کنڈیکٹر نے دیپالپور کا نعرہ لگایا اور دونوں میاں بیوی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اتنی تیزی سے اترے کہ کرن اپنا

www.pklibrary.com

ہینڈ بیگ وہیں بھول گئی۔ اس کے عقب میں کھڑے دونوں آدمیوں نے ایک دوسرے کو معنی خیز انداز میں دیکھا اور بیگ نہایت صفائی سے اڑا کر اپنے پاس محفوظ کرلیا۔

اس کے ساتھی نے سرسراتی آواز میں کہا۔ ''دانستہ تو نہیں چھوڑ دیا۔ ہوسکتا ہے بم وغیرہ ہو۔''

دوسرے نے انتہائی آہستگی سے جواب دیا۔ ''میں ابھی چیک کرتا ہوں۔ تم یہ دیکھو یہ جوڑا کدھر جاتا ہے۔ نظر رکھنا۔'' یہ کہتا ہوا وہ قریبی ٹوائلٹ میں گھس گیا۔ واپس آیا تو بیگ اس کے ہاتھ میں نہیں تھا۔ آتے ہی اس نے اپنے ساتھی کے کان میں سرگوشی کی۔ ''بیگ میں نے ٹوائلٹ کے پچھواڑے جھاڑیوں میں پھینک دیا لیکن اس کے اندر ساری جعلی دواؤں کی کھیپ ہے۔''

''کیا کہہ رہے ہو؟'' دوسرے شخص نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنے ساتھی کو گھورتے ہوئے کہا۔ لمحاتی توقف کے بعد جلدی سے بولا۔ ''اس موضوع پر بعد میں بات کریں گے فی الحال تو ہمیں ان کا پیچھا کرنا ہے، کہیں دونوں آنکھوں سے اوجھل نہ ہوجائیں۔''

دونوں تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے پھر ان دونوں میاں بیوی کے پیچھے لگ گئے لیکن دونوں اس وقت چکرا کر رہ گئے جب روشن خان اور کرن حویلی کے قریب چلتے چلتے ناہموار زمین پر اگی ہوئی خاردار جھاڑ جھنکاڑ میں جا کر یوں غائب ہوئے جیسے انہیں زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔ دونوں ہوا میں تحلیل ہوگئے تھے۔

پہلے نے دوسرے سے مایوس کن اور تھکاوٹ آمیز لہجے میں کہا۔ ''ہماری ساری محنت اور تفتیش قریب قریب ناکام رہی۔''

دوسرے نے پُرامید لہجے میں جواباً کہا۔ ''غلط کہتے ہو تم۔ ہمارے ہاتھ بہت اہم سراغ ہاتھ آگیا ہے۔ ہمارے محکمے کے اعلیٰ افسران سے ہمیں فوری بات کرنا چاہیے۔''

بات سننے کے بعد اس کے ساتھی نے کہا۔ ''اتنا کھڑاگ اور اتنی معمولی کھیپ، بات کچھ پلے نہیں پڑی۔''

اس بار دوسرا ساتھی بے ساختہ ہنس پڑا اور تمسخرانہ لہجے میں بولا۔ ''مجھے تعجب اس بات پر ہے کہ تو اس محکمے میں کس طرح آگیا۔ ابے میری جان! مرد کے ہاتھ میں جو کنگ سائز سوٹ کیس تھا، اس میں کیا مرغیوں کے لیے دانہ دنکا بھرا ہوا تھا؟''

''اوہ گاڈ! اب میں سمجھا۔'' وہ جھینپے ہوئے لہجے میں بولا۔ دونوں آپس میں اسی طرح باتیں کرتے ہوئے شہر جانے والی بس میں سوار ہوگئے۔ وہاں ایک ہوٹل میں قیام کیا اور تمام رپورٹ اوپر تک پہنچادی۔ دونوں کا تھکن کے مارے بُرا حال تھا اس لیے تکیے پر سر رکھتے ہی غفلت کی نیند سوگئے۔

☆☆☆

شعبۂ جرائم کے سربراہ نے اعلیٰ حکام سے اجازت لے کر اس کیس کا انچارج خفیہ پولیس چیف راجیشور راج کو بنادیا۔ راجیشور اپنی ذہانت اور فراست کی وجہ سے ہی اس عہدے تک پہنچا تھا۔ ایسے کئی کیسز جو بظاہر معمہ بنے ہوئے تھے اور ان کا کوئی حل نظر نہیں آرہا تھا۔ راجیشور کا ہاتھ لگتے ہی ساری گتھیاں سلجھ جاتیں اور مجرم نہ صرف بے نقاب ہوجاتا بلکہ فوراً ہی اعترافِ جرم بھی کرلیتا۔ جرائم پیشہ گروہ اس کا نام سنتے ہی کپکپانے لگتا تھا۔ جب راجیشور کے حوالے یہ کیس کیا گیا تو اس نے سب سے پہلے اس کی ہسٹری رپورٹ دیکھی جس میں جابہ جاسب انسپکٹر دیپک ورما اور شلپا ورما کا نام تھا۔ راجیشور نے فوراً دیپک اور شلپا سے ملنے کا فیصلہ کیا اور اپنے اسسٹنٹ کے طور پر دیپک کا نام لکھ کر اوپر پہنچادیا جو بہ آسانی منظور کرلیا گیا۔

اسی رات راجیشور نے ہوٹل مون لائٹ میں دیپک اور شلپا کو مدعو کیا۔ دیپک اس روز بہت خوش تھا۔ شگفتہ لہجے میں وہ چہکتے ہوئے بولا۔ ''یو آر لکی فارمی۔ اتنے بڑے آفیسر نے ہمیں انوائٹ کیا ہے اور اتنے اہم کام کے لیے میرا چناؤ کیا ہے۔ میرے لیے کتنے گرو اور خوشی کا مقام ہے۔ اگر راجیشور راج کے ساتھ رہ کر میں نے اس کیس میں کامیابی حاصل کرلی تو یہ سمجھو کہ میرے لیے پروموشن کی راہیں کھل گئیں۔''

شلپا نے مسرت انگیز لہجے میں کہا۔ ''واقعی! یعنی جس پوسٹ پر آج راجیشور ہے، وہی پوسٹ آپ کو بھی مل سکتی ہے۔''

دیپک نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ ''یکدم سے تو اتنی لمبی چھلانگ نہیں لگا سکتا لیکن ہاں، محنت اور لگن مجھے بھی اس عہدے تک پہنچا سکتی ہے۔''

شلپا نے خوشی سے سرشار لہجے میں کہا۔ ''بیسٹ آف لک فار یو۔''

راجیشور راج نے کیس ہسٹری بغور پڑھی اور دیپالپور سے بھجوائی گئی تازہ ترین رپورٹ کا گہری نظروں سے جائزہ لینے کے بعد دیپک ورما اور شلپا کو ہوٹل مون لائٹ میں مدعو کیا تھا۔ ساحلِ سمندر پر یہ ایک اعلیٰ درجے کا ہوٹل تھا۔ یہاں کی ہر ڈش انتہائی ذائقے دار اور لاجواب

www.pklibrary.com

تھی۔ گردوپیش کا ماحول بھی بہت پُر[illegible] اس لیے وہ دولت مند طبقہ جو چٹخارے دار کھانے کا شوقین ہوتا اسی ہوٹل کا رخ کرتا۔

راجیشور وقت سے پہلے ہی اپنے مہمانوں کو ریسیو کرنے کے لیے ہوٹل پہنچ گیا تھا۔ اس نے دونوں کا استقبال انتہائی گرمجوشی اور کھلے دل سے کیا۔ مینیو میں بھی مہمانوں کی پسند کا خاص خیال رکھا۔ ان تینوں کا آج کا ڈنر سی فوڈ پر مشتمل تھا۔ دیپک اور شلپا نے پہلی بار خفیہ پولیس کے چیف انسپکٹر کو دیکھا تھا۔ ان دونوں کے تصور میں ایک معمر اور سخت گیر شخصیت تھی لیکن راجیشور کو دیکھ کر دونوں حیران رہ گئے۔ اس کی عمر تقریباً چالیس کے لگ بھگ ہوگی۔ صحت قابلِ رشک، بدن مضبوط، توانا اور کسرتی تھا۔ چہرے پر متانت اور سنجیدگی تھی۔ لہجہ نرم اور شائستہ تھا۔ دونوں میاں بیوی اس کی شخصیت سے مرعوب نظر آرہے تھے لیکن اس کی خوش اخلاقی اور دوستانہ رویّہ کو دیکھ کر دونوں مطمئن ہوگئے۔

کچھ لمحے توقف کرنے کے بعد اس نے کہا۔ ’’اس واقعے کا آنکھوں دیکھا حال میں آپ سے سننا چاہتا ہوں۔ ہماری پولیس نے اسے اتفاقیہ حادثہ قرار دے کر اس کی فائل بند کردی۔ میڈیا والوں نے بھی نیوز میں چند جھلکیاں دکھائیں اور بس پھر خاموشی ہی خاموشی لیکن اسے ری اوپن کروانے میں آپ دونوں میاں بیوی کا سب سے بڑا ہاتھ ہے۔ اس کے لیے میں آپ دونوں کا آبھاری ہوں۔‘‘

دیپک اور شلپا نے انکساری سے کام لیتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ ’’ارے نہیں سر! ایسی کوئی بات نہیں۔‘‘

کھانا انتہائی خوشگوار ماحول میں کھایا گیا۔ کھانے کے بعد راجیشور نے شلپا سے کہا۔ ’’شلپاجی! حویلی میں آگ لگنے والی کتھا شروع سے آخر تک مجھے اس طرح سنائیے کہ معمولی سے معمولی بات بھی بھول چوک کا شکار نہ ہونے پائے۔ بلا کسی ہچکچاہٹ کے آپ کو اس واقعے سے پردہ اٹھانا ہے۔‘‘

شلپا نے ہر ہر بات کو پوری تفصیل سے من وعن بیان کیا ماسوائے اپنی بیماری کے کیونکہ رخصتی کے وقت اس کی ماں نے خاص تاکید کی تھی کہ سسرال جاکر اپنی بیماری کی تشہیر مت کرنا اس لیے وہ چیپٹر حذف کرگئی۔ ٹرین میں مردہ اروناچودھری ایک مسلمان پردہ نشین عورت کے روپ میں جب نظر آئی تب وہ کس طرح حیران پریشان ہوئی، اس کی بھی اس نے اس طرح منظر کشی کی کہ راجیشور راج کی زبان سے بے ساختہ نکلا۔ ’’شلپاجی! آپ تو بہت اچھی داستان گو ہیں۔‘‘

[illegible] جھینپ گئی۔ راجیشور نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ’’میں جھوٹ موٹ کی تعریف نہیں کررہا ہوں۔ میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔ اب میں سارے واقعے سے باخبر ہوگیا ہوں اس لیے تحقیقات میں آسانی ہوگی۔‘‘ راجیشور نے سانس لینے کے لیے وقفہ لیا اور پھر سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے بولا۔ ’’ایک اور ضروری بات کہ اس واقعے کو سنانے میں آپ نے کچھ مس تو نہیں کیا؟‘‘

شلپا نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ’’نہیں سر! ساری گھتھا میں نے جوں کی توں سنائی، ایک ایک بات......‘‘ اچانک وہ بولتے بولتے رک گئی اور اپنے ذہن پر زور ڈالتے ہوئے بولی۔ ’’ایک بات آپ کو بتانا بھول گئی۔ میری ایک دوست نے بتایا تھا کہ اس حویلی میں تل گھر، پیچیدہ راہداریاں اور چور دروازے بھی ہیں۔‘‘

راجیشور اس سنسنی خیز انکشاف پر چونک اٹھا اور بولا۔ ’’گڈ! بروقت آپ کو یہ بات یاد آگئی، یہ بہت اچھا ہوا۔ جو کچھ آپ نے بتایا وہ انتہائی دلچسپ، سنسنی خیز اور چونکا دینے والا ہے۔ ہمارے آدمی اسی وجہ سے ان کے تعاقب میں ناکام رہے لیکن اب وہ ہمیں ڈاج نہیں دے سکتے۔‘‘ یہ کہتے ہوئے اس نے دیپک کی طرف دیکھا اور بولا۔ ’’اپنے دیکھنے اور سننے کی ساری حسیں تیز کرلو۔ تمام واردات بڑی ہوشیاری اور منصوبہ بندی سے کی گئی ہے۔ یہ خطرناک کیس ہم دونوں کو مل کر نمٹانا ہے۔ ہم دونوں کو ہر جگہ چوکنا اور مستعد رہنا ہے۔‘‘

دیپک نے اسی لمحے اپنی مستعدی کا مظاہرہ دکھایا اور بولا۔ ’’یس سر! بالکل ایسا ہی ہوگا لیکن کام کی شروعات ہم کہاں سے کریں گے؟ روشن خان اور کرن سے یا پھر دیپاپور سے؟‘‘

راجیشور نے فوراً جواب نہیں دیا۔ چند لمحے سوچنے کے بعد بولا۔ ’’ہم اپنی تفتیش شروع کریں گے شہر کے جنرل اسپتال سے جہاں ڈاکٹر روی کام کرتا ہے۔ تمہیں کیا کرنا ہے اور کب کرنا ہے، اس کی ہدایات تمہیں وقتاً فوقتاً ملتی رہیں گی۔‘‘ یہ کہتے ہوئے اس نے دونوں سے رخصتی مصافحہ کیا اور اپنی اپنی راہ لی۔

راجیشور نے اپنے کام کے آغاز میں ہی ڈاکٹر روی کا سیل فون نمبر حاصل کرلیا۔ یہ اس نے پولیس کے اس شعبے سے حاصل کیا تھا جو سیل نمبروں کے بارے میں تفتیش کرتا ہے پھر اس نے دیپک سے کہا۔ ’’اب یہ نمبر ملا کر تمہیں بات کرنا ہے۔ کیا بات کرنا ہے، میں تمہیں اچھی طرح سمجھا چکا

www.pklibrary.com

ہوں۔ اسے شک نہیں ہونا چاہیے کہ ہمارا تعلق پولیس ڈیپارٹمنٹ سے ہے۔"

دیپک سب انسپکٹر تھا لیکن اس کے پاس معاملہ فہمی کی صلاحیت موجود تھی۔ اپنی ذہانت کو بروئے کار لاتے ہوئے اس نے ڈاکٹر روی کا نمبر ملایا۔ بیل جانے لگی۔ خاصی دیر بعد کال ریسیو ہوئی۔ دیپک فوراً آواز بدل کر بولا۔ "سر! میں ناگپور میڈیکل کا اسٹوڈنٹ ہوں۔ ایم بی بی ایس کا فائنل ایئر ہے۔ مجھے دراصل ایک ڈیڈ باڈی کی ضرورت ہے۔ کچھ Experiments کرنا ضروری ہے۔ میرے ایک واقف کار نے مجھے آپ کا نمبر دیا تھا۔"

جواب میں دیپک کو روی کی دہاڑ سنائی دی۔ "میں ایک ڈاکٹر ہوں، کوئی مُردوں کا سوداگر نہیں۔ آئندہ کبھی یہ نمبر ٹرائی نہیں کرنا۔" یہ کہہ کر سلسلہ منقطع کر دیا۔

اسپیکر آن تھا اس لیے روی کا جواب راجیشور نے بھی سن لیا۔ خود کلامی کے انداز میں وہ آہستہ سے بولا۔ "پکا گھاگ ہے۔" اس کی آنکھوں سے عیاں تھا کہ وہ کسی خاص پوائنٹ کو ذہن میں رکھ کر کچھ سوچ رہا ہے۔ اسے خیالوں میں مستغرق دیکھ کر دیپک نے بھی اسے ڈسٹرب نہیں کیا۔ بالآخر اس نے خود ہی اس خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا۔ "میں تمہیں ایک ایڈریس دے رہا ہوں۔ مطلوبہ شخص اگر تمہیں وہاں ملتا ہے تو میری ہدایت کے مطابق تمہیں بات کرنا ہے اور اپنا جیبی ٹیپ ریکارڈر لے جانا مت بھولنا۔ اس شخص کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ تمہیں ٹیپ کر کے مجھ تک پہنچانا ہے۔ اگر اس دوران کہیں خطرہ محسوس ہو تو فوراً مجھے بھی کال کرنا اور وہاں کے قریبی پولیس اسٹیشن کو بھی فوراً خبردار کرنا۔ وہاں انسپکٹر رنبیر سنگھ سے بات کر کے صورتِ حال سے آگاہ کرنا اور یہ کام تمہیں ابھی اور اسی وقت کرنا ہے۔"

دیپک فوراً اٹینشن ہو گیا۔ اپنی بائیک پر سوار وہ لمحوں میں جنرل اسپتال کی بلند و بالا عمارت کے سامنے پہنچ گیا۔ مُردہ خانے کا راستہ ڈھونڈنے میں اسے کوئی دقت نہیں ہوئی۔ اپنے مطلب کے آدمی سے اس کی فوراً ہی مڈبھیڑ ہو گئی۔ اس کا نام راؤ چندرن تھا اور وہ اس سرکاری مردہ خانے کا انچارج تھا۔

دیپک نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔ "سر! مجھے ڈاکٹر روی نندن چودھری نے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ دراصل میڈیکل اسٹوڈنٹ ہونے کے ناتے ایک میل ڈیڈ باڈی کی ضرورت ہے۔"

راؤ چندرن نے دیپک کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ "... دن مارچ بتاؤ۔"

دیپک جلدی سے بولا۔ "پندرہ مارچ تک کام ہو جانا چاہیے۔"

راؤ چندرن نے رجسٹر کے پیج الٹتے ہوئے اپنے گرد و پیش پر نظر ڈالی اور دھیمے لہجے میں بولا۔ "پے منٹ پوری لوں گا۔ کچھ ابھی کچھ بعد میں...... کوئی کہانی نہیں چلے گی۔"

دیپک نے سوکھا سا منہ بنا کر معصومیت سے کہا۔ "لیکن ڈاکٹر روی تو کہہ رہے تھے کہ آپ رعایت بھی دیں گے اور پے منٹ کے لیے مہلت بھی دیں گے۔"

دیپک کی بات جوں ہی ختم ہوئی، راؤ چندرن بھڑک اٹھا اور اشتعال انگیز لہجے میں بولا۔ "اس ڈاکٹر روی کو گھیر کر کسی دن پٹائی نہیں کی تو میرا نام بدل دینا۔ اسے پتا ہے کہ سارا کام غیر قانونی ہے۔ فروخت کرنے والا منہ سے بھاپ بھی نہیں نکال سکتا اس لیے خود نے بھی پچھلی دیوالی پر فیمیل ڈیڈ باڈی مجھ سے خریدی۔ آدھا پیسا دیا اور آدھا آج تک نہیں دیا۔ ابھی اگر منہ کھول دوں تو اس کا سارا پریوار جیل......" اچانک اس کے پردۂ ذہن پر بجلی سی کوندی اور اس نے یوں منہ بند کیا جیسے کسی نے اس کے منہ میں گول گپا رکھ دیا ہو۔

دیپک اپنا کام مکمل کر چکا تھا اس لیے اس نے راؤ چندرن سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ "کوئی بات نہیں۔ دراصل پورا پیسا میں بھی آپ کو نہیں دے سکتا۔ قسطوں میں ہی ادائیگی کروں گا۔"

راؤ چندرن ہاتھ ہلاتے ہوئے بولا۔ "بس تو پھر چلتے پھرتے نظر آؤ۔"

دیپک لمبے لمبے قدم اٹھاتا ہوا اسپتال سے نکلا اور راجیشور کے پاس پہنچ گیا۔ راجیشور کی عقابی آنکھوں نے فوراً بھانپ لیا کہ وہ کامیاب لوٹا ہے اور جو الفاظ وہ قید کر کے لایا تھا، وہ تو سن کر راجیشور نے اٹھ کر دیپک کی کارکردگی پر اس کی پیٹھ ٹھونک کر شاباشی دی اور بولا۔ "اس کیس سے فارغ ہوتے ہی میں اعلیٰ افسران سے تمہاری سفارش کروں گا۔ دیکھنا بہت جلد تمہارا پروموشن لیٹر ہاتھ میں ہوگا۔"

دیپک نے خوشی سے سرشار لہجے میں جواب دیا۔ "تھینک یو سر۔" وہ فوراً ہی یہ خوشخبری شلپا کو سنانا چاہتا تھا لیکن پھر کچھ سوچ کر رک گیا۔

راجیشور اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اسے سوچ میں ڈوبا دیکھ کر مستفسرانہ لہجے میں بولا۔ "کوئی خاص بات سوچ

www.pklibrary.com

رہے تھے؟''

دیپک گڑبڑا گیا اور بوکھلا کر بولا۔ ''وہ..... وہ سر! کچھ نہیں۔ دراصل اسی کیس کے بارے میں سوچ رہا تھا۔''

راجیشور نے اسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ''اس کیس پر تم جو کچھ سوچ رہے ہو، اپنی تمام سوچیں اور خیالات مجھ سے شیئر کرو۔ تمہاری سوچ کا دھارا کس سمت جا رہا ہے؟ مجھے بتاؤ۔''

دیپک نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے قدرے دھیمے لہجے میں کہا۔ ''سر! آپ کے سامنے میری کیا اوقات ہے۔ میرے لیے تو یہ کیس ابھی تک ٹوٹل بلائنڈ ہے۔ ہاں، البتہ اپنے منتشر دماغ کو سکون کا انجکشن لگایا تو فوراً یہ بات سمجھ میں آ گئی کہ حویلی میں آگ لگی نہیں بلکہ لگائی گئی ہے۔''

راجیشور نے خوش ہو کر بلند آواز میں کہا۔ ''گڈ! اور..... اور آگے کہو..... ارے بھئی سلسلہ جاری رکھو۔'' راجیشور نے ستائشی لہجے میں کہا۔

دیپک اپنے سارے جسم میں ایک جوش آمیز سنسنی محسوس کر رہا تھا۔ خفیہ کا چیف اس کے کام کی تعریف کر رہا تھا۔ احساسِ تفاخر سے اس کی گردن اکڑ گئی تھی۔ لمحاتی توقف کے بعد وہ پھر بولا۔ ''اس آگ میں بہو جلائی گئی اور بیٹی کو بچا لیا گیا۔ بیٹی کو فرار کروا دیا گیا اور اس کی جگہ ایک لاوارث ڈیڈ باڈی جلتی ہوئی آگ میں پھینک دی گئی۔ ساری دنیا یہ سمجھی کہ چودھری کی بہو اور بیٹی دونوں اس آگ میں جل کر بھسم ہو گئے حالانکہ بھسم ہوئی صرف شیفالی۔ ارونا تو آج بھی اس جیتی جاگتی دنیا میں سانس لے رہی ہے۔''

راجیشور جوش میں آ کر کھڑا ہو گیا اور دیپک کو گلے لگاتے ہوئے بولا۔ ''ارے یار! تُو تو غضب کا ذہین آدمی ہے۔ بالکل صحیح لائن پر جا رہا ہے میرے یار۔'' راجیشور نے گرمجوشی کے ساتھ دیپک کا ہاتھ دبایا۔ اسی دوران راجیشور کا موبائل بول اٹھا۔ گھنٹی تسلسل سے بج رہی تھی، وہ اس طرف متوجہ ہو گیا۔

آج دونوں بھی حویلی کے اطراف میں گھوم پھر کر پوری چوکسی کے ساتھ اس علاقے کا معائنہ کر رہے تھے۔ سادہ لباس تھے اس لیے کسی نے بھی غور نہیں کیا کیونکہ باہر گاؤں سے آنے والے لوگ بھی حویلی کا وہ خاکستر حصہ دیکھنے ضرور آتے جس میں چودھری کی بیٹی اور بہو جل مری تھیں۔ اس وقت بھی گاؤں والے یہی سمجھے کہ دو مسافر ہیں جو اس تباہ شدہ حصے کا وزٹ کر رہے ہیں۔ دونوں گشت کرتے رہے لیکن ابھی تک کوئی کلیو ہاتھ نہیں لگا تھا۔ اچانک

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

پاکستان

میں کچھ عرصے سے

مختلف مقامات سے یہ شکایت موصول ہو رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو اسٹال پہ پرچا نہیں ملتا اس سلسلے میں ادارے کے پاس دو تجاویز ہیں۔

آپ اپنے قریبی دکان دار کو ایڈوانس 100 روپے ادا کر کے اپنا پرچا بک کروا لیں۔

یا

ادارے کو 1500 روپے بھیج کر سالانہ خریدار اور 750 روپے ادا کر کے 6 ماہ کے لیے بھی خریدار بن سکتے ہیں اور گھر بیٹھے پورے سال اپنے پسندیدہ ڈائجسٹ وصول کر سکتے ہیں

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

www.pklibrary.com

راجیشور کا پیر ایک خار دار لوہے کے تاروں کے گچھے میں اٹک گیا۔ وہاں کانٹے دار جھاڑیوں کا بھی جھنڈ تھا۔ دیپک جوں ہی راجیشور کی مدد کے لیے جھکا، اسے بڑا بھاری لوہے کا وزنی دروازہ نظر آگیا۔ دروازہ قدیم طرز کا تھا لیکن جلنے کے باوجود بھی اس کی مضبوطی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ اسے کھولنے اور بند کرنے کا میکنزم اندر سے تھا۔ دونوں صرف دیکھ ہی سکتے تھے اس لیے کوئی کوشش نہیں کی۔ دیپک نے راجیشور کے پیر کو آزاد کروایا اور دونوں پیدل چلتے ہوئے اپنے ٹھکانے پر پہنچ گئے۔

دوسرے دن دونوں نے دوربین کی مدد سے حویلی کو دیکھنے کی کوشش کی۔ اس کی اونچی اونچی طویل دیواروں پر جلی ہوئی کنٹورے بنے دیکھ کر راجیشور کے دل کی کلی کھل گئی۔ وہ آہستگی سے بولا۔ ''دیپک! آج فوراً تم ایک عدد مضبوط رسّے کا انتظام کرو۔ بس آج رات ہی ہمیں حویلی میں داخل ہونا ہے۔''

دیپک نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''او کے سر! ایسا ہی ہوگا۔''

گاؤں میں رات جلدی اتر آتی ہے۔ اندھیرا پھیلتے ہی گاؤں کی گلیوں میں کتوں کے بھونکنے کی آوازیں اور ہواؤں کی سنسناہٹ کی وجہ سے عجیب سا ہیبت ناک ماحول طاری ہوجاتا ہے۔ روشنیاں بھی خال خال ہی نظر آتی ہیں۔ اسی پراسرار ماحول میں راجیشور اور دیپک تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے حویلی تک پہنچے۔ دیپک سرگوشیانہ انداز میں راجیشور سے بولا۔ ''سر! ابھی تو رات ہے لیکن میں نے غور کیا ہے کہ گاؤں والے دن کی روشنی میں بھی ادھر آنے سے گھبراتے ہیں۔''

راجیشور نے گمبھیر لہجے میں جواباً کہا۔ ''دراصل فی الوقت تو لوگ آگ والے واقعے سے بھی گھبرائے ہوئے ہیں، دوسرے یہ کہ چودھری خاندان خود بھی نہیں چاہتا کہ لوگ ادھر کا رخ کریں۔ یاد ہے تمہاری مسز نے کیا کہا تھا کہ حویلی کا اندرونی ماحول بھی ڈراؤنا اور پراسرار ہے۔ حقیقت میں کچھ نہیں ہے لیکن رہنے والوں نے اس طرح کا ماحول پیدا کر کے اپنے لیے حفاظتی بند باندھ دیا ہے تاکہ ان کی مجرمانہ سرگرمیوں پر پردہ پڑا رہے۔''

دیپک نے تائیدی انداز میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ''یقیناً یہی بات ہے لیکن سر! ہم دونوں کے پاس صرف ایک ہی ہتھیار ہے۔ پسٹل، جس پر ہم نے سائلنسر فٹ کیا ہے۔ اپنے ڈیپارٹمنٹ سے بھی ہمارا کوئی رابطہ نہیں ہے۔ کہیں ہم اوور کانفیڈنس کا شکار تو نہیں ہو رہے ہیں؟''

راجیشور نے خفیف سی ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔ ''میرے ساتھ کام کرتے رہو گے تو تمہیں خود تجربہ ہوجائے گا کہ یہ جو ایک پسٹل ہے، یہی ہمارے لیے بہت ہے۔ ہم نہتے نہیں ہیں۔ تم کیا سمجھ رہے ہو، کوئی طوفانی جھڑپیں ہوں گے، کوئی تھرل، کوئی ایکسائٹمنٹ یا کوئی فائٹنگ؟ نہ میرے دوست! میں ان تمام چیزوں سے دور رہتے ہوئے کیس سولو کرتا ہوں۔ صرف ہم اپنی عقل کے گھوڑے دوڑائیں گے۔'' یہ کہتے ہوئے راجیشور حویلی کے عقبی حصے میں پہنچ کر رک گیا۔ دیپک نے بھی اپنے قدم روک لیے۔ یہاں تاریکی تھی۔

راجیشور نے آہستگی سے کہا۔ ''یوں لگتا ہے جیسے یہاں کوئی رہتا ہی نہ ہو۔ اگر حویلی کا اندرونی نقشہ ہمارے پاس ہوتا تو کام میں مزید آسانیاں پیدا ہوجاتیں۔ بہرحال، نائٹ ویژن چشمے تو رکھے ہیں نا تم نے؟''

''جی سر! آپ کے حکم کے مطابق تمام چیزیں میرے ہمراہ ہیں۔ رسّا بھی مضبوط اور بہترین کوالٹی والا ہے۔''

راجیشور نے ہنکاری بھری اور بولا۔ ''بس تو پھر ٹھیک ہے۔ ایک چشمہ تمہارے استعمال میں ہوگا اور دوسرا مجھے دو اور رسّا بھی نکالو۔'' راجیشور نے رسّا ہاتھ میں لے کر اپنی خاص تکنیک استعمال کرتے ہوئے پھندا بنایا اور اوپر کی طرف اچھال دیا۔ پہلی اور دوسری بار ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا لیکن تیسری بار اپنے سدھائے ہوئے ہاتھ سے جوں ہی اوپر اچھالا، پھندا ابھرے ہوئے کنگورے میں پھنس گیا۔ اس نے رسّے کو کھینچا اور وہ تنتا چلا گیا۔ جب اچھی طرح تن کر رسّا مضبوط ہوگیا تو راجیشور نے مدھم لہجے میں کہا۔ ''تم نے داخلی دروازے پر دیکھ لیا، چوکیدار موجود ہے یا غائب ہے؟''

دیپک نے بھی اسی کی طرح آہستگی سے کہا۔ ''سر! وہ چوکیدار تو ویسے ہی بوڑھا پھونس ہو رہا ہے۔ شو کے لیے اسے بٹھا رکھا ہے۔ اگر ہم نے ایک بھرپور ہاتھ دے دیا تو غریب پانی بھی نہیں مانگے گا۔''

راجیشور نے زیرلب مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اس قسم کے کھیل میں اپوزیشن کو غریب، لاچار اور مجبور سمجھنا ہی سب سے بڑی غلطی ہے۔ تم ایک کام کرو۔ محتاط قدموں سے حویلی کے گرد ایک چکر کاٹ کر آؤ، اس کے بعد ہم اگلی کارروائی شروع کریں گے۔''

دیپک فوراً مستعد ہوگیا۔ وہ اس وقت بالکل فریش اور تازہ دم تھا۔ راجیشور کے ساتھ رہتے ہوئے اس نے اپنی ڈائٹ پر بھی کنٹرول رکھا تھا اس لیے اصطبل، سستی اور

www.pklibrary.com

نیند کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا وہ بجلی کی سی سرعت کے ساتھ وہاں سے چل پڑا۔ راجیشور کو زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ جوں ہی دیپک اس کے قریب پہنچا اس نے متجسس لہجے میں استفسار کیا۔ ''کیا خبر ہے؟''

دیپک مطمئن لہجے میں بولا۔ ''موسم ہمارے کام کے لیے بالکل فٹ فاٹ ہے۔ دور دور تک کوئی خطرہ نہیں البتہ میں خوفزدہ ہوں تو کتوں سے۔''

راجیشور اسے ہمت حوصلہ دیتے ہوئے بولا۔ ''گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ گاؤں کے پالتو کتے ہیں۔ انہیں بس میں کرنا بہت آسان ہے۔ بس حویلی کے اندر کوئی شکاری کتا نہ ہو۔''

دیپک پُرجوش آواز میں بولا۔ ''حویلی کے گیٹ پر بیٹھنے والا وہ نحیف و نزار بوڑھا چوکیدار ہے نا سر! وہ برسوں سے یہاں چودھری خاندان کی غلامی کر رہا ہے۔ چلم اور بیڑی پینے کا شوقین ہے۔ میں دوستی گانٹھنے کے لیے روزانہ دو بنڈل لاکر تھما دیتا تھا۔ وہ خوش ہو کر دعائیں دیتا اور فوراً بنڈل اپنی دھوتی میں چھپا لیتا۔ اس نے مجھے کافی کچھ اندر کے حالات بتائے ہیں بلکہ یہ بھی بتایا کہ حویلی گروی پڑی ہے۔ چودھری کے معاشی حالات انتہائی کمزور ہیں۔ ان ہی وجوہات کی بنا پر وہ کچھ سنکی اور آدم بیزار ہو گیا ہے اور آگ نے جو تباہی بربادی کی، اس کے بعد ایسا ہی کچھ حال چودھرائن کا بھی ہے۔ دونوں اب کسی سے نہیں ملتے۔''

راجیشور نے ساری تفصیل بغور سنی اور پھر استفسار کیا۔ ''چوکیدار اس وقت گیٹ پر ہے؟''

دیپک نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''نہیں سر! اس وقت اس کی پلنگڑی اور ٹوٹی پھوٹی کرسی دونوں خالی ہیں۔ میں نے بہت قریب جا کر بغور معائنہ کیا ہے۔ وہ رات میں وقفے وقفے سے ٹارچ کی روشنی چمکاتا رہتا ہے لیکن اس وقت مجھے روشنی کا کوئی جھماکا، کوئی لکیر نظر نہیں آئی تو میں بہت قریب چلا گیا۔ دیکھا تو پلنگ پر اس کا بستر لپٹا رکھا تھا اور کرسی بھی خالی تھی۔''

راجیشور نے ایک گہری سانس لی اور بولا۔ ''بہرحال ہمیں غافل نہیں رہنا چاہیے۔'' یہ کہتے ہوئے وہ مستفسر ہوا۔ ''رسّے پر چڑھنے کی ٹریننگ تم نے حاصل کی ہے، چڑھ سکو گے؟''

دیپک نے جھینپتے ہوئے شرمندہ شرمندہ لہجے میں جواب دیا۔ ''نہیں سر! یہ میں نہیں کر سکوں گا۔''

راجیشور کے چہرے پر تفکر آمیز تاثرات ابھرے۔

ماہنامہ پاکیزہ کی سالگرہ کے موقع پر ایک خوشخبری..... دل پزیر، دل نشیں اور دل گداز تحریروں کی خالق

مصنفہ
نسیم دلشاد

جلد ہی

ماہنامہ پاکیزہ کراچی

کے باذوق قارئین کے لیے اپنا
ایک اور دل نواز ناول لے کر آرہی ہیں

معاشرے میں پھیلے ان گنت مسائل اور ان کے مؤثر حل کا
بے حد خوب صورت اور دل خوش کُن انداز میں قلمی اظہار.....

یقیناً قارئین کے ادبی ذوق کے لیے باعثِ تسکین ہو گا

www.pklibrary.com

وہ قدرے ناگوار لہجے میں بولا۔ ''بیٹا! اس محکمے میں ملازمت اختیار کی ہے تو یہ کرتب اور بازی گری سیکھنا بہت ضروری ہے۔ خیر میں رسّے کی مدد سے اوپر جاتا ہوں۔ تم چوکیدار کے پلنگ پر چادر اوڑھ کر لیٹ جاؤ۔ جوں ہی میں گیٹ پر اشارہ دوں، تم فوراً اندر چلے آنا۔''

دیپک نے فوراً کہا۔ ''جی سر! سب کچھ آپ کے حکم کے مطابق ہوگا۔ آپ اطمینان رکھیے۔''

راجیشور خفیف سا ہنستے ہوئے بولا۔ ''بیٹا! اگر میں اطمینان رکھ کر بیٹھ جاؤں تو کام ہو چکا۔ سارا کام ہم دونوں کو اکٹھا مل کر کرنا ہے۔ کہیں مجھے زبان ہلانے کی ضرورت نہ ہو۔ میری نظر کا اشارہ پہچان کر ایکٹیویٹ ہو جایا کرو۔''

دیپک نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ ''بالکل ایسا ہی ہوگا۔ آئی ایم ریڈی۔''

راجیشور نے غائر نظروں سے ایک بار پھر رسّے کو کھینچ تان کر دیکھا۔ وہ مضبوطی سے اپنی جگہ جما ہوا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے رسّے کو پکڑ کر گرفت مضبوط کی اور رسّے سے لٹک گیا۔ بہت آہستہ آہستہ اور سنبھل سنبھل کر اوپر چڑھ رہا تھا۔ یہ ایک بے حد خطرناک کام تھا۔ صرف دیکھ کر ہی دیپک کے پسینے چھوٹ گئے لیکن راجیشور یکساں رفتار سے اوپر کی جانب گامزن تھا۔ جیسے ہی حویلی کی چھت پر اس نے پیر ٹکائے، ایک طویل سانس لے کر دیپک کو اشارہ کیا کہ وہ وہاں سے نکل جائے۔ دیپک نے فوراً حکم کی تعمیل کی اور چوکیدار کے پلنگ پر آ کر لیٹ گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد گیٹ کھلنے کا کھٹکا ہوا۔ دیپک چوکنا ہو گیا۔ جلدی سے اس نے چوکیدار کی شال اپنے جسم کے اردگرد لپیٹ کر اپنا آدھا چہرہ چھپا لیا۔ پستول پر بھی اس کی گرفت مضبوط ہو گئی لیکن جوں ہی سائیڈ گیٹ پر راجیشور کا چہرہ نظر آیا، اس نے ایک سکون کی سانس لی اور شال پھینک کر فوراً کھڑا ہو گیا۔ راجیشور اسے اندر آنے کا اشارہ دے رہا تھا۔

دیپک نے جوں ہی اندر قدم رکھا، راجیشور سرسراتی آواز میں بولا۔ ''حویلی کا خاکہ میری سمجھ میں آ گیا ہے۔ یہ بھی ہمارے لیے پوزیٹو پوائنٹ ہے کہ بجلی ہے لیکن وولٹیج بہت کم ہے۔ ساری راہداریاں اور کمرے یا تو تاریک ہیں یا نیم روشن۔ بہرحال ہمیں ہر پہلو سے جائزہ لینا ہوگا اور ثبوت تلاش کرنا ہوں گے۔''

دیپک سانس روکے سب کچھ سن رہا تھا لیکن جواب میں اس نے کچھ نہیں کہا کیونکہ جتنی آہستگی سے راجیشور بول رہا تھا اور جو والیوم اس نے قائم رکھا تھا، اس والیوم پر بات کرنا اس کے لیے بڑا کٹھن کام تھا اس لیے اس نے اپنے ہونٹ سی لیے تھے۔ دونوں تیزی سے خاموش جگہوں سے گزرتے ہوئے حویلی کے عقبی حصے میں پہنچے۔ یہاں انہیں کچھ لوگوں کی آہٹ محسوس ہوئی۔ اچانک ایک خوفناک آواز کے ساتھ جل گھر کا دروازہ کھلا اور تیز روشنی پھینکی گئی۔ اگر دونوں فوراً ایک طویل ستون کے عقب میں دبک نہیں جاتے تو شاید روشنی میں نہا گئے ہوتے۔ روشنی کی تیز اور چمک دار لکیر تاریکی کو کاٹتی ہوئی چلی گئی۔ ایک جگہ مرتکز نہیں ہوئی۔ دونوں بے حس و حرکت اس وقت تک وہاں بیٹھے رہے جب تک روشنی پھینکنے والا شخص مکمل طور پر جل گھر کی سیڑھیوں سے باہر نہیں آ گیا۔

راجیشور اور دیپک آنکھیں پھاڑے اسے دیکھ رہے تھے۔ اسے دیکھتے ہی دیپک کی آنکھوں میں شناسائی کی جھلک ابھری اور وہ راجیشور کے کان میں بولا۔ ''یہ مردہ خانے کا انچارج راؤ چندرن ہے۔''

راجیشور آہستگی سے بولا۔ ''اچھا! تو یہ ہیں وہ... ہمارے۔'' چند لمحے توقف کے بعد بولا۔ ''دیپک! ویسے ہم اپنے مطلب کی جگہ پہنچ گئے ہیں۔''

جواب میں دیپک خوش دلی سے بولا۔ ''یس سر! یہ ہماری کامیابی کی پہلی سیڑھی ہے۔'' چونکہ وہاں پھر تاریکی چھا گئی تھی اور راؤ چندرن جا چکا تھا۔ دونوں سنبھلتے سنبھلتے ستون کی آڑ سے نکل کر جل گھر کے دروازے پر پہنچ گئے۔ دروازہ چوپٹ کھلا ہوا تھا۔ محتاط انداز میں بچتے بچاتے دونوں سیڑھیاں اترتے چلے گئے۔ وہ بے قدموں سے چلتے ہوئے ایک تاریک راہداری عبور کی تو ایک ہال نما کمرے میں بہت زیادہ روشنی دیکھ کر دونوں ٹھٹک گئے۔ دونوں گھوم کر پچھلی کھڑکی کی طرف گئے اور کھڑکی کی جھری سے اپنی آنکھیں لگا دیں۔ ہال کے فرش پر قالین بچھا ہوا تھا اور جا بجا ... گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے اور تکیوں سے ٹیک لگا کر ایک عورت اور چند مرد بیٹھے ہوئے تھے۔ شراب کی بوتلیں اور جام کھنک رہے تھے۔ پینے پلانے کا شغل بھی جاری تھا اور آپس میں باتیں بھی کر رہے تھے لیکن راجیشور اور دیپک اندر ہونے والی گفتگو سن نہیں پا رہے تھے۔

راجیشور نے مدھم لہجے میں دیپک سے استفسار کیا۔ ''ان میں کوئی تمہارا شناسا ہے؟''

دیپک بولا۔ ''جی سر! جو شخص بیڑی کے کش پر کش لیے جا رہا ہے یہ حویلی کا بوڑھا چوکیدار ہے۔ ہیرامن نام ہے اس کا۔''

www.pklibrary.com

راجیشور نے اسے غور سے دیکھا اور حیران کن لہجے میں بولا۔ ''ایک معمولی چوکیدار لیکن اس وقت اتنے ٹھسّے سے بیٹھا ہے۔ اس کا کیا مطلب؟''

دیپک نے مکمل طور پر اپنی لاعلمی کا اظہار کیا اور لمحاتی توقف کے بعد پھر بولا۔ ''باقی سب لوگ میرے لیے انجان ہیں۔''

راجیشور تفہیمی انداز میں بولا۔ ''ذرا سا دماغ پر زور دو اور اپنا سینس استعمال کرو۔ گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ ہمیں سب کچھ نظر آرہا ہے لیکن ہم کسی کو نظر نہیں آرہے کیونکہ ہم مکمل طور پر اندھیرے میں ہیں۔ اب میں تمہیں بتاتا ہوں کہ یہ کون لوگ ہیں۔ جو شخص درمیان میں گاؤ تکیے سے لگا بیٹھا ہے اور اپنے شانوں پر قیمتی شال ڈالے ہوئے ہے، وہ یقیناً چودھری رگھونندن ہے۔ جو عورت بڑی تمکنت اور رکھ رکھاؤ سے بیٹھی ہے، وہ چودھرائن ہے اور ان دونوں کے قریب ان کا جواں سال بیٹا چودھری روی نندن ہے مگر اس سارے ڈھانچے میں چوکیدار کہاں فٹ ہوتا ہے؟'' آخری جملہ اس نے قدرے الجھن آمیز لہجے میں کہا اور پھر خاموش ہوگیا۔

دیپک سمجھ گیا کہ اس وقت راجیشور صرف اور صرف چوکیدار کے بارے میں سوچ رہا ہے۔ اس نے بھی کوئی آواز نہیں نکالی۔ چند لمحوں بعد راجیشور خود کلامی کے انداز میں بولا۔ ''تم یہیں کھڑے رہو، میں کسی طرح ان کی باتیں سننے کی کوشش کرتا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے وہ ہال کے برابر والے کمرے میں داخل ہوا اور کمرے کی کھڑکی سے لگ کر کھڑا ہوگیا۔

اندر سے آنے والی آوازیں ہلکی تھیں لیکن وہ اپنی غیر معمولی سماعت کے باعث صاف طور پر سن رہا تھا اور ان لوگوں کے چہروں کو بھی پوری توجہ سے دیکھ رہا تھا۔ اندر کُل چار افراد تھے۔ ان چاروں کے درمیان جو مکالمے بازی ہو رہی تھی اس کا ایک ایک لفظ راجیشور ذہن نشین کر رہا تھا۔ کافی دیر تک ان کی یہ میٹنگ جاری رہی۔ اس کے بعد شراب کا دور شروع ہوگیا۔ راجیشور آہستگی سے وہاں سے سرک گیا پھر دیپک کو لے کر آگے کی طرف بڑھتا چلا گیا۔

انتہائی مہین اور باریک آواز میں دیپک سے مخاطب ہوکر بولا۔ ''اس رو میں جو آخری کمرا ہے، اس کی تلاشی لینی ہوگی۔''

دیپک نے آہستہ سے سوال کیا۔ ''وہاں کوئی خاص چیز ہے؟''

''ہوں..... م..... م.....'' راجیشور نے ہنکارا بھرا لیکن وہاں پہنچ کر دونوں کو اپنے قدم روکنے پڑے کیونکہ اس کمرے کے دروازے پر پہرے دار تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھا اور ایک بار پھر ایک موٹے سے ستون کی آڑ میں چھپ گئے۔ پہرے دار جوں ہی اس ستون کے قریب سے گزرا، راجیشور نے فوراً اپنا آہنی ہاتھ اس کی گردن میں ڈال کر اپنی طرف کھینچا اور فوراً اپنا دوسرا ہاتھ اس کے منہ پر رکھ دیا۔ راجیشور کی گرفت اتنی سخت تھی کہ پہرے دار اس کی بانہوں میں مچل کر رہ گیا۔ اس کے حلق سے خرخراہٹ کی آواز بلند ہوئی اور وہ وہیں ڈھیر ہوگیا۔

جو کچھ ہوا اچانک ہوا۔ وہ سنبھلنے نہیں پایا ورنہ پہرے دار بھی مسلح تھا۔ راجیشور نے گھسیٹ کر اسے ایک طرف ڈالا اور دیپک سے بولا۔ ''ہری اپ۔''

دونوں دیوانہ وار کمرے میں گھس گئے۔ راجیشور نے پنسل ٹارچ آن کی تو دونوں کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ جعلی دواؤں کا ذخیرہ فرش سے شروع ہوکر چھت تک پہنچ رہا تھا۔ راجیشور نے سیٹی بجانے والے انداز میں اپنے ہونٹ سکیڑے اور دیپک سے بولا۔ ''اب جتنی جلدی ہوسکے، یہاں سے نکل چلو۔ کل اپنے عملے کے ساتھ ان پر دھاوا بولنا ہوگا۔''

وہاں سے نکلتے ہوئے دیپک نے پہرے دار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے راجیشور سے استفسار کیا۔ ''سر! یہ مر تو نہیں گیا؟'' اس کا لہجہ تشویش ناک تھا۔

جواب میں راجیشور بے نیازانہ انداز میں ہنسا اور بولا۔ ''نہیں! ابھی کچھ دیر میں اسے ہوش آجائے گا۔ میں نے بس اس کی ایک رگ دبائی ہے اور ہوش میں آنے کے بعد یہ شور بھی نہیں مچائے گا کیونکہ چودھری اور اس کا بیٹا اپنے ان آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیتے ہیں جو پولیس والوں کی نظروں میں آجاتے ہیں اس لیے یہ آنکھ کھلتے ہی پھر سے پہرے داری شروع کردے گا۔''

اس کی بات پر دیپک بھی ہنس پڑا۔ دونوں نے واپسی رسّے کے ذریعے ہی کی۔ دیپک اترتے ہوئے بھی گھبرا رہا تھا لیکن راجیشور نے سمجھایا کہ چڑھنے کی بہ نسبت اترنا بہت آسان ہے۔ بس دونوں ہاتھوں کی گرفت میں رسّی کو ڈھیلا کرو اور سرسراتے ہوئے اتر جاؤ۔ دیپک نے اس کی بات پر عمل کیا۔ تھوڑی دیر میں دونوں وہیں پہنچ گئے جہاں سے چلے تھے۔

www.pklibrary.com

راجیشور نے قدرے تیز آواز میں دیپک سے کہا۔ ''دیپک! کل اس کیس کا آخری دن ہوگا۔ کل پولیس نفری کے ساتھ ہم یہاں آئیں گے۔''

دیپک کے لیے یہ لمحہ استعجابیہ تھا۔ وہ حیران نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''سر! کل..... یعنی اتنی جلدی؟''

راجیشور ہنستے ہوئے بولا۔ ''ہاں ہاں، آنے والے کل کی بات کر رہا ہوں لیکن مجرموں کی گرفتاری سے پہلے تمہیں ایک بے ضرر سا جھوٹ بولنا ہے۔ کس سے بولنا ہے، کب بولنا ہے اور کہاں بولنا ہے؟ وہ میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔''

☆☆☆

اس رات دونوں نے بھرپور نیند لی۔ دوسری صبح دونوں ہشاش بشاش اور تازہ دم تھے۔ ناشتا بھی انہوں نے اپنے کمرے میں ہی طلب کیا۔ ناشتے کے دوران اسی کیس پر گفتگو ہوتی رہی۔ راجیشور دوستانہ لہجے میں بول رہا تھا لیکن ساتھ ہی ساتھ دیپک کو تمام ہدایات ایک لیکچر کے مانند دے رہا تھا اور دیپک اس کی زبان سے نکلی ہوئی ہر ہر بات کو بغور سن رہا تھا۔ ناشتے کے خاتمے پر دونوں نے چائے پی اور راجیشور اپنی نشست سے اٹھ کھڑا ہوا اور اپنا کوٹ پہنتے ہوئے بولا۔

''اب تمہاری اور میری ملاقات پولیس اسٹیشن پر ہی ہوگی۔ میری تمام باتوں کو تم نے اچھی طرح ذہن میں اتار لیا ہے نا یا اب بھی کچھ پوچھنا ہے؟'' اس نے سوالیہ نگاہوں سے دیپک کی طرف دیکھا۔

''نو سر! میں نے آپ کی تمام ہدایات دل و دماغ کی تختی پر لکھ رکھی ہیں۔ آپ جیسا چاہتے ہیں ویسا ہی ہوگا۔ بس اب مجھے بھی اجازت دیجیے۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے ہینگر میں لٹکا ہوا کوٹ نکال کر اپنے شانے پر ڈالا اور پھر دونوں زینہ اترتے ہوئے ہوٹل سے باہر آ گئے۔

☆☆☆

قصبوں، گاؤں، دیہاتوں میں بازار، دکانیں صبح تڑکے ہی کھل جاتی ہیں اور لوگوں کی آمد و رفت اور چہل پہل شروع ہو جاتی ہے۔ جب دیپک بھی دیپالپور کے واحد چھوٹے سے بازار میں داخل ہوا تو تقریباً تمام چھوٹی بڑی دکانیں کھل چکی تھیں۔ ایک کریانہ مرچنٹ جس سے اس کی سلام دعا ہو گئی تھی، وہاں رک کر اس نے بیڑی کے پیکٹ خریدے اور وہاں سے نکلنے ہی والا تھا کہ ہیرا من چوکیدار سے اس کی مڈبھیڑ ہو گئی۔ دیپک نے مان سمان کے ساتھ نمسکار کیا اور بولا۔ ''اور سنایئے کاکا! آپ ٹھیک ٹھاک ہیں۔ میں ابھی آپ ہی کی طرف آنے والا تھا۔''

بوڑھے چوکیدار نے محبت بھرے لہجے میں اسے آشیرواد دیا اور بولا۔ ''کیوں آنے والے تھے؟ کوئی کام تھا مجھ سے؟''

دیپک بھی اپنے لہجے کو شہد کے مانند میٹھا بناتے ہوئے بولا۔ ''دراصل آپ کے لیے یہ بیڑی کے پیکٹ خریدے تھے اور اس کے علاوہ آپ سے ایک ضروری بات بھی کرنا تھی۔''

چوکیدار نے چونکتے ہوئے فوراً سوال کیا۔ ''ضروری بات اور مجھ سے؟ میں تو تمہیں جانتا تک نہیں۔ میں تو سمجھ رہا تھا کہ تم گاؤں کے کسی رہواسی (رہنے والا، باشندہ) کے مہمان ہو۔'' اس کا لہجہ کافی حد تک مشتبہ تھا۔ دیپک بھی فوراً چوکنا ہو گیا کہ کہیں معاملہ بگڑ ہی نہ جائے۔

چوکیدار کے قریب جا کر اپنا منہ اس کے کان سے لگایا اور کھسر پسر کرنے والے انداز میں بولا۔ ''چاچا! میں تمہارے بیٹے کا دوست ہوں اور ایک ضروری سندیسہ لایا ہوں تمہارے لیے۔''

یہ سنتے ہی چوکیدار اچھل پڑا اور پُرجوش لہجے میں بولا۔ ''تم..... تم..... میرے بیٹے کے دوست ہو۔ میرے روشن کے دوست ہو؟''

''ہاں..... ہاں..... چاچا! میں روشن کا دوست ہوں لیکن چاچا پبلک پلیس پر ہمارا بات کرنا صحیح نہیں ہے۔''

چوکیدار نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے پھر سوال کیا۔ ''کیا کہا بچے، کہاں بات کرنا صحیح نہیں ہے؟''

''اوہو!'' دیپک نے اپنے سر پر ہتھڑ مارتے ہوئے خود کو تنبیہ کی اور بولا۔ ''پتا ہے یہ اے بی سی ڈی سے بھی لاعلم ہے اور میں انگلش بول جاتا ہوں۔''

اس بار دیپک منہ سے کچھ نہیں بولا بلکہ چوکیدار کا بازو پکڑ کر ایک طرف گھسیٹتا لے گیا اور بولا۔ ''میں روشن اور اس کی پتنی سے مل کر آ رہا ہوں۔ دونوں کی بہت ساری باتیں کرنا ہیں لیکن ایسی جگہ پر جہاں چاچا تمہارے اور میرے سوا کوئی نہ ہو۔''

چوکیدار کو بھی ہوش آ گیا اور تائیدی انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''یہ تو سولہ آنے ٹھیک کہہ رہا ہے۔ یہ باتیں ایسی جگہ کرنا صحیح نہیں ہے۔ چل..... چل میں تجھے اپنے کوارٹر میں لے چلتا ہوں۔''

یہ کہتے ہوئے اس نے دیپک کا ہاتھ پکڑا اور چلنے لگا۔ چلتے چلتے دیپک نے استفسار کیا۔ ''چاچا! تمہارا کوارٹر کہاں ہے؟''

www.pklibrary.com

چوکیدار ہنستے ہوئے بولا۔ ''ارے مورکھ! میرا کوارٹر حویلی کے احاطے میں ہی تو ہے۔''

دیپک نے فوراً اپنا ہاتھ اس کی گرفت سے چھڑایا اور ٹھوس لہجے میں بولا۔ ''نہیں چاچا! جو بات میں تم سے کرنے جارہا ہوں، وہ ایسی نہیں ہے کہ حویلی کے احاطے میں کی جائے۔ چلتے ہوئے مجھے روشن نے بہت سختی کے ساتھ ہدایت کی تھی کہ میرے پتاجی کو کسی ویرانے میں لے جاکر سب باتیں بتانا۔ بیچ چوراہے پر کھڑے رہ کر میری یا میری پتنی کی کوئی بات نہیں کرنا اور تم مجھے حویلی میں لے جارہے ہو۔ نہ بابا نہ، میں تو باز آیا ایسی دوستی سے۔''

چوکیدار گھبرا کر بولا۔ ''اچھا تو بیٹا تو جہاں کہے میں وہاں چلنے کے لیے تیار ہوں۔''

دیپک زیرِلب مسکرایا اور من ہی من بولا۔ ''اب بنی نا بات!'' حویلی کے اردگرد کھیتوں اور باغوں کا سلسلہ دور تک پھیلا ہوا تھا۔ علاوہ ازیں سناٹا بھی ہوتا تھا۔ ہاں، البتہ کھیتوں میں کام کرنے والے کاشتکار اور کسان ضرور نظر آتے تھے۔ دیپک نے ادھر کا رخ ہی نہیں کیا بلکہ ایسی جگہ کا انتخاب کیا جہاں ایک بلڈنگ کی کنسٹرکشن چل رہی تھی۔ چوکیدار ریت کے ایک ڈھیر پر بیٹھ گیا اور دیپک ایک پتھر پر ٹک گیا۔ علاقہ انتہائی سنسان تھا۔ کوئی دیکھتا بھی تو یہی سمجھتا کہ بلڈنگ کا ٹھیکے دار اپنے مزدور سے گفتگو کررہا ہے۔

بیٹھنے کے بعد دیپک نے ایک طویل سانس خارج کی اور بولا۔ ''چاچا! تم تو روشن کے باپ ہو۔ تمہارے ہردے میں جو آگ لگی ہے وہ میں اچھی طرح جانتا ہوں لیکن اب مجھ سے بھی اس کی دُردشا (خراب حالت) اور بے بسی نہیں دیکھی جاتی۔''

چوکیدار نے گھبرا کر سوال کیا۔ ''کیوں، کیا ہوا ہے میرے روشن کو؟''

''ارے چاچا! اس نے مجھ سے کہا کہ خفیہ طور پر میرے پتاجی کو یہ بتانا کہ دشمن ہاتھ دھوکر میرے پیچھے پڑے ہیں۔ کبھی بھی دشمنوں کا یہ گروہ مجھے مار کر حادثاتی موت کی شکل دے کر مجھ سے جان چھڑالے گا اور میں کسی کیڑے مکوڑے کی طرح مسل دیا جاؤں گا۔''

چوکیدار کی آنکھیں خوف اور صدمے سے پھٹ گئیں اور وہ کپکپاتے لہجے میں بولا۔ ''چودھری اور اس کا پریوار ایک عرصے سے میرے بیٹے کے پیچھے پڑا ہے لیکن میں بھی انہیں چھوڑوں گا نہیں۔'' وہ اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی لاٹھی گھماتے ہوئے مشتعل لہجے میں بولا۔ ''چودھریوں کو اس لاٹھی سے ٹھکانے نہیں لگایا تو میرا نام ہیرا من نہیں۔ روشن .... ہیرا من کا بیٹا ہے۔ وہ اس طرح چوہے کی موت نہیں مرے گا۔ میرا بیٹا زندہ رہے گا اور میں ان سب کا قیمہ بنادوں گا۔''

دیپک انتہائی نرمی کے ساتھ اس کے معروف کار ہاتھ روک کر ملائم لہجے میں بولا۔ ''چاچا! سب کا قیمہ بنانے کے بعد کیا پولیس تمہیں اور تمہارے بیٹے کو چھوڑ دے گی؟ ارے چاچا! تمہارے پورے خاندان کو سولی پر نہ لٹکایا تو میرا نام بدل دینا۔ ایسی غلطی بھول کر بھی نہ کرنا۔ میں تمہیں بالکل سہل اور صاف ستھرا راستہ بتاتا ہوں۔ تمہیں اور تمہارے بیٹے کو مکھی میں سے بال کی طرح نکال لوں گا۔ چاچا! قانون کا راستہ اپناؤ، سچائی کی ڈگر پر چلو۔ پولیس والوں سے میری اچھی جان پہچان ہے۔ ایک آفیسر تو میرا بہت اچھا واقف کار ہے۔ ابھی تمہیں وہاں لیے چلتا ہوں۔ اپنا سارا بیان ریکارڈ کروا کر ان کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں لگوادو۔ بدلہ لینا ہی ہے تو اس طرح لو۔''

چوکیدار نے خوفزدہ لہجے میں سوال داغ دیا۔ ''لیکن اس طرح تو ہم دونوں باپ بیٹے بھی پکڑ میں آجائیں گے۔''

دیپک خفیف سی ہنسی ہنستے ہوئے بولا۔ ''تو چاچا میں کس مرض کی دوا ہوں۔ کہہ تو رہا ہوں کہ پولیس اپنی مٹھی میں ہے۔ تمہارے اور روشن کے ناخن کو بھی دھکا نہیں لگے گا۔''

چوکیدار جوشیلے انداز میں اٹھ کھڑا ہوا اور بلند و بانگ لہجے میں بولا۔ ''بس تو بچے پھر مجھے لے چل تو اپنے دوستوں کے پاس۔ میرا بیان اتنا گہرا اور سچا ہوگا کہ چودھری کے خاندان کو ہاتھ پیر ہلانے کا موقع بھی نہیں ملے گا۔ لگتا ہے ان کے پاپ کی ناؤ اب ڈوبنے والی ہے۔''

☆☆☆

چوکیدار کے ہمراہ جوں ہی دیپک انویسٹی گیشن روم میں داخل ہوا، راجیشور نے مسکراتی نظروں سے دیپک کی طرف دیکھا۔ دیپک نے انگوٹھے کا اشارہ کرتے ہوئے اسے اشارہ کیا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں فتح یابی کی خوشخبری سنائی۔ راجیشور کے ساتھ دو آفیسرز اور بھی تھے جو اس کے دائیں بائیں بیٹھے تھے۔ راجیشور کے اشارے پر چوکیدار..... بولنا شروع ہوگیا۔

''دیپالپور میری اور میرے پرکھوں کی جنم بھومی ہے۔ چودھریوں کی حویلی کا وہ چھوٹا سا کوارٹر ہمارا سائبان ہے۔ اب وہ اتنا شکستہ ہوگیا ہے کہ کب ہمارے سر پر اس کی چھت آگرے، کچھ نہیں کہہ سکتے۔ ہمارے خاندان نے ہر

www.pklibrary.com

دور میں اس خاندان کی غلامی کی ہے اور انہوں نے اپنی طاقت اور بل پر ہم پر جو ظلم کیے ہیں، وہ ہمارا پالنے والا ہی جانتا ہے یا ہم۔ انہوں نے نہ صرف ہماری پیٹھ پر مارا ہے بلکہ پیٹ پر بھی مارا ہے۔ موجودہ چودھری رگھونندن نے تو اپنے بڑوں کو بھی مات کر دیا۔ اس کے دادا پر دادا کروڑوں کی زمینیں، کھیت، باغات چھوڑ کر مرے تھے لیکن یہ شروع سے شراب اور جوئے کا رسیا تھا۔ اس کی بیوی کوشلیا بھی اپنے جہیز میں بہت سا دھن دولت لائی تھی لیکن سب شراب اور جوئے کی نذر ہو گیا۔ اس کے دونوں بچے روی نندن اور ارونا کرن شروع سے بڑھنے لکھنے میں تیز تھے۔ دونوں نے شہر کے ہاسٹل میں رہ کر تعلیم حاصل کی۔ دونوں بس چھٹیوں میں دیپالپور آتے تھے۔ ہوش سنبھالتے ہی دونوں کو عقل آ گئی کہ ان کے باپ نے ان کے لیے وسائل کم رکھے ہیں اور مسائل بے تحاشا رکھے ہیں۔ چودھری کے دونوں بچے اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد لوٹے تو گھر میں ایک مہابھارت برپا ہو گئی۔ روی، کوشلیا اور ارونا ایک طرف تھے اور دوسری جانب چودھری اکیلا تھا۔ قرض خواہوں کے منہ کس طرح بند کیے جائیں، حویلی جو برسوں سے گروی پڑی ہے۔ اسے کس طرح چھڑایا جائے۔ بہت سارے مسئلے سر پر کھڑے تھے۔ سیٹھ مدن موہن نے کروڑوں کی حویلی مٹی کے مول اپنے قبضے میں کر لی تھی۔ حویلی کے تمام کاغذات اس کی تجوری میں آج بھی ہیں۔ چودھری کا بھرم بھاری تھا، پٹارا خالی تھا۔ اپنی جھوٹی آن بان اور شان و شوکت قائم رکھنے کے لیے وہ سود بیاج پر پیسا لیتا اور پھر یہ بیاج زر اصل سے بڑھ کر لاکھوں روپے کے سود میں تبدیل ہو جاتا۔ کھیت، باغات بھی بک چکے تھے اس لیے آمدنی نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ اسی بیچ میں مدن موہن نے کورٹ کے ذریعے سمن بھجوایا کہ حویلی جو رہن رکھی گئی ہے اس کی مدت پوری ہو چکی ہے اس لیے خاموشی سے نکل جاؤ ورنہ پولیس لے کر آؤں گا۔ چودھری بری طرح سٹپٹایا۔ اس نے مدن موہن سے مزید مہلت مانگی لیکن مدن موہن تیار نہیں ہوا۔ وہ غصے میں بھرا ہوا چودھری کے پاس پہنچا۔ وہاں پہنچتے ہی اس کی ملاقات چودھری سے بعد میں ہوئی، اس کے بیٹے ڈاکٹر روی سے پہلے ہو گئی۔ روی کو دیکھتے ہی اس کے منہ میں پانی آ گیا۔ پڑھا لکھا، ہینڈسم، لمبا چوڑا گبرو جوان اس کے دل کو ایسا بھایا کہ اس نے اسی وقت اسے جوائی (داماد) بنانے کا فیصلہ کر لیا۔ مدن موہن کی اکلوتی بیٹی پڑھی لکھی اور اچھے سبھاؤ کی لڑکی تھی لیکن ڈاکٹر روی نے اسے دیکھتے ہی ناپسند کر دیا جبکہ چودھری اور چودھرائن کی دلی خواہش تھی کہ روی اس شادی کے لیے تیار ہو جائے تاکہ ان کے سارے دلدّر دور ہو جائیں اور وہ پھر سے پُرآسائش اور خوشگوار جیون کی شروعات کر سکیں اور دھوم دھام سے بیٹی کی بھی شادی کر سکیں۔

''سیٹھ مدن موہن نے چودھری سے وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ نندنی کو اپنی بہو بنا لے تو نہ صرف اپنے تمام قرضے مع سود معاف کر دے گا بلکہ حویلی بھی جوائی بیٹی کو شگون کے طور پر ارپن کر دے گا۔ اس کے علاوہ ان کے تمام چھوٹے بڑے قرضوں سے بھی نجات دلوا دے گا جن کی وجہ سے چودھری پریوار کی رات کی نیند اور دن کا چین حرام ہو گیا تھا۔ ماں باپ نے روی کو بہت سمجھایا لیکن اس کی ''نہ''.....

''ہاں'' میں نہیں بدلی بلکہ ان ہی دنوں روی نے ایک جگہ شیپالی کو دیکھ لیا۔ شیپالی کی سندرتا دیکھ کر روی اپنی سدھ بدھ کھو بیٹھا۔ کسی کی نہیں سنی اور اس سے بیاہ کر لیا اور اسے حویلی میں لے آیا۔ جب مدن موہن کو اس بات کی بھنک لگی تو اسے آگ ہی لگ گئی لیکن چودھری نے اس سے ایک ڈیل کی اور یہ سب میری آنکھوں کے سامنے ہوا کیونکہ چودھری مجھے بے وقوف اور احمق سمجھتا تھا اور میں بھی اس کے سامنے بالکل اندھا، بہرا اور گونگا بن جاتا تھا۔ حالانکہ اس کی ہر ہر حرکت پر میری نظر ہوتی تھی۔ چودھری اسی لیے مجھے پسند کرتا تھا کہ میں اس کی کسی بات کی نفی نہیں کرتا تھا۔ چودھرائن بھی اس لیے مجھ سے راضی خوشی رہتی تھی کہ میں اس سے بھی بحث و تکرار نہیں کرتا تھا۔ سب نوکروں کا محنتانہ (تنخواہ اور معاوضہ) دے دیا جاتا لیکن مجھے دھیرج اور صبر کا پاٹھ پڑھا کر خاموش بٹھا دیا جاتا۔ کبھی کبھی تو میرے پاس اپنی چلم بھرنے کے لیے تمباکو کے بھی پیسے نہیں ہوتے۔ مگر میں خاموش رہتا۔ چودھری نے مدن موہن کو یہ تھاپ دی کہ کچھ دن چپکے بیٹھے رہو۔ میں اس لڑکی کو کسی نہ کسی طرح چلتا کر دوں گا لیکن مدن موہن اس بہلاوے سے نہیں بہلا۔ وہ آئے دن اپنے پیسے کا تقاضا کرتا اور حویلی سے نکلنے کی چتاؤنی بھی دیتا رہتا۔ چودھری کی سٹی گم تھی۔ اس گھور اندھکار میں اسے راستہ نہیں سجھائی دے رہا تھا۔ ادھر روی اپنی پتنی شیپالی کو ٹوٹ کر چاہتا تھا۔ ایک منٹ کے لیے بھی اسے شیپالی کی جدائی گوارا نہیں تھی۔ دونوں کا اٹوٹ پریم دیکھ کر چودھری کے چھکے چھوٹ گئے۔ اس نے پھر ایک نئی چال چلی۔ ایک جیوتشی (نجومی) کو اور ایک تانترک (روحانی معالج) کو منہ بھر کے پیسے دیے کہ وہ شیپالی کی جنم کنڈلی دیکھ

www.pklibrary.com

گریہ کہہ دے کہ یہ عورت کبھی ماں نہیں بن سکتی۔ روی نے فوراً ایک لیڈی ڈاکٹر سے اپائنٹ منٹ لیا اور شیالی کو وہاں لے کر پہنچا لیکن اس سے پہلے اس کے پاس کوشلیا اور کرن پہنچ گئے۔ وہ بھی ڈاکٹر دھن کی لوبھی تھی۔ اس نے بھی وہی ریکارڈ بجایا جو چودھری خاندان چاہتا تھا۔ شیالی، روی کے دل سے اترتی چلی گئی۔ وہ شش و پنج میں پڑ گئی کہ اس کے پتی نے تو اس کی طرف دیکھنا بھی چھوڑ دیا۔ وہ دنیا بھر کے ہار سنگھار کر کے پتی کے سامنے آتی لیکن روی اپنی مصروفیت کا بہانہ کر کے وہاں سے اٹھ جاتا۔ غریب لڑکی بہت دکھی رہنے لگی تھی۔ کبھی کبھی میرا دل چاہتا کہ اسے حقیقت بتادوں لیکن صاب جی اپنی جان کس کو پیاری نہیں ہوتی۔ اس کے علاوہ چودھری کا کرودھ اور عتاب صرف میرے پر نہیں گرتا بلکہ اس کی زد میں میرا اکلوتا بیٹا روشن.... بھی آتا جو مجھے کسی صورت گوارا نہیں تھا۔ شیالی کے میکے میں بھی کوئی نہیں تھا۔ ماں باپ پہلے ہی سنسار چھوڑ چکے تھے۔ بوڑھے ماما مامی تھے جنہوں نے اس کو پال پوس کر بڑا کیا تھا۔ ان کے پلے کچھ نہیں تھا جو اس کی طرف مڑ کر دیکھتے اسی لیے شیالی پہلے ہی دن سے ان کے من کو نہیں بھائی تھی کیونکہ وہ ایک قلاش اور کنگال گھر کی لڑکی تھی۔

''ادھر چودھری اور کوشلیا کو اپنی جوان بیٹی کی بھی فکر کھائے جارہی تھی کیونکہ چودھری کے دوالیا ہونے کی خبر اب کسی سے ڈھکی چھپی نہیں تھی۔ سب کو خبر تھی کی چودھری کی بیٹی سے جو بھی شادی کرے گا، اسے ملنا ملانا کچھ نہیں ہے اس لیے اس کے لیے نہ گاؤں میں کوئی رشتہ تھا نہ گاؤں سے باہر۔ ارونا شروع سے ہاسٹل میں رہی تھی۔ ہاسٹل سے اسکول، کالج، یونیورسٹی تک جانے آنے کے لیے چودھری نے بیٹی کی سہولت کے لیے کار رکھ چھوڑی تھی جس کا ڈرائیور میرا بیٹا روشن .... تھا۔ دونوں ساتھ آتے جاتے، ساتھ اٹھتے بیٹھتے، سیر سپاٹے کرتے، بس یہ رنگ رلیاں اور موج مستیاں ایک دن رنگ لے آئیں۔ چودھری اور چودھرائن نے سارا غصہ مجھ غریب پر اتارا۔ مجھے وہ چوٹ لگائی کہ میں اپنے ہوش کھو بیٹھا۔ میرے پاس بیٹے سے بات کرنے کا کوئی سادھن (ذریعہ) بھی نہیں تھا پھر بھی میں نے اس کے پتے پر خط پتر لکھے۔ میری چٹھی پڑھ کر وہ دوڑا دوڑا آیا۔

''میری حالت دیکھ کر وہ چودھری اور چودھرائن پر چڑھ دوڑا اور دبنگ آواز میں بولا کہ میں اب تمہارا جوائی ہوں۔ دونوں نے ممبئی کے ایک مندر میں جا کر شادی کر لی تھی اور پھر جلتی پر مزید مٹی کا تیل ڈالتے ہوئے بولا۔

''تمہاری بیٹی گربھوتی (حاملہ) ہے۔ جب تک وہ ماں نہیں بن جاتی میں اسے پھٹکنے بھی نہیں دوں گا۔ روی جعلی دواؤں کا بیوپار کر رہا ہے اور آئے دن اس کے پاس جو لوگ آتے ہیں، وہ مجرمانہ سرگرمیوں میں ملوث رہ چکے تھے۔ روشن انہیں اچھی طرح جانتا تھا۔ اس نے چودھری، چودھرائن اور روی کو دھمکی دی کہ اگر انہوں نے زیادہ ہاتھ پیر نکالے تو ابھی پولیس میں رپورٹ کر کے انہیں گرفتار کروادے گا۔

''تینوں کے پسینے چھوٹ گئے۔ انہوں نے اس سے وعدہ کیا کہ روشن .... تو اب ہمارا داماد بن گیا ہے اس لیے ہماری عزت تیری عزت ایک سمان۔ تیرا باپ ہمارا سمبندھی ہے۔ ہم اس کا خیال رکھیں گے تو ہمارا خیال رکھ۔ ممبئی تک جو دوائیں اسمگل ہو کر آتی ہیں، وہ ہم تک اب تو پہنچائے گا کیونکہ جو گینگ اس دھندے میں شامل ہیں ان سب کا ریکارڈ پولیس والوں کو اس طرح یاد ہے جیسے زخمی ناگ ناگن اپنے حملہ آور کو یاد رکھتے ہیں اس لیے ان سے مزید کام نہیں لیا جاسکتا۔ اب اس کاروبار کو تم آگے بڑھاؤ۔ ہم تم کو بھرپور حصہ دیں گے۔ اتنا دیں گے کہ تم اور ارونا سکھی زندگی گزار سکتے ہو لیکن ہماری بھی ایک شرط ہے۔ ارونا کے ماں بننے کے بعد اس بچے کو دنیا والوں سے چھپا کر رکھنا ہوگا اور دیوالی سے پہلے پہلے ارونا کو دیپالپور پہنچانے کی ذمے داری بھی تمہاری ہے۔ ہماری تمہاری ساجھے داری اور رشتے داری کی سن گن کسی کو نہیں لگنا چاہیے۔ دیوالی پر ہر سال کی طرح بڑا بھاری جشن ہوگا جس میں ناچ گانا دھوم دھڑکا ایسا ہوگا کہ لوگ برسوں یاد رکھیں گے اور اس میں شیالی اور ارونا اپنی کلا (فن) کا مظاہرہ کریں گی۔ تم بھی اس میں شریک رہو گے لیکن چوکیدار کے بیٹے کی حیثیت سے۔ ہم تمہیں اپنے گھر کا داماد اس وقت سویکار کریں گے جب تم ہمارا پورا پورا ساتھ دو گے۔ ہمارا تمہارا کاروبار چمک گیا تو ہم بھی گاؤں چھوڑ کر کسی بڑے شہر کی راہ لیں گے۔ وہاں تمہیں، ارونا اور تمہارے بچے کو آنے جانے کی کھلی چھوٹ ہوگی لیکن اگر اس سے پہلے تم نے منہ سے بھاپ بھی نکالی تو ہمارے کرائے کے قاتل تمہاری تکا بوٹی کر کے کتوں کے سامنے ڈال دیں گے۔ تمہیں پوری رازداری کے ساتھ ہمارے ساتھ کام کرنا ہوگا۔ تم دونوں کو ایک سوانگ یہ بھی رچانا ہوگا کہ تم روشن ..... سے روشن خان اور ارونا کرن چودھری، کرن خان بن جائیں گے۔ دیکھنے والے تم دونوں کو مسلمان جوڑا سمجھیں گے۔ مسلمان عورت کی حیثیت سے

www.pklibrary.com

وہ ہمیشہ برقعے میں رہے گی تو تم دونوں محفوظ رہو گے اور کوئی تمہارا بال بھی بیکا نہیں کر سکے گا۔

''ان لوگوں نے روشن کے سامنے ایسا ہرا بھرا چارا ڈالا کہ اس کے منہ میں پانی بھر آیا لیکن ایکانت (تنہائی) میں، میں نے اسے بہت سمجھایا کہ تو ان کی کسی بھی بات پر بھروسا نہ کر۔ یہ تجھے ماریں گے بھی اور رونے بھی نہیں دیں گے لیکن اس نے میری ایک نہیں سنی۔ چونکہ وہ ارونا سے شادی کر چکا تھا اس لیے سسرال والوں کے لیے ہر خطرہ مول لینے کو تیار تھا اور اب نہ اپنی مرضی سے کہیں آسکتا ہے اور نہ جاسکتا ہے۔ ساری آزادی ختم ہوگئی۔ خوفزدہ چوہا بن کر رہ گیا ہے۔ ارونا نے بھی اس کا جینا دوبھر کر رکھا ہے۔ ہمیشہ اسے اس کی اوقات یاد دلاتی رہتی ہے۔ ماں باپ کی بات مان کر بچے کو ایک دھرم شالہ میں رکھ چھوڑا ہے۔ روشن ہی اس کا خیال رکھتا ہے۔ ارونا نے پلٹ کر بھی بچے کی خبر نہیں لی۔

''دیوالی کی رات جو کچھ ہوا اس ڈرامے کا لیکھک بڑا چودھری تھا۔ کوشلیا، روی اور ارونا نے اس کا ساتھ دینے میں کمی نہیں کی۔ مجھے یہ تو پتا تھا کہ ناچ رنگ کے بعد یہاں آگ کے شعلے بھڑکنے والے ہیں مگر اس آگ میں بلی کا بکرا شپالی ہے، مجھے یہ نہیں معلوم تھا ورنہ میں اپنی جان پر کھیل کر اسے بچالیتا۔ اپنی بدنامی سے بچنے کے لیے اور دنیا دکھاوے کے لیے ارونا کو بھی جلا کر راکھ کے ڈھیر میں تبدیل کر دیا گیا لیکن ممکنہ احتیاط اور منصوبہ بندی کے ساتھ اسے تل گھر میں اتار لیا گیا۔ پھر گھر میں رونے دھونے کا ایسا ناٹک رچایا گیا کہ گاؤں والے سمجھے کہ چودھری اور چودھرائن بھی کچھ دن کے مہمان ہیں اور یہ غم انہیں کھا جائے گا۔

''سب سے بڑا اکلاکار تو ڈاکٹر روی تھا۔ دکھاوے کے لیے پتنی کے غم میں شراب میں ڈوبتا چلا گیا۔ یہ ساری اداکاری تھی۔ شراب وہ پیتا ضرور ہے لیکن بہت کم۔ اس کے باپ کو شراب نے ہی غرق کیا ہے اس لیے وہ شراب سے نفرت کرتا ہے لیکن بیوی اور بہن کی موت پر شراب کی بوتل میں بھر کر پتا نہیں کیا پیتا تھا اور مصنوعی نشہ اور غنودگی اپنے آپ پر چڑھائے رکھتا۔ باپ کو بھی فالج کا مریض بنا کر بیڈ پر لٹا دیا اور آنے جانے والوں سے کہتا کہ وہ اب کسی سے ملنا نہیں چاہتے۔

''جوں ہی ان لوگوں نے شپالی کی ہتھیا کی، میرے کان کھڑے ہو گئے۔ اگلا کرتا ہے پچھلا ہوشیار ہوتا ہے۔ میں نے اسی سے روشن کو پیش گوئی کر دی کہ روشن، شپالی کے بعد تیری باری ہے۔ کٹھور اور سنگ دل چودھری اپنی بیٹی اور اپنے بیٹے کو تو صاف بچالے جائے گا لیکن تجھے پھنسا دے گا کیونکہ دونوں باپ بیٹے اس کہاوت پر عمل کرتے ہیں ''تو بل میں ہاتھ ڈال میں منتر پڑھوں۔'' اور میرے پاگل بیٹے نے اپنے اچھے بُرے کی پہچان بھول کر اپنا ایک ہاتھ نہیں بلکہ دونوں ہاتھ بل میں ڈال دیے۔ جب دیپک بابو نے میرے بیٹے کا سندیسہ مجھ تک پہنچایا اور اس کا سارا حال سنایا تو میرا سارا جسم سن ہوگیا۔ دماغ زور زور سے سائیں سائیں کرنے لگا۔''

چوکیدار کی گدلی گدلی آنکھوں سے آنسوؤں کا طوفان ابل پڑا۔ راجیشور نے اسے دلاسا دیتے ہوئے کہا۔ ''پریشان نہ ہو۔ مجرموں کو ان کے کیے کی سزا ضرور ملے گی۔ شپالی اگر آگ میں جلی ہے تو چودھری، اس کی بیوی اور بیٹا بیٹی بھی سولی پر لٹکیں گے۔ روشن کے لیے کوشش کریں گے کہ عدالت اسے کم سے کم سزا سنائے اور پھر تم، تمہارا بیٹا اور پوتا سکھ بھرا جیون بتا سکیں۔''

لڑھکا چوکیدار ایک جھٹکے کے ساتھ کھڑا ہوگیا اور تشکرانہ جذبات سے مغلوب ہو کر راجیشور کے قدموں میں جھک گیا اور روتے ہوئے بولا۔ ''مائی باپ! حویلی میں جتنے نوکر چاکر ہیں، وہ بھی سب نردوش ہیں۔ انہیں بھی پولیس والوں سے بچا لیجیے گا۔''

راجیشور نے اپنے ہاتھ کا سہارا دے کر اسے اٹھایا اور بولا۔ ''ہیرا من! میرا وعدہ ہے کسی بے گناہ اور بے قصور پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔''

☆☆☆

دیپاپور جیسے پُرسکون قصبے میں اس وقت ہلچل اور ہنگامہ مچ گیا جب پولیس کی درجنوں گاڑیوں نے حویلی کو گھیرے میں لے لیا۔ چودھری خاندان کی ساری شاطرانہ چالیں فیل ہو چکی تھیں۔ تمام ہولناک اور سنسنی خیز انکشافات جیسے ہی منظر عام پر آئے، لوگوں کی قیاس آرائیاں دم توڑ گئیں ورنہ ابھی تک وہ ان واقعات کو کسی ابلا کا شراپ (مظلوم کی بددعا) یا دیوی دیوتا کا قہر سمجھ رہے تھے۔ مجرم سلاخوں کے اندر پہنچ چکے تھے۔ سرکاری مخبر کی حیثیت سے ہیرا من اور روشن لال معافی کے حق دار قرار پائے۔

دیپک کی خوشی اس وقت دیدنی تھی جب راجیشور نے بدھائی دیتے ہوئے خفیہ پولیس کا اپائنٹ منٹ لیٹر پیش کیا اور بہت جلد تربیتی کورس شروع ہونے کی خوشخبری سنائی۔

⌘⌘⌘

www.pklibrary.com

اعزاز

اعتزاز سلیم وصلی

کچھ لوگوں کے نزدیک خاندانی عزت و ناموس ہی ان کا سب سے بڑا سرمایا ہوتی ہے اور اسے بچانے کے لیے وہ کسی بھی حد تک جاسکتے ہیں۔ اسے بھی اپنی ناموس بہت عزیز تھی مگر ... اس کے ساتھ قسمت نے ایسا عجیب کھیل کھیلا کہ عزت کے ساتھ ساتھ جانے کتنے جنازے اٹھ گئے لیکن ... اس کی پُرخلوص کوششوں میں کسی طور کمی نہیں آئی... کیونکہ وہ ہر حال میں اپنے خاندان کا نام زندہ رکھنا چاہتا تھا۔

اپنوں کی محبت میں مرمٹنے والے ایک جانباز کا قصہ

شارلٹ پولک نے اس تقریباً سولہ سترہ سال کی عمر کے لڑکے سے پارسل لے کر میز پر رکھا۔ ''شکریہ پیارے لڑکے۔'' وہ مسکراتا ہوا واپس چلا گیا۔ شارلٹ نے پارسل کھولا اور ہنری کا پسندیدہ پیزا نکال کر میز پر سجانے میں مصروف ہوگئی۔ ہنری پولک سے اس کی شادی کو دو سال ہو چکے تھے۔ ان دو سالوں میں جب بھی ویک اینڈ پر ہنری نوکری سے گھر واپس آتا تھا، اسے پیزا اسی طرح میز پر سجا ہوا ملتا تھا۔ شارلٹ خود بھی جاب کرتی تھی مگر جاب کے ساتھ ساتھ وہ گھر کی ذمے داری نبھانا بھی خوب جانتی تھی۔

شام چھ بجے جب سورج واپسی کی تیاری پکڑ چکا تھا اور دن کی دھوپ اب تاریکی کی طرف سفر کی آخری منزل پر تھی، ہنری کی آمد ہوئی۔ شارلٹ نے دروازہ کھولا اور

www.pklibrary.com

مسکرا کر بولی۔ ''خوش آمدید۔''

''شکریہ۔'' ہنری نے یک لفظی جواب دیا اور اندر قدم بڑھا دیے۔ اس کا موڈ انتہائی خراب محسوس ہو رہا تھا۔ چہرے کے نقوش بگڑے ہوئے تھے اور وہ بار بار ہاتھوں کو حرکت دے رہا تھا۔ شارلٹ جانتی تھی، جب وہ شدید غصے میں ہوتا تھا تب ہی اس کے ہاتھ بے آرام رہتے تھے۔ اس نے کچھ پوچھنے کے بجائے خاموش رہنے کو ترجیح دی۔ کچھ دیر بعد ہنری نے لباس تبدیل کیا۔

''پانی پلاؤ مجھے۔'' اس کی بات سن کر شارلٹ فریج کی طرف بڑھی اور پانی نکال کر اسے دیا۔ پانی پینے کے بعد اس کے تاثرات معمول پر آئے۔

''کیا بات ہے ہنری؟'' اس نے نرمی سے ہنری کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

''اولیور۔'' اس نے پوری بات بتانے کے بجائے بس ایک نام لیا۔ شارلٹ نے گہری سانس لی۔

''کیا کیا اس نے؟'' حالانکہ وہ جانتی تھی، اولیور کچھ کرے یا نہ کرے، ہنری کے غصے کے لیے اس کا نام ہی کافی تھا۔

ہنری، اولیور اور شارلٹ کی کہانی محبت کی روایتی کہانی تھی۔ تینوں ایک ہی یونیورسٹی میں پڑھتے تھے۔ ہنری اور اولیور تاریخ جبکہ شارلٹ انفارمیشن ٹیکنالوجی کی اسٹوڈنٹ تھی۔ ان تینوں کی دوستی کی وجہ ان کا لکھنے کا شوق تھا۔ تینوں اپنے شوق کے مطابق مختلف مضامین لکھا کرتے تھے۔ اکثر ان کے درمیان مختلف موضوعات کو لے کر بحث ہوتی رہتی تھی۔ نہ جانے کب اولیور اور شارلٹ کے درمیان محبت کا رشتہ پروان چڑھا۔ وہ دونوں کئی سال تک ساتھ رہے۔ ایک دوسرے کو سمجھا اور آخر میں شادی کر لی۔

شارلٹ بے خبر رہی کہ اس رشتے کی وجہ سے ایک دل ٹوٹ چکا ہے اور وہ دل ہنری کا تھا۔ شارلٹ کے لیے اپنے جذبات چھپا کر اس نے چپ چاپ ان کی شادی میں شرکت کی۔ شارلٹ اور اولیور کے درمیان شادی کے چند سال بعد ہی لڑائیاں بڑھ گئیں۔ اولیور کو اولاد کی خواہش تھی جبکہ شارلٹ کو اپنی جوانی عزیز تھی۔ یوں تعلق کی اس خرابی نے ہنری کا راستہ ہموار کیا۔ وہ ہر صورت شارلٹ کو اپنانا چاہتا تھا۔ ان کی ملاقاتیں بڑھ گئیں تو اولیور کو احساس ہوا۔ اس آزاد معاشرے میں رہنے کے باوجود بھی اس کی مردانہ انا نے اسے ہنری سے لڑنے پر مجبور کیا۔ آخر شارلٹ کو طلاق دے کر اس نے اپنی دوستی اور محبت کا باب ہمیشہ کے لیے بند کر دیا۔

آج نہ جانے کتنے ماہ بعد ان دونوں کے درمیان اولیور کا ذکر آیا تھا۔ شارلٹ حیران تھی کہ آخر ہنری کیوں اتنے غصے میں ہے۔

''اس نے میری تحقیق چرا کر ایک قسط وار سلسلہ شروع کیا ہے سنڈے میگزین میں۔'' اس نے وجہ بیان کی تو شارلٹ نے اس کے سینے پر سر رکھا۔

''تم بھول جاؤ..... یہ کوئی ایسی بات نہیں۔''

''کیوں ایسی بات نہیں؟ میامی ڈرگ وار پر لکھنا میرا خواب تھا..... میں نے اس کے لیے کئی سال محنت کی..... تحقیق کی، کئی لوگوں کے ساتھ وقت گزارا..... قیدیوں سے جیل میں جا کر ملاقاتیں کیں۔''

''اسے کیسے علم ہوا اس ساری تحقیق کا؟''

''میں نے اس سانپ کے ساتھ اس ساری معلومات پر بحث کی تھی..... گفتگو کی تھی..... مگر مجھے نہیں علم تھا کہ وہ سانپ اتنا کمینہ نکلے گا۔'' ہنری نے زیر لب مزید گالیاں اولیور کے نام کیں۔

''تم اس پر کیس کر دو۔''

''میرے پاس کوئی ثبوت نہیں۔'' اس نے گہری سانس لی۔ ''مجھے اس سے بدلہ لینا ہے..... کسی بھی طرح۔'' شارلٹ نے گہری نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ غصے میں کچھ بھی کر سکتا تھا.....

☆☆☆

''کسی زمانے میں اسے خطرناک ترین شہر تصور کیا جاتا تھا۔'' اولیور نے لیو کی طرف دیکھا۔ دونوں بھائی کافی دنوں بعد ایک ساتھ سفر کر رہے تھے۔ ان کی گاڑی کی رفتار سے اندازہ ہوتا تھا کہ انہیں گھر جانے کی کوئی جلدی نہیں۔ میامی میں جون اپنے عروج پر تھا۔ درجۂ حرارت تیس سے زیادہ نہ تھا اور کچھ دیر پہلے چلنے والی ٹھنڈی ہوا اسے مزید نیچے لانے میں مدد دے رہی تھی۔ عام دنوں کی نسبت موسم خوشگوار تھا۔ اولیور کو یونیورسٹی سے چھٹی تھی۔ اس لیے اس نے اپنے سے پانچ سال چھوٹے بھائی کو شہر گھمانے کا کہا۔ لیو خوش ہو گیا۔ وہ ویسے بھی پڑھائی کی مصروفیات سے وقت نکال کر دماغ کو پُرسکون کرنا چاہتا تھا۔

''اب تو ایسا کچھ محسوس نہیں ہوتا۔''

''زیادہ آبادی کی وجہ سے اب بھی جرائم تو ہیں مگر پہلے کی نسبت حالات بہت بدل گئے ہیں۔ سٹر کی دہائی میں تو یہاں کا ہر شخص مجرم لگتا تھا۔ باہر سے کوئی نہیں آتا تھا یہاں.....

www.pklibrary.com

پورے امریکا کے نشیات فروش یہاں جمع تھے۔''

''آپ نے شہر کی تاریخ یاد کر رکھی ہے۔'' لیو مسکرایا۔

''میرا کام ہی کچھ ایسا ہے۔'' اولیور نے ڈرائیونگ پر توجہ مرکوز کی۔ اس کاروباری شہر میں شام کے وقت سڑکوں پر شدید رش تھا۔ لوگ کام سے واپس گھروں کو جا رہے تھے۔ سڑک کی دونوں جانب گاڑیوں کی لمبی قطاریں تھیں۔ یہی وقت تھا جب لیو کی نظر ایک گاڑی پر پڑی۔ سرخ رنگ کی یہ کار پورے سفر کے دوران ان کے آس پاس رہی تھی۔ اس وقت بھی وہ ان سے کچھ آگے تھی۔ اسے عجیب سا احساس ہوا۔ اس نے گاڑی پر نظر جمائی۔ گاڑی کا نمبر اس نے یاد کر لیا۔ جیسے جیسے وہ مین شہر سے باہر جا رہے تھے، سڑک پر رش کم ہوتا جا رہا تھا۔

''کیا سوچ رہے ہو لیو؟'' اولیور کی آواز نے اسے خیالوں سے باہر نکالا۔

''یہ سرخ رنگ کی گاڑی بار بار ہماری کار کے آس پاس دکھائی دے رہی ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''زیادہ رش ہے..... اور آگے اسکول زون ہے اس لیے یہ اسپیڈ بھی کم کر رہا ہے.....'' اولیور نے سمجھایا مگر اس کے دماغ میں خطرے کی گھنٹی مسلسل بجتی رہی۔ اسے اکثر احساس ہوتا تھا کہ اس کی چھٹی حس عام لوگوں کی نسبت زیادہ تیز ہے۔ کئی بار خطرے کے احساس کے بعد اس نے دماغ کی ہدایت پر عمل کیا تھا اور نقصان سے محفوظ رہا تھا۔ لیو یونیورسٹی کا طالب علم تھا۔ اسکول زون کے بعد اولیور نے گاڑی کی اسپیڈ بڑھائی۔ ''کیا کھانا پسند کرو گے لیو؟''

''پیزا اور ایک کولڈ ڈرنک۔'' اس نے جواب دیا۔

ابھی اولیور کسی پیزا شاپ پر رکنے کا سوچ رہا تھا کہ اچانک سامنے سفر کرتی سرخ رنگ کی گاڑی کے ڈرائیور نے گاڑی روک دی۔ اولیور نے بڑی مشکل سے گاڑی کو قابو کیا۔

''کتیا کا بچہ۔'' وہ بڑبڑایا۔ ابھی وہ گاڑی آگے بڑھانے کا سوچ ہی رہا تھا کہ سامنے موجود کار کی فرنٹ سیٹ سے ایک شخص باہر آیا۔ اس نے چہرہ ماسک میں چھپا رکھا تھا۔

''اولیور..... جھک جاؤ۔'' لیو نے اجنبی کے ہاتھ میں پسٹل دیکھ لیا تھا۔ اولیور کو سمجھنے میں دیر لگی..... گولی چلنے کی آواز آئی..... پہلی گولی ونڈ اسکرین توڑتی ہوئی اولیور کی گردن کے پاس لگی۔ دوسری گولی بھی پہلی کے آس پاس کہیں لگی تھی۔ ''بھائی۔'' لیو چیخا۔ ٹریفک میں ہلچل مچ گئی۔ لوگ چیخ رہے تھے۔ قاتل تیزی سے واپس گاڑی کی طرف بڑھا۔ اولیور کا سر لیو کی گود میں تھا۔ اس کے منہ سے چیخیں نکل رہی تھیں۔

''کیا ہوا ہے..... کوئی پولیس کو کال کرو..... ایمبولینس بلاؤ۔'' کوئی ان کی کار کے پاس کھڑا چیخ رہا تھا۔ چند لمحے پہلے شہر کا وہ علاقہ جو پُرسکون تھا..... اب نہیں تھا۔ وہاں چیخ و پکار تھی۔ لوگ بھاگ رہے تھے۔ پولیس کی گاڑی اور ایمبولینس موقع پر پہنچ گئی مگر کہانی ختم ہو چکی تھی..... اولیور مر چکا تھا۔

☆☆☆

یونیورسٹی آف میامی میں تاریخ پڑھانے والے مشہور پروفیسر اولیور کو روڈ پر قتل کیا گیا تھا۔ یہ کوئی عام بات نہیں تھی۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ اینڈریان کے ہاتھ میں تھی۔ اس کے چہرے پر سوچ کے تاثرات تھے۔ آفیسر اینڈریان پولیس کے بہترین آفیسرز میں سے ایک تھا۔ اس کے ساتھ ایوا موجود تھی۔ اپنے سینئر آفیسر کے چہرے پر تاثرات دیکھ کر وہ اندازہ لگا سکتی تھی کہ اس کیس کا دباؤ بہت زیادہ ہے۔

''ایک تاریخ پڑھانے والے پروفیسر سے کسی کی کیا دشمنی ہو سکتی ہے جو اس طرح قتل کیا گیا ہے؟'' اینڈریان بڑبڑایا۔ ایوا کو لگا وہ خود سے پوچھ رہا ہے مگر جواب ایوا کی طرف سے ہی آیا۔

''کوئی وجہ ضرور ہے جو یوں سرِ عام قتل کیا گیا ہے..... کوئی خاص وجہ ہے۔''

''وہ گاڑی ملی؟''

''نہیں..... دو دن گزر گئے ہیں..... ایک مخصوص جگہ کے بعد وہ غائب ہے۔ اس کا نمبر اور ریکارڈ ہمارے پاس ہے۔'' اس نے پاس پڑے کاغذات اٹھائے۔ ''مالک کا نام انتھونی جیمز، ایک عام سی ملازمت کرنے والا عام سا آدمی ہے۔''

''گاڑی چوری کی رپورٹ تو نہیں ہوئی؟'' اینڈریان نے کسی خیال کے تحت پوچھا مگر ایوا نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''کوئی رپورٹ نہیں..... میں نے دوبارہ ریکارڈنگ دیکھی ہے کیمروں کی، ڈرائیونگ سیٹ پر وہ موجود تھا۔ واضح نہیں مگر مجھے شک ہے کہ اس کے سر سے پسٹل لگایا ہوا تھا قاتل نے۔''

''یہ کیسے کہہ سکتی ہو تم؟'' وہ چونکا۔

''ایک جگہ جب اس کی گاڑی کیمرے سے کچھ فاصلے پر تھی تو جو ویڈیو آئی اس میں سے ایک تصویر نکالی ہے میں نے۔ اس تصویر کو مختلف زاویوں سے دیکھا تو یہ نتیجہ نکلا۔'' اس نے لیپ ٹاپ آن کیا اور ویڈیو میں سے لی گئی

www.pklibrary.com

تصویر نکالی۔ ''یہ دیکھیں...... جو سایہ ہے اس میں اگر دیکھیں تو تقریباً واضح ہے۔'' اینڈریان نے غور سے دیکھا اور سر ہلا دیا۔

''زبردست۔'' اسی دوران باہر ہلچل مچی۔ کوئی چیخا...... اینڈریان اور ایوا نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور ریوالور نکال کر تیزی سے پولیس اسٹیشن سے باہر نکلے۔ یہاں ایک گاڑی موجود تھی جس کو چاروں طرف سے پولیس والوں نے گھیر رکھا تھا۔ یہ سرخ رنگ کی وہی کار تھی جسے وہ دو دن سے مسلسل تلاش کر رہے تھے۔ ڈرائیونگ سیٹ پر موجود شخص نے دونوں ہاتھ کھڑے کیے اور چیخا۔

''میں قاتل نہیں ہوں...... میں باہر آ رہا ہوں۔''

ایک ہاتھ نیچے کر کے اس نے لاک کھولا۔

''کوئی گولی نہ چلائے...... اپنی اپنی پوزیشن پر رہو سب۔'' اینڈریان نے چیخ کر سب کو ہدایت دی اور ایوا کو ساتھ لے کر آگے بڑھا۔ دونوں نے آگے بڑھ کر گاڑی کے ڈرائیور کو ہتھکڑی لگائی۔ ''تم یقیناً انتھونی جیمز ہو۔''

''ہاں...... وہ قاتل میری گاڑی میں زبردستی داخل ہوا...... اور میرے سر پر پستول لگا دیا...... اس نے مجھے ایک شخص کی گاڑی کے تعاقب کا کہا اور پھر...... پھر۔'' اس نے ہاتھوں کو حرکت دینا چاہی مگر ہتھکڑی کی وجہ سے کچھ نہ کر سکا۔

''اسے مار دیا۔'' انتھونی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ''میں بھاگنا چاہتا تھا۔ میں نے گاڑی آگے بڑھانا چاہی مگر وہ واپس آ گیا۔ اس نے مجھے مجبور کیا تھا اور میں اسے میامی سے باہر چھوڑ آیا ہوں۔'' انتھونی نے تفصیل بتائی۔ پولیس اسٹیشن کے اندر لا کر اس کی ہتھکڑی کھول دی گئی۔ اینڈریان کو محسوس ہوا کہ وہ سچ بول رہا ہے۔

''تم کس جگہ نوکری کرتے ہو اور یہ قاتل کس جگہ تمہارے پاس آیا؟''

''میں ٹیلر اینڈ جارج کمپنی کا ملازم ہوں۔ اسی کے مین آفس کی پارکنگ میں یہ شخص میری گاڑی میں داخل ہوا۔'' اس کا جواب سن کر اینڈریان نے سر ہلایا اور ایوا کی طرف دیکھا۔

''ایوا...... ٹیلر اینڈ جارج کمپنی کے آفس میں جو پارکنگ ہے اس کے کیمرے کی ریکارڈنگ حاصل کرو اور ہاں...... مسٹر انتھونی کی گاڑی کے تمام حصوں پر موجود انگلیوں کے نشانات حاصل کرو۔'' اینڈریان کی ہدایت پر ایوا نے سر ہلایا اور باہر نکل گئی۔ ایوا کے جانے کے پندرہ منٹ بعد لیو کی آمد ہوئی۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں۔ انتھونی کو باہر بھیج کر اینڈریان نے لیو کی طرف دیکھا۔

''مجھے اولیور کی موت کا بہت افسوس ہے۔ وہ ایک بہترین پروفیسر تھے اور ان کی کمی یونیورسٹی ہمیشہ محسوس کرے گی۔'' لیو نے سر ہلا دیا۔ ''میں جاننا چاہتا ہوں کہ اس دن کیا ہوا؟''

''بھائی کی یونیورسٹی سے چھٹی تھی اس دن...... میری پڑھائی کی بہت زیادہ مصروفیات تھیں اس لیے بھائی نے کچھ وقت نکال کر مجھے پُرسکون کرنے کے لیے باہر جانے کا فیصلہ کیا۔ ہم دونوں گاڑی میں جا رہے تھے جب یہ سرخ رنگ کی کار بار بار ہماری کار کے قریب آئی۔ کچھ دیر بعد یہ آگے نکل گئے اور جیسے ہی رش کچھ کم ہوا...... انہوں نے گاڑی روک دی اور پھر۔'' لیو کی آنکھوں میں نمی آ گئی۔ ''دو فائر ہوئے...... ان کا نشانہ بھائی ہی تھے اور وہ جھٹکا کھا کر پیچھے ہوئے پھر میری گود میں گر گئے۔'' اس نے دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا لیا۔ اینڈریان نے اسے پانی دیا۔ کچھ دیر بعد وہ سنبھل گیا۔ ''معذرت چاہتا ہوں۔''

''کوئی بات نہیں۔'' اینڈریان نے غور سے اس نوجوان کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیا۔

''کبھی کوئی دھمکی ملی تھی اولیور کو؟ یا ایسی کوئی بات جس سے محسوس ہوا ہو کہ کوئی ان کا دشمن ہے؟''

''نہیں...... وہ اپنے کام سے کام رکھنے والے انسان تھے۔ تاریخ سے دلچسپی تھی انہیں...... آج کل مضامین لکھ رہے تھے سنڈے میگزین میں۔''

''کس موضوع پر؟''

''میامی کے حالات پر...... ستر اور اسی کی دہائی میں جو یہاں ڈرگ اسمگلرز کے درمیان لڑائیاں ہوئیں، ان پر کافی تحقیق کی تھی انہوں نے...... اس تحقیق کی مدد سے ان کے لکھے گئے ایک مضمون کا پہلا حصہ شائع ہوا تھا پچھلے اتوار کو۔'' اس کی بات سن کر اینڈریان کی آنکھیں پھیل گئیں۔ میامی ڈرگ وار ایک خوفناک خواب تھا جس پر لکھنا اور اس کے متعلق تحقیق کرنا اپنی جان کو خطرے میں ڈالنے کے مترادف تھا۔

''اولیور کے تمام مضامین کہاں محفوظ ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''ان کے لیپ ٹاپ میں۔''

''مجھے وہ لیپ ٹاپ درکار ہے...... اٹھو...... میرے ساتھ آؤ۔'' ٹھیک پانچ منٹ بعد اینڈریان کی گاڑی میں بیٹھ کر وہ دونوں لیو کے گھر جا رہے تھے۔ اینڈریان کے چہرے کے تاثرات سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ صورتِ

www.pklibrary.com

حال اس کی سوچ سے زیادہ خراب ہے۔

☆☆☆

رات نے اپنا اندھیرا چاروں طرف پھیلا دیا تھا۔ گہری خاموشی میں کسی ٹرک کے گزرنے کی آواز آئی تو وہ چونکا۔ اینڈریان کو خبر ہی نہیں ہوئی تھی کہ رات کے دو بج چکے تھے۔ اس نے پروفیسر اولیور کا لیپ ٹاپ بند کیا اور کھڑکی سے باہر دیکھا۔ ہر طرف اندھیرا تھا۔ روشنی کی خبر لانے والا سورج ابھی چند گھنٹوں کی مسافت پر تھا۔ پروفیسر اولیور کے لیپ ٹاپ میں موجود مضامین پڑھ کر اس کا سر مسلسل گھوم رہا تھا۔ میامی کی مشہور ڈرگ وار کے بارے میں اتنی تحقیق شاید ہی کسی نے کی ہوگی جتنی پروفیسر اولیور نے کی تھی۔

''کہاں سے لی اتنی معلومات مسٹر پروفیسر؟'' وہ بڑبڑایا۔ اگر پروفیسر کی زندگی میں اس نے یہ معلومات پڑھی ہوتی تو اب تک وہ یقیناً پروفیسر سے کئی بار مل چکا ہوتا۔ میامی ڈرگ وار کے بارے میں پڑھنا اس کا بھی شوق تھا مگر اتنی معلومات اس کے پاس ہرگز نہ تھی۔ ایک گھنٹے بعد وہ بستر پر موجود تھا۔ دماغ کو آزاد چھوڑ کر اس نے سونے کی کوشش کی جو پندرہ بیس منٹ بعد کامیاب ہوگئی۔

اگلی صبح وہ پولیس اسٹیشن پہنچا تو ایوا اس سے پہلے موجود تھی۔

''سر! یہ رہی معلومات۔'' اس نے ایک فائل سامنے رکھی۔

''کوئی خاص بات معلوم ہوئی؟''

''ہاں..... قاتل نے کوئی حفاظت نہیں کی اپنے فنگر پرنٹس کی..... نہ ہی اسے ضرورت تھی۔'' اس کی بات سن کر اینڈریان چونکا۔

''کون ہے وہ؟''

''جوڈی لوکاس..... نام تعارف کا محتاج نہیں۔'' جوڈی لوکاس کا نام واقعی تعارف کا محتاج نہیں تھا۔ فلوریڈا کے علاوہ وہ دوسری ریاستوں میں بھی کئی قتل کر چکا تھا۔ وہ پیشہ ور قاتل تھا جس کا کام پیسے لے کر ٹارگٹ کو ختم کرنا تھا۔ پولیس میں اس کا ریکارڈ موجود تھا۔ ابھی تک وہ پولیس کی گرفت سے باہر تھا۔

''جوڈی لوکاس..... ہوں، یعنی پروفیسر کو پیسے دے کر قتل کروایا گیا ہے۔'' اینڈریان نے کچھ سوچا۔ ''ایوا..... جوڈی نے کبھی کسی ڈرگ اسمگلر کے لیے کام کیا ہے؟''

''ممکن ہے..... اسے پیسے سے مطلب ہے، ڈرگ اسمگلر ہو یا پولیس چیف..... اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟''

''پروفیسر نے کچھ مضامین لکھے ہیں..... ان میں اس نے مکمل تفصیل بیان کی ہے ڈرگ وار کی..... اور اس نے میڈیئن کارٹل کی تفصیل بھی لکھی ہے۔ اس کے مطابق پولیس سے زیادہ ان کے آپس کے اختلاف نے انہیں ختم کیا تھا..... اور اس نے چند نام بھی گنوائے ہیں جو اب تک موجود ہیں..... ایک تو شاید میڈیئن کارٹل کے کسی اہم بندے کا بیٹا ہے۔''

''کیا نام ہے اس کا؟''

''نہیں معلوم..... اس کے مطابق لوگ اسے روبوٹ کہتے ہیں..... اس میں رحم نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔'' اینڈریان نے تفصیل بتائی۔ ''مجھے یقین ہے اولیور اپنے تحقیقی مضمون کی وجہ سے مارا گیا ہے۔''

''مگر میرا نہیں خیال کہ اسے کسی ایسے بندے نے قتل کروایا ہے جو ڈرگ اسمگلنگ میں ملوث ہے۔'' ایوا نے کچھ سوچا۔ ''یہ ممکن نہیں۔''

''کیوں؟'' وہ اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر

خون

نرس آدمی سے۔ ''آپ کا اور آپ کی بیوی کا خون ایک جیسا ہی ہے۔''

آدمی۔ ''ہوگا، ضرور ہوگا۔ 17 سال سے میرا ہی خون پی رہی ہے۔''

مکمل سکون

ڈاکٹر۔ ''آپ کے شوہر کو مکمل سکون کی ضرورت ہے۔ یہ نیند کی گولی رکھ لیں۔''

بیوی۔ ''یہ انہیں کس وقت دینا ہے؟''

ڈاکٹر۔ ''یہ آپ نے خود کھانی ہے۔''

شادی

ماں بیٹے سے۔ ''اپنے لیے ایک لڑکی ڈھونڈ لو جو نمازی، پرہیزگار، پردے دار اور نیک سیرت ہو۔''

بیٹا۔ ''یہ بتائیں اس سے شادی کرنا ہے یا پانی دم کروانا ہے۔''

(مرسلہ: محمد انور ندیم، حویلی لکھا، اوکاڑہ)

www.pklibrary.com

بولا۔ ایوا کے خوبصورت نقوش پر سوچ کے تاثرات تھے۔

''ذرا گہرائی میں جائیں اور سوچیں..... اسّی کی دہائی میں جب ایک سال میں چھ سو سے زیادہ لوگ مارے گئے تھے تو ہر قتل میں خاص بات کیا تھی؟'' وہ غور سے اپنے سینئر آفیسر کی طرف دیکھنے لگی۔

''اکثر قتل سرِ عام ہوئے تھے..... سڑکوں پر..... شاپنگ مال میں.....''

''یہ خاص بات نہیں.....'' ایوا نے نفی میں سر ہلایا۔ ''جتنے قتل ہوئے تھے، ان میں سے ہر قتل کی باقاعدہ تصدیق ہو جاتی تھی کہ یہ قتل کس گروپ نے کیا ہے یا یہ بندہ کسی ذاتی دشمنی کی وجہ سے مارا گیا ہے..... یعنی پولیس کو علم تھا کہ کتنے بندے ڈرگ وار میں مارے گئے ہیں اور کتنے بندے پولیس کا نشانہ بنے ہیں.....'' اینڈریان نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''میں تمہاری بات نہیں سمجھ رہا۔''

''صاف بات ہے..... اگر اولیور کو کسی ڈرگ اسمگلر نے قتل کروایا ہے تو وہ نشانی ضرور چھوڑ جاتے..... اکثر ان کے قتل کرنے کے انداز سے علم ہو جاتا ہے..... جیسے تین گولیاں مارنا..... جسم کے مخصوص حصوں کو نشانہ بنانا یا پھر پورے گھر کو آگ لگا دینا۔ پروفیسر اولیور کا قتل ایسے نہیں ہوا۔''

''ایوا..... اب وہ دور نہیں رہا..... یہ وہ میامی نہیں جہاں سے پورے امریکا میں بلکہ پوری دنیا میں منشیات پھیلائی جاتی تھی۔ یہ آج کا میامی ہے..... کاروباری شہر۔''

''ٹھیک ہے..... ایک کام کرتے ہیں۔''

''کیا؟''

''تصدیق کرتے ہیں کہ پروفیسر کسی منشیات فروش گروپ کا نشانہ بنا ہے یا کوئی اور وجہ تھی؟''

''کیسے تصدیق کرو گی؟''

''آپ کی مدد درکار ہو گی مگر تصدیق کر لوں گی۔'' وہ مسکرائی۔ اینڈریان نے سر ہلا دیا۔ کچھ دیر تک دونوں اسی موضوع پر گفتگو کرتے رہے۔ اسی دوران پولیس چیف کی کال آ گئی۔ اولیور کے قتل کی تفتیش کے بارے میں بتا کر اینڈریان نے کال بند کر دی۔

''چیف پر بہت دباؤ ہے۔'' اس نے ایوا کی طرف دیکھا۔

''ہو جائے گا کیس حل.....'' اس نے سر ہلا دیا۔

☆☆☆

میامی شہر میں مقامی لوگوں سے زیادہ غیر ملکی رہتے تھے۔ کچھ قانونی اور کچھ غیر قانونی طور پر اس شہر میں داخل ہونے والے بہت سے لوگوں میں چھوٹے قد اور عجیب سے نقوش کا مالک اینٹون بھی تھا۔ اینٹون میکسیکو سے تھا۔ اس نے آٹھ سال پہلے میامی میں قدم رکھا تھا اور اس کے بعد کبھی واپس نہیں گیا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی چالاک آنکھیں اپنے کلب میں ہر آتے جاتے شخص کو دیکھ رہی تھیں۔ یہ کلب اس نے چار سال پہلے بنایا تھا۔ کلب سے کمائی جانے والی دولت سے کہیں زیادہ دولت اس نے ایک دوسرے کام سے کمائی تھی۔ یہ کلب اس نے اپنے دوسرے بزنس کو بچانے کے لیے بنایا تھا۔

رات کے تقریباً دس بجے تک کلب لوگوں سے بھر چکا تھا اور قہقہے گونج رہے تھے۔ اسی وقت ایک لڑکی کی آمد ہوئی۔ اس کی اصل عمر زیادہ ہو گی مگر چست لباس اور اچھے میک اپ کے علاوہ جسم کی ساخت نے اس کی عمر کو بیس بائیس سال تک ظاہر کیا تھا۔ اس نے ادھر اُدھر نظریں دوڑائیں اور سیدھا اینٹون کی طرف بڑھی۔ اینٹون اسے دیکھ کر چونک گیا۔ وہ اس کے کلب میں پہلی بار آئی تھی۔

''مسٹر اینٹون.....'' اس نے اینٹون سے ہاتھ ملایا۔

''میں ماریا براؤن..... انگلینڈ سے۔''

''اینٹون..... میکسیکو سے ہوں مگر میامی میری پہچان ہے۔'' وہ مسکرایا۔ تعارف کے بعد اس نے پوچھا۔ ''کیا خدمت کر سکتا ہوں آپ کی؟''

''مجھے جوزف نے بھیجا ہے.....'' ماریا نے اس کے تاثرات کا جائزہ لیا۔ اینٹون نے اپنے چہرے کے تاثرات قابو میں رکھے تھے۔ ''جوزف..... ٹرپل ٹو، ٹرپل ون۔''

اب کی بار وہ چونکے بنا نہ رہ سکا۔ ماریا مسکرا دی۔ اینٹون پریشان دکھائی دیا۔

''آؤ میرے ساتھ۔'' وہ اسے لے کر تیزی سے سیڑھیوں کی جانب بڑھ گیا۔ ماریا نے اس کے پیچھے قدم بڑھا دیے۔ سیڑھیوں کے اختتام پر سامنے ایک کمرا دکھائی دیا جس کے دروازے پر رنگین لائٹ سے اینٹون کا نام لکھا تھا۔ اینٹون نے دروازہ کھولا اور ماریا کو اندر بلایا۔ دروازہ اندر سے لاک کر کے اس نے سوئچ آن کیا۔ کمرے میں روشنی ہو گئی۔ ماریا سکون سے ایک صوفے پر بیٹھ گئی۔ ''اب بتاؤ..... کیا چاہیے تمہیں؟''

''کچھ معلومات.....''

''جوزف بے وقوف نہیں جو صرف معلومات کے لیے لڑکی کو میرے پاس بھیج دے۔'' اس نے ہاتھ اٹھا کر ماریا کی بات کاٹی۔ ''میرے پاس وقت کم ہے اس لیے صاف

www.pklibrary.com

صاف بات بتاؤ۔''

''روبوٹ نے پچھلے دنوں ایک قتل کروایا ہے..... مجھے اس قاتل کے بارے میں معلومات حاصل کرنی ہے۔''

''روبوٹ نام کا کوئی انسان اس دنیا میں نہیں ہے۔'' وہ غرایا۔''اور اگر ہے بھی تو میں اپنے دشمنوں کا نام اس کلب میں نہیں سنتا۔''

''دنیا میں کوئی شخص نہیں اس نام کا پھر بھی تم اسے دشمن کہہ رہے ہو۔'' ماریا ہنسی۔''بچوں جیسی باتیں مت کرو اینٹون..... مجھے معلومات چاہیے..... ورنہ.....'' اس نے ہاتھ پیچھے کیا اور ریوالور باہر نکالا۔''اس کمرے سے باہر تمہاری لاش جائے گی۔'' اینٹون ہنس پڑا۔

''کھلونا پاس رکھو اور سنو.....'' اس نے ریوالور کی طرف اشارہ کیا۔''روبوٹ اب اس شہر میں نہیں ہے..... وہ کہاں ہے، کوئی نہیں جانتا۔ اگلی بات..... جوڈی لوکاس جیسے پیشہ ور قاتل کے ذریعے ایک معمولی پروفیسر کو قتل کروانا روبوٹ کا کام نہیں ہوسکتا..... وہ میرا دشمن ہے اور میں دشمن کی پہچان رکھتا ہوں۔ روبوٹ کو پروفیسر سے کوئی خطرہ نہیں تھا اور اگر خطرہ ہوتا بھی تو اس کا پورا گھر جلا دیتا..... آئی سمجھ؟'' ماریا نے سر ہلا دیا۔

''تمہارا شکریہ۔'' وہ اٹھی اور دروازے کی طرف بڑھی۔

''ہاں، ایک اور بات سنتی جاؤ مس ایوا براؤن!'' اینٹون نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ایوا اچھل پڑی۔''بھیس بدل کر تمہاری شناخت اینٹون سے نہیں چھپ سکتی۔ جوزف تک جس پولیس کے مخبر کے ذریعے پہنچی ہو اسے میں ڈھونڈ لوں گا۔ بہتر ہے اب اسے اس ڈیوٹی سے ہٹا لو ورنہ پروفیسر اولیور کے بعد تمہیں ایک اور قتل کی تفتیش کرنی پڑے گی..... پولیس آفیسر کے قتل کی۔'' وہ ہنسا۔ ایوا سر ہلا کر باہر نکل گئی۔ اینٹون اس کی توقع سے زیادہ چالاک ثابت ہوا تھا۔

اپنے فلیٹ پر جا کر اس نے حلیہ بدلا اور پولیس اسٹیشن آ گئی۔ اس کی آمد کے تقریباً دس منٹ بعد اینڈریان نے پولیس اسٹیشن میں قدم رکھا۔

''کیا خبر ہے ایوا؟''

''میری بات سچ تھی..... یہ کسی ڈرگ اسمگلر کا کام نہیں۔''

''تفصیل بتاؤ۔'' اس کے کہنے پر ایوا نے اینٹون سے ملاقات کی تفصیل بیان کی اور آخر میں کہا۔

''اینٹون بہت چالاک ہے مگر اس کی بات درست ہے۔ میں نے جوزف کے گروپ میں شامل ہمارے پولیس آفیسر کو اطلاع دے دی ہے اور واپس بلا لیا ہے ورنہ وہ مارا جاتا.....'' اینڈریان نے سر ہلا دیا۔

''اگر یہ روبوٹ کا کام نہیں ہے تو پھر کسی اور کا..... ہوگا۔ میں نے پوری تفصیل اکٹھی کی ہے..... جوڈی لوکاس کم معاوضہ لینے والا قاتل ہے۔ ہم یہ بھی اندازہ کر سکتے ہیں کہ اولیور نے اپنے مضمون میں جن عام تنظیموں کا ذکر کیا تھا، ان میں سے بھی کوئی یہ کام کر سکتا ہے.....''

''آپ صرف مضمون کو لے کر تفتیش کر رہے ہیں۔'' اس کے لہجے میں جھنجلاہٹ تھی۔ اینڈریان مسکرا دیا۔

''ایوا..... ہمارے پاس اس کے علاوہ نہ کوئی ثبوت ہے نہ ہی کوئی ایسا سراغ جس کی مدد سے قاتل تک پہنچا جا سکے۔ انتونی جیمز بے گناہ تھا پھر بھی اس کی نگرانی کی جا رہی ہے اور اس پر فلوریڈا سے باہر جانے پر پابندی ہے۔ جوڈی لوکاس کی تلاش جاری ہے مگر اب تک جتنے بھی اس نے قتل کیے ہیں، اس کے بعد وہ کئی ماہ تک غائب ہو جاتا ہے۔''

اس کا جواب سن کر ایوا خاموش ہوگئی۔''تم ایک کام کرو..... یونیورسٹی سے تفصیل اکٹھی کرو۔ اولیور کے دوستوں سے ملو اور ہاں ایک بات اور..... اس نے اتنی تحقیق کیسے کی، یہ معلومات اس کے پاس کہاں سے آئی، یہ سب معلوم کرو۔ قاتل کا کوئی نہ کوئی نشان مل جائے گا۔'' اس نے مزید ہدایات دیں اور پھر اولیور کا لیپ ٹاپ کھول لیا۔ یہ تحقیقی مضمون اس کے دماغ پر سوار تھا۔

☆☆☆

ٹھیک دو دن بعد ایوا اپنی گاڑی میں اس عمارت کے سامنے موجود تھی جس کے ایک فلیٹ میں پروفیسر ہنری پولک موجود تھا۔ پروفیسر ہنری بھی تاریخ کا پروفیسر تھا مگر وہ میامی یونیورسٹی چھوڑ چکا تھا۔ آج سے کچھ سال پہلے تک وہ پروفیسر اولیور کے قریبی دوستوں میں شمار ہوتا تھا مگر پچھلے دو سال سے دونوں ایک دوسرے کا چہرہ دیکھنا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ ہنری پولک کے بارے میں انہیں یونیورسٹی کے ہی چند اسٹوڈنٹس نے بتایا تھا۔ اینڈریان نے لیو سے تصدیق کی۔ لیو نے سادہ الفاظ میں جواب دیا۔

''میرا نہیں خیال کہ ہنری پولک کے بارے میں آپ کو بتانا درست تھا۔ ہنری اولیور کی زندگی کی کتاب کا وہ صفحہ ہے جسے اس نے بہت پہلے پھاڑ کر پھینک دیا تھا۔ ہنری نے ہمارا گھر برباد کیا تھا..... اور اپنے بہترین دوست اولیور کو دھوکا دیا تھا۔ اب اس کے پاس ایسی کوئی وجہ نہیں تھی کہ وہ میرے بھائی کو قتل کروا دیتا، نہ ہی پچھلے دو سال سے بھائی

www.pklibrary.com

نے اس کا ذکر کیا ہے اور نہ ہی اس کی طرف سے کوئی ایسی بات ہوئی ہے۔" لیو نوجوان تھا۔ اینڈریان کے مطابق لیو اندازہ نہیں کرسکتا تھا کہ ہنری جیسا چالاک شخص کسی وقت بھی وار کرسکتا ہے۔ اس لیے اس نے ایوا کو اس کے تعاقب میں لگا دیا۔ ایوا بار بار ہنری کے فلیٹ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اسی دوران اس کے موبائل کی بیل بجی۔ اینڈریان کی کال تھی۔

"یس باس!" اس نے ہیلو کے جواب میں کہا۔

"ہنری کا سنبھل کر تعاقب کرنا..... یونیورسٹی انتظامیہ سے جو معلومات ملی ہے اس کے مطابق ہنری نے اولیور پر تحقیق چرانے کا الزام لگایا تھا۔ اگر اولیور کے مضمون میں ہنری کی تحقیق شامل ہے تو پھر تمہیں محتاط رہنا ہوگا۔ وہ چالاک شخص ہے..... ڈرگ وار پر اس کی معلومات سے اندازہ ہوا ہے مجھے۔"

"بے فکر رہیں..... میں محتاط ہوں۔" ایوا کو سمجھ نہیں آرہی تھی کہ ہنری کے تعاقب سے اینڈریان کیا معلوم کرنا چاہتا ہے۔ وہ اسے ویسے ہی پولیس اسٹیشن بلا کر تفتیش کرسکتا تھا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد ایوا کے بالکل سامنے ایک گاڑی آکر رکی۔ ایوا نے غیر ارادی طور پر اس گاڑی کی طرف دیکھا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے شخص نے ماسک پہن رکھا تھا۔ گاڑی سے اتر کر ماسک نیچے کرکے اس شخص نے اردگرد دیکھا۔ ایوا نے حلیہ بدل رکھا تھا۔ اسے پہچاننا مشکل تھا مگر ایوا اس شخص کو پہچان چکی تھی۔ وہ اچھل پڑی۔ وہ شخص مڑ کر ہنری کے فلیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ اس کے جانے کے فوراً بعد ایوا نے اینڈریان کو کال ملانے کے لیے موبائل اٹھایا مگر اس سے پہلے اینڈریان کی کال آگئی۔

"ایوا! جلدی واپس آؤ..... ایک بہت بڑی غلطی ہوئی ہے ہم سے۔"

"کیا؟" اس نے پوچھا۔

"میرے سامنے اس وقت اولیور کا لکھا مضمون موجود ہے۔ اس میں ایک اہم شخصیت کو مس کیا ہے ہم نے..... اوہ میرے خدا۔" اینڈریان کے منہ سے نکلا۔ "قاتل کو ڈھونڈنا اب آسان ہے۔"

"میرے پاس بھی اطلاع ہے ایک۔"

"کیا؟"

"ہنری سے ملنے کوئی آیا ہے۔"

"کون؟" اینڈریان چونک گیا۔ ایوا نے جو نام بتایا، اس کا اینڈریان کو پہلے اندازہ ہو چکا تھا۔

"ابھی ہم اسے گرفتار نہیں کریں گے..... میرے دماغ میں ایک منصوبہ ہے، تم واپس آؤ۔"

"میں آرہی ہوں۔" اس نے کال بند کی اور گاڑی پولیس اسٹیشن کی طرف موڑ دی۔ تقریباً تیس منٹ بعد وہ پولیس اسٹیشن پہنچ چکی تھی۔

☆☆☆

لیو کے سامنے اس وقت ایک مشہور چینل کا رپورٹر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ دونوں لیو کے گھر میں موجود تھے۔ صوفے پر بیٹھے نوجوان لیو کے چہرے پر جوش تھا اور وہ بہت تیزی سے رپورٹر کے سوالات کا جواب دے رہا تھا۔ "میرے بھائی کا کام مکمل کرنے کا اعزاز حاصل ہو رہا ہے مجھے۔"

"کیا میگزین آپ کو اس بات کی اجازت دے گا؟"

"کیوں نہیں..... میری ایڈیٹر سے بات ہو چکی ہے۔ انہوں نے خوشی کا اظہار کیا ہے اس پر۔"

"کیا آپ اتنی بہترین تحقیق کرسکیں گے جتنی آپ کے بھائی نے کی؟"

"کوشش کروں گا۔" وہ مسکرا دیا۔ اس انٹرویو کو کئی لوگ دیکھ رہے تھے۔ ان دیکھنے والوں میں ایوا اور اینڈریان بھی شامل تھے۔ آخری بات سن کر دونوں مسکرا دیے۔ لیو کے اس اعلان اور انٹرویو کے بعد کئی لوگوں نے اس سے رابطہ کیا تھا۔ ان میں زیادہ تعداد اولیور کے دوستوں کی تھی۔ ان کے خیال میں لیو کا یہ قدم جذباتی تھا۔ جس تحقیق اور مضمون کے بعد اس کے بھائی کا قتل ہوا تھا..... اب اسے دوبارہ شروع کرنا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا مگر لیو نے سب کو ایک ہی جواب دیا۔

"میرے بھائی نے یہ کام شروع کیا تھا اور میں اسے ادھورا نہیں چھوڑ سکتا۔" ٹی وی چینل کو دیے جانے والے انٹرویو کے تین دن بعد لیو کو ایک اجنبی نمبر سے کال آئی۔ ہیلو کے جواب میں ایک بھاری آواز سنائی دی۔

"مسٹر لیو....."

"بات کر رہا ہوں۔"

"مجھے تم سے ملنا ہے..... تمہاری تحقیق کے سلسلے میں مدد کرنا چاہتا ہوں تمہاری۔ اولیور نے بھی میری خدمات حاصل کی تھیں..... تم مل سکتے ہو مجھ سے۔" لیو کے لیے یہ کال بہت اہم تھی۔ اس کا چہرہ جوش کی شدت سے سرخ ہو گیا مگر اس نے اپنی آواز پر قابو رکھا۔

"کون ہو تم؟" اس نے محتاط انداز میں پوچھا۔

"یہ جاننا ضروری نہیں..... اتوار کی شام ٹھیک سات بجے کنگ ہوٹل کے سامنے آجانا۔" کال منقطع ہوگئی۔ کال

www.pklibrary.com

کرنے والے کو یقین تھا کہ لیو ضرور آئے گا۔ لیو نے گہری سانس لی۔ اسے اپنے حواس کو قابو کرنے میں وقت لگا تھا۔ آج جمعہ تھا۔ اس کے پاس سوچنے کے لیے صرف کل کا وقت تھا۔ وہ رات اور اس سے اگلا دن اس نے سوچنے میں گزار دیا۔ ہفتے کی رات دس بجے کنگ ہوٹل جانے کا فیصلہ کر کے اس نے دماغ کو آزاد چھوڑا اور سو گیا۔

اگلے دن شام کے ساڑھے چھ بجے وہ اولیور کی گاڑی میں بیٹھا اور کنگ ہوٹل آ گیا۔ ہوٹل میں بیٹھ کر اس نے آدھا گھنٹا انتظار کیا۔ سات بجے دوبارہ اس کے موبائل کی بیل بجی۔ ہیلو کے جواب میں وہی بھاری آواز سنائی دی۔ ''ہوٹل سے باہر آ جاؤ، میں سڑک کی دوسری جانب موجود ہوں۔ اپنی گاڑی پارکنگ سے نکال کر لاؤ اور گاڑی لاک مت کرنا۔'' اس نے ہدایات سن کر گہری سانس لی۔ وہ اٹھا اور پارکنگ کی طرف بڑھا۔ گاڑی باہر لا کر اس نے جیسے ہی اچانک بریک لگائے..... کوئی تیزی سے کار میں داخل ہوا۔ لیو کو اسے پہچاننے میں کوئی مشکل نہیں ہوئی تھی۔

''تم؟'' اس نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''ہاں میں..... گاڑی آگے بڑھاؤ۔'' اس نے اشارہ کیا۔

''مگر.....''

''وقت ضائع مت کرو لیو..... جو کہا ہے وہ کرو۔'' لیو نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ دو کلومیٹر آگے آ کر اس نے گاڑی روکنے کا اشارہ کیا۔

''تمہارے پاس کیا معلومات ہے؟''

''یہ۔'' اس نے جیب سے ریوالور نکالا۔ لیو کا رنگ اڑ گیا۔ اس نے خشک ہوتے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ ''تمہارے بھائی کی تحقیق ہمیشہ ادھوری ہی رہے گی۔'' وہ غرایا۔

''تم مجھے نہیں مار سکتے۔'' لیو نے اطمینان سے جواب دیا۔

''کیوں؟'' اس سے پہلے لیو اس کے 'کیوں' کا جواب دیتا یا وہ گولی چلاتا..... لیو نے کار کا شیشہ نیچے کیا۔

''گولی مت چلانا انتھونی جیمز۔'' اینڈریان کی آواز سنائی دی۔ پولیس نے کار کو چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا۔ انتھونی نے گہری سانس لی۔ وہ پولیس کے نشانے پر تھا۔ چند سیکنڈ کا کھیل تھا۔ اس کی حیرت سے لیو نے فائدہ اٹھایا اور اس کے ریوالور والے ہاتھ پر وار کیا۔ ریوالور اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ انتھونی کا کھیل ختم ہو چکا تھا۔

☆☆☆

پولیس اسٹیشن میں لیو، ہنری پولک، شارلٹ، ایوا اور اینڈریان موجود تھے۔ اینڈریان کی آواز کمرے میں گونج رہی تھی۔ ''پروفیسر اولیور کی تحقیق میں ایک بات واضح لکھی تھی کہ میامی ڈرگ وار میں بہت سے پولیس آفیسرز نے شہرت حاصل کی حالانکہ بہت سے ڈرگ اسمگلر آپس میں لڑائی کی وجہ سے مارے گئے تھے۔ انہی میں ایک پولیس آفیسر جیمز رائے تھا۔ اسے نہ صرف ترقی ملی بلکہ گورنمنٹ کی طرف سے بہت سے انعامات اور اعزازات سے نوازا گیا تھا۔ وہ ایک عام سا پولیس آفیسر تھا جس نے بغیر کسی محنت کے تحقیقوں کی لڑائی کا فائدہ اٹھایا اور اعزاز اپنے نام کیا۔ اس کا اکلوتا بیٹا انتھونی جیمز..... اپنے مرحوم باپ کی عزت کے لیے اولیور سے الجھ پڑا۔ اسے معلوم تھا کہ اولیور اور ہنری کی بہترین تحقیق کی وجہ سے اس کے باپ کی عزت خاک میں مل جائے گی۔ بہت سے لوگ پہلے ان کے خلاف تھے اور گورنمنٹ کے دیے گئے اعزاز سے ان کا خاندان محروم ہو سکتا تھا۔

''اس نے پہلے جوڈی لوکاس کی خدمات حاصل کیں۔ جوڈی اولیور کو مارنے کے بعد غائب ہو گیا۔ میں نے اولیور کے مضمون میں جب جیمز رائے کے بارے میں پڑھا اور تھوڑی سی تحقیق کی تو اس کے بیٹے انتھونی جیمز کا علم ہوا۔ انتھونی نے خود کو شک سے بچانے کے لیے پہلے ہی اس کیس میں خود کو اس طرح ملوث کیا تھا کہ لوگ اسے بے گناہ سمجھیں۔

''ایوا، ہنری کی نگرانی کر رہی تھی جب انتھونی اس سے ملنے پہنچا۔ اسے خبر ہو چکی تھی کہ اصل میں تحقیق میں زیادہ حصہ ہنری کا ہے۔ ہنری نے اس موضوع پر اس سے بات کرنے سے انکار کر دیا اور وہ واپس آ گیا۔

''اگلے دن جب لیو نے اعلان کیا کہ وہ بھائی کا مضمون مکمل کرے گا تو انتھونی ایک بار پھر اپنے اعزاز کو بچانے کے لیے میدان میں اترا۔ لیو کا اعلان کرنا اور ٹی وی پر انٹرویو دینا، یہ سب میرے منصوبے کا حصہ تھا۔ مجھے معلوم تھا انتھونی اسے مارنے آئے گا۔ اس بار جوڈی نہیں تھا۔ اس لیے لیو مجھ سے مشورہ کر کے اس سے ملنے چلا گیا اور انتھونی گرفتار ہو گیا۔''

''صرف اپنے خاندان کی عزت کے لیے انتھونی نے یہ سب کیا؟ حیرت ہے۔'' ہنری نے تبصرہ کیا۔

''وہ آخری شخص ہے اپنے خاندان کا..... اس نے شادی نہیں کی۔ ایک عام سی نوکری کرنے والے انتھونی کے لیے یہ اعزاز ہی سب کچھ تھا۔'' اینڈریان نے جواب دیا تو سب خاموش ہو گئے۔

⌘⌘⌘

www.pklibrary.com

محفلِ شعر و سخن

❁ ناہید یوسف.....اسلام آباد

میں تجھ کو مانگ رہا ہوں قبول کر کہ نہ کر
یہ بات تیری ہری ہے اسے دعا نہ سمجھ

❁ حرا اطہر.....کراچی

اس کا سوچا بھی نہ تھا اب کے جو تنہا گزری
وہ قیامت ہی غنیمت تھی جو یکجا گزری
آج کیا دیکھ کے بھر آئی ہیں تیری آنکھیں
ہم پہ اے دوست یہ ساعت تو ہمیشہ گزری

❁ نازیہ خان.....سرگودھا

مرے ضمیر نے قابیل کو نہیں بخشا
میں کیسے صلح کروں قتل کرنے والوں سے

❁ شوکت علی زخمی.....رحیم یار خان

تیری صورت کو جب سے دیکھا ہے
میری آنکھوں پہ لوگ مرتے ہیں

❁ محمد انور ندیم.....حویلی لکھا، اوکاڑہ

کوئی تو بات ہے اس میں فیض
ہر خوشی جس پہ لٹا دی ہم نے

❁ قاسم علی.....ملتان

میرے مرنے سے کچھ نہیں ہوگا
میرے ہونے سے کچھ ہوا ہے کیا

❁ حاجی محمد زاہد اقبال زرگر.....سکھیکی

کیا کہوں اس سے جو بات سمجھتا ہی نہیں
وہ تو ملنے کو ملاقات سمجھتا ہی نہیں

❁ عبدالجبار رومی انصاری.....بورے والا

خوشبو ہے چاندنی ہے لب جو ہے اور میں
کس نے پناہ رات میں تنہا کیا مجھے

❁ عائشہ احمد.....روہڑی

سفر پیچھے کی جانب ہے قدم آگے ہے میرا
میں بوڑھا ہوتا جاتا ہوں جواں ہونے کی خاطر

❁ ہما بخاری.....سکھر

خود سے ملنے کا ذرا سا بھی روادار نہیں
کیا کروں روز کوئی کام نکل آتا ہے

❁ پرویز چودھری.....لاہور

دو قدم کی رفاقت بہت ہے یہاں
دور تک ساتھ جانا ضروری نہیں

❁ نازش.....فیصل آباد

میں سوچتا ہوں بہت دوسروں کے بارے میں
کبھی کبھی مجھے اپنا خیال آتا ہے

❁ سلطان احمد قائم خانی.....ٹنڈو جان محمد

آجا کہ ابھی ضبط کا موسم نہیں گزرا
آجا کہ پہاڑوں پہ ابھی برف جمی ہے
خوشبو کے جزیروں سے ستاروں کی حدوں تک
اس شہر میں سب کچھ ہے بس اک تیری کمی ہے

❁ امتیاز احمد.....بھالیہ

رگوں میں زہر بھرتے جا رہے ہیں
مرے سب لوگ مرتے جا رہے ہیں

www.pklibrary.com

❁ مہتاب احمد.....حیدرآباد

شہر کی بھیڑ سے خود کو تو بچا لاتا ہوں
گو سلامت مرے اعصاب نہیں آتے ہیں

❁ شاہینہ مہتاب.....چنیوٹ

خواب رخصت ہوئے آنکھوں سے مری
اور پھر سب مرے ارمان گئے

❁ راحیل احمد.....پھلیکی

پاؤں رکھ تو دیا بے دھیانی میں
نہیں مہتاب نہ ہو پانی میں

❁ لبنیٰ وکیل.....کوئٹہ

آج ہم خواب میں مل سکتے ہیں
نیند کرنے کی مشقت کرلو

❁ جنید ملک.....کراچی

ایک موہوم ثقافت کے علمبردارو
ایک بے رحم صداقت کا گناہ گار ہوں میں
ایک خوابیدہ مشیت کے پرستار ہو تم
ایک تابندہ حقیقت کا خریدار ہوں میں

❁ عظیم احمد.....جھنگ سٹی

تم کو اس وقت بھی معلوم نہیں ہے شاید
کہ زمانہ تو بہت دور نکل آیا ہے
آج سلجھائے گی جمہور کی آواز اسے
تم نے تاریخ میں جس بات کو الجھایا ہے

❁ صبا سحر.....کراچی

جہاں سے شاخ ٹوٹی ہے وہیں سے شاخ پھوٹی ہے
نمو کی قوتیں اس زخم کو بھرنے نہیں دیتیں

❁ منیر شگفتہ.....دہاڑی

شبِ وعدہ ابھی تک ختم ہونے میں نہیں آئی
کہ برسوں سے مسلسل ایک آہٹ سن رہا ہوں میں
خدا کا شکر، احساسِ زمیں مرنے نہیں پایا
ستارے چننے نکلا تھا، شرارے چن رہا ہوں میں

❁ ذوہیب ملک.....کراچی

ڈبڈباتی ہوئی آنکھوں سے نہ بہلاؤ مجھے
ٹمٹماتے ہوئے تاروں کے چلن جانتا ہوں

❁ انعم کمال.....حیدرآباد

سائے سمٹیں گے کہ ظلمت پر کوئی آنچ نہ آئے
تیرگی چاہے گی، لیکن نہ اماں پائے گی
سینۂ سنگ کی حدت سے کھلیں گے گلزار
اتنی شدت سے زمانے میں بہار آئے گی

❁ سید شاہ عالم زمرد.....پنڈی

مچل مچل کے ابھرتی ہے جب چراغ کی لَو
میں سوچتا ہوں کہ ان لرزشوں میں تو، تو نہیں

❁ طیب اسد.....ڈیرہ اسماعیل خان

ہزاروں ڈوبتے تھے سہاروں کے سہاروں پر
ہزاروں ڈوبنے والے سہاروں کو بھی لے ڈوبے
بھنور میں ڈوب کر ابھرے شکستہ کشتیوں والے
مگر تقدیر کے مارے کناروں کو بھی لے ڈوبے

❁ سلیم قادر.....میانوالی رانجھا

کبھی کبھی کوئی ایسا مسافر آتا ہے
رستے اپنے آپ سنورتے جاتے ہیں

❁ نادیہ ریاض.....نواب شاہ

مرے خطوط پہ جمنے لگی ہے گردِ حیات
اداس نقش گرو، اب مجھے نکھارو بھی

❁ شاہد علی.....فیصل آباد

تلاشِ حسن کہاں لے چلی، خدا جانے
امنگ تھی کہ فقط زندگی کو اپنائیں

❁ طیب شاہین.....کھیالہ شیخاں

شکستہ پر ہے ابھی فلسفہ اسیروں کا
قفس کو توڑ کے نکلے تو زیرِ دام آئے
سمجھ میں آ نہ سکا یہ طلسمِ لیل و نہار
کہ دن طلوع نہ ہو پائے اور شام آئے

❁ سائرہ نواب.....پشاور

یہ تیری چاپ ہے یا میرے دل کی دھڑکن ہے
بہت قریب سے آئی ہے دور کی آواز

❁ نعیم احمد.....بہاولپور

اجل کی رہزنی سے ہر طرف طاری ہیں سناٹے
سرودِ زندگی کو نیند سے چونکانے آئے ہیں

❁ صبا حمید.....ٹنڈوالہیار

جو زہر پی چکا ہوں تمہی نے مجھے دیا
اب تم تو زندگی کی دعائیں مجھے نہ دو
ایسا نہ ہو کبھی کہ پلٹ کر نہ آسکوں
ہر بار دور جاکے صدائیں مجھے نہ دو

❁ عاصم خان.....کراچی

میخانے کا پندار گیا پیمانے کا معیار کہاں
کل تک مے بھی کھلتی تھی اب زہر گوارا کیسا ہے
وہ پاس نہیں احساس تو ہے اک یاد تو ہے اک آس تو ہے
دریائے جدائی میں دیکھو تنکے کا سہارا کیسا ہے

www.pklibrary.com

❄ عمران شیروانی......لاہور
جانے کس زعم میں مقتل کو سجائے تم ہو
مجھ کو کیا قتل کرو گے مرے سائے تم ہو
❄ ماہین فاطمہ......اوکاڑہ
ہر چہرہ دو ٹکڑوں میں تقسیم ہوا
اب کے دلوں میں ایسا بال پڑا لوگو
❄ حنظلہ خان......گوادر
اس کو دیکھنا دیکھتے رہنا کافی تھا
لوٹ آیا ہوں دل میں لے کر دل کی بات
❄ محمد الیاس......لسبیلہ بلوچستان
اب تو مجھ کو بھی ندامت ہے وفا پر اپنی
مختلف کتنا زمانے سے چلن میرا تھا
❄ مدحت......کراچی
ڈھونڈتا پھرتا ہوں لوگوں میں شباہت اس کی
کہ وہ خوابوں میں بھی لگتی ہے خیالوں جیسی
❄ محمد جاوید......تحصیل علی پور
اب دیکھ یہ حسرت بھری اجڑی ہوئی آنکھیں
دنیا، ترے بارے میں مرے خواب بہت تھے
❄ ولید رضا......ساہیوال
مجھ کو بھی تیری اداسی دل ویراں سی لگی
تو بھی اے شہر جدائی مرے قابل ٹھہرا
❄ نوروز خان......کوئٹہ
تیز سورج میں چلے آتے ہیں میری جانب
دوستوں نے مجھے صحرا کا شجر جانا ہے
❄ محمد طلحہٰ......کراچی
ان صورتوں کو ترسے گی چشمِ جہاں کہ آج
کمیاب ہیں تو کل ہمیں نایاب دیکھنا
❄ شگفتہ نور......ٹنڈو آدم
یارو مجھے مصلوب کرو تم کہ مرے بعد
شاید کہ تمہارا قد و قامت نکل آئے
❄ ناصر حسین......سکھر
ایک مرکز ہو تو بچتا ہے تجسس، لیکن
ان گنت دائروں میں گھومتی رہتی ہے زمیں

❄ میمونہ عزیز......کراچی
کبھی قریب سے گزرے، بدن چرائے ہوئے
تو دور تک نظر آتے رہے ہمیں
❄ دانش عمیر......کراچی
میرے بدل جانے پر تم کو حیرت کیوں ہے
میں نے یہ بہروپ تمہارے سنگ بھرا ہے
❄ قاسم مجید......لاڑکانہ
اُن کا آنا حشر سے کچھ کم نہ تھا
اور جب پلٹے قیامت ڈھا گئے
❄ اسما خان......مری
اڑتا پھرتا ہوں اب غبار سا میں
خود کو سمجھا تھا آسماں ہوں میں
❄ بینش......گھوٹکی
گرم رکھتا ہے لہو کو خواہشوں کا سلسلہ
دھوپ کے صحرا سے لے کر سایۂ اشجار تک
❄ دیدار علی......چکوال
میں مہکتا ہوں تری خوشبو سے
خود کو تُو بھول گئی ہے مجھ میں
کتنا شفاف تھا منظر میرا
کس قدر دھول اڑی ہے مجھ میں
❄ مسکان......اسلام آباد
اے حسن خود پرست ذرا سوچ تو سہی
مہر و وفا سے تجھ کو ملے دیر ہوگئی
❄ سحر علی......گوجرانوالہ
سبز جنگل میں پرندوں کے ٹھکانوں میں کہیں
وقت چھوڑ آیا ہمیں گزرے زمانوں میں کہیں
❄ ثنا صادق......کراچی
کرتا ہوں بہت یاد مگر آتے نہیں یاد
کچھ حرف مرے دل میں کھٹکتے ہیں ابھی تک
❄ ہمایوں خان......چنیوٹ
غم کی بارش کیسے ٹوٹ کے برسی ہے
دل کے دشت میں ہر جانب ہریالی ہے

کوپن برائے شمارہ جولائی 2021

مُحفلِ شعر و سُخن

نام: --

پتا: --

www.pklibrary.com

چشم دید

عسیوق بخاری

جرائم کی دنیا بھی کتنی عجیب ہوتی ہے... جرم کرنے والا اتنا خطاوار نہیں جتنا جرم کرتے دیکھنے والا ہوتا ہے... ایک ختم نہ ہونے والی دشمنی کا آغاز... اتنا سنگین... کہ محض دیکھ لیے جانے پر موت اس کا مقدر بنادی جاتی ہے۔

ایک بے گناہ مگر..... چشم دید گواہ کا سبق آموز ماجرا

دسمبر کی ٹھٹھرتی اندھیری رات، گرجتے بادل، کڑکتی بجلی اور لمحہ بہ لمحہ تیز ہوتی بارش۔ ان سب سے ڈری ہوئی نینسی چھتری تھامے تیز تیز چلی جارہی تھی۔ آفس سے نکلتے نکلتے بارش شروع ہوگئی تھی۔ ٹیکسی بھی نہ مل سکی تھی۔ اپنے فلیٹ تک پہنچنے کے لیے اسے کافی فاصلہ طے کرنا تھا۔ وہ خود کو کوس رہی تھی کہ وہ وقت پر آفس سے کیوں نہ نکلی۔ آدھا فاصلہ تو طے کرچکی تھی کہ اچانک اس نے دوڑتے قدموں کی آواز سنی۔ چند ہی لمحوں میں ایک آدمی تیز دوڑتا

www.pklibrary.com

ہوا سامنے والی گلی سے نکلا۔ وہ بار بار پیچھے کی طرف دیکھتا ہوا بھاگ رہا تھا کہ اس کا پاؤں کیچڑ میں پھسلا اور وہ گر گیا۔ اس کے گرتے ہی ایک اور شخص اسی گلی سے نکلا اور اس کے قریب پہنچ کر بڑی بے رحمی سے اس پر بے تحاشا فائر کیے۔ گرنے والا شخص تڑپ تڑپ کر مر گیا۔ اس کے ساکت ہوتے ہی قاتل نے ایک جانب دیکھتے ہوئے اشارہ کیا۔ اس کے اشارہ کرتے ہی تین آدمی تابوت لیے آئے۔ مقتول کو اس میں ڈالا اور اٹھا کر گاڑی میں ڈالنے لگے جو اسی وقت وہاں آ کر رکی تھی۔

''سر! کہاں پھینکیں اس لاش کو؟'' ان میں سے ایک نے پوچھا۔

''بہت دور کسی ویرانے میں پھینک دو۔ اتنی دور کہ اس کا نام و نشان نہ ملے..... اور ہاں، اگر تمہیں کوئی یہ کام کرتے دیکھ لے تو اسے چھوڑنے کی غلطی مت کرنا۔ اسے بھی اڑا دینا۔ میں کسی چشم دید گواہ کی مصیبت نہیں جھیلنا چاہتا۔'' بڑی بے رحمی سے بات کرتے ہوئے قاتل نے پستول بھی اسے تھما دیا تاکہ اسے بھی غائب کیا جا سکے۔

بات ختم کر کے قاتل نے ماحول کا جائزہ لینے کے لیے اردگرد دیکھا تو اس کی نظر کچھ فاصلے پر کھڑی نینسی پر پڑی۔ وہ چونک سا گیا۔ ادھر قتل کے واقعے کی چشم دید گواہ نینسی کا گویا سانس رکا ہوا تھا۔ کڑکتی بجلی والی خوفناک رات میں ایک بھیانک منظر نے اسے دہلا کر رکھ دیا تھا۔ وہ بھاگنا چاہ رہی تھی لیکن اس سے تو خوف کے مارے ہلا بھی نہیں جا رہا تھا۔ شدید سردی میں بھی وہ پسینے میں بھیگ گئی۔ قاتل بڑے غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے موبائل فون کی ٹارچ آن کی ہوئی تھی۔ قاتل نے چند سیکنڈ اسے دیکھا اور اس کی جانب تیزی سے بڑھا۔ ساتھ ہی اس نے اپنے ساتھیوں کو بھی کوئی اشارہ کیا۔ پہلے تو نینسی اسے خوفزدہ نظروں سے دیکھتی رہی پھر اسے جان بچانے کی خواہش نے گویا بیدار سا کر دیا۔ چھتری وہیں پھینک کر وہ سرپٹ بھاگی۔ قاتل اور اس کے ساتھی اس کے پیچھے تھے۔ نینسی کی خوش قسمتی تھی کہ سڑک کے ساتھ بہت سی گلیاں تھیں۔ اس نے مختلف گلیوں میں بھاگتے ہوئے تعاقب کرنے والوں سے پیچھا چھڑا لیا۔ وہ ہانپتے کانپتے فلیٹ پر پہنچی اور پھر ڈر کے مارے ساری رات سوتے جاگتے گزار دی۔

اگلے روز اس کا آفس جانے کا بالکل دل نہیں کر رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا وہ جونہی گھر سے نکلے گی، قاتل اس کے پیچھے لگ جائیں گے۔ انتہائی تنگ دستی میں زندگی بسر کرنے والی نینسی کو چند ماہ پہلے یہ معمولی سی تنخواہ والی جاب ملی تھی۔ بس گزارہ کرتے ہوئے وہ وقت کاٹ رہی تھی۔ اس معمولی سی تنخواہ میں سے بھی اسے کچھ رقم اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کو بھیجنا پڑتی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ ایک ملازمت اور بھی کر لے تاکہ کچھ آسانی ہو جائے۔ اب حالت یہ ہو گئی تھی کہ قتل کا واقعہ اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے بعد وہ یہ ملازمت اور فلیٹ چھوڑنے کا سوچنے لگی تھی۔ دو روز تک ڈرنے اور آفس نہ جانے کے بعد تیسرے دن نینسی کئی واہمے اور خدشے لیے آفس چلی گئی۔ دوپہر تک اس کا ڈر کافی حد تک دور ہو گیا لیکن لنچ بریک میں یہ اطمینان برقرار نہ رہ سکا۔ وہ جونہی کینٹین میں داخل ہوئی تو اسے سامنے ہی ایک شخص ٹیبل پر بیٹھا نظر آیا جس کے چہرے پر زخم کے نشان تھے۔ کرخت سی صورت والے نے نینسی کے داخل ہوتے ہی اسے غور سے دیکھا اور سیل فون اٹھا کر کسی سے بات کرنے لگا۔ بات کرنے کے دوران وہ مسلسل نینسی کو گھور رہا تھا۔ وہ بے چاری کچھ پل ہی وہاں ٹھہر سکی اور خوفزدہ ہو کر واپس آ گئی۔ آفس بند ہونے تک وہ..... ڈرتی رہی۔ آفس بند ہوتے ہی وہ ساتھیوں کے ہمراہ تیزی سے باہر نکلی اور تقریباً بھاگتے ہوئے ٹیکسی میں بیٹھ کر اسے فلیٹ کا ایڈریس بتایا۔ اس دوران بھی اسے مسلسل خطرے کا احساس ہوتا رہا۔

ٹیکسی فلیٹ کے سامنے رکی۔ نینسی نے جب اتر کر ڈرائیور کو کرایہ تھمایا تو ڈرائیور نے پیسے پکڑتے ہوئے بڑے غور سے اس کے فلیٹ کی طرف دیکھا اور پھر نینسی کو اس طرح دیکھا کہ ڈر سے اس کی سانسیں اٹکنے لگیں۔

ٹیکسی چلی گئی لیکن وہ وہیں کھڑی لرز رہی تھی۔ یقین ہو گیا تھا کہ وہ ٹیکسی والا مجرموں کا ساتھی تھا جو اس کے ٹھکانے کو دیکھ چکا ہے۔ نینسی نے فوری طور پر پولیس سے مدد لینے کا فیصلہ کیا۔ وہ فلیٹ جانے کے بجائے سڑک پر آ گئی اور ٹیکسی کے لیے اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ اچانک اس نے ایک ایسا نظارہ دیکھا جو ناقابلِ یقین اور شدید خوفزدہ کر دینے والا تھا۔

نینسی پلکیں جھپکائے بغیر پھٹی پھٹی نظروں سے بھیڑ میں ایک شخص کو دیکھ رہی تھی۔ یہ وہی مقتول تھا جسے نینسی نے اپنی آنکھوں کے سامنے قتل ہوتے دیکھا تھا۔

www.pklibrary.com

وہ ہونٹوں پر بڑی عجیب سی ..... مسکراہٹ سجائے اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ مجرموں کے خوف سے چھٹکارا پانے کے لیے پولیس کے پاس جانے کا سوچنے والی بھوت کے ڈر سے سب کچھ بھول کر الٹے قدموں فلیٹ کی جانب بھاگی۔ فلیٹ میں پہنچ کر اس نے تیزی سے دروازہ بند کیا۔ اپنے کمرے میں داخل ہوتے ہی اسے ایک اور شدید جھٹکا لگا۔

نینسی کے کمرے میں ایک شخص بڑے آرام سے کرسی پر بیٹھا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ نینسی نے دیکھا کہ کھڑکی کا شیشہ ٹوٹا ہوا ہے۔ کھڑکی کے راستے اندر آنے والا بڑے اطمینان سے پستول تھامے بیٹھا تھا۔ تین روز کی ڈری سہمی، بھوت، ٹیکسی ڈرائیور سے خوفزدہ نینسی اسے دیکھ کر گویا پاگل سی ہوگئی۔

اپنا پرس جھنجلاہٹ میں اس نے دیوار پر دے مارا اور چیختے ہوئے بولی۔ ''کیا قصور ہے میرا؟ کیا بگاڑا ہے میں نے تمہارا؟ قتل تم نے کیا، لاش تم نے غائب کی۔ بُرے تم ہو اور مصیبت میں، میں پھنس گئی۔ میرا گناہ یہی ہے نا کہ میں نے تم لوگوں کو ایک جیتے جاگتے انسان کو لاش میں تبدیل کرتے دیکھ لیا ہے؟ مجرم تم ہو گھٹیا آدمی اور ستایا مجھے جا رہا ہے۔ آخر کیوں میرے پیچھے پڑ گئے ہو؟'' ہذیانی انداز میں چیختے ہوئے نینسی رو دی۔

اس شخص نے پوری بات سنی اور اٹھ کر اس کی جانب بڑھا۔ قریب پہنچ کر بولا۔ ''ہاں تو میڈم چشم دید گواہ! کیسا محسوس کر رہی ہو؟'' نینسی جواب میں کچھ بھی نہ بول پائی۔ وہ بس اسے دیکھے جا رہی تھی۔

''تم نے ہمیں قتل کرتے دیکھا ہے۔ ہمارے جرم کی گواہ صرف اور صرف تم ہو۔ تمہیں ختم کر دیا جائے تو ہماری ساری پریشانی ختم ہو جائے گی۔ کیوں مس نینسی! میں نے ٹھیک کہا نا؟'' پستول والے نے بات مکمل کر کے اس کا نام بھی لیا تو وہ چونک پڑی۔ یقیناً وہ اس کے بارے میں پوری معلومات حاصل کر چکے تھے۔

''دیکھو، میں کسی سے کچھ نہیں کہوں گی۔ پلیز! میری جان بخش دو۔'' نینسی نے التجا کی۔ ابھی اس کی بات مکمل ہوئی تھی کہ کمرے میں وہی شخص داخل ہوا جسے نینسی نے قتل ہوتے اور کچھ دیر پہلے سڑک پر دیکھا تھا۔ ایک طرف قاتل، دوسری طرف مقتول کا بھوت۔ دونوں نینسی کو لرزا رہے تھے۔ وہ ڈر کے مارے رو بھی نہیں پا رہی تھی۔ اس کے ہونٹ لرز رہے تھے اور وہ کانپتے وجود کے ساتھ

چند پندِ سود مند

☆ دنیا میں سب سے زیادہ مطمئن وہ لوگ ہیں جنہیں اپنے معاملات اللہ تعالیٰ کے سپرد کرنے کی عادت ہو۔

☆ اپنے اردگرد اچھے اعمال کے خوب صورت چراغ جلاتے چلو تاکہ موت کے راستوں سے گزرتے وقت تاریکی کا احساس نہ ہو۔

☆ مشکل ہمیشہ بہترین لوگوں کے حصے میں آتی ہے کیونکہ وہ اس کو بہترین طریقے سے انجام دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

☆ جب انسان ٹوٹ کر چکنا چُور ہو جاتا ہے تو خالی ہاتھوں میں اپنی کرچیاں سمیٹ کر رب کی بارگاہ میں حاضر ہوتا ہے۔ وہ پاک پروردگار ایسے سمیٹتا ہے جیسے انسان ٹوٹا ہی نہیں تھا۔ بے شک اللہ عظیم ہے۔

(مرسلہ: وزیر محمد خان، بٹل ہزارہ)

ذرا سوچیے

☆ جب آپ کسی کی اولاد کی تکلیف پر اپنی اولاد کی طرح غم کھاتے ہیں تو آپ سے اولاد کا غم ہٹا دیا جاتا ہے کہ آپ نے اپنے حصے کا غم دوسرے کی اولاد پر کھا لیا ہے۔ یوں آپ کی اولاد غم سے نجات پا جاتی ہے۔

☆ جب آپ کسی کے بوڑھے باپ کے لیے اپنی سیٹ سے کھڑے ہوتے ہیں تو آپ کے باپ کے احترام میں کھڑا ہونے والا بھی اسی بس میں سوار کر دیا جاتا ہے۔

☆ جب آپ کسی کی ماں، بہن اور بیٹی کی طرف اٹھنے والی غلط نگاہ پھیر لیتے ہیں تو آپ کی ماں، بہن اور بیٹی کے گرد وقار کا ہیولا بنا دیا جاتا ہے جس کی طرف اٹھنے والی ہر غلط نگاہ جھکنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔

(مرسلہ: محمد انور ندیم، حویلی لکھا، اوکاڑہ)

www.pklibrary.com

بھوت کو دیکھ رہی تھی۔ قریب تھا کہ وہ گر جاتی کہ بھوت آگے بڑھا اور بولا۔ ''بس..... اب ڈرنا بند کرو۔ میں بھوت نہیں، زندہ انسان ہوں۔'' ساتھ ہی وہ اور پستول والا دونوں ہنسنے لگے۔ نینسی حیران پریشان سی ان کو دیکھ رہی تھی۔

پستول والا دوبارہ کرسی پر جا بیٹھا اور نینسی کو بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ ڈرتے ڈرتے بیٹھ گئی۔ ''میرا نام البرٹ ہے۔ میں چھوٹی موٹی فلمیں بناتا ہوں۔ میری کوشش ہوتی ہے کہ میں حقیقی انداز میں حقیقت سے قریب ترین سین فلماؤں۔ چہرے پر حقیقی تاثرات لانے کے لیے میں اپنے ساتھ کام کرنے والے فنکاروں پر بڑی محنت کرتا ہوں۔ اس رات جب تم نے ہمیں دیکھا تو ہم.....''

اس نے نینسی کو غور سے دیکھتے ہوئے بات ادھوری چھوڑ دی اور کہا۔ ''پہلے تم پانی پی لو، بلکہ ٹھہرو میں لاتا ہوں۔'' کہتے ہوئے اس نے کچن سے نینسی کو پانی لاکر دیا اور بڑے دوستانہ انداز میں سوری کہتے ہوئے تسلی دی۔ ''پلیز! معاف کرنا۔ میں تمہیں ساری تفصیل بتاتا ہوں۔ یہ جسے تم بھوت سمجھ رہی ہو، یہ میرا دوست اور اداکار جمی ہے۔ یہ میرے ساتھ کام کرتا ہے۔ اس رات جب تم نے ہمیں دیکھا تو ہم بارش میں قتل کا ایک سین فلمارہے تھے۔ اسی دوران میری تم پر نظر پڑی۔ میں نے تمہیں بتایا نا کہ میں تاثرات کے حقیقت کے قریب ہونے کو غیر معمولی اہمیت دیتا ہوں۔ تمہیں دیکھا تو تمہارے چہرے کے تاثرات دیکھ کر بجلی کے کوندے کی طرح ایک آئیڈیا میرے ذہن میں آیا۔ میں تمہاری طرف بڑھا۔ ساتھ ہی میں نے اپنے لوگوں کو یہ سین ریکارڈ کرنے کا کہا۔ ہم بارش میں قتل کا سین بنا چکے تھے۔ جب تمہاری مووی بنائی اور دیکھی تو کافی اچھی لگی۔ ہم نے سوچا کہ قتل کے سین اور تمہارے اصلی گھبرائے ہوئے چہرے، ڈر کے مارے بھاگ دوڑ اور بھوت دکھا کر ایک ڈراؤنی پُراسرار فلم بنائی جائے۔ اس آئیڈیے پر عمل کرتے ہوئے ہم نے تھوڑی سی فلم تمہاری اجازت کے بغیر بنالی ہے۔ ہم نے تمہارے بارے میں کچھ معلومات لے لی تھیں کہ تمہارا نام کیا ہے؟ کہاں سے تعلق ہے؟ معاشی حیثیت کیسی ہے؟ وغیرہ..... کینٹین میں جس شخص کو دیکھ کر تم ڈر گئی تھیں وہ ایک اداکار تھا اور ٹیکسی ڈرائیور کے روپ میں ہمارا ہی آدمی تھا۔ یہ تمام سین فلمائے گئے ہیں اور ایک سین تو ابھی ابھی تمہارے کمرے میں بنا ہے جو میری، تمہاری اور جمی کی موجودگی میں مکمل ہوا ہے۔ آجاؤ تم بھی..... اب اگلا کام مس نینسی کی اجازت سے ہی ہوگا۔'' البرٹ نے ساری تفصیل بتا کر ٹوٹی کھڑکی میں سے جھانکتے ہوئے کیمرا اٹھائے اپنے ساتھیوں کو اندر آنے کا کہا۔ وہ بھی کمرے میں آگئے۔

''دیکھو نینسی! اگر ہم پہلے تمہیں بتا دیتے تو ہم نے جو حقیقی تاثرات کے ساتھ چند سین بنائے ہیں، وہ نہ بنا پاتے۔ پلیز! ہمیں معاف کردو۔ ہم تمہیں تمہارے کام کا پورا معاوضہ دیں گے۔ ہاں بتاؤ! اب باقی کام کب شروع کریں؟'' اب کی بار بات جمی نے کی تھی۔

نینسی نے پہلے تو دونوں کو گھورا پھر ناراض سے لہجے میں بولی۔ ''تم لوگوں نے مجھے خوفزدہ کیا، خوب ڈرایا۔ مجھ سے پوچھے بغیر فلم بناتے رہے۔ اب کیا تمہیں یقین ہے کہ میں تمہارے ساتھ کام کروں گی؟''

البرٹ اٹھا۔ نینسی کے پاس آیا اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے گویا سمجھاتے ہوئے بولا۔ ''تم ایک معمولی سی تنخواہ پر معمولی سی ملازمت کرتی ہو۔ جب میں تمہیں، تمہارے بغیر اجازت کے کام کا معاوضہ اداکروں گا تو تم بخوشی اگلا کام کرنے پر رضامند ہوجاؤ گی۔'' البرٹ نے رقم بتائی تو نینسی کا چہرہ حیرت آمیز خوشی سے کھل گیا۔ خوف تو پہلے ہی دور ہو چکا تھا، اب ناراضگی بھی پل بھر میں ختم ہوگئی۔

''کہانی کیا ہے؟'' نینسی نے پوچھا۔

''ایک مظلوم انسان جو قتل ہوجاتا ہے، اس کا بھوت انصاف کے لیے لوگوں کو پاس آتا ہے لیکن کوئی اسے دیکھ اور سن نہیں پاتا پھر وہ اچانک ایک معصوم سیدھی سادی لڑکی جو اس کے قتل کی چشم دید گواہ بھی ہے، کو نظر آنے لگتا ہے۔ وہ اسے دیکھ اور سن سکتی ہے پھر وہ دونوں مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچانے کے لیے مل کر.....'' البرٹ فلم کی کہانی بتانے لگا۔ نینسی نے اطمینان سے کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے پوری توجہ اس کی طرف مبذول کردی۔

اندھیری، ڈراؤنی، کڑکتی بجلی والی خوفناک رات کے ایک بھیانک واقعے نے غریب نینسی کی زندگی کو روشن، گلیمرس اور مستقبل کو خوب صورت کردیا تھا۔

✖✖✖

www.pklibrary.com

تنزیلہ راستے میں دکھائی دے گئی تھی۔

جنید لپک کر اس کے پاس پہنچ گیا۔ ”ارے لڑکی! کہاں غائب ہو گئی تھیں؟“

”ارے میں تمہارے بھوت سے بچ کر کہاں جا سکتی ہوں؟“ تنزیلہ مسکرا کر بولی۔ اس کے ہاتھ میں ایک بڑا سا شاپر تھا۔ اس نے وہ شاپر جنید کی طرف بڑھا دیا۔ ”یہ لو۔ اب کچھ دیر تم اٹھاؤ۔“

”کیا مذاق ہے؟“ جنید نے کہا۔ اس نے شاپر لے لیا تھا۔ ”کیا ہے یہ سب؟“

”یار! بتایا تو تھا کہ کزن کی شادی ہے۔ اسی لیے تم سے مل نہیں سکی اور یونیورسٹی بھی نہیں آ سکی۔ اب شاپنگ کرتی پھر رہی ہوں۔“

”یہ احساس کیے بغیر کہ میرا کیا حال ہوا ہوگا؟“

”نہیں نہیں، احساس تو تھا کہ تم اب تک تین چار بار خودکشی کر چکے ہو گے۔“ تنزیلہ ہنس کر بولی۔

”بکواس مت کرو۔ چلو کہیں چل کر بیٹھتے ہیں۔“ جنید نے کہا۔

مسئلہ چھوٹا ہو یا بڑا... اگر فیصلہ مناسب ہو جائے تو بہ آسانی حل نکالا جا سکتا ہے مگر... بگاڑ پیدا کرنے والے کب اتنی آسانی سے حل کو تسلیم کرتے ہیں لہٰذا... اس طرح تو ہوتا ہے... اس طرح کے کاموں میں والا معاملہ درپیش ہو ہی جاتا ہے۔

ایک معمولی سی بات کو بڑھاوا دینے والوں کا قصہ

مناسب فیصلہ

منظر امام

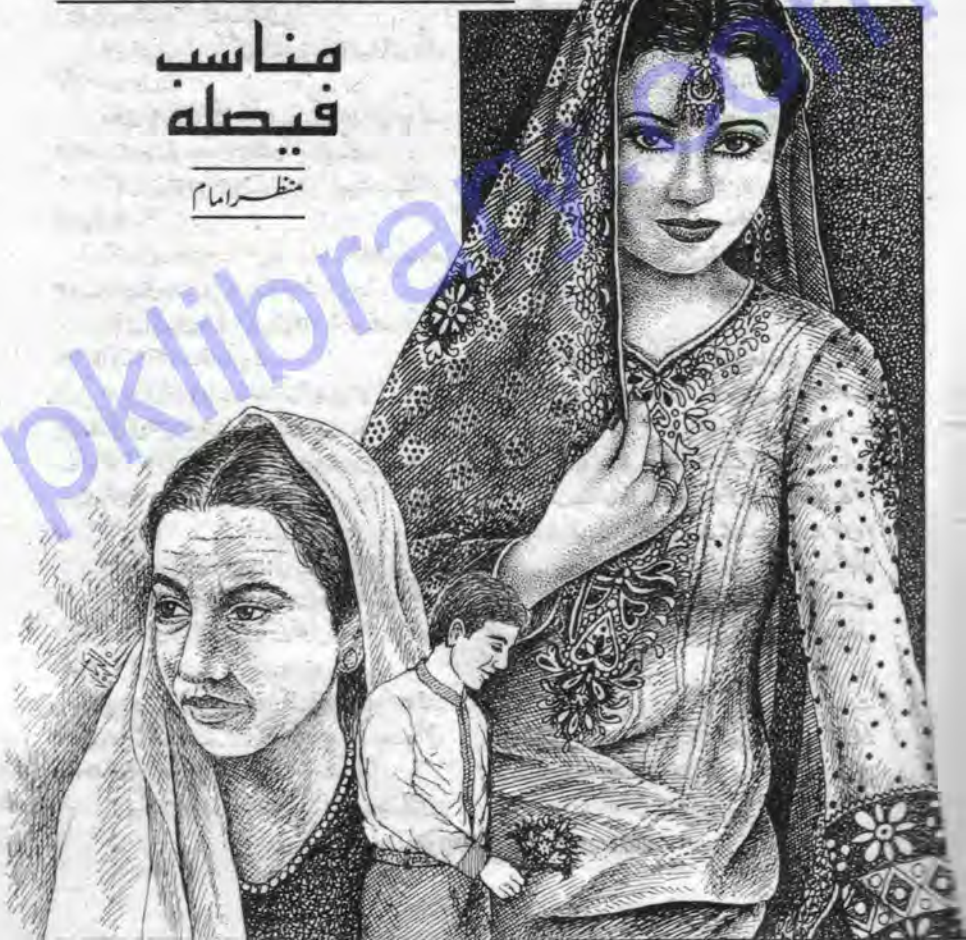

www.pklibrary.com

"ہاں چلو، سپنا میں چل کر بیٹھتے ہیں۔"

سپنا ریسٹورنٹ قریب ہی تھا۔ یہ دونوں اکثر وہیں چلے جایا کرتے تھے۔ چلتے چلتے تنزیلہ نے اچانک جنید کے بالوں کو چھیڑ دیا۔ یہ اس کی پرانی عادت تھی۔

جنید بدک گیا۔ "یہ کیا کرتی ہو، لوگ کیا کہیں گے؟"

"کہنے دو۔ ہم نے کب کسی کی پروا کی ہے؟"

جنید کے بال کتنے خوبصورت تھے۔ ہلکے گھنگرالے، گہرے سیاہ، جن کی ایک لٹ اس کے کشادہ ماتھے پر بکھری رہتی۔ تنزیلہ اس کے بالوں کو چھیڑ دیا کرتی۔ وہ ناراضگی کا اظہار کرتا۔ "یار! یہ تم کیا کرتی ہو؟"

"اچھے لگتے ہیں نا۔" وہ ہنس کر کہتی۔

"اگر اچھے لگتے ہیں تو ان کو بگاڑ کیوں رہی ہو؟"

"خوش قسمت ہو تم کہ میں تمہارے بالوں کو ہاتھ لگا لیتی ہوں، ورنہ بے چارے میرے کئی عاشق تو اسی حسرت میں رہتے ہیں۔ جلتے اور کڑھتے رہتے ہیں۔"

جنید اس کی زلفوں کو بھی چھیڑ دیتا۔ "خوب! میں واقعی خوش قسمت ہوں۔"

دونوں پھر ہنسنے لگتے، مسکرانے لگتے اور دن اچانک خوبصورت ہو جاتے۔ دونوں سپنا میں آ کر بیٹھ گئے۔

"ہاں اب بتاؤ۔" جنید نے پوچھا۔ "کب تک چلے گا یہ شادی کا ہنگامہ؟"

"بس ایک ہفتہ اور۔" تنزیلہ نے کہا۔ "شادی کے بعد عروسہ بحرین چلی جائے گی، اس کے بعد میں آزاد۔"

دونوں ایک ہی کالج، ایک ہی کلاس میں تھے۔ ان کی دلچسپی کا ایک ہی سبجیکٹ تھا، نفسیات۔

اور وہ بھی طبی نفسیات۔ حالانکہ تنزیلہ کی خواہش ادراکی نفسیات کی تھی لیکن جنید اسے اپنے شعبے میں لے آیا تھا۔ اس نے کہا تھا۔ "جانتی ہو کہ میں ایسا کیوں چاہتا ہوں کہ تم کلاس روم میں بھی میرے ساتھ رہو؟"

"تم بتاؤ!"

"تاکہ تم ہر وقت میری نگاہوں کے سامنے رہو۔"

تنزیلہ مسکرا دیتی۔ اس کی مسکراہٹ بہت غضب کی تھی۔ ایسی مسکراہٹ جو اس کے چہرے کے نقوش کو اور بھی دل آویز کر دیتی۔

پورا کالج ان کی محبت سے واقف تھا۔ جنید کہا کرتا تھا۔ "تم نہ مانو مگر حقیقت ہے، عشق انسان کی ضرورت ہے۔ یہ عشق ہی ہوتا ہے جو انسان کو حیوان سے الگ کر دیتا ہے۔"

تنزیلہ چھیڑا کرتی۔ "فرہاد صاحب! کیا آپ جانتے ہیں کہ غالب نے کیا کہا تھا..... کہتے ہیں جس کو عشق، خلل ہے دماغ کا۔"

"وہ غالب کے لیے ہوگا۔ میرے لیے تو میری زندگی ہے۔"

دونوں کا تعلق عام گھرانے سے تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ دونوں بہت امیر گھرانوں سے تعلق رکھتے ہوں۔ بس سفید پوش تھے۔ دونوں کے گھروں میں ایک ایک کی کمی تھی۔

جنید کی والدہ کا انتقال ہو چکا تھا بہت پہلے جبکہ تنزیلہ باپ کی شفقت سے محروم تھی۔

جنید کبھی کبھی تنزیلہ کے گھر چلا جاتا تو تنزیلہ کی ماں بہت پیار سے جنید کا استقبال کرتی۔ جنید کی پسند کے کھانے تیار کرتی۔

جنید کا اس کے گھر میں آنا جانا بھی تھا۔ شاید تنزیلہ کی ماں کو احساس ہو گیا تھا کہ یہ دونوں ایک دوسرے کے ہو چکے ہیں جبکہ جنید نے بھی اپنے ابو، ہاشم صاحب کو تنزیلہ کے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا۔

ہاشم صاحب بہت عرصے سے ملک سے باہر تھے۔ وہ ایک انجینئر تھے۔ بیوی کی موت کے بعد انہوں نے اپنے آپ کو اپنے بیٹے جنید کے لیے وقف کر دیا تھا۔

پھر جب جنید جوان ہوا، اس نے کالج جانا شروع کر دیا تو ہاشم صاحب کو ایک بار پھر باہر کی آفر ہوئی۔ جنید خود کو سنبھالنے کے قابل ہو چکا تھا۔

جانے سے پہلے ہاشم صاحب نے جنید سے کہا۔ "دیکھو بیٹا! زندگی اسی کا نام ہے۔ میں اپنے حصے کی اننگ کھیل چکا ہوں۔ اب میرے لیے اس کے علاوہ کچھ نہیں رہ گیا کہ تمہاری زندگی بہتر بنا سکوں۔"

"بابا! آپ نے تو زندگی بہتر بنا دی ہے، اب کیا چاہیے؟"

"مجھے بس تمہاری پُرسکون زندگی چاہیے۔" ہاشم صاحب کہا کرتے۔

"آپ ساتھ رہیں گے تو ہو ہی جائے گی۔"

"نہیں بیٹا! کچھ دنوں کے لیے مجھے باہر جانا ہے۔" ہاشم صاحب نے کہا۔ "تاکہ میں تمہارے لیے راستے ہموار کر سکوں۔ یہاں جو کچھ بھی ہے، وہ بہت بے رحم ہے۔ کوئی ساتھ نہیں دیتا، چاہے وہ کوئی بھی ہو..... لیکن جب بینک میں اکاؤنٹ ہو اور اس میں رقم ہو تو پھر بہت سی پریشانیاں کترا کر نکل جاتی ہیں۔"

"یہ تو ہے۔"

"بس تم آرام سے اپنی تعلیم مکمل کرو اور اس کے بعد زندگی کی دوسری راہ پر قدم رکھ دینا۔"

"وہ دوسری راہ کون سی ہے، بابا!"

www.pklibrary.com

''ارے بھائی! شادی کی راہ، محبت کی راہ۔ وہ بھی تو ضروری ہے۔''

دونوں باپ بیٹے کے درمیان ایسا ہی رشتہ تھا۔ دوستی کا، بے تکلفی کا۔

جنید نے ہاشم صاحب کو نہیں بتایا کہ بابا میں تو پہلے ہی محبت کی راہ پر چل پڑا ہوں۔ آپ جب واپس آئیں گے تو اس لڑکی سے ملوادوں گا، جس کا نام تنزیلہ ہے۔

☆☆☆

ہاشم صاحب کو پاکستان سے جانے سے قبل بہت سی یادوں سے جنگ کرنی تھی۔ یادیں آسانی سے کہاں جانے دیتی ہیں۔ وہ ہمیشہ اپنے حصار میں رکھتی ہیں۔ انہیں یاد تھا کہ اب سے بہت پہلے جب انہوں نے دردانہ کو بتایا تھا کہ وہ تعلیم کی غرض سے انگلینڈ جارہے ہیں تو وہ کتنی دیر تک روتی رہی تھی۔ دردانہ ان کی محبت تھی۔

ان کا تعلق بھی ایک پڑھے لکھے گھرانے سے تھا۔ ان کا باپ ایک کاروباری شخص تھا۔ اس کے نزدیک محبت اور رشتوں سے زیادہ اہمیت پیسوں کی تھی۔

ہاشم صاحب نے انہیں سمجھاتے ہوئے کہا تھا۔ ''تم کیا سمجھتی ہو کہ دور جانے سے محبت کم ہوجاتی ہے۔ جب کم ہوجائے تو پھر وہ محبت کہاں رہی، اسے کوئی اور نام دینا چاہیے۔ میں ہمیشہ سے تمہارے پاس تھا اور رہوں گا۔''

''اور وہاں جا کر بدل گئے تو؟''

''تو پھر وہ محبت تو نہیں ہوئی نا۔''

ہاشم صاحب چلے گئے۔ ان کے سامنے ایک زندگی تھی جس میں وہ دردانہ کے ساتھ رہنا چاہتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر زندگی میں کبھی محبت حاصل ہوجائے تو اس کی قدر کرنی چاہیے، اسے ہاتھ سے نہ جانے دو۔ ویسے تو رشتے درجنوں ہوتے ہیں لیکن... جو کہ رشتے میں کچھ نہیں ہوتے..... ان سے رشتہ بلا کا ہوتا ہے۔

وہ دردانہ کو اپنانا چاہتے تھے، ہمیشہ کے لیے۔ ویسے تو زندگی دو ہی دن کی ہوتی ہے لیکن اگر محبت مل جائے تو لمحوں کو ابدیت حاصل ہوجاتی ہے لیکن انہیں نہیں معلوم تھا کہ ایک آسیب تعاقب میں ہے۔ وہ اچک کر لے جانا چاہتا ہے۔ ان کی محبت کو، ان کے ارمانوں کو، ان کے خوابوں کو۔

اچانک ایک دن انہیں پتا چلا کہ دردانہ کے باپ نے دردانہ کا رشتہ کہیں طے کردیا ہے۔ یہ خبر خود دردانہ نے فون کے ذریعے سنائی تھی۔ وہ ہچکیاں لے کر رو رہی تھی۔

''یہ..... یہ کیسے ہوسکتا ہے؟'' ہاشم صاحب پر جیسے بجلی سی گری تھی۔

''یہی ہوا ہے ہاشم!'' دردانہ نے بتایا۔

''پھر تم نے کیا کیا؟''

''وہی جو ایک کمزور لڑکی کرسکتی ہے۔'' دردانہ نے بتایا۔ ''میں نے خودکشی کی کوشش کی تھی۔ میں نے فنائل پی لیا تھا۔ بے ہوش ہوگئی تھی لیکن امی موجود تھیں۔ انہوں نے واویلا مچادیا۔ مجھے فوری طور پر اسپتال لے جایا گیا جہاں کئی دنوں تک میرا علاج ہوتا رہا ہے۔''

''نہیں دردانہ..... اب یہ مت کرنا۔'' ہاشم صاحب نے کہا۔ ''محبت حاصل کرنے کا نام نہیں ہے۔ محبت ایک دوسرے کی یادوں میں زندہ رہنے کا نام ہے۔ زندہ رہو۔'' دردانہ کو سمجھاتے ہوئے ہاشم صاحب کی آواز رندھی ہوئی تھی۔ ان کا دل رو رہا تھا۔ دوسری طرف دردانہ روتی رہی تھی۔

ہاشم صاحب اس کے بعد بکھر کر رہ گئے تھے۔ ان کا دل چاہا کہ وہ اپنی تعلیم وغیرہ چھوڑ کر واپس چلے جائیں لیکن اب کیا فائدہ۔ اب کیا تھا وہاں؟ کچھ بھی نہیں۔ وہ راہ گزر تھے جن پر وہ دردانہ کے ساتھ چلا کرتے تھے۔

لیکن اب سب اس طرح ختم ہوگیا تھا جیسے جادو کی چھڑی گھمادی جائے اور منظر تبدیل ہوجائے۔ راتوں کو نیند نہیں آتی تھی اور دن بے چینی میں گزر جاتے تھے۔

پھر ان کے باپ نے انہیں فون کیا۔ وہ بتا رہے تھے۔ ''بیٹے! میں نے تمہارے لیے ایک مناسب رشتہ تلاش کرلیا ہے۔ میرے ایک دوست کی بیٹی ہے۔''

''بابا! میں ابھی شادی نہیں کرنا چاہتا۔'' ہاشم صاحب نے کہا۔

''میں جانتا ہوں کہ تم اس وقت کس کرب میں ہو لیکن حالات کے ساتھ سمجھوتا کرلیا جاتا ہے۔ واپس آکر شادی کرکے اپنی نئی زندگی شروع کرو۔''

ہاشم صاحب کے لیے کوئی راستہ نہیں تھا کہ وہ اپنے بابا کی بات مان لیں۔ زندگی میں اب رہ کیا گیا تھا۔ وہ ملک واپس آگئے۔ کچھ دنوں کے بعد رومانہ سے ان کی شادی ہوگئی۔

رومانہ ایک اچھی بیوی ثابت ہوئی تھیں لیکن وہ صرف بیوی تھیں۔ ان کے ساتھ محبت اور اپنائیت کا وہ رشتہ نہیں تھا جو دردانہ کے ساتھ تھا۔ اس کے باوجود زندگی گزر رہی تھی۔ انہوں نے رومانہ کا پورا خیال رکھا تھا۔ انہوں نے کبھی احساس نہیں ہونے دیا کہ رومانہ نے ایک ادھورے انسان سے شادی کی ہے۔ ان کا آدھا پن تو دردانہ کے ساتھ تھا۔ پھر ان سے ایک اولاد ہوئی، جنید۔ جو ایک بہت خوش شکل بچہ تھا۔

www.pklibrary.com

ہاشم صاحب نے وردانہ کو تلاش کرنے کی کوشش بھی کی تھی لیکن وہ لوگ گھر چھوڑ کر کہیں جا چکے تھے اور اس افراتفری کے دور میں کس کو اتنی فرصت ہوتی ہے کہ یاد رکھے کہ فلاں شخص کہاں چلا گیا ہے۔ جب تک سامنے ہیں، اسی وقت تک تو سب کچھ ہے۔

وقت گزرتا چلا گیا۔ جنید بڑا ہو گیا۔ وہ بھی ذہین تھا۔ اس نے ہاشم صاحب کی طرح انجینئرنگ نہیں کی بلکہ اس نے نفسیات میں ماسٹر کیا تھا۔

ہاشم صاحب نے کبھی اس پر دباؤ نہیں ڈالا تھا کہ وہ فلاں سبجیکٹ کا انتخاب کرے۔

وہ ایک دوسرے مزاج کے انسان تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ ہر شخص کو اپنی راہ اختیار کرنے کا حق حاصل ہے۔ جب تک وہ بچہ رہتا ہے، اس کی نگہداشت والدین کے ذمے ہوتی ہے اور جب وہ بڑا ہو جاتا ہے تو اپنی نگہداشت خود اس کی ذمے داری ہو جاتی ہے۔ وہ اچھے یا بُرے کے فیصلے خود کر سکتا ہے۔

رومانہ بھی ان کے درمیان نہیں رہی تھیں۔ ان کا انتقال ہو چکا تھا۔ اب دونوں باپ بیٹا رہ گئے تھے۔

کچھ دنوں کے بعد ہاشم صاحب کے والد کا بھی انتقال ہو گیا۔ ہاشم صاحب سوچا کرتے کہ زندگی سے انہیں کیا ملا ہے۔ ماں چلی گئی، باپ بھی نہیں رہا۔ بیوی بھی نہیں رہی۔ اب صرف ایک نشانی رہ گئی ہے۔ ان کا بیٹا جنید، جو ایک سعادت مند اور سمجھ دار نوجوان تھا۔ اس نے ماسٹر کے بعد ایک کالج میں پڑھانا شروع کر دیا تھا۔

ان دونوں باپ بیٹے کے درمیان دوستی جیسا رشتہ تھا۔ جنید انہیں اپنی کہانیاں سنایا کرتا۔ ان کہانیوں میں صرف ایک ہی لڑکی کا ذکر ہوتا تھا اور وہ تھی تنزیلہ۔

ایک دن ہاشم صاحب نے کہا۔ ”یار! تم ہر وقت تنزیلہ کی تعریف کرتے رہتے ہو، کبھی اسے لے کر تو آؤ۔“

”کیوں نہیں بابا! ضرور لے کر آؤں گا..... اسے آپ کی بہو جو بننا ہے۔“

”اوہو! تو اب یہاں تک فیصلہ ہو گیا ہے۔“

”ہاں بابا! کیونکہ میں جانتا ہوں کہ آپ نے ہمیشہ میری خوشی کا خیال رکھا ہے۔ کبھی مایوس نہیں کیا۔“

”تو پھر لے آؤ کسی دن۔ میں اس کے لیے ایک خاص ڈش بنا دوں گا۔“

”یہ کیا بات ہوئی۔ کیا آپ کھانا بنائیں گے؟“

”بے وقوف! یہ تو اس کے لیے ایک خوشی کی بات ہو گی کہ اس کے ہونے والے سسر کے پاس یہ ہنر بھی ہے۔“

”او کے! میں لے آؤں گا اس کو۔“

☆☆☆

جنید اور تنزیلہ کئی دنوں کے بعد اسی ریسٹورنٹ سپنا میں بیٹھے ہوئے تھے۔ تنزیلہ اپنے کزن کی شادی سے فارغ ہو چکی تھی۔

”میرا خیال ہے کہ تم خود اپنی شادی میں اتنی محنت نہیں کرو گی، جتنی محنت تم نے اپنی کزن کی شادی میں کی ہے۔“

”بے وقوف آدمی! خود اپنی شادی میں کون محنت کرتا ہے۔ سارا کام تو دوسرے سنبھال لیتے ہیں۔“

”چلو چھوڑو۔ یہ بتاؤ، تم کب میرے بابا سے ملنے آ رہی ہو؟“

”میں تو تیار ہوں۔ جب چاہو لے جاؤ۔“ تنزیلہ نے کہا۔ ”سچ تو یہ ہے کہ مجھے خود انکل سے ملنے کا شوق ہو گیا ہے۔“

”میرے بابا ایک گریٹ آدمی ہیں۔ ماما کی موت کے بعد انہوں نے دوسری شادی صرف میرے لیے نہیں کی۔“

”ہاں یار! اس دنیا میں ایسے بھی لوگ ہوتے ہیں، ورنہ.....“

”ورنہ کیا؟“

”ورنہ..... لوگ اس انتظار میں ہی رہتے ہیں کہ بیوی کا انتقال ہو جائے تو فوراً دوسری شادی کر لیں۔“

”میرے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟“

”فکر مت کرو۔ میرا فی الحال مرنے کا موڈ نہیں ہے۔“

جنید جب تنزیلہ کو اپنے گھر لے کر آیا تو ہاشم صاحب نے بہت خوش دلی سے تنزیلہ کا استقبال کیا تھا۔

”انکل! یہ جنید ہر وقت آپ کی تعریف کرتے رہتے ہیں۔“ تنزیلہ نے کہا۔

”ظاہر ہے، میں اکلوتا باپ ہوں اس کا۔“ ہاشم صاحب ہنس کر بولے۔

تنزیلہ کو ہاشم صاحب بہت پسند آئے تھے۔ جب ہاشم صاحب نے اسے اپنے ہاتھوں سے تیار کھانے کھلائے تو وہ اچھل پڑی۔ ”واہ انکل! آپ کے ہاتھوں میں کتنا ٹیسٹ ہے۔ ایسا تو میری امی بھی نہیں بنا تیں حالانکہ میں انہیں اس فیلڈ کا چیمپئن سمجھتی تھی۔“

”چلو کسی دن تمہاری امی کے ہاتھ کے بھی کھانے کھا کر دیکھیں گے۔“

”ضرور انکل! آپ کل ہی آ جائیں نا۔ ہم انتظار کریں گے۔“

”ارے نہیں۔ اب اتنی جلدی بھی نہیں۔“

”اس میں جلدی اور دیر کیا ہے انکل! پلیز آ جائیں۔ میں ابھی سے امی کو جا کر یہ خبر سناتی ہوں کہ کل ہمارے یہاں ایک اسپیشل گیسٹ آ رہے ہیں۔ جتنا ہنر دکھانا ہو، دکھا دیں۔“

ہاشم صاحب ہنس پڑے۔ تنزیلہ انہیں پسند آئی تھی۔ وہ ایک سادہ مزاج لڑکی تھی، پیار کرنے والی۔

www.pklibrary.com

جاتے جاتے بھی تنزیلہ نے یاد دہانی کروادی۔ ”انکل! آپ دونوں کل آرہے ہیں نا؟“

”ہاں بیٹا! جب تم اتنے پیار سے بلا رہی ہو تو کیوں نہیں آؤں گا۔“

☆☆☆

تنزیلہ کے گھر جا کر بے شمار زخم ایک ساتھ ہرے ہو گئے تھے۔

تنزیلہ کی ماں اس کے سامنے آ کر بیٹھ گئی تھی اور پتا چلا کہ یادیں کس طرح ساتھ دیتی ہیں اور کبھی کبھی بھولے ہوئے کردار کس طرح سامنے آجاتے ہیں۔

تنزیلہ کی ماں، دردانہ تھی۔

وقت تو گزر گیا تھا لیکن اس کے چہرے کے نقوش ویسے ہی تیکھے تھے جن کو دیکھ دیکھ کر ہاشم صاحب کہا کرتے۔ ”یار! تمہارے یہ کٹیلے نقش تو جان لے لیں گے۔“

”کیا لینگویج ہے تمہاری۔“ دردانہ بدک جاتی۔

”یہ محبت کی لینگویج ہے اور محبت کی لینگویج میں کوئی تکلف نہیں ہوتا۔“

وہی کٹیلے نقش والی دردانہ اس کے سامنے بیٹھی تھی جو خود ہاشم صاحب کو دیکھ کر سکتے میں رہ گئی تھی۔ جنید اور تنزیلہ سامنے بیٹھے تھے۔

اچانک ہاشم صاحب نے دردانہ سے کہا۔ ”مجھے معاف کردیں۔ میں نہیں بیٹھ سکوں گا۔ پیٹ میں شدید درد ہو رہا ہے۔“

”کچھ دیر رک جائیں انکل!“ تنزیلہ نے کہا۔ ”امی نے بہت دل سے کھانے بنائے ہیں۔“

”ہاں بیٹا! لیکن میں اس وقت رک نہیں سکوں گا۔“

دردانہ بالکل خاموش تھی۔ اس کا چہرہ سپاٹ ہو رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں آ گیا تھا کہ ہاشم صاحب کیوں رکنا نہیں چاہتے۔

ہاشم صاحب کسی طرح اس گھر سے باہر آ گئے تھے۔ جنید کا موڈ اگرچہ خراب ہو گیا تھا لیکن اس نے ہاشم صاحب سے کچھ نہیں کہا۔

ہاشم صاحب کے لیے وہ رات بہت کرب کی تھی۔ یادوں نے کسی سیلاب کی طرح انہیں گھیر لیا تھا..... نہ جانے کون کون سے لمحے اچک اچک کر کسی شریر بچے کی طرح ان کے سامنے آتے جا رہے تھے۔

دردانہ انہیں ملی بھی تو کس تناظر میں ملی تھی۔ وہ اس لڑکی کی ماں تھی جس سے ان کے بیٹے نے محبت کی تھی۔

ہاشم صاحب کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ انہوں نے سوچا تھا کہ اگر زندگی کی راہ میں کبھی دردانہ سے ملاقات ہوئی تو وہ ہر حال میں اسے اپنا لیں گے۔ وہ اسے بھول نہیں سکتے تھے، کسی بھی حال میں۔

دوسری صبح انہوں نے جنید سے پوچھا۔ ”کیا تمہارے پاس تنزیلہ کے گھر کا فون نمبر ہے؟“

”جی ہاں!“

”مجھے دے دو۔“

جنید نے انہیں تنزیلہ کے گھر کا نمبر دے دیا۔ جنید کے جانے کے بعد انہوں نے فون کیا۔ لاکھوں آوازوں کے درمیان وہ دردانہ کی آواز پہچان سکتے تھے۔ دردانہ نے بھی ان کی آواز پہچان لی تھی۔

”دردانہ! کیا ہم کہیں مل سکتے ہیں؟“ اس نے پوچھا۔

کچھ دیر کی خاموشی کے بعد دردانہ نے کہا۔ ”کیوں نہیں، کب ملو گے؟“

”ابھی..... اسی وقت۔ میرا مطلب ہے کہ مجھ میں اتنی تاب کہاں ہے کہ میں انتظار کر سکوں۔“

”اتنی بے تابی مت دکھاؤ۔“ دردانہ نے کہا۔ ”کل ہم مل لیتے ہیں۔“

”کہاں؟“

”وہیں، جہاں ہم ملا کرتے تھے۔“

☆☆☆

جنید کو اندازہ بھی نہیں تھا کہ بابا کا فون یہ گل کھلا دے گا۔ ہاشم صاحب صبح سے کہیں گئے ہوئے تھے۔ انہوں نے جنید کو بتایا بھی نہیں تھا کہ وہ کہاں جا رہے ہیں۔

ہاشم صاحب کا جب فون آیا تو جنید نے جلدی سے ریسیور اٹھا لیا۔ ”کیا ہوا بابا! کہاں چلے گئے تھے؟ شام ہونے لگی ہے اور آپ کا کوئی پتا نہیں ہے۔“

”بیٹا! تمہیں ایک خبر دینی تھی۔“

”ہاں بابا! بتائیں۔“

”بیٹا! تم نے ایک بار کہا تھا کہ بابا جہاں سے ہو، خوشی حاصل کرلیں کیونکہ آپ نے پوری زندگی محرومیوں کے ساتھ گزاری ہے۔“

”ہاں..... میں تو ہمیشہ یہی کہتا ہوں..... تو کہاں سے خوشی ملی ہے؟“

”بیٹا! میں نے کورٹ میرج کرلی ہے۔ دن بھر اسی میں مصروف تھا۔“

”کورٹ میرج؟ کہاں؟ کس کے ساتھ؟“

”تمہاری ہونے والی ساس کے ساتھ۔ وہی تو میری محبت تھی جو میں نے اب جا کر حاصل کی ہے۔“

جنید کے ہاتھ سے ریسیور چھوٹ گیا تھا۔

⌘⌘⌘

www.pklibrary.com

شاہین

طاقت کے گھمنڈ اور غرور کے محلوں کو مسمار کرنے والے ایک شجاع کے عزم کا سنسنی خیز سلسلہ

محمد عبداللہ

دور چاہے جو بھی ہو معاشرتی ناسور ہر
عہد میں متحرک رہے ہیں۔ وہ جو دانا باپ کا
بہادر بیٹا تھا، سرداری اسے وراثت میں ملی
تھی اور بچپن کی خوب صورت یادیں اس کا
سرمایہ تھیں... کمسنی میں ساتھ کھیلتے کھیلتے
اب جوانی میں بھی زندگی بھر ساتھ رہنے کے خواب
دیکھنے لگے تھے۔ اگرچہ محلاتی سازشوں سے وہ بے
خبر نہ تھا، اس کے باپ نے اس کے "آگاہ" رہنے کی صلاحیت
کو اتنا نکھارا تھا کہ اس کی حسیات جانوروں سے زیادہ
چوکنا ہو گئی تھیں۔ کہیں رنگِ وفا سے کھیلتا ہوا اور کہیں
زہرِ جفا سے نبرد آزما... زندگی کے نشیب و فراز میں الجھی
رنگین و سنگین لمحات کی داستان... ایک ایسے سادہ دل
نوجوان کا فسانۂ حیات جس کے لہو میں محبت کی خوشبو اور
آنکھوں میں سنہرے خواب تھے جن کی حفاظت کے لیے اسے ایک طویل
مگر اذیت بھرا سفر درپیش تھا۔

سولھواں حصہ

www.pklibrary.com

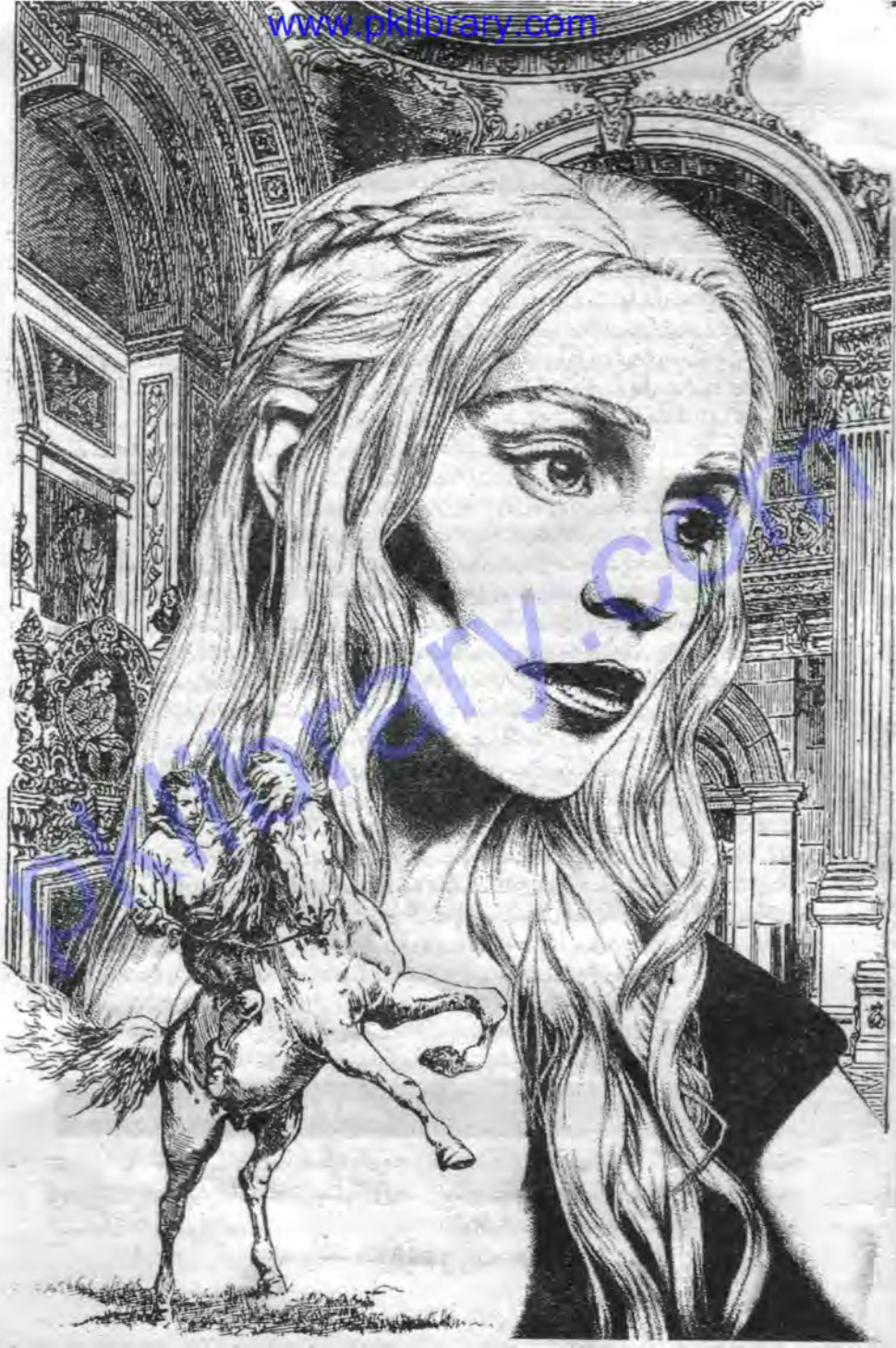

www.pklibrary.com

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

ساشا کا تعلق ڈاکوؤں کے ایک ایسے گروہ سے ہے جس کا سردار اس کا اپنا باپ تھا۔ ساشا کا باپ ڈاکو بننے سے قبل ایک عرب امیر کے دربار سے وابستہ تھا اور امیر کے بیٹے کے اتالیق کے فرائض انجام دیتا تھا۔ ان فرائض کی انجام دہی کے دوران ہی اسے کچھ ایسے بدترین حالات سے گزرنا پڑتا ہے کہ وہ عزت دار زندگی چھوڑ کر ڈاکو بننے کو ترجیح دیتا ہے۔ وہ مختلف قومیتوں اور مذاہب سے تعلق رکھنے والے افراد پر مشتمل ایسا گروہ ترتیب دیتا ہے جو طویل عرصے کے لیے کسی ایک جگہ سکونت اختیار نہیں کرتا۔ ایسے گروہ کے درمیان رہ کر جنگلوں اور بیابانوں میں پرورش پانے والا ساشا ایک ایسے نوجوان کے طور پر سامنے آتا ہے جسے فنونِ حرب اور سخت جانی میں کمال حاصل ہے اور جو طرح طرح کی زبانیں بولنے اور سمجھنے میں مہارت رکھتا ہے۔ گروہ کے بیشتر افراد کی رائے کے مطابق وہ اپنے باپ کا بہترین جاں نشین ہوتا ہے لیکن اس منظم گروہ میں ایک ایسا سازشی ٹولا بھی موجود تھا جو ساشا کی جگہ اپنے آدمی کو سردار دیکھنا چاہتا تھا۔ ساشا کے باپ کی موت پر اس ٹولے کو سر اٹھانے کا موقع ملتا ہے اور سرداری پر قبضے کے لیے پورا زور لگایا جاتا ہے۔ ان نامساعد حالات میں ساشا کو اپنی زندگی بچانے کے لیے فرار کی راہ اختیار کرنی پڑتی ہے۔ دشمنوں سے چھپتا چھپاتا اور بھاگتا ہوا وہ ایک بااثر امیر کے آدمیوں کے ہاتھ لگ جاتا ہے اور اسے مشکوک جان کر قید خانے میں ڈال دیا جاتا ہے۔ اس قید خانے میں اپنی زبان دانی کی صلاحیت کی بنیاد پر وہ ایک اتفاق کا فائدہ اٹھا کر امیر کی نظروں میں سرخرو ہونے کا موقع حاصل کر لیتا ہے۔ امیر کا قرب حاصل کرنے کے بعد وہ کچھ اہم رازوں سے واقف ہو جاتا ہے۔ امیر کی اپنے چھوٹے بھائی سے شدید دشمنی اور اختلاف ہوتا ہے۔ اس اختلاف کی وجہ اس پراسرار خزانے کا راز تھا جو انہیں نسل در نسل منتقل ہوتے ہوئے اپنے باپ سے ملا تھا۔ ایک معین مدت مکمل ہونے کے بعد امیر بڑا بھائی ہونے کے ناتے خود کو خزانے کے راز کا حق دار سمجھتا ہے لیکن حقیقتاً اس کی بے راہ روی اور بداخلاقی کے باعث اس کا باپ اسے اس حق سے محروم کر کے چھوٹے بیٹے کو یہ حق تفویض کر دیتا ہے۔ خزانے کی تلاش میں پیش آنے والی دشواریوں اور پیچیدگیوں سے گزرتا ساشا کئی ذیلی معاملات میں بھی الجھا رہتا ہے۔ ادھر کفار سے برسرِ پیکار مسلمانوں کا ایک قافلہ بہادر داؤد کی راہنمائی میں اپنا سفر جاری رکھے ہوئے ہے۔ داؤد ساتھیوں سمیت ایک بستی میں پڑاؤ ڈال دیتا ہے تاہم پناہ گزینوں میں شامل سارہ نامی لڑکی اور راہباؤں کے پیچھے کچھ لوگ انہیں نقصان پہنچانے کی کوشش میں ہوتے ہیں۔ بستی میں قیام کے دوران بھی انہیں کافی نقصان اٹھانا پڑتا ہے جس کی وجہ سے وہ سردار پر شک کرتے ہیں۔ ادھر ساشا پڑاؤ کے دوران انسانی آنکھ سے مشابہ ایک غار کی طرف بڑھتا ہے مگر وہاں اسے سانپ ڈس لیتا ہے اور باہر سے کوئی غار کا دہانہ بند کر دیتا ہے۔ وہ بے ہوش ہو جاتا ہے اور اسے ہوش آتا ہے تو اسے تلاوتِ قرآن سنائی دیتی ہے۔ سلیمان اور فیرس اس کی تیمارداری کر رہے ہوتے ہیں۔ ادھر داؤد قافلے سمیت بستی میں پھنس جاتا ہے۔ سردار کو قتل کر دیا جاتا ہے اور سردار زادی اسے مخالف لوگوں کی سرکوبی کے لیے اپنا کردار ادا کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ داؤد مخالف گروہ کے پاس ان کا ہمدرد بن کر پہنچ جاتا ہے۔ داؤد کے ساتھی لطیف کو مار دیا جاتا ہے۔ داؤد وہاں سے نکل کر سردار زادی کے گروہ میں شامل ہو جاتا ہے۔ ساشا اسلام قبول کر لیتا ہے۔ سارہ اپنے پاس موجود ہیرا داؤد کے حوالے کر کے ان کی مدد کرنا چاہتی ہے۔ حاطب ہیرا پہچان کر اسے سارہ کو طلب کرنے کا کہتا ہے۔ ساشا اور اس کے ساتھی سردار مراد کی بستی کے حالات جان کر یہ عہد کر لیتے ہیں کہ انہیں مسلمانوں کی مدد کرنی ہے اور اس کے لیے وہ اپنے ساتھیوں سے مشورہ کر کے انہیں جہاد کا حکم دیتا ہے۔ اس مقصد کے لیے وہ خود کمان نہیں سنبھالتا اور سفیر اللہ کو کمان دار بناتا ہے۔ ادھر داؤد بھی ایک بستی میں پہنچ کر وہاں کے لوگوں کو اپنے دینی بھائیوں کی مدد پر آمادہ کرتا ہے اور ساشا کے گروہ سے جا ملتا ہے۔ وہ لوگ ایک ہندو بلوائی کو پکڑ لیتے ہیں اور اس سے پوچھ گچھ کرتے ہیں اور اسلحے کے ذخیرے پر قابض ہو جاتے ہیں۔ سارہ اسلام قبول کر لیتی ہے۔ قابوس کا لشکر ثوبان سے جا ملتا ہے۔ ساشا بھی چپکے سے اس لشکر میں شامل ہو جاتا ہے اور وہ ان کے سامان کو آگ لگا دیتا ہے۔ قابوس اور ثوبان سر جوڑ کر حالات کا تجزیہ کرنے لگتے ہیں اور حملہ کرنے کے پہلوؤں پر غور کرتے ہیں۔ ثوبان قابوس کو نشہ آور مشروب پلا کر بستی پر حملہ کر دیتا ہے۔ داؤد بن معیز لیلیٰ کے سپاہیوں کے ساتھ مل کر دفاع کرتا ہے۔ ساشا بھی ان سے آملتا ہے۔ زوروں کی لڑائی ہوتی ہے۔ ثوبان، داؤد کی بہن کو یرغمال بنا لیتا ہے اور وہاں سے نکلنے کا راستہ مانگتا ہے۔ داؤد خفیہ راستے سے وہاں پہنچتا ہے مگر دھر لیا جاتا ہے۔ ادھر ساشا پہاڑی کے ذریعے دشمنوں کے ٹھکانے تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ داؤد بھی ساشا سے مل جاتا ہے، وہ دونوں مل کر دشمنوں کو زیر کرتے ہیں تاہم ثوبان اور چند ساتھی خفیہ سرنگ کے ذریعے باہر نکلنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ ثریا کو یرغمالی بنانے والا اسے آگ لگا دیتا ہے۔ داؤد بہن کو بچانے کی کوشش میں خود بھی جھلس جاتا ہے۔ ادھر سارہ ساشا کی طرف بڑھنے والا تیر اپنے جسم پر کھاتی ہے۔ دشمنوں کو ٹھکانے لگا دیا جاتا ہے۔ ساشا کو حاطب کے ذریعے پتا چلتا ہے کہ وہ امان کی اولاد نہیں تو وہ بے چین ہو جاتا ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

''اخی.....'' ثریا کے ہونٹوں سے نکلنے والی درد بھری پکار سن کر طیبہ جو پہلے ہی اس کے بستر سے لگی بیٹھی تھی، اس کے کچھ اور بھی قریب ہو گئی۔

''ثریا..... میری بہن! میں تمہارے پاس ہوں۔ کچھ کہنا ہے تو مجھ سے کہو۔'' نہایت دردمندی سے اس سے کہتے ہوئے وہ پوری جان سے اس کی طرف متوجہ تھی۔ ثریا

www.pklibrary.com

سے یوں بھی محبت اور خلوص کا رشتہ تھا اور اب اس کی اس حالت نے اس کے اپنے زخم ادھیڑ دیے تھے۔ اپنی نومولود بیٹی اور ہمدرد و غم گسار ساس کے جل کر مرنے کا غم ثریا کے جسم پر موجود آبلوں کو دیکھ کر ایک بار پھر تازہ ہو گیا تھا اور وہ اس کے لیے ویسے ہی تڑپ رہی تھی جیسے ان دونوں کو آگ میں جل کر خاک ہوتے دیکھ کر تڑپی تھی۔ ثریا کی ہر آہ اور سسکی اسے ان آہوں اور سسکیوں کو محسوس کرنے پر مجبور کر دیتی تھی جنہیں اس نے اپنے کانوں سے سنا نہیں تھا لیکن اپنے دل پر محسوس کیا تھا۔

''میرے اخی..... کا کیا حال ہے طیبہ؟ وہ..... ٹھیک تو ہیں نا؟'' اس نے اٹک اٹک کر اپنا سوال مکمل کیا۔ اس کا سوال سن کر طیبہ کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ وہ خود پور پور جلی ہوئی تھی اور اس کا پورا جسم آبلہ بن چکا تھا پھر بھی اسے اپنے بھائی کی فکر تھی۔

''وہ ٹھیک ہیں میری پیاری بہن! انہیں معمولی نوعیت کے زخم آئے تھے جن کی مرہم پٹی کی جا چکی ہے اور اب وہ آرام کر رہے ہیں۔'' اس نے نرم لہجے میں اسے تسلی دی۔

''میری اخی سے ملاقات کروا دو طیبہ! میں ایک بار انہیں اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتی ہوں۔'' اس نے اسی ٹوٹے بکھرے لہجے میں فرمائش کی۔ تکلیف اتنی شدید تھی کہ اپنے بے انتہا ضبط کے باوجود وہ درد کو لہجے میں جھلکنے سے روکنے سے قاصر تھی۔

''میری زبان پر اعتبار نہیں ہے کیا؟'' اس کی فرمائش سن کر طیبہ نے پیار سے شکوہ کیا۔

''اعتبار کیوں نہیں ہوگا بھلا، لیکن دل تو اسی وقت قرار پائے گا جب انہیں اپنے روبرو دیکھ لوں گی۔ ویسے بھی کسے معلوم ہے کہ کب یہ درد میں ڈوبی سانسیں بھی اس جسم کی قید سے آزاد ہو جائیں۔ میں مرتے وقت اپنے اخی کا چہرہ اپنی نظروں میں سمو کر مرنا چاہتی ہوں۔'' بولتے بولتے اس کی آواز اتنی دھیمی ہو گئی کہ طیبہ کو بات سمجھنے کے لیے سماعتوں پر پورا زور دینا پڑ رہا تھا۔

''ایسی دل دکھانے والی باتیں مت کرو ثریا! اللہ تمہیں میری بھی زندگی لگا دے۔'' طیبہ کی آنکھوں کی نمی آنسو بن کر رخساروں پر پھیل گئی۔

''اچھا اب نہیں کروں گی لیکن تم اخی کو تو بلا دو۔'' وہ بھائی کی صورت دیکھنے کے لیے بے حد بے چین تھی۔ اس کی اتنی بے چینی دیکھ کر طیبہ کو خیمے سے باہر نکلنا ہی پڑا۔ ملاقات کا پیغام داؤد بن سعیز کو بھجوا کر وہ واپس خیمے میں آ گئی۔ ثریا اب نیم غنودگی کی کیفیت میں تھی لیکن اس حالت میں بھی اس کے ہونٹوں سے آہیں نکل رہی تھیں۔ طیبہ دل ہی دل میں اس کے درد میں کمی کی دعائیں مانگنے کے ساتھ ساتھ اس پر قرآنی دعائیں پڑھ کر پھونکنے لگی۔

''کیا میں اندر آ سکتا ہوں؟'' تھوڑی ہی دیر میں داؤد کی آواز اسے خیمے کے دروازے پر سنائی دی۔

''جی ضرور!'' اس نے جواب دیتے ہوئے اپنے چہرے پر نقاب درست کیا اور اس کے اندر داخل ہوتے ہی بہن بھائی کو تخلیہ فراہم کرنے کی نیت سے باہر نکل گئی۔ باہر جاتے ہوئے داؤد کے پٹیوں میں جکڑے ہوئے ہاتھ اس کی نظروں میں آنے سے نہ رہ سکے تھے۔

''اخی.....!'' ثریا نے اس کی آمد کو محسوس کر کے آنکھیں کھول دیں۔

''میں تمہارے پاس ہوں میری پیاری بہن۔'' داؤد کو اپنی آنکھوں کی نمی چھپانے کے لیے بہت جدوجہد کرنا پڑی تھی۔ وہ جس بستر پر لیٹی ہوئی تھی اس کے گرد ایک چادر اس طرح تنی ہوئی تھی کہ اس کے چہرے کے سوا پورا جسم چھپ گیا تھا لیکن وہ تو جانتا تھا کہ چادر کے پیچھے چھپا اس کی پیاری بہن کا جسم کس اذیت سے گزر رہا ہے۔ اسے بچانے کی خواہش میں اس نے خود بھی اپنے جسم پر آگ کی سفاکی کو سہا تھا۔ ہاتھوں اور پیروں کے علاوہ اس کے پیٹ کا بھی کچھ حصہ آگ سے متاثر ہوا تھا اور وہ اپنی تکلیف کو دس سے ضرب دے کر ثریا کی تکلیف محسوس کر سکتا تھا۔

''آپ کو زیادہ تکلیف تو نہیں ہے نا اخی؟'' اس نے داؤد کی پٹیوں کی طرف دیکھتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''تکلیف تو بہت ہے میری عزیز از جان بہن۔ تکلیف کیسے نہیں ہوگی۔'' اس بار وہ خود پر قابو نہ رکھ سکا اور آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

''خدارا ایسا نہ کیجیے اخی! میں تو ہاتھ بڑھا کر آپ کے آنسو بھی پونچھنے کے لائق نہیں ہوں۔'' ثریا تڑپ گئی۔

''کاش! میں تمہاری تکلیف خود پر لے سکتا۔'' وہ جو میدانِ جنگ میں سینہ تان کر لڑتا تھا، اس وقت بے بسی کی تصویر نظر آ رہا تھا۔

''کوئی کسی کی تکلیف اپنی جان پر نہیں لے سکتا۔ اگر ایسا ممکن ہوتا تو میں آپ کے دل کا درد نہ بانٹ لیتی۔'' ثریا سسکی۔

''کیا کہنا چاہتی ہو؟'' داؤد نے چونک کر پوچھا۔

''میں جانتی ہوں کہ آپ کا دل سارہ کا اسیر ہو چکا ہے لیکن وہ کیا کرے کہ وہ خود کسی کی اسیری میں ہے۔ مر جائے گی لیکن کسی اور کو اس کی جگہ نہیں دے سکے گی۔''

www.pklibrary.com

''یہ کون سا موقع ہے ایسی باتوں کو چھیڑنے کا؟'' داؤد کا درد اور سوا ہوا۔ وہ دشمنِ جاں تیر سے گھائل ہو کر ابھی تک ہوش و حواس سے بیگانی پڑی تھی اور طبیب واضح طور پر کہنے سے قاصر تھے کہ اس کی زندگی بچنے کے امکانات کتنے فیصد ہیں۔

''یہی تو موقع ہے اخی! اس کے بعد جانے مہلت ملے نہ ملے۔'' ثریا کی آواز ڈوبنے لگی۔

''ایسی باتیں کر کے مجھے دکھ نہ دو ثریا!'' وہ تڑپ گیا۔

''کہنے نہ کہنے سے حقیقت بدلتی تو نہیں ہے۔ میں اپنے آس پاس موت کی آہٹیں سن رہی ہوں۔''

''ثریا.....'' غم سے داؤد کی آواز پھٹ سی گئی۔

''مجھے کہنے دیجیے اخی، ورنہ بعد میں آپ کو پچھتاوا ہوگا کہ میری آخری خواہش کیوں نہ سنی۔'' اس کے لہجے میں کچھ ایسا تھا کہ اس کے الفاظ سے شدید تکلیف محسوس کرنے کے باوجود داؤد اسے کچھ کہہ نہ سکا۔

''طبیبہ کو اپنا لیں اخی! دوسروں کے درد کا درماں بن جانا ٹوٹے ہوئے دل والوں کا ہی وصف ہوتا ہے۔'' اس کی خواہش نے داؤد کو ششدر کر دیا۔

''میں آپ کے کہے بغیر ہی آپ کا مقدمہ کئی بار سارہ کے حضور لڑ چکی ہوں اور ہر بار ہارنے کے بعد جان چکی ہوں کہ وہ اپنے دل کے ہاتھوں بے بس ہے۔ اس کی بے بسی کو سمجھیے اور طبیبہ کا سہارا بن جایئے۔'' وہ آج داؤد کو حیران کرنے پر تلی ہوئی تھی۔

''تم نے سارہ کی بے بسی کو سمجھ لیا ہے تو میری بے بسی کو کیوں نہیں سمجھتی ہو؟'' اس نے شکوہ کیا۔

''کیونکہ میں جانتی ہوں کہ میرے اخی ایک بہادر انسان ہیں اور خود کو دھوپ میں جلا کر دوسروں کے لیے سایہ بننے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ اپنے غم سے ٹوٹ کر بکھر جانا کوئی کمال نہیں۔ کمال تو اس میں ہے کہ انسان غم سہہ کر غم بانٹنے کا حوصلہ پیدا کر لے۔'' وہ بولتی تھی تو اس کا لہجہ کانپتا تھا اور آواز ڈوب ڈوب جاتی تھی لیکن آنکھیں مسلسل داؤد کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ آہستہ آہستہ زندگی کی چمک کھوتی ہوئی ان آنکھوں کی آس کو توڑنا داؤد کے بس سے باہر تھا، سو اس کے آگے ہار گیا۔

''مجھے اپنے رب سے امید ہے کہ وہ آپ کو زندگی میں بے شمار خوشیوں سے نوازے گا۔'' ثریا اس کے مان جانے سے خوش ہوگئی۔

''اس کے لیے دعا کرنا ثریا..... وہ موت و زیست کی کشمکش میں ہے۔ تم رب سے اس کے لیے زندگی ضرور مانگنا۔'' ثریا کی حالت کے پیشِ نظر اب تک اسے سارہ کے زخمی ہونے کی اطلاع نہیں دی گئی تھی۔ اس وقت داؤد بے ساختہ ہی اس سے التجا کر بیٹھا اور پھر اس کے استفسار پر ساری تفصیل بتانا پڑی۔

''میں اس کے لیے زندگی بھی مانگوں گی اور اسے بھی جو اسے زندگی سے بڑھ کر پیارا ہے۔'' ثریا کے کہے الفاظ نے اس کی ساری الجھنیں دور کر دیں اور اسے اپنے اس سوال کا جواب مل گیا کہ سارہ نے ایک اجنبی کو بچانے کے لیے اپنی جان کیوں خطرے میں ڈالی؟ وہ اجنبی تھا ہی کب؟ وہ تو اس کے دل کا مکین تھا۔

''اور وہ شخص اتنا شاندار ہے کہ اس کے لیے وہ داؤد بن معیز سمیت دنیا کے کسی بھی مرد کو آسانی سے ٹھکرا سکتی ہے۔'' اس نے بہت ایمانداری کے ساتھ خود سے اعتراف کیا۔ خود سے کی جانے والی اس گفتگو کے دوران اس کی توجہ ثریا پر سے ہٹ گئی تھی اس لیے محسوس نہ ہوا کہ وہ یکدم خاموش ہوگئی ہے۔ ایک تیز آہ سنائی دی تو ہڑبڑا کر اس کی طرف متوجہ ہوا۔ اس کے چہرے پر شدید تکلیف کے آثار تھے اور تیز تیز سانسوں کے دوران منہ سے خود بخود آہیں نکلتی چلی جا رہی تھیں۔

''ثریا..... ثریا..... میری پیاری ثریا!'' وہ تڑپ کر اس کی طرف بڑھا لیکن بے بسی ہی بے بسی تھی کہ وہ اسے چھو تک نہیں سکتا تھا۔ چادر کے پیچھے چھپا اس کا آبلہ آبلہ جسم پیار اور ہمدردی بھرا لمس تک برداشت کرنے کے قابل نہیں تھا۔ وہ اپنی ساری مردانگی بھول کر بلک بلک کر رونے لگا پھر خیال آیا تو طبیب کو بلانے کے لیے خیمے سے باہر کا رخ کیا۔ باہر نکلتے ہی طبیبہ سے سامنا ہوگیا۔

''ثریا ٹھیک تو ہے؟'' اس نے داؤد کے چہرے پر چھائی دہشت دیکھ کر گھبرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''اس کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ عجیب اکھڑی اکھڑی سانسیں لے رہی ہے۔''

''آپ اس کے پاس جایئں، میں طبیب کو بلا کر لاتی ہوں۔'' اس کی بات سنتے ہی طبیبہ کہتی ہوئی پلٹ کر دوڑ گئی۔ وہ واپس ثریا کے پاس آیا۔ اب اس کی سانسیں پہلے سے زیادہ تیزی اور بے ترتیبی سے چل رہی تھیں اور آنکھوں کی پتلیاں پلٹنے لگی تھیں۔

''مجھے چھوڑ کر مت جانا ثریا! میرے پاس بس ایک تم

www.pklibrary.com

ہی تو باقی رہ گئی ہو۔'' اس ایک پل میں ماں باپ اور بھائیوں سمیت ان سارے خونی رشتوں کے چہرے اس کی نظروں کے سامنے گھوم گئے تھے جنہیں وہ کب کا خوارزم میں گنوا چکا تھا۔ وہ کسی خوفزدہ بچے کی طرح گھٹنوں کے بل اس کے بستر کے قریب بیٹھ گیا اور اپنا ہاتھ اس کی پیشانی پر رکھا۔ اس کی صبیح پیشانی جلنے سے مکمل طور پر محفوظ رہی تھی اور اس وقت ہمیشہ سے زیادہ روشن دکھائی دے رہی تھی لیکن چھونے پر اسے وہاں ٹھنڈک کا احساس ہوا۔ اس ٹھنڈک نے اسے مزید سہما دیا۔ وہ ایک سپاہی تھا اور موت اس کے لیے کوئی نئی شے نہیں تھی جو وہ سمجھ نہیں پاتا کہ زندگی کے روٹھنے کی کیا نشانیاں ہوتی ہیں لیکن اس وقت وہ کچھ سمجھنا نہیں چاہتا تھا۔

''تم ٹھیک ہو جاؤ گی ثریا! تم تو میری بہت بہادر بہن ہو۔ جیسے دشمن کے سامنے ڈٹ کر کھڑی ہو جاتی ہو ویسے ہی ڈٹ کر موت کا بھی مقابلہ کرو۔'' وہ اسے نصیحتیں کر رہا تھا جو بہت پہلے موت کے فرشتے کی آہٹیں سن چکی تھی اور اب اسے اپنی روح سونپ دینے کے لیے پوری طرح تیار تھی۔

''کلمہ پڑھو دوست! یوں رو کر اور پکار کر ہمشیرہ کے آخری سفر کو مشکل نہ بناؤ۔'' شاہی طبیب کے ساتھ سلیمان کب خیمے میں داخل ہوا، اسے خبر نہیں ہوئی۔ اس نے دونوں شانے تھام کر نصیحت کی تو وہ چونکا اور تڑپ کر بولا۔

''ایسی باتیں مت کرو سلیمان! ثریا ٹھیک ہو جائے گی۔ ابھی ابھی تو یہ مجھ سے اتنی باتیں کر رہی تھی۔''

''چراغ بجھنے سے پہلے ایک بار پوری قوت سے بھڑکتا ہے دوست!'' سلیمان بات اس سے کر رہا تھا اور نظریں شاہی طبیب پر تھیں جس نے داؤد کا ہاتھ ثریا کی پیشانی سے ہٹا دیا تھا اور خود اس کی بند ہو جانے والی آنکھوں کے پپوٹے الٹ کر دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر جو مایوسی تھی، اسی نے سلیمان کو کوئی دلاسا دینے کے بجائے سچ بولنے پر مجبور کیا تھا۔

''انا للہ وانا الیہ راجعون۔'' شاہی طبیب کے لبوں سے یہ آوازِ بلند نکلے ان الفاظ نے اسے مزید سچ بولنے کی زحمت سے بچا لیا اور وہ دوستی کا حق ادا کرنے کے لیے داؤد کے آنسوؤں کا بوجھ اپنے شانے پر اٹھانے کے لیے تیار ہو گیا۔

☆☆☆

''مجھے اندازہ ہے کہ امان نے بہت محبت اور توجہ سے آپ کی پرورش کی ہے۔''

''جی ہاں۔ سچ یہ ہے کہ آج میں جو کچھ ہوں، بابا کی وجہ سے ہوں۔ انہوں نے اپنا سارا ہنر اور علم میرے اندر منتقل کر دیا تھا۔ آپ مجھے ان کا عکس بھی کہہ سکتے ہیں۔'' اس نے حاطب کی بات کا جواب دیتے ہوئے بہت محبت سے سردار امان کو سوچا لیکن اس کا ذہن ابھی تک اس بات میں الجھا ہوا تھا کہ کیا اس کا کوئی اور بھائی بہن بھی اس دنیا میں موجود تھا۔

''آپ واقعی اپنے والد کا عکس ہیں۔ ان ہی کی طرح خوب صورت، وجیہہ، پُروقار، بہادر اور کبھی شعلہ تو کبھی شبنم صفت۔'' حاطب کی نظریں اس کے چہرے پر ٹکی ہوئی تھیں اور ذہن کہیں دور بہت دور بھٹک رہا تھا۔

''آپ بابا کو بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔'' وہ حاطب کا تبصرہ سن کر مسکرایا۔

''کسی کے ساتھ برسوں گزارے جائیں تو انسان اسے جاننے اور سمجھنے لگتا ہے۔''

''یہ تو آپ نے ٹھیک کہا۔'' اس نے حاطب کی تائید کی۔

''لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جس کے ساتھ ہم پوری زندگی گزار دیتے ہیں، اس کی ذات کا کوئی پہلو ہم سے مخفی رہ جاتا ہے اور اس پہلو کا سامنے آجانا ہماری محبت کے لیے امتحان بن جاتا ہے۔ آج آپ کے سامنے بھی ایسا ہی ایک امتحان آ کھڑا ہوا ہے۔''

''آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں؟ میں سمجھنے سے قاصر ہوں۔'' اسے حاطب کی باتوں نے ایک بار پھر الجھا دیا۔

''آپ کے ہوش میں اگرچہ یہ ہماری پہلی ملاقات ہے لیکن یہ اللہ کی طرف سے ہے کہ میں آپ کی زندگی کے بعض پہلوؤں سے آپ سے بھی زیادہ واقف ہوں۔ مثلاً میں جانتا ہوں کہ امان کے بعد آپ کی دوسری عزیز ترین ہستی مطربہ ہے۔'' حاطب نے بات نہیں کی تھی، اس کی سماعتوں میں کوئی دھماکا کیا تھا۔

''نام مت لیں میرے سامنے اس دھوکے باز اور دروغ گو کا۔ اس کا بابا جیسے انسان سے کوئی تقابل نہیں ہے۔'' اس کا لہجہ خود بخود بلند ہو گیا۔

''سچ سے واقف ہونے کے بعد آپ شاید یہ بات نہ کہہ سکیں لیکن میں آپ سے اتنا ضرور کہوں گا کہ جس کے لیے آپ کے لہجے میں اتنی نفرت اور حقارت ہے، وہ آپ پر اپنی جان وار کر اپنے کیے کا کفارہ ادا کر چکی ہے۔'' حاطب کے الفاظ اس کے لیے ایک دوسرا دھماکا تھے۔

www.pklibrary.com

''آپ کا مطلب ہے..... وہ اپنا جملہ مکمل نہیں کرسکا۔

''جی ہاں۔ وہ جو آپ کے حصے کا تیر خود کھا کر اس وقت زندگی اور موت کے درمیان پڑی ہوئی ہے، وہی مطربہ ہے۔ جو آپ کی خاطر اپنی جان دے دینے کا حوصلہ رکھے، اس کی محبت کی سچائی پر آپ شک کیسے کرسکتے ہیں؟'' حاطب کی تصدیق اور پھر اس کے بعد کیے سوال نے اسے اپنا سر تھام کر بیٹھنے پر مجبور کردیا۔

''مجھے افسوس ہے لیکن وقت کی مجبوری ہے کہ آپ کی زندگی کے تمام تلخ حقائق بیان کرنے کی ذمے داری میرے شانوں پر آن پڑی ہے۔ آپ کی کچھ امانتیں ہیں میرے پاس جو میں آپ کے سپرد کرنا چاہتا ہوں۔'' حاطب نے کہتے ہوئے ایک مکتوب اور چھوٹی سی مخملی تھیلی اس کے سپرد کی تو اسے بہت کچھ یاد آگیا۔ یہی چیزیں تو تھیں جنہیں وہ سردار امان کی وصیت پر عمل کرتے ہوئے اس غار میں تلاش کرنے گیا تھا لیکن اسے یہ وہاں نہیں ملی تھیں اور وہ زندگی کے ایک بھیانک تجربے سے گزرنے کے بعد ایمان کی دولت حاصل کرکے لوٹا تھا۔

''یہ مطربہ نے آپ کے حوالے کی ہوں گی؟'' اسے اندازہ تھا کہ اس نے کچھ کمزور لمحات میں اپنے راز اس دشمنِ جاں کے حوالے کردیے تھے۔

''جی ہاں، ایسا ہی ہے لیکن اطمینان رکھیے کہ آپ کی امانتیں محفوظ ہیں اور بحفاظت آپ تک پہنچائی جارہی ہیں۔'' حاطب نے سنجیدگی سے جواب دیتے ہوئے ان تین ہیروں کو دیکھا جو مخملی تھیلی سے ساشا کی ہتھیلی پر منتقل ہوچکے تھے اور ان کی جگمگاہٹ اس کے چہرے پر منعکس ہورہی تھی۔

''آپ کا شکریہ۔'' وہ جواب میں صرف اتنا ہی کہہ سکا۔ اب اسے سردار امان کا لکھا ہوا وہ مکتوب پڑھنے کی بے چینی تھی۔

''شکر گزار تو میں اپنے رب کا ہوں جس نے مجھے امانت کو اس کے حق دار تک پہنچانے کی مہلت عطا کی۔'' حاطب نے انکساری سے جواب دیا اور لمحہ بھر کے توقف کے بعد بولا۔

''آپ اس مکتوب کو تنہائی میں پڑھیں تو آپ کے لیے مناسب ہوگا۔ میری بس آپ سے اتنی گزارش ہے کہ خود سے زیادتی کرنے والوں کو معاف کرنے کی کوشش کیجیے گا کہ کچھ بھی سہی، ان کی آپ سے محبت میں کوئی کھوٹ نہیں تھا۔

''میں اجازت چاہتا ہوں۔'' اس نے حاطب کی درخواست کا کوئی جواب دینے کے بجائے اس سے رخصت طلب کی۔

''جیسی آپ کی مرضی۔'' حاطب احتراماً اسے رخصت کرنے کے لیے کھڑا ہوگیا اور اس کے اس عمل نے اسے ایک بار پھر الجھن میں ڈال دیا۔ ایک دوست کے بیٹے سے محبت تو سمجھ آتی تھی لیکن اس قدر احترام..... اتنا زیادہ احترام اسے الجھن میں ڈال رہا تھا لیکن اس بار اس نے سوال کرنے کے بجائے جواب کے لیے انتظار کرنا مناسب سمجھا۔

باہر نکل کر اس نے دور سے ہی ان خیموں پر نظر ڈالی جہاں لڑائی میں زخمی ہونے والوں کا علاج معالجہ کیا جارہا تھا۔ ان خیموں میں سے کسی ایک میں وہ بھی تھی جس نے اس کے دل پر پہلی بار دستک دی تھی اور جس کے بعد وہ کسی اور کو دل میں جگہ نہیں دے سکا تھا لیکن جب اس کے دیے دھوکے کا علم ہوا تھا تو پھر لگتا تھا کہ اس سے زیادہ کوئی قابلِ نفرین نہیں ہے لیکن آج ایک بار پھر اس نے بازی پلٹ دی تھی اور کہیں کسی اوٹ سے جھانک کر اس سے پوچھ رہی تھی کہ بولو، کیا بھی میری محبت سے منحرف ہوسکو گے؟ وہ اس سوال کا جواب نہیں دینا چاہتا تھا اس لیے خیموں کی طرف جانے کے بجائے رخ موڑ گیا اور اس مقام سے دور ایک الگ تھلگ پہاڑی کے عقب میں جا بیٹھا۔ وہاں بیٹھ کر اس نے ایک بار پھر ہیروں کو نکال کر اپنی ہتھیلی پر پھیلایا اور انہیں غور سے دیکھنے لگا۔ اپنی تراش خراش، رنگت اور چمک کے اعتبار سے وہ اتنے منفرد، قیمتی اور خوب صورت تھے کہ وہ برملا اس بات کا اعتراف کرسکتا تھا کہ اس نے اپنی زندگی میں اس سے بہتر ہیرے کبھی نہیں دیکھے۔

وہ جب تجارتی قافلوں کو لوٹتے تھے تو دیگر مال و متاع کے ساتھ اکثر ہیرے بھی ان کے ہاتھ لگ جاتے تھے اس لیے وہ ان کی قدر و قیمت سے آگاہ تھا اور بغیر کسی شک کے کہہ سکتا تھا کہ ان ہیروں کی قدر و قیمت کا تعین کرنا اس کے بس کی بات نہیں۔ اس نے ہیروں کو دوبارہ تھیلی میں ڈال کر اس کا منہ بند کردیا اور اس مکتوب کی طرف متوجہ ہوا۔

اس کے سامنے جو تحریر تھی وہ اسے سردار امان کی تحریر کے طور پر شناخت کرسکتا تھا لیکن تعجب کی بات یہ تھی کہ بغیر کسی تخاطب کے شروع ہونے والی اس تحریر کو سردار امان

www.pklibrary.com

نے داستان کے سے انداز میں تحریر کیا تھا۔ یہ وہی داستان تھی جو کچھ دیر قبل اس نے حاطب کی زبانی بھی سنی تھی لیکن اس تحریر کو پڑھتے ہوئے اسے اندازہ ہوا کہ حاطب نے اسے ادھوری داستان سنائی تھی۔ داستان کی تکمیل سردار امان نے ان الفاظ میں کی تھی۔

''اپنے گھر اور بچوں کے زندہ جلائے جانے کی خبر نے میرے اندر غم و غصے کی آگ بھڑکا دی تھی لیکن اس ننھی جان کو سینے سے لگائے زندگی کی تلاش میں بھاگتے ہوئے میرے سینے میں محبت کی ایک ننھی سی کونپل کب اور کیسے پھوٹی، مجھے اندازہ ہی نہیں ہو سکا اور اس کے بعد میری زندگی میں جو کچھ ہوا، وہ خود کار طریقے سے ہوتا ہی چلا گیا۔ مجھ پر دھن سوار ہو گئی کہ میں اس بچے کو وہ سب کچھ دوں جو میرے ساتھ نہ آنے کی صورت میں اسے حاصل ہوتا۔ میں نے اس کے قدموں میں مال و دولت کا ڈھیر لگانے کے لیے راہزنی کا پیشہ اختیار کر لیا اور ایک سردار زادے کی حیثیت سے اس کے اندر حکمرانوں کی سی خوبو جگانے میں کامیاب رہا۔ میں نے اسے بے پناہ محبت دینے کے ساتھ ساتھ بہترین تربیت بھی دی اور ہر وہ ہنر سکھایا جو کسی حکمران کے لیے ضروری ہوتا ہے لیکن یہ سب کرتے ہوئے میں بھول گیا تھا کہ میں کچھ بھی کر لوں، اسے وہ مقام نہیں دے سکتا جو اسے اپنے باپ کے ساتھ رہنے کی صورت میں حاصل ہوتا۔'' داستان کے ان الفاظ نے اسے ہلا کر رکھ دیا۔ کیا سردار امان ان الفاظ کے ذریعے اسے یہ بتا رہا تھا کہ وہ اس کا باپ نہیں تھا۔

''میرے راجکمار!''

اگلے دو الفاظ اس کے لیے مزید ہلا دینے والے تھے۔

''آج میں آپ کے حضور اپنے اس جرم کا اعتراف کرتا ہوں کہ ڈاکو میں آپ کو پانے کے بعد نہیں بنا تھا۔ ڈاکو تو میں اس وقت ہی بن گیا تھا جب میں نے راجا پردیپ سنگھ کی سب سے قیمتی متاع لوٹ لی تھی۔ وہ قسمت کا عجیب ہیر پھیر تھا کہ اس صبح آپ کی طبیعت کی خرابی کی صورت میں طبیب شمس الدین کو محل میں طلب نہ کیا جا سکا۔ وہاں معاملات اتنے الجھے ہوئے تھے کہ آپ کی خادمہ نے ایسا کوئی مطالبہ کرنے کے بجائے خود ہی آپ کو طبیب کے پاس لے جانا مناسب سمجھا۔ خادمہ سے ایسی حماقت کا کون سوچ سکتا تھا لیکن جب کچھ ہونا ہو تو اس کے لیے اسباب خود ہی بن جاتے ہیں۔ خادمہ کو بے بس کر کے آپ کو وہاں سے لے کر فرار ہوتے ہوئے میرے دل میں یہی خیال تھا کہ میں راجا کو بھی ویسی ہی چوٹ دے رہا ہوں جیسی چوٹ انہوں نے مجھے پہنچائی ہے لیکن دنیا بنانے والے کے الگ ہی کھیل ہیں۔ اس نے میرے انتقام سے بھرے ہوئے دل کو آپ کی محبت سے بھر دیا اور میں ساری زندگی آپ کے سامنے اس بات پر شرمسار رہا کہ میری وجہ سے ایک راجکمار ان حالوں کو پہنچ گیا ہے۔ اپنے اس جرم کی تلافی کے لیے میں جو اقدامات اٹھا سکتا تھا، وہ میں نے اٹھائے۔ سب سے پہلا کام تو میں نے یہ کیا کہ آپ کو اپنے دین پر چلانے کی کوشش نہیں کی اور یہ فیصلہ وقت پر چھوڑ دیا کہ آپ اپنے لیے جس دین کو مناسب سمجھیں، اس کا انتخاب کر لیں۔

دوسرا کام میں نے آپ کے لیے یہ مکتوب تیار کر کے اس خفیہ غار میں رکھنے کا کیا۔ مجھ میں حوصلہ نہیں تھا کہ جیتے جی آپ کو خود سے جدا کر سکتا اس لیے سوچ لیا کہ مرنے سے قبل غار اور مکتوب دونوں کی نشاندہی کر دوں گا۔ مکتوب کے ساتھ وہ تین ہیرے بھی ہیں جو بطور ولی عہد شاہی نشانی کے طور پر آپ کے گلے میں ڈالے گئے تھے۔ آپ جب بھی لوٹ کر اپنی ریاست واپس جائیں گے، ان ہیروں کے باعث آپ کو پہچان لیا جائے گا۔ یقیناً آپ ایسا اعلیٰ مقام پانے کے لیے وہاں لوٹ کر جانا ضرور پسند کریں گے۔

بالفرض کسی وجہ سے آپ نے اسے پسند نہیں کیا یا کسی وجہ سے نہیں جا سکے تو بھی میں نے اس غار میں آپ کے لیے اتنا مال و زر جمع کر دیا ہے کہ آپ بے شک ایک راجا کی سی نہیں لیکن پُرتعیش زندگی ضرور گزار سکیں گے۔

آخر میں آپ سے بس اتنا کہوں گا کہ اگرچہ میرا جرم معمولی نہیں لیکن اس محبت کے صدقے میں، جو میں نے آپ سے کی اور اپنے زندہ جل کر مر جانے والے بچوں کے مقابلے میں بہت زیادہ کی۔ مجھے میرے اس جرم کے لیے معاف کرنے کی کوشش کیجیے گا۔

آپ سے بے حد شرمسار

آپ کا خادم

سردار امان!''

تحریر ختم ہو گئی تھی لیکن وہ اپنی جگہ سکتہ زدہ بیٹھا ہوا تھا۔ یہ انکشاف کہ جس سردار امان کو وہ ایک مثالی باپ اور انسان کی حیثیت سے پرستش کی حد تک چاہتا رہا تھا، اس کا باپ نہیں تھا۔ اسے اس کا وہ خود کو کندھے پر بٹھا کر چلنا، لاڈ اٹھانا، چومنا، شمشیر چلانا سکھانا، نشانے بازی کی مشق کرانا، اجنڈ ڈاکوؤں کے درمیان رہ کر لکھنا پڑھنا سکھانا اور نہ جانے

www.pklibrary.com

کیا کیا تھا جو ایک کے بعد ایک کر کے یاد آتا چلا جا رہا تھا۔ سردار امان کے ساتھ گزری زندگی کے ان برسوں میں ایک پل بھی تو ایسا نہیں تھا جسے وہ اپنی گرفت میں لیتا اور سوچتا کہ وہ شخص اس کا باپ نہیں تھا اس لیے اس کے ساتھ فلاں زیادتی کر گیا۔ اس شخص نے تو گویا اس سے عشق کیا تھا اور وہ ہمیشہ اس بات پر نالاں رہا تھا کہ جیسا اس کا باپ اسے چاہتا ہے، ویسی محبت کسی اور باپ نے اپنے بیٹے کو نہیں دی ہوگی لیکن اب اس کے ساتھ یہ عجیب ہی سانحہ پیش آ گیا تھا کہ اسے بتایا جا رہا تھا کہ وہ جسے ساری زندگی بابا پکارتا رہا، وہ اس کا باپ ہی نہیں تھا۔

''وہ موت نہیں تھی جس نے مجھ سے میرا باپ چھین لیا تھا۔ یہ آپ ہیں جس نے میرے بابا کو میرا نہیں رہنے دیا۔'' سردار امان کی موت کے بعد یہ دوسری بار تھا کہ اس کی آنکھیں آنسو بہا رہی تھیں۔ جب سردار امان مرا تھا تو اسے لگا تھا کہ وہ اپنی زندگی کے سب سے بڑے غم سے گزر رہا ہے لیکن آج احساس ہو رہا تھا کہ موت سے بڑھ کر بھی کوئی دکھ ہوتا ہے۔ کچھ ایسا جو پل بھر میں سب کچھ زیر و زبر کر دیتا ہے، جو آپ سے آپ کی ہستی کا غرور چھین لیتا ہے جس کے بعد آپ کی ذات کے سارے حقائق بدل جاتے ہیں۔

''میرے باپ سے انتقام لینے کے لیے مجھے ان سے جدا کیا تھا تو میرے ساتھ وہ سلوک بھی کرتے جو کسی دشمن کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ اپنے دشمن کی اولاد کے ساتھ اتنی محبت کون کرتا ہے بھلا؟ آپ نے تو مجھے اپنی محبت کے ہاتھوں مار دیا۔'' وہ سردار امان کے تصور سے ہمکلام ایک کے بعد ایک شکوہ کر رہا تھا۔ اس کے لیے سردار امان کا بیٹا نہ ہونے کا صدمہ اتنا بڑا تھا کہ اپنے ایک راجکمار ہونے کا انکشاف بھی خوش کن محسوس نہیں ہو رہا تھا۔

''میں ہمیشہ کہتا تھا کہ میں اپنے بابا کے جیسا ہوں۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ میں تو اپنے بابا کا ہی نہیں ہوں۔'' آنسو ایک تواتر سے اس کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے لیکن اسے ان کا احساس نہیں تھا۔ اس کے سینے میں دھڑکتا دل اس وقت ایک ایسے لوتھڑے میں بدل چکا تھا جو جسم کو خون کے بجائے درد و اذیت منتقل کر رہا تھا۔ یہ درد اس کی ایک ایک رگ میں دوڑتا اسے سراپا درد بنا چکا تھا۔ ہلنے جلنے سے بھی قاصر وہ کتنی دیر سے ایک ہی زاویے پر بیٹھا ہوا ہے، اسے احساس نہیں تھا۔ وہ تو یہ بھی بھول گیا تھا کہ وہ لڑکی جسے کبھی اس نے ٹوٹ کر چاہا تھا اور پھر اپنے تئیں اس سے اتنی ہی نفرت بھی کی تھی، اپنے کیے کا کفارہ ادا کرنے کے بعد موت وزیست کی کشمکش میں پڑی ہوئی تھی۔ حقیقتاً اس کے لیے اس وقت دنیا میں سب کچھ ختم ہو گیا تھا اور صرف یہ دکھ باقی رہ گیا تھا کہ وہ سردار امان کا بیٹا نہیں ہے۔

''میں آپ کو آپ کا یہ جرم تو معاف کر دوں کہ آپ نے مجھے ایک راجکمار نہیں رہنے دیا لیکن یہ جرم کیسے معاف کر دوں کہ آپ نے مجھے اپنا بیٹا بھی نہیں رہنے دیا۔'' وہ اس بچے کی طرح سسک رہا تھا جس کا ہاتھ بھرے میلے میں اپنے باپ کے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا اور وہ کسی طور باپ کو تلاش نہیں کر پا رہا تھا۔ اس وقت اس کی جو حالت تھی، اگر کوئی اسے دیکھ لیتا تو حیران رہ جاتا کہ یہ وہی سورما ہے جس کی تلوار دشمن پر قہر بن کر برستی ہے، جس کا تیر بھی اپنے نشانے سے نہیں چوکتا اور جس کی بہادری کی مثال ملنا مشکل ہے۔

وقت دھیمی رفتار سے آگے بڑھتا رہا اور آخر کار اس کے آنسوؤں کے سوتے خشک پڑ گئے۔ اب وہ نہ تو رو رہا تھا اور نہ ہی کچھ سوچ رہا تھا۔ وہ بس پتھر کے ایسے مجسمے میں ڈھل گیا تھا جس کے لیے اپنی جگہ سے جنبش کرنا بھی ممکن نہیں رہا تھا۔

''آقا..... میرے آقا.....! آپ یہاں بیٹھے ہیں اور میں پاگلوں کی طرح رات بھر آپ کو ڈھونڈتا رہا۔'' وہ صالح تھا جو صبح دم اسے تلاش کرتا ہوا وہاں آ پہنچا تھا۔

''کیوں تلاش کر رہے تھے تم مجھے؟ کیا میں کھو گیا تھا؟'' اس نے غائب دماغی سے پوچھا۔

''شاید آپ کو علم نہیں ہے کہ داؤد بن معیشرہ کی ہمشیرہ وفات پا گئی ہیں۔ وہ ہمشیرہ کی جدائی کے غم سے نڈھال ہیں اور انہیں ہماری غمگساری کی حاجت ہے۔'' صالح نے اسے اطلاع دی۔

''موت تو یہاں بھی ہوئی ہے۔ بس مرنے والے کا نام نہیں پکارا گیا۔'' اس کے لہجے میں ایسی یاسیت تھی کہ صالح ہل کر رہ گیا اور پہلی بار غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔

''مجھے بتائیے میرے آقا! کیا ہوا ہے آپ کے ساتھ؟ کیا آپ نے کوئی بری خبر سنی ہے؟'' وہ یکدم ہی اس کے قدموں میں بیٹھ گیا اور اس کے دونوں گھٹنے تھام کر اس سے پوچھنے لگا۔

''کب ہوا داؤد کی بہن کا انتقال؟'' اس نے صالح کے سوال کو ٹالا اور دماغ کو حاضر کرتے ہوئے اپنی کیفیت اس سے چھپانے کی کوشش کی۔

''میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ ایسا کیا ہوا کہ آپ سب سے چھپ کر یہاں آ بیٹھے اور آپ تک اتنی اہم خبر نہیں پہنچی

www.pklibrary.com

سکی۔'' صالح کو کرید لگ گئی تھی۔

''آؤ، داؤد کے پاس چلتے ہیں۔ اسے اس وقت ہماری ہمدردی کی ضرورت ہے۔'' اس نے ایک بار پھر صالح کو ٹال دیا اور اپنی جگہ سے کھڑا ہوا۔

''آپ مجھ سے اپنا دکھ چھپانا چاہتے ہیں؟'' صالح کو صدمہ ہوا۔

''فی الحال تو میں خود سے بھی چھپانا چاہتا ہوں۔'' اس نے کہتے ہوئے صالح کے شانے پر تھپکی دی اور پھر اس کا ہاتھ تھام کر چل پڑا۔ اب صالح کی مجال نہیں تھی کہ اس سے کوئی سوال کر سکتا لیکن اندر ہی اندر اس کے لیے پریشان ہوتا رہا۔ جس حال میں اس نے اسے آج دیکھا تھا، اس سے قبل کبھی نہیں دیکھا تھا۔

''سردار زادی لیلیٰ کا کیا حال ہے؟'' صالح کا دھیان بٹانے کے لیے اس نے اس سے دریافت کیا۔

''شاہی طبیب اور سلیمان صاحب دونوں کی مشترکہ رائے ہے کہ ان کی جان بچانے کے لیے ان کا ہاتھ کہنی کے اوپر سے کاٹنا پڑے گا۔'' صالح کے پاس ایک اور افسوس ناک خبر موجود تھی۔ وہ پل بھر کے لیے خبر سن کر خاموش ہو گیا لیکن ابھی ایک اہم سوال باقی تھا جسے کرنے کے لیے اسے اپنی ہمت مجتمع کرنا پڑی۔

''وہ..... وہ لڑکی کیسی ہے جس نے مجھے بچانے کی خاطر خود تیر کھا لیا تھا؟''

''آپ سارہ صاحبہ کا پوچھ رہے ہیں.....؟'' صالح نے اپنے تئیں اسے زخمی لڑکی کے نام سے آگاہ کیا اور اداس لہجے میں بتانے لگا۔

''ان کی حالت ابھی خطرے سے باہر نہیں ہے۔ اطباء کے مطابق زخم بہت گہرا ہے اور خاصا خون بہہ گیا ہے۔ ان کے لیے دوا سے زیادہ دعا کی درخواست کی جا رہی ہے۔'' آج کا سورج صرف بری خبریں لے کر ہی طلوع ہوا تھا۔

''میں نے ان کے لیے بہت دعائیں کی ہیں۔ اپنی جان خطرے میں ڈال کر جس طرح انہوں نے آپ کی جان بچائی ہے، اس کے بعد تو میں عمر بھر کے لیے ان کا مقروض ہو گیا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ آپ کے بعد اب کبھی جس ہستی کا حکم نہ ٹال سکوں گا، وہ ہستی سارہ صاحبہ ہی ہوں گی۔'' صالح کی اس سے محبت اتنی خالص تھی کہ اس سے اسی طرح کے خیالات کی امید کی جا سکتی تھی۔

''وہ آپ پر اپنی جان وار کر اپنے کیے کا کفارہ ادا

کیا آپ
لبوب مُقوّی اعصاب
کے فوائد سے واقف ہیں؟

کھوئی ہوئی توانائی بحال کرنے اعصابی کمزوری دور کرنے تھکاوٹ سے نجات اور مردانہ طاقت حاصل کرنے کیلئے کستوری عنبر زعفران جیسے قیمتی اجزاء والی بے پناہ اعصابی قوت دینے والی لبوب مُقوّی اعصاب ایک بار آزما کر دیکھیں۔ اگر آپ کی ابھی شادی نہیں ہوئی تو فوری طور پر لبوب مُقوّی اعصاب استعمال کریں۔ اور اگر آپ شادی شدہ ہیں تو اپنی زندگی کا لطف دوبالا کرنے یعنی ازدواجی تعلقات میں کامیابی حاصل کرنے کیلئے بے پناہ اعصابی قوت والی لبوب مُقوّی اعصاب ٹیلیفون کر کے گھر بیٹھے بذریعہ ڈاک وی پی VP منگوالیں فون صبح 10 بجے تا رات 9 بجے تک

المسلم دارالحکمت (رجسٹرڈ)
(دیسی یونانی دواخانہ)
ضلع و شہر حافظ آباد پاکستان

0300-6526061
0301-6690383

آپ صرف فون کریں۔ آپ تک لبوب مقوی اعصاب ہم پہنچائیں گے

www.pklibrary.com

کر چکی ہے۔" صالح کی بات سنتے ہوئے حاطب کے الفاظ یاد آئے تو دل کی بے چینی سوا ہوگئی۔

"داؤد بن معیز سے ملاقات سے قبل میں خاتون کی مزاج پرسی کرنا چاہتا ہوں صالح!" بے اختیار ہی اس نے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔

"جیسی آپ کی مرضی آقا! یہ سامنے ہی تو ان کا خیمہ نصب ہے۔" صالح نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ چلتے چلتے وہ اس مقام پر آچکے تھے جہاں ضرورت کے تحت کئی خیمے نصب کیے گئے تھے اور صالح نے ان خیموں میں سے ہی ایک کی نشاندہی کی تھی۔

"میں اجازت لے لیتا ہوں۔" صالح آگے نکل گیا۔ اسے سست روی سے اس کے پیچھے جاتے ہوئے حاطب کی ایک اور بات یاد آئی۔ اس نے کہا تھا۔

"خود سے زیادتی کرنے والوں کو معاف کرنے کی کوشش کیجیے گا کہ کچھ بھی سہی، ان کی آپ سے محبت میں کوئی کھوٹ نہیں تھا۔" اس وقت اس نے حاطب کے الفاظ کو مطربہ کے لیے سفارش سمجھا تھا لیکن حقیقتاً وہ مطربہ کے ساتھ ساتھ سردار امان کے لیے بھی کی گئی سفارش تھی اور وہ حاطب کی اس بات سے انکار نہیں کر سکتا تھا کہ ان دو لوگوں کی محبت میں کوئی کھوٹ نہیں تھا۔ سردار امان کی محبت پر تو شک کرنے کا سوال ہی نہیں تھا جبکہ مطربہ اپنے دامن پر لگا بے وفائی کا داغ اپنے خون سے دھو چکی تھی۔

"طبیب نے میرے اصرار پر تھوڑی سی دیر کے لیے ہی مریضہ کو دیکھنے کی اجازت دی ہے۔ اس کے مطابق مریضہ کی حالت نازک ہے اور آمدورفت سے دوران علاج اس کی توجہ میں خلل پڑتا ہے۔" خیمے کے باہر صالح نے دھیمی آواز میں اسے مطلع کیا تو وہ آہستہ سے سر ہلا کر پردہ اٹھا کر اندر داخل ہوگیا۔ سامنے ہی وہ بند آنکھوں کے ساتھ بستر پر دراز تھی۔ اس کے گلاب رنگ عارض اس وقت کسی خزاں رسیدہ پتے کی طرح زرد پڑے ہوئے تھے اور وہ لب جن کی حرکت سے خوش الحان پرندوں کی چہچہاہٹ سے بھی زیادہ شیریں اور مترنم آواز سنائی دیتی تھی، ایک دوسرے میں پیوست بارش سے محروم صحرا کی طرح بالکل خشک تھے۔

"مطربہ......" اس کے لبوں نے بے آواز سرگوشی میں اسے پکارا...... اس کی نبض تھام کر بیٹھے طبیب نے نبض کی رفتار میں واضح تبدیلی محسوس کی۔

"ایسے بھی کوئی کسی کو چاہتا ہے کہ اپنی جان سے ہی گزر جائے۔" اسے اس حال میں دیکھ کر اس نے چپکے سے شکوہ کیا۔ وہ سامنے تھی تو محبت کے سوا کوئی دوسرا جذبہ یاد ہی نہیں رہا تھا اور یہ محبت ہی تھی جو قطرہ قطرہ کر کے اس اکھڑ، مغرور اور سرپھرے مرد کے دل کو یوں پگھلا رہی تھی کہ اس کی آنکھوں میں نمی اتر آئی تھی۔ اس نمی نے اسے مطربہ کی پلکوں میں ہونے والی لرزش کو دیکھنے نہیں دیا لیکن اپنی مریضہ پر مسلسل نظریں جمائے بیٹھے طبیب سے یہ تبدیلی بھی پوشیدہ نہیں رہی۔ اپنی مریضہ کے اس پہلے جسمانی ردعمل نے اسے جوش سے بھر دیا۔

"مجھے اس قرمزی عرق کی شیشی پکڑاؤ۔" اس نے معاونت کے لیے عقب میں کھڑی خادمہ کو حکم دیا اور پھر خاموش کھڑے ساشا کی طرف رخ کر کے بے اعتنائی سے بولا۔

"برائے مہربانی آپ باہر چلے جائیں۔ مکمل ارتکاز کے لیے مجھے تنہائی درکار ہے۔" ساشا کے پاس اس کی بات ماننے کے سوا چارہ نہیں تھا چنانچہ وہ اس کا چہرہ نظروں میں سموئے واپسی کے لیے پلٹا۔ اس کے رخ موڑتے ہی مطربہ کی سانسیں بے ترتیب ہونے لگیں اور اس کا سینہ یوں پھولنے پچکنے لگا جیسے اسے ایک ایک سانس لینے میں خاصی مشقت کرنا پڑ رہی ہو۔ طبیب نے گھبرا کر اپنی معاون کو کوئی نئی ہدایت جاری کی۔ ساشا نے اس کا یہ گھبرایا ہوا لہجہ سنا تو رخ پھیر کر دوبارہ پیچھے کی طرف دیکھا۔ اب وہ بے چینی سے اپنے ہاتھ پیر پٹک رہی تھی۔

"خاتون کے ہاتھوں کو مضبوطی سے تھام لو۔ حرکت سے زخم کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔" ٹپٹائے ہوئے طبیب نے معاون کو ایک اور ہدایت دی اور خود اس کے خشک لبوں کو کھول کر اس کے منہ میں کسی عرق کے قطرے ٹپکانے کی کوشش کرنے لگا۔

"سا...... سا۔" تڑپتے ہوئے لبوں سے اس نے جو نام پکارا وہ ادھورا تھا لیکن وہ اس پکار کو کیوں نہ سمجھتا جس کی ذات کی تکمیل ہی پکارنے والی کی ذات سے ہوتی تھی۔

"میں تمہارے پاس ہوں مطربہ!" وہ تڑپ کر اس کے قریب گیا اور اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔

"میں نے آپ سے کہا تھا کہ آپ باہر تشریف لے جائیں۔" طبیب اس کی دخل اندازی پر برہم ہوا۔

"میرا یہاں رہنا آپ کی مریضہ کی زندگی کے لیے ضروری ہے محترم!" اس نے رسان سے طبیب کو جواب دیا اور خود اپنا ہاتھ مطربہ کی پیشانی پر رکھ کر اس کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے بولا۔

www.pklibrary.com

''میں یہیں تمہارے قریب موجود ہوں۔ اتنی مشکل سے تو ملی ہو، اب تمہیں چھوڑ کر جانے کی غلطی کیسے کرسکتا ہوں۔ بس اب تم جلدی سے ٹھیک ہوجاؤ۔ مجھے اپنے زندہ رہنے کے لیے تمہاری زندگی کی ضرورت ہے۔''

طبیب چاہتا تھا کہ اس احمق کو جلّا کر یہ بکواس بند کرنے اور باہر نکل جانے کا حکم دے لیکن وہ ایسا نہیں کرسکا۔ اس کی انگلیوں کے نیچے موجود مریضہ کی نبض کی رفتار میں تبدیلی نے اسے ایسا نہیں کرنے دیا۔ وہ دیکھ سکتا تھا کہ نبض کے ساتھ ساتھ اب اس کی سانس کی رفتار بھی قابو میں آتی جارہی ہے۔

''تم تو جانتی ہو نا کہ مجھ سے میرا سب کچھ چھن چکا ہے۔ میری زندگی کے نشیب و فراز سے تم سے بڑھ کو کون واقف ہوسکتا ہے؟ تم میری محرم راز ہو۔ اگر تم بھی مجھ سے چھن گئیں تو کیا میں بالکل خالی ہاتھ نہیں رہ جاؤں گا۔ مجھے خالی ہاتھ رہ جانے سے بچالو مطربہ! میرے لیے، صرف ایک بار میرے لیے لوٹ کر واپس آجاؤ۔'' اس کا نم لہجہ اس کے جذبوں کی شدت کا عکاس تھا۔ اس بار طبیب بالکل خاموش رہا بالکل ایسے جیسے اسے ڈر ہو کہ بولے گا تو کسی کی عبادت میں مخل ہوجائے گا۔ اسے اپنے علم پر کتنا ہی ناز سہی لیکن زندگی کے تجربات نے اسے سکھایا تھا کہ معجزے ہمیشہ علم پر بھاری پڑجاتے ہیں۔ اس وقت بھی وہ اپنے سامنے ایک معجزہ ہوتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ اس شخص کی آمد نے اس کی نیم مردہ مریضہ کے اندر نئی روح پھونک دی تھی۔

''جو کچھ گزر چکا، اسے میں تقدیر کا لکھا سمجھ کر بھلادوں گا لیکن اس بار اگر تم مجھے چھوڑ کر گئیں تو میں تمہیں معاف نہیں کروں گا۔ مجھ سے معافی چاہتی ہو تو تمہیں موت سے مقابلہ کرنا ہی پڑے گا۔'' وہ اپنے اردگرد کسی کی بھی موجودگی سے بے نیاز پوری جان سے اس کی طرف متوجہ تھا۔ وہ جو عالم بے ہوشی میں بھی اس کی آمد کے ساتھ اس کی خوشبو پاگئی تھی، اس کی اپنے کان میں کی گئی سرگوشیوں پر کیسے ردعمل نہ دیتی۔ بند آنکھوں کے پیچھے سے ہی آنسوؤں کا سیلاب امڈا اور آنسو اس کی کنپٹیوں سے بہہ کر تکیے میں جذب ہونے لگے۔ اصل میں محبت میں بے وفائی کا داغ خود پر لگوانے کے بعد اس نے وفا کی منزلیں کچھ ایسی لگن سے طے کی تھیں کہ اپنے عشق میں ساشا سے کئی قدم آگے نکل گئی تھی اور عشق میں یہ مقام پانے والوں کے لیے بھلا اپنے محبوب کی رضا سے بڑھ کر کیا اہم ہوتا ہے۔ وہ اس کے زندہ رہنے کی شرط پر اس کا جرمِ دغابازی معاف کرنے کے لیے تیار تھا تو اب اسے کسی بھکارن کی طرح اپنے رب سے اپنی زندگی طلب کرنا تھی۔

''میں تمہارے آنسوؤں کا نہیں، تمہارے لبوں پر کھیلتی مسکراہٹ اور سریلے گیتوں کا متمنی ہوں مطربہ! تم میری زندگی میں نغمۂ طرب بن کر آئی تھیں اور میں تمہیں ہمیشہ اسی روپ میں دیکھنا چاہتا ہوں۔'' اس کا اپنا دل بے حد بوجھل تھا لیکن وہ اس کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔

''محترم!'' طبیب نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بہت دھیمی آواز میں اسے پکارا تو وہ چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوا۔ اس نے زبان سے کچھ کہنے کے بجائے آنکھ کی جنبش سے مطربہ کی طرف اشارہ کیا تو ساشا نے اس کی نظروں کے تعاقب میں مطربہ کی طرف دیکھا۔ سینے کے قریب اس کی قمیص پر سرخ دھبا دکھائی دے رہا تھا۔ یقیناً ہاتھ پیر ہلنے کے باعث زخم سے خون رسنا شروع ہوگیا تھا اور طبیب کو زخم کا معائنہ کر کے اس کی مرہم پٹی کرنا تھی۔

''اپنے معالج کے ساتھ بھرپور تعاون کرو۔ میں فی الحال تم سے رخصت چاہتا ہوں۔ ان شاء اللہ بہت جلد دوبارہ ملاقات کے لیے آؤں گا اور وہ بھی اس امید کے ساتھ کہ تم کھلی آنکھوں اور مسکراتے لبوں کے ساتھ میرا استقبال کروگی۔'' اس نے طبیب کا اشارہ سمجھتے ہوئے اسے سمجھایا اور دھیرے سے اس کا ہاتھ تھپک کر اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا۔ اس بار وہ پہلے کی طرح بے چین و بے قرار تو نہیں ہوئی لیکن اس کے چہرے کے تاثرات نے ساشا کو بتادیا کہ اس نے اسی پل سے اس کی دوبارہ آمد کا انتظار شروع کردیا ہے۔

وہ بہت بوجھل سا وہاں سے رخصت ہوکر صالح کے ہمراہ داؤد بن معیز سے اس کی ہمشیرہ کے انتقال کی تعزیت کرنے گیا۔ داؤد باوجود ضبط کی کوشش کے، اس غم سے نڈھال تھا۔ اپنی فکریں اور غم بھول کر وہ حتی الامکان اس کا غم بانٹنے کی کوشش کرتا رہا اور وقت کا ایک بہت بڑا حصہ اس کے ساتھ گزار کر بعد از عشا صالح کے ہمراہ اپنے لیے مخصوص خیمے میں لوٹ آیا۔

''آقا.....!'' اس وقت جب وہ بظاہر سونے کے لیے بستر پر دراز ہونے لگا تھا، صالح نے اسے پکارا۔

''میرا زخم ٹھیک ہے صالح اور اس وقت میں کسی مرہم پٹی کی ضرورت محسوس نہیں کررہا اس لیے بہتر ہوگا کہ تم بھی سکون سے آرام کرو اور مجھے بھی سونے دو۔''

www.pklibrary.com

اسے لگا کہ صالح، سلیمان کی ہدایت کے مطابق اس کے زخم کے سلسلے میں کچھ کرنے کا ارادہ رکھتا ہے اس لیے قدرے رکھائی سے اسے ٹالنے کی کوشش کی۔

''مجھے آپ سے اختلاف کی جرأت نہیں میرے آقا! مجھے امید ہے کہ آپ کا زخم ٹھیک ہوگا لیکن میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ آپ ٹھیک نہیں ہیں۔ آپ کے ساتھ کچھ ایسا ہوگیا ہے جس نے آپ کو بری طرح توڑ کر رکھ دیا ہے۔'' اس کے لہجے کی پروا نہ کرتے ہوئے صالح اس کے قدموں میں آبیٹھا اور بڑی عاجزی سے اپنے دل کی بات کہی۔ وہ اس کے الفاظ سن کر گنگ ہوگیا۔ اپنے تئیں تو اس نے اپنے دکھ کو اپنے اندر ہی چھپالیا تھا لیکن اس شخص نے کتنی آسانی سے اسے پڑھ لیا تھا۔

''صالح ان لوگوں میں سے نہیں جو آپ کا چہرہ دیکھ کر آپ کے دل کا حال جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔ صالح وہ شخص ہے جس کا دل آپ کے دل سے منسلک ہے اس لیے ممکن نہیں کہ صالح کے دل کو خبر نہ ہو کہ آپ کا دل تکلیف میں مبتلا ہے۔'' وہ اس کی حیرت کو بھانپ گیا۔

''مت کرو مجھ سے اتنی محبت۔ میں وہ بدقسمت ہوں جسے اس کے ٹوٹ کر چاہنے والے ہی توڑ دینے والی تکلیف دیتے ہیں۔'' وہ بیک وقت یاسیت اور جھنجلاہٹ کا شکار ہوا۔

''جسے کوئی ٹوٹ کر چاہنے والا ہو، وہ شخص بدقسمت کیسے ہوسکتا ہے میرے آقا! محبت تو مہربان ہی خوش قسمتوں پر ہوتی ہے۔''

''بعض اوقات محبت کرنے والے دھوکا بھی دے ڈالتے ہیں۔ محبت میں دھوکا کھانے والے کی بدقسمتی کے بارے میں تم کیا کہو گے صالح؟'' لاشعوری طور پر وہ اس سے اپنا دکھ بانٹنے لگا۔

''محبت کرنے والے دھوکا نہیں دیتے، بس کچھ غلطیاں کر بیٹھتے ہیں لیکن ہمارا قصور یہ ہوتا ہے کہ ہم اس حقیقت کو سمجھے بغیر کہ غلطیاں انسانوں ہی سے ہوتی ہیں، ان سے ضرورت سے زیادہ امیدیں وابستہ کرلیتے ہیں۔ محبت جیسی نعمت کو کھودینے سے بہتر ہے کہ انسان ان غلطیوں کو معاف کردینے کا ہنر سیکھ لے۔'' صالح کا نقطۂ نظر بالکل سیدھا اور صاف تھا۔

''تم عجیب ہی باتیں کررہے ہو صالح! دنیا کی تاریخ بھری پڑی ہے دھوکے اور بے وفائی کی داستانوں سے اور تم سرے سے محبت میں دھوکے کو ماننے کے لیے ہی تیار نہیں ہو۔''

''میں اب بھی اپنے موقف پر قائم ہوں میرے آقا! کیونکہ میرا ماننا ہے کہ جو دھوکا دیتے ہیں انہوں نے کبھی محبت کی ہی نہیں ہوتی۔ وہ بس اس غلط فہمی میں مبتلا ہوجاتے ہیں کہ انہیں محبت ہوگئی ہے۔ آپ ایمانداری سے تجزیہ کیجیے کہ جن لوگوں پر آپ دھوکا دہی کا الزام لگا رہے ہیں، کیا آپ کو ان کی محبت پر کوئی شک ہے۔ اگر ہے تو اطمینان سے انہیں اپنے چاہنے والوں کی فہرست سے نکال دیجیے بصورتِ دیگر دھوکا دہی کا الزام واپس لے کر انہیں محض خطا کار سمجھتے ہوئے معاف کردیجیے۔'' اس کے پاس اس کے مسئلے کا بالکل سیدھا حل موجود تھا۔

''تم نے میرا بہت بڑا مسئلہ حل کردیا دوست! اب میں کم از کم رات کو سکون سے سوسکوں گا۔'' اس نے محبت سے اس شخص کا ہاتھ تھام کر ممنونیت کا اظہار کیا جسے وہ کب کا اپنی غلامی سے آزاد کرچکا تھا لیکن پھر بھی وہ اس کا غلام بن کر رہنے میں ہی خوش تھا۔ اتنے خلوص سے وفا نبھانے والے کے نظریہ محبت پر یقین نہ کرنا بھی محبت کی توہین ہوتی چنانچہ اس نے مان لیا کہ سردار امان اور مطربہ بھی رعایت کے مستحق ہیں اور اگر اس نے انہیں ان کی غلطیوں کے لیے معاف نہیں کیا تو خود بھی زندگی بھر کبھی خوش نہیں رہ سکے گا۔

☆☆☆

''امیر زادی کی وفات پر مجھے دلی افسوس ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور آپ کو یہ صدمہ سہنے کی ہمت دے۔'' امیر ارغل کے مقابل بیٹھ کر یہ تعزیتی کلمات ادا کرتے ہوئے وہ فقط رسم ادا نہیں کررہا تھا بلکہ سچ مچ اسے خوب صورت حورم کے یوں تشنہ آرزو دنیا سے چلے جانے کا دکھ تھا۔

مرتوشاید وہ لوئیس کے ساتھ ہی گئی تھی، اب آتی جاتی سانسوں کا سلسلہ بھی ٹوٹ گیا تھا۔ اگرچہ سلیمان نے اسے پہلے ہی حورم کی مایوس کن حالت سے آگاہ کرتے ہوئے صاف بتادیا تھا کہ اس کے زندہ بچ جانے کا کوئی امکان نہیں ہے پھر بھی اسے اس کے یوں چلے جانے کا شدید دکھ ہوا تھا اور پہلی فرصت میں امیر ارغل سے تعزیت کرنے پہنچ گیا تھا۔

''تمہاری آمد کا شکریہ۔ حقیقتاً ہم خود بھی تم سے ملنا چاہتے تھے۔ ہمارے خیال میں اب وقت آگیا ہے کہ بغیر کسی تاخیر کے آگے کا سفر شروع کیا جائے۔ ہم یہاں کے معاملات میں الجھ کر ویسے بھی بہت وقت برباد کرچکے ہیں۔ اگر مزید دیر کی تو ہمارے ہاتھ کچھ نہیں آئے گا۔'' اپنی

www.pklibrary.com

تعزیت کے جواب میں امیر ارغل کے الفاظ نے اسے حیران کر دیا۔

''حورم ہماری عزیز بیٹی تھی۔ ہمیں اس کی موت کا صدمہ بھی ہے لیکن ہم شعور رکھتے ہیں کہ موت ایک اٹل حقیقت ہے جس سے کسی صورت فرار ممکن نہیں۔ ہم ہزار برس بھی کسی کے مرنے کا سوگ منالیں لیکن اسے واپس لانے کی طاقت نہیں رکھتے تو پھر کسی کے سوگ میں وقت گنوانے کا فائدہ کیا ہے۔ ایسے لاحاصل سوگ سے تو خزانے کی تلاش میں نکل کھڑا ہونا ہمارے خیال میں زیادہ سودمند عمل ہے۔'' یقیناً امیر خود بھی جانتا تھا کہ اس موقع پر خزانے کے بارے میں فکرمند ہونا ایک عجیب بات ہے اس لیے خود ہی وضاحت بھی دینے کی کوششیں کر رہا تھا۔ ساشا کو بے ساختہ ہی حورم سے اپنی آخری ملاقات یاد آئی۔ اس ملاقات کا صرف اور صرف ایک مقصد تھا۔ وہ اس سے اس بات کی یقین دہانی چاہتی تھی کہ وہ رہے نہ رہے، اس کے باپ کو اس کا مقام واپس کر دیا جائے گا اور اسے موقع دیا جائے گا کہ وہ حسب سابق سر اٹھا کر پوری شان سے زندگی گزارے۔ خود سے اپنا محبوب چھین لینے والے باپ کے لیے ایسا جذبہ رکھنے والی بیٹی کی محبت کا یہ صلہ تھا کہ باپ اس کی دائمی جدائی پر چار آنسو بھی بہانے کے لیے تیار نہیں تھا۔

''پھر کیا خیال ہے تمہارا؟ یہاں سے کب تک ہماری روانگی ممکن ہو سکے گی؟'' امیر ارغل کے لیے اس کی خاموشی ناقابل قبول تھی۔

''اس سلسلے میں آپ پر کسی قسم کی پابندی نہیں ہے۔ آپ جب چاہیں یہاں سے روانہ ہو سکتے ہیں۔''

''کیا مطلب؟ کیا تم آگے کے سفر میں ہمارے ساتھ نہیں ہو گے؟'' امیر کو اس کے جواب نے چونکا دیا۔

''کچھ ذاتی مسائل کی وجہ سے میری یہاں سے فوری روانگی ممکن نہیں ہے اس لیے بہتر ہوگا کہ آپ اپنا وقت ضائع کرنے کے بجائے سفر کا آغاز کر دیں۔'' اس نے احتیاط سے جواب دیا۔

''ہمیں یہ بات منظور نہیں ہے۔ تم ہمارے ساتھ سفر پر روانہ ہوئے تھے اور اصولاً ہمارے ساتھ ہی رہنے کے پابند ہو۔'' امیر ارغل کو اس کا جواب پسند نہیں آیا تھا۔

''میں اب وہ نہیں رہا امیر محترم، جو آپ کے ساتھ سفر پر روانہ ہونے سے قبل تھا۔ اس سفر نے مجھے زندگی کے ایسے تجربات سے گزارا ہے کہ میرے لیے مال و دولت اور خزانوں وغیرہ کی کوئی اہمیت نہیں رہی ہے۔'' اس نے اپنے اندر کا سچ بیان کیا۔

''بے شک تمہیں دلچسپی نہ رہی ہو لیکن ہمیں تمہیں اپنے ساتھ رکھنے میں دلچسپی ہے۔ تم یہ سوچ کر اس سفر پر ہمارے ساتھ چلو کہ حاصل ہونے والے خزانے سے عوام کی فلاح و بہبود کے بہت سے کام انجام دیے جا سکیں گے۔ کیا ایک اچھا مسلمان اپنے مسلمان بھائیوں کی مدد کا ایسا بہترین موقع ہاتھ سے نکلنے دے سکتا ہے؟'' امیر زمانہ شناس تھا اس لیے اسے قائل کرنے کے لیے وہ نکتہ پیش کیا جو اس کے دل کو چھو سکے۔ حقیقتاً اس سفر پر روانگی سے قبل ہی ایک ماہر نجوم نے اسے تجویز دی تھی کہ ساشا نامی اس نوجوان کو اس سفر میں اپنے ساتھ رکھنا امیر کے لیے مبارک ثابت ہوگا، اس لیے امیر کی کوشش ہونی چاہیے کہ آخری مرحلے تک اسے اپنے ساتھ رکھیں۔ امیر کو اپنے اس نجومی کی پیش گوئیوں پر بڑا اعتماد تھا اس لیے کسی پر ظاہر نہ کرنے کے باوجود اسے یقین تھا کہ خزانے کی تلاش ساشا کے بغیر ممکن نہیں ہوگی۔ راستے میں پیش آنے والے مصائب سے نمٹنے میں ساشا کے کردار نے اس کے یقین کو مزید پختہ کر دیا تھا اور اب وہ ہر حال میں اسے اپنے ساتھ رکھنا چاہتا تھا۔

''میں آپ کے حکم کو ماننے سے انکار نہیں کر سکتا لیکن آپ سے تھوڑی سی رعایت کا طلب گار ہوں۔ میرا آپ کو مشورہ ہے کہ آپ اپنے ساتھیوں کے ساتھ خسرو کی تلاش میں روانہ ہو جائیں۔ آپ کے خادمین میں شکور الحمد للہ سلامت ہے اور خسرو کے ساتھ موجود ناصر کو شناخت کر سکتا ہے۔ آپ شکور کی مدد سے ناصر کا کھوج لگا کر خسرو تک بہ آسانی پہنچ سکتے ہیں۔ اس کے بعد اس سے نقشے کا حصول آپ کے لیے یقیناً مشکل نہیں ہوگا۔ جس عرصے میں آپ یہ کام نمٹائیں گے، میں بھی اپنے ضروری امور سے فارغ ہو کر آپ سے آملوں گا۔ آگے کی مہم میں آپ مجھے اپنے ساتھ پائیں گے۔'' اس نے تجویز پیش کی۔

''ہم سمجھنے سے قاصر ہیں کہ یہاں اس اجنبی علاقے میں تمہیں ایسے کون سے ضروری امور انجام دینے ہیں کہ تم اس مہم کو ہی فراموش کر بیٹھے ہو جسے انجام دینے کے لیے یہ سفر اختیار کیا گیا تھا۔'' امیر اس کی تجویز سن کر جز بز ہوا اور پہلو بدلتے ہوئے ناگواری کا اظہار کیا۔

''زندگی میں سب کچھ ویسے ہی ہو جیسے ہم نے طے کر رکھا ہے تو دنیا بنانے والے کے اختیار کو کون تسلیم کرے گا۔ اس کے اختیار اور مرضی کے آگے مجھ سمیت ہر ایک بے بس ہے۔ برائے مہربانی آپ میری بے بسی کو سمجھیے اور مجھے

www.pklibrary.com

اس بات کے لیے مجبور نہ کیجیے جسے ماننا میرے اختیار میں ہی نہیں ہے۔'' یہ عاجزی اور انکسار اس کی فطرت کا حصہ نہیں تھا لیکن اب یہ صفات بھی خود بخود اس کے اندر پیدا ہونے لگی تھیں۔ راجا پردیپ سنگھ کے بیٹے نے وقت سے سیکھ لیا تھا کہ اگر بنانے والے کو اسے منکسر و مغرور ہی رکھنا ہوتا تو وہ اسے راجا پردیپ کے محل کے بجائے سردار امان کے ڈیرے پر پروان نہ چڑھاتا اور نہ ہی زندگی کے اتنے نشیب و فراز سے گزارتا۔ امیر ارغل جو اتنے دنوں کے ساتھ میں اس کے مزاج کے کئی رنگ دیکھ چکا تھا، اس انداز پر سوچ میں پڑ گیا۔ اس کی زمانہ شناسی نے اسے بتا دیا تھا کہ اس سے زیادہ زور دینا کسی طور مناسب نہیں ہوگا اس لیے بادل ناخواستہ ہی سہی، اس کی درخواست قبول کر کے دوسرے ضروری امور طے کرنے لگا۔

☆☆☆

''یوں راہ روکنے پر معافی چاہتی ہوں لیکن مجھے آپ سے ایک ضروری بات کرنا ہے۔'' وہ امیر ارغل سے ملاقات کر کے باہر نکلا ہی تھا کہ ایک بوڑھی عورت نے اس کی راہ روک لی۔

''جی کہیے۔'' اس نے عورت پر ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈالی اور کہا لیکن پھر فوراً ہی اس کی توجہ یوسف کی طرف مبذول ہوگئی۔ یوسف اپنے اہلِ خانہ سے ملاقات کا خواہشمند تھا اس لیے سالار سے اجازت لے کر اس کے ساتھ اپنی بستی آیا تھا۔ بستی پہنچ کر اس نے اپنے گھر کا رخ کیا تھا جبکہ وہ امیر ارغل سے ملاقات کے لیے آگیا تھا۔ یہ ملاقات اس کی توقع سے کافی زیادہ طویل ہوگئی تھی پھر بھی اس کا خیال تھا کہ یوسف کیونکہ گھر والوں سے ملنے گیا ہے اس لیے اتنی جلدی فارغ نہیں ہوگا اور اسے یوسف کو لینے اس کے گھر جانا پڑے گا لیکن وہ اس کے انتظار میں خیمے کے باہر موجود تھا۔

''میں کافی دیر سے آپ کا انتظار کر رہا ہوں۔'' اسے اپنی طرف متوجہ پا کر یوسف نے بتایا۔

''مجھے تمہارے اتنی جلدی آنے کی امید نہیں تھی۔ تم اندر پیغام ہی بھجوا دیتے تاکہ تمہیں اتنی دیر انتظار نہ کرنا پڑتا۔'' یوسف سے مخاطب ہونے کے باوجود اسے احساس تھا کہ وہ بوڑھی عورت اب بھی وہیں موجود ہے اور اس کے متوجہ ہونے کی منتظر ہے۔

''انتظار کرنے سے مجھے کوئی زحمت نہیں ہوئی۔ دو تین جاننے والے مل گئے تھے، ان سے گفتگو میں وقت آسانی سے گزر گیا۔ میں نے یہاں آنے میں عجلت اس لیے دکھائی تھی کہ آپ کو زیادہ دیر انتظار نہ کرنا پڑے۔ ویسے بھی گھر پر آپ کا بہت شدت سے انتظار ہو رہا ہے اور میرے بھائیوں کی خواہش ہے کہ آپ کھانا ان کے ساتھ کھائیں۔'' یوسف نے اسے بتایا۔

''اس تکلف کی کیا ضرورت تھی؟''

''تکلف نہیں، یہ ان کی خوشی ہے۔ وہ میرے دوستوں کو بہت اہمیت دیتے ہیں اور ویسے بھی آج ہماری الوداعی ملاقات ہے۔ میری چھٹیاں ختم ہوگئی ہیں اور کل مجھے سلطانی سپاہ کے دستے کے ساتھ ہی روانہ ہونا ہے۔'' یوسف نے اسے بتایا۔

''اچھا تو پھر کچھ دیر انتظار کرو۔ مجھے ان خاتون کی بات سننا ہے۔'' اس نے یوسف سے کہا اور تحمل سے انتظار کرتی خاتون کی طرف متوجہ ہوا۔ اس بار اس کی نظروں نے خاتون کے چہرے کو بہتر طور پر دیکھا اور وہ ٹھٹک گیا۔ یہ چہرہ اسے یہاں نظر آئے گا، اس کا اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔

''میری بات کچھ طویل ہے سردار! اور یوں کھڑے کھڑے نہیں ہو سکے گی اس لیے آپ کو نا گوار نہ ہو تو میرے خیمے میں چل کر ذرا اطمینان سے سن لیں۔'' بوڑھی خاتون نے اس سے درخواست کی۔

''میں تم سے معذرت چاہتا ہوں یوسف! لیکن میرا خاتون کی بات سننا ضروری ہے۔ بہتر ہے کہ تم گھر واپس لوٹ جاؤ اور یہ وقت اپنے گھر والوں کے ساتھ گزارو۔ میں فارغ ہو کر کسی کی مدد سے خود وہاں پہنچ جاؤں گا۔'' اسے معلوم تھا کہ خاتون اس سے جو بھی گفتگو کریں گی، وہ تنہائی کی متقاضی ہوگی اس لیے یوسف کو سلیقے سے وہاں سے روانہ کر دیا۔

''میں نے اس سے قبل بھی آپ تک ملاقات کی درخواست بھیجی تھی لیکن شاید آپ کو فرصت نہیں مل سکی۔ ملاقات بہت ضروری تھی اس لیے آج جیسے ہی مجھے آپ کی آمد کی اطلاع ملی تو میں امیر ارغل کے خیمے کے باہر آپ کے انتظار میں آ کھڑی ہوئی۔ امید ہے میری یہ جسارت آپ کو بری نہیں لگی ہوگی۔'' کچھ دیر بعد جب وہ خاتون کے خیمے میں اس کے روبرو بیٹھا ہوا تھا، اس نے گفتگو کا آغاز کیا۔ اس کے ان الفاظ کو سن کر اسے یاد آیا کہ جب وہ لوگ ثوبان اور قابوس پر حملہ کرنے جا رہے تھے تو اسے امیر سفیان کے قافلے کی کسی عورت کی طرف سے ملاقات کا پیغام ملا تھا لیکن

www.pklibrary.com

اس وقت اس کے پاس ملاقات کا موقع نہیں تھا اور بعد میں اتنی مصروفیت ہوگئی تھی کہ یہ بات ذہن سے ہی نکل گئی تھی۔

''آپ کو جو کہنا ہے وہ کہیں۔'' اس نے خاتون کی تمہید کا مختصر الفاظ اور سپاٹ لہجے کے ساتھ جواب دیا۔ اس کے لیے اس عورت سے اس سے بہتر لہجے میں بات کرنا ممکن نہیں تھا اور یہ بات وہ عورت بھی جانتی تھی اس لیے جھکے ہوئے سر اور نم آنکھوں سے بولی۔

''میں جانتی ہوں سردار کہ میرے خاندان نے آپ کے ساتھ بہت برا کیا اور ہمارے اس سلوک کے بدلے آپ ہم میں سے ہر ایک کے ساتھ شدید نفرت کرنے کا حق رکھتے ہیں پھر بھی میری آپ سے درخواست ہے کہ آپ کم از کم مطربہ سے نفرت نہ کریں۔ وہ بری نہیں تھی لیکن ہم نے اسے پالنے کا خراج وصول کرنے کے لیے ..... برا بنا دیا۔'' عورت جو حکیم حاذق کی بیوی تھی، بولتے بولتے رونے لگی۔ اس کے رونے میں ایک ندامت اور شرمندگی سی تھی۔

''میں سب کچھ تفصیل سے سننا چاہتا ہوں۔'' اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ قافلے میں شامل ہونے کے باوجود عورت کا مطربہ سے سامنا نہیں ہوا ہے لیکن فوری طور پر اسے کچھ بتانے کے بجائے اس سے سوال کیا۔

''بہت سی باتوں کا شاید آپ کو پہلے سے ہی معلوم ہو۔ حاذق کے دل میں کافی عرصے سے بے ایمانی آ گئی تھی۔ وہ لوٹ کے مال میں سے سردار کے سب سے بڑا حصہ وصول کرنے پر ناخوش رہتا تھا اور اس کے اپنے دل میں سرداری کی خواہش تھی لیکن سردار امان کے رعب و دبدبے کی وجہ سے ان کے مقابل کھڑا ہونے کی ہمت کبھی نہیں تھی۔ سردار کے اتفاقاً زخمی ہو جانے پر اسے اپنا خواب پورا کرنے کا موقع مل گیا۔ اس نے اپنے پیشے سے بددیانتی کرتے ہوئے سردار کے زخم کو زہر سے خراب کر دیا اور سردار کی بیماری کے عرصے میں کچھ اپنے ہم خیال لوگوں کے ساتھ مل کر سازش کا جال بنتا رہا۔ اس نے لوگوں کو باور کروا دیا کہ ضروری نہیں کہ سردار کا بیٹا ہی گروہ کا سردار بنے۔ سرداری کسی بھی بہادر نوجوان کو مل سکتی ہے۔ کئی لوگوں نے اس کی تائید کی۔ سردار کی وفات کے بعد جب آپ اپنے غم میں ڈوب کر آس پاس سے بے خبر ہو گئے تھے، اسے اس سازش کو پھیلانے کا مزید موقع ملا اور اس نے اپنے مقصد کے حصول کے لیے مطربہ کو بھی استعمال کرنے سے گریز نہیں کیا۔ مطربہ کے ذریعے ایک طرف وہ آپ کو کمزور کرنا چاہتا تھا اور دوسری طرف اس دولت تک رسائی بھی جو اس کے خیال میں سردار امان نے کہیں کسی خفیہ جگہ چھپا رکھی تھی۔ مطربہ اس سب سے خوش نہیں تھی لیکن باپ کے حکم پر اسے طوعاً و کرہاً عمل کرنا ہی پڑتا تھا لیکن جب اسے علم ہوا کہ جس شخص کو باپ سمجھ کر وہ اس کے ہر حکم کی تعمیل کر رہی ہے، وہ اس کا سگا باپ نہیں بلکہ ماں باپ کا قاتل ہے تو اسے حاذق سے نفرت ہوئی اور اس نے عین اس موقع پر جب آپ کے قتل کی سازش پر عمل ہونے ہی والا تھا، پیغام بھجوا کر آپ کو جان بچانے کا موقع فراہم کر دیا۔ اس واقعے کے بعد وہ میرے سامنے بہت دیر تک روتی رہی تھی اور اپنے باپ بھائی کو برا بھلا بھی کہتی رہی تھی جنہوں نے اسے ایک ایسے شخص کے خلاف استعمال کیا جو اسے اچھا لگتا تھا۔'' عورت نے ذرا سا توقف کیا۔

''مطربہ اب کہاں ہے؟'' اس نے انجان بن کر عورت سے سوال کیا۔

''حاذق کو پتا چل گیا تھا کہ آپ کے فرار میں اس کا ہاتھ ہے۔ اس نے پیغام لے کر جانے والی کنیز کو بے دردی سے قتل کر دیا تھا اور مطربہ کے بارے میں بھی ایسا ہی ارادہ رکھتا تھا لیکن میرے لیے یہ ناقابلِ قبول تھا۔ میں نے اس چھوٹی سی بچی کو اپنے ہاتھوں سے پال کر جوان کیا تھا۔ میں اسے مرتا ہوا نہیں دیکھ سکتی تھی اس لیے میں نے اسے فرار کروا دیا تھا۔ فرار ہو کر وہ کہاں گئی اور کس حال میں ہے؟ مجھے کچھ خبر نہیں۔ بس میں اپنے رب سے دن رات اس کی سلامتی کی دعائیں مانگتی رہتی ہوں۔'' عورت کے آنسو ایک بار پھر بے قابو ہوئے۔

''مطربہ کے اصل والدین کون تھے؟'' اس نے یونہی عورت سے سوال کر ڈالا۔

''ہمارے گروہ نے ایک قافلے پر حملہ کیا تھا۔ حملے کے وقت سردار امان کی ہدایت ہوتی تھی کہ قتل و غارت سے ہر ممکن گریز کریں اور بہت سے بہت محافظوں کو زخمی کرنے پر اکتفا کریں لیکن ایک تو اپنی جان بچانے کی فکر میں کسی کو یہ ہدایت یاد نہیں رہتی تھی، دوسرے حاذق سمیت کچھ لوگ مزاجاً بھی قتل و غارت کو پسند کرتے تھے اس لیے لوٹ مار کرتے ہوئے کئی لوگ ان کے ہاتھوں مارے بھی جاتے تھے۔ مطربہ کے ماں باپ کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا اور ماں کی لاش کے قریب روتی بلکتی بچی کو حاذق پتا نہیں کس جذبے کے باعث اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ میں نے اس کے گلے میں موجود صلیب دیکھ کر اندازہ لگایا تھا کہ اس کے والدین نصرانی تھے۔'' عورت کے جواب نے اسے کچھ پل

www.pklibrary.com

کے لیے خاموش کر دیا۔ اسے شدت سے احساس ہو رہا تھا کہ وہ کیسے قابل نفرت پیشے سے وابستہ رہا تھا۔

''یقیناً آپ مجھے یہاں دیکھ کر حیران ہوئے ہوں گے؟'' اسے خاموش پا کر عورت نے خود ہی بولنا شروع کر دیا۔

''مجھے لگتا ہے کہ خدا نے مجھے شاید آپ کو یہ بتانے کے لیے آپ تک پہنچایا ہے کہ مکافاتِ عمل سے کوئی نہیں بچ سکا اور لالچ میں اندھے ہو جانے والے خود اپنے ہی کھودے ہوئے گڑھے میں گر گئے۔''

''کیا ہوا تھا؟'' اسے عورت کے الفاظ نے کسی انہونی کا احساس دلایا اور سرسراتی آواز میں پوچھا۔

''حاذق اور اس کے ساتھیوں کے درمیان پھوٹ پڑ گئی۔ کئی لوگوں کو لگنے لگا کہ حاذق نے اپنے بیٹے کو سردار بنا کر ناانصافی کی ہے کیونکہ وہ اتنا بہادر اور عقلمند نہیں ہے جتنا کہ ایک سردار کو ہونا چاہیے۔ حاذق کو چاہیے تھا کہ لوگوں کی اس بات پر توجہ دیتا لیکن وہ اپنی ضد پر اڑا رہا اور مجھے اپنی زندگی کی سب سے خوفناک رات دیکھنا پڑی۔'' عورت نے بولتے بولتے جھرجھری لی اور پھر یوں گہرے گہرے سانس لینے لگی جیسے خود کو سنبھالنے کی کوشش کر رہی ہو۔ وہ بنا دخل دیے اس کی طرف دیکھتا رہا۔

''اس رات دلبر کی بیوی کو بچہ ہونے والا تھا۔ وہ مجھے زچگی میں مدد دینے کے لیے اپنے ساتھ لے گیا۔ معاملہ پیچیدہ تھا۔ مجھے اس بچے کو دنیا میں لانے کے لیے بہت محنت کرنا پڑی۔ اس دوران میں نے باہر شور بھی سنا لیکن زچہ اور بچہ کی جان بچانے کی جدوجہد میں مجھے باہر جا کر حالات معلوم کرنے کا موقع نہیں ملا۔ ابھی بچے نے دنیا میں آ کر پہلی سانس ہی لی تھی کہ دلبر گھبرایا ہوا میرے پاس آیا اور مجھ سے اپنے ساتھ آنے کی درخواست کی۔ باہر نکلتے ہی اس نے مجھے ایک گھوڑے پر بٹھایا اور ڈیرے سے باہر لے جانے لگا۔ میں نکلتے نکلتے بس اتنا دیکھ سکی کہ جس طرف ہمارا خیمہ نصب تھا، وہاں سے آگ کے شعلے اٹھ رہے ہیں۔ میں دلبر سے اس بارے میں پوچھتی رہی لیکن اس نے مجھے کچھ نہیں بتایا اور جب ہم ڈیرے سے کافی دور نکل گئے تو گھوڑا روک کر میرے آگے ہاتھ جوڑتا ہوا بولا.....'' عورت بولتے بولتے یوں رکی جیسے اگلا جملہ ادا کرنا اس کے لیے مشکل ہو۔ حقیقتاً آنسوؤں کا ایک گولہ تھا جو اس کے حلق میں اٹک گیا تھا۔ ساشا نے ادھر ادھر نظریں دوڑا کر دیکھا اور ایک طرف رکھی صراحی میں سے کٹورے میں پانی انڈیل کر لے آیا۔

''پانی پی لیں۔'' نرمی سے بولتے ہوئے اس نے کٹورا عورت کو تھمایا۔ عورت نے اس میں سے بہ مشکل ایک گھونٹ پانی پیا لیکن بہرحال وہ بولنے کے لائق ہو گئی۔

''دلبر نے مجھے بتایا کہ حاذق اور میرے بیٹے کو ہمارے خیمے میں آگ لگا کر ہلاک کر دیا گیا ہے۔ ہلاک کرنے والوں کے علم میں یہ بات نہیں تھی کہ میں خیمے میں موجود نہیں ہوں اور دلبر چاہتا تھا کہ میں کسی کے علم میں آنے سے پہلے پہلے وہاں سے فرار ہو جاؤں۔ شوہر اور بیٹے کے بعد میرے لیے دنیا میں کچھ نہیں بچا تھا لیکن زندہ جلائے جانے کی اذیت بھی قابل قبول نہیں تھی اس لیے وہاں سے روانہ ہو گئی۔ میری کوئی منزل تو تھی نہیں بس گھوڑا دوڑتا ہوا جہاں لے گیا، وہاں پہنچ گئی۔''

''یعنی امیر سفیان کے قبیلے میں؟'' اس نے اندازہ لگایا۔

''ہاں۔'' عورت نے اثبات میں سر ہلایا اور مزید بتانے لگی۔

''وہاں میری ان آدمیوں میں سے ایک سے ملاقات ہوئی جو آپ کے تعاقب میں گئے تھے اور پھر کبھی لوٹ کر نہیں آ سکے تھے۔ ہم نے ایک دوسرے کو پہچان لیا، یوں امیر سفیان کو پتا چل گیا کہ میں آپ سے واقف ہوں۔ اس آدمی کی موت کے بعد امیر کا مجھ پر دباؤ تھا کہ میں امیر ارغل پر آپ کی اصلیت کھول دوں۔ میں نے دل میں اس کی بات نہ ماننے کا فیصلہ کر رکھا تھا لیکن اللہ کا شکر ہے کہ اس کی نوبت ہی نہیں آئی اور اب میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ اللہ نے آپ کو کیسی عزت اور مقام سے نوازا ہے۔ حاذق کی سازش سے آپ کا کچھ بگڑا نہیں بلکہ سنورا ہی سنورا ہے۔ اگر آپ وہاں رہتے تو ایک رذیل پیشے سے ہی وابستہ رہتے اور آپ کے حصے میں کبھی وہ دعائیں نہیں آتیں جو آج آپ کو مل رہی ہیں۔'' عورت کی باتوں میں ایسی حقیقت تھی جسے وہ کبھی جھٹلا نہیں سکتا تھا۔ واقعی اللہ نے اس کے لیے شر میں سے خیر کو نکالا تھا۔

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ مجھے حکیم حاذق اور آپ کے بیٹے کی موت پر بھی افسوس ہے۔ میں اس بات سے انکار نہیں کروں گا کہ جب میں وہاں سے نکلا تھا تو میرے دل میں ان کے لیے بڑے منتقمانہ جذبات تھے لیکن ایمان قبول کرنے کے بعد دھیرے دھیرے سب کچھ بدل گیا۔ اب تو میں ان کو تقریباً بھول ہی گیا تھا۔''

''اگر تم سچے ہو تو وعدہ کرو کہ اگر زندگی میں کسی موڑ پر

www.pklibrary.com

مطربہ سے ملاقات ہوئی تو اس کے ساتھ بھی نرمی سے پیش آؤ گے۔'' اس کا جواب سن کر عورت بیتابانہ بولی۔

''یہ وعدہ تو میں آپ سے نہیں کرسکتا۔'' اس نے نہایت سنجیدہ تاثرات کے ساتھ اسے جواب دیا۔

''خدارا ایسا نہ کہیں۔ جب آپ بڑے مجرموں کو معاف کرسکتے ہیں تو مجبور اُن کا ساتھ دینے والی میری بچی کو کیوں نہیں معاف کرسکتے؟'' عورت تڑپ اٹھی۔

''وہ اس لیے کہ میں آپ کے کہنے سے پہلے ہی ایسا کرچکا ہوں۔ اللہ کی مہربانی سے وہ مجھے مل چکی ہے اور ہمارے درمیان ہر غلط فہمی دور ہوچکی ہے۔''

''کیا واقعی؟'' عورت کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

''میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔ تھوڑی دیر بعد میں سردار مراد کی بستی کے لیے واپس روانہ ہونے والا ہوں۔ آپ بھی میرے ساتھ چل کر خود اپنی آنکھوں سے اسے دیکھ لیجیے گا۔'' اس نے مسکرا کر عورت کو یقین دہانی کروائی۔

☆☆☆

''اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟'' داؤد نے ہمیشہ کی طرح چہرہ نقاب کے پیچھے چھپائے بیٹھی لیلیٰ سے دریافت کیا۔ ثریا کی دائمی جدائی کا غم ایسا نہیں تھا جسے وہ آسانی سے فراموش کردیتا لیکن اسے اپنے غم کو اپنے اندر چھپا کر جینے کا فن آتا تھا۔ وہ غم کو سینے سے لگا کر اپنا آپ گھلا دینے کے بجائے دوسروں کے دکھ درد بانٹ کر اپنے غموں کا علاج کرنے والا آدمی تھا چنانچہ ایک بار پھر حوصلے کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

''الحمد للہ! میں ٹھیک ہوں اور اپنے رب کے بعد آپ سب کی شکر گزار ہوں کہ آپ نے اس کڑے وقت میں اپنے مسلمان ہونے کا حق ادا کرتے ہوئے ہماری اس قدر مدد کی کہ بڑی سے بڑی قربانی دینے سے دریغ نہیں کیا۔ ثریا بہن کی لازوال قربانی نے تو مجھے مرتے دم تک اپنا مقروض کردیا ہے۔'' لیلیٰ نے جھکی نظروں لیکن خلوصِ دل سے اعتراف کیا۔

''انسان میں اتنی طاقت کہاں کہ کسی کی مدد کرسکے۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ یہ آپ کی اور آپ کے والد کی لگن اور نیک نیتی تھی جس کے باعث اوپر آسمانوں سے آپ کی مدد کے اسباب پیدا کیے گئے اور آپ نے قابوس اور ثوبان جیسے شیطان صفت لوگوں کی سازشوں سے نجات پائی۔ میری دعا ہے کہ جس فتنے سے نجات کے لیے آپ کے والد نے اپنی جان نچھاور کی اور آپ نے بھی بہت بڑی قربانی دی، وہ فتنہ دوبارہ پھر کبھی سر نہ اٹھا پائے اور آپ لوگ ایمان کے ساتھ اپنی یہ سادہ اور خالص زندگی جیتے رہیں۔'' بولتے ہوئے اس کی نظریں بے ساختہ ہی لیلیٰ کے اس شانے کی طرف اٹھ گئی تھیں جس کے ساتھ اب اس کا بازو منسلک نہیں رہا تھا۔ اس بہادر لڑکی نے اپنے اتنے بڑے نقصان کو بہت حوصلے سے سہا تھا اور زبردست قوتِ برداشت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ذہنی کے ساتھ ساتھ جسمانی تکلیف بھی پامردی سے جھیل گئی تھی۔ اطباء تک اس کی اس قدر برداشت اور ہمت کو دیکھ کر حیران رہ گئے تھے۔

''آمین۔ اللہ آپ کی دعا قبول کرے۔ مستقبل میں ایسے کسی فتنے سے بچنے کے لیے میں جلد بستی کے سرکردہ لوگوں کے ساتھ مل کر کوئی حکمتِ عملی ترتیب دینے کا ارادہ رکھتی ہوں۔ ہوسکتا ہے کہ ہم مرکز سے درخواست کریں کہ ہمارے علاقے میں ایسے علماء اور مبلغین بھیجے جائیں جو کم از کم بنیادی عقائد اس طرح لوگوں کے ذہنوں میں راسخ کردیں کہ پھر کسی بہکانے والے کے لیے بہکانا ممکن نہ رہے۔'' اس نے داؤد کو اپنے مستقبل کے ارادوں سے آگاہ کیا۔

''اچھا خیال ہے، لیکن اس سے قبل آپ کو ان لوگوں پر توجہ دینا ہوگی جو ثوبان کے عقائد سے متاثر ہوچکے ہیں۔ ان لوگوں کے سلسلے میں ذرا بھی بے احتیاطی کی گئی تو یہ مستقبل میں بڑا خطرہ ثابت ہوں گے۔'' داؤد نے اس کی توجہ مبذول کروائی۔

''ایسے افراد میں سے بیشتر پہلے ہی گرفتار کیے جاچکے ہیں۔ کچھ ثوبان کی قابوس کے ساتھ ملی بھگت اور اس کے کردار کی خامیوں کو جاننے کے بعد تائب ہوچکے ہیں۔ جو چند لوگ ابھی تک سامنے نہیں آسکے ہیں، ان کی نشاندہی کے لیے جاسوسوں سے مدد لی جائے گی۔ امید ہے کہ جلد ہم اس برائی کو جڑ سمیت اپنی سرزمین سے اکھاڑ پھینکیں گے۔'' صاحب فراش ہونے کے باوجود اس کی توجہ ہر مسئلے پر تھی۔ حقیقتاً اس نے ثابت کردیا تھا کہ وہ صرف سردار زادی نہیں ہے بلکہ سردار کی گدی سنبھالنے کی پوری اہلیت بھی رکھتی ہے۔ اسی اہلیت کے باعث لوگ اس کے لڑکی ہونے کو فراموش کرکے غیر اعلانیہ طور پر اس کی سرداری تسلیم کرچکے تھے۔

''بہت خوب۔ آپ کی معاملہ فہمی کو دیکھتے ہوئے میں امید کرتا ہوں کہ جلد آپ اپنے تمام مسائل کو حل کرنے میں کامیاب ہوجائیں گی۔ میری دعا ہے کہ اللہ مستقبل میں آپ

www.pklibrary.com

کو آسانیاں عطا فرمائے اور ایسے لوگوں کا ساتھ نصیب ہو جو مخلص اور ایماندار ہوں۔'' داؤد نے اسے سراہنے کے ساتھ ساتھ خلوص دل سے دعا دی۔

''میں بھی آپ کے مستقبل کے لیے نیک تمنائیں رکھتی ہوں۔ سنا ہے آپ عنقریب طیبہ سے نکاح کرنے والے ہیں۔ اللہ اس نکاح میں برکت ڈالے۔ طیبہ ایک خوب سیرت اور خوب صورت لڑکی ہے۔ امید ہے وہ آپ کے لیے ایک بہترین رفیقۂ حیات ثابت ہوگی۔'' بہت خلوص سے یہ سب کہنے کے باوجود اس کے دل میں کہیں اداسی کا ڈیرا تھا۔ ایک ایسا شخص جو اپنے دل کو اچھا لگا ہو، اسے کسی اور کی دسترس میں جاتا دیکھنا بہرحال ایک تکلیف دہ عمل ہوتا ہے۔

''ثریا نے مرتے ہوئے مجھ سے طیبہ کو شریک حیات بنانے کی خواہش کی تھی۔ میرے لیے اس کی خواہش کو ٹالنا ممکن ہی نہیں۔ ویسے بھی میں سمجھتا ہوں کہ طیبہ میرے لیے ایک بہترین انتخاب ثابت ہو سکتی ہے۔ ہم دونوں کے خمیر ایک ہی مٹی سے اٹھے ہیں اور اپنی مٹی سے محبت ہماری رگوں میں خون کی طرح دوڑتی پھرتی ہے۔ میں اپنے اندر کی اس خواہش کو کبھی نہیں مار سکتا کہ ایک دن مجھے لوٹ کر اپنی سرزمین پر واپس جانا ہے اور اسے ظالم تاتاریوں کے قبضے سے آزاد کروانا ہے۔ طیبہ میری ہم وطن ہونے کے ناتے میری... تڑپ کو سمجھ سکتی ہیں اس لیے مجھے یقین ہے کہ وہ میرے اس مقصد کی راہ میں حائل ہونے کے بجائے میرے لیے مددگار ثابت ہوں گی۔'' یہ جاننے کے بعد کہ دل نے جس کی چاہ کی تھی، وہ کوئی سارہ نہیں بلکہ ساشا کی مطربہ تھی، اس نے خود کو جن دلائل سے بہلایا تھا، وہی دلائل سردارزادی لیلیٰ کے سامنے بھی رکھ دیے۔

''اللہ آپ کے یقین کو سلامت رکھے۔'' محبت کرنے والوں کے دل اگر دکھے ہوئے ہوں تب بھی دعا کے سوا ان کے لبوں پر کچھ نہیں آتا۔ داؤد بن معیز دعاؤں کا تحفہ ساتھ لیے جب اس لڑکی سے رخصت ہوا تو اسے اندازہ بھی نہیں تھا کہ وہ کسی کے دل پر وہ تحریر رقم کر کے جا رہا ہے جو کبھی مٹ نہ سکے گی اور ایک ان کہی داستان کی طرح بس اسی ایک دل میں محفوظ رہے گی۔

☆☆☆

''تم واپس تو لوٹ آؤ گے نا؟'' وہ بستر پر تکیوں کے سہارے کچھ اس انداز میں بیٹھی تھی کہ اس کی اوڑھنی نے اس کی پیشانی اور چہرے کے آدھے حصے کو چھپا رکھا تھا۔ وہ دل و جان سے اس کی طرف متوجہ ہونے کے باوجود اس کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنے کی تاب نہیں رکھتی تھی لیکن اس کے دل کی ساری بے چینی اس کے اس چھوٹے سے سوال میں سمو گئی تھی۔

''لوٹ آنے کے سوا میرے پاس کوئی دوسرا انتخاب نہیں ہے۔ اگر مجھے یہ خیال نہیں ہوتا کہ ایک باپ آج بھی اپنے کھوئے ہوئے بیٹے کی یاد میں تڑپتا ہوگا اور اس گمشدہ بیٹے سے ملنے کی خواہش اس کے دل کو بے چین رکھتی ہوگی تو شاید میں کبھی وہاں جانے کا سوچتا بھی نہیں۔ زندگی مجھے جس مقام پر لے آئی ہے، میرے لیے بہتر ہے کہ میں بھول جاؤں کہ میں کسی راجا پردیپ سنگھ کے محل میں پیدا ہوا تھا اور پیدا ہونے کے بعد مجھے راجکمار دلجیت سنگھ کہہ کر پکارا جاتا تھا۔'' اس نے جواب دیتے ہوئے اوٹ سے جھانکتی اس کی ستواں ناک پر ایک نظر ڈال کر فوراً ہی نظروں کو جھکا لیا۔ وہ حسن جو کبھی بے حجاب اس کے روبرو ہوتا تھا، آج اسے آنکھ بھر کر دیکھنے کی بھی جرأت نہیں ہوتی تھی۔ ایمان نے دونوں کو ہی حیا کا سبق پڑھا دیا تھا۔ ہوس اور غرض کی آلائشیں نکل جانے کے بعد تعلق میں خالص محبت باقی رہ گئی تھی اور محبت کبھی نفس کے منہ زور گھوڑے پر سواری نہیں کرتی۔ محبت حیا اور وقار کو اپنے ساتھ لے کر چلتی ہے۔

''کیا وہ اپنے برسوں کے بچھڑے بیٹے کو اپنے پاس روکنا نہ چاہیں گے؟'' وہ اس کی پکار پر موت کو شکست دے کر ایک بار پھر زندگی سے ہم آغوش ہوئی تھی۔ اسے اس زندگی میں اس کے نہ ہونے کے اندیشے ستا رہے تھے تو یہ کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔

''اگر ان کا بیٹا آج بھی دلجیت سنگھ ہوتا تو وہ ضرور ایسا کرتے۔ اگر صرف ساشا ہوتا تب بھی اسے اپنے پاس روکنے کی کوئی صورت نکال لیتے لیکن وہ سیف اللہ کو کیسے روکیں گے؟ سیف اللہ کا کسی غیر مسلم حکمران کی نیام میں رہنا ممکن ہی نہیں ہے۔ سیف اللہ (اللہ کی تلوار) تو بس اللہ کی راہ کے لیے ہی ہے۔'' اس نے ایک ایسی حقیقت بیان کی جس سے انکار ممکن ہی نہیں تھا۔

''ماں تمہاری اس تبدیلی سے بہت خوش ہے۔ کہتی ہے تم دونوں کو ایک سچے مسلمان کے روپ میں دیکھ کر جتنی خوشی ہوتی ہے، اتنی ہی خوشی اس بات کی بھی ہوتی ہے کہ میرے شوہر اور بیٹے کی، کی گئی زیادتی کی تلافی کا موقع مل گیا۔ ساشا کو پہلے سے بہتر حال میں دیکھتی ہوں تو دل میں امید پیدا ہوتی ہے کہ ان دونوں کے گناہ کا بوجھ کچھ ہلکا ہو گیا

www.pklibrary.com

www.pklibrary.com

ہوگا اور ان پر سے آخرت کا عذاب ہلکا ہو جائے گا۔'' مطربہ نے اسے حکیم حاذق کی بیوی اور اپنی منہ بولی ماں کے خیالات سے آگاہ کیا۔

''حکیم حاذق اور ان کے بیٹے کے اعمال ان کے ساتھ ہی دفن ہو چکے ہیں۔ اب تمہیں یہ سوچ کر ان خاتون کا خیال رکھنا ہوگا اور ان کی دلجوئی کرنا ہوگی کہ وہ ایک تنہا اور دکھی خاتون ہیں جو بطور انسان ہمدردی کا حق رکھتی ہیں۔ تم پر تو ویسے بھی ان کا حق بنتا ہے کہ سگی ماں نہ ہوتے ہوئے بھی انہوں نے تمہیں ایک بیٹی کی سی ہی محبت اور شفقت سے پالا ہے۔'' اس نے مطربہ کو ہدایت دی۔

''میں اس بات کو سمجھتی ہوں اور سچ پوچھو تو مجھے خود بھی ان کی ضرورت ہے۔ اب وہ ہی تو ایک بزرگ رہ گئی ہیں جن کے لبوں پر ہمارے لیے دعائیں ہیں۔'' یہ سب کہتے ہوئے اس کے دل میں ہلکی سی کسک پیدا ہوئی تھی اور اپنے وہ سگے ماں باپ یاد آئے تھے جن کے ساتھ رہنا نصیب ہی نہیں ہوا تھا۔ دنیا میں کہیں یقیناً اس کا خاندان بھی موجود تھا لیکن اس کے پاس وہاں تک پہنچنے کی کوئی راہ نہیں تھی چنانچہ اسے زندگی کو اسی شکل میں قبول کرنا تھا جس شکل میں وہ اسے ملی تھی۔

''سلیمان کا خیال ہے کہ سفر پر جانے سے قبل ہمارا نکاح ہو جانا چاہیے۔ اس کی تجویز ہے کہ کل داؤد اور طیبہ کے نکاح کے موقع پر ہمارا نکاح بھی انجام دے دیا جائے۔ تم ابھی مکمل طور پر صحت یاب نہیں ہوئی ہو اور میں نے تم سے تمہاری رضامندی بھی نہیں لی تھی اس لیے اسے کوئی جواب نہیں دے سکا۔ ویسے بھی میں ایک ایسے سفر پر جا رہا ہوں جس کے حوالے سے تمہارے دل میں اندیشے ہیں کہ جانے میں لوٹ کر آؤں گا بھی یا نہیں، تو ایسے میں نکاح کرنا.....''

''مجھے سلیمان کی تجویز قبول ہے۔'' اس نے درمیان سے اس کی بات کاٹ کر سرعت سے کہا اور پھر خود ہی اس عجلت پر جھینپ کر سر کو مزید جھکا گئی۔

''یہ نکاح میرے ہر اندیشے کو دور کر دے گا۔ بالفرض خونی رشتوں کی کشش اور اقتدار کی چکاچوند نے تمہاری واپسی کی راہیں مسدود کر بھی دیں تو میرے جینے کے لیے اتنا ہی کافی ہوگا کہ میں تمہاری منکوحہ ہوں۔ دنیا میں قائم ہونے والے اس رشتے کے ناتے میں آخرت میں، کم از کم تمہیں اپنے رب سے مانگنے کا حق تو حاصل کر لوں گی نا۔'' جھکے سر کے ساتھ اس کے لبوں سے ادا ہونے والے یہ الفاظ اس کی محبت کی گہرائی کا ثبوت تھے۔

''بہت شکریہ مطربہ! میں تمہارے ان جذبات کی ہمیشہ قدر کروں گا اور اپنے رب سے دعا کرتا رہوں گا کہ دنیا اور آخرت دونوں کی زندگی میں مجھے تمہارا ہی ساتھ نصیب کرے۔'' اپنے دل میں عجیب سی شکر گزاری محسوس کرتے ہوئے وہ بڑے دل گداز لہجے میں بولا تو وہ دھیرے سے مسکراتے ہوئے اپنی گنگناتی آواز میں شرماتے لہجے میں صدقِ دل سے بولی۔

''آمین۔'' اس کی اس آمین نے سیف اللہ کے دل کے تاروں کو چھیڑ کر ایک ایسا راگ الاپا جس نے اسے یقین دلایا کہ وہ اس عورت سے تا زندگی محبت کرتا رہے گا۔

☆☆☆

''اللہ اس نکاح میں برکت ڈالے اور دونوں جوڑوں کو ایک دوسرے کے ساتھ تا دمِ مرگ خوشحال اور خوشگوار زندگی گزارنا نصیب ہو۔'' رسم نکاح کی ادائیگی کے بعد حاطب نے دعا کے لیے ہاتھ بلند کیے اور نئی زندگی کا آغاز کرنے والوں کے لیے بہت دیر تک دعا مانگتا رہا۔ جیسے ہی اس نے دعا کے اختتامی کلمات ادا کیے، شرکاء بہ آوازِ بلند آمین کہتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے اور باری باری دونوں دلہاؤں سے مصافحہ کرتے ہوئے انہیں مبارک باد پیش کرنے کے ساتھ ساتھ حسبِ استطاعت تحائف بھی دیتے چلے گئے۔

نکاح کی تقریب اگرچہ سادگی سے ادا کی گئی تھی لیکن ہر شخص نے اس میں بھرپور جوش و خروش سے حصہ لیا تھا اور دونوں جوڑوں کو ذرا بھی احساس نہیں ہوا تھا کہ وہ اپنی زندگی کے اہم ترین موقع پر کسی اجنبی سرزمین پر موجود ہونے کے باعث کسی کمی کا شکار رہے ہیں۔ اہلِ علاقہ نے اتنے عرصے کے جنگ و جدل اور خون خرابے کے بعد اپنی سرزمین پر منعقد ہونے والی خوشی کی اس تقریب میں خلوصِ دل سے حصہ لیا تھا اور خود بھی خوش دکھائی دیتے تھے۔ سردار زادی لیلیٰ نے بذاتِ خود اس تقریب میں بہت دلچسپی لی تھی۔ اس کی طرف سے تقریب کے لیے دونوں دلہنوں کو خوب صورت ملبوسات اور کچھ مقامی زیورات فراہم کیے گئے تھے جبکہ دلہاؤں کے لیے دیدہ زیب اونی پارچوں کا تحفہ تھا۔ نکاح کے بعد ضیافت کا انتظام بھی اسی کی طرف سے تھا اور اب مہمان اس ضیافت سے لطف اندوز ہوتے ہوئے ایک دوسرے سے گفتگو میں مصروف تھے۔

''تو آپ نے حتمی فیصلہ کر لیا ہے کہ کل صبح آپ صالح کے قافلے کے ساتھ واپس وطن روانہ ہو جائیں گے؟'' ساشا

www.pklibrary.com

نے اپنے پہلو میں بیٹھے ہوئے سفیر اللہ سے پوچھا۔

''بالکل! میری اور میرے ساتھ جانے کے خواہش مند ساتھیوں کی تیاری مکمل ہے۔ ان شاء اللہ کل صبح ہمارا سفر شروع ہو جائے گا۔'' سفیر اللہ نے جواب دیا۔

''امیر یقیناً آپ کے اس فیصلے سے ناخوش ہوں گے؟'' اس نے آہستہ سے پوچھا۔

''بہت زیادہ نہیں۔ سچ پوچھو تو مجھے محسوس ہوا کہ اب وہ خود بھی اپنے اطراف بہت زیادہ ہجوم نہیں چاہتے۔ مجھے اڑتی اڑتی خبر ملی ہے کہ وہ اپنے قافلے میں سے لوگوں کا انتخاب کر رہے ہیں۔ جوان، توانا اور چست لوگوں کو ایک گروہ میں رکھا جا رہا ہے جبکہ باقی لوگ دوسرے گروہ میں ہیں۔ ابھی انہوں نے اس سلسلے میں کوئی باقاعدہ اعلان نہیں کیا ہے لیکن مجھے لگتا ہے کہ وہ دوسرے گروہ کو کہیں قیام کا حکم دے کر پہلے گروہ کے ساتھ آگے کا سفر جاری رکھنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔'' سفیر اللہ نے دھیمی آواز میں اسے معلومات فراہم کیں۔

''امیر، میرے اندازوں سے زیادہ خود غرض اور مطلب پرست ہیں۔ انہیں انسانوں سے محبت یا ان کی قدر کرنا نہیں آتی۔ وہ صرف انہیں استعمال کرنا جانتے ہیں۔'' اس نے امیر کے بارے میں اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔

''عموماً حکمران اسی مزاج کے مالک ہوتے ہیں اور حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ایک عام آدمی کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ آسائشیں رکھنے کے باوجود ان کے دل میں مال کی طمع زیادہ ہوتی ہے۔''

''آپ کا دل نہیں چاہتا امیر ہونے کو؟ ساتھ دینے کی صورت میں آپ کو بھی حاصل ہونے والے خزانے میں سے معقول حصہ مل سکتا تھا۔'' اس نے سفیر اللہ کی بات سن کر ان سے سرگوشی میں پوچھا۔

''پہلے دل میں ایسی خواہش تھی لیکن زندگی کی بے ثباتی دیکھ کر احساس ہونے لگا ہے کہ مال و زر بس ایک حد تک انسان کے کام آتے ہیں اس لیے انسان کو بس ایک حد تک ہی ان کی خواہش کرنا چاہیے۔ میرے لیے اس وقت مال و متاع کے مقابلے میں اپنا خاندان اہم ہے۔ میں نے آپ کو بتایا تھا نا کہ چند دنوں سے میں خواب میں اپنے بیوی بچوں کو متواتر پریشان دیکھ رہا ہوں۔ وہ مجھے پکار رہے ہوتے ہیں اور چونکہ عموماً میرے خواب سچے ہوتے ہیں اس لیے میں اس وقت واپس لوٹ جانا ہی مناسب سمجھتا ہوں۔''

''اللہ آپ پر رحم کرے اور واپس جا کر آپ کو سب کچھ ٹھیک دیکھنے کو ملے۔ میں نے صالح کو آپ کے سلسلے میں خاص ہدایت کر دی ہے۔ وہ دورانِ سفر آپ کا خاص خیال رکھے گا۔'' اس نے انہیں بتایا۔

''بہت بہت نوازش۔'' سفیر اللہ نے اس کا شکریہ ادا کیا۔

''سلیمان نے نقشے کی نقول بھی تیار کر دی ہیں۔ انہیں ضرور اپنے ساتھ رکھیے گا تاکہ دورانِ سفر کسی قسم کی پریشانی پیش نہ آئے۔'' اس نے انہیں ہدایت کی اور پھر اعزاز الدین کی طرف متوجہ ہو گیا۔ حورم کی محبت میں مبتلا یہ نوجوان اس کی موت کے بعد بہت بجھا بجھا رہنے لگا تھا اور اس نے بھی واپس جانے والے قافلے میں شامل ہونے کا اعلان کر دیا تھا۔

''میری دعا ہے کہ آپ کی زندگی کا سفر خوشیوں سے بھرپور رہے اور آپ بھی اپنی من پسند ساتھی سے جدا نہ ہوں۔'' اس نے خصوصیت سے اسے دعا دی۔

''بہت شکریہ، لیکن تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میں اپنی من پسند ساتھی کے ساتھ زندگی کا سفر شروع کرنے جا رہا ہوں؟'' اسے اعزاز الدین کی دعا نے متاثر کیا اور اس سے سوال کیے بغیر نہ رہ سکا۔

''آپ کے چہرے کی خوشی سے۔ یہ خوشی من پسند ساتھی پانے والوں کے چہرے پر ہی چمکتی ہے۔ داؤد بن معیسر کو ہی دیکھیے، وہ ایک باوقار دلہا ضرور ہے لیکن اس کے چہرے پر وہ چمک نہیں ہے جو آپ کے چہرے پر دکھائی دے رہی ہے۔'' اعزاز الدین کے تجزیے نے اسے حیران کر دیا۔

''بہت کمال کی نظر ہے تمہاری۔'' اس نے بے ساختہ ہی اسے سراہا۔

''یہ نظر نہیں دل کا کمال ہے۔ ایک محبت کرنے والا دل دوسرے اپنے جیسے دل کو پہچان لیتا ہے۔'' اعزاز الدین کے ہونٹوں پر جو مسکراہٹ نمودار ہوئی اس میں ایک کرب سا گھلا ہوا تھا۔ یہ کرب حورم کی جدائی کی دین تھا۔

''میں تمہارے لیے افسردہ ہوں اعزاز الدین! لیکن اسے قصوروار نہ سمجھنا۔ دلوں کا سودا زندگی میں بس ایک بار طے پاتا ہے اور وہ یہ سودا بہت پہلے کر چکی تھی اسی لیے تو زیادہ جی نہیں سکی اور اپنے حسنِ بے مثال کے ساتھ پیوندِ خاک ہو گئی۔ اب تو تم بس اس کی روح کے سکون کے لیے دعا کیا کرو۔'' آس پاس دوسرے لوگوں کی موجودگی کے باعث وہ اعزاز الدین سے بہت دھیمی آواز میں بات

www.pklibrary.com

کر رہا تھا۔

''اس کے سوا اب کام ہی کیا رہ گیا ہے۔ میں تو اب کوئی نیکی بھی اس نیت سے کیا کروں گا کہ اس کا ثواب اس کی روح کو پہنچے۔'' اس کے جواب نے اس کے جذبے کی گہرائی کو عیاں کر دیا۔ اس جواب کے بعد ساشا کو ضرورت نہیں رہی تھی کہ اس سے اس کی واپسی کے فیصلے کے بارے میں کوئی سوال کرتا۔ جو دل محبت کی تال پر دھڑکتے ہیں ان کے لیے دنیاوی مال و متاع بے معنی ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اعزاز الدین کو بھی خزانے کے حصول کے لیے امیر کے ساتھ آگے جانے سے کوئی دلچسپی نہیں رہ گئی تھی اور وہ اپنے دل میں جلتے محبت کے دیے کی روشنی پر ہی قانع باقی جیون بتا دینا چاہتا تھا۔ غرض سے پاک یہ محبت قابلِ احترام تھی۔ ساشا نے بھی اس کے احترام میں خاموشی اختیار کی اور اعزاز الدین کے شانے کو دھیرے سے تھپتھپا کر رہ گیا۔

اگلی صبح بعد نماز فجر وہ واپسی کے لیے روانہ ہونے والے قافلے کو رخصت کرنے کے لیے کھڑا تھا تو بیتی شب کی ساری خوبصورتی اس کے چہرے سے روشنی بن کر منعکس ہو رہی تھی۔

''اللہ آپ کے چہرے کو ہمیشہ یونہی ماہ تمام کی طرح جگمگاتا ہوا رکھے۔'' صالح نے معانقہ کرتے بے ساختہ اسے دعا دی۔ قریب کھڑا داؤد اس دعا کو سن کر مسکرایا اور زیر لب آمین کہا۔ وہ ایسا ہی بے غرض اور پُرخلوص شخص تھا جو اپنے دل کا دکھ چھپا کر دوسروں کی خوشی میں خوش رہنے کا ہنر جانتا تھا اور یہاں تو اس کی خوشیوں کی بات تھی جسے اس نے دل کی گہرائیوں سے چاہا تھا۔ ساشا کے خوش ہونے کا مطلب تھا کہ سارہ (مطربہ) خوش ہے اور وہ اس کی خوشی سے بڑھ کر کچھ نہیں چاہتا تھا۔

خود اپنے لیے بھی اس نے قدرت کا طے کردہ فیصلہ قبول کر لیا تھا اور مطمئن تھا کہ اسے ایک بہترین شریک حیات کا ساتھ میسر آ گیا ہے۔ طیبہ خوش شکل ہی نہیں، خوش اطوار بھی تھی اور اس سے ہونے والی گفتگو سے وہ جان گیا تھا کہ وہ اپنی زندگی کے ہر مقصد اور ہر موڑ پر اسے اپنا ساتھ دینے والا پائے گا۔

''سفیر اللہ صاحب اور اعزاز الدین کا اس سفر میں خصوصی خیال رکھنا صالح!'' ادھر ساشا، صالح کو ہدایات دے رہا تھا۔

''ہر حکم کی تعمیل ہوگی آقا۔'' وہاں ہمیشہ کی طرح فرمانبرداری اور جاں نثاری کا اظہار تھا۔

''اپنے اہلِ خانہ کو میری طرف سے سلام کہنا اور انہیں میری جانب سے یہ تحائف پیش کرنا۔'' اس نے شانے سے لٹکا ایک تھیلا اتار کر صالح کی طرف بڑھایا۔

''اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے آقا! میں کوئی ہمیشہ کے لیے تو وہاں نہیں جا رہا ہوں۔ مجھے ان سب کو لے کر واپس آپ کے پاس ہی لوٹنا ہے۔ جب آپ کی ان سے روبرو ملاقات ہو تو اپنے ہاتھ سے انہیں یہ تحائف دے دیجیے گا۔'' صالح یوں بدک کر پیچھے ہٹا جیسے وہ تحائف کے بجائے سانپ بچھوؤں سے بھرا ہوا تھیلا ہو۔ وہ اس کے معاملے میں ایسا ہی حساس تھا اور ایسی معمولی سی بات بھی برداشت نہیں کر سکتا تھا جس میں جدائی کا شائبہ بھی ہو۔

''ان تحائف کو میرا ان سے تعارف سمجھ کر لے جاؤ۔ جب روبرو ملاقات ہوگی تو اس خوشی کے الگ تحائف ہوں گے بلکہ میں اور مطربہ پورے مہینے انہیں مہمان بنا کر ان کی خاطر مدارت کریں گے۔'' اس نے اپنی طرف سے صالح کو مطمئن کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ اس کی محبت کی شدت کے پیش نظر اس نے اسے بھنک بھی نہیں پڑنے دی تھی کہ وہ اس کی روانگی کے بعد دوا لیے سفر کرنے کا ارادہ رکھتا ہے جن کے انجام کے متعلق اسے کوئی علم نہیں کہ اس کے بعد زندگی پہلی سی رہے گی بھی یا نہیں۔

''کیسی مہمان داری اور خاطر داری..... میں اور میرے اہلِ خانہ واپس آ کر صرف اور صرف آپ لوگوں کی خدمت کریں گے۔'' صالح نے فوراً اپنا فیصلہ سنایا۔

''اچھا میرے بھائی جو تمہارا جی چاہے کرنا لیکن فی الحال تو یہ پکڑو اور یہاں سے روانہ ہو۔ تم یہاں سے جاؤ گے تب ہی تو واپس لوٹ کر آؤ گے۔'' اس نے زبردستی صالح کے ہاتھ میں وہ تھیلا پکڑایا۔

''اللہ آپ کو اپنی امان میں رکھے میرے آقا!'' صالح ایک بار پھر اس کے گلے لگ گیا اور نم آنکھوں کے ساتھ دعا دی۔

''کچھ اظہارِ محبت ہمارے لیے بھی بچا لو بھائی۔ آخر ہم بھی تو تمہیں رخصت کرنے کے لیے صبح دم یہاں آ کر کھڑے ہوئے ہیں۔'' سلیمان نے اسے پکارا تو وہ ساشا کو چھوڑ کر ذرا شرمندہ سا اس کی طرف بڑھا اور اس کے گلے لگ گیا۔

''ویسے سلیمان صاحب! ایک طرح سے دیکھا جائے تو آپ نے اب تک شادی نہ کر کے عقلمندی ہی کی۔ اگر شادی کر لیتے تو میری طرح اس وقت آپ بھی سب سے

www.pklibrary.com

گلے مل کر رخصت ہونے کی تیاری کر رہے ہوتے۔'' اس نے اتنی بے ساختگی سے ان خیالات کا اظہار کیا تھا کہ تمام حاضرین کے حلق سے قہقہے ابل پڑے تھے۔ یونہی تھوڑے سے آنسوؤں، تھوڑے سے قہقہوں اور بہت ساری دعاؤں کے سنگ قافلے کو روانہ کر دیا گیا۔

''آنے والے دنوں میں ہم سب بھی یہاں سے روانہ ہو رہے ہوں گے۔ اس امید کے ساتھ کہ ایک دن ہم سب کو ایک ہی جگہ اکٹھے ہو کر نئے سرے سے زندگی کا آغاز کرنا ہے۔'' قافلے کے پیچھے اڑتی دھول کو دیکھتے ہوئے اس نے کسی کو بھی بطور خاص مخاطب کیے بغیر تبصرہ کیا۔

''ان شاء اللہ ایسا ہی ہوگا۔'' داؤد نے اس کی تائید کی جبکہ سلیمان نے اسے قدرے تشویشناک نظروں سے دیکھا۔ وہ اسے آگاہ کر چکا تھا کہ وہ مطربہ کو یہیں چھوڑ کر ایک سفر پر روانہ ہونے والا ہے۔ اس سفر سے واپسی کے بعد اس نے امیر ارغل کے ساتھ شامل ہونے کا بھی عندیہ دیا تھا لیکن یہ بتانے سے صاف انکار کر دیا تھا کہ وہ کہاں اور کیوں جا رہا ہے؟ اس انکار کے بعد سوال کی گنجائش تو نہیں رہ گئی تھی لیکن سلیمان جیسا دوست خود کو پریشان ہونے سے نہیں روک سکتا تھا۔ اس وقت بھی اس نے سلیمان کی نظروں کی تشویش کو محسوس کیا لیکن انجان بن گیا۔ یہ نہیں تھا کہ سلیمان اس کے لیے قابلِ اعتبار نہیں تھا، بات صرف اتنی تھی کہ وہ اسے اپنے متعلق وہ سب نہیں بتانا چاہتا تھا جو ماضی کا حصہ بن چکا تھا اور جسے وہ اپنے مستقبل میں شامل نہیں رکھنا چاہتا تھا۔

☆☆☆

اس پُرشکوہ محل میں داخل ہوتے ہوئے اس کا دل عجیب سے احساسات سے دوچار تھا۔ یہ محل امیر ارغل کے محل سے کئی گنا بڑا، خوب صورت اور متاثر کن تھا۔ محل کو دیکھ کر ہی احساس ہو جاتا تھا کہ اس میں بسنے والوں کی دولت مندی کا کیا عالم ہوگا۔ اس کے لیے یہ احساس بڑا عجیب تھا کہ وہ اسی محل میں پیدا ہوا تھا اور راجا پردیپ سنگھ کے وارثوں میں سے ایک تھا۔ یہ وارث آج اجنبیوں کی طرح محل کی طویل راہداریوں سے گزر رہا تھا اور راہنمائی کے لیے ہمراہ چلتے پہریداروں میں سے کسی کو گمان بھی نہیں تھا کہ انہیں اسے کس تعظیم سے نوازنا چاہیے۔ یہ احساس صرف اس ایک شخص کو تھا جو واقفِ حال تھا اور اپنی پیرانہ سالی کے باوجود بصد اصرار اس اہم ملاقات کے لیے اس کے ہمراہ آیا تھا۔ وہ اس سے چند قدم پیچھے اپنا سفید بالوں والا سر جھکائے بڑے احترام سے چل رہا تھا۔

وہ بوڑھا شخص حاطب تھا۔ اس کے ساتھ چلے آنے سے اسے یہ فائدہ ہوا تھا کہ اس نے اپنے ایک سابقہ دوست کے بیٹے سے رابطہ کر کے راجا پردیپ سنگھ کو ملاقات کا پیغام بھجوانے میں کامیابی حاصل کر لی تھی۔ پیغام میں یہ تو نہیں لکھا گیا تھا کہ ملاقات کا خواہش مند کون ہے لیکن پیغام کے ساتھ نشانی کے طور پر تین میں سے جو ایک ہیرا بھیجا گیا تھا، وہ اتنی بڑی سفارش تھا کہ راجا ایک لمحے کے لیے بھی اس ملاقات کو ٹال نہیں سکتا تھا۔ اس نے فوری طور پر ملاقات کے خواہش مندوں کو محل میں طلب کر لیا تھا اور اب جبکہ یہ ملاقات چند قدموں کی دوری پر رہ گئی تھی، ہر فریق کی جذباتی کیفیت عجیب سی تھی۔

حاطب کے مرحوم دوست کے بیٹے کی زبانی انہیں بہت سی معلومات حاصل ہوئی تھیں۔ اسے معلوم تھا کہ راجکمار دلجیت سنگھ کی گمشدگی کے بعد راجا پردیپ سنگھ برسوں اسے تلاش کرواتا رہا تھا۔ بعد میں مزید دو بیٹوں کا باپ بننے کے بعد بھی وہ اپنے کھوئے ہوئے بیٹے کا غم نہیں بھلا سکا تھا اور رعایا نے اس کے چہرے پر کبھی خوشی سے بھرپور مسکراہٹ نہیں دیکھی تھی۔ کچھ برس قبل رانی کی موت کے بعد اس نے امورِ سلطنت بڑے بیٹے کو سونپ کر خود مکمل گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی اور اب رعایا اس کے دیدار تک سے محروم ہو چکی تھی۔

''اگر تم چاہو تو میری یہاں موجودگی کی مخبری کر کے مجھے سپاہیوں کے ہاتھوں گرفتار کروا کر وفاداری کا ثبوت اور انعام حاصل کر سکتے ہو لیکن یقین جانو کہ اس سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ میں تو اب ویسے بھی لبِ گور ہوں لیکن ایسا کر کے تم کسی ایسے شخص کی ناراضی مول لو گے جس کے لیے اس ملاقات کو راز رکھنا اتنا اہم ہے کہ وہ بدلے میں تمہیں بے حد وحساب انعام سے نواز سکتا ہے۔'' برسوں حکمرانوں کے سنگ رہ کر ان کے تیور پہچاننے والے حاطب نے اپنے دوست کے بیٹے کو ذمے داری سونپنے سے قبل اسے انتباہ کر دیا تھا اس لیے وہ اس کی خواہش کے خلاف جانے کی ہمت نہیں کر سکا تھا۔ ساشا کے بارے میں اسے تجسس ضرور تھا اور وہ اس سلسلے میں حاطب سے چند سوالات بھی کر چکا تھا لیکن حاطب نے اسے جھڑک دیا تھا۔ ایک معتوب شخص ہونے کے باوجود اس کے انداز میں ایسا رعب تھا کہ وہ شخص اس کے سامنے زیر ہو گیا تھا اور اب وہ دونوں اس کے تعاون کے نتیجے میں شاہی محل کے اندر موجود تھے۔

''راجا صاحب اندر آپ لوگوں کے منتظر ہیں۔ ان کی

www.pklibrary.com

خواہش پر اس ملاقات کے دوران صحن سپاہی اندر موجود نہیں ہوں گے البتہ ان کا خادمِ خاص اندر ہی موجود ہے اور تنہا دس آدمیوں سے لڑنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔'' سپاہیوں کو ایک طرف ان مہمانوں کا احترام بھی کرنا تھا جو اجنبی ہونے کے باوجود راجا سے ملاقات کا اعزاز حاصل کرنے جا رہے تھے اور دوسری طرف ان کے دلوں میں شکوک وشبہات بھی موجود تھے، اس لیے گفتگو کا یہ انداز اختیار کیا تھا۔ ان کے ہتھیار داخلی دروازے پر ہی رکھوا لینے کے باوجود شاید وہ ان کی طرف سے پوری طرح مطمئن نہیں تھے۔ ان دونوں ہی نے پہریداروں کے اس رویّے کی طرف سے بے نیازی اختیار کی اور اندر سے اجازت مل جانے پر دھڑکتے دلوں کے ساتھ قدم آگے بڑھائے۔ اندر راجا پردیپ سنگھ ایک اونچی اور پُرشکوہ مسند پر براجمان اپنے ہاتھ میں موجود بلوریں جام پر نظریں ٹکائے ہوئے تھا لیکن اس کے چہرے کے تاثرات سے ظاہر تھا کہ جام اس کی توجہ کا مرکز نہیں ہے اور ذہن کہیں اور الجھا ہوا ہے۔

''آپ کا سیوک آپ کی خدمت میں حاضر ہے مہاراج! چاہیں تو شما کر دیں اور چاہیں تو اس مورکھ کی جان لے لیں۔'' حاطب میں راجا پردیپ سنگھ کے روبرو کھڑے رہنے کی تاب نہیں تھی۔ وہ فوراً ہی آگے بڑھا اور اس کے قدموں میں گر کر گڑگڑانے لگا۔

''کون ہو تم؟'' راجا نے کھوئے کھوئے لہجے میں پوچھا۔ حوادثِ زمانہ سے گزر کر عمر کی آخری منزل پر آ کھڑا ہونے والا حاطب اس کے لیے قابلِ شناخت نہیں رہا تھا۔ شاید اس نے اسے پہچاننے کے لیے زیادہ مشقت بھی نہیں کی تھی۔ اس کی نگاہیں تو اس نوجوان پر ٹک گئی تھیں جو اس کے روبرو نظریں جھکائے بڑے ادب سے کھڑا تھا لیکن اس کے چہرے کی سرخ پڑتی رنگت گواہی دے رہی تھی کہ وہ کسی بڑے جذباتی بحران سے گزر رہا ہے۔ طوفان تو راجا پردیپ سنگھ کے اندر بھی بپا تھا۔ جب سے راجکمار کے ان تین مخصوص ہیروں میں سے ایک ہیرا اس تک پہنچا تھا، اس کے لیے خود کو سنبھالنا مشکل ہو گیا تھا اور اب ایک ایسا چہرہ اس کے روبرو کھڑا تھا جس میں وہ اپنے ماضی کی شبیہہ دیکھ سکتا تھا۔

''باقی دو ہیرے بھی ہمیں دے دو۔'' اس نے نوجوان کو گلے لگانے کی شدید خواہش کو کسی نہ کسی طرح پس پشت ڈالتے ہوئے تحکمانہ لہجے میں اس سے کہا۔ اس کے حکم کی فوراً ہی تعمیل کی گئی لیکن ہیرے براہِ راست راجا کو تھمانے کے بجائے بائیں جانب کھڑے اس کے خادمِ خاص کو پکڑائے گئے۔ خادمِ خاص ہیرے لے کر راجا کے قریب پہنچا تو اس نے پہلے اپنے ہاتھ میں موجود جام اسے تھمایا پھر ہیرے پکڑے۔ اب وہ اپنی ہتھیلی پر رکھے ان ننھے لیکن خیرہ کن چمک اور انوکھی تراش والے ہیروں کو بڑی محویت سے دیکھ رہا تھا۔ ہیروں کا جائزہ لیتی ہوئی اس کی بوڑھی اور دھندلائی ہوئی آنکھوں کی چمک اتنی بڑھ گئی تھی کہ اس چمک کے آگے ہیروں کی چمک ماند پڑ گئی تھی۔

''تخلیہ۔'' اس نے اپنی آواز کی لرزش پر قابو پا کر تحکمانہ لہجے میں کہا تو یہ بات بالکل واضح تھی کہ حکم خادمِ خاص کے لیے تھا۔ خادمِ خاص اس حکم کی تعمیل کرتے ہوئے ذرا سا جھجکا۔ کچھ کہنے کے لیے لب بھی کھولے لیکن جب راجا کے چہرے پر موجود قطعیت دیکھی تو کچھ کہنے کی جرأت کیے بغیر الٹے قدموں باہر نکل گیا۔

''برسوں سے بیٹے کے لیے تڑپتے باپ کے سینے کو ٹھنڈک پہنچانے کے لیے اور کتنا انتظار کرواؤ گے جانِ پدر؟'' اب وہ اپنی جگہ سے کھڑا ہو چکا تھا اور براہِ راست اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا اس سے مخاطب تھا۔ اپنے قدموں میں گر کر آنسو بہاتے حاطب کی طرف تو اس نے نظر ڈالنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی تھی۔ اس کے نزدیک اس کا ہونا یا نہ ہونا گویا کوئی اہمیت ہی نہیں رکھتا تھا۔

''میری کیا مجال تھی کہ آپ کو انتظار کی زحمت سے گزارتا۔ میں تو خود اپنے پتا کے سینے سے لگنے کے لیے جانچ کے مرحلے سے گزرنے کی تکلیف سہہ رہا تھا۔'' اس کے لبوں پر شکوہ مچل گیا لیکن اس نے درمیانی فاصلہ پاٹ کر باپ کے مقابل جا کھڑا ہونے میں کوئی کوتاہی نہیں کی تھی۔

''اپنے ہی عکس کو پہچاننے کے لیے ہمیں کسی پڑتال کی ضرورت نہیں تھی لیکن یہ ہماری مجبوریاں تھیں جنہوں نے ہمیں خود پر قابو رکھنے پر مجبور کیا۔'' اسے اپنے ساتھ بھینچتے ہوئے راجا کے انداز میں جتنی گرم جوشی تھی، لہجے میں اتنی ہی بے بسی کی جھلک بھی تھی۔

''مجھے آپ کے مسائل کا اندازہ ہے اور میں آپ کو یقین دہانی کروانا چاہتا ہوں کہ میں آپ کے مسائل میں اضافے کے لیے نہیں بلکہ صرف اور صرف آپ کو خوشی دینے کے لیے یہاں آیا ہوں۔'' اس نے راجا کے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھ میں لے کر چومتے ہوئے اسے جواب دیا۔

''خوشی تو اتنی بے تحاشا ہے کہ ڈر لگتا ہے کہ کہیں خوشی کی زیادتی سے یہ دل دھڑکنا ہی نہ چھوڑ دے۔'' راجا نے اسے اپنے ساتھ ہی اپنی مسند پر بٹھا لیا۔

www.pklibrary.com

''میں انہیں چچا جان کہہ کر پکارتا ہوں اور میرے لیے یہ باعث شرم ہوگا کہ انہیں اپنے قدموں میں دیکھوں۔'' موقع ملتے ہی اس نے حاطب کی سفارش کی۔

''تمہاری سفارش ٹالنا ہمارے بس میں نہیں۔ تم اس شخص کے لیے جو چاہو حکم دے دو۔'' راجا نے اسے جواب دیا تو اس نے حاطب کو اپنا انتظار کرنے کا کہہ کر باہر بھیج دیا۔ حاطب کے باہر جانے کے بعد راجا پردیپ سنگھ نے ایک بار پھر اسے اپنے گلے سے لگالیا۔ برسوں کی پیاس تھی، لمحوں میں کیسے مٹتی۔ وہ بیٹا جس کے ملنے کی کوئی آس نظر نہ آتی تھی اور جس کو دیکھنے کی خواہش سے وہ کبھی دستبردار نہیں ہوسکا تھا..... آج سامنے آیا تھا تو دل کی عجیب ہی کیفیت تھی۔ جذبات کی دیوانگی کہتی تھی کہ چیخ چیخ کر ساری دنیا کو یہ خوشخبری سنادے لیکن مصلحتوں نے دامن تھام رکھا تھا۔

''اتنے برس کہاں اور کیسے رہے اور ہم تک دوبارہ کیونکر پہنچے؟'' راجا نے بیٹے کا چہرہ دونوں ہاتھوں سے تھام کر محبت سے پوچھا۔

''سردار امان کے ساتھ ہی رہا۔ انہوں نے محبت بھی دی اور تعلیم وتربیت سے بھی نوازا۔ وہ مجھے آپ سے چرا کر لے گئے تھے لیکن جانے کس آس پر ایک راجکمار کی طرح ہی سارے علوم وفنون سکھاتے رہے۔ ان کے انتقال کے بعد میں نے وہ جگہ چھوڑ دی اور حوادثِ زمانہ سے لڑتا اور بھٹکتا ہوا حاطب تک پہنچ گیا۔ ہیروں کی وجہ سے حاطب نے مجھے شناخت کرلیا اور بس یوں میں آپ تک پہنچ گیا۔'' اس نے پوری زندگی کی داستان کو چند جملوں میں سمیٹ دیا۔

''امان بہت لائق اور وفادار انسان تھا بلکہ وہ تینوں ہی ایک سے بڑھ کر ایک تھے لیکن حالات نے کچھ اس طرح سے پلٹا کھایا کہ وہ اپنی وفاداری نبھا نہ سکے اور ہم بھی اپنے جذبات پر قابو پاکر غیر جانبداری سے فیصلہ نہیں کرسکے۔'' راجا کے لہجے میں پچھتاوا سا تھا۔

''عورت کے مکر کے آگے بڑے سے بڑا سورما فریب کھا جاتا ہے اور جب معاملہ غیرت کا ہو تو عقل بالکل ہی ساتھ چھوڑ جاتی ہے۔'' اس نے حقیقت بیان کی۔

''کچھ ایسی ہی بات ہے۔ ہم نے بھی رانی کے کہنے پر امان کو اپراد ھی مان کر اس کو ایسی کڑی سزا دی تھی کہ وہ بلبلا کر رہ جائے۔ ہماری اچھا پوری ہوگئی۔ وہ بلبلایا اور بلبلا کر ہمیں ہی کاٹ لیا۔ ہم ان گزرے روز وشب میں تمہارے لیے کیسے کیسے نہیں تڑپے، کہاں کہاں تمہیں تلاش نہیں کروایا، کون کون سی منت نہیں مانی لیکن تمہیں نہ ملنا تھا، نہ ملے اور اب جب ہم ہر طرف سے مایوس ہوکر دنیا تیاگ کر بیٹھ گئے تھے تو تم خود ہم تک آپہنچے ہو۔ ایک ایسے سمے پر جب ہم بالکل خالی ہیں اور سوچ رہے ہیں کہ ہمارا وہ راجکمار جو اگر ہمارے پاس رہتا تو ہم اسے اپنے سنگھاسن پر بٹھاتے، اسے اس کا حق کیسے دیں؟ حق دینا تو دور کی بات، ہم تو اس بات سے بھی ڈر رہے ہیں کہ اگر کسی کو تمہاری اصلیت کا پتا چل گیا تو ہم تمہاری جان بچانے کے لیے کیا کرسکیں گے؟'' بوڑھے راجا کی آنکھوں سے آنسو نکل کر اس کے رخساروں پر بہہ نکلے۔

''میں تو پہلے ہی آپ سے کہہ چکا ہوں کہ میں آپ کے لیے مسائل پیدا کرنے نہیں بلکہ صرف اور صرف آپ کو خوشی دینے کے لیے آیا ہوں۔ مجھے تخت وتاج کی بالکل بھی ہوس نہیں۔ میں تو ان میں سے ہوں جو محنت مزدوری کرکے بھی اپنا پیٹ پالنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے۔'' اس نے راجا کا ہاتھ تھپکتے ہوئے اسے تسلی دی۔

''تو کیا تم واپس لوٹ جاؤ گے؟'' راجا اس کے الفاظ سے اس کے ارادے کو بھانپ گیا۔

''مجھے لوٹنا ہی پڑے گا۔ برسوں پہلے جب میں اس محل سے لے جایا گیا تھا تو کاتب تقدیر نے گویا اعلان کردیا تھا کہ محل میں پیدا ہونے کے باوجود میں محلوں میں رہنے کے لیے پیدا نہیں کیا گیا۔ میری منزل کوئی اور ہے۔ یہ محل تو بس ایک پڑاؤ ہے جہاں میں آپ کے من کی شانتی کے لیے پل دو پل کے لیے ٹھہر گیا ہوں اور مجھے یہاں سے آگے کہیں دور جانا ہے۔'' اس نے سچ بولنے سے اجتناب نہیں کیا۔

''کیا امان نے تمہیں اپنے دھرم میں داخل کرلیا تھا؟'' راجا کا ماتھا ٹھنکا اور اس نے اس کے چہرے کو ٹٹولتی نظروں سے دیکھا۔

''نہیں۔ ان میں اتنی جرأت نہیں تھی لیکن دنیا بنانے والے نے خود مجھے اپنے دین کے لیے چن لیا تو میں اس کے حکم کے آگے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہوگیا۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ کو اس بات سے دکھ پہنچے گا لیکن سچ یہی ہے کہ میں اب آپ کا بیٹا وجیت سنگھ نہیں رہا، میں اب اپنے رب کا بندہ سیف اللہ ہوں جو باپ کا حق پہچانتے ہوئے اس کو اپنے زندہ ہونے کی خوشی تو دینے چلا آیا ہے لیکن اس کی خوشی کے لیے اپنے راستے کو نہیں چھوڑ سکتا۔'' اس کی صاف گوئی کے مظاہرے پر راجا خاموش ہوگیا اور سر جھکا کر آزردہ سا بیٹھ گیا۔

''میں آپ کا دل دکھانے کے لیے آپ سے معافی چاہتا ہوں۔'' اسے راجا کو دکھ دینے پر افسوس ہوا۔

''نہیں..... اس کی ضرورت نہیں۔'' راجا نے ایک

www.pklibrary.com

ٹھنڈی آہ بھری۔ ''جو ہوا اچھا ہی ہوا۔ اس طرح کم از کم ہم تمہارے سامنے شرمندہ ہونے سے تو بچ گئے۔ تم دلجیت سنگھ بن کر ہمارے سامنے آتے تو ہم تمہیں دلجیت سنگھ کی جگہ کیونکر دلوا پاتے۔ وہ جگہ تو ہم اسے دے چکے ہیں جو اپنی ماں ہی کی طرح تنگ دل اور لالچی ہے۔ اسے اگر خبر ہو جائے کہ اس وقت تم یہاں موجود ہو تو وہ سپاہی بھیج کر تمہیں گرفتار کروا دے۔'' راجا نے اپنی بے بسی کھل کر بیان کر دی۔

''کیا آپ کو بعد میں پتا چل گیا تھا کہ رانی نے جھوٹ بولا تھا؟'' رانی کے بارے میں راجا کی رائے نے اسے سوال اٹھانے پر مجبور کیا۔

''مرنے سے پہلے اس نے خود اپنا پاپ سویکار کر لیا تھا۔''

''جو ہوا اسے بھول جائیں اور بس اتنا یاد رکھیں کہ میں آپ کا بیٹا ہوں اور کسی بھی لالچ کے بغیر آپ سے بے حد محبت کرتا ہوں۔ زندگی میں جب جب موقع ملا میں یونہی اجنبیوں کے بھیس میں آپ سے ملنے کے لیے آتا رہوں گا۔'' اس نے باپ کی دلجوئی کی کوشش کی۔

''دو دہائیوں سے زیادہ سے لگا کر اس پہلی ملاقات کے لیے آئے ہو۔ اگلی ملاقات کے لیے معلوم نہیں زندگی مجھے موقع دے بھی یا نہیں۔ ویسے بھی میں نے اس سے بس اتنی ہی مہلت مانگی تھی کہ ایک بار تمہیں اپنی نظروں کے سامنے دیکھ لوں۔ میری اچھا پوری ہو گئی، اب مجھے زندگی سے کچھ اور مانگنے یا شکوہ کرنے کا ادھیکار نہیں رہا۔'' راجا کے ہونٹوں پر اداس سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ حقیقتاً اس کا چہرہ ایک دکھی شخص کا چہرہ تھا جس کی ہر لکیر گواہی دیتی تھی کہ دولت و اقتدار کے باوجود وہ عمر بھر خوشیوں اور محبتوں سے محروم ہی رہا ہے۔ دولت و اقتدار کو رشک بھری نظروں سے دیکھنے والے راجا پردیپ سنگھ کے چہرے پر لکھے دکھ پڑھ پاتے تو جان لیتے کہ خوشیاں دولت و اقتدار نہیں بلکہ وفا اور محبت پانے والوں کو ملتی ہیں۔

''میرا خیال ہے کہ آپ بہت تھک چکے ہیں۔ اب آپ کو کچھ آرام کرنا چاہیے۔ میں ابھی یہیں آپ کی ریاست میں ٹھہرا ہوا ہوں۔ آپ جب چاہیں پیغام بھیج کر دوبارہ مجھے ملاقات کے لیے بلوا سکتے ہیں۔'' بوڑھے راجا کی حالت دیکھتے ہوئے اس نے دل نہ چاہتے ہوئے بھی اس سے اجازت طلب کی۔

''ذرا ٹھہرو۔'' راجا نے اسے رکنے کا اشارہ کیا اور خود اپنی جگہ سے اٹھ کر سج سج چلتا ہوا وسیع و عریض کمرے کو تقسیم کرنے والے پردے کو ہٹا کر دوسری طرف چلا گیا۔ کچھ دیر بعد واپسی ہوئی تو ہاتھ میں ایک مخملی تھیلی تھی۔

''اپنا سب کچھ تیاگ دینے کے بعد یہ ہم نے نہ جانے کیوں سنبھال رکھے تھے۔ اب خوشی ہو رہی ہے کہ تمہیں خالی ہاتھ بھیجنے کی خجالت سے بچ گئے۔'' وہ تھیلی اس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے راجا نے حسرت زدہ سے لہجے میں کہا۔

''مجھے آپ سے آپ کی دعاؤں کے سوا کچھ نہیں چاہیے۔'' وہ اس تھیلی کو تھامنے میں متردد ہوا۔

''بے شک نہیں چاہیے ہوگا لیکن تمہارا یہاں سے خالی ہاتھ لوٹ جانا ہمیں شدت سے احساس دلائے گا کہ ہم ایک معزول حکمران ہیں۔ اپنے لیے نہ سہی، ہماری عزت کے بھرم کے لیے یہ تحفہ سویکار کر لو۔'' راجا نے اس کے لیے انکار کی گنجائش باقی نہیں رہنے دی۔ اس نے وہ چھوٹی لیکن بھاری تھیلی تھامی اور جذباتی انداز میں باپ سے لپٹ گیا۔ وقتِ رخصت دونوں ہی کی آنکھوں میں آنسو تھے اور دونوں ہی کی کوشش تھی کہ ان کے آنسو ظاہر نہ ہونے پائیں۔

محل سے رخصت ہو کر وہ حاطب کے ہمراہ اپنے میزبان کے گھر واپس پہنچا تو ذہنی اور قلبی حالت بہت عجیب تھی۔ باپ سے ملوں گا، انہیں اپنے زندہ ہونے کی خبر دوں گا اور وقتاً فوقتاً ملتے رہنے کا وعدہ کر کے رخصت لے لوں گا، یہ سوچنا آسان تھا۔ مل لینے کے بعد دل میں جو تڑپ پیدا ہو گئی تھی اس سے گزرنا بہت مشکل ہو گیا تھا۔ وہ اپنے آپ کو ایک بار پھر اس تکلیف سے گزرتا ہوا محسوس کر رہا تھا جس تکلیف سے سردار امان کی موت کے وقت گزرا تھا۔ بچھڑنا شاید دنیا کا سب سے تکلیف دہ عمل ہے۔ موت جدائی ڈالے یا انسان جیتے جی اپنے پیاروں کو چھوڑ دینے پر مجبور ہو جائے، دونوں صورتوں میں تکلیف بہرحال ہوتی ہے۔ وہ بھی اس وقت شدید تکلیف میں تھا۔ برسوں سے بچھڑے باپ سے ملاقات ہوئی تھی تو بھی جدائی کی شرط پر۔ وقت نے ان کے درمیان ایسی لکیر کھینچ دی تھی کہ باپ بیٹا چاہ کر بھی ایک دوسرے کے ساتھ نہیں رہ سکتے تھے۔ دونوں طرف مجبوریاں اور مصلحتیں تھیں۔ بیٹا رک نہیں سکتا تھا اور باپ روکنے پر قادر نہیں تھا۔ وہ پلک جھپکائے بغیر بستر پر لیٹا رات بھر تڑپتا رہا۔

پُرخطر جزیروں اور بغاوتوں کے جنگل میں بھٹکتے مسافر کی داستان کے مزید واقعات اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں

www.pklibrary.com

جمعے کی سہ پہر پرنسپل این ڈیوٹ کو اپنی میز صاف کرنے اور ویک اینڈ کا انتظار کرنا چاہیے تھا لیکن اس کے بجائے وہ ڈینی بلیک ویل کو دیکھ رہی تھی جو اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ ایک ایسے نوعمر لڑکے کی عکاسی کر رہا تھا جو دوسروں کے لیے پریشانی کا باعث تھا۔ این جانتی تھی کہ ایسے لڑکوں سے نمٹنا کتنا مشکل ہوتا ہے۔

ڈینی کو وہاں بیٹھے ہوئے دس منٹ ہو چکے تھے۔ انہیں اس کے والدین کا انتظار تھا اور اب ڈینی کی بے چینی

ہیرو

شاہ زین رضوان

مغربی معاشرے میں اگرچہ اچھائی اور برائی کے معیار اور انداز ذرا الگ ہی ہوتے ہیں اس لیے ان میں فرق بھی ذرا مشکل سے ہی ہو پاتا ہے شاید ... اسے بھی بہت دیر لگی تھی ایک سیدھی سی بات کو سمجھنے کے لیے کہ وہ ایک ہیرو ہے کیونکہ ... اس کا معیار اور ... انداز ہی جدا تھا۔

دشمنی کے انداز میں ہمدردی کرنے والے ایک ہیرو کا منفرد طریقہ

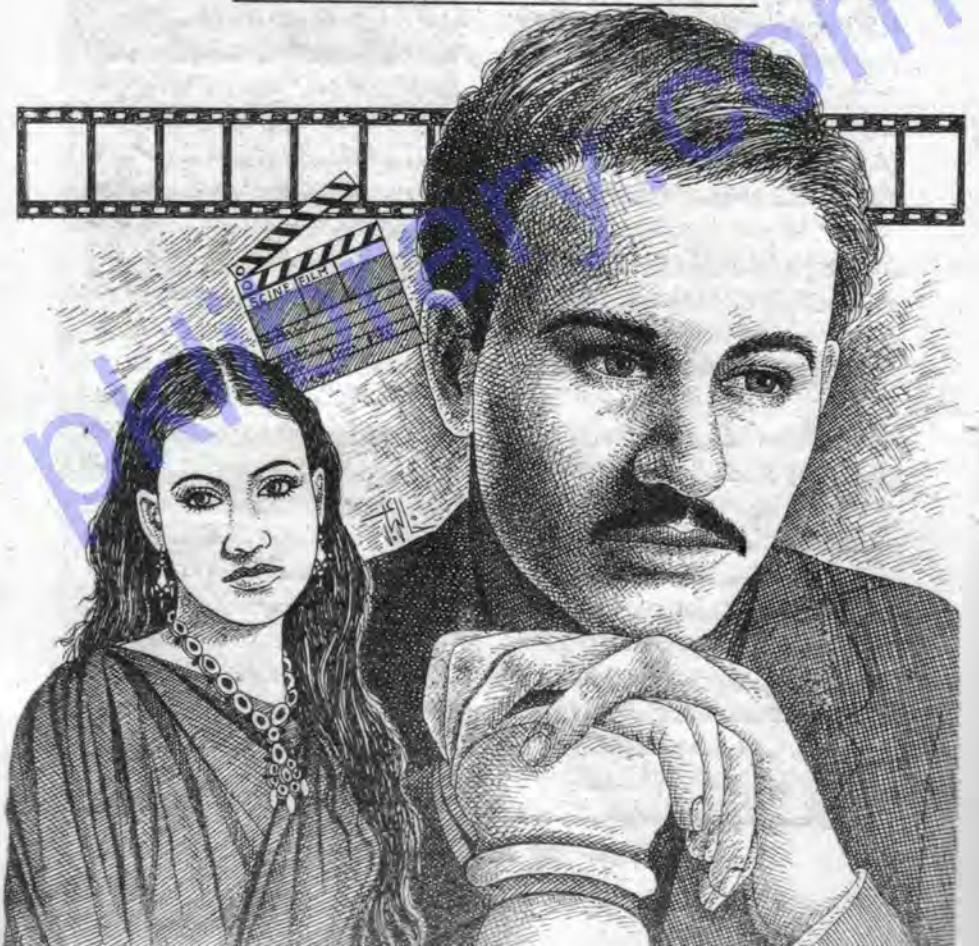

www.pklibrary.com

بڑھتی جارہی تھی۔ اس کے برعکس این کو اپنے آپ پر قابو تھا۔ اس نے بالکل بھی ظاہر نہیں کیا کہ اسے فریڈ اور لوسی بلیک ویل پر کتنا غصہ آرہا ہے جنہیں بیس منٹ پہلے آجانا چاہیے تھا۔

لگتا تھا کہ ڈینی اس کے سامنے اپنے جرم کا اعتراف نہیں کرنا چاہتا اور این کو بھی زیادہ باتیں کرنے کی عادت نہیں تھی لہٰذا این نے کچھ کاغذات دیکھنا شروع کردیے کیونکہ اس وقت کمرے میں ڈینی کے علاوہ کوئی اور فرد موجود نہیں تھا اس لیے این نے اپنے کمرے کا وہ دروازہ کھلا رکھا جو دوسرے کمرے میں کھلتا تھا۔ وہاں اس کی سیکریٹری کرسٹی بیٹھتی تھی اور وہ اس وقت تک نہیں جاتی تھی جب تک کہ این اسے نہ کہے۔ اس وقت این اپنے کمرے میں ایک طالب علم کے ساتھ تنہا تھی اس لیے مناسب نہیں تھا کہ وہ درمیان کا دروازہ بند کردیتی۔

این نے ڈینی کو غور سے دیکھا۔ اس کی عمر سولہ سال تھی۔ بھورے بال، بادامی آنکھیں اور دلکش مسکراہٹ تھی لیکن این کو کئی ہفتوں سے وہ مسکراہٹ نظر نہیں آئی اور اب وہ اس بارے میں سوچ رہی تھی۔ اسے فخر تھا کہ وہ اپنے تمام طالب علموں کے بارے میں جانتی ہے لہٰذا ڈینی کے بارے میں بھی اس کے پاس مکمل معلومات تھیں۔ وہ ایک اوسط درجے کا طالب علم تھا۔ اسے ایتھلیٹ تو نہیں کہا جاسکتا البتہ وہ فٹ بال کھیلتا تھا۔ درحقیقت وہ ایک غیر اہم شخصیت تھا لیکن گزشتہ چند ماہ میں اس نے کچھ ایسی حرکتیں کیں کہ وہ سب کی توجہ کا مرکز بن گیا۔

اس کا یہ رویہ تکلیف دہ تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ جرم کے راستے پر چل پڑا ہے۔ گو کہ ابھی وہ طفل مکتب تھا لیکن ایک ہفتے میں تین ٹیچرز نے اس کی شکایت کی تھی لہٰذا این کو یہ قدم اٹھانا پڑا۔

اب وہ این کے دفتر میں بیٹھے ایک دوسرے کی کمپنی میں بور ہورہے تھے جبکہ باہر سورج نکلا ہوا تھا اور ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ یہ گویا ہر ایک کے لیے دعوتِ عام تھی کہ وہ باہر نکلے اور اپنے انداز میں موسم سے لطف اندوز ہو۔

این نے سیکریٹری کی میز پر رکھے ہوئے فون کی گھنٹی اور جواب میں اس کے بڑبڑانے کی آواز سنی تو اس نے اپنے کمرے کی کھڑکی سے باہر دیکھا۔ اس کی نظریں پارکنگ لاٹ سے ہوتی ہوئی سرسبز لان اور اس سے آگے جنگل تک چلی گئیں پھر وہ اٹھی اور سیکریٹری کے کمرے میں چلی گئی۔

''بلیک ویل کا فون تھا؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں، فریڈ بلیک ویل کا فون تھا۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ نہیں آسکتے۔ لگ رہا تھا کہ وہ اپنی کار میں ہے۔''

این اس لڑکے کو والدین کی غلطیوں کے لیے موردِ الزام نہیں ٹھہرا سکتی تھی۔

''میرا خیال ہے کہ وہ سیلز مین ہے۔ میں اس سے مل چکی ہوں۔'' این نے کہا۔ ''اس نے اسکول کی کچھ چیزیں بیچی تھیں۔ کیا تم ان لوگوں کے بارے میں کچھ جانتی ہو؟ مجھے یاد ہے کہ اس کی بیوی زیادہ تر وہیل چیئر پر ہوتی تھی۔''

کرسٹی کافی عرصے سے کولٹین کاؤنٹی میں رہ رہی تھی اور وہ وہاں کے لوگوں کے بارے میں تقریباً ہر بات جانتی تھی۔

''اس وقت فریڈ ایک مختلف شخص تھا۔ لوسی بلیک ویل گزشتہ دو سال سے کینسر میں مبتلا ہے۔'' کرسٹی نے دھیمی آواز میں کہا۔ ''اسے چوتھے درجے کا بریسٹ کینسر ہے۔ فریڈ اس صورتِ حال سے پریشان ہے اور وہ ہر ایک کو الزام دے رہا ہے۔ ڈینی ان کی اکلوتی اولاد ہے۔ وہ تنہا ہے اور کوئی اس سے بات کرنے والا نہیں۔''

کرسٹی جو کہہ رہی تھی، اسے سمجھنا آسان تھا۔ این نے اس کی بیان کردہ صورتِ حال پر غور کیا۔ کرسٹی کے خیال میں ڈینی کو اس کی ماں کی خوفناک بیماری سے نمٹنے کے لیے تنہا چھوڑ دیا گیا تھا۔

این اپنے دفتر میں واپس آئی اور کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس نے ڈینی کو غور سے دیکھا جو اپنا فون جیب میں رکھ کر ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔

''میں سمجھتا ہوں کہ وہ نہیں آرہے۔'' ڈینی نے کہا۔

''لگتا تو یہی ہے۔'' این بولی۔

''ہاں، وہ کبھی نہیں آئیں گے۔'' وہ اپنی تلخی نہ چھپا سکا۔

''لیکن میری ماں کے لیے آج کا دن اچھا نہیں ہے۔'' ڈینی نے کہا۔ ''وہ واقعی بیمار ہے۔''

وہ اپنے والدین کے بارے میں بات کرتا رہا۔ اسے اپنی زبان پر قابو نہیں تھا۔ یہ جانتے ہوئے کہ وہ فضول گفتگو کررہا ہے، این اس بارے میں کچھ نہیں کرسکتی تھی البتہ یہ ضرور چاہتی تھی کہ وہ اپنا رویہ تبدیل کرے۔

''تو آج رات تمہاری کوچ ہیری کے ساتھ ڈیٹ ہے؟'' ڈینی نے اسے چور نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا جیسے اس نے این کے خیالات پڑھ لیے ہوں۔

این نے اسے سختی سے گھورا۔ وہ ڈینی کو اپنی ذاتی زندگی کے بارے میں بات کرنے کی اجازت نہیں دے سکتی تھی۔

www.pklibrary.com

ڈینی اس کے کڑے تیور دیکھ کر گھبرا گیا اور بڑبڑاتے ہوئے بولا۔ ''سوری!''

''کیونکہ تمہارے والدین یہاں نہیں ہیں اس لیے ان کی غیر موجودگی میں ہم زیادہ بے تکلفی سے بات کر سکتے ہیں۔'' این نے کہا۔

ڈینی کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ ''لیکن!''

''ٹھاہ..... ٹھاہ.....''

''اوہ میرے خدا!'' کرسٹی نے چیخ ماری۔

''یہ فائر کی آواز ہے۔'' ڈینی نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

نارتھ کیرولینا میں شکار اور نشانہ بازی بہت مقبول تھی اور اسکول کے بیشتر طالب علم بندوق اور پستولوں سے آشنا تھے۔

''کرسٹی! کیا تم سیکیورٹی کیمروں تک پہنچ سکتی ہو؟'' این نے کھڑے ہو کر آواز لگائی۔ عام طور پر سیکیورٹی کیمروں کی فوٹیج سیکیورٹی آفیسر ٹوڈ وائٹ کے دفتر میں نصب اسکرین پر دیکھی جا سکتی تھی لیکن کرسٹی انہیں اپنے کمپیوٹر پر بھی دیکھ سکتی تھی۔

''گولی یقیناً اسکول کے اندر سے ہی چلائی گئی تھی۔ ٹوڈ کہاں تھا؟ اس نے حملہ آور کو دیکھ کر الارم کیوں نہیں بجایا؟''

''میں دیکھ رہی ہوں۔'' کرسٹی سے بولا نہیں جا رہا تھا۔

''الارم بجاؤ۔'' این نے کہا۔

انہوں نے اس کی مشق کر رکھی تھی لیکن این کو اچانک ہی خیال آیا کہ انہوں نے اور بھی کئی مفروضے قائم کر رکھے تھے مثلاً یہ کہ میٹل ڈیٹیکٹر سے پتا چل جائے گا کہ کوئی پستول لے کر آیا ہے، سیکیورٹی آفیسر حملہ آور کو دیکھ لے گا اور اس کا مقابلہ کرے گا۔

عمارت پوری طرح خالی نہیں ہوئی تھی۔ اس وقت بھی اسکول میں کچھ ٹیچرز اور طلبہ موجود تھے لہٰذا الارم بجایا گیا تاکہ اگر کوئی ہال یا باتھ روم میں ہو تو قریبی کلاس روم میں پہنچ جائے۔ ٹیچرز نے کلاس روم کے دروازے، کھڑکیاں بند کیں اور سب لوگ خاموش اور جھک کر بیٹھ گئے۔

این کو معلوم نہیں تھا کہ کون ابھی تک اسکول کے اندر ہے۔ اپنی کھڑکی سے وہ پارکنگ لاٹ میں چند کاریں دیکھ سکتی تھی۔ شاید کچھ ٹیچرز کام ختم کرنے کے لیے اپنے کمروں میں رک گئی تھیں اور اگر ان کے ساتھ کچھ بچے بھی ہوتے تو وہ اپنے والدین کے ساتھ گھر جا سکتے تھے۔

این نے الماری کی دراز کھولی اور جب وہ مڑی تو اس کے ہاتھ میں پستول تھا۔ وہ ہتھیار اس کے لیے غیر مانوس نہیں تھا۔ وہ اپنے پہلے شوہر کے ساتھ نشانہ بازی کی مشق کیا کرتی تھی اور اب وہ کوچ ہیری کے ساتھ نشانہ بازی اور شکار سے لطف اندوز ہوتی تھی۔

''کرسٹی!'' اس نے آواز لگائی۔ ''کیا تم نے ٹوڈ کو تلاش کیا؟''

عمر رسیدہ پولیس آفیسر ٹوڈ وائٹ کو اسکول میں تعینات کیا گیا تھا۔ اسے اپنے چھوٹے سے کنٹرول روم میں ہونا چاہیے تھا جہاں بیٹھ کر وہ سیکیورٹی کیمروں کو دیکھ سکتا تھا۔ اسے اب تک این سے بات کر لینا چاہیے تھی، پھر اس نے کرسٹی کو بولتے ہوئے سنا لیکن اس کی بات سمجھ نہ سکی۔

''کیا ہوا؟'' این نے اس کے کمرے میں داخل

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں گھر بیٹھے حاصل کریں

جاسوسی، ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرسالانہ بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ

پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 1500 روپے

امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 20,000 روپے

بقیہ ممالک کے لیے 19,000 روپے

بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں

رابطہ:

مرزا شمر عباس: 0301-2454188

سرکولیشن مینیجر سید منیر حسین: 0333-3285269

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی

مین کورنگی روڈ۔ کراچی

www.pklibrary.com

ہوتے ہوئے کہا۔

کرسٹی اپنی کمپیوٹر اسکرین کو دیکھ رہی تھی جس پر سیکیورٹی کیمرے کی فوٹیج نظر آرہی تھی۔ اس کے گال آنسوؤں سے تر تھے۔

''ٹوڈ مرگیا۔'' کرسٹی نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''فوراً نو گیارہ کو فون کرو۔''

کرسٹی نے اس کے کہنے پر عمل کیا۔ اس نے لرزتی آواز میں اپنا تعارف کروایا لیکن واضح طور پر آفیسر کو پوری صورتِ حال بتادی۔ اسکول الارم نے پہلے ہی انہیں ہوشیار کردیا تھا لیکن این چاہتی تھی کہ ان کی مدد کے لیے مسلح پولیس پہنچ جائے۔

''میں ٹوڈ کو دیکھنے جارہی ہوں۔'' این نے کہا۔

اس وقت انہوں نے ایک اور فائر کی آواز سنی جو دور سے آئی تھی۔

''وہاں مت جاؤ۔'' کرسٹی نے جلدی سے کہا۔ ''تمہارا جانا ضروری نہیں ہے۔''

این یہ بات جانتی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ وہ اپنے آپ کو خطرے میں ڈال رہی ہے لیکن یہ اس کا اسکول تھا۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ کوئی شخص اس کے اسکول میں لوگوں کو گولی مار کر چلا جائے۔

''مجھے ٹوڈ کو دیکھنا ہے۔'' اس نے پھر کہا۔ کرسٹی اس کی بات کو سمجھتی تھی۔ اسے اس پر یقین تھا۔ اس نے اپنے سوئٹر کے نیچے پیٹی میں گن چھپائی، چابیاں جیب میں رکھیں اور جوتے اتار کر دبے پاؤں نارتھ ساؤتھ ہال کی جانب چل دی۔

اسکول کے داخلی دروازے پر دو میٹل ڈیٹیکٹر لگے ہوئے تھے۔ اس کے بائیں جانب ایک اور دروازہ تھا جسے صرف این استعمال کرتی تھی۔ این نے وہ دروازہ تھوڑا سا کھولا۔ اسکول میں بالکل خاموشی تھی۔ راہداری کا بغور جائزہ لینے کے بعد اس نے قدم باہر نکالا اور دروازہ بند کردیا۔

جمعے کے روز اسکول بند ہونے کے بعد صفائی کا عملہ ہر کمرے میں جاکر صفائی کرتا اور مشین کے ذریعے فرش پر پالش کرتا لیکن اس روز کوئی آواز نہ سنائی دی۔ کیا انہوں نے کسی کمرے میں پناہ لے رکھی تھی یا وہ بھی مرگئے تھے؟

این کو ٹوڈ وائٹ کی لاش اس جگہ سے نظر آگئی جہاں وہ کھڑی ہوئی تھی۔ اس کی لاش ہال کی مخالف سمت میں پڑی ہوئی تھی۔ وہ آدھا کمرے سے باہر اور آدھا اندر تھا۔

ایک گز کا فاصلہ ہونے کے باوجود وہ بتا سکتی تھی کہ ٹوڈ مرچکا ہے۔ وہ دبے پاؤں چلتے ہوئے اسکول کے مرکزی دروازے تک گئی اور دیکھا کہ میٹل ڈیٹیکٹرز کے پلگ نکلے ہوئے تھے، جیسے یہ قیمتی آلات بے کار ہوگئے ہوں۔

این کو کبھی بھی ان آلات پر بھروسا نہیں تھا۔ وہ صحیح جگہ نصب نہیں تھے اور ان کی موجودگی کے باوجود صبح آنے والے طالب علموں کی نگرانی کے لیے کم از کم دو سیکیورٹی آفیسرز کی ضرورت ہوتی تھی۔

این کو یہ بات بہت عجیب لگی کہ حملہ آور نے صرف میٹل ڈیٹیکٹر کا پلگ نکالنے کے بارے میں سوچا ورنہ نوّے فیصد طالب علموں کو تو معلوم بھی نہ ہوگا کہ ان کے پلگ دیوار میں لگے ہوئے ہیں۔

اس نے اندازہ لگایا کہ حملہ آور کا کوئی مخصوص ہدف تھا ورنہ وہ اس وقت آتا جب یہاں زیادہ لوگ ہوتے۔ وہ واپس مڑی اور اس جگہ گئی جہاں ٹوڈ کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ سیکیورٹی روم کے برابر میں نرس کا کمرا منقل تھا۔ اگر وہ اس وقت موجود ہوتی جب ٹوڈ وائٹ کو گولی لگی تب بھی وہ مرجاتا۔ اسے تو ملک کے بہترین ڈاکٹروں کی ٹیم بھی نہیں بچاسکتی تھی کیونکہ اس کے سینے میں گولی لگی تھی۔

این کمرے میں دیکھنے کے لیے لاش پر جھکی۔ اس کی یہ حرکت ایک اسکرین پر نظر آئی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ جو کچھ کررہی ہے، اسے کیمرا دیکھ رہا ہے۔ راہداریوں میں صرف چند مقامات کیمرے کی رینج سے باہر تھے۔

گویا ٹوڈ ان کیمروں کی منظر کشی دیکھ رہا تھا اور اس نے کسی کو مرکزی دروازے سے اندر آتے بھی دیکھا تھا۔ ممکن ہے کہ اس نے کسی کو پلگ نکالتے ہوئے بھی دیکھا ہو۔ اسے اپنی گن نکالنے اور دفتر کا دروازہ کھولنے کا موقع تو مل گیا لیکن وہ حملہ آور کو خبردار نہ کرسکا۔

یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ٹوڈ اس شخص کو جانتا ہو جو بیرونی دروازے سے اندر داخل ہوا تھا یا یہ بھی ممکن ہے کہ اس نے حملہ آور کو زخمی کردیا ہو۔ وہاں خون نظر نہیں آیا لیکن یہ کوئی ثبوت نہیں تھا۔ وہ ٹوڈ کی گن کا معائنہ کرنے والی تھی جب ایک آواز نے اسے دیوار سے لگنے پر مجبور کردیا۔ یہ کسی کے بے آواز جوتوں کی آواز تھی جو کینے میریا سے اس طرف آرہا تھا۔

این نے اس کے آنے کا انتظار کیا تاکہ وہ اسے دیکھ سکے۔ ممکن ہے کہ وہ حملہ آور ہو اور شاید زخمی ہوگیا ہو کیونکہ اس کی چال ناہموار تھی۔ این نے اپنی گن نکال لی پھر این نے اس لڑکی کو پہچان لیا جو لنگڑاتے ہوئے چل رہی تھی۔

www.pklibrary.com

''واندا!'' این نے آہستہ سے کہا۔ ''تم باہر کیوں آگئیں؟ مسز لوری کہاں ہے؟''

واندا اسے دیکھ کر پُرسکون ہوگئی اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ وہ اپنی پرنسپل کی طرف لپکی اور اس کے گلے میں اپنی بانہیں ڈال دیں۔

''وہ مرگئی۔'' واندا نے روتے ہوئے کہا اور زور زور سے سسکیاں لینے لگی۔

''مسز لوری کہاں ہے؟'' این نے کہا۔ ''کیا تم نے دیکھا کہ کس نے اسے گولی ماری ہے؟''

''لفٹ میں۔'' واندا نے کہا۔ ''وہ مجھے یہاں سے نکال رہی تھی تاکہ میں اپنی ماں کی کار تک چلی جاؤں۔ جیسے ہی لفٹ کا دروازہ کھلا اس نے کہا ''نہیں'' اور مجھے اپنے پیچھے کرلیا لہٰذا میں کچھ نہ دیکھ سکی۔ اب وہ خون میں لتھڑی پڑی ہے۔'' اس نے اپنے سامنے ایک خون آلود لاش دیکھی تو اس کی چیخ نکل گئی۔

این نے اسے چپ کرانے کی کوشش نہیں کی اور اپنا پستول کمر میں اڑسنے کے بعد ٹوڈ کی گن اٹھالی۔ وہ جانتی تھی کہ یہ غلط ہے لیکن بھرے ہوئے پستول کو وہاں چھوڑنا بھی مناسب نہیں تھا۔

این اس لڑکی کو لے کر اپنے دفتر میں آئی اور دروازے پر دستک دی۔ ''مس ڈیوٹ!'' کرسٹی نے اندر سے کہا۔ وہ اس دستک کو پہچانتی تھی۔

''دروازہ کھولو۔'' این نے کہا۔ ''میرے ساتھ واندا ہے۔''

''اوہ، میرے خدا!'' دروازہ فوراً ہی کھل گیا اور این، واندا کے ساتھ دفتر میں داخل ہوئی۔

''دروازہ بند کردو۔'' این نے کہا۔ اسے یقین تھا کہ وہ یا واندا حملہ آور کی توجہ کا مرکز بن گئی ہوں گی۔ باہر کھڑے ہونا اور چلّانا ایک طرح سے حملہ آور کو بلانے کے مترادف تھا۔

این سوچ رہی تھی کہ ٹوڈ کے بعد لوری کو کیوں قتل کیا گیا؟ ٹوڈ کا قتل تو سمجھ میں آتا تھا کیونکہ وہ سیکیورٹی آفیسر ہونے کے علاوہ مسلح اور تربیت یافتہ بھی تھا جبکہ لوری ایک مہربان، سمجھ دار اور چرچ جانے والی عورت تھی اور دس سال سے معذور بچوں کی مدد کررہی تھی۔ این نے یہ بھی سنا تھا کہ وہ ویک اینڈ پر ضرورت مند گھرانوں میں کھانا بھی لے کر جاتی تھی۔ یہ ناقابلِ یقین تھا کہ وہ خاص طور پر کسی کا ہدف بنتی۔

'میں نے کرسٹی سے یہ نہیں پوچھا کہ پولیس کب آئے گی؟' این نے سوچا۔

عقیدے

☆ اسلامی ملک مالدیپ کے باشندوں کا عقیدہ ہے کہ اگر انہیں کسی نے کھاتے دیکھ لیا تو دیکھنے والے کا تو پیٹ بھر جائے گا لیکن وہ خود بھوکے رہ جائیں گے۔

☆ برصغیر میں مسلمان صفر کے مہینے میں شادی نہیں کرتے تھے۔

☆ قدیم یونانی اپنے بدصورت بچوں کو چٹانوں سے نیچے پھینک دیتے تھے۔

مرسلہ: ریاض بٹ، حسن ابدال

وہ واپس اس جگہ پر آئی جسے گرانڈ سینٹرل کہا جاتا تھا۔ اس نے مزید کسی فائر کی آواز نہیں سنی تھی اور نہ ہی کسی کو حرکت کرتے دیکھا نہ سنا۔ اس نے نوٹ کیا کہ صرف ایک کلاس روم کا دروازہ اور کھڑکی بند ہے۔ کوئی تصور نہیں کرسکتا تھا کہ اسکول حالتِ محاصرہ میں ہے جبکہ سب طالب علم جاچکے تھے۔

اگر حملہ آور ٹوڈ اور لوری کو قتل کرنے کے بعد فرار نہیں ہوا اور وہ ابھی تک عمارت میں تھا تو وہ صرف دو جگہوں پر ہوسکتا تھا۔ کیفے ٹیریا یا اوپر کی منزل پر۔ وہ کیفے ٹیریا کی طرف گئی۔ وہ بڑی خاموشی سے چل رہی تھی۔ یہ بھی اچھا ہوا کہ ابھی تک کسی نے فرش پر پالش نہیں کی تھی ورنہ وہ پھسل جاتی۔

کیفے ٹیریا کے دونوں دروازے اور لائٹیں بند تھیں۔ وہ جھک کر دروازوں کی جھری سے سننے کی کوشش کرنے لگی۔ اس نے فرش پر کرسی گھسیٹنے کی آواز سنی۔ کیفے ٹیریا کے ملازمین اب تک جاچکے ہوں گے تاہم فوڈ سروس منیجر مارکوس واشنگٹن شاید اب بھی کام کررہا ہو۔ بیوی کے مرنے کے بعد وہ اسکول میں زیادہ وقت گزارنے لگا تھا۔

ہر دروازے میں ایک شیشہ لگا ہوا تھا۔ این کھڑکی کے ایک طرف کھڑے ہوکر جھانکنے لگی لیکن اسے کچھ زیادہ نظر نہیں آیا۔ وہ گھٹنوں کے بل جھک کر کھڑکی کے نیچے سے ہوتی ہوئی دوسرے دروازے تک گئی۔ اس نے مارکوس کو کیفے ٹیریا کے آخری سرے پر دیکھا۔ وہ ٹیچرز کے لیے مخصوص میز پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی پشت این کی طرف تھی اور وہ کسی چیز پر جھکا ہوا تھا۔ نہ جانے وہ کیا کررہا ہے؟ اسے معلوم ہونا چاہیے کہ عمارت میں ایک حملہ آور موجود ہے۔

این نے اپنے دائیں ہاتھ سے دروازے کو دھکا دیا۔ ٹوڈ کی گن اس کے بائیں ہاتھ میں تھی۔ وہ میزوں کے

www.pklibrary.com

درمیان سے گزرتے ہوئے اس کے پاس پہنچی لیکن مارکوس اسے دیکھنے کے لیے نہیں مڑا۔

''مارکوس! کیا تم نے الارم کی آواز نہیں سنی؟'' اس نے کہا۔

''میں نے سنی تھی۔'' مارکوس نے کہا۔ اس کی آواز سخت اور درد بھری تھی۔ ''مجھے گولی لگی ہے۔''

این نے اس کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ جب وہ اس کے قریب پہنچی تو اسے خون کی بو آئی۔ اس نے دیکھا کہ مارکوس کے دونوں ہاتھ اس کی سفید پولو شرٹ پر ہیں۔ اس نے ابھی تک باورچیوں والا ایپرن پہن رکھا تھا۔ وہ یقیناً کچن میں کام کر رہا ہوگا۔ اس نے اپنی انگلیوں سے زخم کی جگہ کو زور سے دبا رکھا تھا تاکہ خون جسم سے باہر نہ آئے۔

''کس نے تمہیں گولی ماری؟'' این نے پوچھا۔

''میرا خیال ہے کہ وہ کوئی سراغ رساں تھا..... جو الارم سن کر آیا۔ میں اسے نہیں جانتا۔'' مارکوس نے کہا۔ اس کی آواز بہت مدھم ہوگئی تھی اور وہ اپنے زخم کو کنٹرول کرنے پر توجہ دے رہا تھا۔ ''میرا خیال ہے کہ میں نے اسے پہلے بھی دیکھا ہے۔'' اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔ ''کیا تم ایمبولینس بلا سکتی ہو؟''

''وہ آرہے ہیں۔ ہم نے انہیں دس منٹ پہلے ہوشیار کر دیا تھا۔'' اس نے امید کا اظہار کیا۔ ''وہ دیکھنے میں کیسا لگ رہا تھا؟''

''بھورے بال، بھوری آنکھیں، قد پانچ فٹ دس انچ، دبلا پتلا، عمر چالیس کے لگ بھگ۔'' وہ دوبارہ ہانپنے لگا۔ اس کا پورا جسم اکڑ گیا۔ اس سے درد برداشت نہیں ہو رہا تھا۔

این کچن ٹاول اور ٹیپ لے کر آئی۔ اس نے مارکوس کو میز پر لیٹنے میں مدد دی اور اس کے زخم پر تولیا رکھ کر مضبوطی سے ٹیپ لگا دیا۔ یہ ایک عارضی کارروائی تھی لیکن اس وقت وہ یہی کر سکتی تھی۔

اس کا خیال تھا کہ مارکوس بے ہوش ہوگیا ہے لیکن اس نے آنکھیں کھول دیں۔ ''وہ عقبی دروازے کی طرف گیا ہے۔'' مارکوس نے کہا اور آنکھیں بند کر لیں۔

این دیر نہیں کر سکتی تھی۔ وہ ننگے پیر مڑی اور اس نے دوڑ لگا دی۔ حملہ آور سامنے والے دروازے سے آیا تھا۔ اس نے دو افراد کو قتل کیا لیکن وہ این کے دفتر میں نہیں آیا۔ وہ پوری عمارت سے گزرتا ہوا گیا اور مارکوس پر گھات لگا کر حملہ کیا اور اس دروازے سے نکل گیا جو باہر کی طرف کھلتا تھا۔

اس نے این کو اس کے دفتر سے باہر نکالا۔ اب این کو اپنی حماقت کا احساس ہوا کہ اس نے اس امکان کے بارے میں کیوں نہیں سوچا۔ وہ چاہتا تھا کہ این باہر آئے تاکہ وہ اسے قابو کر سکے یا وہ چاہتا ہوگا کہ این اپنے دفتر سے باہر آئے تاکہ وہ اسکول میں رہ جانے والوں کا دفاع نہ کر سکے۔

این نے اپنی رفتار کم نہیں کی جب تک کہ وہ دونوں ہال کے بیچ میں نہ پہنچ گئی۔ وہ اس جگہ سے دس فٹ دور تھی۔ اس نے بقیہ فاصلہ پیٹ کے بل رینگ کر طے کیا۔ اس نے اچانک ہی تصور کیا کہ حملہ آور کسی کونے میں چھپا ہوا ہے اور وہ جیسے ہی وہاں پہنچے گی تو وہ اسے قتل کر دے گا۔ وہ اس کے سر میں گولی مارے گا جیسا اس نے لوری کے ساتھ کیا تھا۔

یہ بڑی عجیب بات تھی کہ وہ سیکیورٹی آفیسر اور لوری کو قتل کرنے کے بعد کینے ٹیریا کی طرف چلا گیا۔ وہ وانڈا کو بھی مار سکتا تھا لیکن اس نے اسے چھوڑ دیا۔

این نے سائرن کی آواز سنی لیکن وہ بہت دور تھی پھر اس نے اپنے دفتر سے آنے والی آوازیں سنیں۔ اسے یہ آوازیں نہیں سننا چاہیے تھیں اگر وہ دفتر سے نکلتے وقت سب چیزیں بند کر کے آتی تو اچھا ہوتا۔ دفتر کا ایک دروازہ کھلا ہوا تھا۔ این کا خیال تھا کہ وہ عقبی دروازہ ہوگا۔ اسے وہ کبھی کبھی استعمال کرتی تھی جب وہ بہت جلدی میں ہوتی۔ جب وہ گرانڈ سینٹرل کے قریب پہنچی تو اس نے دیکھا کہ وہی دروازہ کھلا ہوا تھا اور وہیں سے آوازیں آرہی تھیں۔

کیونکہ وہ کسی کو وہاں چھوڑ کر نہیں گئی تھی جو دروازہ کھولتا اس لیے حملہ آور ہی اندر تھا۔ اب این کو اپنے آپ کو ظاہر کرنے کا خطرہ مول لینا تھا۔ وہ جاننا چاہتی تھی کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔

گو کہ اس وقت اس کی پوزیشن بڑی عجیب تھی۔ ایک پرنسپل کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ ننگے پاؤں ہتھیار لے کر ہال کے درمیان پھرتی رہے لیکن پیچھے ہٹنا اس کی فطرت میں نہیں تھا۔ اس نے اپنے حواس قابو میں کیے اور دروازے کی طرف جانے والی دیوار کے ساتھ چلنے لگی۔

وہ آوازیں اندر سے ہی آرہی تھیں۔ این میں ڈینی، کرسٹی، وانڈا اور ایک اجنبی شخص کی آواز شامل تھی۔ ''تم نے اسے قتل کر دیا۔'' وہ آدمی کہہ رہا تھا۔

''تم کس کی بات کر رہے ہو؟''

''تم نے اپنی ماں کو قتل کر دیا؟'' وہ آدمی غرایا۔

''کیا؟'' ڈینی کی پریشانی اور حیرت حقیقی لگ رہی تھی۔ این کو اس کا پورا یقین تھا۔ ''جب میں صبح گھر سے نکلا تو وہ بالکل ٹھیک تھی۔''

www.pklibrary.com

''تم جھوٹے ہو۔'' اور این نے کسی کے حرکت کرنے کی آواز سنی۔ کرسٹی چلائی۔

''فریڈ..... یہ مت کرو۔''

این تیزی سے گھومی اور ایک چھوٹی راہداری سے ہوتی ہوئی اپنے دفتر میں پہنچ گئی۔ اس کے دائیں ہاتھ میں ٹوڈ کی گن تھی۔ اس آدمی نے بھی حرکت کی اور این کو نشانے پر لے لیا۔ یہ یقیناً وہی شخص تھا جس کا حلیہ مارکوس نے بیان کیا تھا۔

این بائیں ہاتھ سے اپنا پستول نکال کر اسے گولی مار سکتی تھی لیکن یہ مناسب نہیں تھا۔ وہ قانون کو اپنے ہاتھ میں نہیں لینا چاہتی تھی۔ اس شخص کا گرفتار ہونا ضروری تھا تاکہ معلوم ہو سکے کہ اس نے دو بے گناہ لوگوں کو کیوں قتل کیا۔ اس لیے اس نے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا اور کوئی دوسرا راستہ تلاش کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

''واپس جاؤ۔'' اس شخص نے کہا۔ اس کا چہرہ اتنا بگڑا ہوا تھا کہ وہ اسے پہلی نظر میں نہ پہچان سکی لیکن پھر وہ اسے پہچان گئی۔

''تم نے سیکیورٹی سسٹم ناکارہ کیا۔'' این نے کہا۔ ''فریڈ بلیک ویل! کیونکہ تم ہی جانتے تھے کہ میٹل ڈیٹیکٹر کا پلگ کیسے نکالا جاتا ہے اور ٹوڈ کہاں ملے گا؟''

اپنے باپ کے پیچھے کھڑے ہوئے ڈینی نے حیرت زدہ انداز کو پیچھے دھکیلنا شروع کر دیا اور کرسٹی کا بازو پکڑ لیا تاکہ وہ اپنے کمرے میں واپس چلی جائے۔

فریڈ بلیک ویل کو ڈینی سے کوئی خطرہ نہیں تھا یہاں تک کہ اس نے پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا جب وہ تینوں کرسٹی کے دفتر میں واپس جا رہے تھے۔

این کو توقع تھی کہ کرسٹی اپنا دماغ استعمال کر کے دونوں بچوں کے ساتھ اس کے دفتر سے نکل کر خارجی دروازے کی طرف جائے گی۔

''ہاں، میں نے سیکیورٹی سسٹم ناکارہ بنایا۔'' فریڈ نے کہا۔ ڈینی بھی واپس آ گیا۔ اس نے بھی جوتے اتار دیے تھے۔ وہ فریڈ کے پیچھے کھڑا ہوا تھا۔ اس کی نظریں باپ کی پشت پر جمی ہوئی تھیں۔

لیکن پھر ڈینی ایک کرسی سے ٹکرایا اور وہ فرش پر تھوڑی سی کھسک گئی۔ اس معمولی سی آواز نے فریڈ کو چونکا دیا اور وہ یہ دیکھنے کے لیے گھوم گیا کہ اس کے عقب میں کیا ہو رہا ہے۔

این اسی وقت کے انتظار میں تھی۔ اس نے ٹوڈ کے پستول سے اس پر فائر کر دیا۔ اس نے یہ احتیاط ضرور کی کہ وہ مر نہ جائے کیونکہ وہ اسے پوچھ گچھ کے لیے زندہ رکھنا چاہتی تھی چنانچہ اس نے فریڈ کی بائیں ٹانگ کی پنڈلی کا نشانہ لیا۔ وہ نیچے گرا اور اس کی ٹانگ سے خون بہنے لگا۔ وہ چلایا اور اس نے بھی پلٹ کر فائر کرنے کی کوشش کی یا اضطراری طور پر ٹریگر پر گرفت مضبوط کرنے لگا۔

این چلائی اور دوسرے لمحے اس نے فریڈ کی کلائی پکڑ لی تاکہ اس کے ہاتھ سے پستول نکل جائے لیکن جب اس نے ضد دکھائی تو این نے اس کی زخمی ٹانگ پر ٹھوکر لگائی۔ بالآخر فریڈ نے پستول چھوڑ دیا اور اپنے زخم کی طرف ہاتھ بڑھانا چاہا لیکن این نے اسے ایسا نہیں کرنے دیا۔

''تمہیں گولی لگی ہے۔'' ڈینی چلایا۔ اس نے ابھی تک اپنے آپ کو کنٹرول کیا ہوا تھا لیکن اب اس سے ضبط نہ ہو سکا۔

''ڈینی! تم یہاں کیا کر رہے ہو؟'' این نے کہا۔

''یہ میرا باپ ہے۔'' ڈینی نے کہا۔ ''مجھے اسے کسی اور کو زخمی کرنے سے روکنا تھا۔ کیا میری ماں واقعی مر گئی ہے؟''

''تم نے اسے مارا ہے۔'' فریڈ نے بیٹے سے کہا۔

''تم نے اپنی ماں کو قتل کیا ہے۔'' اس کے چہرے پر دکھ اور نفرت تھی۔

این کو اس کی کوئی پروا نہیں تھی کہ یہ الزام صحیح ہے یا نہیں۔ ڈینی نے یقیناً کسی کو قتل نہیں کیا تھا لیکن اس کے چہرے پر پھیلی ہوئی حیرت نے اسے یقین دلا دیا کہ اس کا باپ جو کہہ رہا ہے، ڈینی اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔

''میں شرطیہ کہتی ہوں کہ تم نے اسے قتل کیا ہے فریڈ!'' این نے کہا۔ اس طرح اس نے ڈینی کو کسی اور بارے میں سوچنے کا موقع دے دیا پھر اس نے وہ بات کہی جس کا اس نے کبھی ارادہ نہیں کیا تھا۔ اس نے فریڈ کی طرف دیکھا اور بولی۔ ''تم ایک کمزور اور جذباتی شخص ہو۔''

''میں یہاں اپنے بیٹے کو قتل کرنے آیا تھا۔'' فریڈ نے روتے ہوئے کہا۔

''اس کے بجائے تم نے دو لوگوں کو قتل اور ایک کو زخمی کر دیا کیونکہ تمہارا خیال تھا کہ شاید وہ تمہیں پہچان لیں۔'' این نے کہا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ کیا ڈینی نے اس کی بات سنی ہے یا نہیں۔ لگ رہا تھا کہ اسے شدید صدمہ ہوا ہے۔

لیکن ڈینی نے سن لیا تھا۔ ''کیوں؟'' اس نے کہا۔

''کیوں ڈیڈی! تم نے مجھے اور مام کو ایک ہی دن میں کیوں کھو دیا؟''

''وہ کینسر میں مبتلا ہونے کے باوجود زندہ رہ سکتی

www.pklibrary.com

تھی۔'' فریڈ نے کہا۔ ''لیکن لوگ ہمیشہ تمہارے رویے کی شکایت کرتے رہتے تھے۔ تمہاری وجہ سے وہ بستر کی ہو کر رہ گئی۔ اس سے یہ برداشت نہ ہو سکا۔ اس نے آج صبح گولیوں کی زیادہ مقدار لے لی۔ جب میں کام پر گیا ہوا تھا یا تم نے اسے وہ خوراک دی ہوگی یا اس نے تم سے کہا تھا؟''

''تم نے ہی اسے کہا تھا کہ وہ اپنا علاج خود کرے۔''

ڈینی سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''تم نے ہی اسے وہ سب کچھ کرنے کے لیے کہا جو وہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ تم نے اسے اسپتال میں داخل نہیں کروایا بلکہ اس کے لیے نرس کا بھی انتظام نہیں کیا۔''

این پولیس کاروں کی آواز سن سکتی تھی جو اسکول کی پارکنگ لاٹ میں داخل ہو رہی تھیں۔ اس نے ٹوڈ کی گن ڈینی کو پکڑا دی۔ ڈینی نے پہلے گن اور پھر اپنے باپ کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ سخت ہو گیا۔ اس نے بازو نیچا کر کے نشانہ لیا اور فائر کر دیا۔

جب این کو یقین ہو گیا کہ فریڈ مر چکا ہے تو اس نے ٹھوکر مار کر اس کے ہاتھ سے گن دور کر دی۔ ڈینی خوفزدہ انداز میں اپنے باپ کی لاش کو دیکھ رہا تھا۔

''میری جان بچانے کا شکریہ۔'' این نے کہا اور اپنی گن الماری کی دراز میں رکھ کر اسے مقفل کر دیا۔ ''میرا خیال ہے کہ ٹوڈ کو بھی فخر ہوگا کہ تم نے اسی کی گن سے اس کے قاتل کو ہلاک کر دیا۔''

''کیا مسز اسٹرنگ نے تمہاری گن نہیں دیکھی؟'' ڈینی نے کہا۔

''میں ایسا نہیں سمجھتی اور تم نے بھی اپنی ماں کو نہیں مارا۔'' این نے کہا۔

ڈینی زور سے سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں نے ایسا کچھ نہیں کیا لیکن اس نے مجھ سے گولیوں کے لیے کہا تھا۔ میں نے منع کر دیا۔ اس میں اتنی طاقت تھی کہ وہ ان گولیوں کو لینے کے لیے چل کر جا سکتی۔''

این سن سکتی تھی کہ پولیس اسکول کی عمارت میں داخل ہو رہی ہے۔ ''یہ تمہاری زندگی کا بدترین دن ہے۔'' این نے کہا۔ ''اس کے بعد بھی بُرے دن آئیں گے لیکن یہ بدترین ہے۔ تم نے جو کیا وہ ٹھیک ہے۔ کچھ غلط نہیں کیا۔''

ڈینی اسے خالی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ''کیا تمہیں اس پر یقین ہے؟'' اس نے کہا۔

''ہاں!''

جب پولیس دفتر میں داخل ہوئی تو این نے اپنا بازو ڈینی کے گلے میں ڈال دیا۔ اب وہ رو رہا تھا۔ چیف مارٹن نے فریڈ کی لاش کو دیکھا۔ ''یہی حملہ آور ہے؟'' اس نے پوچھا۔

این نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''یہ اس لڑکے کا باپ ہے۔'' اس نے مارٹن کو بتایا۔ ''فریڈ اپنے بیٹے ڈینی کو یہ بتانے آیا تھا کہ اس کی ماں مر گئی ہے لیکن اس کا ٹوڈ سے جھگڑا ہو گیا اور اس نے اسے گولی مار دی۔ ہمارے کینے ٹیریا سپروائزر کو ایمبولینس کی فوری ضرورت ہے۔ وہ کینے ٹیریا میں ہے اور اس کے پیٹ میں گولی لگی ہے جبکہ لوری لفٹ میں ہے۔''

مارٹن ششدر رہ گیا۔ ''وہ بھی مر گئی؟''

''ہاں۔''

''اور یہ سب فریڈ نے کیا؟''

''ہاں۔''

''میں نہیں سمجھتا۔'' چیف مارٹن نے کہا۔

''پھر کون کر سکتا ہے؟'' این نے کہا۔

''مجھے شروع سے بتاؤ۔'' مارٹن نے کہا۔

''میں نے ٹوڈ کی گن اٹھالی۔'' این نے کہا۔ ''جب میں نے ٹوڈ کی لاش دیکھی تو یہ مناسب نہ سمجھا کہ وہاں ایک بھری ہوئی گن موجود ہو لہٰذا میں نے اسے اٹھالیا۔ جب میں اسے لے کر دفتر میں آئی تو فریڈ یہاں ڈینی کو دھمکا رہا تھا۔ میں نے فریڈ کو گرانے کی کوشش کی اور میرے ہاتھ سے گن چھوٹ گئی۔ خوش قسمتی سے ڈینی نے اسے اٹھالیا اور جب فریڈ نے مجھے گولی مارنا چاہی تو ڈینی نے اس پر فائر کر کے میری زندگی بچالی۔''

ڈینی نے این کے کندھے سے سر اٹھایا اور اثبات میں ہلا دیا۔

''کیونکہ ڈینی نابالغ ہے اس لیے بہتر ہوگا کہ تم وکیل کی موجودگی میں اس سے بات کرو۔'' این نے تجویز پیش کی۔ ''آج اس نے اپنے ماں باپ دونوں کو کھو دیا ہے۔''

چیف مارٹن نے اس کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''اور تم اسی بارے میں سوچ رہی تھیں جبکہ تمہارے سامنے فرش پر ایک لاش پڑی ہوئی ہے؟''

این نے کہا۔ ''میں ہمیشہ اپنے طالب علموں کے بارے میں سوچتی ہوں اور ڈینی نے تو میری جان بچائی ہے۔ وہ ایک ہیرو ہے۔'' این نے ڈینی کی آنکھوں میں دیکھا اور اس نے بھی جواب میں سر ہلا دیا۔

⌘⌘⌘

www.pklibrary.com

مشہور صوفی ابوعلی دقاق کے صاحبزادے اسماعیل کا نام خاصا مشہور ہوا۔ وہ اپنے اس بیٹے کو دیکھتے اور فرماتے۔
''واللہ! میں اس کی نسل میں احد الدین کو دیکھ رہا ہوں۔''

سلسلۂ تصوف کی ایک نادر شخصیت کی سوانح اور اقوال

کئی نسل پہلے جس کی آمد کی خبر دی گئی تھی۔ اپنے دین اور مسلک میں یکتا، زمانے کی رنگارنگی اور دلچسپیاں اسے اپنی طرف راغب نہ کرسکیں۔ اس عمر میں جس میں انسان سوچتا نہیں، عمل کرتا ہے اور ناتجربہ کاری اور لاعلمی سے دنیا کی ہر شے دلچسپ، حسین اور پرکشش معلوم ہوتی ہے۔ آپ کو ان کی اصل کا علم حاصل ہوگیا تھا۔ اپنے وقت کی عریاں تلوار، شمشیر براں۔ اس کی زد میں جو آیا کٹ گیا۔ وہ مرشد ہو یا کوئی اور صوفی، ان کی سچائی اور صداقت سے کوئی بے خبر نہ تھا۔

شیخ ابو عبداللہ بلیانی

ضیا تسنیم بلگرامی

www.pklibrary.com

ان سے پوچھا گیا۔ ''حضرت! احد الدین سے آپ کی کیا مراد ہے؟''

ابوعلی دقاق فرماتے۔ ''اس کا لقب احد الدین ہوگا۔ اپنے زمانے کا عظیم صوفی، اپنے دین، اپنے مسلک کا فردِ وحید۔''

آپ کے ایک مرید نے دریافت کیا۔ ''وہ کب آئے گا؟''

ابوعلی دقاق نے جواب دیا۔ ''یہ تو اللہ ہی جانے، لیکن وہ آئے گا ضرور۔''

آپ کے بعض مریدوں نے خوشی کا اظہار کیا اور پوچھا۔ ''اگر ہمیں ان کا زمانہ میسر آجائے تو ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ اس وقت ہم کیا کریں گے؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''اس کا زمانہ تم نہیں پاؤ گے لیکن بفرضِ محال اس کا زمانہ پا جاؤ تو تم پر یہ واجب ہوگا کہ اس کی بیعت کرلو۔''

دقاق کے مریدوں کو احد الدین کا انتظار تھا۔ دقاق کی کئی اولادوں میں اسماعیل کو بڑی قدر و منزلت سے دیکھا جا رہا تھا۔ وہ بہتوں کے لیے قابلِ رشک تھا۔ اسماعیل جوان ہوئے، بوڑھے ہو گئے لیکن ان کی اولاد میں احد الدین کا کہیں پتا نہ تھا۔ اسماعیل بھی اپنے دور کے بزرگوں میں شمار کیے جاتے تھے۔ ان سے پوچھا گیا کہ وہ احد الدین کہاں ہیں جن کی آپ کے والد نے پیش گوئی کی تھی؟

اسماعیل نے جواب دیا۔ ''آپ لوگ والد مرحوم کی بات سمجھ نہیں سکے۔ کیا انہوں نے یہ نہیں کہا تھا کہ اس کا زمانہ تم نہیں پاؤ گے۔ مجھے بھی کشف میں یہی بتایا گیا ہے کہ میرا وہ بچہ میرے بیٹے عمر کی اولاد میں سے ہوگا۔ عمر کی پانچویں پشت میں۔ اس کو تمہارے بعد کی نسلیں دیکھیں گی۔''

اب بات صاف اور واضح ہو چکی تھی۔ عمر کے بعد ان کے بیٹے احمد سے علی کا سلسلہ چلا۔ علی سے محمد اور محمد سے مسعود کی ولادت ہوئی۔ مسعود لوگوں میں بہت مقبول تھے۔ مسعود کا پورا نام شیخ ضیا الدین مسعود تھا اور یہ شیخ اسماعیل الدین شیرازی سے خرقۂ خلافت حاصل کر چکے تھے۔ یہاں ہزاروں تشنگانِ حق آتے اور اپنی پیاس بجھاتے۔ ان کے ایک بیٹے کا نام ابو عبداللہ تھا۔ ابوعبداللہ بچپن ہی سے غیر معمولی نظر آتے تھے۔ آنے جانے والوں سے گریزاں، خلوت پسند، یادِ الٰہی میں گم رہتے۔ باپ نے کئی بار سمجھایا۔ ''بیٹے! کیا بات ہے، تم میرے پاس نہیں بیٹھتے؟ کچھ کھوئے کھوئے رہتے ہو، آخر کیوں؟ اگر کوئی پریشانی لاحق ہو تو بتاؤ، میں اس کے ازالے کی فکر کروں۔''

ابوعبداللہ نے جواب دیا۔ ''باوا جان! میرے اندر ایک شعلہ موجزن ہے۔ انسانوں میں میرا دل نہیں لگتا۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں کہیں اور چلا جاؤں۔ میں بالکل تخلیہ چاہتا ہوں۔''

باپ نے کہا۔ ''تخلیہ تو یہاں بھی ہے پھر تمہیں کون سا تخلیہ درکار ہے؟''

ابوعبداللہ نے کہا۔ ''وہ تخلیہ جو پہاڑوں میں، غاروں میں میسر آتا ہے۔ انسانی آبادی سے دور۔ مجھے کوئی یہاں سے چلے جانے پر مجبور کر رہا ہے۔''

باپ کو پریشانی اور فکر نے گھیر لیا، کہا۔ ''بیٹے! ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے۔ ابھی تو تمہیں یہیں میرے پاس رہنا چاہیے۔ عبادت اور مجاہدے کے طریقوں پر غور کرو، سیکھو، ان پر عمل کرو، اس کے بعد کہیں جاؤ ورنہ یوں کسی تربیت کے بغیر تم کیا پاؤ گے؟''

ابوعبداللہ نے باپ سے بحث نہیں کی۔ خاموش ہو گئے اور یہی مناسب سمجھا کہ اپنے والد کی نگرانی میں تربیت حاصل کریں۔

ان کے والد ضیا الدین مسعود کی خانقاہ میں جو لوگ رہتے تھے، ان میں شیخ جمال الدین محمد باکھنجار بڑے نامور صوفی تھے۔ یہ بھی اس خانقاہ میں ذکر و فکر میں مشغول رہتے تھے۔ باپ بیٹے کی بات چیت شیخ جمال نے بھی سنی اور شیخ ضیا الدین سے کہا۔ ''بابا ضیا الدین! جس بچے کا ذکر بابا دقاق نے کیا تھا، میرا تو یہ خیال ہے کہ احمد الدین یہی وہ بچہ ہے۔ اس میں کچھ غیر معمولی باتیں نظر آتی ہیں۔''

ضیا الدین نے جواب دیا۔ ''میں یہ بات خود اپنی زبان سے نہیں کہنا چاہتا لیکن مجھے سالوں پہلے بتایا جا چکا ہے کہ یہی وہ احد الدین ہے جس کی دادا ابوعلی دقاق پیش گوئی فرما گئے ہیں۔''

ابوعبداللہ بڑے خوش الحان تھے۔ شعر و شاعری سے فطری لگاؤ رکھتے تھے۔ یہ رات کو بہت کم سوتے تھے۔ نصف شب کے بعد ذکر میں مشغول ہو جاتے اور اس ذکر کے دوران وہ بہت اچھے، پُرلطف اور دلوں کو تڑپا دینے والے اشعار بڑی خوش الحانی سے سنانے لگتے۔ یہ وہ وقت ہوتا تھا جب شیخ جمال بھی اپنے حجرے میں محوِ ذکر و اشغال ہوتے تھے۔ ابو عبداللہ کی پُرسوز آواز ان کے کان میں پڑتی تو وہ سب کچھ بھول کر اس آواز کے سحر میں ڈوب جاتے۔

شیخ جمال یہ نہیں جانتے تھے کہ یہ معمولی بچہ ایک دن کیا بن جائے گا؟

وہ بڑی سرد رات تھی۔ ابوعبداللہ نماز میں ایسے مشغول ہوئے کہ انہیں کسی بات کا ہوش ہی نہیں رہا۔ پھر نصف شب کے بعد افضل الذکر لا الہ الا اللہ کا ورد شروع ہو گیا۔ اس ورد کے دوران شیخ سعدی کا کلام نہایت پُرسوز اور خوش الحان دھن میں بہ آواز بلند پڑھنے لگے۔ شیخ جمال کے کانوں میں ان کی آواز جو پہنچی تو بے قابو ہو گئے اور تجاہلِ عارفانہ سے کام لینے کی کوشش کی۔ کسی سے یہ بھی نہ پوچھا کہ اندر کیا ہو رہا ہے۔

شیخ جمال اپنے قابو میں نہیں رہے اور اٹھ کر رقص شروع کر دیا۔ انہیں اس حال میں دیکھ کر دوسروں نے بھی یہی کام شروع کر دیا۔

شیخ ضیاالدین نے اپنے مریدوں اور ارادت مندوں سے کہا۔ ''دیکھو، میرے بیٹے ابوعبداللہ کو دیکھو اور اس سے کچھ حاصل کرنے کی کوشش کرو۔''

مریدوں نے کوئی جواب نہیں دیا لیکن شیخ جمال کہنے لگے۔ ''بابا ضیاالدین! اپنے بیٹے سے کہو کہ یہ ذکر میں اشعار کی پُرسوز آمیزش مجھ کو برباد کر دے گی۔ میرا جو حال ہو جاتا ہے، میں بیان نہیں کر سکتا۔''

شیخ ضیاالدین نے کہا۔ ''میں اپنے بیٹے سے یہ بات نہیں کہہ سکتا۔ تم خود کہو۔''

شیخ جمال خاموش ہو گئے۔

دوسرے دن رات کو شیخ جمال اپنے حجرے میں نماز ادا کر رہے تھے کہ ابوعبداللہ کی پرسوز آواز کانوں میں داخل ہوئی۔ شیخ جمال بے چین ہو گئے، نماز پڑھ کر ابوعبداللہ کے حجرے میں داخل ہو گئے۔ یہ اپنے کام میں اتنے مشغول اور منہمک تھے کہ انہیں شیخ جمال کی آمد کی خبر تک نہ ہوئی۔ کافی دیر بعد جب اپنے ہوش میں آئے تو گوشے میں شیخ جمال کو دیکھ کر فکرمند ہو گئے۔ پوچھا۔ ''عمِ محترم! کیا بات ہے؟ خیریت تو ہے؟''

شیخ جمال نے کہا۔ ''میں کئی دن سے سوچ رہا تھا کہ یہاں حاضری دوں اور تم سے چند ضروری باتیں کروں۔''

ابوعبداللہ نے پریشانی سے پوچھا۔ ''کیا مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی؟''

شیخ جمال نے جواب دیا۔ ''غلطی تو نہیں ہوئی مگر جو کچھ تم کر رہے ہو، اس سے میرا سکون، میرا چین جاتا رہا۔ میں تڑپ تڑپ کر راتیں گزارتا ہوں۔''

ابوعبداللہ نے پوچھا۔ ''میں کیا کر رہا ہوں؟''

شیخ جمال نے جواب دیا۔ ''صاحبزادے! یہ ذکر کے بیچ بیچ میں تم اشعار کیوں پڑھتے ہو؟''

ابوعبداللہ نے کہا۔ ''اس لیے کہ میرا دل مجھے اس پر مجبور کر دیتا ہے۔''

شیخ جمال نے کہا۔ ''عجیب ہے تمہارا دل۔ تمہاری پُرسوز آواز مجھے بے چین کر دیتی ہے۔ اگر میں عبادت میں مشغول ہوتا ہوں تو میرے انہماک میں فرق پڑ جاتا ہے اور میں تمہاری طرف متوجہ ہو جاتا ہوں اور اس پر تم یہ ستم کرتے ہو کہ میری سیری ہوتی نہیں اور تم خاموش ہو جاتے ہو۔ گویا تم نیم بسمل کر کے چھوڑ دیتے ہو۔''

ابوعبداللہ نے عرض کیا۔ ''عمِ محترم! میں جو کچھ کرتا ہوں غیر ارادی، بے اختیار کرتا ہوں۔ مجھے خود ہوش نہیں ہوتا کہ میں کیا کر رہا ہوں۔''

شیخ جمال کہنے لگے۔ ''دیکھو صاحبزادے! آئندہ ایسا نہ کرنا۔ میں تو ایک بات جانتا ہوں کہ جب درویش تم سے آواز خریدتے ہیں تو تم ان کے دل کے خریدار بن جاؤ۔''

ابوعبداللہ نے عرض کیا۔ ''میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔''

شیخ جمال نے جواب دیا۔ ''میرا مطلب بالکل سیدھا سادہ ہے۔ تم اپنی آواز اور اشعار سے میرے دل میں آگ لگا دیتے ہو۔ ہمیں تمہارا یہ مشغلہ پسند ہے اور تم سے فرمائش کرتے ہیں کہ اس کو دیر تک جاری رکھا کرو۔ نیم بسمل کر کے نہ

www.pklibrary.com

چھوڑ دیا کرو۔ اگر تم میری مرضی پوری کردو گے تو گویا میرا دل خرید لو گے۔"

ابوعبداللہ نے عرض کیا۔ "عم محترم! میں جو کچھ کرتا ہوں، غیر شعوری اور غیر ارادی طور پر کرتا ہوں۔ اب اگر میں ارادتاً اس میں طول دے دوں گا تو اس میں میرا شوق، میرا جذبہ شامل نہیں ہوگا اور جب اس میں میرا شوق میرا جذبہ شامل نہیں ہوگا تو آپ کا دل اس کا اثر کیوں قبول کرے گا۔"

شیخ جمال نے کہا۔ "نہیں، یہ بات نہیں ہے۔ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ تم جو کام ذرا سی دیر کے لیے کرتے ہو، وہ دیر تک ہوتا رہے اور تمہارا دل مستقلاً جذب و کیف میں مبتلا رہے۔"

ابوعبداللہ نے عرض کیا۔ "خدا کرے ایسا ہی ہو جائے۔ اللہ آپ کی زبان مبارک کرے۔"

شیخ جمال نے جواب دیا۔ "اللہ ایسا ہی کرے گا۔ تم درویشوں کو خوش کرو، درویش تمہیں خوش کر دیں گے۔"

دوسرے دن صبح باپ نے ان سے پوچھا۔ "کیا شیخ جمال تم سے ملے تھے؟"

انہوں نے جواب دیا۔ "ہاں ملے تو تھے۔"

باپ نے پوچھا۔ "کچھ باتیں کر رہے تھے؟"

انہوں نے جواب دیا۔ "ہاں، باتیں بھی کر رہے تھے۔"

باپ نے پوچھا۔ "کس قسم کی باتیں کر رہے تھے؟"

انہوں نے ساری باتیں بتادیں اور کہا۔ "پدر بزرگوار! آپ خود بتائیں کہ میں جو کچھ کرتا ہوں اس میں میرے ارادے، میرے اختیار کو کتنا دخل ہوتا ہے؟"

باپ نے کہا۔ "بیٹے! بات ارادے اور اختیار کی نہیں ہے۔ شیخ جمال زمانۂ حاضرہ کے بہت بڑے شیخ ہیں۔ ان کی دعائیں تمہارے کام آجائیں گی۔"

شیخ ابوعبداللہ نے عرض کیا۔ "پدر بزرگوار! میں تو آپ کی راہنمائی کا پابند ہوں۔ آپ جو کہیں گے میں اس پر عمل کروں گا۔"

باپ نے انہیں سمجھایا۔ "شیخ جمال کا یہ کہنا کہ درویش تم سے آواز خریدتے ہیں، تم ان کے دل کے خریدار بن جاؤ۔ اس کا یہی مطلب ہے کہ تم جو کچھ جذب و شوق میں سناتے ہو، اس کو تادیر سناتے رہو۔ اس سے انہیں جو لذت حاصل ہوتی ہے کسی اور چیز سے حاصل نہیں ہوسکتی۔"

ابوعبداللہ نے اپنے والد اور شیخ جمال کی خواہش پوری کردی لیکن اس سے خود انہیں سکون نہیں ملا اور یہ طے کرلیا کہ اب وہ کہیں اور جا کر عبادت اور ریاضت کا سلسلہ جاری رکھیں گے۔ چنانچہ آپ کوہِ رکام تشریف لے گئے اور وہاں کے ایک غار میں سکونت اختیار کی۔ یہاں دنیا کا شور و شغف نہیں تھا۔ کبھی کبھی وہاں سے نکل کر آبادی میں چلے جاتے۔ محنت مزدوری سے جو کچھ حاصل ہوتا اس سے ضروریاتِ زندگی کی اشیا خرید کر پھر یادِ الٰہی میں مشغول ہوجاتے۔

یہاں دوسرے صوفی بھی آتے رہے۔ کوہِ رکام کے غار اس معاملے میں زیادہ شہرت رکھتے تھے۔ یہاں مسلمانوں کے علاوہ دوسرے مذاہب کے بزرگ بھی آتے رہتے تھے۔ ابوعبداللہ اپنے کام سے کام رکھتے۔ ان کا کسی سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ ایک غیر مسلم صوفی نے جب ان سے یہ کہا کہ تم یہاں کیا لینے آئے ہو۔ تم تو مسلمان ہو اور مسلمان گوشہ نشینی یا ترک دنیا کے قائل نہیں ہوتے۔

اس پر انہوں نے اس کو جواب دیا۔ "میں یہاں زیادہ دن نہیں رہوں گا۔ میں تو اس طرح اپنے رسول ﷺ کی سنت پر عمل کر رہا ہوں۔ ہمارے رسول ﷺ نے بھی غارِ حرا میں وقت گزارا تھا اور وہیں حضرت جبرئیل تشریف لائے تھے اور اقرا باسم ربک الذی، قرآن کی پہلی سورۃ نازل ہوئی تھی۔ میں بھی اپنے رسول ﷺ کی طرح اپنے شہر واپس چلا جاؤں گا اور پھر ساری زندگی وہیں گزار دوں گا۔"

یہاں دوسرے غیر مسلم دیندار اور تارکِ دنیا آپ سے مباحثے اور مناظرے بھی کرتے رہتے تھے۔ اللہ نے آپ کو ایسا علم عطا کر رکھا تھا کہ مناظرے یا مباحثے میں لوگ آپ سے جیت نہیں پاتے تھے۔ نادر دلیلیں اور شاندار جوابات دوسروں کو زچ کر دیا کرتے تھے۔

ایک پارسی نے آپ سے کہا۔ "کیا بات ہے، تم مسلمانوں میں جنگ و جدل بہت ہوتی رہتی ہے۔ اس کی کوئی خاص

www.pklibrary.com

وجہ ہے؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''جنگ وجدل کون نہیں کرتا۔ ہم سب میں حیوانیت پائی جاتی ہے۔ پھر یہ الزام مسلمانوں کے سر کیوں؟''

پارسی لاجواب ہوگیا۔ آپ فرماتے رہے۔ ''مسلمان تو آپس میں شیر وشکر ہوکر رہتے ہیں۔ عربی، عجمی، حبشی، مصری، افریقی، ہندی سبھی ایک اللہ کی عبادت کرتے ہیں۔ اس کا عظیم الشان مظاہرہ دیکھنا ہے تو مسجدوں میں جا کر دیکھو۔''

آپ نے گیارہ سال کوہِ رکام کے اس غار میں گزار دیے اور جب یہ محسوس کیا کہ اب یہاں رہنا بے سود ہے تو وہاں سے چلے آئے۔ ان دنوں شہر میں شیخ زاہد ابوبکر ہمدانی کا بڑا چرچا تھا کہ یہ واقعی خدا رسیدہ ولی تھے۔ آپ ان کے پاس پہنچے تو انہیں دیکھتے ہی شیخ زاہد ابوبکر نے کہا۔ ''احمد الدین! تم کہاں تھے؟ میں تو تمہارا عرصے سے انتظار کر رہا ہوں۔''

شیخ ابوعبداللہ نے عرض کیا۔ ''حضرت! میرا نام تو ابوعبداللہ ہے۔ آپ احمد الدین فرما رہے ہیں۔''

شیخ زاہد نے جواب دیا۔ ''یہ نام میں نے نہیں، تیرے دادا ابوعلی دقاق نے صدیوں پہلے رکھا تھا۔''

شیخ ابوعبداللہ کو اب ان کی عظمت اور کشف کا یقین آگیا، کہنے لگے۔ ''میں خوش اور مطمئن ہوں کہ صحیح جگہ پر آیا ہوں۔''

شیخ زاہد نے کہا۔ ''کیا تم ابھی تک شک وشبے میں تھے؟''

انہوں نے جواب دیا۔ ''نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں۔ پھر بھی باتوں ہی باتوں میں جو کچھ معلوم ہوگیا اس سے میرے ایمان کو تقویت حاصل ہوئی ہے۔''

شیخ زاہد کہنے لگے۔ ''صاحبزادے! یہاں تم کتنے دن رہو گے، کچھ پتا نہیں لیکن یہاں آرام نہیں ملے گا۔ مشقتیں زیادہ ہیں، آرام برائے نام۔ سوچ لو۔''

انہوں نے جواب دیا۔ ''میں یہاں اپنی مرضی سے آیا ہوں، کسی کے بلانے سے نہیں۔ میں گیارہ سال کوہِ رکام کے غار میں گزار آیا ہوں۔ محنت مشقت سے بالکل نہیں ڈرتا۔ خوب سوچ سمجھ کر یہاں آیا ہوں۔''

انہوں نے ایک کونے میں لوہے کا عصا کھڑا دیکھا۔ سوچا، شیخ زاہد کے رہنے کا انداز یہ بتاتا ہے کہ یہ کہیں آتے جاتے نہیں اور ان کی صحت اتنی اچھی تھی کہ اگر ادھر اُدھر کہیں جاتے ہوں تو اس کے لیے عصا کی ضرورت نہیں پڑتی ہوگی۔ سوچا، پھر اس عصا کا یہاں کیا کام؟

شیخ زاہد آپ ہی کہہ رہے تھے، بالکل اپنے آپ سے۔ ''لولی! کیا سوچنے لگا؟ عصا بڑے کام کی چیز ہے۔ اتنے کام کی چیز کہ تجھے اس کی افادیت کا بہت جلد اندازہ ہوجائے گا۔''

آپ نے پوچھا۔ ''یہاں لولی کس کا نام ہے؟ اور پھر اس حجرے میں میرے علاوہ کوئی اور ہے بھی نہیں۔''

شیخ نے جواب دیا۔ ''میں نے تیرا نام لولی رکھا ہے، تو ہے لولی۔''

ابوعبداللہ کو ان کی یہ بات بہت بری لگی، بولے۔ ''حضرت! لولی تو معنی کے اعتبار سے بہت برا نام ہے۔''

شیخ نے جواب دیا۔ ''ہوگا برا نام۔ میں تو تجھ کو لولی ہی کہوں گا۔ جی میں آئے تو رہ میرے پاس، نہ جی چاہے تو یہاں سے چلا جا، کہیں اور چلا جا۔''

ابوعبداللہ کو معلوم تھا کہ لولی کا مطلب کیا ہے۔ بے شرم، بے حیا، ناچنے والی..... لولی کے یہی معانی تھے۔ انہوں نے کہا۔ ''اگر آپ مجھ کو ایسا سمجھتے ہیں تو خیر، میں اسے بھی برداشت کرلوں گا مگر یہاں سے کہیں اور نہیں جاؤں گا۔''

شیخ نے کہا۔ ''اگر یہ بات ہے تو رہ جا میرے پاس۔''

یہ شیخ کے پاس رہ گئے۔ شام تک تو کچھ بھی نہ ہوا۔ کوئی خاص بات نہیں ظاہر ہوئی لیکن رات کو شیخ نے کونے سے اپنا لوہے والا عصا اٹھایا اور اپنے مصلے پر اس طرح کھڑے ہوگئے کہ لاٹھی کا ایک سرا زمین پر ٹکا تھا، دوسرا ٹھوڑی کے زنخدان پر۔ ابوعبداللہ اپنے شیخ کے پیچھے کھڑے ہوگئے۔

کافی دیر بعد شیخ نے ان کو آواز دی۔ ''لولی! کہاں چلے گئے؟''

انہوں نے جواب دیا۔ ''میں آپ کے پیچھے موجود ہوں۔''

شیخ نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا، پوچھا۔ ''یہاں کیا کر رہے ہو؟''

www.pklibrary.com

انہوں نے جواب دیا۔ ''وہی جو آپ کر رہے ہیں۔''

شیخ نے کہا۔ ''میں تو کچھ بھی نہیں کر رہا۔''

آپ نے کہا۔ ''اگر آپ کچھ نہیں کر رہے تو میں بھی کچھ نہیں کر رہا۔''

شیخ نے پیچھے مڑ کر ان کی طرف دیکھا۔ شیخ کچھ شرمندہ نظر آ رہے تھے، پوچھا۔ ''ابوعبداللہ! تو اس حال میں کب تک کھڑا رہے گا؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''میں تو آپ کی اتباع کر رہا ہوں۔ میں تو آپ سے بیعت ہوا ہوں۔ جو آپ کریں گے وہی میں کروں گا۔''

شیخ کچھ اور شرمندہ ہو گئے۔ آہستہ سے کہا۔ ''رات آرام کے لیے بنی ہے، تو سو جا بستر پر۔ میرا کیا ہے۔ میں تو ساری رات اسی طرح کھڑا رہوں گا۔''

آپ نے کہا۔ ''میں نے کہہ جو دیا کہ میں آپ کا متبع ہوں۔ آپ کے ساتھ رات بھر کھڑا رہوں گا۔''

شیخ نے کہا۔ ''تیری مرضی لیکن میں تو سونے سے رہا۔ تو بھی رات بھر جاگنا چاہتا ہے تو جاگتا رہ۔'' شیخ منہ پھیر کر اسی طرح کھڑے ہو گئے۔

کافی دیر بعد پھر مڑ کے دیکھا اور پوچھا۔ ''لولی! تُو نے میری بات نہیں مانی۔''

انہوں نے جواب دیا۔ ''حضرت! میں نے کہہ جو دیا کہ میں آپ کی اتباع میں کھڑا ہوں۔''

شیخ نے کہا۔ ''میں تجھ کو حکم دیتا ہوں کہ جا، سو رہ۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''میرے نزدیک یہ گستاخی ہے کہ میں تو آرام کروں اور آپ اس طرح جاگتے رہیں۔''

شیخ نے کہا۔ ''تو کیسا مرید ہے کہ اپنے شیخ کا حکم نہیں مان رہا۔''

انہوں نے جواب دیا۔ ''میں آپ کا حکم کیوں نہیں مان رہا۔ میں آپ کی اتباع کر رہا ہوں۔ یہی میری اطاعت، میری فرماں برداری ہے۔''

شیخ شرمندہ ہو گئے، بولے۔ ''بہت سن لیں تیری باتیں۔ اب آرام کر، مجھے تیرے کھڑے رہنے سے تکلیف ہو رہی ہے۔''

آپ جہاں کھڑے تھے، وہیں پر بیٹھ گئے، کہا۔ ''بس اتنی سی تابعداری کر سکتا ہوں۔''

شیخ پھر اسی طرح کھڑے ہو گئے۔ منہ دوسری طرف کر لیا۔

ابوعبداللہ کچھ دیر تو بیٹھے رہے اس کے بعد پھر کھڑے ہو گئے۔ انہیں اپنے پیر مرشد کا احترام بھی ملحوظِ خاطر تھا۔ یہ کیا کہ پیر مرشد تو کھڑے رہیں اور ابوعبداللہ آرام کریں۔

کچھ دیر بعد شیخ نے گھوم کر جو دیکھا تو انہیں پھر کھڑے دیکھ کر سرزنش کی۔ ''لولی! تُو نہیں مانے گا؟''

انہوں نے جواب دیا۔ ''حضرت! میرے لیے یہ بات ناقابلِ برداشت ہے کہ آپ تو رات بھر کھڑے رہیں اور میں آرام کروں۔''

شیخ ان کی بات سے خاصے متاثر ہوئے اور خاموشی اختیار کر لی۔

کچھ عرصے بعد شیخ ابوعبداللہ نے اپنے اندر کچھ عجیب سی کیفیت محسوس کی اور آپ کو اندازہ ہو گیا کہ ہر شب پیر مرشد کے ساتھ کھڑا ہو جانا ان کے کام آ رہا ہے اور شیخ کی کیفیت خود ان میں سرایت کرتی جا رہی ہے۔ اس نئی کیفیت نے ان میں تنہائی پسندی کی خو مستحکم کر دی۔ وہ آنے جانے والوں سے پرہیز کرنے لگے۔

ایک روز ابوعبداللہ کہیں گئے ہوئے تھے، جب واپس آئے تو ایک مرید نے ان سے پوچھا۔ ''ابوعبداللہ! تم کہاں چلے گئے تھے؟''

انہوں نے جواب دیا۔ ''کہیں دور نہیں گیا تھا۔ یہیں قریب ہی موجود تھا۔ کیوں، کوئی خاص بات؟''

مرید نے کہا۔ ''تمہیں پیر مرشد یاد کر رہے تھے۔''

انہوں نے پوچھا۔ ''کیا کہہ رہے تھے؟''

مرید نے جواب دیا۔ ''وہ کہہ رہے تھے کہ لولی آیا اور مجھ سے کچھ لے کر چلا گیا۔'' پھر پوچھا۔ ''پیر مرشد، لولی تمہی کو

www.pklibrary.com

کہتے ہیں نا؟''

انہوں نے کہاں۔ ''ہاں، کہتے تو مجھ ہی کو ہیں لولی۔''

مرید نے جواب دیا اور مشورتاً کہا۔ ''اب آ گئے ہو تو پیر مرشد کے پاس چلے جاؤ اور ان سے کہو کہ میں آ گیا ہوں۔ آپ کیا ارشاد فرما رہے تھے؟''

ابو عبداللہ نے کہا۔ ''میں شیخ کی خدمت میں چلا تو جاؤں گا لیکن میں ان سے کچھ پوچھ نہیں سکتا۔''

مرید نے انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا۔ ''جیسی تمہاری مرضی۔''

ابو عبداللہ اس سے بات کر کے اٹھے اور سیدھے پیر مرشد کی خدمت میں پہنچے۔ شیخ اس وقت کسی اور ہی عالم میں تھے۔ انہوں نے ابو عبداللہ کو دیکھا مگر کوئی توجہ نہیں دی اور کہنے لگے۔ ''لولی آیا اور مجھ سے کچھ لے کر چلا گیا۔''

ابو عبداللہ نے پوچھا۔ ''پیر مرشد! وہ کہاں چلا گیا؟''

شیخ نے جواب دیا۔ ''میں کیا جانوں وہ کہاں چلا گیا؟ بس چلا گیا وہ۔''

ابو عبداللہ ان کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ کچھ دیر بعد شیخ کو ہوش آ گیا۔ ان سے کہنے لگے۔ ''لولی! تو کہاں تھا اور میرے لیے کیا لایا ہے؟''

ابو عبداللہ کا دل بھر آیا۔ کہنے لگے۔ ''پیر مرشد! میں آپ کے لیے کیا لاؤں گا۔ آپ مجھے شرمندہ نہ کریں۔''

شیخ نے جواب دیا۔ ''میں تجھ کو شرمندہ نہیں کر رہا۔ میں تو تجھ سے کچھ پوچھ رہا ہوں۔ ایک سوال کر رہا ہوں۔''

ابو عبداللہ نے عرض کیا۔ ''آپ مجھ سے سوال کر رہے ہیں اور میں آپ کو آپ کے سوال کا جواب دے رہا ہوں۔''

شیخ خاموش ہو گئے۔ کچھ دیر نہیں بولے لیکن پھر کہنے لگے۔ ''لولی! میں تجھ کو غیر نہیں سمجھتا، اپنا ہی سمجھ کر کچھ پوچھ لیتا ہوں لیکن اگر تجھ کو میری یہ بات پسند نہیں تو میں آئندہ خاموش رہا کروں گا۔''

ابو عبداللہ نے جواب دیا۔ ''محترم شیخ! میں آپ سے کچھ لینے آیا ہوں اور آپ مجھ سے سوال کرتے ہیں کہ میں آپ کے لیے کیا لایا ہوں۔ میرے لیے یہ بڑی اذیت کا مقام ہے۔''

شیخ نے کہا۔ ''اگر تجھ کو میرے کسی سوال سے تکلیف پہنچی ہے تو میں معذرت خواہ ہوں اور وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔''

ابو عبداللہ نے عرض کیا۔ ''اب میں یہ بھی جاننا چاہتا ہوں کہ مجھے آپ کی خدمت میں کتنے دن اور رہنا ہے؟''

شیخ نے جواب دیا۔ ''میں تجھ کو غیر نہیں سمجھتا اس لیے تو خاموش رہ اور خود کو غیر نہ سمجھ۔ میں تجھ کو اپنا ہی سمجھتا ہوں۔''

ابو عبداللہ میں بڑی جسارت، بے حد جرأت آ گئی تھی۔ کہنے لگے۔ ''اگر آپ اجازت دیں تو اس لفظ غیر کے سلسلے میں کچھ عرض کروں۔''

شیخ نے جواب دیا۔ ''اجازت ہے لیکن ذرا ہوش رہے۔ مدہوشی نہ تو مجھے پسند ہے نہ اللہ کو۔''

ابو عبداللہ نے عرض کیا۔ ''حضرت! میں تو خدا کا بھی غیر نہیں۔ آپ انسان کی بات کرتے ہیں۔''

شیخ نے تلخی سے کہا۔ ''لولی! یہ تو کیسی باتیں کرنے لگا ہے۔ اس طرح تو حسین ابن منصور بولا کرتے تھے۔ انہوں نے انا الحق کہا اور دار پر چڑھ گئے۔ تو کیا چاہتا ہے؟''

ابو عبداللہ پر جذب کی کیفیت طاری ہو گئی۔ کہنے لگے۔ ''پیر مرشد! یہ کس کی بات کر رہے ہیں؟ منصور کی؟ اگر میں آہ کر دوں تو اس سے ایک لاکھ منصور پیدا ہو جائیں۔''

شیخ نے اپنا عصا اٹھایا اور ان پر حملہ کر دیا۔ ابو عبداللہ ایک طرف ہٹے۔ ان کا وار خالی جانے دیا۔

شیخ نے انہیں برا بھلا کہنا شروع کر دیا اور کہا۔ ''بڑا آیا منصور کا مقابلہ کرنے۔ منصور کو سولی پر چڑھا دیا گیا لیکن وہ نہیں بھاگا اور تو ہے کہ میرے عصا سے بھاگ رہا ہے۔''

ابو عبداللہ نے جواب دیا۔ ''پیر مرشد! گستاخی معاف۔ منصور کی کوتاہی کہیے یا سستی کہ بھاگ نہ سکا۔ اگر اس کو موقع ملتا تو وہ بھی بھاگ کھڑا ہوتا۔ اللہ کے نزدیک وہ اتنا بڑا نہیں تھا جتنا لوگوں نے اس کو سمجھ رکھا ہے۔''

شیخ نے کہا۔ ''لولی! کہیں تو گھاس تو نہیں کھا گیا؟ یہ تو کیسی باتیں کر رہا ہے؟''

ابو عبداللہ نے جواب دیا۔ ''ہاں، میں گھاس کھا گیا ہوں لیکن یہ گھاس حقیقت کے سبزہ زار کی تھی۔''

www.pklibrary.com

شیخ نے کہا۔ ''بہت خوب۔ بڑی اچھی جگہ سے گھاس کھائی ہے تُو نے۔ واہ، سبحان اللہ۔ آ، وہاں کیوں کھڑا ہے۔ میرا سجادہ حاضر ہے، اس پر بیٹھ جا۔''

ابوعبداللہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ شیخ نے کہا۔ ''تُو کیا سوچ رہا ہے۔ آ، میرے سجادے پر بیٹھ جا اور اس کی حفاظت کر۔''

ابوعبداللہ، شیخ کے پاس بیٹھ گئے۔

شیخ نے کہا۔ ''میں نے تو پہلے ہی یہ کہہ دیا تھا کہ لولی آیا اور مجھ سے کچھ لے گیا۔''

ابوعبداللہ نے اپنا سر جھکا دیا اور رونے لگے۔ کہا۔ ''پیر مرشد! یہ سر حاضر ہے۔ اس کے ساتھ جو سلوک چاہیں کریں۔''

شیخ نے کہا۔ ''تیری باتوں نے مجھے خوش کر دیا۔ ہاں، وہ کیا بات تھی؟ منصور کے بارے میں کہ وہ کوتاہی یا سستی سے بھاگ نہ سکا اور اس کو سولی دے دی گئی۔ اس کی تیرے پاس کیا دلیل ہے؟''

ابوعبداللہ نے جواب دیا۔ ''پیر مرشد! اس کی واضح دلیل یہ ہے کہ جو سوار گھڑسواری کا دعویٰ کرے تو وہ اس طرح گھوڑا دوڑائے کہ اس کی باگ ہاتھ ہی میں رہے۔ اس کو کسی حال میں بھی ہاتھ سے نہ جانے دے لیکن اگر گھڑسواری کے دوران باگ ہاتھ سے چھوٹ جائے اور گھڑسوار باگ کے بعد گھوڑے کی ایال بھی نہ پکڑ سکے تو وہ ماہر گھڑسوار کہاں ہوا؟ ایک ماہر شہسوار وہی ہے جو ہر حال میں گھوڑا دوڑاتا رہے۔ ایسا شخص جو بھی دعویٰ کرے، مان لیا جائے گا لیکن اس کے برعکس اگر وہ گر جائے تو وہ شہسوار ہی نہیں اور اس کا کوئی بھی دعویٰ قابلِ قبول نہیں ہوگا۔''

شیخ دم بخود یہ باتیں سنتے رہے۔ آخر میں کہا۔ ''ابوعبداللہ! تو سچا ہے۔ تیری دلیل قابلِ قبول اور لائقِ مسموع ہے۔ میں نے تجھ سے زیادہ دانا اور بینا کسی اور کو نہیں پایا۔ سبحان اللہ۔''

اب آپ کا مقصد پورا ہو چکا تھا۔ اپنے پیر مرشد سے گھر جانے کی اجازت چاہی جو بہ آسانی مل گئی۔ آپ یہاں سے اٹھ کر سیدھے اپنے باپ کے پاس پہنچے۔ ضیاالدین ان کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور لوگوں سے کہا۔ ''یہ شیخ زاہد سے جو کچھ بھی لایا ہے، میں اس میں اضافہ کر دوں گا۔ بس یہ سمجھ لو کہ میں نے اللہ سے جو کچھ بھی طلب کیا تھا، وہ سب کا سب میں نے عبداللہ کو دے دیا۔ مجھ بے مقدار پر تو کھڑکی کھولی گئی تھی لیکن عبداللہ پر پورا دروازہ کھول دیا گیا ہے۔''

ایک دن کسی نے آپ کو بتایا۔ ''آج کل ایک بزرگ باہر سے آئے ہوئے ہیں۔ سننے میں آیا ہے کہ وہ بڑے باکمال ہیں۔''

ابوعبداللہ کو جستجو ہوئی اور پوچھا۔ ''یہ کون بزرگ ہیں اور کہاں سے آئے ہیں؟''

چھان بین اور جستجو کے بعد آپ کو بتایا کہ ان کا نام ہے نجیب الدین بزغش۔ شیخ شہاب الدین سہروردی کے مرید ہیں۔

آپ نے سوچا کہ یہ تو کام کے آدمی ہوں گے۔ چلو، ان سے بھی کچھ حاصل کیا جائے۔

ان کے ایک ارادت مند نے کہا۔ ''آپ کو ان سے کیا ملے گا؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''پتا نہیں کیا ملے گا؟ لیکن ظاہر ہے یہ مجھ سے زیادہ ہی تجربہ کار ہوں گے۔ ان سے کچھ نہ کچھ تو مل ہی جائے گا۔''

لیکن آپ کے ارادت مند اچھی طرح جانتے تھے کہ شیخ نجیب الدین بزغش کتنے ہی بڑے عالم یا درویش کیوں نہ ہوں، وہ ابوعبداللہ کے پائے کے ہرگز نہ ہوں گے۔

آپ کو بتایا گیا کہ شیخ نجیب الدین بزغش شیراز میں قیام فرما ہیں۔ یہ شیراز پہنچے اور ان کی خدمت میں حاضری دی۔

شیخ نجیب الدین بزغش نے انہیں بغور دیکھا اور دریافت کیا۔ ''کہو، کیسے آنا ہوا؟ خیریت تو ہے؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''علم کی طلب اور پیاس مجھ کو اِدھر اُدھر لیے پھرتی ہے۔ وہی پیاس آپ کے پاس لے آئی ہے۔''

شیخ نجیب نے پوچھا۔ ''تم کیا جاننا چاہتے ہو؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''کئی باتیں۔ میں نے یہ سنا ہے کہ سہروردیہ سلسلے میں مال و دولت کا ذخیرہ ناجائز نہیں ہے۔ یہ

www.pklibrary.com
شیخ ابو عبداللہ بلیانی

احمق ہمسفر

ایک بار حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ہمراہ ایک شخص سفر کر رہا تھا۔ اسے خیال آیا یہ سنہری موقع ہے کیوں نہ عیسیٰ علیہ السلام سے کوئی ایسا عمل سیکھ لیا جائے جس سے پتھر سونا بن جائیں اور مردے زندہ ہو جائیں۔ اس نے پیغمبر خدا سے عرض کیا:

"یا حضرت! مجھے آج کوئی ایسا عمل بتا دیں جس سے میرا بھی کوئی فائدہ ہو جائے مثلاً میں پھونک مار کر مردوں کو زندہ کر دوں۔" حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بے حد افسوس ہوا کہ یہ شخص جو خود بیمار اور مردے سے بھی بدتر ہے اسے اپنی فکر نہیں۔ یہ چاہے تو میری رفاقت سے اپنے دل مردہ کا علاج کر سکتا ہے مگر یہ تو کچھ اور ہی طلب کر رہا ہے۔ اس کا حال اس شخص جیسا ہے جو ایک ہی دن میں تخت و تاج حاصل کرنا چاہتا ہو۔

آپ نے فرمایا۔ "چپ رہو۔ یہ تم جیسے لوگوں کے کام نہیں اس کے لیے عمریں گزر جاتی ہیں اور پہلے روح کی آلائشوں کو دھونا پڑتا ہے۔ تو نے عصا تو ہاتھ میں لے لیا مگر یہ موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ میں ہو گا تو اژدھا بنایا جا سکے گا یہ کام ہر شخص کا نہیں۔"

اس شخص نے دوبارہ بڑی منت سماجت کرتے ہوئے کہا۔

"اگر آپ مجھے یہ راز نہیں بتانا چاہتے تو میری یہ درخواست تو قبول فرمائیے کہ مجھے کسی مردے کو زندہ کر کے دکھا دیجیے۔"

سفر کے دوران کچھ دور آگے جا کر ایک گڑھا نظر آیا جس میں کچھ ہڈیاں تھیں اس شخص نے عرض کی۔

"یا حضرت ان ہڈیوں پر پھونکیے۔" حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اس کے بار بار اصرار پر اللہ کا نام پڑھ کر ان ہڈیوں پر پھونکا تو وہ ایک سیاہ شیر بن کر سامنے آ گیا۔ شیر اسی شخص پر جھپٹا اور اسے مار ڈالا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے شیر سے پوچھا کہ اس نے ایسا کیوں کیا تو شیر بولا۔

"یہ آپ کو ننگ کر رہا تھا۔"

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے پوچھا۔ "تم نے اس کا خون کیوں نہیں پیا؟"

شیر نے جواب دیا۔ "اول تو یہ آپ سے بے ادبی اور گستاخی کر رہا تھا۔ دوسرا اب اس دنیا کا رزق میرے نصیب میں نہیں تھا اور اس لیے میں ایسا نہ کر سکتا تھا۔"

سبق: بے وقوف لوگ اپنی غلط حرکتوں کی وجہ سے پریشانی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

اقتباس حکایات رومی اور سعدی، از ڈاکٹر تصدق حسین

لوگ کھانے بھی اچھے اچھے کھاتے ہیں اور کپڑے بھی اچھے پہنتے ہیں۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ آخر کیوں؟ ایسا کیوں ہے؟"

شیخ نجیب نے پوچھا۔ "اور کچھ؟"

آپ نے جواب دیا۔ "میں نے سنا ہے کہ بایزید بسطامیؒ یہ فرمایا کرتے تھے کہ جس نے ان کی شکل دیکھ لی، اس پر آتشِ دوزخ حرام ہو گئی۔ اس میں کتنی صداقت ہے؟"

شیخ نجیب نے کہا۔ "بس یا کچھ اور؟"

آپ نے کہا۔ "اور یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب ﷺ کے ذکر میں یہ فرمایا ہے کہ رفعنا لک ذکرک، اس کا کیا مطلب ہے؟"

شیخ نجیب نے پھر اپنا سوال دہرایا۔ "بس یا اور کچھ؟"

آپ نے جواب دیا۔ "فی الحال ان کے ہی جواب مل جائیں تو غنیمت ہے۔"

شیخ نجیب نے کہا۔ "اچھا کچھ دیر بیٹھ جاؤ۔ میں سوچ سمجھ کر ان سوالوں کے جواب دوں گا۔"

آپ وہیں ایک طرف بیٹھ گئے اور کافی دیر بیٹھے رہے۔ شیخ نجیب نے اس کے بعد تو کوئی بات ہی نہ کی اور ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ مراقبے میں کچھ جاننے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ ان کی واپسی کے منتظر رہے لیکن جب کافی وقت گزرنے کے بعد بھی شیخ نجیب نے ان کے ایک سوال کا بھی جواب نہ دیا تو آپ وہاں سے اٹھ کر چلے آئے اور سوچا کہ کسی دن، دن میں جا کر ان سے جواب لے لوں گا۔

اس بات کو کئی دن گزر گئے لیکن شیخ نجیب نے نہ تو ان کو بلوایا اور نہ یہ خود گئے۔

www.pklibrary.com

ایک دن ایک ارادت مند آپ کے گھر سے تلاش کرتا ہوا آیا اور کہا۔ ''آپ کا گھر چلنا بے حد ضروری ہے۔ اگر یہاں کا کام ختم ہو گیا ہو تو میرے ساتھ چلیے۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''ابھی کام تو نہیں ختم ہوا۔ میں جو باتیں شیخ نجیب سے معلوم کرنا چاہتا تھا، ہنوز ان کا کوئی جواب نہیں ملا۔''

ارادت مند نے عرض کیا۔ ''حضرت! سیکڑوں شائقینِ دید اور طالبانِ ملاقات کے لیے آتے ہیں اور واپس چلے جاتے ہیں، اب آپ کا چلنا ضروری ہو گیا ہے۔''

آپ نے کہا۔ ''بہتر ہے، چلو میں شیخ نجیب سے مل کر اسی وقت روانہ ہو جاؤں گا۔''

یہ اپنے ارادت مند کے ساتھ شیخ نجیب کے گھر پہنچے تو وہاں کے ٹھاٹ ہی کچھ اور نظر آئے۔ وہاں جو لوگ موجود تھے، وہ ارادت مند سے زیادہ دربان معلوم ہوتے تھے۔ آپ کو دیکھتے ہی پوچھا۔ ''آپ کس کے پاس آئے ہیں؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''شیخ نجیب الدین بزغش سے ملنے آیا ہوں۔ وہ کہاں ہیں؟''

جواب دیا گیا۔ ''وہ اندر زنان خانے میں ہیں۔ آپ چاہیں تو ان کا انتظار کر لیں۔''

آپ نے کہا۔ ''میں اسی وقت چلا جانا چاہتا ہوں، اگر ملاقات ہو جاتی تو اچھا ہوتا۔''

کہا گیا۔ ''لیکن ان کو اندر سے بلوایا نہیں جا سکتا۔ آپ کو کچھ دیر انتظار تو کرنا ہی پڑے گا۔''

آپ ایک طرف بیٹھ گئے۔ وہاں پاس ہی شیخ نجیب کا مصلا بچھا ہوا تھا اور اس مصلے پر کچھ کاغذات رکھے تھے۔ آپ ان کاغذات کو الٹ پلٹ کر دیکھتے رہے اور یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ ان کاغذات پر وہی سوالات درج تھے جن کے جوابات کا آپ کو بے حد انتظار تھا۔

آپ نے سوچا، یہ کیسا شیخ ہے جس کو میرے سوالات تک زبانی یاد نہیں رہے اور ان کو کاغذ پر لکھ کر رکھ لینا پڑا اور ان کے جوابات ابھی تک نہیں لکھے گئے تھے۔ یہ سوچ کر آپ تیزی سے اٹھے اور اپنے ارادت مند سے کہا۔ ''افسوس کہ میں نے اتنا وقت برباد کر دیا۔ میں بلاوجہ دھوکا کھا گیا۔''

آپ اسی وقت اپنے گھر چلے گئے اور پھر مراقبے میں ان سوالوں کے جوابات بھی آپ کو مل گئے۔

☆☆☆

شیخ سعدیؒ آپ کے ہم عصر تھے۔ آپ ان سے ملنے کے لیے شیراز تشریف لے گئے۔ شیخ سعدیؒ کی شاعری اور پند و نصائح کا دور دور چرچا تھا اور ان سے ملنے کے لیے ہر قسم کے آدمی شیراز پہنچتے رہتے تھے۔ ابوعبداللہ بھی شیراز اس حال میں پہنچے کہ ان کے ساتھ ارادت مندوں کی بھی اچھی خاصی تعداد تھی۔

شیخ سعدیؒ نے جب یہ سنا کہ ابوعبداللہ ان سے ملنے آ رہے ہیں تو وہ باہر نکل کر کھڑے ہو گئے اور چند قدم بڑھ کے خوش آمدید کہا۔

آپ نے کہا۔ ''شیخ! میں تو اکیلا ہی آنا چاہتا تھا لیکن میرے ارادت مند نہیں مانے اور آپ کے دیدار اور ملاقات کے شوق میں یہاں تک آ گئے۔''

شیخ سعدیؒ نے کہا۔ ''مہمان تو اللہ کی رحمت ہوتے ہیں۔ میں اللہ کی رحمت کا خوش دلی سے استقبال کرتا ہوں۔''

آپ نے کہا۔ ''پھر درویشوں کے کھانے پینے کا بندوبست ہو جائے۔''

شیخ سعدیؒ اندر گئے اور کچھ دیر بعد اس طرح باہر آئے کہ ان کے ہاتھ کی ایک مٹھی بند تھی۔ آتے ہی پوچھا۔ ''ابو عبداللہ! بتاؤ تو سہی، میری مٹھی میں کیا ہے؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''شیخ محترم! اس مٹھی سے کام نہیں چلے گا۔ تم تو اچھے کا برتن اٹھالاؤ۔ اس میں باسٹھ اچھے رکھے ہیں، وہ کب کام آئیں گے؟''

شیخ سعدیؒ نے حیرت سے پوچھا۔ ''اے ابوعبداللہ! آپ کو میری باسٹھ اشرفیوں کا علم کیونکر ہوا؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''بندے کو وہی باتیں معلوم ہوتی ہیں جن سے اللہ اس کو مطلع کر دیتا ہے۔''

شیخ سعدیؒ اچھوں (اشرفیوں) کا برتن اٹھالائے۔ اس کو کھولا گیا تو اس میں سے باسٹھ اشرفیاں نکل آئیں۔

ابوعبداللہ نے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''ان اشرفیوں سے درویشوں کی دعوت کا انتظام کرو۔''

www.pklibrary.com

شیخ سعدیؒ نے ان اشرفیوں سے شاندار کھانے کا اہتمام کیا۔ درویشوں نے کھانے بھی کھائے اور شیخ سعدیؒ سے ان کا کلام بھی سنا۔

آپ کا ایک مرید باورچی تھا اور وہ بڑے اچھے کھانے پکاتا تھا۔ آپ کو اس کے کھانوں میں آش بے حد پسند تھی۔ آش ایک پتلی غذا تھی۔ آپ جب بھی اپنے باورچی کی دکان کے سامنے سے گزرتے، وہ باورچی آپ کا راستہ روک کر کھڑا ہو جاتا اور آش کا ایک پیالہ آپ کی خدمت میں پیش کرتا۔ آپ اس کو پی لیتے اور کچھ دیر اس سے باتیں کر کے چلے جاتے۔

اس وقت باورچی کی دکان پر بہت زیادہ بھیڑ بھاڑ تھی۔ آپ نے سوچا اس ہجوم سے میں بچ کر نکل سکتا ہوں، باورچی دیکھ بھی نہیں پائے گا۔

یہ سوچ کر آپ دکان کے پاس سے گزر گئے لیکن دوسرے ہی لمحے باورچی دوڑتا ہوا آیا اور آپ کی خوشامد کرنے لگا۔ ''پیر مرشد! آپ مجھ پر یہ ظلم تو نہ کریں۔ یہ میری خوش بختی ہے کہ میں آپ کی زیارت کر لیتا ہوں۔ آپ میری راہ نمائی فرماتے ہیں اس لیے میں آپ کے لیے ہر روز آش تیار کر رکھتا ہوں۔ آپ اگر بچ کر چلے جائیں گے تو آپ کے حصے کی آش یوں ہی رکھی رہے گی۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''لیکن تو آئندہ میرے لیے آش تیار نہیں کرے گا۔''

آپ نے آش کا پیالہ ہاتھ میں لیا ہی تھا کہ سامنے سے ایک درویش آ گیا۔ درویش کے جسم پر نہایت قیمتی سفید لباس تھا۔ اس نے آپ کو سلام کیا۔ آپ نے سلام کا جواب دیا اور پوچھا۔ ''آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟''

درویش نے جواب دیا۔ ''میں کیا بتاؤں کہ کہاں سے آیا ہوں۔ آپ تو مجھ سے یہ پوچھیں کہ میں آپ کے پاس کیوں آیا ہوں؟''

آپ کو درویش کی باتیں اچھی نہیں لگیں، پوچھا۔ ''اچھا یہی سہی۔ کیوں آئے ہیں میرے پاس؟''

درویش نے کہا۔ ''میں آپ سے راہنمائی کا طالب ہوں۔ مجھے خدا کا راستہ دکھایئے۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''تو خدا تک پہنچنے کا راستہ کیوں معلوم کرنا چاہتا ہے؟''

درویش نے کہا۔ ''اس سے مجھے فائدہ پہنچے گا۔'' لیکن درویش نے محسوس کیا کہ ابو عبداللہ کا لہجہ بدل گیا ہے۔

آپ نے درویش کے قیمتی لباس کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ''لیکن تو اس راستے پر چل نہیں سکے گا۔''

درویش نے کہا۔ ''آپ نے کس طرح اندازہ لگا لیا کہ میں آپ کے تجویز کردہ راستے پر نہیں چل سکوں گا۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''تیرے قیمتی لباس سے۔''

درویش ہنسنے لگا۔ ''شاید آپ کا یہ اندازہ کم از کم میرے بارے میں درست نہیں ہے۔''

آپ نے فرمایا۔ ''اچھا پھر یہ آش کا پیالہ لے اپنے ہاتھ میں۔''

آپ نے وہ پیالہ درویش کے ہاتھ میں دیا اور پوچھا۔ ''کیا تو آزمائش کے لیے تیار ہے؟''

درویش نے جواب دیا۔ ''بالکل۔ آپ امتحان لے لیں۔''

آپ نے کہا۔ ''یہ آش تو اپنی انگلیوں کی مدد سے کھا لے۔''

درویش نے آپ کے اس حکم کی تعمیل بھی کر دی۔ اس کی انگلیاں آلودہ ہو چکی تھیں۔

آپ نے درویش کو حکم دیا۔ ''اب اپنی آلودہ انگلیاں اپنے لباس سے پونچھ ڈال۔''

درویش کو تامل ہوا، کہنے لگا۔ ''یہ کیوں؟ اس طرح تو میرا قیمتی لباس خراب ہو جائے گا۔''

آپ نے فرمایا۔ ''میں نے جو کام تجھ کو بتایا ہے، تو اسے تواتر سے ایک سال تک انجام دیتا رہے گا۔ اس کے بعد پھر مجھ سے ملے گا اور میں تجھ کو خدا تک پہنچنے کا راستہ بتاؤں گا۔''

درویش نے دو ٹوک جواب دیا۔ ''شیخ! میں یہ کام نہیں کر سکتا، مجھے کچھ اور بتائیں۔''

آپ نے فرمایا۔ ''یہ کتنا ادنیٰ، معمولی نوعیت کا کام ہے اور تو اسے بھی انجام نہیں دے سکتا پھر میں کوئی اور دشوار طریقہ کیوں بتاؤں اور تو اس پر کیا چلے گا۔''

درویش کہنے لگا۔ ''واہ جناب! یہ کیا بات ہوئی۔ آپ میرے قیمتی لباس کے پیچھے کیوں پڑ گئے ہیں؟''

www.pklibrary.com

آپ نے جواب دیا۔ ''میں تیرے قیمتی لباس کے پیچھے نہیں پڑ رہا ہوں۔ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ میں تیرے اس غرور اور انا کو ختم کر دوں جو اس قیمتی لباس کے پیچھے کارفرما ہے۔''

درویش نے صاف انکار کر دیا۔ ''تب پھر میں بھی آپ کی راہنمائی سے راہِ فرار اختیار کرتا ہوں۔''

درویش جدھر سے آیا تھا، اسی طرف چلا گیا اور آپ سوچنے لگے کہ ایسا کیوں ہوا؟ یہ درویش کون تھا اور آپ کے پاس کیوں آیا تھا؟

آپ اپنے مریدوں کے سامنے وعظ فرما رہے تھے۔ آپ نے ان سے کہا۔ ''کیا تم جانتے ہو کہ یہاں یعنی دنیا میں غیرِ خدا کچھ بھی نہیں۔ اس لیے اپنے کردار کے عمل سے ایسی تشکیل اور تعمیر کرو کہ.....''

کسی مرید نے پوچھا۔ ''غیرِ خدا سے آپ کی کیا مراد ہے؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''ہمہ اوست۔ یہاں ہمیں جو کچھ نظر آ رہا ہے اس کے پیچھے خدا کی ذات کارفرما ہے۔''

بات ختم ہو گئی۔ وہ مرید جو سوال جواب میں شامل تھا، آپ کے پاس سے کہیں اور چلا گیا۔ آپ نے اس کے بارے میں پوچھا بھی کہ وہ کہاں چلا گیا؟

جواب دیا گیا۔ ''وہ تزکیۂ نفس کی خاطر ایک غار میں رہ رہا ہے اور یہ غار پہاڑی کے دامن میں ہے۔''

آپ نے اپنے مرید کو دعا دی۔ ''تو جہاں بھی رہے، میری دعا ہے کہ اللہ تجھ کو خوش رکھے۔''

کچھ عرصے بعد ایک شخص بھاگا ہوا آپ کے پاس پہنچا اور عرض کیا۔ ''حضرت! آپ کے مرید کو سانپ نے ڈس لیا ہے۔''

آپ نے فرمایا۔ ''سانپ نے ڈس لیا! لیکن میں یہ پوچھتا ہوں کہ اس نے سانپ کو پکڑا ہی کیوں؟''

آنے والے نے جواب دیا۔ ''لیکن وہ کیوں سانپ کو پکڑتا۔ آپ فرماتے ہیں تو میں آپ کو جھٹلاؤں گا بھی نہیں لیکن اپنی طرف سے میں یہی کہوں گا کہ اس نے سانپ کو نہیں پکڑا ہوگا۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''میں جانتا ہوں کہ اس نے سانپ کو پکڑا تھا۔ اسی وجہ سے اس کو ڈسا گیا۔''

آنے والا کہنے لگا۔ ''چلیے، جو کچھ آپ فرما رہے ہیں، میں اس سے انکار نہیں کرتا لیکن یہ نازک وقت باتوں میں نہ گنوائیے۔ میرے ساتھ چلیے۔''

آپ اس کے ساتھ پہاڑی کے غار کی طرف تشریف لے گئے۔ غار کے اندر آپ کا مرید بے سدھ پڑا ہوا تھا۔

آپ اس کے پاس بیٹھ گئے اور آہستہ سے پوچھا۔ ''یہ تو نے کیا غضب کر دیا۔ تو نے سانپ کو پکڑا ہی کیوں؟''

مرید نے جواب دیا۔ ''آپ نے ایک بار فرمایا تھا کہ دنیا میں غیرِ خدا کچھ بھی نہیں۔ آج بھی میرے کانوں میں آپ کی وہ آواز گونج رہی ہے۔''

آپ نے فرمایا۔ ''بہرحال، یہ بھی تو دیکھنا ضروری ہے کہ کہیں خدا قہر آلود نظروں سے تو تجھے نہیں دیکھ رہا۔ جب وہ قہر میں ہو تو اس سے دور بھاگو۔''

مرید نے عرض کیا۔ ''اس وقت میں کیا کروں؟''

آپ نے اس کے سر کے نیچے ہاتھ رکھا اور آہستہ سے اٹھا کر بٹھا دیا اور کہا۔ ''میں تیرے لیے دعا کرتا ہوں لیکن ایک بار پھر غور سے سن لے کہ جب بھی کوئی ایسا وقت آئے تو، تو اس میں اللہ کے قہر یا مہر کو سمجھنے کی کوشش کرے گا۔ قہر سے بچے گا اور مہر سے آگے بڑھے گا۔''

مرید نے وعدہ کر لیا۔ ''آئندہ میں اس کا خیال رکھوں گا۔''

آپ نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ ''اے اللہ! میں نے اس نادان کو یہ بتایا تھا کہ تو ہر شے میں موجود ہے۔ اس نے سادگی اور بھولے پن سے یہی سمجھا کہ تو ہر شے میں موجود ہے اور تو سراپا مہر ہے۔ اس نے تیرے غضب اور قہر کے بارے میں تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا چنانچہ جب اس نے سانپ کو دیکھا تو اس وقت بھی تو اس کے ذہن میں سراسر مہر ہی مہر تھا لیکن سانپ نے اسے ڈس لیا۔ اب میری تجھ سے یہ دعا ہے کہ اس کو اپنی رحمت، اپنے مہر سے مایوس نہ کر اور اسے اچھا کر دے۔''

آپ رو رو کر دعا مانگ رہے تھے اور دوسری طرف مرید کو افاقہ محسوس ہوتا جا رہا تھا۔

www.pklibrary.com

کچھ دیر بعد ہوا چلنے لگی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی پُرلطف ہوا۔ آپ نے اپنے مرید سے پوچھا۔ ''اب تیرا کیا حال ہے؟''
مرید نے جواب دیا۔ ''خاصا افاقہ ہے۔''
آپ نے زخمی حصے پر ہاتھ پھیرنا شروع کر دیا اور پوچھتے رہے۔ ''اب کیا حال ہے؟''
مرید نے کہا۔ ''اب پہلے سے زیادہ افاقہ ہے۔''
آپ نے کچھ دیر بعد زخمی حصے پر ہاتھ رکھ دیا اور پوچھا۔ ''اور اب؟ اب کیا حال ہے؟''
اب مرید بالکل صحیح تھا۔ جواب دیا۔ ''اب تو میں بالکل ٹھیک ہوں۔''
آپ نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا۔ ''اب شکرانے کے طور پر دو رکعت نماز ادا کر اور خدا سے توبہ و استغفار کر۔''

مرید نے آپ کے حکم کی تعمیل کی اور شکرانے کی نماز پڑھ کر دیر تک توبہ استغفار کرتا رہا۔
جب آپ اپنے مرید کے پاس سے واپس آ رہے تھے تو راستے میں ایک نادار شخص مل گیا۔ اس نے آپ کا راستہ روک لیا اور کہا۔ ''حضرت! میں تو آپ کو دیر سے تلاش کر رہا ہوں۔''
آپ نے پوچھا۔ ''خیریت تو ہے؟''
جواب ملا۔ ''اگر خیر ہے تو سب کچھ ہے ورنہ اس دنیا میں جیتے جی کس کو آرام ملا ہے۔ سبھی پریشان ہیں۔''
آپ اس شخص کے ساتھ اس کے گھر گئے اور پوچھا۔ ''ہاں تو اب بتا، کیا بات ہے؟''
اس شخص نے جواب دیا۔ ''یہاں میرے بوڑھے والدین رہتے ہیں۔ میں ان کی خدمت کرتا ہوں لیکن آج رات میں ان کی خدمت میں نہیں رہ سکوں گا۔ میری بیوی اور بچے دوسرے شہر میں ہیں۔ ان کو یہاں لانا ہے۔ اگر میں اپنے والدین کے پاس رہتا ہوں تو میرے بیوی بچے دوسرے شہر میں پریشان رہیں گے اور اگر میں ان کے پاس جاتا ہوں تو یہاں میرے والدین تنہا رہ جاتے ہیں۔ اب آپ ہی بتائیں، میں کیا کروں؟''
آپ نے پوچھا۔ ''تیرا کوئی عزیز رشتے دار بھی ہے یہاں؟''
اس نے جواب دیا۔ ''نہیں، کیونکہ میں اصفہان کا رہنے والا ہوں۔ یہاں میرا کوئی نہیں۔''
آپ نے فرمایا۔ ''اچھا تو پھر اپنے بیوی بچوں کے پاس چلا جا اور انہیں لے آ۔ اس وقت تک میں تیرے والدین کے پاس رہوں گا اور ان کا خیال رکھوں گا۔''
آپ نے دو دن یہاں گزارے۔ رات کو آپ نمازیں پڑھا کرتے تھے مگر ان دو دنوں میں ایسا ممکن نہ رہا اور راتیں بوڑھے والدین کی دیکھ بھال اور خدمت گزاری میں بسر ہوئیں۔ جب وہ شخص اپنے بیوی بچوں کو لے کر واپس آ گیا تو آپ اپنے گھر گئے۔

آپ کے مرید اور ارادت مند آپ سے ان دو دنوں کے بارے میں پوچھنے لگے۔ آپ نے اصل واقعہ بتا دیا۔
ایک ارادت مند نے کہا۔ ''حضرت! یہ تو بہت برا ہوا۔ اس طرح تو آپ دو راتیں نماز بھی نہیں پڑھ سکے۔''
آپ نے جواب دیا۔ ''تو اس سے کیا ہوتا ہے۔ سب کچھ نماز روزہ ہی تو نہیں۔''
ارادت مند حیرت سے آپ کی صورت دیکھنے لگا۔ ''حضرت! یہ آپ کیا فرما رہے ہیں؟''
آپ نے فرمایا۔ ''میں صحیح کہہ رہا ہوں۔ سب کچھ روزہ نماز ہی تو نہیں۔''
ارادت مند نے عرض کیا۔ ''ایک صوفی کے لیے روزہ اور نماز ہی سب کچھ ہیں۔''
آپ نے جواب دیا۔ ''نہیں، ایسا نہیں ہے۔ درویشی صرف شب بیداری اور روزہ نماز ہی تو نہیں، یہ سب تو بندگی کے اسباب ہیں۔ اصل درویشی یہ ہے کہ کسی کو اذیت نہ پہنچائی جائے۔ کسی کے کام آیا جائے۔ اگر ایسا ہو جائے تو انسان واصل بن جائے گا۔''

ایک دن آپ کو جذب کے عالم میں دیکھا گیا۔ آپ اس عالم میں جیسی باتیں کر رہے تھے، وہ بہتوں کے لیے پریشان کن تھیں۔ آپ اپنے مریدوں سے کہہ رہے تھے۔ ''دوستو! خدا کو جانو، خدا کو پہچانو، خدا کو پہچانو۔''
کسی نے عرض کیا۔ ''خدا کو کس طرح جانا جائے، اس کو کس طرح پہچانا جائے؟''
آپ نے جواب دیا۔ ''اگر یہ کام دشوار ہے تو خود کو ہی جان لو، خود ہی کو پہچان لو، اگر خود کو جان لو گے تو خدا کو بھی

www.pklibrary.com

جان لو گے۔ اس کو بھی پہچان لو گے۔''

مریدوں پر سناٹا طاری ہو گیا۔

کچھ دیر بعد آپ نے کہا۔ ''ابھی ابھی میں نے جو کچھ کہا تھا، اب اس سے بہتر قول میری سمجھ میں آ گیا ہے۔''

ایک مرید نے پوچھا۔ ''وہ قول کیا ہے، ذرا ہم بھی تو سنیں۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''میرا مشورہ ہے کہ تم خدا بن جاؤ۔''

سبھی چونک گئے اور انہیں ایسا محسوس ہوا گویا ان میں منصور نے 'انا الحق' کا نعرہ بلند کر دیا ہے۔

ایک نے عرض کیا۔ ''ہم خدا کس طرح بن سکتے ہیں؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''اگر خدا نہیں بن سکتے تو پھر میرا کہنا مانو۔''

ایک نے عرض کیا۔ ''میں خدا بننا چاہوں بھی تو نہیں بن سکتا۔''

آپ نے کہا۔ ''تب پھر تم اپنی بھی نفی کر دو۔ تم خود ہو ہی نہیں کیونکہ جب تم خود نہیں رہو گے تو بس خدا رہ جائے گا۔''

اس آخری فقرے نے مریدوں پر خاصا اثر کیا اور وہ بے چین ہو گئے۔

☆☆☆

شیخ روزبہان بقلی ان کے علاقے کے مشہور صوفی تھے۔ ان کی عظمت اور بزرگی کا سبھی اعتراف کرتے تھے۔ ان کا انتقال ہو چکا تھا۔ آپ نے ان کے مزار پر حاضری کا منصوبہ بنایا۔ جب مزار پر پہنچے تو دیکھا وہاں شیخ مرحوم کے صاحبزادے شیخ صدرالدین آزردہ بیٹھے ہوئے تھے۔ شیخ صدرالدین ان سے اچھی طرح واقف تھے۔ ابوعبداللہ، مرحوم شیخ کی قبر کے پاس کھڑے تھے اور شیخ صدرالدین احتراماً ان کے پیچھے کھڑے تھے۔ ابوعبداللہ نے ان پر کوئی توجہ نہیں کی۔ یہ رات کا وقت تھا۔ اسی عالم میں ایک پہر گزر گیا۔ شیخ صدرالدین عاجز آ کر بیٹھ گئے لیکن کچھ دیر بعد خیال آیا کہ یہ تو صریحاً بے ادبی ہے۔ دوبارہ کھڑے ہو گئے اور دیر تک کھڑے رہے پھر تھک گئے اور دوبارہ بیٹھ گئے لیکن ایک بار پھر یہ احساس ستانے لگا کہ یہ تو سراسر گستاخی ہے، بے ادبی ہے۔ یہ پھر کھڑے ہو گئے۔

کافی دیر بعد ابوعبداللہ نے مڑ کر شیخ صدرالدین کی طرف دیکھا اور سلام دعا کے بعد ان سے ان کی خیریت معلوم کی۔

شیخ صدرالدین نے شکایتاً کہا۔ ''شیخ ابوعبداللہ! آپ میرے لیے لائق صد احترام ہیں مگر مجھے آپ سے یہ شکایت ہے کہ میں کافی دیر سے آپ کے عقب میں موجود ہوں لیکن آپ نے مجھے نظر انداز کر دیا۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''یہ تیرا خیال ہے۔ میں نے تجھ کو کیوں نظر انداز کر دیا۔ میں کیوں نظر انداز کروں گا۔''

شیخ صدرالدین نے پوچھا۔ ''پھر آپ نے مجھ پر توجہ کیوں نہیں دی؟''

آپ نے فرمایا۔ ''میں یہاں تھا کب؟ مجھے تو تیرے والد روزبہان بقلی نے اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔ انہوں نے مجھے ایک انار دیا تھا اور تاکید کی تھی کہ اسے میں ان کی موجودگی میں ان کے سامنے ہی کھالوں، چنانچہ میں انار کھانے میں مشغول ہو گیا۔''

شیخ صدرالدین کی آنکھیں بھیگ گئیں، بولے۔ ''میں یہاں ہر روز ہی آ جاتا ہوں لیکن والد مرحوم نے مجھ پر کوئی توجہ نہیں دی۔ آپ خوش قسمت ہیں کہ ان کے کرم سے فیض یاب ہیں۔''

ابوعبداللہ شاعری بھی کرتے تھے۔ آپ نے اپنے عہد کو اتنا متاثر کیا کہ ہر صوفی اور غیر صوفی، ادنیٰ اور اعلیٰ، چھوٹا اور بڑا آپ کے اثر سے محفوظ نہیں رہا۔ چنانچہ جب بروز عاشورہ 686ھ (1283ء) آپ نے وصال فرمایا تو ایک زمانے نے آپ کا سوگ منایا۔ ہر آنکھ آبدیدہ ہو گئی۔ آپ کی موت کو عالم کی موت قرار دیا گیا کیونکہ آپ صوفی بھی تھے اور عالم بھی۔ جس کے لیے کہا گیا ہے کہ موت العالم، موت العالم۔

ماخذات

نفحات الانس، مولانا عبدالرحمٰن جامی۔ تذکرۃ الاولیاء، شیخ فرید الدین عطار۔
اخبار الصالحین، نواب معشوق جنگ بہادر۔ سکینۃ الاولیاء، داراشکوہ

www.pklibrary.com

بھوک اور بے بسی بعض اوقات بے حسی کو جنم دیتی ہے جو کبھی کبھی ایسے کارنامے انجام دے جاتی ہے کہ جن کا تصور عام حالات میں ممکن نہیں ہوتا۔ وہ جو انتہائی مجبور اور ناامید ہو بیٹھا تھا کہ اچانک پیروں تلے ایسا سفر آیا جو حیرت کے در وا کر گیا۔ یہ اور بات کہ یہ فیصلہ صحیح تھا یا غلط مگر اسے کسی رستے کا انتخاب تو کرنا تھا... سو کر لیا۔

بے چارگی کے جنگل میں بھٹکنے والے ایک سمجھ دار انسان کا قصہ

نئی راہ

بابر نعیم

میں نے بڑی احتیاط سے سوداگر کا پرس نکالنے کے لیے اس کی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ وہ دراصل چمڑے کی ایک چھوٹی تھیلی تھی جو دیکھنے میں کافی بھاری لگ رہی تھی۔ گو کہ میں اسے دو مرتبہ تھیلی نکالتے اور سامان کی خریداری کے لیے سونے اور چاندی کے سکے ادا کرتے ہوئے دیکھ چکا تھا۔ اس کے ملازم نے سامان پکڑا ہوا تھا اور وہ اپنے مالک سے کوئی بات کر رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ... یہ گفتگو میرے لیے کوئی مسئلہ نہیں بن سکتی۔ بہرحال میں پرس کا بہترین جیب کترا تھا اور

www.pklibrary.com

اچھی طرح جانتا تھا کہ میں کیا کر رہا ہوں اور اس کے مرنے کا بہترین طریقہ کیا ہے۔ اگر اس طرح کے اور پرس مل جائیں تو جرائم کی دنیا میں میری ساکھ بڑھ جائے گی اور میں وہ مقام حاصل کرلوں گا جس کا میں مستحق تھا۔

میں بہت دیر سے اس شکار کا پیچھا کر رہا تھا کیونکہ اس پر نظر پڑتے ہی میں سمجھ گیا تھا کہ یہ ایک موٹی اسامی ہے پھر جب اس نے دو دکانوں سے بھاری مقدار میں سامان خریدا تو میرا شک یقین میں بدل گیا۔ اس خریداری کے بعد بھی اس کا بٹوا کافی بھاری لگ رہا تھا پھر میں اسے کیسے چھوڑ سکتا تھا۔ میرے لیے یہ ایک آسان موقع تھا اور بازار میں لوگوں کی بھیڑ کی وجہ سے یہ اور آسان ہوگیا تھا۔ میں سکوں سے بھری ہوئی تھیلی نکالتا اور اس سے پہلے کہ کسی کو پتا چلتا، میں اس بھیڑ میں گم ہوجاتا۔

میں نے اپنی کارروائی چھپانے کے لیے ٹاٹ کی بوری ایک ہاتھ سے پکڑ کر سینے کے آگے کرلی جبکہ اس کے نیچے سے بایاں ہاتھ سوداگر کی جیب کی طرف بڑھایا۔ چند لمحوں بعد میں اس امیر آدمی کی دولت کا مالک بننے والا تھا۔ ان پیسوں سے میں دوسرے لوگوں کی میز سے بچا ہوا کھانا لوٹنے کے بجائے گرم روٹی، پنیر اور قیمہ بھرا ہوا رول کھا سکتا تھا۔

میری انگلیاں اس کے پرس کو چھونے ہی والی تھیں کہ میں نے اپنی کلائی پر کسی مضبوط ہاتھ کی گرفت محسوس کی اور اپنا ہاتھ سوداگر کی جیب سے نکال لیا۔

اس مضبوط ہاتھ نے مجھے سختی سے پکڑ رکھا تھا۔ میں چلتے چلتے رک گیا۔ لوگوں نے گردن گھما کر ہمیں دیکھا اور پاس سے گزر گئے۔ سوداگر اور اس کی رقم مجھ سے دور ہوتی چلی گئی تھی۔

اب میں اور میرا پیٹ دونوں ہی مشکل میں تھے۔ وہ اپنی ناراضی کا اظہار گڑگڑاہٹ سے کر رہا تھا لیکن میں خالی پیٹ کے علاوہ کچھ دوسرے مسائل کی وجہ سے بھی ڈر رہا تھا۔ اگر میں پولیس والوں کی گرفت میں آگیا تو مجھے جیل بھیج دیا جائے گا جہاں میں دوبارہ نہیں جانا چاہ رہا تھا۔

میں آہستہ سے اس شخص کی جانب مڑا جس نے میری کلائی پکڑ رکھی تھی اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ پولیس کی وردی کے بجائے ڈھیلے ڈھالے کسان کے کپڑے پہنے ہوئے تھا۔ اس کے چہرے کے بائیں جانب کنپٹی سے جبڑے تک اودے رنگ کا تازہ زخم کا نشان تھا۔

وہ مجھے دیکھ کر مسکرایا لیکن اس نے میری کلائی نہیں چھوڑی۔ ''تم اس جرم کے بعد سزا سے نہیں بچ سکتے تھے لڑکے۔'' اس نے نیچی آواز میں کہا۔

میں نے بے یقینی سے اس کی جانب دیکھا۔ اس نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ وہ مجھے بتائے کہ سڑک پر کیسے جیب کاٹی جاتی ہے۔

''جیسے ہی اس آدمی کو جیب میں رکھے ہوئے بٹوے کا وزن ہلکا محسوس ہوتا۔'' اس نے وضاحت کی۔ ''وہ چور چور کا شور مچا دیتا اور تم پکڑے جاتے۔''

''تم نے غلط اندازہ لگایا۔'' میں نے جواب دیا۔ ''میرا یہ بالکل بھی ارادہ نہیں تھا۔''

''پھر تمہارا ہاتھ اس شریف آدمی کی جیب میں کیوں تھا؟''

''میرا ہاتھ اس کی جیب تک نہیں گیا۔'' میں نے واضح طور پر کہا۔ ''تمہاری آنکھوں نے دھوکا دیا۔ تم نے جو سوچا وہی دیکھا۔''

اس آدمی نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ ''تمہیں چوری کرنا نہیں آتی اور نہ ہی جھوٹ بولنا آتا ہے لیکن اس کے باوجود مجھے یقین ہے کہ میں حالات بہتر بنانے میں تمہاری مدد کرسکتا ہوں۔''

اس نے پُرجوش انداز میں بولنا شروع کیا اور میں سوچنے لگا کہ اس کے دماغ میں کیا ہے۔

''میرے دوست اور میرے پاس، تمہارے لیے ایک چھوٹا سا کام ہے جس کا تمہیں اس سے دگنا معاوضہ ملے گا جو اس آدمی کے پرس سے ملتا اور اس جیب کاٹنے کے مقابلے میں خطرہ بہت کم ہے۔''

''وہ کس طرح؟'' میں نے جاننا چاہا۔

''یہاں نہیں بتاؤں گا۔'' اس نے جواب دیا۔ ''تم میرے ساتھ چلو۔ تمہارا میرے دوست سے ملنا ضروری ہے پھر ہم دیکھیں گے کہ کیا تم ہمارے کام کے لیے موزوں ہو۔''

ان آخری الفاظ نے میری انا کو ٹھیس پہنچائی۔ میں نے مدر مارگوکس کے اسکول میں طویل عرصے تک جیب تراشی کی تربیت حاصل کی۔ اس کے بعد گزشتہ دو سال سے پیرس کی سڑکوں پر اپنے فن کا مظاہرہ کرکے گزر اوقات کر رہا تھا پھر وہ کون ہوتا ہے میری صلاحیتوں کی بے وقعتی کرنے والا؟

اس نے ابھی تک میری کلائی کو مضبوطی سے پکڑا ہوا تھا۔ ہم پُرپیچ راستوں سے گزرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھر رہا تھا اور مجھے اس کا ساتھ دینے کے لیے تیز چلنا پڑ رہا تھا۔

''ہم کہاں جا رہے ہیں؟''

''میں اپنے دو دوستوں سے ملنے جا رہا تھا جو دوسرے لوگوں کی چیزیں چوری کرتے ہیں کہ اچانک میری

www.pklibrary.com

نظر تم پر پڑی۔ مجھے لگا کہ تم کسی مشکل میں پڑنے والے ہو۔ تبھی مجھے خیال آیا کہ ہم تین دوستوں کو جو ایک چھوٹا سا کاروبار کرتے ہیں، آج رات ایک کام کے سلسلے میں ایک چوتھے پارٹنر کی ضرورت ہے۔ شاید تم ہماری اس کوشش میں ساتھ دینا پسند کرو۔''

اب میں اس کی بات پوری طرح سمجھ گیا۔ میں تھوڑا سا پیچھے ہٹا، یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ میں اس کا خواہش مند نہیں ہوں۔

''پورا پارٹنر، ورنہ نہیں۔'' میں نے کہا۔ اس سے پہلے کئی مرتبہ جرائم پیشہ ساتھیوں نے میرے بُرے حالات سے فائدہ اٹھایا اور مجھے چوری کی واردات سے ہونے والے منافع میں بہت تھوڑا حصہ دے کر ٹرخا دیا۔

اس نے میرے چہرے کو غور سے دیکھا جیسے وہ دل ہی دل میں حساب لگا رہا ہو پھر مسکراتے ہوئے بولا۔ ''ٹھیک ہے۔ ہم چاروں کا برابر کا حصہ ہوگا۔ تم، میں، برنارٹ اور گیون۔ اگر تم اس کام کے لیے موزوں ہوئے اور احکامات پر عمل کر سکے۔''

''میں ہر لحاظ سے موزوں ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

آخر کار ہم ایک شراب خانے پہنچے۔ وہ ایک شراب کی دکان تھی جس کے بارے میں مشہور تھا کہ اس کا مالک اسمگل شدہ شراب بیچتا ہے جو پیپوں میں بھر کر لائی جاتی ہے اور انہیں بیل گاڑیوں کے نیچے چھپا دیا جاتا ہے تاکہ ٹیکس حکام کی نظروں میں نہ آئے اور اس پر ٹیکس نہ دینا پڑے۔ مجھے ایسا لگا کہ پیرس میں ہر کوئی حکومت کو دھوکا دے رہا ہے۔

زخمی چہرے والے شخص نے ایک بار پھر سڑک پر نگاہ ڈالی جہاں ہم کھڑے ہوئے تھے اور شراب خانے میں داخل ہو گئے۔ مجھے دو گاہکوں کے اوپر سے گزرنا پڑا جو پتھر کے ناہموار فرش پر آڑے ترچھے پڑے ہوئے تھے۔ بظاہر یہی لگتا تھا کہ انہوں نے بہت زیادہ پی لی ہے اور اب زمین پر لیٹے ہوئے خراٹے بھر رہے تھے۔ ان میں سے ایک کے کھلے ہوئے منہ کے قریب ایک مکھی بھنبھنا رہی تھی۔ دوسرے آدمی کے پیروں پر ایک کتا جھکا ہوا تھا۔

عقبی حصے کے ایک کونے میں لکڑی کی بینچ پر ایک شخص بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے بھی زخمی چہرے والے شخص جیسا لباس پہن رکھا تھا۔ اس کے برابر میں لکڑی کے تختے والی میز پر مجھ سے زیادہ عمر کا لڑکا بیٹھا ہوا تھا۔ ان دونوں نے ہمیں دیکھا۔ اس آدمی نے پہلے زخمی چہرے والے اور پھر مجھ پر اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالی لیکن زبان سے کچھ نہیں کہا۔ لڑکے نے میری طرف دیکھا۔ میری اچانک آمد پر اس کا ردِعمل مخالفانہ لگ رہا تھا۔

''گیون!'' زخمی چہرے والے نے مجھے آگے کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے یقین ہے کہ میں نے وہ لڑکا تلاش کر لیا ہے جو اس کام کو مناسب طریقے سے کر سکتا ہے۔'' پھر اس نے دیوار کے قریب سے ایک دوسری بینچ کھینچی اور مجھے اس پر بٹھا دیا۔ اس طرح ہم ایک دوسرے کے آمنے سامنے ہو گئے۔ میں گیون کے سامنے جبکہ مجھ سے بڑا لڑکا اس آدمی کے مدمقابل بیٹھا ہوا تھا۔

''برابر کے شریک۔'' میں نے کوئی لگی لپٹی بغیر کہا تاکہ بعد میں کوئی غلط فہمی نہ ہو۔

دوسرا لڑکا آگے کی طرف جھکا اور اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن اس کے برابر میں بیٹھے ہوئے آدمی نے اپنا مضبوط ہاتھ اس کے بازو پر رکھ کر روک دیا۔

''شٹس برنارٹ!'' وہ بڑبڑایا۔ ''دیکھتے ہیں کہ یہ کیا کہہ رہا ہے۔''

میں نے دیکھا کہ گیون کی نظریں میرے برابر میں بیٹھے ہوئے آدمی پر ہیں۔ اس نے اپنی پلک جھپکائی۔ میں نے جلدی سے مڑ کر دیکھا۔ وہ زخمی چہرے والا اشارے سے اپنی رضامندی ظاہر کر رہا تھا۔ اس نے آگے کی طرف جھکتے ہوئے نیچی آواز میں کہا۔

''اس لڑکے میں صلاحیت ہے۔ اس کے بغیر ہم کام نہیں کر سکتے۔ اس کا مطالبہ جائز ہے لہٰذا سب کا حصہ برابر ہونا چاہیے۔''

گیون کے چہرے پر شکوک و شبہات نمودار ہوئے۔ اس نے پوچھا۔ ''کیا تم واقعی اتنے باصلاحیت ہو؟''

''اس سے بھی زیادہ۔'' میں نے فخریہ کہا۔

میرا جواب سن کر اس کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر میز کے نیچے میرے گھٹنے پر تھپکی دی۔ ''ٹھیک ہے، ہمیں منظور ہے۔''

برنارٹ نے گیون کی آستین کھینچی لیکن اس نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا اور تحکمانہ لہجے میں بولا۔ ''بعد میں۔''

زخمی چہرے والے اور گیون نے دوسرے معاملات کے بارے میں بات شروع کر دی اور مجھے ایک دفعہ بھی کام کے بارے میں نہیں بتایا۔ میں جاننا چاہ رہا تھا کہ ہمیں آج رات کیا کام کرنا ہے۔ کافی دیر انتظار کرنے کے بعد میں نے ان کی گفتگو میں مداخلت کی۔

''ہم جو کام کرنے جا رہے ہیں، مجھے اس کے بارے

www.pklibrary.com

میں بتاؤ۔ تمہارا پلان کیا ہے؟''

زخمی چہرے والے نے جلدی سے دوسری میزوں کی طرف دیکھا کہ کہیں قریب میں بیٹھا ہوا کوئی شرابی ہماری باتیں تو نہیں سن رہا۔

''ابھی نہیں۔'' اس نے سرگوشی میں جواب دیا۔ ''ہمیں بہت محتاط رہنا ہے۔ وقت آنے کا انتظار کرو۔''

میں نے بیزاری سے اپنی آنکھیں گھمائیں۔ بازوؤں کو سینے پر باندھا اور بے صبری سے اپنا ایک پاؤں فرش پر مارا۔

گیون مجھے تسلی دیتے ہوئے بولا۔ ''پُرسکون ہو جاؤ میرے دوست۔ ہمارے پاس مشروب ہے، اس انتظار سے نمٹنے کے لیے۔''

اس نے اسٹیل کی صراحی میں سے ایک گلاس میں شراب انڈیلی اور اسے میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے اس کا ایک گھونٹ لیا۔ ایک بے وقوف بھی بتا سکتا تھا کہ اس میں پانی ملایا گیا ہے لیکن اس کے باوجود اس کا ذائقہ اتنا برا نہیں تھا۔

''ہم کس کا انتظار کر رہے ہیں؟'' بالآخر میں نے پوچھ ہی لیا۔

''اندھیرا ہونے کا۔'' زخمی چہرے والے نے جواب دیا۔

''اس عورت کا۔'' برنارٹ نے کہا۔ اس کے کہے ہوئے الفاظ بہ مشکل سمجھ میں آ رہے تھے۔ اس نے مجھے یوں گھورا جیسے میں نے اسے ناراض کر دیا ہو۔

میں حیران رہ گیا۔ اس کی آواز سن کر مجھے چیختی ہوئی بلی یاد آ گئی۔ بعد میں جب میں نے غور کیا تو پتا چلا کہ وہ بہرا تھا۔ وہ دوسرے لوگوں کے ہونٹوں کی حرکت سے ان کی بات سمجھ لیتا تھا لیکن اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ جب وہ خود بولتا ہے تو دوسروں کو کیسا لگتا ہے۔ اس کے حلق سے برآمد ہونے والی کچھ ناگوار آوازیں سن کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

''وہ عورت اس کام میں ہماری مدد کر رہی ہے۔'' اس نے سرگوشی میں کہا۔ ''اس کے بعد ہی ہم اپنی کارروائی شروع کر سکیں گے۔''

''اس کا مطلب ہے کہ میرا حصہ اب پانچواں ہوگا؟''

''نہیں۔'' اس نے مجھے تسلی دی۔ ''تمہیں چوتھا حصہ ہی ملے گا۔ اس عورت نے ہم پر ایک بڑا احسان کیا تھا۔ اس کی مدد سے یہ قرض اتر جائے گا۔''

اس نے میرا گلاس دوبارہ مشروب سے بھرا اور اپنے گلاس سے ٹکراتے ہوئے بولا۔ ''آج رات ہونے والی متوقع کامیابی کے نام۔''

زخمی چہرے والا آہستہ سے ہنسا اور ہمارے ساتھ شامل ہو گیا۔ برنارٹ منہ ہی منہ میں بڑبڑانے لگا۔ میں اپنے خالی معدے میں شراب انڈیل رہا تھا جس کی وجہ سے پیٹ میں گڑگڑاہٹ ہو رہی تھی اور میرے لیے بھوک برداشت کرنا مشکل ہو رہا تھا۔

اندھیرا ہوتے ہی ایک سرخ بالوں والی جوان عورت اندر داخل ہوئی۔ اس نے کھلے گلے کا لباس پہن رکھا تھا جس سے اس کے جسمانی خطوط نمایاں ہو رہے تھے۔ وہ ہماری طرف بڑھی لیکن مجھے دیکھ کر ٹھٹک گئی۔

''یہ کون ہے؟'' اس نے میری طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

''یہ ہمارے ساتھ ہے۔'' زخمی چہرے والے نے کہا۔ ''تم کھل کر بات کر سکتی ہو لیکن اپنی آواز نیچی رکھنا۔''

وہ بینچ پر بیٹھ گئی اور اس نے اپنا سر آگے جھکا لیا۔ ہم سب لوگ بھی آگے کی طرف جھک گئے تاکہ اس کی ہلکی آواز میں ہونے والی گفتگو بہتر طور پر سن سکیں، سوائے برنارٹ کے جو اپنی جگہ بیٹھا اس عورت کے ہونٹوں کی حرکت دیکھتا رہا اور جب وہ کچھ بولنا چاہتا تو اس کے اپنے ہونٹ بھی حرکت کرنے لگتے۔

''میں نے وہی کیا جو تم نے بتایا تھا۔ وہ درزی یہ سمجھا کہ اسے میری خوبصورتی کا نظارہ کرنے کے لیے شہر کے دوسرے کونے پر واقع ایک مکان پر ملنے کے لیے آنا ہوگا۔ اپنی غلطی کا احساس ہونے کے بعد اسے واپس آنے میں کم از کم ایک گھنٹا لگ جائے گا۔ اگر تم جلدی کرو تو تمہیں اپنی کارروائی مکمل کرنے کے لیے تقریباً دو گھنٹے مل جائیں گے۔''

''کیا وہ دکان سے نکل گیا؟'' گیون نے پوچھا۔

''ہاں، ابھی تھوڑی دیر پہلے نکلا ہے۔'' اس عورت نے کہا۔ ''میں سڑک کے دوسری طرف چھپ کر اس کی نگرانی کر رہی تھی۔ اس نے دکان بند کی، سامنے والے دروازے کو تالا لگایا اور تیز تیز قدم اٹھاتا چلا گیا۔''

''تم نے اپنا کام بہ خوبی انجام دیا۔'' زخمی چہرے والے نے کہا۔ ''اب یہ بہتر ہوگا کہ تم کچھ عرصے کے لیے روپوش ہو جاؤ۔ اگر ہماری کارروائی مکمل ہونے کے بعد اس درزی کو تم پر شبہ ہوا تو تمہیں یہاں نظر نہیں آنا چاہیے ورنہ اس کی گرفت میں آ جاؤ گی۔''

یہ کہہ کر اس نے اسے جانے کا اشارہ کیا۔ وہ عورت ہماری میز سے اٹھی اور تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی دکان سے باہر چلی گئی۔

''اب ہمیں چلنا چاہیے۔'' زخمی چہرے والے نے

www.pklibrary.com

کہا۔ ”گیون تم اور برنارٹ درزی کی دکان کے پیچھے والی گلی میں گھوڑا گاڑی لے کر آؤ، میں اس لڑکے کے ساتھ جا کر وہاں کا جائزہ لوں گا۔“

گیون اور برنارٹ جانے کے لیے اٹھے۔ برنارٹ نے ایک بار پھر مجھے غصے سے دیکھا۔ ”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ مجھ سے اتنا ناراض کیوں ہے؟ میں نے اس کا کیا بگاڑا ہے؟“

زخمی چہرے والا اپنی جگہ سے اٹھا۔ اس نے اپنا ہاتھ میری گردن پر رکھا اور مجھے آہستہ سے چلاتا ہوا بیرونی دروازے کی طرف لے گیا۔

”آؤ میرے دوست! اس درزی کی دکان یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔“

دو سڑکوں سے گزرنے کے بعد ہم ایک دو منزلہ عمارت کے سامنے پہنچ گئے۔ نچلی منزل یا اوپر کے اپارٹمنٹ میں کوئی لائٹ نہیں جل رہی تھی۔ بیرونی دروازے کے اوپر ایک لکڑی کے بورڈ پر درزی کی دکان کا نام لکھا ہوا تھا۔ ہم اس عمارت کے کونے پر گئے اور وہاں سے گھوم کر عقبی گلی میں چلے گئے جہاں مدھم چاندنی میں ہمیں راستہ تلاش کرنا تھا لیکن ہمیں زیادہ انحصار اپنے جوتوں پر کرنا پڑا جن کی وجہ سے ہم گڑھوں کے درمیان سے بچ کر چل رہے تھے۔

عمارت کے عقب میں پہنچ کر زخمی چہرے والے نے اس کا عقبی دروازہ کھولنے کی کوشش کی لیکن وہ اندر سے بند تھا۔ اس نے دروازے سے کان لگا کر سننے کی کوشش کی پھر چند منٹ بعد وہ پیچھے ہٹ گیا۔

”ایسا لگتا ہے کہ اندر کوئی نہیں ہے۔ اب ہمیں صرف گھوڑا گاڑی کا انتظار کرنا ہے۔“

گلی میں گہری خاموشی تھی۔ ہم وہاں کھڑے اپنے ساتھیوں کا انتظار کر رہے تھے۔ کبھی کبھی مجھے ایک یا دو چوہوں کی آواز سنائی دیتی جو کچرے میں کرید کر اپنی خوراک تلاش کر رہے تھے۔ میں ان کی بھوک کی شدت سمجھ سکتا تھا۔

چند لمحوں بعد سڑک پر گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز آئی اور گھوڑا گاڑی ہماری گلی کی طرف مڑ گئی۔ تھوڑی دیر بعد گیون نے اسے بالکل عمارت کے عقب میں لگا دیا۔ زخمی چہرے والے نے عقبی دروازے کے اوپر ایک چھوٹی کھڑکی کی طرف دیکھا اور گیون کو گاڑی روکنے کا اشارہ کیا۔

”اب کیا کرنا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

اس نے سرگوشی میں کہا۔ ”اب تم اس کھڑکی کے راستے اندر جا کر سیڑھی کے ذریعے اترو گے اور ہمارے لیے عقبی دروازے کا کنڈا کھولو گے۔“

”لیکن میں ہی کیوں؟“

”کیونکہ برنارٹ بہت زیادہ کھاتا ہے، اس وجہ سے اس کا وزن اور جسامت بڑھ گئی ہے۔ وہ کھڑکی سے نہیں گزر سکتا۔ اس کے مقابلے میں تمہاری جسامت کم ہے اور تم بہ آسانی کھڑکی کے راستے اندر جا سکتے ہو۔ اس کے علاوہ تم بہت بہادر ہو اور کسی دوسرے کے مکان میں بلا خوف و خطر داخل ہو سکتے ہو اس لیے تم وہی کرو جو کہا جا رہا ہے، اگر تمہیں اپنا حصہ چاہیے۔“

مجھے یہ آئیڈیا بالکل پسند نہیں آیا کہ کھڑکی کے راستے تاریک اپارٹمنٹ میں اندر جاؤں، اندھیرے میں سیڑھی کے ذریعے نیچے اتروں اور ٹٹولتا ہوا دکان کا عقبی دروازہ تلاش کروں لیکن اسی وقت میرے پیٹ میں گڑگڑاہٹ ہوئی جس کی وجہ سے مجھے یہ فیصلہ کرنا پڑا۔ میں گھوڑا گاڑی پر چڑھا اور زخمی چہرے والے نے اپنے کندھوں پر مجھے اٹھایا۔ گیون نے کھڑکی کھولنے کے لیے مجھے ایک چھوٹی

بات تو سچ ہے

• کچھ لوگ اجازت لے کر بے عزتی کرتے ہیں۔

• لڑکی کو بیس سال تک پہنچنے میں کم از کم 30 سے 35 سال لگ جاتے ہیں۔

• کلاس میں سب سے آخری لائن میں بیٹھنے والے لڑکے رزلٹ والے دن مسجد کی پہلی لائن میں بیٹھے ہوتے ہیں۔

• ملک کے حالات صرف کنوارے ہی بدل سکتے ہیں۔ شادی شدہ تو اپنی مرضی سے ٹی وی چینل بھی نہیں بدل سکتے۔

• بیوی اور سورج میں مشابہت..... دونوں کو گھور کر دیکھنے کے بعد آنکھوں میں روشنی نہیں رہتی۔

• بچپن سے لے کر اب تک ہر چیز کو یوٹرن لیتے دیکھا ہے سوائے ماں کی پھینکی ہوئی جوتی کے۔ کیا سیدھی بچتی ہے۔

مرسلہ: وزیر محمد خان، بلل ہزارہ

www.pklibrary.com

لوہے کی سلاخ دی۔

میں نے ہر ممکن تیزی دکھاتے ہوئے کھڑکی کھولی۔ سیڑھیوں سے نیچے گیا اور اندر سے دروازہ کھول دیا تاکہ وہ دونوں آدمی اندر آسکیں۔ لوہے کی سلاخ ابھی تک میرے ہاتھ میں تھی۔ میں نے اسے چھپانے کے لیے اپنی پینٹ میں اڑس لیا۔ اس وقت مجھے معلوم نہیں تھا کہ بعد میں اس سے کیا کام لینا ہے۔

اندر آنے کے بعد زخمی چہرے والے نے ایک چھوٹی لالٹین کے ذریعے ان چیزوں کو دیکھا جو وہ اپنے ساتھ لے جانا چاہ رہا تھا۔ گیون نے اپنے لیے ایک موم بتی جلائی جبکہ برنارٹ نگرانی کے لیے باہر گلی میں ہی رک گیا۔

زخمی چہرے والا میز پر رکھی ہوئی سلائی کی سوئیوں، چاندی کے چھلوں اور مختلف رنگ کے دھاگوں میں سے وہ چیزیں الگ کرنے لگا جو وہ کپڑے کی بوری میں ڈال کر اپنے ساتھ لے جانا چاہ رہا تھا جبکہ گیون نے میرے بازوؤں پر قیمتی کپڑے کی تہیں لاد دیں اور مجھے دروازے کی طرف دھکیلتے ہوئے بولا۔

''جلدی کرو۔''

میں نے اس کی ہدایات پر عمل کرتے ہوئے سارا سامان گھوڑا گاڑی کے پچھلے حصے میں رکھا اور مزید کپڑا اٹھانے کے لیے واپس اندر آگیا۔ تقریباً پندرہ منٹ کے اندر چھکڑا پوری طرح بھر گیا۔ لگ رہا تھا کہ ہم دکان اور درزی کے گھر کا فرنیچر بھی ساتھ لے جا رہے ہیں۔

زخمی چہرے والے نے آخری بار چاروں طرف دیکھا، لائٹس بند کیں اور باہر چلا گیا۔ گیون نے بھی اپنی موم بتی بجھائی اور خاموشی سے دکان کا دروازہ بند کر دیا۔ ہم بھوتوں کی طرح گلی سے نکلے اور بڑی سڑک پر آگئے۔ صرف گھوڑے کی ٹاپوں اور چھکڑے کے پہیوں سے آواز پیدا ہو رہی تھی لیکن وہاں ہمیں دیکھنے والا کوئی نہیں تھا۔

''یہ تو بہت آسان تھا۔'' میں نے فخریہ کہا۔

''ہمارے کام کا دوسرا حصہ مکمل ہوا۔'' گیون نے کہا۔ ''اب ہمیں ان چیزوں کو کسی جگہ اسٹور کرنا ہے جب تک گاہک انہیں دیکھ کر قیمت نہ لگا لے۔''

''اور میرا حصہ؟'' میں نے پوچھا۔

''جب گاہک اس سامان کی قیمت ادا کرے گا تو تمہیں بھی حصہ مل جائے گا۔''

''مجھے بھوک لگ رہی ہے۔''

گیون نے اپنے ہونٹ بھینچ لیے جیسے کسی گہری سوچ میں ہو۔ ''میں اپنے پارٹنر سے بات کرتا ہوں۔ دیکھتا ہوں کہ کیا ہو سکتا ہے۔''

''ہمارا پارٹنر۔'' میں نے اسے یاد دلایا۔

وہ مسکرایا اور میری کمر پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔ ''بالکل..... بالکل۔''

چار سڑکوں سے گزرنے کے بعد ہم ایک تنگ لین پر واقع عمارت پر رک گئے جس پر ڈبل ڈور لگا ہوا تھا۔ گیون نے ایک چابی اس کے تالے میں گھمائی اور دونوں بھاری دروازے کھل گئے۔ میں نے دیکھا کہ وہ ایک بڑا کمرا تھا جس میں ہمارے چھکڑے کا سارا سامان آسکتا تھا۔

زخمی چہرے والے نے کپڑوں کے کچھ بنڈل اٹھائے اور انہیں اسٹور روم میں لے گیا۔ برنارٹ اور میں نے بھی ایسا ہی کیا لیکن جب زخمی چہرے والا واپس آیا تو گیون اسے ایک طرف لے گیا اور اس سے اکیلے میں مختصر گفتگو کی۔ بات ختم کرنے کے بعد اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے اور برنارٹ کو اپنے پاس بلایا۔ جیب میں ہاتھ ڈال کر چمڑے کا پرس نکالا اور اس میں سے دو تانبے کے سکے نکالے۔

''گیون نے مجھے بتایا ہے کہ تم دونوں نے دوپہر کا کھانا نہیں کھایا بلکہ ابھی تک ڈنر بھی نہیں کیا۔ تم دونوں اپنے حصے میں سے یہ سکے لے لو اور کھانا کھا لو۔''

یہ کہہ کر اس نے ہمیں ایک ایک سکہ دیا۔ ''باقی سامان اتارنے کا کیا ہوگا؟'' میں نے پوچھا۔

''میں اور گیون اس کا خیال رکھیں گے اور گاہک کے آنے تک اسٹور کو تالا لگا دیں گے۔ تم دونوں نے بہت عمدہ کام کیا ہے۔ اب تم جا کر کھانا کھاؤ اور ہم سے ملنے اسی شراب کی دکان پر آجانا۔ ہم وہیں حساب کتاب کر لیں گے۔''

گیون نے رضامندی میں سر ہلایا اور ہمیں وہاں سے جانے کا اس طرح اشارہ کیا جیسے میں اور برنارٹ اس کے صحن میں آنے والے چوزے ہیں۔

مجھے کھانے کی شدید طلب ہو رہی تھی اس لیے میں وہاں سے جانے لگا۔ برنارٹ رکنا چاہ رہا تھا لیکن میں نے گیون کو کہتے ہوئے سنا کہ وہ اپنے نئے پارٹنر کو کمپنی دے پھر میں نے اسے برنارٹ کو آنکھ مارتے ہوئے دیکھا جیسے اپنے کہے ہوئے لفظوں سے زیادہ کی طرف اشارہ کر رہا ہو۔ برنارٹ نے ہچکچاتے ہوئے میری آستین پکڑی اور مجھے کھینچتا ہوا واپس سائڈ لین پر لے گیا۔ وہ سلاخ ابھی تک میرے پاس تھی اور میں اپنا ہاتھ چھڑانے کے لیے استعمال کر سکتا تھا لیکن اس وقت میرا دماغ دوسری باتوں میں الجھا

www.pklibrary.com

عید کی خوشیوں سے مرصع مئی 2021ء کا متاثر کن شمارہ

گھر کے ہر فرد کے لیے

ماہنامہ

پاکیزہ

کراچی

افشاں آفریدی، نایاب جیلانی کے سلسلے وار ناول ایک دلچسپ دوراہے پر

عنیزہ سید کا خوب صورت مکمل ناول، **سانجھ بھئی چودیس**

عالیہ حرا اور **فوزیہ سرور** کے شاہکار ناولٹ

شائستہ زریں کا شاندار **سروے**

اختر شجاعت کے پُرنور افکار پرمبنی

شمع ہدایت میں ایمان افروز مقالہ

بُخل، مذمّتِ الٰہی

اندازِ نو میں ملیے ...... ریڈیو کی گنگناتی آواز **عروج زہرا** سے

اس کے علاوہ

اُمِ ارسلان، سعدیہ ہما شیخ، قرۃ العین سکندر،
انعم سجیل، روبینہ شاہین، عائشہ تنویر کی دلچسپ تحریریں......

پُرتنوع سلسلوں سے سجا، خوب صورت تراشوں پرمبنی، شعروشاعری سے مرصع اور حُسن وصحت
کے متعلق متن سے آراستہ ماہنامہ پاکیزہ صرف آپ جیسے باذوق قارئین کے لیے......

www.pklibrary.com

ہوا تھا۔

میں جتنا اس کے اشارے کے بارے میں سوچتا، اتنی ہی میری پریشانی بڑھ جاتی۔ میرا معدہ بھوک کی کہانی سنا رہا تھا لیکن میرا دماغ زور زور سے چلا رہا تھا۔ گو کہ میں سمجھ نہیں سکا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ گیون کچھ فاصلہ رکھ کر ہمارا تعاقب کر رہا تھا۔ جب میں اور برنارٹ ایک ٹوٹی ہوئی اینٹوں کی دیوار کے پاس پہنچے تو میں نے دوبارہ پیچھے مڑ کر دیکھا۔ اب گیون واپس چھکڑے کی طرف جا رہا تھا۔ وہ یہی سمجھا ہوگا کہ ہم انہیں چھوڑ کر جا چکے ہیں تاکہ وہ خود ہی کام ختم کر لیں۔

میں چلتے چلتے رک گیا۔ برنارٹ نے حیرت سے مجھے دیکھا۔ میں نے دیوار میں پڑنے والے شگاف کی طرف اشارہ کیا۔ اس کے چہرے پر الجھن کے آثار تھے۔ میں نے شہادت کی انگلی اپنے ہونٹوں پر رکھی۔ اب میری باری تھی کہ اس کی آستین پکڑ کر چلوں۔ میں نے اسے کھینچ کر دیوار کے شگاف میں سے گزارا اور اس کے ٹوٹے ہوئے کنارے میں سر داخل کر کے لین کی طرف دیکھا۔ برنارٹ نے بھی میری تقلید کی۔

کئی منٹ بعد میں نے گاڑی کے پہیوں کی آواز سنی پھر گھوڑا گاڑی، گیون اور زخمی چہرے والا وہاں سے گزرے جس جگہ ہم چھپے ہوئے تھے۔ ان کے جانے کے بعد میں اور برنارٹ دیوار سے باہر آئے اور محتاط انداز میں گاڑی کا تعاقب کرنے لگے۔ وہ کئی پُر پیچ راستوں سے گزرتی ہوئی ایک اور اسٹور روم پر جا کر رک گئی۔ ان دونوں نے سامان اتار کر اسٹور میں رکھا اور اسے تالا لگا کر گاڑی سمیت چلے گئے۔

میں نے محتاط انداز میں اسٹور روم کا دروازہ دیکھا۔ اس میں تالا لگا ہوا تھا اور میرے پاس اس کی چابی نہیں تھی۔ میرے حصے کا سامان اسٹور میں رکھا ہوا تھا۔ برنارٹ نے دونوں ہاتھوں سے میرا چہرہ پکڑ کر اپنی طرف کیا اور حلق سے عجیب و غریب آوازیں نکالنے لگا جیسے مجھ پر غرا رہا ہو۔

میرے پاس اس کی باتیں سننے کا وقت نہیں تھا لہٰذا میں نے اس کے دونوں ہاتھ اپنے چہرے سے ہٹائے، اس کی آستین دوبارہ پکڑی اور اسے کھینچتا ہوا بڑی سڑک تک

دلایا کہ وہ سارا سامان پہلے اسٹور میں رکھ چکے ہیں۔ انہوں نے ہمیں کھانے کے لیے بھیج دیا اور سامان لے کر اس دوسرے اسٹور میں لے آئے۔ اب وہ اسے گاہک کو فروخت کریں گے اور ہمیں کچھ نہیں ملے گا۔ وہ کبھی بھی شراب کی دکان پر ہمارا حصہ دینے نہیں آئیں گے۔''

''ہم کیا کریں؟'' برنارٹ کے حلق سے آواز نکلی۔

''مجھے سوچنے دو۔'' میں نے جواب دیا۔

دوسرے روز صبح میں نے درزی کی دکان کے دروازے پر دستک دی جبکہ برنارٹ سڑک کے پار چھپ کر کھڑا ہو گیا، یہ دیکھنے کے لیے کہ معاملہ کیا رخ اختیار کرتا ہے۔ میری تیسری دستک پر ایک چھوٹے قد کے گنجے آدمی نے دروازہ کھولا۔ لگتا تھا کہ وہ کسی بھی لمحے دوبارہ دروازہ بند کر سکتا ہے۔

''تم جیسا بدمعاش لڑکا مجھ سے کیا چاہتا ہے؟''

''میں جانتا ہوں کہ گزشتہ رات تمہاری دکان میں چوری ہوئی ہے۔''

''اور تم اس چوری کے بارے میں کیا جانتے ہو؟''

میں آہستہ سے ایک قدم پیچھے ہٹ گیا تاکہ اس کی پہنچ سے دور رہوں۔

''صرف اتنا کہ اگر ہم دونوں تیزی دکھائیں تو شاید میں تمہیں دکھا سکوں کہ تمہاری کچھ چیزیں کہاں رکھی ہوئی ہیں لیکن مجھے اس کا معاوضہ چاہیے۔''

''بالکل ملے گا۔'' یہ کہہ کر اس نے دروازہ تھوڑا سا اور کھول دیا۔

''تاہم میں اپنی آنکھوں سے ان چیزوں کو دیکھنے کے بعد ہی معاوضہ دوں گا۔'' درزی نے کہا۔ ''اس کے بعد ہی ہم معاوضے کی بات کر سکتے ہیں کیونکہ مجھے تم پر بھروسا نہیں ہے۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو؟''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا۔ ''ہم ایک معاہدہ کر لیتے ہیں۔ میں تمہیں اس جگہ لے جاؤں گا لیکن تمہیں فاصلہ رکھ کر میرے پیچھے چلنا ہوگا تاکہ دوسرے لوگ یہ نہ سمجھیں کہ میں نے تمہیں وہ جگہ دکھائی تھی۔''

''مجھے منظور ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

میں واپس جانے کے لیے مڑا اور چلنا شروع کر دیا۔

pklibrary.com

www.pklibrary.com

ہوا تھا۔

میں جتنا اس کے اشارے کے بارے میں سوچتا، اتنی ہی میری پریشانی بڑھ جاتی۔ میرا معدہ بھوک کی کہانی سنا رہا تھا لیکن میرا دماغ زور زور سے چلّا رہا تھا۔ گو کہ میں سمجھ نہیں سکا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ گیون کچھ فاصلہ رکھ کر ہمارا تعاقب کر رہا تھا۔ جب میں اور برنارٹ ایک ٹوٹی ہوئی اینٹوں کی دیوار کے پاس پہنچے تو میں نے دوبارہ پیچھے مڑ کر دیکھا۔ اب گیون واپس چھکڑے کی طرف جا رہا تھا۔ وہ یہی سمجھا ہوگا کہ ہم انہیں چھوڑ کر جا چکے ہیں تاکہ وہ خود ہی کام ختم کر لیں۔

میں چلتے چلتے رک گیا۔ برنارٹ نے حیرت سے مجھے دیکھا۔ میں نے دیوار میں پڑنے والے شگاف کی طرف اشارہ کیا۔ اس کے چہرے پر الجھن کے آثار تھے۔ میں نے شہادت کی انگلی اپنے ہونٹوں پر رکھی۔ اب میری باری تھی کہ اس کی آستین پکڑ کر چلوں۔ میں نے اسے کھینچ کر دیوار کے شگاف میں سے گزارا اور اس کے ٹوٹے ہوئے کنارے میں سر داخل کر کے لین کی طرف دیکھا۔ برنارٹ نے بھی میری تقلید کی۔

کئی منٹ بعد میں نے گاڑی کے پہیوں کی آواز سنی پھر گھوڑا گاڑی، گیون اور زخمی چہرے والا وہاں سے گزرے جس جگہ ہم چھپے ہوئے تھے۔ ان کے جانے کے بعد میں اور برنارٹ دیوار سے باہر آئے اور محتاط انداز میں گاڑی کا تعاقب کرنے لگے۔ وہ کئی پُر پیچ راستوں سے گزرتی ہوئی ایک اور اسٹور روم پر جا کر رک گئی۔ ان دونوں نے سامان اتار کر اسٹور میں رکھا اور اسے تالا لگا کر گاڑی سمیت چلے گئے۔

میں نے محتاط انداز میں اسٹور روم کا دروازہ دیکھا۔ اس میں تالا لگا ہوا تھا اور میرے پاس اس کی چابی نہیں تھی۔ میرے حصے کا سامان اسٹور میں رکھا ہوا تھا۔ برنارٹ نے دونوں ہاتھوں سے میرا چہرہ پکڑ کر اپنی طرف کیا اور حلق سے عجیب و غریب آوازیں نکالنے لگا جیسے مجھ پر غرا رہا ہو۔

میرے پاس اس کی باتیں سننے کا وقت نہیں تھا لہٰذا میں نے اس کے دونوں ہاتھ اپنے چہرے سے ہٹائے، اس کی آستین دوبارہ پکڑی اور اسے کھینچتا ہوا بڑی سڑک تک لے گیا۔ وہاں اتنی روشنی تھی کہ وہ میرے ہونٹوں کی حرکت پڑھ سکے۔

''تمہارے دونوں دوست ہمارے ساتھ بے ایمانی کرنا چاہ رہے ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''انہوں نے ہمیں یقین دلایا کہ وہ سارا سامان پہلے اسٹور میں رکھ چکے ہیں۔ انہوں نے ہمیں کھانے کے لیے بھیج دیا اور سامان لے کر اس دوسرے اسٹور میں لے آئے۔ اب وہ اسے گاہک کو فروخت کریں گے اور ہمیں کچھ نہیں ملے گا۔ وہ کبھی بھی شراب کی دکان پر ہمارا حصہ دینے نہیں آئیں گے۔''

''ہم کیا کریں؟'' برنارٹ کے حلق سے آواز نکلی۔

''مجھے سوچنے دو۔'' میں نے جواب دیا۔

دوسرے روز صبح میں نے درزی کی دکان کے دروازے پر دستک دی جبکہ برنارٹ سڑک کے پار چھپ کر کھڑا ہو گیا، یہ دیکھنے کے لیے کہ معاملہ کیا رخ اختیار کرتا ہے۔ میری تیسری دستک پر ایک چھوٹے قد کے گنجے آدمی نے دروازہ کھولا۔ لگتا تھا کہ وہ کسی بھی لمحے دوبارہ دروازہ بند کر سکتا ہے۔

''تم جیسا بدمعاش لڑکا مجھ سے کیا چاہتا ہے؟''

''میں جانتا ہوں کہ گزشتہ رات تمہاری دکان میں چوری ہوئی ہے۔''

''اور تم اس چوری کے بارے میں کیا جانتے ہو؟''

میں آہستہ سے ایک قدم پیچھے ہٹ گیا تاکہ اس کی پہنچ سے دور رہوں۔

''صرف اتنا کہ اگر ہم دونوں تیزی دکھائیں تو شاید میں تمہیں دکھا سکوں کہ تمہاری کچھ چیزیں کہاں رکھی ہوئی ہیں لیکن مجھے اس کا معاوضہ چاہیے۔''

''بالکل ملے گا۔'' یہ کہہ کر اس نے دروازہ تھوڑا سا اور کھول دیا۔

''تاہم میں اپنی آنکھوں سے ان چیزوں کو دیکھنے کے بعد ہی معاوضہ دوں گا۔'' درزی نے کہا۔ ''اس کے بعد ہی ہم معاوضے کی بات کر سکتے ہیں کیونکہ مجھے تم پر بھروسا نہیں ہے۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو؟''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا۔ ''ہم ایک معاہدہ کر لیتے ہیں۔ میں تمہیں اس جگہ لے جاؤں گا لیکن تمہیں فاصلہ رکھ کر میرے پیچھے چلنا ہوگا تاکہ دوسرے لوگ یہ نہ سمجھیں کہ میں نے تمہیں وہ جگہ دکھائی تھی۔''

''مجھے منظور ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

میں واپس جانے کے لیے مڑا اور چلنا شروع کر دیا۔ درزی نے جلدی سے دکان کا دروازہ بند کیا اور میرے پیچھے آنے لگا۔ ہم شہر کی مختلف سڑکوں سے گزرتے ہوئے دوسرے اسٹور روم پر پہنچے۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ وہ مجھ سے تیس فٹ کے فاصلے پر تھا۔ میں اسٹور کے پاس سے

www.pklibrary.com

گزرتا ہوا مزید بیس فٹ آگے گیا اور پلٹ کر ہاتھ سے اسے رکنے کا اشارہ کیا۔

''اس دروازے پر لگا ہوا تالا دیکھ رہے ہو۔'' میں نے تالے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''تمہارا سامان اس کمرے میں ہے۔''

''میں کیسے جان سکتا ہوں؟'' اس نے پوچھا۔

''دروازے پر تالا لگا ہوا ہے۔''

میں نے اپنی پیٹی سے لوہے کی سلاخ نکالی اور اس کی طرف اچھال دی۔

''تم اس سے تالا توڑ دو اور اپنی آنکھوں سے دیکھ لو۔''

اس نے سلاخ اٹھائی اور تالے میں ڈال کر اسے پوری قوت سے نیچے کیا۔ کنڈے کے اسکریو دروازے سے نکل کر نیچے گر پڑے۔ اس نے دروازہ کھول کر اندر جھانکا پھر پلٹ کر مجھے دیکھا۔

''یہ پورا سامان نہیں ہے۔ اس میں کچھ چیزیں کم ہیں۔''

میں نے حیران ہوتے ہوئے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔ ''اوہ! اس کا مطلب ہے کہ وہ چور واپس آئے تھے اور انہوں نے کچھ سامان نکال کر گاہک کو دے دیا۔ ہمیں جلدی کرنا چاہیے اس سے پہلے کہ وہ باقی سامان لینے بھی آجائیں۔ میں یہاں رک کر انتظار کرنے کے علاوہ اس جگہ پر بھی نظر رکھوں گا۔ تم پولیس میں رپورٹ درج کروادو۔ ممکن ہے کہ وہ انہیں گرفتار کر کے تمہارا سارا سامان برآمد کرلیں۔''

درزی نے سر گھما کر سڑک کے دونوں جانب دیکھا اور ایک قدم آگے بڑھایا پھر اگلے لمحے اس نے اپنا پاؤں پیچھے کرلیا جیسے کوئی فیصلہ نہ کر پا رہا ہو۔

''جلدی کرو۔'' میں نے کہا۔ ''وہ چور کسی وقت بھی واپس آسکتے ہیں۔ میں دروازہ اس طرح بند کروں گا کہ کوئی نہ جان سکے کہ ہم نے اسے کھولا تھا اور میں قریب ہی کہیں چھپ جاؤں گا۔''

بالآخر درزی فے جانے کے لیے اپنا ذہن بنالیا۔ کونے پر پہنچ کر اس نے مڑ کر مجھے دیکھا۔ میں دروازہ ٹھیک کر رہا تھا۔ میں نے اسے ہاتھ کے اشارے سے جلدی جانے کے لیے کہا۔ جب وہ میری نظروں سے اوجھل ہوگیا تب بھی میں نے کام جاری رکھا۔ میں اس دروازے کی دوسری بار مرمت کر رہا تھا۔ اس سے پہلے میں رات کو بھی یہ کام کر چکا تھا جب میں نے لوہے کی سلاخ کے ذریعے دروازہ کھولا تھا۔ برنارٹ اور میں نے کچھ اچھی اور قیمتی چیزیں اٹھائیں اور اپنے ایک جاننے والے گاہک کے پاس لے گئے... کیونکہ ہمارے پاس گھوڑا گاڑی نہیں تھی اس لیے ہم دونوں اپنے بازوؤں میں صرف تین تین بنڈل ہی لے جاسکے۔ وہ گاہک اس سامان کی کوالٹی دیکھ کر بہت خوش ہوا اور اس نے ہمیں اس کی اچھی قیمت ادا کی۔ شاید وہ دونوں چور بھی ہمیں اتنے پیسے نہ دیتے بشرطیکہ وہ دیانت دار ہوتے لیکن ان کی نیت خراب تھی اور وہ سارا مال ہڑپ کرنا چاہ رہے تھے۔ لگتا ہے کہ اب ہر کوئی دھوکا دے رہا ہے۔

میں نے اپنے پیچھے قدموں کی آواز سنی اور پلٹ کر دیکھا۔ برنارٹ سڑک پار کر کے آرہا تھا۔ میں نے دروازے کا کنڈا اپنی جگہ پر لگایا اور اس میں اسکروفکس کردیے۔ برنارٹ نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ میں کھڑا ہوگیا اور لوہے کی سلاخ دوبارہ اپنی پیٹی میں اڑس لی۔ کیا پتا کب اس کی ضرورت پیش آجائے۔

''سب ٹھیک ہے؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور مجھے تازہ روٹی اور بھنے ہوئے گوشت کا ایک ٹکڑا پکڑا دیا۔ میں نے بڑی خوشی سے اسے کھانا شروع کیا اور سڑک کی دوسری جانب چل دیے کیونکہ ہم نہیں چاہتے تھے کہ درزی یا پولیس والوں سے ہمارا سامنا ہو۔ مجھے درزی سے کوئی انعام ملنے کی بالکل بھی توقع نہیں تھی لیکن یہ امید ضرور تھی کہ وہ پولیس والوں کی مدد سے گیون اور زخمی چہرے والے کو پکڑ کر اپنا بقیہ سامان حاصل کرلے گا۔

جہاں تک مدد کرنے کا تعلق ہے، جو زخمی چہرے والے نے شروع میں مجھے پیشکش کی تھی تو اس کی حقیقت بھی بہت جلد سامنے آگئی، جب ان دونوں چوروں نے مجھے اور برنارٹ کو راستے سے ہٹانے اور ساری آمدنی خود ہڑپ کرنے کے لیے کھانے پر بھیجا تھا۔ میں اسی وقت سمجھ گیا تھا کہ زخمی چہرے والے کی پیشکش ایک دھوکا تھی۔ پھر مجھے ایک پادری کی بات یاد آگئی جس نے کہا تھا کہ خدا بھی ان کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد آپ کرتے ہیں۔ یہی بات میں نے اس رات برنارٹ کو سمجھانے کی کوشش کی تو اس نے سوالات کی بوچھاڑ کردی اور مجھے ہاتھ کے اشارے سے اسے روکنا پڑا۔

بہرحال اپنی مدد آپ پر عمل کرنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ چوری کے مال کی ساری آمدنی ہمارے حصے میں آگئی۔ اب برنارٹ میرا مستقل پارٹنر ہے اور ہم کئی کامیاب وارداتیں کر چکے ہیں۔ میں زخمی چہرے والے کا شکر گزار ہوں جس نے دھوکا کر کے ہمیں ایک نئے راستے پر لگا دیا۔

⌘⌘⌘

www.pklibrary.com

حاصل

کبیر عباسی

دنیا میں اگر کوئی انتہائی عجیب و غریب چیز ہے تو وہ ہے انسان کی فطرت... جو کبھی حیران کرتی ہے اور کبھی پریشان... اور جو کبھی مکمل طور پر کسی کی سمجھ میں نہ آسکی... اس تحریر میں بھی انسانی فطرت کی قلابازیوں کو زیرِ قلم لایا گیا ہے۔ اسی بے ثبات زندگی کی چاہ نے حضرتِ انسان کو کس کس مقام پر رسوا کیا اگر اس کا ادراک صحیح معنوں میں ہوجائے تو مختلف النوع کے تماشے ہونا بند اور تماشا گر خاک چاٹنے پر مجبور ہوجائیں... انسان زندگی بھر غلطیاں کرتا ہے اور انہی غلطیوں میں زندگی کی خوبصورتی تلاش کرتا رہتا ہے لیکن کیا... غلطی کرکے اچھے کی امید رکھنا عجب نہیں؟ بس یہی انسانی فطرت ہے اور پچھتانے کا یہ انداز بھی خوب ہے۔ "کاش زندگی میں ریورس گئیر" ہوتا... زندگی کوئی فلم نہیں جسے ریوائنڈ کرکے تمام غلطیوں کی کاٹ چھانٹ کرلی جائے... زندگی تو ایک عجائب خانہ ہے جہاں حیرتوں کے شاہکار اور بے شمار آزار قدم قدم پر اس کے منتظر رہتے ہیں۔

شکر کی نعمت سے بیزار رہنے والے چند عاقبت نااندیشوں کی عبرت اثر داستان

www.pklibrary.com

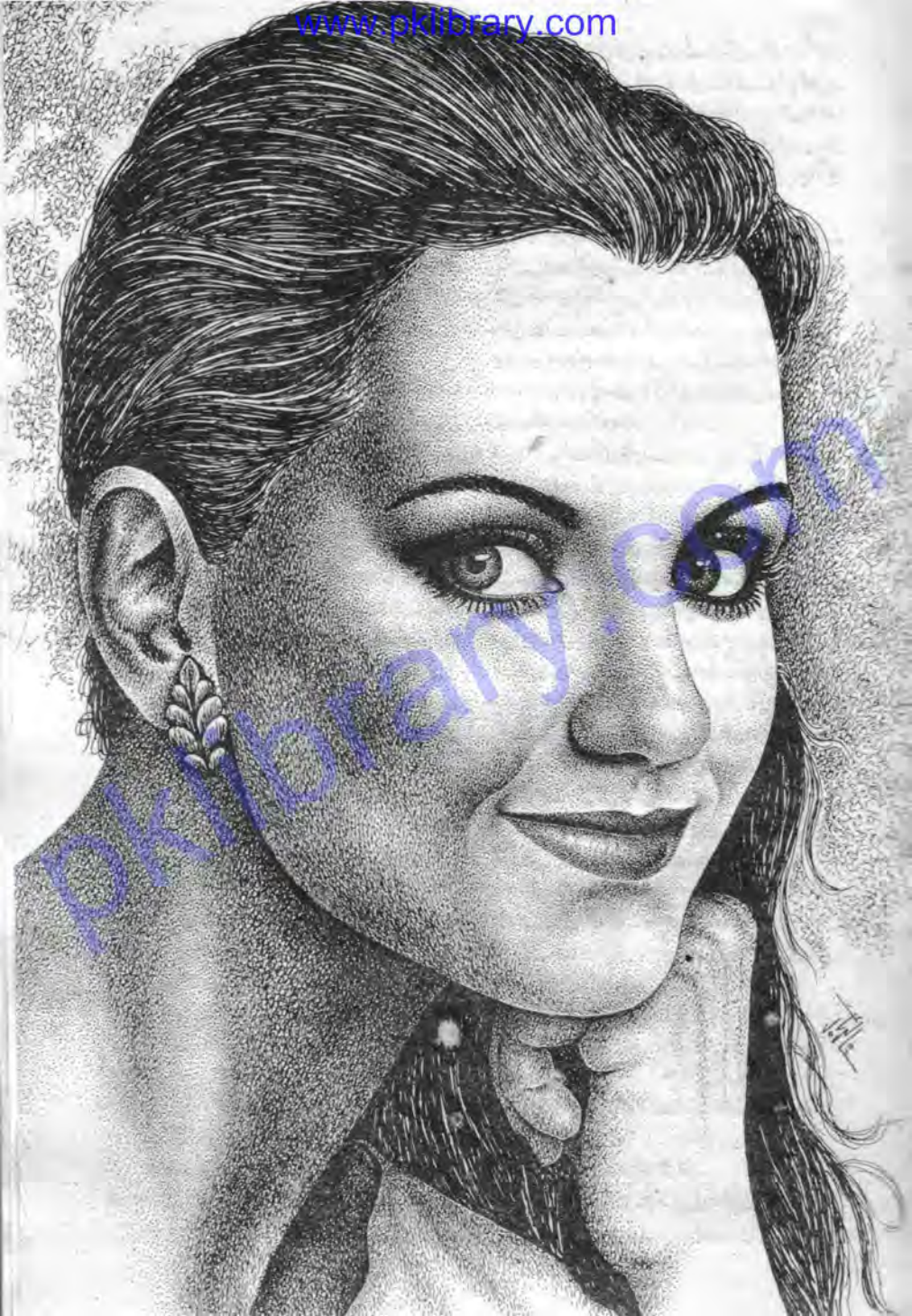

www.pklibrary.com

میں دھند کے مرغولوں کی طرح آسمان میں اڑ رہا تھا، بالکل بے وزنی کی کیفیت میں۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ ایسی کیفیت خلا میں ہوتی ہے جہاں کششِ ثقل موجود نہیں ہوتی، تو کیا میں خلا میں آ چکا تھا؟

یہ خیال ذہن میں آتے ہی میں نے پنجے جھاڑے۔ میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ زمین بہت دور نظر آ رہی تھی۔ مکانات، درخت سب بہت چھوٹے چھوٹے دکھائی دے رہے تھے اور میں حقیر ذرّے کی طرح بے کراں آسمان کی وسعتوں میں ہچکولے کھا رہا تھا۔ میں نے خوف سے آنکھیں بند کر لیں۔ دل کی دھڑکن مجھے اپنی کنپٹیوں میں سنائی دے رہی تھی۔

میں نے اپنے چہرے کا رخ اوپر کی طرف کیا اور ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھول دیں۔ اب جیسے میں فضا میں بغیر کسی سہارے کے چت لیٹا آسمان کو دیکھ رہا تھا۔ دور بادل تیر رہے تھے۔ ان بادلوں کے بیچ سے کہیں کہیں نیلا آسمان جھانک رہا تھا۔ میری ڈھارس بندھی، اب خوف کی جگہ ایک انوکھے انبساط نے لے لی تھی۔ میں اس کیفیت سے ابھی پوری طرح لطف اندوز بھی نہیں ہوا تھا کہ اچانک جیسے ہوا کے جھکڑ چلنے لگے۔ ہوا نے مجھے ایک طرف اچھال دیا۔ اب میں تیزی سے ایک ہی سمت میں حرکت کر رہا تھا۔ میں نے ایک بار پھر گھبرا کر آنکھیں بند کر لیں۔ ہواؤں کی آواز میرے کانوں میں سیٹیاں بجانے لگی۔ خوف کے باعث میرا دل کسی زرد پتے کی طرح لرز رہا تھا۔ میں چیخنا چاہتا تھا مگر میرے گلے سے گھٹی گھٹی سی آواز نکل رہی تھی۔

میں نے ڈرتے ڈرتے آنکھ کی جھری بنائی۔ میرا دل ڈوب گیا۔ اب میرے چاروں اطراف اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے میں کسی اندھیری سرنگ میں تیزی سے حرکت کرتا جا رہا ہوں۔

''یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟'' میرے خوفزدہ ذہن میں خیال آیا، مگر ذہن اس سوال کا کوئی بھی جواب دینے سے قاصر تھا۔ اچانک دور سرنگ کے کنارے پر مجھے روشنی کی ہلکی سے رمق نظر آنے لگی۔ ''یہی..... ہاں یہی ہے میری منزل۔'' بے اختیار مجھے خیال آیا۔ یکدم میں خود کو ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا تھا۔

میری آنکھ کھلی تو میرے احساسات انتہائی عجیب سے ہو رہے تھے۔ اس طرح کا خواب میں اکثر دیکھا کرتا تھا۔ میں آسمان میں اڑ رہا ہوتا تھا، لطف کے ساتھ خوف بھی آتا تھا۔ جب میری آنکھ کھلتی تو کتنی ہی دیر میں خواب کے زیرِ اثر رہتا تھا لیکن آج کی کیفیت کچھ الگ سی تھی۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے میں صدیوں کا سفر طے کر کے آیا ہوں۔ کمرے میں ملگجا سا اندھیرا چھایا ہوا تھا اور ایسا ہی اندھیرا مجھے اپنے دماغ میں بھی محسوس ہو رہا تھا۔ میں کتنی ہی دیر خالی ذہن کے ساتھ چھت کو گھورتا رہا، اچانک میری نظر دیوار گیر گھڑی پر پڑی۔ صبح کے سات بج رہے تھے۔

''آج تو اتوار ہے۔'' یہ خیال آتے ہی میں نے آنکھیں موند لیں۔ میں پھر سے سونے کی کوشش کرنے لگا لیکن نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ میں نے دھیرے سے گردن گھما کر ساتھ والی چارپائی پر دیکھا۔ یہاں میری بیوی، ہماری ایک سالہ بچی کے ساتھ سوتی تھی مگر اس وقت چارپائی سونی پڑی تھی۔ اسامہ میرے ساتھ سوتا تھا۔ وہ بھی موجود نہیں تھا۔

''یہ سب صبح سویرے کہاں چلے گئے؟'' بیوی اور بچوں کا خیال آتے ہی میرے ذہن میں رات کے واقعات گھومنے لگے۔

رات کو میرا، اپنی بیوی سے زوردار قسم کا جھگڑا ہوا تھا۔ بچے بھی ہمیں لڑتے دیکھ کر سہم گئے تھے۔ ان کی سہمی ہوئی شکلیں دیکھ کر میں تو چپ ہو گیا تھا مگر وہ کتنی ہی دیر روتی رہی تھی۔ اس کی سسکیاں سنتے ہوئے میرا دماغ کھول رہا تھا۔ میں اپنی توجہ ہٹانے کے لیے اسامہ کو کہانی سنانے لگا۔ وہ تو کچھ ہی دیر میں سو گیا تھا مگر میری بیوی ابھی تک رو رہی تھی۔ میرا دل غم سے بوجھل ہو رہا تھا۔ میں سونے کی کوشش کر رہا تھا مگر اس کی سسکیاں جیسے میرے کانوں کے پردے پھاڑ رہی تھیں۔ میں اٹھا تھا اور.....

اچانک مجھے کچن میں کسی برتن کے گرنے کی آواز آئی۔ میں چونک کر اپنے خیالات سے باہر آیا۔

'وہ ناشتا بنا رہی ہوگی۔' سوچتے ہوئے میں باہر نکلا۔ چلتے ہوئے بھی مجھے عجیب سا احساس ہو رہا تھا مگر میرا ماؤف ذہن اس احساس کو کوئی نام دینے سے قاصر تھا۔ کچن میں کوئی خاتون چولہے کی طرف رخ موڑے کھڑی تھی۔

'یہ کون ہے؟' میں نے حیرانی سے سوچا۔ معاً اس خاتون نے اپنا رخ میری طرف موڑا۔ حیرت کا جھٹکا اتنا شدید تھا کہ میں اپنی جگہ پر کھڑا نہیں رہ پایا۔ میں دھڑام سے نیچے گرا، میرا سر دیوار سے ٹکرایا اور میں ہوش و حواس سے بیگانہ ہو گیا۔

☆☆☆

میرا نام ذیشان ہے۔ میری زندگی ناکامیوں اور

www.pklibrary.com

حسرتوں سے عبارت ہے اور افسوس کی بات یہ ہے کہ ان ناکامیوں کی پہلی اینٹ..... بلکہ شاید ہر اینٹ میرے اپنے ہی ہاتھ سے رکھی گئی۔

میں نے ایک خوشحال گھرانے میں آنکھ کھولی تھی۔ ابو کا جنرل اسٹور تھا۔ ہمارا شمار دولتمند نہ سہی کھاتے پیتے گھرانوں میں ہوتا تھا۔ میں اپنے والدین کی اکلوتی نرینہ اولاد تھا۔ میری دو بہنیں تھیں۔ سائرہ مجھ سے بڑی تھی اور نوشین چھوٹی۔ میں میٹرک..... میں تھا، سائرہ فرسٹ ایئر میں جبکہ نوشین کلاس ہفتم میں تھی۔ ہم خوشیوں کے ہنڈولے میں جھول رہے تھے کہ اچانک میری ایک غلطی سے ہماری زندگی تہ و بالا ہو گئی۔

ابو کو کوئی کام پڑتا تھا تو وہ مجھے دکان پر بٹھا جاتے تھے۔ اس دن بھی ابو فوتگی پر گئے ہوئے تھے اور مجھے دکان پر بٹھا گئے تھے۔ دکان کے پچھلے حصے میں گودام بنا ہوا تھا جسے ایک پارٹیشن سے الگ کیا گیا تھا۔ میں گودام سے کوئی چیز اٹھانے گیا۔ بجلی گئی ہوئی تھی۔ گودام میں اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ میں نے موم بتی جلا کر لکڑی کی ایک سگر پر ٹکائی اور سامان اٹھا کے باہر آ گیا۔ باہر گاہکوں کو نمٹاتے مجھے موم بتی بجھانے کا خیال ہی نہیں آیا اور یہ میری بہت بڑی غلطی تھی۔ شاید زندگی کی سب سے بڑی غلطی۔

موم بتی گری اور گودام میں رکھے سامان نے آگ پکڑ لی۔ گھی اور کوکنگ آئل کو لگنے والی آگ اتنی تیزی سے بھڑکی کہ چند لمحوں میں پوری دکان لپیٹ میں آ گئی۔ شعلوں کی تپش اتنی زیادہ تھی کہ میں چیختا ہوا باہر بھاگا۔ اس ناگہانی سے میرا دماغ ایسا ماؤف ہوا تھا کہ گلے میں رکھا کیش تک مجھے نکالنے کا خیال نہ آیا۔

دکان کے آگے لوگوں کا جم غفیر جمع ہو چکا تھا۔ انہی میں سے کسی نے فائر بریگیڈ کو بھی کال کر دی۔ کچھ لوگ ادھر ادھر سے پانی لا کے آگ بجھانے کی کوشش کرنے لگے مگر سب بے سود..... فائر بریگیڈ کے پہنچنے سے قبل ہی پوری دکان جل کے خاکستر ہو گئی۔ میں دھواں دھواں چہرے کے ساتھ اپنی دکان کو جلتا دیکھتا رہ گیا۔ لوگوں کے چیخنے چلانے کی آوازیں مجھے بہت دور سے آتی سنائی دے رہی تھیں۔

فائر بریگیڈ کی گاڑی پہنچی اور وہ لوگ آگ بجھانے میں مصروف ہو گئے۔ انہوں نے جلد ہی آگ پر قابو پا لیا۔ اردگرد کی دکانیں تو آگ سے محفوظ رہیں مگر ہماری دکان میں کچھ بھی باقی نہ بچا۔

میں سکتہ زدہ ادھر ہی کھڑا تھا جب میں نے ابو کو بھاگے ہوئے آتے دیکھا۔ دکان کی حالت دیکھتے ہی ان کا رنگ فق ہو گیا۔ میں نے دھیرے سے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ میری آنکھوں میں آنسو لرز رہے تھے۔

''کیسے ہوا یہ سب؟'' ان کی سرسراتی ہوئی آواز مجھے بہت دور سے آتی محسوس ہوئی۔

''یہ..... یہ سب میری غلطی سے ہوا۔'' میں گھٹی گھٹی آواز میں بولا۔ تفصیل سن کے ان کی نظروں میں مجھے اپنے لیے غیظ و غضب کی جھلک دکھائی دی، تاہم انہوں نے خود پر قابو پا لیا۔

دکان میں دو لاکھ کے قریب کیش موجود تھا، جو انہوں نے ادائیگی کے لیے رکھا تھا۔ دکان کے ساتھ وہ بھی جل کے خاک ہو گیا تھا۔ ابو اس حادثے سے بالکل ڈھے کے رہ گئے۔

جو جمع پونجی تھی وہ ادائیگیوں کی نذر ہو گئی۔ دکان کرائے کی تھی، ویسے بھی اب ہمارے پاس اتنا کچھ بچا ہی نہیں تھا کہ ابو دوبارہ سے اپنی دکان کھولنے کا سوچتے۔ امی نے انہیں قرض لے کے نئی دکان کھولنے کا کہا مگر وہ نہ مانے۔ وہ ایک اور جنرل اسٹور پر سیلز مین کے طور پر کام کرنے لگے۔ تنخواہ معمولی سی تھی، جس سے بہ مشکل سہی مگر گزر بسر ہونے لگی۔

تقدیر کی ستم ظریفی سے ہم چند دن میں ہی عرش سے فرش پر آ گئے تھے۔ ابو نے کبھی مجھے کچھ کہا تو نہیں تھا تاہم ان کے رویے میں واضح فرق آ چکا تھا۔ اب وہ پہلے کی طرح مجھ سے بات نہیں کرتے تھے۔ وہ جب بھی مجھے دیکھتے تو مجھے ان کی نظروں میں اپنے لیے تنفر نظر آتا۔ مجھے لگتا تھا کہ وہ اس سانحے کا ذمے دار مجھے ہی سمجھتے ہیں۔ امی اور بہنیں بھی بالکل بجھ کے رہ گئی تھیں۔ میری بڑی بہن سائرہ فرسٹ ایئر میں پڑھ رہی تھی۔ وہ گورنمنٹ کالج میں تھی، وہاں فیس تو زیادہ نہیں تھی مگر وین کا کرایہ دینا بھی مشکل ہو گیا۔ ابو نے اس سے کالج چھڑوا دیا۔ اسے پڑھائی کا شوق تھا مگر حالات کے آگے ہم سب بے بس تھے، سو اس نے بھی صبر کر لیا۔

میں اور نوشین ایک ہی اسکول میں زیر تعلیم تھے۔ ہم سرکاری اسکول میں پڑھ رہے تھے۔ ان دنوں ویسے بھی پرائیویٹ اسکول اتنے عام نہیں تھے۔ ہمارا اسکول قریب ہی تھا۔ ہم پیدل ہی اسکول چلے جاتے۔ میں نے خود کو پڑھائی میں مگن کر لیا۔ میں پڑھائی میں اوسط درجے کا طالبعلم تھا مگر اس سانحے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ اب پڑھائی ہی وہ واحد راستہ ہے جس پر چل کے ہم اپنے گزرے دنوں کو واپس لا سکتے ہیں۔ گھر کے حالات جیسے بھی

www.pklibrary.com

تھے ابو نے ان سے سمجھوتا کرلیا تھا۔ حالات کو بہتر کرنے کا جذبہ ان میں رہا ہی نہیں تھا۔ انہوں نے سیلز مین کی نوکری پر ہی اکتفا کرلیا تھا۔

ہمارے اسکول میں پڑھائی گزارے لائق ہی تھی۔ انگلش اور میتھ کا تو پیریڈ ہی کم کم لگتا تھا۔ انگلش کا ٹیچر کبھی آتا بھی تو رٹنے کے لیے کام دے دیتا۔ میتھ کا ٹیچر بھی بس بورڈ پر سوال لکھ دیتا۔ باقی سائنس کے مضامین کے پیریڈز تو باقاعدگی سے ہوتے تھے مگر وہ مضامین بھی انگلش میں ہونے کی وجہ سے رٹے ہی مارنے پڑتے کیونکہ میری انگلش بہت کمزور تھی۔ اس سے قبل میں امتحانات کے دنوں میں ٹیوشن پڑھ کے پاس ہوجاتا تھا مگر اب تو ٹیوشن پڑھنا بھی ممکن نہیں تھا۔ خیر میں نے کچھ بڑی بہن سے، کچھ کلاس فیلوز سے اور کچھ مثالیں دیکھ دیکھ کے میتھ سمجھنا شروع کیا۔ رٹے سے میری جان جاتی تھی مگر اس کے بغیر چارہ نہ تھا۔ میں نے دن رات کی محنت کے بعد پیپرز دیے۔ میں مطمئن تھا کہ بہ آسانی اچھے گریڈ میں پاس ہوجاؤں گا۔

پیپرز کے بعد میرے ایک دوست نے کمپیوٹر سینٹر میں داخلہ لے لیا۔ اس نے مجھے بھی کہا۔ میں نے ابو سے بات کی تو وہ یک ٹک مجھے دیکھتے رہ گئے۔

''تمہیں گھر کے حالات پتا ہیں نا۔'' وہ جیسے اپنا غصہ بمشکل کنٹرول کرتے ہوئے بولے تھے۔ ''اب بڑے ہو گئے ہو تم۔ میرا ہاتھ بٹاؤ۔ میں تمہیں کسی دکان پر سیلز مین رکھوا دیتا ہوں۔''

''ابو! بس دو گھنٹے کی کلاس ہوتی ہے۔'' میں گھگیایا۔ ''میں دکان پر بھی کام کرلوں گا۔ بس مجھے داخلہ دلوا دیں۔'' ابو سوچ میں پڑ گئے۔ انہیں سوچ میں پڑے دیکھ کر میرا حوصلہ بڑھا۔

''ابو! آج کل کمپیوٹر کی بہت مانگ ہے۔ میں نے کورس کرلیا تو کسی اچھی جگہ نوکری مل جائے گی۔''

''ہوں ..... یہ بات اپنی جگہ درست ہے۔'' انہوں نے پُرسوچ انداز میں کہا تو میرے چہرے پر خوشی کے تاثرات پھیل گئے۔

میں صبح ایک جنرل اسٹور پر جانے لگا۔ کمپیوٹر کی کلاس میں، میں نے شام سات بجے کا ٹائم رکھا۔ دکان سے چھٹی کرکے میں سیدھا ادھر جاتا۔ شروع میں ٹائپنگ سکھائی جا رہی تھی۔ مجھے یہ کام اتنا پُرلطف لگا کہ دو کے بجائے تین تین گھنٹے مشق کرتا رہتا۔ چند دن میں ہی میں نے مکمل کی بورڈ پر پچاس الفاظ فی منٹ سے بھی زیادہ کی رفتار سے ٹائپنگ شروع کردی۔ کمپیوٹر سینٹر پر کمپوزنگ کا کام بھی آتا رہتا تھا۔ میرے ٹیچر نے میری رفتار دیکھ کر مجھ سے کمپوزنگ کرانا بھی شروع کردی۔ وہ مجھے کچھ ادائیگی بھی کر دیتا تھا۔ ونڈوز، مائیکروسافٹ آفس اور چند دوسرے پروگرامز میں نے بہت تیزی سے سیکھ لیے۔ کمپیوٹر میں میری دلچسپی دیکھتے ہوئے میرے ٹیچر نے مجھے مشورہ دیا کہ میں آگے آئی سی ایس کرلوں۔

''مشورہ تو آپ کا اچھا ہے مگر مجھ پر گھر کی ذمے داری بھی ہے۔ میں شاید آگے تعلیم جاری نہ رکھ پاؤں۔'' میں نے افسردگی سے کہا تھا۔

''تم کالج کے بعد میرے پاس آجانا۔ یہاں لڑکوں کو کمپیوٹر سکھانا، کمپوزنگ کرنا۔ دکان پر جتنا تمہیں ملتا ہے اس سے زیادہ ہی میں تمہیں دے دوں گا۔'' اس نے کچھ سوچ کے کہا۔

''چلیں، رزلٹ تو آنے دیں پھر سوچتے ہیں۔''

جس رات خبرنامے میں بورڈ کے رزلٹ کا اعلان کیا گیا، میں پوری رات سو نہیں پایا تھا۔ ان دنوں اخبار میں رزلٹ آیا کرتا تھا۔ میں نے نہم اور دہم کا اکٹھا امتحان دیا تھا۔ میں فجر کی نماز کے بعد ہی اخبارات کے اسٹال پر جا کے کھڑا ہوگیا تھا۔ آخر خدا خدا کر کے اخبار والا آیا۔ اس سے اخبار لے کر میں لرزتے ہاتھوں سے اپنا رزلٹ چیک کرنے لگا۔ میرا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ اپنا رول نمبر دیکھتے ہی میرے دل کی دھڑکن جیسے ساکت ہوگئی۔ میں پاس ہوگیا تھا مگر میرے نمبر میری توقع سے بہت کم تھے۔ میں فرسٹ ڈویژن لینے میں بس ایک نمبر سے رہ گیا تھا۔ میں خوشی اور دکھ کی ملی جلی کیفیت میں گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔

رات کو ابو گھر آئے تو میں نے انہیں اپنا رزلٹ دکھایا۔ انہوں نے رسمی سے انداز میں مبارکباد دی۔ ان کا انداز دیکھ کے میرا دل کٹا۔ کچھ دیر ہمت یکجا کرنے کے بعد میں بولا۔

''ابو! میں آگے پڑھنا چاہتا ہوں۔''

انہوں نے غصیلے سے انداز میں میری طرف دیکھا۔

''تمہیں گھر کی کوئی فکر ہے؟'' ان کا لہجہ سرد تھا۔

''بہنیں تمہاری جوان ہوچکی ہیں۔ ان کی شادیاں کیا مجھ اکیلے کی کمائی سے ممکن ہیں؟''

''ابو! میں ساتھ جاب بھی کرلوں گا۔ اپنی پڑھائی کا خرچ بھی خود اٹھاؤں گا اور گھر میں بھی کچھ رقم دے دیا کروں گا۔'' میں بہ مشکل دھیرے سے بولا تھا۔

www.pklibrary.com

''جو دل چاہے کرو، بس مجھ سے اب ایک روپیا بھی مت مانگنا۔'' انہوں نے غصے سے کہا تھا۔ میرا دل بجھ گیا۔ یہی بات وہ آرام سے بھی کہہ سکتے تھے مگر حالات نے انہیں اس قدر چڑچڑا کر دیا تھا کہ وہ بات بات پر ہم بہن بھائیوں کو جھڑک کے رکھ دیتے تھے۔

میں نے کالجز کے چکر لگانا شروع کر دیے۔ میں آگے آئی سی ایس کرنا چاہ رہا تھا مگر تمام گورنمنٹ کالجز میں آئی سی ایس کا میرٹ بہت ہائی تھا۔ میں نے اپنے کمپیوٹر ٹیچر کو بتایا تو وہ ہنس دیے۔ ''صبر کرو بھئی۔ شروع میں ایسا ہی رکھتے ہیں، میرٹ بعد میں کم ہو جائے گا۔'' مجھے تسلی ہوئی۔ میں نے تین کالجز میں فارمز جمع کرا دیے۔ پہلی لسٹ کے بعد میرٹ کم ہوا تھا مگر فرسٹ ڈویژن سے کم میرٹ نہ آئی سی ایس کا ہوا تھا نہ ایف ایس سی کا۔ میں صرف ایک نمبر سے آئی سی ایس میں داخلہ لینے سے رہ گیا تھا۔ پرائیویٹ کالجز میں میرٹ کم تھا وہاں داخلہ ممکن تھا مگر میں فیس افورڈ نہیں کر سکتا تھا۔

میں نے ٹیچر سے مشورہ کیا تو وہ بولے۔ ''فی الحال ایف اے میں داخلہ لے لو، کمپیوٹر سائنس میں ماسٹرز تو بی اے کے بعد بھی ہو سکتا ہے۔''

میں نے ان کے مشورے کے بعد ایف اے میں داخلہ لے لیا۔ اب میں کالج کے بعد کمپیوٹر سینٹر آ جاتا۔ وہاں سے رات گیارہ بجے ہی گھر پہنچتا۔ میرے دوست زندگی سے خوب لطف اندوز ہو رہے تھے مگر میری زندگی بہت مصروف ہو گئی تھی۔ میں پھر بھی مطمئن تھا۔ شاید اسی طرح میری غلطی کی تلافی ہو سکتی تھی۔

موسم آتے جاتے رہے مگر میں ان سے بے خبر محنت میں لگا رہا۔ جاب کی وجہ سے مجھے پڑھائی کا بہت کم وقت ملتا تھا۔ فرسٹ ائیر کے پیپرز نزدیک آئے تو میں نے جاب سے چھٹی لے لی مگر اس کے باوجود میری انگلش کی سپلی آ گئی۔ سیکنڈ ائیر میں، میں نے زیادہ محنت کی مگر بہ مشکل ہی پاس ہو سکا۔ میں پڑھائی سے کافی حد تک دلبرداشتہ ہو چکا تھا مگر میرے ٹیچر نے کہا کہ ایف اے پاس کو معمولی نوکری ہی مل سکتی ہے۔ ساری زندگی کی خواری سے بہتر ہے کہ چند سال محنت کر کے ماسٹرز کر لیا جائے۔ کمپیوٹر سائنس میں ماسٹرز کرنے سے میرے دن پھر سکتے ہیں۔

میں نے ایک بار پھر ان کے مشورے سے بی اے میں داخلہ لے لیا۔ بی اے کی انگلش تو مزید مشکل تھی۔ بھرپور محنت کے باوجود میں بی اے میں فیل ہو گیا۔ انہی دنوں میری بہن کا رشتہ طے پا گیا۔ وہ لوگ جلد شادی کرنا چاہ رہے تھے مگر ہمارے پلے کچھ تھا ہی نہیں۔ رشتہ مناسب تھا، ابو نے ان کی ضد کے آگے ہتھیار ڈال دیے۔ انہوں نے چند جاننے والوں سے قرض پکڑا اور بہن کی شادی کرا دی۔ اب وہ قرض مجھے ہی ادا کرنا تھا۔ میں بی اے بھول کے کسی بہتر نوکری کی تلاش میں لگ گیا۔ جلد ہی مجھے ایک پرائیویٹ کمپنی میں کمپیوٹر آپریٹر کی نوکری مل گئی۔ تنخواہ کم ہی تھی مگر اس سے زیادہ کی میں کہیں توقع رکھ بھی نہیں سکتا تھا۔ اب میں شام پانچ بجے چھٹی کر کے کمپیوٹر سینٹر آتا تھا۔

قرض ابھی پورا اترا ہی نہیں تھا کہ ابو کا ایک حادثے میں انتقال ہو گیا۔ گھر کی ساری ذمے داری یکدم میرے ناتواں کندھوں پر آن پڑی۔ ابو کی موت کا امی نے بہت زیادہ اثر لیا۔ ان کا بی پی ہائی رہنے لگا۔ دو، تین بار چیک اپ کرایا تو ڈاکٹر نے کہا کہ انہیں بی پی کی گولی باقاعدگی سے لینی ہو گی مگر میں نے ڈاکٹر کے مشورے کو زیادہ سنجیدہ نہیں لیا۔ ویسے بھی مجھے قرض اتارنے کی فکر ہر دم ہلکان کیے رکھتی تھی۔ قرض خواہ جہاں ملتے واپسی کا تقاضا کرتے۔ اب تو ابو کا سہارا بھی نہیں رہا تھا۔ میں پیسا پیسا جوڑ کے قرضے کی قسط دیا کرتا۔ میرا خیال تھا کہ میں امی کی دوا نہ لے کے پیسے بچا رہا ہوں مگر میں یہ نہیں جانتا تھا کہ میں کتنی بڑی کوتاہی کر رہا ہوں۔

اس دن میں کمپیوٹر سینٹر میں تھا، جب میری بہن بھاگتی ہوئی آئی۔ اس کا اڑا ہوا رنگ دیکھ کے میرے بھی اوسان خطا ہو گئے۔ مجھے دیکھتے ہی وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ''بھائی، امی کو کچھ ہو گیا ہے۔ ان سے ہلا ہی نہیں جا رہا۔'' میں اس کے ساتھ گھر گیا۔ امی کو دیکھتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ ان پر فالج کا حملہ ہوا ہے۔ وہ بول رہی تھیں مگر ان کی بائیں سائڈ مکمل طور پر مفلوج تھی۔ ایک ٹیکسی منگوا کے میں انہیں اسپتال لے کر گیا۔ سی ٹی اسکین کی بھاری بھرکم فیس کی ادائیگی کے بعد ڈاکٹرز نے فالج کی وجہ بتائی۔ ان کے دماغ کی طرف جانے والی ایک شریان بی پی ہائی ہونے کی وجہ سے پھٹ گئی تھی جس کی وجہ سے ان پر فالج کا اٹیک ہوا تھا۔ مجھے اپنی غفلت کا احساس ہوا مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔

اسپتال میں کسی وارڈ میں کوئی بیڈ خالی ہی نہیں تھا۔ ڈاکٹر نے دوائیں لکھ کے ہمیں گھر بھیج دیا۔ میں نے قرض کی قسط کی ادائیگی کے لیے جو پیسے جمع کیے تھے وہ ایک ہی چکر میں خرچ ہو گئے۔

ناگہانیوں نے جیسے ہمارے گھر کا راستہ ہی دیکھ لیا تھا۔ پہلے ابو گئے اور اب امی معذور ہو گئی تھیں۔ امی کی

www.pklibrary.com

تکلیف اور چھوٹی بہن کی ویران آنکھیں مجھ سے دیکھی نہیں جا رہی تھیں۔ اس دن گھر جا کے میں خوب رویا۔ میں آج تک اپنی اس غلطی کو کوس رہا تھا جس کی وجہ سے ہماری زندگیوں کا رخ تبدیل ہو گیا تھا۔ میرے دل میں شدت سے خواہش ابھری کہ کاش وقت پھر پیچھے جائے اور میں موم بتی بجھا دوں۔ نہ ہماری دکان جلے اور نہ ہماری زندگی مشکلات کا شکار ہو۔

مسلسل دواؤں کے استعمال اور ورزش سے ایک ماہ میں امی کی حالت میں محض اسی حد تک بہتری آ سکی کہ وہ سہارے سے چند قدم چل لیتیں۔ نوشین بساط بھر ان کا خیال رکھ رہی تھی۔ میں ان کے لیے وقت نکالنے کی کوشش کرتا مگر میرے پاس وقت تھا ہی کہاں۔ انہیں وقت دیتا تو قرض خواہ جان کو آ جاتے۔

انہی دنوں میرے ایک پڑوسی رمضان نے مجھے ایک اشتہار دکھایا۔ یہ محکمۂ تعلیم میں درجہ چہارم کی نوکریوں کا اشتہار تھا۔ اشتہار دیکھ کے میں نے بمشکل ناگواری چھپاتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''یہ مجھے کیوں دکھا رہے ہیں؟''

''تم یہاں اپلائی کرو۔ کب تک پرائیویٹ نوکری میں دھکے کھاتے رہو گے۔ سرکاری نوکری ہے، اچھی تنخواہ ہے، پنشن بھی ملے گی۔ تمہارا مستقبل بن جائے گا۔''

''میں اتنا پڑھ لکھ کے اب یہ درجۂ چہارم کی نوکری کروں گا؟'' نہ چاہتے ہوئے بھی میری آواز بھرائی۔

اس نے ہمدردی سے مجھے دیکھا۔ ''میں تمہاری بھلائی کے لیے ہی کہہ رہا ہوں۔ ابھی کون ساتم افسر لگے ہوئے ہو۔ یہ آدھے دن کی نوکری ہے۔ شام کو تم پارٹ ٹائم کام بھی کر سکتے ہو اور سب سے بڑی بات میڈیکل بھی فری ہو گا۔ تم اپنی ماں کا علاج بھی کرا سکتے ہو۔''

اس کی یہ بات میرے دل کو لگی مگر میں اب بھی تذبذب کا شکار تھا۔ وہ مجھے سوچ میں پڑا دیکھ کے بولا۔

''تمہارے گھر کے حالات میرے سامنے ہیں۔ یہ نوکری تمہارے بہت سے مسائل حل کر دے گی۔ یہ نوکری بھی ایسے ہی نہیں مل جائے گی۔ سیکڑوں لوگ اس کے لیے اپلائی کریں گے اور بھرتی ہونے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور بھی لگائیں گے۔ تم اگر اپلائی کرو تو میں تمہاری ایم پی اے صاحب سے سفارش کرا دوں گا۔'' وہ مقامی ایم پی اے کے دفتر میں ملازم تھا۔

میں نے ٹھنڈی آہ بھری۔ ''ٹھیک ہے، میں اپلائی کر دیتا ہوں۔''

میں نے اس کے کہنے پر لیب اٹینڈنٹ کی نوکری کے لیے کاغذات جمع کرا دیے۔ ایک ماہ بعد انٹرویو ہوا۔ رمضان نے میری سفارش کرا دی تھی۔ کچھ ہی دن بعد مجھے اپائنٹ منٹ آرڈر مل گیا۔ لوگ مجھے مبارک بادیں دے رہے تھے مگر میں افسردہ تھا۔

میری نوکری اسی اسکول میں ہوئی تھی جہاں سے میں نے میٹرک کیا تھا۔ ابھی تک زیادہ تر وہی اساتذہ تھے، جن سے میں نے پڑھا تھا۔ استاد ہونے کی وجہ سے میں ان کا احترام کرتا تھا مگر ان کا رویہ میرے ساتھ حقارت آمیز ہی تھا۔ میری نوکری لیب اٹینڈنٹ کی تھی مگر وہ مجھ سے اپنے ذاتی کام کراتے رہتے۔ میں انہیں نہ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ درجۂ چہارم کے مزید چار ملازمین تھے جن میں سے ایک تو چوکیدار تھا، اس کی ڈیوٹی رات کو ہوتی تھی جبکہ باقی تین کی ڈیوٹی دن کو ہی ہوتی تھی۔ وہ تینوں مزے سے ادھر ادھر گھومتے رہتے۔ اساتذہ ان کو کم ہی کوئی کام بتاتے تھے۔ بتاتے بھی تو وہ اکثر ٹال ہی دیتے مگر مجھے وہ خوب لگنی کا ناچ نچاتے۔ اسکول کے بعد میں کمپیوٹر سینٹر جا رہا تھا۔ چند ماہ میں ہی میں قرض اتارنے میں کامیاب ہو گیا مگر مجھے سکون کا احساس نہیں ہوا تھا۔ عجیب بے حسی سی تھی جو میرے احساسات پر غالب آ گئی تھی۔ کوئی امنگ باقی ہی نہیں رہی تھی۔ شاید مشکلات ایسے ہی انسان کو اندر سے مار دیتی ہیں۔

اسکول میں سارا کلریکل کام کمپیوٹر پر ہوتا تھا جو آئی ٹی ٹیچر ہی کیا کرتا تھا کیونکہ کلرک کمپیوٹر سے نابلد تھا۔ ایک دن وہ ٹیچر رخصت پر تھا کہ ہیڈ ماسٹر کو ڈی ای او کی طرف سے کال آ گئی۔ وہ کوئی فائل ارجنٹ ای میل کرنے کا کہہ رہا تھا۔ اسکول میں باقی تمام ٹیچرز پرانے تھے جو کمپیوٹر جانتے ہی نہیں تھے۔ مجھ سے ہیڈ ماسٹر کی پریشانی دیکھی نہیں گئی۔ میں نے اسے پیشکش کی۔ ''سر! میں کمپیوٹر جانتا ہوں۔ آپ بتائیں کیا کام کرنا ہے، میں کر دیتا ہوں۔'' اس کی آنکھوں میں حیرت و خوشی کے تاثرات نمودار ہوئے۔ میں نے اس کے بتائے ہوئے کاغذات تیار کر کے میل کر دیے۔ اس کے بعد تو یہ کام بھی میرے ذمے پڑ گیا۔ ٹیچرز کمپیوٹر سے متعلق ذاتی کام بھی مجھ سے کرانے لگے۔ کسی کو پے سلپس کے پرنٹ چاہیے ہوتے تو کسی کو لیٹرز ٹائپ کرانے ہوتے۔ میں پورا دن ان کے کام کرتے کرتے ہلکان ہو جاتا مگر اس کے باوجود معمولی کوتاہی پر وہ مجھے جھاڑ کے رکھ دیتے۔ میں ان کے احترام میں نہ صرف ان کے کام کرنے پر مجبور تھا بلکہ

www.pklibrary.com

ان کی کڑوی کسیلی باتیں بھی سہتا۔

اساتذہ کی بے سپلس پر ان کی تنخواہ دیکھ کے میں حیران رہ جاتا۔ اکثر کی تنخواہ اتنی زیادہ تھی کہ مجھے یقین ہی نہ آیا جبکہ زائد تنخواہ لینے والے اساتذہ کی اکثریت نہ اچھی طرح پڑھانا جانتی تھی نہ وہ پڑھاتے تھے۔ ان سے تو اچھا میں پڑھا سکتا تھا مگر میں گویا ان کی جوتیاں سیدھی کرنے پر مامور تھا۔

کمپیوٹر ٹیچر نے کمپیوٹر کے ساتھ بی ایس سی ہی کیا ہوا تھا اور اس کی تنخواہ پچپن ہزار تھی۔ وہ نیا بھرتی ہوا تھا۔

میرے دل سے ہوک اٹھی۔ میں صرف ایک نمبر سے آئی سی ایس میں داخلہ لینے سے رہ گیا تھا۔ اگر مجھے آئی سی ایس میں داخلہ مل جاتا تو میں بہ آسانی بی ایس سی بھی کر لیتا۔ میں بی ایس سی کر لیتا تو آج اس کی جگہ میں تعینات ہوتا۔ میرے پچھتاووں میں ایک اور پچھتاوے کا اضافہ ہو گیا۔

میں دن رات خود کو کوستا رہتا کہ میں معمولی سی محنت مزید کر لیتا تو میرا ایک نمبر تو مزید آ ہی جاتا۔ کبھی کبھار میرے دل میں شدت سے خواہش ابھرتی کہ کاش کیا وقت پھر آ جائے اور میں اس بار فرسٹ ڈویژن لے لوں مگر گیا وقت کب واپس آیا ہے؟

اسکول کے ماحول سے مجھے آہستہ آہستہ شناسائی ہو رہی تھی۔ باقی ملازمین نے کمائی کے کئی راستے نکالے ہوئے تھے۔ کوئی بھی شخص کاغذات کی تصدیق کے لیے آتا تو اس سے پیسے وصول کر لیتے۔ اسکول میں مختلف تربیتی نشستیں، یونیورسٹی کی ورکشاپس و امتحانات وغیرہ ہوتے رہتے تھے۔ اسکول کے بعد باقی ملازمین ان لوگوں سے موبائل رکھنے کے پیسے، پارکنگ کے پیسے چارج کر لیتے۔ طلبا کو نقل کراتے۔ بعض اوقات تو وہ ''جوڑوں'' کو اسکول میں ملنے کی جگہ تک فراہم کرتے۔ میں جوں جوں جانتا جا رہا تھا میری کڑھن بڑھتی جا رہی تھی۔ میں خود تو یہ سارے کام کر نہیں سکتا تھا مگر ان کو کرتے دیکھ کر کڑھتا رہتا۔ میٹرک کے امتحانات آئے تو طلبا کو خوب نقل کرائی گئی۔ میں حیران تھا کہ ہمارے وقت میں تو ایسا بالکل نہیں تھا۔ اب تو بالکل ہی نالائق قسم کے طلبا بھی بغیر محنت کے فرسٹ ڈویژن لے رہے تھے، ایک میں تھا جو دن رات کی محنت کے بعد بھی ایک نمبر سے رہ گیا تھا۔

اس نوکری کے بعد میرے بہت سے مسائل حل ہو گئے تھے مگر میرا اطمینان رخصت ہو گیا تھا۔ اسکول کے حالات اور کولیگز کا رویہ دیکھ کر میں ہر وقت کڑھتا رہتا۔ انہی دنوں مجھے بی اے دوبارہ کرنے کا خیال آیا۔ میں نے ایک استاد سے بات کی تو انہوں نے بتایا کہ اس کے لیے مجھے محکمے کی طرف سے این او سی لینا پڑے گا، مگر اس میں ہیڈ ماسٹر کی رضامندی بھی ضروری ہوگی۔

میں نے ہیڈ ماسٹر سے بات کی تو اس نے عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھا۔ ''اچھی خاصی نوکری تمہیں ملی ہوئی ہے۔ پھر کیوں پڑھائی میں وقت اور پیسا ضائع کرنا چاہتے ہو؟''

مجھے اس کا سوال بے حد عجیب لگا۔ ''سر! میں اس نوکری سے مطمئن نہیں۔ گریجویشن ہو جائے تو ٹیچر بھی بھرتی ہو سکتا ہوں۔''

وہ طنزیہ سے انداز میں ہنسا۔ ''ٹیچر بھرتی ہونا اتنا آسان نہیں۔ اب تو کم سے کم ماسٹرز مانگتے ہیں۔ این ٹی ایس ہوتا ہے۔ ہزاروں لوگ اپلائی کرتے ہیں اور ان میں سے چند ہی بھرتی ہو پاتے ہیں۔''

''سر! آپ مجھے این او سی دلوا دیں۔ آگے میری قسمت۔''

اس نے ناگواری سے مجھے دیکھا۔ ''جب داخلے جا رہے ہوں گے تو بتانا۔''

میں ''او کے سر'' کہہ کے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس گفتگو سے میرا حوصلہ مزید پست ہو گیا تھا۔ ''تو کیا میں ساری زندگی درجۂ چہارم کی نوکری کرتے ہی گزار دوں گا؟'' یہ خیال آتے ہی میرا دل ڈوبنے لگتا مگر مجھے کوئی راہ بھی نہیں سجھائی دے رہی تھی۔ ایک تعلیم ہی تھی مگر نہ یہ حاصل کرنا آسان تھا اور نہ بعد میں اس کے بل بوتے پر اچھی نوکری کرنا۔ خیر اس کے باوجود میں نے بی اے کی تیاری کا ارادہ باندھ لیا مگر میں دن بھر اتنا مصروف رہتا کہ یہ ارادہ، ارادہ ہی رہا، اس کو عملی جامہ نہ پہنا سکا۔ بی اے کے داخلے کھلے تو میں نے ہیڈ ماسٹر کو این او سی کی یاد دلائی۔ اس نے مجھے درخواست اور کاغذات دینے کا کہا۔ میں نے اگلے ہی دن کاغذات اسے دے دیے۔

''میں یہ ڈپٹی ڈی ای او کو بھیج دوں گا۔ تم داخلہ بھیج دو۔'' میں نے داخلہ بھجوا دیا۔ میں نے تیاری شروع کر دی۔ اب میں کمپیوٹر سینٹر سے شام چھ بجے ہی گھر چلا جاتا اور گھر جا کے پڑھائی میں گم ہو جاتا۔ باقی مضامین کی تیاری تو مشکل نہ تھی مگر انگلش میرا ایک بار پھر امتحان لے رہی تھی۔ اسکول کے اساتذہ میں سے بھی کسی کو بی اے کی انگلش نہیں آتی تھی حالانکہ تمام اساتذہ کی کم سے کم تعلیم بھی گریجویشن تھی۔ میں نے ایک دن ایک ساتھی ملازم سے شکوہ کیا تو وہ ہنس کے بولا۔ ''ان سب پرانے ٹیچرز نے نوکری کے دوران اوپن

www.pklibrary.com

یونیورسٹی سے نقلیں کر کے بی اے کیا ہے۔ انہیں انگلش آتی ہی کہاں ہے۔" میں ششدر رہ گیا۔ لوگ کیسے کامیابی کے لیے غلط راہ نکال لیتے ہیں۔ ایک میں تھا جو ہر کام ایمانداری سے کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ میں نے دکھ سے سوچا۔

انگلش کے رٹے مار مار کے میں اپنی تیاری سے کسی قدر مطمئن تھا۔ امتحانات کی ڈیٹ شیٹ آ گئی مگر این او سی نہیں آیا۔ جس دن میرا پہلا پرچہ تھا اسی دن کسی آفیسر نے اسکول وزٹ کرنا تھا۔ میں نے چھٹی مانگی تو ہیڈ ماسٹر نے انکار کر دیا۔ "تمہارا این او سی ہوتا تو میں تمہیں چھٹی دے دیتا۔ بغیر این او سی کے میں تمہیں پیپر کے لیے چھٹی دے کر اپنی نوکری خطرے میں نہیں ڈال سکتا۔" اس نے دوٹوک انکار کر دیا۔

"سر! میری ڈیٹ شیٹ ہو گی۔ میری چھٹی پر تو کوئی اعتراض نہیں کر سکے گا۔"

"فالتو بحث مت کرو۔" اس نے غصے سے کہا۔ "وہ این او سی مانگے گا تو میں اسے کیا جواب دوں گا؟"

میں اسے بے بسی سے دیکھتا رہ گیا۔ باقی لوگ ڈنکے کی چوٹ پر چھٹیاں کر لیتے تھے۔ ایک میں تھا جسے وہ چھٹی نہیں دے رہا تھا۔ حالانکہ میں تو اسکول میں سب سے کم چھٹی کرتا تھا اور کام بھی اپنی ذمے داریوں سے کئی گنا زیادہ کرتا تھا۔ وہ میری شرافت کا ناجائز فائدہ اٹھا رہا تھا۔ غم و غصے سے میری بری حالت ہو گئی۔ میں نے ایک ٹیچر سے بات کی تو وہ ہنسا۔ "میرے بھولے بادشاہ! کلاس فور کے لیے این او سی اتنا ضروری نہیں ہوتا۔ یہ تمہیں الو بنا رہا ہے۔"

میں نے اسے بے یقینی سے دیکھا۔ میں سیدھا سادہ تھا۔ سب کے کام آتا تھا مگر سب میری سادگی کا ناجائز فائدہ اٹھا رہے تھے۔

"پھر [illegible]ی کیوں نہیں دے رہا؟"

"[illegible] بہرحال اس کے اختیار میں ہے دے یا نہ دے۔" اس نے کندھے اچکائے۔

ہیڈ ماسٹر کی کم ظرفی نے مجھے دکھی کر دیا۔ جو اسے دبا کے رکھتے تھے وہ ان سے دب جاتا تھا اور جو اس سے تعاون کرتے تھے، بے چون و چرا کیے اس کے احکامات بجا لاتے تھے، ان سے تعاون کے بجائے وہ الٹا انہیں دباتا تھا۔

'کچھ بھی ہو میں نے پیپر تو دینا ہے۔' میں نے غصے سے سوچا۔ میں نے چھٹی کی درخواست اور ڈیٹ شیٹ کلرک کے حوالے کر دی۔

"یہ ہیڈ ماسٹر صاحب سے Recommend کرا کے لاؤ۔" اس نے درخواست میری طرف بڑھائی۔

"وہ چھٹی نہیں دے رہے مگر میں نے پیپر تو ہر صورت دینا ہے۔ وہ لیو لگاتے ہیں تو ٹھیک، نہیں تو بے شک غیر حاضری لگا دینا۔" میں سپاٹ انداز میں کہتے ہوئے باہر نکل آیا۔

اگلے دن میں پیپر دینے چلا گیا۔ میں نے چھٹی کر تو لی تھی لیکن میں بے حد پریشان تھا۔ پریشانی میں، میں پیپر بھی ٹھیک طرح سے نہیں دے پایا۔ پرچہ دے کر میں نے کلرک کو کال کی۔ "کہاں ہو تم، ڈی ای او تمہیں معطل کر گیا ہے۔" اس کی اطلاع مجھ پر بم کی طرح گری۔

"آپ نے اسے ڈیٹ شیٹ نہیں دکھائی؟" میں نے لرزتی ہوئی آواز میں استفسار کیا۔

"ہیڈ ماسٹر صاحب نے مجھے منع کر دیا تھا۔ وہ تمہارے بلا اجازت چھٹی کرنے پر بہت غصے میں تھے۔ میں صبح بھی تمہیں کال کر رہا تھا کہ اسکول آ جاؤ مگر تمہارا نمبر بند جا رہا تھا۔"

"مگر میری ڈیٹ شیٹ تو دکھا دیتے۔" میں نے بے چارگی سے کہا۔

"کیسے دکھا دیتا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے صبح ہی تمہاری غیر حاضری لگا دی تھی۔ ڈی ای او نے تمہاری غیر حاضری کی وجہ دریافت کی تو ہیڈ ماسٹر صاحب نے کہا کہ وہ چھٹی مانگ رہا تھا مگر میں نے اسے چھٹی نہیں دی تو اس نے بلا اجازت چھٹی کر لی۔ انہوں نے ڈی ای او کو تمہارے خلاف اتنا بھڑکایا کہ اس نے اسکول میں ہی بیٹھ کے خود تمہارا سسپنشن لیٹر ٹائپ کیا۔" میرا دماغ کھول کے رہ گیا۔ ایک میں تھا جو وہ کام بھی کر رہا تھا جو میری ذمے داری میں ہی نہیں آتے تھے اور ہیڈ ماسٹر نے میری مجبوری کے باوجود مجھ سے معمولی سا تعاون بھی نہیں کیا تھا۔

میں انتہائی غصے کے عالم میں اسکول کی طرف روانہ ہو گیا۔ میں اسکول پہنچا تو چھٹی کا وقت ہو چکا تھا۔ ہیڈ ماسٹر آفس سے باہر نکل رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ طنزیہ انداز میں مسکرایا۔ اس کی مسکراہٹ مجھے سلگا گئی۔ میں غصے سے مٹھیاں بھینچنے لگا۔ "جمیل! اسے اس کا سسپنشن لیٹر دے دو۔" اس نے ایک ملازم سے کہا۔

"آخ تھو۔" میں نے انتہائی غصے میں کہتے ہوئے اس کے منہ پر تھوک دیا۔ "میں لعنت بھیجتا ہوں تم پر اور تمہاری اس نوکری پر۔" ہیڈ ماسٹر اور اس کے ساتھ کھڑے دو اساتذہ میری اس حرکت پر ہکا بکا رہ گئے۔ میں انہیں حیران چھوڑ کے پلٹا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا باہر نکل آیا۔

www.pklibrary.com

میرے دماغ میں چنگاریاں سی پھوٹ رہی تھیں۔ جانے کتنی ہی دیر میں اسی کیفیت میں جلتا رہا۔ مجھے ہوش آیا تو میں گھر کے دروازے پر کھڑا تھا۔ نوشین میری صورت دیکھتے ہی بولی۔ ”کیا ہوا بھائی؟“

”میں نے نوکری چھوڑ دی۔“ میں گم صم سی کیفیت میں بولا۔

”کیا کہا تم نے؟“ امی چلائیں۔

میں نے انہیں سارا قصہ سنایا۔

”بیوقوف انسان۔ یہ کیا کیا تونے۔ لگی لگائی نوکری پر لات مار کے آگئے۔“ میرا خیال تھا امی مجھ سے ہمدردی جتائیں گی مگر وہ الٹا مجھے ہی لتاڑنے لگیں۔ میں تھکے ہوئے قدموں سے اپنے کمرے میں آگیا۔

میں نے پیپرز کی وجہ سے کمپیوٹر سینٹر سے چھٹی لی ہوئی تھی مگر پڑھائی میں بھی میرا دل نہیں لگ رہا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ میں ایک بار پھر ناقابلِ تلافی غلطی کر چکا ہوں۔ میرے پاس نہ کچھ خاص تعلیم تھی، نہ ہنر اور نہ سرمایہ۔ یہ نوکری بھی ہاتھ سے جاتی تو گزارہ ایک بار پھر مشکل ہو جاتا۔ ابھی تو مجھ پر اپنی اور نوشین کی شادی کا بھی بار تھا۔ پرائیویٹ نوکری میں یہ ذمے داریاں پوری کرنا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔

میں پریشانی کے عالم میں باہر نکل آیا۔ چند لمحوں بعد میں رمضان کے گھر کا دروازہ بجا رہا تھا۔ اسی نے مجھے اس نوکری پر لگوایا تھا، اب وہی میری نوکری بچا سکتا تھا۔

اس نے میری ساری بات سنی تو تاسف سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تم نے بہت بڑی غلطی کی۔ ہیڈ ماسٹر کے ساتھ تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔“

”اس نے مجھے معطل کرا دیا، اب مجھے کسی طرح تو اس سے بدلہ لینا ہی تھا۔“

”معطلی تو کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا۔ تم بہ آسانی بحال ہو جاتے۔ بہت ہوتا تو ایک دن کی تنخواہ ریفنڈ کرانا پڑتی مگر تمہاری غلطی سے اب مسئلہ گمبھیر ہو چکا ہے۔“

”تو کیا اب کچھ نہیں ہو سکتا؟“ میں نے امید بھری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

وہ سوچ میں پڑ گیا۔ ”اب تو بس یہی حل ہے کہ تم ہیڈ ماسٹر سے معافی مانگ لو۔“

اس سے معافی مانگنے کا مطلب اپنا ہی تھوکا ہوا چاٹنے کے مترادف تھا مگر اس کے بغیر اب چارہ بھی نہ تھا۔

”مجھے منظور ہے۔“ کچھ دیر سوچنے کے بعد میں نے تھکے ہوئے انداز میں کہا۔

رمضان بیچ میں نہ پڑتا تو ہیڈ ماسٹر مجھے کبھی معاف نہ کرتا۔ وہ تو مجھے دیکھتے ہی بتھے سے اکھڑ گیا تھا۔ رمضان نے بڑی مشکل سے اسے رام کیا۔ اسی کی کوششوں سے میری نوکری بحال تو ہو گئی مگر میرا ٹرانسفر ایک دور دراز گاؤں میں کر دیا گیا۔ یہ میری سزا تھی۔ ان چکروں میں میرے پیپرز بیچ میں ہی رہ گئے۔

جس اسکول میں میرا ٹرانسفر ہوا تھا وہ میرے گھر سے ڈیڑھ سو کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ اتنی دور روزانہ جانا آنا ناممکن تھا۔ مجھے وہیں کہیں رہائش کا بندوبست کرنا پڑتا۔ میں وہاں جاتے ہوئے تذبذب کا شکار تھا مگر رمضان نے مجھے کہا کہ میں فی الحال ادھر جوائننگ دے دوں، جلد ہی وہ شہر میں کوئی سیٹ تلاش کر کے مجھے واپس ٹرانسفر کرا دے گا۔ میں اس کا مشورہ ماننے پر مجبور تھا۔ امی اور نوشین کو اکیلا چھوڑ کے جاتے ہوئے میرا دل بے حد دکھی تھا۔ امی بار بار دوپٹے سے آنسو صاف کر رہی تھیں۔

”میں ادھر جگہ دیکھ آؤں۔ جلد ہی رہائش کا بندوبست کر کے آپ کو بھی ادھر ہی بلوا لوں گا۔“ میں نے انہیں تسلی دی۔

بس میں جاتے ہوئے میں افسردہ تھا۔ میری غلطیوں میں ایک اور غلطی کا اضافہ ہو چکا تھا۔ اب جانے کب تک میں نے اپنی اس غلطی پر بھی پچھتانا تھا۔ اس بار میرے ساتھ وہ معاملہ ہوا تھا کہ کھایا پیا کچھ نہیں، گلاس توڑا بارہ آنے۔ جن پیپرز کے لیے میں نے چھٹی کی تھی، وہ پیپر تو دے ہی نہیں سکا تھا الٹا مجھے سزا ہو گئی تھی۔ پتا نہیں میری قسمت خراب تھی یا میں تھا ہی اتنا احمق کہ زندگی کے ہر موڑ پر مجھ سے کوئی نہ کوئی ایسی غلطی سرزد ہو جاتی تھی جس کی تلافی ممکن نہیں ہوتی تھی۔ میں سارے سفر میں یہی سوچتا رہا۔ بس نے مجھے دو گھنٹے بعد میرے اسٹاپ پر اتارا۔ یہاں سے آگے میں نے ویگن میں سفر کرنا تھا۔ ویگن سے اتر کے میں نے ایک شخص سے اسکول کا پتا پوچھا۔

اس نے مجھے غور سے دیکھا۔ ”کیتھوں آئے ہو جی؟“

”پنڈی سے آیا ہوں۔ میرا اس اسکول میں ٹرانسفر ہوا ہے۔“

اس نے پرجوش انداز میں مجھ سے مصافحہ کیا۔ ”ماسٹر صاحب! میرا گھر وی اسکول کول ای اے جی، آؤ میرے نال۔“ وہ مجھے استاد سمجھا تھا۔ میں نے بھی اس کی غلط فہمی رفع نہیں کی۔

www.pklibrary.com

بہار کی چمکیلی سی دھوپ ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ کھیتوں میں گندم کی فصل لہلہا رہی تھی۔ کھیتوں کے بیچ چلتے ہوئے مجھے عجیب سے سکون کا احساس ہو رہا تھا۔ میں جو انتہائی افسردہ تھا یکدم ہی خود کو ہشاش بشاش محسوس کرنے لگا تھا۔ میرے ساتھ چلتا شخص مجھ سے مسلسل باتیں کیے جا رہا تھا۔ کچھ ہی دیر میں اس نے نہ صرف مجھ سے سارا ''بائیو ڈیٹا'' پوچھ لیا تھا بلکہ اپنے اور گاؤں کے متعلق بھی بہت کچھ بتا دیا تھا۔ اسکول کے اساتذہ کی وہ بھی مسلسل تعریفیں کیے جا رہا تھا۔

'دور کے ڈھول سہانے ہوتے ہیں۔' میں نے دل ہی دل میں سوچا۔

جب میں اسکول میں پہنچا تو ساڑھے دس بج چکے تھے۔ اسکول میں خلافِ توقع میرا گرمجوشی سے استقبال کیا گیا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب سمیت تمام اساتذہ مجھ سے بہت خوش اخلاقی سے پیش آئے۔ مجھے چائے پلائی گئی۔ چائے کے ساتھ بسکٹ اور کیک وغیرہ بھی تھے۔ ان سب کے رویّے سے مجھے لگ ہی نہیں رہا تھا کہ میں درجہ چہارم کا ملازم ہوں۔ اسکول میں بریک ٹائم ہوا تو سب اساتذہ اسٹاف روم میں... آ گئے۔ وہ مجھ سے تعارف لینے لگے۔

میں نے رہائش کے متعلق پوچھا تو ایک ٹیچر آفتاب صاحب جوش سے بولے۔ ''اسکول میں ہی ایک کمرے میں بستر لگا ہے۔ آپ میرے ساتھ آئیں، میں آپ کو کمرا دکھاتا ہوں۔'' میں اپنا بیگ لے کر اس کے ساتھ چل پڑا۔ ایک اور نوجوان ٹیچر وسیم بھی ہمارے ساتھ چل پڑا۔ یہ ایک چھوٹا سا کمرا تھا جس میں ایک ہی چارپائی بچھی ہوئی تھی۔ چھوٹے گیس سلینڈر والا چولہا اور برتن بھی موجود تھے۔

''یہاں کھانا پکانے کا انتظام بھی موجود ہے۔ ان شاء اللہ آپ کو یہاں کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔''

''میں تو کھانا بنا ہی نہیں سکتا۔'' میں دھیرے سے بولا۔

''اوہ..... یہ تو تھوڑا مسئلہ ہو جائے گا۔'' آفتاب صاحب کے چہرے پر پریشانی چھا گئی۔ ''دراصل ہم سب تو کافی دور سے آتے ہیں ورنہ کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا۔'' ان کے لہجے میں شرمندگی تھی۔

''ایک حل ہے میرے پاس۔'' وسیم بولا۔ ''اسکول کے ساتھ ہی میری خالہ کا گھر ہے۔ وہ بیوہ ہیں۔ آپ انہیں کچھ پے کر دینا وہ آپ کو کھانا اپنے گھر سے ہی بنا کے دے دیا کریں گی۔''

''ٹھیک ہے مجھے منظور ہے۔ ویسے یہاں کرائے پر کوئی گھر مل سکتا ہے؟'' وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ میں نے وضاحت کی۔ ''دراصل میں اپنی امی اور بہن کو بھی ادھر ہی شفٹ کرنا چاہتا ہوں۔''

''کرائے پر گھر تو بہت مشکل ہے۔ بہرحال کچھ کرتے ہیں۔'' وسیم نے کہا۔ بریک ختم ہوا تو آفتاب صاحب تو کلاس میں چلے گئے۔ وسیم مجھ سے بولا۔

''میرا پیریڈ فری ہے۔ آئیں میں آپ کو ان خاتون سے ملوا لاتا ہوں، جن کے گھر کا نمک آپ کے نصیب میں لکھا گیا ہے۔'' اس کے لہجے میں معنی خیزی چھپی تھی۔

میں اس کے ساتھ باہر آ گیا۔ گیٹ کے قریب ہی رک کے وہ مجھے پُرسوچ انداز میں دیکھنے لگا۔ میں نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''آپ کے مسئلے کا حل سوچ رہا ہوں۔''

''کون سے مسئلے کا حل؟'' میں نے اچنبھے سے پوچھا۔

''بھئی جو آپ کرائے کے گھر کا کہہ رہے تھے۔'' اس نے وضاحت کی۔ ''معذور ماں اور بہن کو اکیلے آپ چھوڑ نہیں سکتے مگر یہاں کرائے پر گھر ملنا تو ناممکن ہے اور گاؤں کا ماحول ایسا ہے کہ کوئی غیر مرد کو اپنے گھر بھی نہیں ٹھہرا سکتا۔ اب بس ایک ہی صورت بچتی ہے۔''

''وہ کیا؟''

''آپ شریف اور بھلے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ اس لیے آپ کے لیے ایک مشورہ ہے۔'' اس نے مجھے بغور دیکھا۔

''جی بتائیں۔'' اس کا انداز مجھے بے چین کر رہا تھا۔

''اگر آپ اپنی فیملی کے ساتھ یہاں رہنا چاہتے ہیں تو یہاں شادی کر لیں۔''

''شادی؟'' میں حیران رہ گیا۔ ''مگر کس سے؟''

وہ مسکرایا۔ ''ہم جس گھر جا رہے ہیں، ان خاتون کی ایک بیٹی ہے۔ جوان اور سلیقہ شعار ہے۔ میٹرک تک پڑھی ہوئی بھی ہے۔ خوبصورت ہے۔ آپ اس سے شادی کر لیں۔ انہیں بھی سہارا مل جائے گا اور آپ کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔''

میں نے عجیب سے انداز میں اس کی طرف دیکھا۔ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ''حیران مت ہوں۔ میرا مزاج ہی ایسا ہے کہ کوئی بھی شخص کسی مسئلے سے دوچار ہو تو مجھ سے جس حد تک ہو سکتا ہے اس کی مدد کی کوشش کرتا ہوں۔''

میں قدرے مطمئن نظر آنے لگا۔ ورنہ اس کی پیشکش نے مجھے حیران کر دیا تھا۔ وہ میرے تاثرات دیکھ کر بولا۔ ''اس کے علاوہ آپ کی فیملی کی یہاں رہائش کی اور کوئی صورت نہیں۔ میں نے آپ کو مشورہ دے دیا باقی آپ کی مرضی۔''

www.pklibrary.com

''آپ کا شکریہ کہ آپ نے میرے مسئلے کو اتنی سنجیدگی سے لیا۔ اس پر سوچا جا سکتا ہے۔'' میں نے مسکرا کے کہا۔

''آئیں ان کے گھر چلتے ہیں۔ آپ اسے دیکھیے گا، بات کیجیے گا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ آپ کو پسند آئے گی۔'' ہم چند قدم ہی چلے تھے کہ وسیم ایک گھر کے دروازے پر رکا۔ اس نے مسکرا کے مجھے دیکھا۔ ''دیکھ لیں، میرے مشورے پر عمل کی صورت میں آپ گھر بیٹھے بھی نوکری کر سکیں گے۔''

دستک کے جواب میں قدموں کی چاپ ابھری۔ وسیم مسکراتے ہوئے مجھے دیکھ رہا تھا اور میں بے چینی سے دروازے کو۔

''کون ہے؟'' ایک مدھر آواز ابھری اور میری بے چینی سوا ہو گئی۔

''میں ہوں، وسیم۔'' لڑکی نے یکدم دروازہ کھول دیا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی اس نے گھبرا کے دوپٹے کا کنارہ منہ پر کر لیا۔ اس کی یہ ادا میرے دل میں کھب گئی۔ میرا لڑکپن اور نوجوانی محنت کرتے اور گھر کے حالات بہتر کرنے میں ہی گزر گئی تھی۔ صنفِ نازک میں دلچسپی لینے کا مجھے کبھی موقع ہی نہیں ملا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا جب میں کسی لڑکی کو اس نظر سے دیکھ رہا تھا اور پہلے ہی موقع پر میرا دل گھائل ہو گیا تھا۔

وسیم نے ایک نظر مجھے دیکھا اور لڑکی سے پوچھا۔ ''خالہ ہیں گھر میں؟''

''جی، آپ آ جائیں۔'' وہ ابھی تک قدرے گھبرائی ہوئی لگ رہی تھی۔ ہم اندر داخل ہو گئے۔ لڑکی اندر کی طرف بڑھنے لگی۔ صاف ستھرا صحن تھا جس کے آگے چھوٹا سا برآمدہ بنا ہوا تھا۔ اس نے ہمیں ایک کمرے میں بٹھایا۔ ''میں امی کو بلاتی ہوں۔''

''ایک منٹ رکو۔'' وسیم نے کہا۔ ''یہ میرے کولیگ ذیشان ہیں۔ آج ہی پنڈی سے ٹرانسفر ہو کے آئے ہیں۔''

''السلام علیکم۔'' اس نے مجھے بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ میں نے سلام کا جواب دیا۔ وہ سوالیہ نظروں سے وسیم کو دیکھنے لگی۔

''خالہ کو بلا لاؤ اور کھانا بھی تیار کر دو۔ ہم کھانا ادھر ہی کھائیں گے۔'' اس نے بے تکلفی سے کہا۔ لڑکی نے عجیب سے انداز میں وسیم کی طرف دیکھا اور ''جی اچھا'' کہتے ہوئے اندر چلی گئی۔ وسیم نے مسکراتے ہوئے مجھے دیکھا۔ میں بھی نروس سے انداز میں مسکرا کے رہ گیا۔

''میرے خالو چھ ماہ قبل ہی سانپ کے کاٹنے سے فوت ہو گئے تھے۔ تب سے میں ہی ان کو سپورٹ کر رہا ہوں۔'' اس نے وضاحت کی۔

خالہ سیدھی سادی عورت تھیں۔ انہوں نے شفقت سے میرے سر پر ہاتھ پھیرا۔ وسیم انہیں میرے بارے میں بتانے لگا۔ میں بار بار بے چینی سے دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ادھ کھلے دروازے سے کبھی کبھار اس کی جھلک دکھ جاتی تھی اور میرے بے قرار دل کو جیسے قرار آ جاتا تھا۔

کھانے میں آلو گوشت کے ساتھ چپاتیاں تھیں۔ ساتھ سلاد تھی مگر اس سادہ سے کھانے کا ذائقہ لاجواب تھا۔ میں جو اس لڑکی کی صورت دیکھتے ہی اس پر فریفتہ ہو گیا تھا اس کے سلیقے کا بھی قائل ہو گیا۔ کھانے کے دوران وہ گرما گرم چپاتیاں لے کر آتی رہی۔ وسیم نے اسے بھی ساتھ بیٹھنے کی پیشکش کی مگر اس نے معذرت کر لی۔ کھانے کے بعد وہ چائے لے کر آ گئی۔ وسیم کے کہنے پر اس نے ہمارے ساتھ ہی بیٹھ کے چائے پی مگر چائے پیتے ہوئے وہ مجھے گم صم نظر آئی۔ اس نے زیادہ بات چیت میں حصہ نہیں لیا۔

چائے کے بعد ہم نے رخصت چاہی اور اسکول میں آ گئے۔ اسکول میں چھٹی ہو چکی تھی۔ محض ایک ملازم موجود تھا۔ وہ چابی میرے حوالے کرنے کے لیے ہی رکا ہوا تھا۔ وسیم نے اسے بھیج دیا۔ ہم کمرے میں آ گئے۔

''ہاں بھئی، تو کیسی لگی آپ کو میرا؟'' اس نے معنی خیز سے انداز میں مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''اچھی ہے لیکن گھر والوں سے بات کرنے کے بعد ہی میں کوئی فیصلہ کر پاؤں گا۔''

''کب کریں گے گھر والوں سے بات؟''

''ظاہر ہے جب چھٹی پر جاؤں گا تو۔''

''آپ چاہیں تو آج ہی چلے جائیں۔ کل گھر والوں کو لے آئیں۔''

''اتنی جلدی؟'' میں نے حیرت سے کہا۔

''ٹیک کام میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔'' وہ مسکرایا۔ ''ویسے بھی معذور ماں اور بہن کو آپ اکیلا چھوڑ آئے، یہ آپ ہی کی ہمت ہے۔ اب جب یہاں رہائش کا بندوبست ہو گیا ہے تو میرے خیال میں آپ کو فوراً انہیں لے آنا چاہیے۔''

امی کا خیال آتے ہی مجھے یکدم ان کی یاد ستانے لگی۔ جانے میرے بغیر اکیلے ان کی رات کیسے گزرتی۔ میں نے ابھی جانے کا فیصلہ کر لیا مگر اسکول سے چھٹی کا مسئلہ تھا۔ وسیم نے کہا کہ میں چھٹی کی فکر نہ کروں۔ یہ گاؤں کا اسکول تھا یہاں چھٹی کا اتنا مسئلہ نہیں ہوتا تھا۔ ہم روانہ ہو گئے۔

راستے میں وہ مجھ سے میرا سے شادی کے فوائد گنواتا رہا۔

www.pklibrary.com

''میں تو شادی پر تیار ہوں۔ کیا سمیرا اور اس کی امی مانیں گی؟'' میں نے پُرسوچ انداز میں پوچھا۔

''ان کی فکر چھوڑیں۔ انہیں میں جو بات کہوں گا انہیں قبول ہوگی۔'' وہ جلدی سے بولا۔ ''میرا مشورہ مانیں تو آپ ایک دو دن میں سادگی سے سمیرا سے نکاح پڑھوالیں۔ مزید آپ ولیمہ وغیرہ کرنا چاہیں تو بعد میں شہر جا کے کر لیجیے گا۔'' ہم ویگن کا انتظار کر رہے تھے جب اس نے کہا۔

میں خود بھی سوچ رہا تھا۔ جتنی جلدی یہ نیک کام ہو جاتا اچھا تھا۔

امی اور نوشین مجھے دیکھ کے حیران رہ گئیں۔ میں نے انہیں ساری بات بتائی تو ان کی حیرت میں مزید اضافہ ہو گیا۔

''امی! آپ لوگ تیاری کریں۔ صبح ہم نے جانا ہے۔ اگر آپ کو سمیرا پسند آ گئی تو میں اس سے شادی کر لوں گا پھر ہم ادھر ہی رہیں گے۔''

''یوں ہتھیلی پر سرسوں نہیں جمتی۔'' انہوں نے ناگواری سے کہا۔ ''شادی ہے کوئی گڈی گڈے کا کھیل نہیں جو تو اتنی جلدی فیصلہ کر رہا ہے۔''

''امی! مجھے یقین ہے آپ کو سمیرا پسند آئے گی۔''

''شادی کے لیے صرف لڑکی نہیں دیکھی جاتی۔ اس کا خاندان بھی دیکھا جاتا ہے اور سو باتیں ہوتی ہیں دیکھنے والی۔''

''اچھا خفا کیوں ہو رہی ہیں۔'' میں نے مسکسی سی صورت بنا کے کہا۔ ''آپ دیکھ لیجیے گا سب، پھر اگر آپ کو قبول ہوا رشتہ تو میں بھی قبول ہے کہہ لوں گا۔'' میرے لہجے سے خوشی پھوٹ رہی تھی۔

اگلے دن میں امی اور نوشین کو لے کے چل پڑا۔ کل میں جاتے ہوئے افسردہ تھا مگر آج بے حد خوش۔ کل جاتے ہوئے میں اپنی غلطیوں پر پچھتا رہا تھا اور آج مجھے اپنی آخری غلطی پر پیار آ رہا تھا۔ میں نے فون پر وسیم کو بتا دیا تھا۔ سمیرا کی امی نے ہمارا خوشدلی سے استقبال کیا۔ وسیم بھی ادھر ہی موجود تھا۔ چائے پینے کے بعد وہ بولا۔

''میرا خیال ہے، خواتین کو آپس میں گھلنے ملنے کا موقع دینا چاہیے۔ آئیں، ہم اسکول چلتے ہیں۔'' میرا دل وہاں سے اٹھنے کا تو نہیں چاہ رہا تھا مگر اس کی بات بھی درست تھی۔ ہم اسکول آ گئے۔

چھٹی سے کچھ دیر قبل کھانے کے وقت ہماری واپسی ہوئی۔ امی اور نوشین سمیرا اور اس کی امی سے متاثر لگ رہی تھیں۔ میں نے تنہائی میں امی سے ان کی مرضی پوچھی۔ انہیں بھی سمیرا پسند آئی تھی تاہم وہ فوری شادی کے خلاف تھیں۔ میں ہر کام میں رسوم و رواج اور زیادہ سوچ بچار کے بجائے سہولت کا قائل تھا۔ سمیرا سے فوری نکاح میں ہمیں بہت سی سہولیات مل جاتیں۔ جیسے رہائش کا مسئلہ فوری حل ہو جاتا، دوبارہ پنڈی کے چکر لگانے کی ضرورت بھی نہ پڑتی۔ محض ایک بار جا کے ولیمہ بھی کر آتے، گھر سے سامان بھی لے آتے اور گھر کرائے پر بھی دے آتے، پھر میں اپنی جاب پر بھی توجہ دے سکتا تھا اور گھر پر بھی۔

گاؤں آمد کے بعد کمپیوٹر سینٹر کی اضافی آمدنی بھی ہاتھ سے گئی تھی۔ وہی آمدنی میری بچت تھی، تنخواہ سے تو... بہ مشکل گھر کا نظام چل رہا تھا۔ گھر کرائے پر فوری دینے سے اضافی آمدنی کا بھی بندوبست ہو جاتا۔ میں نے امی کو قائل کرنے پر پورا زور لگا دیا۔ وہ میرے دلائل سے متفق تھیں مگر وہ مطمئن نہیں تھیں۔ وسیم نے بھی ان سے بات کی تو وہ مارے باندھے قائل ہو ہی گئیں۔ اگلے دن نکاح کی مختصر سی تقریب رکھی گئی۔ نکاح کے لیے کچھ شاپنگ بھی کرنا تھی۔ میں نے وسیم سے بات کی تو اس نے قریب ہی ایک مارکیٹ کا بتایا۔ وہ لوگ وہیں سے شاپنگ کیا کرتے تھے۔ میں نوشین کو ساتھ لے گیا۔ وسیم بھی ہمارے ساتھ تھا۔ میری جمع پونجی کا بڑا حصہ اس معمولی سی شاپنگ کی نذر ہو گیا۔

اس رات امی اور نوشین، سمیرا کے گھر ہی رہے تھے جبکہ میں نے اسکول میں رات گزاری تھی۔

اگلے دن میں نے چند اساتذہ سے سمیرا سے شادی کے متعلق مشورہ کیا تو انہوں نے بھی میرے فیصلے کو سراہا۔ چھٹی کے بعد چند اساتذہ اور سمیرا کے چند رشتے داروں کی موجودگی میں ہمارا نکاح ہو گیا۔ نکاح کی تقریب کے بعد کھانا کھلایا گیا۔ اس کھانے کا بندوبست وسیم نے ہی کیا تھا۔ میں اپنا ولیمہ شہر جا کے کرنا چاہتا تھا جہاں میرے رشتے دار اور دوست احباب شریک ہوتے۔ میری زندگی میں بہت تیزی سے تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں اور یہ تبدیلی خوشگوار لگ رہی تھی۔ طویل عرصے کے بعد مجھے اپنے اندر بے حسی کی برف پگھلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ میں بے حد مسرور تھا۔

کل تک اس گھر کے مکینوں کے لیے میں اجنبی تھا۔ آج میں اس گھر کا فرد تھا۔ سمیرا کی سہیلیوں نے ہمارا حجلۂ عروسی تیار کیا۔ میں کمرے میں داخل ہوا تو میرے دل میں کیف آمیز سی سنسنی پھیلی ہوئی تھی۔ سمیرا گھونگھٹ نکالے بیٹھی تھی۔ میں نے لرزتے ہاتھوں سے اس کا گھونگھٹ اٹھایا۔ شرم سے اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ کل اگر وہ سادہ سے حلیے میں پرکشش لگ رہی تھی تو آج تو اس کی سج دھج ہی نرالی

www.pklibrary.com

تھی۔ میں یک ٹک اسے دیکھتا رہ گیا۔ میں نے جیب سے انگوٹھی نکال کے پہنائی۔ اس کا ہاتھ بالکل سرد تھا۔ میں اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اس سے باتیں کرنے لگا۔

یہ رات اگر میری زندگی کی خوبصورت ترین رات تھی تو اگلی صبح بھی انتہائی خوشگوار تھی۔ سمیرا کی امی نے ہمارے لیے ناشتا تیار کیا۔ ناشتے کے بعد سمیرا کام میں لگ گئی۔ نوشین نے اسے بہت منع کیا مگر وہ باز نہ آئی۔ اگلے تین دن خوشیوں کے ہنڈولے میں جھولتے گزر گئے۔ میں تھوڑی دیر کے لیے اسکول میں جاتا اور حاضری لگا کے واپس آجاتا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب اور دوسرے کولیگز میرے ساتھ ہر معاملے میں تعاون کر رہے تھے۔ میں ایسے ہی ماحول کا خواہشمند تھا جہاں انسانیت کی قدر ہو۔ انسان دوسرے انسان کو اپنا حلیف سمجھے نہ کہ حریف۔ شہر میں ایسا ماحول ناپید تھا۔ مجھ پر وہ محاورہ صادق آرہا تھا کہ ''ٹھگیے کو لات لگی تو اس کا کُب سیدھا ہو گیا۔''

میری سزا ہی میرے لیے جزا بن گئی تھی۔ تیسرے دن امی نے پنڈی جانے کا پوچھا تو میں یکدم جیسے خوابوں کی دنیا سے حقیقت میں آگیا۔ ولیمے کے لیے اور مکان کرائے پر دینے کے لیے پنڈی جانا ضروری تھا۔ میں یہ کام جلد از جلد نمٹا لینا چاہتا تھا۔ میں نے اگلے دن کا ہی پروگرام بنالیا۔ سمیرا اور اس کی امی بھی ہمارے ساتھ تھیں۔ ولیمے کی تقریب میں نے گھر پر ہی رکھی تھی۔ میں نے چند قریبی احباب کو ہی مدعو کیا۔ سب میری اچانک شادی پر حیران تھے، میں انہیں مطمئن کر کر کے تھک گیا۔ اگلے دن میں سمیرا کو گھمانے لے گیا۔ وہ انتہائی کم گو تھی بلکہ کئی بار تو مجھے وہ گم صم سی لگی تھی۔ شروع میں تو میں نے نوٹس نہیں کیا تھا، اس کی خاموشی کو میں نے شرم و حیا پر محمول کیا تھا مگر اب مجھے اس کی مسلسل خاموشی کھلنے لگی تھی۔

ہم راول لیک میں کشتی پر بیٹھے تھے۔ تیز ہوا اس کی زلفوں کو چھیڑ رہی تھی۔ اس کے بال بار بار اس کے چہرے پر آرہے تھے مگر اسے کوئی الجھن محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ وہ گم صم حالت میں پانی کے اندر جانے کیا تلاش رہی تھی۔ اس حالت میں وہ بے پناہ حسین لگ رہی تھی۔ میں یک ٹک اسے دیکھتا رہا مگر وہ جیسے میری محویت سے بھی بے خبر تھی۔

راول لیک کے بعد میں اسے دامن کوہ لے گیا۔ شکر پڑیاں، فیصل مسجد...... میں جیسے ایک ہی دن میں اسے پورا اسلام آباد دکھا دینا چاہتا تھا۔ میں اسے ساری جگہوں کے بارے میں بتاتا رہا، وہ بس ہوں ہاں میں جواب دیتی رہی۔

موسم انتہائی خوشگوار تھا۔ پورا دن میرا موڈ بھی اچھا رہا تھا مگر اس کی خاموشی سے اب مجھے جھنجلاہٹ ہونے لگی تھی۔ وہ میرے ساتھ ہوتے ہوئے بھی میرے ساتھ نہیں تھی۔ میں نے اس سے اس کی خاموشی کی وجہ دریافت کی تو وہ پھیکا سا مسکرا کے بولی۔

''مرد تو ہمیشہ اپنی بیویوں کے زیادہ بولنے سے نالاں نظر آتے ہیں، آپ کو میری خاموشی پر اعتراض ہے۔'' شادی کے بعد یہ شاید سب سے طویل جملہ تھا، جو اس نے مجھ سے بولا تھا۔ میں نے زوردار قہقہہ لگایا۔ وہ جھینپ گئی۔

''بھئی، ہر چیز میں میانہ روی ہونی چاہیے۔ جیسے زیادہ بولنے والی خواتین سے بندہ بیزار ہو جاتا ہے ایسے ہی خاموشی بھی بیزار کرتی ہے۔'' اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ مجھے اس کی آنکھوں میں خوف کی جھلک دکھائی دی۔ وہ دوسری سمت دیکھنے لگی۔

''بھئی، کچھ تو بولو۔ آخر کب تک میں اکیلا ہی باتیں کرتا رہوں گا۔'' میں نے بے بسی سے کہا۔ اس نے ایک گہری سانس لی اور کھوئے کھوئے سے انداز میں بولی۔

''آپ میری زندگی میں رحمت کا فرشتہ بن کے آئے ہیں۔ میں ابھی تک بے یقینی کی کیفیت میں ہوں۔ آپ کا ساتھ مجھے خواب کی طرح لگ رہا ہے۔ ڈرتی ہوں کہ یہ خواب ٹوٹ گیا تو میں کیا کروں گی؟''

میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دبایا۔ ''مجھے چھوؤ، محسوس کرو۔ میں ٹھوس حقیقت ہوں، خواب نہیں۔''

''حقیقت کو خواب ہوتے دیر تھوڑی لگتی ہے۔'' اس نے عجیب سے انداز میں کہا۔

میں جھنجلا گیا۔ ''سمیرا! آخر وہ کیا چیز ہے جو تمہیں خوفزدہ کر رہی ہے؟''

اس نے افسردگی سے میری طرف دیکھا۔ ''کچھ نہیں۔ سوری، میں نے آپ کو پریشان کیا۔'' اس کی آواز بھرا گئی۔ مجھے اپنے لہجے پر افسوس ہوا۔

''دیکھو بھئی۔ میں تمہارا شوہر ہوں۔ تمہیں کوئی بھی مسئلہ ہے تو مجھ سے شیئر کر سکتی ہو۔'' میں نے نرمی سے کہا۔

''میں تھک گئی ہوں۔ اب گھر چلتے ہیں۔'' اس کے چہرے پر واقعی تھکن کے آثار تھے۔ میں نے پورے دن کے لیے ایک ٹیکسی ہائر کی ہوئی تھی۔ کافی دیر ہو چکی تھی، میں نے واپسی کا قصد کر لیا۔

گاڑی میں بیٹھتے ہی اس نے آنکھیں موندلیں۔ میں اس کے رویّے پر غور کرنے لگا۔ وہ خدمت گزار تھی، سلیقہ

www.pklibrary.com

شعار تھی۔ میری ضروریات کا خیال رکھتی تھی۔ اس نے چند دن میں ہی میری زندگی کو خوشیوں سے بھر دیا تھا مگر وہ خود خوش نہیں لگ رہی تھی۔ اسے کوئی پریشانی تھی جس کی وجہ سے وہ گم صم اور ڈری ہوئی رہتی تھی مگر وہ مسئلہ کیا تھا، میں اندازہ لگانے سے قاصر تھا۔ میں اس سے پوچھ، پوچھ کے تھک چکا تھا مگر وہ بتا کے نہیں دیتی تھی۔ اس وقت میری سب سے بڑی خواہش اس کا مسئلہ جاننے کی تھی مگر بعد ازاں میں ہمیشہ پچھتا تا رہا کہ کاش اس کا مسئلہ میرے علم میں آتا ہی نہ۔

☆☆☆

مکان کرائے پر چڑھانے کے لیے میں نے ایک پراپرٹی ڈیلر سے بات کی ہوئی تھی۔ اگلے دن وہ صبح صبح ہی ایک پارٹی لے کر آدھمکا۔ چھوٹی سی فیملی تھی۔ میاں بیوی اور دو بچے۔ مرد کسی سرکاری محکمے میں ملازم تھا۔ مکان انہیں پسند آگیا اور میری شرائط بھی انہوں نے قبول کرلیں۔ یہ مسئلہ حل ہوا تو اگلے ہی دن ہم سامان سمیت گاؤں منتقل ہو گئے۔ میرے دن لگی بندھی روٹین میں گزرنے لگے۔ گاؤں کے لوگ انتہائی ملنسار تھے۔ ان کی صحبت میں، میں زندگی کے حقیقی رنگوں سے پوری طرح لطف اندوز ہو رہا تھا۔

سمیرا کے رویے میں بھی کچھ بہتری آئی تھی۔ وہ ہنسنے بولنے لگی تھی تاہم اب بھی وہ بیٹھے بیٹھے گم صم ہو جاتی تھی۔ میں نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔

قریباً ایک ماہ بعد مجھے تنخواہ کے سلسلے میں اکاؤنٹ آفس کا چکر لگانا پڑا۔ تھوڑی دیر کا کام تھا۔ اس کے بعد میں فارغ ہو جاتا۔ میں نے سوچا کہ سمیرا کو بھی گھما پھرا لاتا ہوں، اس کے مزاج پر اچھا اثر پڑے گا۔ میں نے اسے بھی ساتھ چلنے کا کہا۔ اس نے انکار کیا مگر میری ضد کے آگے آخر کار اسے ہتھیار ڈالنے ہی پڑے۔

بس میں وہ سارے سفر کے دوران گم صم باہر کے نظاروں میں ہی محو رہی۔ میں نے سفر کے آغاز میں اس سے بات چیت کی کوشش کی تھی مگر اس کا موڈ نہ دیکھ کر میں بھی چپ ہو گیا تھا۔ میرا اسٹاپ قریب آیا تو میں نے اسے متوجہ کیا، دو تین بار پکارنے کے باوجود بھی اس نے توجہ نہیں دی تو میں نے اس کا کندھا ہلایا۔ اس کے وجود میں، اس بار بھی حرکت پیدا نہیں ہوئی تو میں نے اسے جھنجوڑ دیا۔ اس کا کھڑکی کے ساتھ ٹکا سر ڈھلک گیا۔ اس کا چہرہ بالکل نیلا پڑا تھا اور بے حد سرد تھا۔ وہ بے ہوش لگ رہی تھی۔ میں گھبرا گیا۔ میرا واویلا سن کے سواریاں بھی میری طرف متوجہ ہو گئیں۔ لوگ مجھے، سمیرا کو اسپتال لے جانے کے مشورے دینے لگے۔ ایک شخص نے نیچے اتر کے ایک ٹیکسی والے سے بات کی۔ وہ ٹیکسی بس کے قریب لے آیا۔ میں نے ایک عورت کی مدد سے سمیرا کو اٹھا کے ٹیکسی میں منتقل کیا۔

''کسی نزدیک ترین اسپتال چلو، جلدی۔'' میں نے بیٹھتے ہی ہیجانی انداز میں ڈرائیور سے کہا۔

سمیرا کی نبض بالکل سست چل رہی تھی۔ جانے اچانک اسے کیا ہو گیا تھا۔ اس نے تو اپنی ناسازی طبیعت کا احساس تک نہ ہونے دیا تھا۔ میں دل ہی دل میں اس کی خیریت کی دعائیں مانگنے لگا۔ کچھ ہی دیر میں ٹیکسی ایک پرائیویٹ کلینک کے سامنے رکی۔ ٹیکسی ڈرائیور میرے کہنے پر ایک اسٹریچر لے آیا، اس کے ساتھ اسپتال کا ملازم بھی موجود تھا۔ میں نے سمیرا کو اٹھا کے اسٹریچر پر ڈالا۔ رجسٹریشن ڈیسک پر ریسپشنسٹ نے مجھ سے سمیرا کے کوائف اور مرض پوچھا۔

''سر! آپ دو ہزار روپے دے دیں۔'' اس نے پیشہ ورانہ انداز میں کہا۔

مجھے علاج سے پہلے کی ہی ادائیگی کھلی مگر سمیرا کی طبیعت کی وجہ سے میں نے بحث نہیں کی۔ ضروری کاغذی کارروائی کے بعد ایمرجنسی میں ایک نرس نے اس کا بی پی چیک کیا۔

''ان کا بی پی بہت لو ہے۔'' نرس بولی۔ اتنے میں ایک ڈاکٹر بھی آچکی تھی۔

''یہ پریگنٹ تو نہیں ہیں؟'' ڈاکٹر نے سمیرا کو دیکھتے ہی سوال کیا۔

''میرے علم کے مطابق تو نہیں۔ باقی آپ ٹیسٹ کر سکتی ہیں۔'' ڈاکٹر اسے زنانہ وارڈ میں لے گئی۔ میں ادھر ہی سر پکڑ کے بیٹھ گیا۔ اچانک پڑنے والی اس افتاد نے میرا سر چکرا دیا تھا۔ میں تو ٹیکسی ڈرائیور کو کرایہ تک دینا بھول گیا تھا۔ اس نے خود توجہ دلائی تو مجھے احساس ہوا۔

کچھ دیر کے بعد ڈاکٹر وارڈ سے باہر نکلتی نظر آئی۔ مجھے اپنی نشست سے اٹھتا دیکھ کے وہ میری طرف بڑھی۔

''پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ بس بی پی لو ہونے کی وجہ سے وہ بے ہوش ہوئی ہیں۔ میں نے الٹرا ساؤنڈ کر کے انجکشن اور ڈرپ لگا دی ہے۔'' اس نے ایک ہی سانس میں ساری تفصیل سنا دی۔

''اس نے صبح ناشتا نہیں کیا تھا۔ اوپر سے لمبا سفر...... شاید اسی وجہ سے اس کا بی پی لو ہوا۔''

وہ مسکرائی۔ ''اس حالت میں ان کی خوراک کا برابر

www.pklibrary.com

خیال رکھیں۔ وہ بہت کمزور ہیں۔''

''اس حالت میں مطلب؟''

''بھئی، تین ماہ سے ان کی پرگننسی چل رہی ہے اور آپ کو خبر ہی نہیں۔'' اس کے الفاظ مجھ پر بم بن کر گرے۔

''تین ماہ سے؟'' میرے لبوں سے بمشکل سرسراتی ہوئی آواز برآمد ہوئی۔

''جی ہاں، تین ماہ سے۔'' وہ تو کہہ کے چلی گئی مگر میری تو جیسے دنیا اندھیر ہوگئی۔ کتنی ہی دیر ہکا بکا کھڑا میں اس کے الفاظ سمجھنے..... کی کوشش کرتا رہا۔ میری شادی کو تو ابھی بمشکل ایک ڈیڑھ ماہ ہی ہوا تھا۔ گویا وہ شادی سے پہلے ہی حاملہ تھی؟ مجھے وسیم کا سمیرا سے جلد شادی پر زور دینا، سمیرا کا ہر وقت گم صم اور پریشان ہونا..... سب یاد آ رہا تھا اور میرے ذہن میں کڑیوں سے کڑیاں ملتی جا رہی تھیں۔

تو کیا اس بچے کا باپ وسیم ہے؟ مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ سمیرا، وسیم کی سگی خالہ زاد نہیں تھی۔ وہ جس طرح ان کی سپورٹ کر رہا تھا، ایسے کوئی بے غرض تو نہیں کرتا اور وہ بھی دور پار کے رشتے دار کی۔ وہ خود شادی شدہ تھا۔ اس لیے سمیرا سے شادی بھی نہیں کر سکتا تھا۔ سمیرا اس کے تعلقات کے نتیجے میں حاملہ ہوگئی تھی۔ وہ اس مسئلے کا کوئی حل ڈھونڈ رہے تھے اور خوش قسمتی سے عین موقع پر میرے جیسا کاٹھ کا الو انہیں مل گیا تھا۔

کچھ بھی تھا میرے ساتھ بہت بڑا دھوکا ہوا تھا۔ میں اپنی سادہ لوحی کے سبب بہ آسانی شکار ہو گیا تھا۔ غم و غصے سے میرا برا حال ہو رہا تھا۔ میری ساری زندگی خوشیوں کو ترستے ہی گزری تھی۔ جب کبھی خوشی ملی بھی تھی تو ادھوری خوشی۔ ایک طویل عرصے کے بعد میری بے رنگ زندگی میں کچھ رنگ بھرے تھے، مگر یہ رنگ بھی کچے ثابت ہوئے تھے۔ میری آنکھیں گرم پانی سے بھر گئیں۔

میں اسپتال سے باہر نکل آیا۔ سڑک پر ٹریفک رواں دواں تھا۔ لوگ اپنی اپنی مصروفیات میں بھاگ دوڑ رہے تھے۔ مجھ پر قیامت گزر گئی تھی مگر کسی کو رتی برابر بھی فرق نہیں پڑا تھا۔ میں دھندلائی ہوئی آنکھوں سے بے سمت چل پڑا۔ اچانک مجھے سمیرا کا خیال آیا۔ میں اسے اسپتال میں اکیلا چھوڑ آیا تھا۔

اسے چھوڑنا ہی ہے۔ کہاں چھوڑا، سے اب کیا فرق پڑتا ہے۔ میں نے افسردگی سے سوچا۔

''جو ہونا تھا ہو گیا۔ اب آگے جو کرنا ہے سوچ سمجھ کے کرو۔ ہمیشہ جذبات میں آ کے، جلد بازی میں تم نے غلط فیصلے کیے اور بعد میں پچھتائے۔ ایک بار پھر یہ غلطی نہ کرو۔'' میرے ذہن نے مجھے مشورہ دیا۔

میں نے خود کو سنبھالا اور اس مسئلے کے ممکنہ تمام حل سوچنے لگا۔ بہت سوچ بچار کے بعد آخر کار میں ایک نتیجے پر پہنچ گیا۔ وسیم اور سمیرا نے مل کر مجھے دھوکا دیا تھا۔ اب سمیرا کو تو میں نے چھوڑنا ہی تھا مگر ان دونوں کو اس دھوکا دہی کی سزا ملنا بھی ضروری تھی۔ میں گاؤں کے چند سرکردہ لوگوں کو بلا کے ان کے سامنے وسیم اور سمیرا کے کرتوت عیاں کرتا اور فیصلہ انہی پر چھوڑ دیتا۔

میں واپس اسپتال آیا۔ ڈاکٹر مجھے دیکھ کے ہی خفگی سے بولی۔ ''آپ کہاں چلے گئے تھے؟ آپ کی مسز آپ کا پوچھ رہی تھیں۔''

''ایک ضروری کام سے باہر گیا تھا۔'' میں نے سپاٹ سے انداز میں جواب دیا۔ ''اب کیسی طبیعت ہے اس کی؟''

''وہ بہتر ہیں مگر ان کی خوراک کا خاص خیال رکھیں۔ ان کی ڈرپ ختم ہو جائے تو آپ انہیں لے جا سکتے ہیں۔ میں یہ کچھ میڈیسنز لکھ کے دے رہی ہوں، یہ ان کو ریگولر دیں اور ان کا باقاعدگی سے چیک اپ کرائیں۔''

میں دواؤں کا پرچہ لے کر باہر آ گیا۔ سمیرا کا سامنا کرنے کی مجھ میں ہمت نہیں تھی۔ میں باہر ہی بیٹھ کے اس کا انتظار کرنے لگا۔ کچھ ہی دیر میں ایک نرس اسے سہارا دے کر باہر لے آئی۔ اس کا چہرہ ہلدی کی طرح زرد نظر آ رہا تھا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی اس کی پلکیں لرزیں۔ مجھے لگا کہ وہ پھر سے بے ہوش ہو کر نہ گر جائے۔ میں زبردستی کی مسکراہٹ سجا کے اس کی طرف بڑھا۔ میں نے اس کا حال دریافت کیا۔ وہ بے یقینی اور الجھن بھری نظروں سے مجھے دیکھتی رہ گئی۔

میں اسے سہارا دے کر باہر لے آیا۔ ہم ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔ وہ بار بار میرے چہرے کی جانب دیکھ رہی تھی۔ وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتی تھی مگر اس کے لب لرز کے رہ جاتے۔ مجھے اس پر ترس آ رہا تھا لیکن میں نے دل کو سخت کر لیا۔ میں کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔

ٹیکسی سے اتر کے ہم بس کی طرف بڑھ رہے تھے کہ وہ اچانک بولی۔ ''آپ کوئی بات کیوں نہیں کر رہے؟'' میں نے چونک کے اسے دیکھا۔ میں یہاں کوئی تماشا کھڑا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے جی کڑا کر کے مسکراتے ہوئے بولا۔ ''تمہارے ہی خیال سے بات نہیں کر رہا۔ تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں نا۔'' اس نے الجھن بھرے انداز میں مجھے دیکھا تاہم بولی کچھ نہیں۔

www.pklibrary.com

بس کا سفر بھی خاموشی میں ہی طے ہوگیا۔ اس نے بھی دوبارہ میرے نہ بولنے کا شکوہ نہیں کیا تھا۔ ہم رات کا اندھیرا پھیلنے کے بعد گھر پہنچے۔

اپنے کمرے میں پہنچتے ہی میں نے اس کی الٹرا ساؤنڈ رپورٹ اس کے سامنے پھینکی۔

اس کا رنگ فق ہوگیا۔ ''یہ کیا ہے؟'' اس نے لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''تمہارا اعمال نامہ۔'' میرے اندر آندھیاں چل رہی تھیں تاہم میرا انداز سپاٹ تھا۔

اس نے لرزتے ہاتھوں سے رپورٹ اٹھائی۔ خوف سے اس کی رنگت پیلی پڑ گئی تھی۔ یکدم وہ رپورٹ پھینک کے میرے پاؤں پڑ گئی۔

''مجھے معاف کر دیں۔'' اس نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔

میں نے اسے جھٹکنے کی کوشش کی مگر وہ میری ٹانگوں کے ساتھ لپٹ گئی۔ ''میں تب تک آپ کو نہیں چھوڑوں گی جب تک آپ مجھے معاف نہیں کر دیتے۔''

''تمہیں تو اب خدا بھی معاف نہیں کرے گا۔'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔

''وہ میرا اور خدا کا معاملہ ہے۔ وہ میری مجبوریاں سمجھتا ہے۔ پلیز، آپ مجھے معاف کر دیں۔'' وہ میری ٹانگوں سے چمٹے زاروقطار رو رہی تھی۔ مجھے اس پر ترس آنے لگا۔

میں نے لہجہ سخت کرتے ہوئے کہا۔ ''میرے پاؤں چھوڑو۔''

اس نے سر اٹھا کے مجھے دیکھا۔ اس کے زرد چہرے پر آنسو قطار کی صورت بہہ رہے تھے۔ میرا دل کٹا۔ میں نے اسے کندھوں سے پکڑ کے سیدھا کیا۔ ''اٹھو، آرام سے بیٹھ کے بات کرتے ہیں۔''

اس نے بے یقینی سے مجھے دیکھا۔ میں نے اسے چارپائی پر بٹھایا۔ اس کی سسکیاں میرا دل پگھلا رہی تھیں۔

''بتاؤ، کس کے ساتھ رنگ رلیاں مناتی رہی ہو؟''

''پلیز، مجھے معاف کر دیں۔ میں آپ کے بغیر نہیں رہ سکتی۔'' وہ یکدم مجھ سے لپٹ کے مجھے چومنے لگی۔ میرا سوال اس نے یکسر ہی نظرانداز کر دیا تھا۔

میں اسے پیچھے دھکیلنے لگا۔ وہ میرے ساتھ لپٹتے ہوئے بولی۔ ''میں ساری زندگی آپ کی غلام بن کے رہوں گی۔''

میں نے اسے کندھے سے پکڑ کے پیچھے ہٹایا۔ ''وسیم تھا نا وہ؟''

''خدا بھی آپ کو اس کا اجر دے گا۔ آپ نے مجھ بے سہارا کا ہاتھ تھاما تھا۔ پلیز، اب مجھے چھوڑنا مت۔'' وہ سسکیاں لیتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ میرا فیصلہ کمزور پڑنے لگا۔

اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ ''بھائی، کھانا کھا لیں۔'' نوشین نے پکارا۔

''آتے ہیں۔'' میں نے کہتے ہوئے سمیرا کی طرف دیکھا۔ ''تم خود کو سنبھالو۔ میں نے اپنے گھر والوں کو ابھی کچھ نہیں بتایا۔ کھانا کھالو، پھر اس موضوع پر بات کرتے ہیں۔''

''آپ نے مجھے معاف کر دیا ہے نا؟'' اس کے لہجے میں امید ہلکورے لے رہی تھی۔

میں کچھ کہے بغیر باہر نکل آیا۔ سمیرا بھی تھوڑی دیر بعد مشترکہ کھانے میں شریک ہوگئی۔ میں نے دن کا کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔ اس وقت بھوک شدت کی لگ رہی تھی مگر نوالہ حلق سے اترتا ہی نہیں رہا تھا۔ میری نظر سمیرا کے چہرے پر پڑی۔ اس کی رنگت میں جیسے سرسوں کی زردی گھلی ہوئی تھی۔ رونے کے بعد اس کی آنکھیں بے حد شفاف نظر آرہی تھیں۔

''کیا اس کو چھوڑ کے تم زندگی بھر خوش رہ پاؤ گے؟'' میرے دل نے مجھ سے سوال کیا۔

''اس کے ساتھ بھی تو خوش نہیں رہ سکوں گا۔'' میں نے بے بسی سے سوچا۔

''تمہارے تو مقدر میں اداسی لکھی ہی ہے پھر کیوں نہ کسی اور کی زندگی بچا لو۔ تمہاری وجہ سے کسی کی زندگی برباد ہونے سے بچ جائے تو یہ گھاٹے کا سودا تو نہیں۔'' میرے اندر سے آواز ابھری۔ میں کشمکش کا شکار ہوگیا۔ میں نے اٹل فیصلہ کیا تھا مگر دل اور دماغ کی جنگ نے ایک بار پھر مجھے دوراہے پر لا کھڑا کیا تھا۔

☆☆☆

میں نے سمیرا کی خاطر قربانی دینے کا فیصلہ کیا تھا۔ میں نے سمیرا کو معاف کر دیا لیکن میرا دل بجھ کے رہ گیا تھا۔ وہی بے کیفی اور بے حسی مجھ پر ایک بار پھر مسلط ہوگئی تھی جس کا میں ایک عرصے تک شکار رہا تھا۔

سمیرا کا خوف ختم ہوگیا تھا، اب وہ ہنسنے بولنے لگی تھی۔ وہ میرا اور میرے گھر والوں کا بھرپور خیال رکھ رہی تھی مگر مجھے اب اس سے وہ پہلی سی محبت محسوس نہیں ہوتی تھی۔ جب میرا خیال اس کے وجود میں پلتے بچے کی طرف جاتا تو مجھے اس سے گھن آنے لگتی۔ مجھے احساس تھا کہ میں نے اسے معاف کر کے غلط فیصلہ کیا ہے۔ اب اس کا بچہ ساری زندگی میرے لیے آزار کا باعث بننے والا تھا لیکن میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی

www.pklibrary.com

اپنے فیصلے کو قبول کر لیا تھا۔ سمیرا کا پیٹ جوں جوں بڑھتا جا رہا تھا میرے ڈپریشن میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ سات ماہ بعد بچہ پیدا ہوتا تو پھر بھی لوگ باتیں بناتے۔ میں نے اپنے تئیں سمیرا کو جس بدنامی سے بچانے کے لیے قربانی دی تھی، وہ بدنامی میرے بھی گلے پڑنے والی تھی۔

پہلے وہ گم صم رہتی تھی اور میں اسے ہنسانے کی کوشش کرتا رہتا تھا مگر زندگی کے اس موڑ پر اب ہم دونوں کا کردار آپس میں بدل گیا تھا۔ میں حد درجہ چڑچڑا بھی ہو گیا تھا۔ وہ میری ترش روئی کو خندہ پیشانی سے برداشت کر لیتی۔ کبھی کبھی مجھے خیال آتا کہ ایسے تو میں خود اپنے ہاتھوں اپنی زندگی برباد کر رہا ہوں مگر اس بربادی میں بھی مجھے ایک طرح کا سکون محسوس ہوتا تھا۔ خود کو تکلیف دینے میں بھی راحت ملتی تھی۔

وسیم کو دیکھ کر میرا دماغ کھولنے لگتا تھا مگر میں دنیا دکھاوے کو اس سے ہنس کے بات کر لیتا تھا۔ مجھے اب گاؤں کے لوگوں سے بھی بات کرنے کا دل نہیں کرتا تھا۔ میرے ساتھ تو یہاں بھی دھوکا ہی ہوا تھا۔ میں اسکول سے چھٹی کر کے سیدھا گھر آجاتا تھا اور گم صم ایک کونے میں پڑا رہتا تھا۔

سمیرا کی ڈلیوری کے دن قریب آئے تو میں اسے شہر لے آیا۔ اس کی امی بھی ہمارے ساتھ تھیں۔ میں نے سمیرا کو اسپتال میں داخل کرا دیا۔ وہ بے حد خوفزدہ تھی۔ اس کے داخل ہونے کے دو دن بعد بچہ پیدا ہوا۔ وہ انتہائی کمزور تھا۔ اس کو سانس کا مسئلہ بھی تھا۔ اسے چند دن نرسری میں رکھا گیا۔ میرے احساسات پر برف جمی ہوئی تھی۔ میں گم صم اسپتال کے احاطے میں بیٹھے بیٹھے دن گزار دیتا۔

بچے کے کمزور ہونے اور نرسری میں داخل ہونے کی وجہ سے اس کی قبل از وقت پیدائش کا مسئلہ حل ہو گیا تھا مگر مجھے کوئی خوشی محسوس ہی نہیں ہوئی تھی۔ ایک ہفتے بعد ڈاکٹرز نے سمیرا کو ڈسچارج کر دیا۔

میری امی اور نوشین بچے کو دیکھ کے بے انتہا خوش ہوئیں۔ وہ پورا دن اس کے آس پاس رہتیں۔ سمیرا تو اسے ہاتھ لگاتے ہوئے بھی ڈرتی تھی۔ وہ بار بار مجھے خوفزدہ انداز میں دیکھنے لگتی۔ رات کو جب تک میں سو نہ جاتا وہ بچے کے پاس جاتی ہی نہیں تھی۔ میرے دل میں بچے کے لیے کوئی جذبہ موجود نہیں تھا۔ نہ محبت کا، نہ نفرت کا۔ میرے احساسات جیسے مر چکے تھے اور پھر میرے احساسات کی پُرسکون جھیل میں وسیم کی آمد سے ارتعاش برپا ہوا۔

جن دنوں بچے کی ولادت ہوئی تھی، وسیم امتحانی ڈیوٹی پر تھا۔ وہ واپس آیا تو اس نے مجھے مبارکباد دیتے ہوئے جس طنزیہ سے انداز میں میری طرف دیکھا، اس پر میرا خون کھول اٹھا۔ بہ مشکل میں نے خود پر قابو پایا، ورنہ اس دن میرا شدت سے جی چاہا تھا کہ اس کا منہ توڑ دوں۔ مجھے ڈر تھا کہ میں کوئی انتہائی قدم نہ اٹھا لوں۔ میں اسکول سے نکل آیا۔ اس حالت میں، مجھے گھر جانا بھی مناسب نہ لگا۔ میں بازار چلا گیا۔ دن بھر آوارہ گردی کے بعد میں رات کو ہی گھر لوٹا۔ اتنی دیر میں، میں خاصی حد تک نارمل ہو چکا تھا مگر بچے پر نظر پڑتے ہی میرے دماغ میں چنگاریاں سی چھوٹنے لگیں۔ آج پہلی بار مجھے اس سے بے پناہ نفرت محسوس ہو رہی تھی۔ یہ اس شخص کا خون تھا جس نے اپنا گناہ مجھ پر لاد دیا تھا اور میں بیوقوف اس کے گناہ کو اپنا نام دے رہا تھا۔ اس کی پرورش کر رہا تھا۔ میرا دماغ کھول رہا تھا۔ میں سونے کے لیے لیٹ تو گیا تھا مگر نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ وسیم کی طنزیہ مسکراہٹ جیسے میرے دماغ کے ساتھ چپک کے رہ گئی تھی۔

میں نے کن انکھیوں سے سامنے والی چارپائی پر دیکھا۔ سمیرا بچے کو آگے رکھے بے خبر سو رہی تھی۔ بچے پر میری نظر پڑتے ہی دماغ میں ایک خیال کوندے کی طرح لپکا۔ ”اسے مار دو۔“

میں نے گھبرا کے سمیرا کی طرف دیکھا۔ وہ میرے ذہن میں آنے والے خیال سے بے خبر گہری نیند میں تھی۔

”اس بچے نے تمہاری زندگی میں زہر گھول دیا ہے۔ یہ جب تک تمہارے سامنے رہے گا تم سکون سے نہیں رہ پاؤ گے۔ آج یہ چھوٹا ہے، کل کلاں یہ بڑا ہو گا۔ تمہارے پاس آئے گا۔ تم سے باپ کا پیار اور شفقت چاہے گا۔ تب تم اس کا سامنا کیسے کرو گے؟ رہی بات سمیرا کی تو وہ چاہے اس کی ماں ہو مگر اس کا وجود اس کے لیے بھی ان چاہا ہی ہے۔ اس بچے نے اسے بھی بے سکون کر رکھا ہے۔ یہ جب تک زندہ رہے گا سمیرا کی زندگی سے خوف نہیں نکلے گا۔ وہ ہمیشہ تمہارے اور اس کے بیچ پستی رہے گی۔“ میرے اندر کی آواز مسلسل مجھے بہکا رہی تھی، اکسا رہی تھی۔ مجھے مستقبل کا وہ چہرہ دکھا رہی تھی جو میرے لیے ناقابل برداشت تھا۔ میں اگر حقیقت پسند بن کے سوچتا تو اس بچے کی زندگی میں میری موت تھی اور اس کی موت میں ہی میری زندگی تھی۔ میں نے حقیقت پسند بن کے ہی سوچا اور ایک فیصلے پر پہنچ گیا۔

میں دھیرے سے اٹھا۔ میں پُرسکون تھا۔ میرے

www.pklibrary.com

قدموں میں کوئی لرزش نہیں تھی۔ میں نے ایک نظر سمیرا کی طرف دیکھا۔ وہ گہری نیند میں تھی۔ اس کے چہرے پر سکون پھیلا ہوا تھا۔ اس کی طرف سے مطمئن ہو کے میں نے بچے کے چہرے پر ہتھیلی رکھ دی۔ وہ ذرا سا کسمسایا۔ میری نظر سمیرا پر تھی۔ اس کے چہرے پر بے چینی پھیلی مگر میں بے حسی سے ہاتھ جمائے تب تک کھڑا رہا جب تک بچے کا چہرہ ٹھنڈا نہیں ہو گیا۔ میں نے ہاتھ ہٹا کے اسے دیکھا۔ اس کا چہرہ نیلا پڑ چکا تھا۔ وہ مر چکا تھا۔ سمیرا سوئی ہوئی تھی مگر اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار نظر آ رہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کوئی بھیانک خواب دیکھ رہی ہو۔

میں پُرسکون انداز میں چلتے ہوئے اپنی چارپائی پر جا کر لیٹ گیا۔ میں نے اس سنپولیے کو کچل دیا تھا جس نے میری زندگی میں زہر گھول رکھا تھا۔ میرے اندر گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ مجھے نہ خوشی کا احساس ہو رہا تھا نہ خوف، دکھ یا پشیمانی کا۔ ہر احساس گویا مر چکا تھا۔

☆☆☆

میری آنکھ سمیرا کی چیخ سے کھلی تھی۔ میں ہڑبڑا کے اٹھا۔

''کیا ہوا؟''

''ذیشان، اسے دیکھیں.....'' یہ کہتے ہی وہ سسکیاں لینے لگی۔

میں خالی خالی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگا۔ میرے دماغ میں جھماکا سا ہوا اور نیند سے بوجھل دماغ یکدم روشن ہو گیا۔ وہ تو میری کارروائی کا نتیجہ ہی مجھے دکھا رہی تھی۔

میں اٹھ کے اس کے پاس گیا۔ بچے کے مردہ چہرے پر نظر پڑتے ہی میرے اندر عجیب سا خوف جاگا۔ میں نے خود کو سنبھالتے ہوئے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ ''یہ تو مر گیا ہے۔'' میرے لبوں سے سرسراتی ہوئی سرگوشی برآمد ہوئی۔

''مر کیسے؟'' وہ چیخی۔

''اسے سانس کا مسئلہ تھا نا۔'' میں جیسے خودکار سے انداز میں بولا۔ اس نے عجیب سی نظروں سے میری جانب دیکھا اور دھاڑیں مار مار کے رونے لگی۔ اس کا واویلا سن کے اس کی امی اور نوشین دوڑی آئیں۔ بچے کی اچانک موت نے انہیں بھی سکتہ زدہ کر دیا تھا۔

''کیا ہوا؟'' دوسرے کمرے سے میری امی عجیب خوفزدہ انداز میں چلاتے ہوئے پوچھ رہی تھیں۔ میں ان کی طرف بڑھا۔ وہ لڑکھڑاتی ہوئی قدم گھسیٹ رہی تھیں۔ میں نے انہیں کندھے سے پکڑ کے بٹھایا اور تسلی دینے لگا۔

دوسرے کمرے سے اب بلند انداز میں رونے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ فجر کا وقت تھا۔ شور سن کے گاؤں کے لوگ بھی آ گئے۔ حقیقتِ حال جان کے مرد مجھے تسلی دلاسا دینے لگے۔

دوپہر کو بچے کی تدفین کر دی گئی۔ میرا خیال تھا کہ بچے کی موت کے بعد میں پھر سے جینے لگوں گا مگر یہ میری خام خیالی تھی، اس کی موت نے تو مجھے بھی زندہ لاش بنا دیا تھا۔ میرے اندر جینے کی جو بچی کھچی امنگ تھی، وہ بھی دم توڑ گئی تھی۔ بچے کا مردہ چہرہ جیسے میرے دماغ کے ساتھ چپک کے رہ گیا تھا۔ وہ خوابوں میں مجھے ڈرایا کرتا۔

سمیرا نے خود کو تیزی سے سنبھال لیا تھا۔ وہ بننے بولنے لگی تھی۔ وہ مجھ سے التفات کا مظاہرہ کرتی لیکن مجھے جیسے اس میں بھی کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ وہ میرا رویہ دیکھ کے جھنجلا جاتی مگر میں کیا کرتا، بے بس تھا۔ میرا اپنے احساسات پر کوئی زور ہی نہیں تھا۔ میں چاہ کے بھی انہیں زندہ نہیں کر سکتا تھا۔

گاؤں سے بھی میرا دل بالکل ہی اچاٹ ہو گیا تھا۔ میں نے اپنا ٹرانسفر دوبارہ شہر میں کرانے کا فیصلہ کیا۔ شہر کی مصروف زندگی شاید میرے مزاج پر مثبت اثر ڈالتی۔ ٹرانسفرز سے بین ہنا تو میں نے اپلائی کر دیا۔ میرا ٹرانسفر ہو گیا۔ سمیرا کو پتا چلا تو وہ اداس ہو گئی۔ اسے گاؤں میں رہنا پسند تھا مگر وہ میرے فیصلے پر اعتراض کی پوزیشن میں نہیں تھی۔ ہم دوبارہ اپنے گھر میں شفٹ ہو گئے۔ سمیرا کی امی بھی ہمارے ساتھ تھیں۔ میرا جس اسکول میں ٹرانسفر ہوا تھا وہ گھر سے بیس بائیس کلو میٹر کے فاصلے پر ہی تھا۔ اسٹاف ویسا ہی بے حس اور بے مروت تھا جیسا میرے پہلے اسکول کا تھا لیکن مجھے اب تجربہ ہو چکا تھا۔ میں ان سے لیے دیے ہی رہتا۔

مکان کے کرائے کی مد میں جو رقم آتی رہی تھی، وہ کرائے دار میرے اکاؤنٹ میں جمع کرا دیا کرتا تھا۔ گاؤں میں اخراجات کم تھے اس لیے اس رقم کا بیشتر حصہ بچ گیا تھا۔ میں نے اسکول کے قریب ہی موبائل ایسسریز کی ایک دکان کھول لی۔ دکان پر ایزی لوڈ، ایزی پیسا، کپوزنگ و پرنٹنگ وغیرہ جیسی سہولیات بھی دستیاب تھیں۔ میرا کاروبار چل نکلا۔ میں رات کو گیارہ بجے چھٹی کر کے گھر جاتا۔ میری معاشی حالت قدرے بہتر ہو گئی تھی مگر میرے اندر کی کیفیت میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی تھی۔

اسامہ اور ہانیہ کی پیدائش بھی میرے احساسات پر جمی برف نہیں پگھلا سکی تھی۔ میں ان کا خیال رکھتا تھا، ان سے پیار کرتا تھا مگر یہ سب جیسے مشینی سے انداز میں کرتا تھا۔

www.pklibrary.com

ان کی معصوم اور پیاری پیاری حرکتیں دیکھ کے میرے لبوں پر مسکراہٹ آجاتی لیکن پھر یکدم میرے ذہن کے پردے پر اس معصوم بچے کا چہرہ آجاتا جسے میں نے اپنے ہاتھ سے مارا تھا، میرے لبوں پر چھائی مسکراہٹ معدوم ہوجاتی۔ میں وہاں سے اٹھ جاتا۔

پہلے میں اپنا کسی قدر خیال رکھا کرتا تھا۔ میں خوش لباس تھا، میری شخصیت بھی متاثر کن تھی لیکن اب مجھے نہ اپنے لباس کی فکر ہوتی تھی نہ حلیے کی۔ کئی کئی دن میں شیو نہیں بناتا تھا۔ سمیرا ابھی میرے اس رویے سے تنگ تھی۔ وہ مجھ سے بارہا میرے رویے کی وجہ دریافت کر چکی تھی لیکن میرے پاس بتانے کو کچھ ہوتا تو بتاتا۔

اس عرصے میں نوشین کی شادی ہو چکی تھی۔ اس کی شادی کے ایک ماہ بعد ہی امی ہمیں تنہا چھوڑ گئی تھیں۔ میں ان کا بھی اس طرح خیال نہیں رکھ سکا تھا جو ایک بیٹے کا حق ہوتا ہے۔ یہ پچھتاوا بھی مجھے پریشان کیے رکھتا تھا۔ پچھتاوا اور اداسی جیسے میرے مزاج کا حصہ بن چکے تھے۔

کبھی کبھی تو میرے اندر اتنی اداسی پھیل جاتی کہ میرا دل چاہتا کہ میں خود کشی کرلوں لیکن بچوں کا خیال مجھے اس امر سے باز رکھتا تھا۔ مجھے احساس تھا کہ میری زندگی برباد ہو چکی ہے۔ میں چاہ کے بھی اسے آباد نہیں کرسکتا تھا۔ کبھی کبھار میرے اندر شدت سے خواہش ابھرتی کہ کاش وقت اڑان بھرے اور مجھے پیچھے لے جائے۔ اس دن، جب میں نے اپنی تباہی کی پہلی اینٹ رکھی تھی۔ میں گودام میں رکھی موم بتی بجھا دوں۔ میں میٹرک میں اچھے نمبر لوں۔ کمپیوٹر سائنس کی فیلڈ اختیار کروں اور اس میں کوئی کارنامہ سرانجام دوں۔ نہ درجۂ چہارم کی نوکری کروں، نہ کسی گاؤں جاؤں اور نہ ہی وسیم اور سمیرا جیسے کسی شخص کے ہاتھوں دھوکا کھا کے اپنی زندگی برباد کرلوں۔ کسی معصوم کا لہو ہاتھوں پر نہ لگے۔ اس کے علاوہ مجھے اپنی زندگی بہتر کرنے کا کوئی چارہ نظر نہیں آرہا تھا۔

اس رات سمیرا نے مجھ سے اگلے دن شاپنگ پر ساتھ چلنے کا کہا تھا۔ اس نے بچوں کی کچھ چیزیں لینی تھیں۔

اگلے دن اتوار تھا۔ میں سکون سے نیند پوری کرنا چاہتا تھا اور پھر دکان کا کچھ سامان لینے جانا تھا۔ اس کی خواہش مجھے بری طرح کھلی۔ ”تم جا کے لے لینا۔ مجھے ضروری کام ہے۔“ میں نے سپاٹ سے انداز میں کہا تھا۔

اس نے غصے سے مجھے دیکھا۔ ”یہ بھی کام ہی ہے اور ضروری ہی ہے۔“ وہ لفظوں کو چبا چبا کے بولی تھی۔

اس دن میرا موڈ کچھ زیادہ ہی خراب تھا۔ اس کے انداز نے مجھے طیش دلا دیا۔

”ضروری ہے تو جا کر خود کرلینا شاپنگ۔ میرا جانا ضروری ہے کیا؟“

”جی ہاں، بچے آپ کے بھی ہیں۔ مجھ اکیلی کے نہیں ہیں۔“

”تم بار بار مجھے یہ احساس کیوں دلاتی ہو۔ کیا میں نہیں جانتا کہ بچے میرے بھی ہیں۔“ میں یکدم چلایا تھا۔

”میں جو کچھ کرتا ہوں بچوں کے لیے اور تمہارے لیے ہی کرتا ہوں۔ میری زندگی تو تم برباد کر ہی چکی ہو۔ اب کیا چاہتی ہو کہ میں ہر وقت تمہارے اشاروں پر ہی چلتا رہوں۔“ میں جانے کیا کچھ کہتا جا رہا تھا۔

سمیرا میرے اس رویے کی عادی ہو چکی تھی۔ وہ عموماً جب میں غصے میں ہوتا تھا تو مجھ سے بحث نہیں کرتی تھی لیکن اس دن وہ بھی چپ نہیں رہی۔ پہلے تو وہ مجھے برا بھلا کہتی رہی اور پھر خود ہی رونے لگی تھی۔ مجھے اس کے رونے پر غصہ بھی آرہا تھا اور دکھ بھی ہو رہا تھا جو بتدریج بڑھتا جا رہا تھا۔ میں منتظر تھا کہ وہ چپ ہو اور میں بھی سسکوں مگر وہ جیسے آج ہی اپنے سارے آنسو بہا دینا چاہتی تھی۔ اس کی سسکیوں نے مجھے بے سکون کر دیا تھا۔ اب وہ چپ ہو بھی جاتی تو میں پوری رات بے قراری سے کروٹیں بدلتا رہتا۔ آخر کار میں تنگ آکر اٹھا۔ میں نے وضو کر کے دو رکعت نماز..... پڑھی۔ میں دعا میں خدا سے سکون اور اطمینان مانگ رہا تھا۔ میری کیفیت عجیب ہو رہی تھی۔ دعا مانگتے ہوئے اچانک میرے دماغ میں ایک خیال آیا کہ خدا کے خزانے میں آخر کس چیز کی کمی ہے۔ وہ چاہے تو مجھے میری زندگی دوبارہ سے بھی عطا کرسکتا ہے۔ وہی زندگی جو میں نے اپنے ہاتھوں سے برباد کی تھی۔ دوسری زندگی میں، میں اپنی ساری غلطیاں سدھار سکتا تھا۔ میں روتے روتے خدا سے دعا مانگنے لگا۔ ”یا اللہ! مجھے اطمینان عطا کر یا مجھے میری زندگی واپس لوٹا دے۔“ میں جانے کتنی ہی دیر تک یہ دعا مانگتا رہا۔ میں شاید دعا مانگتے ہی سو گیا تھا اور پھر میں نے وہ پراسرار خواب دیکھا تھا۔ جانے کیسے میں ڈریم ورلڈ میں پہنچ گیا تھا۔ سمیرا اور بچے کمرے میں موجود ہی نہیں تھے۔ میں کچن میں گیا اور وہاں میں نے اپنی امی کو دیکھا تھا۔ انہیں دیکھ کر مجھے حیرت کا جو جھٹکا لگا تھا، اس نے میرے قدموں کے نیچے سے گویا زمین ہی نکال دی تھی۔ میں گرا تھا اور میرا سر دیوار سے ٹکرایا تھا۔ اس تصادم نے مجھے ہوش و حواس سے بیگانہ کر دیا تھا۔

www.pklibrary.com

☆☆☆

مجھے ہوش آیا تو میں اسپتال کے کمرے میں تھا۔ میرے سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ سامنے کرسی پر امی بیٹھی تسبیح پڑھ رہی تھیں۔ مجھے آنکھیں کھولتے دیکھ کر وہ بھاگی ہوئی میرے پاس آئیں۔

انہوں نے مجھ سے کچھ کہا تھا۔ شاید میرا حال پوچھا تھا لیکن میرا ذہن ان الفاظ کو سمجھنے سے قاصر رہا۔ میں خالی الذہنی کی کیفیت میں انہیں دیکھتا رہ گیا۔ انہیں دوبارہ زندہ دیکھ کے، اپنے سامنے پا کر مجھے خوشی ہونی چاہیے تھی لیکن میری کیفیت عجیب سی ہو رہی تھی۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔

سمیرا اور بچوں کا خیال آتے ہی میں تڑپ گیا۔ اگر یہ سب حقیقت تھی تو کیا میں انہیں ہمیشہ کے لیے کھو چکا تھا۔ یہ زندگی میں نے اپنی خواہش سے چنی تھی، بلکہ رو رو کے خدا سے مانگی تھی۔ شاید میری دعا میں اتنی طاقت تھی کہ انہونی ہو گئی تھی لیکن مجھے خوشی کا احساس ہی نہیں ہو رہا تھا۔ کوئی احساس تھا تو بس احساسِ زیاں اور یہ احساس اتنا طاقتور تھا کہ میری پلکوں کے گوشے بھیگنے لگے۔ امی حیرت اور پریشانی کے ملے جلے تاثرات سے مجھے دیکھ رہی تھیں۔ میری حالت دیکھ کر وہ ڈاکٹر کو بلانے چلی گئیں۔

ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے مجھ سے کوئی بات کی۔ شاید مجھ سے کوئی سوال پوچھا تھا لیکن اس کے الفاظ مجھے سمجھ ہی نہیں آئے تھے۔ میں خالی خالی آنکھوں سے اسے دیکھتا رہ گیا۔ جب میں نے اس کی کسی بات کا جواب نہیں دیا تو اس کے چہرے پر بھی پریشانی جھلکنے لگی۔

اس نے امی سے کوئی بات کی اور کمرے سے چلا گیا۔ امی پریشانی سے مجھے دیکھ رہی تھیں۔ وہ میرے پاس آئیں اور میرے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگیں۔ مجھے سکون کا احساس ہوا۔ کچھ ہی دیر میں، میں نیند کی وادی میں اتر گیا۔

میری دوبارہ آنکھ کھلی تو میں نے خود کو حرکت کرتے ہوئے پایا۔ میں نے گرد و نواح کا جائزہ لیا۔ مجھے اسٹریچر پر کہیں لے جایا جا رہا تھا، پھر میری نظر ابو پر پڑی۔ وہ اسٹریچر کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ ان کے چہرے پر بھی پریشانی کے تاثرات تھے۔ ایک طویل عرصے کے بعد ان کا چہرہ دیکھ کر مجھے عجیب سا احساس ہوا۔ میں اس احساس کو کوئی نام دینے سے قاصر تھا۔ میں یک ٹک انہیں دیکھتا رہ گیا۔ میں جو کھو چکا تھا وہ مجھے دوبارہ مل گیا تھا اور جو میں نے حاصل کیا تھا، وہ کھو چکا تھا۔ میرے پاس جو نہیں تھا اس کی محرومی نے ہمیشہ رلایا تھا، میرے پاس جو تھا اس کی کبھی میں نے قدر نہیں کی تھی۔ مجھے احساس ہو رہا تھا کہ ہمیشہ کی طرح شاید اس بار بھی میں نے جلد بازی میں غلط فیصلہ کیا تھا۔ شاید ایک بار پھر پچھتاوے میرا مقدر بننے والے تھے۔

میرے مختلف ٹیسٹ لینے کے بعد مجھے دوبارہ کمرے میں لایا گیا۔ امی اور ابو میرے متعلق باتیں کرنے لگے۔ وہ میرے لیے بے حد پریشان نظر آ رہے تھے۔ مجھے پشیمانی نے گھیر لیا۔ مجھے اس حقیقت کو قبول کرنا تھا، خوشی سے قبول کرنا تھا۔ وہ سب کچھ حاصل کرنا تھا جو میں پہلی زندگی میں حاصل نہیں کر سکا تھا۔ جس کی خواہش نے مجھے ہمیشہ پریشان رکھا تھا۔

میں ڈبڈباتی ہوئی آنکھوں سے اپنے ماں باپ کے چہرے دیکھنے لگا۔ کون کہتا ہے کہ مُردے دوبارہ زندہ نہیں ہوتے۔ میرے لیے تو وہ دوبارہ زندہ ہو گئے تھے۔ میرے دل کی گہرائی میں خوشی کا احساس جاگا اور میرے رگ و پے میں پھیل گیا۔

''امی۔'' میرے لبوں سے لرزتی ہوئی آواز نکلی۔

انہوں نے بے یقینی اور خوشی کے ملے جلے احساس سے میری طرف دیکھا اور ''میرا بچہ'' کہتے ہوئے میرے پاس آ گئیں۔ ان کی آنکھیں نم تھیں۔

''کیسے ہو تم؟''

''ٹھیک ہوں۔'' میں نے نقاہت زدہ انداز میں جواب دیا۔

''یہ تمہیں اچانک کیا ہو گیا تھا؟''

''پتا نہیں۔'' اپنی آواز مجھے کہیں دور سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔ ''بس مجھے اچانک چکر آیا تھا اور میں گر گیا تھا۔''

''ایسا پہلے تو کبھی تمہارے ساتھ نہیں ہوا؟''

''امی! میں ٹھیک ہوں۔ مجھے گھر لے چلیں۔'' میں یکدم بولا۔

کچھ دیر کے بعد ابو رپورٹس لینے چلے گئے۔ وہ واپس آئے تو ان کے چہرے سے خوشی پھوٹی پڑ رہی تھی۔ ''ڈاکٹر کہہ رہا ہے کہ کوئی مسئلہ نہیں۔ یہ بالکل ٹھیک ہیں۔ بس اچانک سر پر لگنے والی چوٹ سے وقتی طور پر ایسا ہوا ہے۔'' امی کے چہرے سے بھی خوشی جھلکنے لگی۔

شام کو ہم گھر آ گئے۔ میری حالت خاصی حد تک بہتر ہو چکی تھی۔ نوشین اور سائرہ کو دیکھ کر میرا دل خوشی سے بھر گیا۔ مجھ جیسا خوش قسمت بھی کوئی ہو گا جسے دوبارہ زندگی

www.pklibrary.com

گزارنے کا موقع ملا تھا؟ بے اختیار میرے ذہن میں خیال آیا۔ اس خیال کے آتے ہی اسامہ اور ہانیہ کی صورتیں میری نظروں کے سامنے آئیں اور میرا دل بجھ کے رہ گیا۔ اب مجھے دوبارہ زندگی کا سفر ان سے محرومی کے احساس کے ساتھ ہی طے کرنا تھا۔ یکدم مجھے خیال آیا تو میرا دل ایک بار پھر سلگنے لگا۔ زندگی کے سفر میں دوبارہ پیچھے جا کر غلطیاں سدھارنے کی خواہش ہمیشہ سے میرے دل میں تھی لیکن یہ خواہش کرتے ہوئے مجھے کبھی یہ خیال آیا ہی نہیں تھا کہ اس صورت میں، میں جو پا چکا ہوں وہ دوبارہ کھودوں گا۔ سچ ہے، انسان کو وہ نعمتیں محسوس ہی نہیں ہوتیں جو اسے حاصل ہوتی ہیں۔ وہ ان نعمتوں کے پیچھے بھاگتا ہے جو اسے حاصل نہیں ہوتیں۔ پاس موجود نعمتوں کے لطف سے محروم بھی رہتا ہے۔ ان نعمتوں کا احساس اسے تبھی ہوتا ہے جب وہ ان میں سے کچھ کھو دیتا ہے۔

میری زندگی اسی دن سے شروع ہوئی تھی جس دن میری غلطی سے ہماری دکان جلی تھی۔ میں خوش تھا کہ اس بار ایسا نہیں ہوا تھا مگر بیوی بچوں کا خیال آتے ہی میں یکدم گم صم ہو جاتا۔ مجھے اپنی سابقہ زندگی کے بارے میں سب یاد تھا۔ جو اہم واقعات ملکی و بین الاقوامی حوالے سے ہوئے تھے، ملکی افق پر رونما ہونے والی سیاسی، معاشی و معاشرتی تبدیلیاں..... لیکن ان کے بارے میں سوچتے ہی میرے اندر خوف جاگ جاتا۔

میں نے نئے ولولے کے ساتھ دوبارہ اسکول جانا شروع کیا۔ اس بار میں نے وہ غلطیاں نہیں کرنا تھیں جو پچھلی بار ہوئی تھیں۔ اس بار ہر میدان میں، میں نے کامیابی کے جھنڈے گاڑنے تھے۔ یہ خیال میرے لیے سکون بخش تھا۔

تعلیمی میدان میں میری کارکردگی میں بہتری بھی اساتذہ کے لیے اچنبھے کا باعث تھی۔ میری ساری توجہ پڑھائی کی طرف تھی۔ ابو مجھے دکان پر بیٹھنے کا کہتے تو میں صاف انکار کر دیتا۔ دکان پر بیٹھنے کا خیال آتے ہی خوف میرے اندر اپنے پنجے گاڑ لیتا۔ میں ڈرتا کہ کہیں مجھ سے دوبارہ وہ غلطی سرزد نہ ہو جائے جس کا خمیازہ مجھے پچھلی بار پوری عمر بھگتنا پڑا تھا۔ ابو مجھ سے ناراض رہتے لیکن میں چاہتے ہوئے بھی ان کی مدد نہیں کر سکتا تھا۔

پورا دن فارغ ہوتے ہو۔ میرا ہاتھ بٹاؤ۔''

''ابو پلیز، مجھے دکان پر بیٹھنے کا نہ کہیں۔ میں کمپیوٹر کورس کرنا چاہتا ہوں۔'' گو کہ مجھے کمپیوٹر سیکھنے کی ضرورت نہیں تھی مگر دکان پر بیٹھنے سے بچنے کے لیے مجھے یہی بہانہ سوجھا تھا۔

''تو کر لو کورس بھی، میں کونسا تمہیں پورا دن دکان پر بیٹھنے کا کہہ رہا ہوں۔'' ابو کا پارہ چڑھتا جا رہا تھا۔ میں بے بسی سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیسے انہیں اپنا مسئلہ سمجھاؤں۔

میرے انکار پر ابو کا رویہ مجھ سے کھنچ گیا۔ وہ مجھ سے بات ہی نہ کرتے۔ میں انہیں ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن میں بے بس تھا۔ حالات و واقعات بدل گئے تھے لیکن ابو کا وہی رویہ مجھے دوبارہ سہنا پڑ رہا تھا، جو میں پہلے بھی سہہ چکا تھا۔ میں نے ان کی مرضی کے خلاف کمپیوٹر سینٹر جانا شروع کر دیا لیکن اس بار میں کمپیوٹر سیکھ رہا نہیں بلکہ سکھا رہا تھا۔ فارغ وقت میں، میں انٹرنیٹ سے معلومات حاصل کرتا رہتا۔

وقت گزرنے کے ساتھ میں اپنی پہلی زندگی کے رشتوں سے محرومی کو بڑی حد تک بھول چکا تھا۔ بس کسک باقی رہ گئی تھی۔ یہ کسک مجھے تڑپاتی لیکن میں اس کو خود پر حاوی نہ ہونے دیتا۔

دن گزرتے رہے، جب رزلٹ آیا تو تحصیل میں میری پہلی پوزیشن تھی۔ اسکالرشپ پر مجھے کہیں بھی بہ آسانی داخلہ مل سکتا تھا۔ میں نے ایک پرائیویٹ کالج میں آئی سی ایس میں داخلہ لے لیا۔ آئی سی ایس کے بعد بی ایس بھی میں نے ایک معروف یونیورسٹی سے اسکالرشپ پر کیا۔

مجھے وہ کامیابی مل گئی تھی جس کی تمنا مجھے پہلی زندگی میں تھی۔ جس دن ہمیں ڈگری ملی تھی اسی دن بہت سے سافٹ ویئر ہاؤسز کی طرف سے مجھے جاب کی آفرز آ گئیں۔ میرے ذہن میں ایسے بہت سے سافٹ ویئر پروگرامز اور ویب سائٹس کے آئیڈیاز تھے جو میں نے پچھلی زندگی میں استعمال کیے تھے۔ میں ان پر کام کرنا چاہتا تھا لیکن اس کے لیے تجربہ ضروری تھا۔ میں نے کچھ عرصہ جاب کی مگر وہاں مجھے اپنی مرضی کا کام کرنے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ وہ تو بس اپنا ہی کام کرا رہے تھے۔

www.pklibrary.com

گزارنے کا موقع ملا تھا؟ بے اختیار میرے ذہن میں خیال آیا۔ اس خیال کے آتے ہی اسامہ اور ہانیہ کی صورتیں میری نظروں کے سامنے آئیں اور میرا دل بجھ کے رہ گیا۔ اب مجھے دوبارہ زندگی کا سفر ان سے محرومی کے احساس کے ساتھ ہی طے کرنا تھا۔ یکدم مجھے خیال آیا تو میرا دل ایک بار پھر سلگنے لگا۔ زندگی کے سفر میں دوبارہ پیچھے جا کر غلطیاں سدھارنے کی خواہش ہمیشہ سے میرے دل میں تھی لیکن یہ خواہش کرتے ہوئے مجھے کبھی یہ خیال آیا ہی نہیں تھا کہ اس صورت میں، میں جو پا چکا ہوں وہ دوبارہ کھودوں گا۔ سچ ہے، انسان کو وہ نعمتیں محسوس ہی نہیں ہوتیں جو اسے حاصل ہوتی ہیں۔ وہ ان نعمتوں کے پیچھے بھاگتا ہے جو اسے حاصل نہیں ہوتیں۔ پاس موجود نعمتوں کے لطف سے محروم بھی رہتا ہے۔ ان نعمتوں کا احساس اسے تبھی ہوتا ہے جب وہ ان میں سے کچھ کھو دیتا ہے۔

میری زندگی اسی دن سے شروع ہوئی تھی جس دن میری غلطی سے ہماری دکان جلی تھی۔ میں خوش تھا کہ اس بار ایسا نہیں ہوا تھا مگر بیوی بچوں کا خیال آتے ہی میں یکدم گم صم ہو جاتا۔ مجھے اپنی سابقہ زندگی کے بارے میں سب یاد تھا۔ جو اہم واقعات ملکی و بین الاقوامی حوالے سے ہوئے تھے، ملکی افق پر رونما ہونے والی سیاسی، معاشی و معاشرتی تبدیلیاں..... لیکن ان کے بارے میں سوچتے ہی میرے اندر خوف جاگ جاتا۔

میں نے نئے ولولے کے ساتھ دوبارہ اسکول جانا شروع کیا۔ اس بار میں نے وہ غلطیاں نہیں کرنا تھیں جو پچھلی بار ہوئی تھیں۔ اس بار ہر میدان میں، میں نے کامیابی کے جھنڈے گاڑنے تھے۔ یہ خیال میرے لیے سکون بخش تھا۔

تعلیمی میدان میں میری کارکردگی میں بہتری بھی اساتذہ کے لیے اچنبھے کا باعث تھی۔ میری ساری توجہ پڑھائی کی طرف تھی۔ ابو مجھے دکان پر بیٹھنے کا کہتے تو میں صاف انکار کر دیتا۔ دکان پر بیٹھنے کا خیال آتے ہی خوف میرے اندر اپنے پنجے گاڑ لیتا۔ میں ڈرتا کہ کہیں مجھ سے دوبارہ وہ غلطی سرزد نہ ہو جائے جس کا خمیازہ مجھے پچھلی بار پوری عمر بھگتنا پڑا تھا۔ ابو مجھ سے ناراض رہتے لیکن میں چاہتے ہوئے بھی ان کی مدد نہیں کر سکتا تھا۔

میٹرک کے امتحانات میں، میں نے بھرپور محنت کی۔ میرے پرچے بہت اچھے ہوئے تھے۔ پیپرز کے بعد میں فری تھا۔ ابو نے مجھے ایک بار پھر دکان پر بیٹھنے کا کہا۔

''پہلے تمہارے پاس پڑھائی کا بہانہ ہوتا تھا، اب تو پورا دن فارغ ہوتے ہو۔ میرا ہاتھ بٹاؤ۔''

''ابو پلیز، مجھے دکان پر بیٹھنے کا نہ کہیں۔ میں کمپیوٹر کورس کرنا چاہتا ہوں۔'' گو کہ مجھے کمپیوٹر سیکھنے کی ضرورت نہیں تھی مگر دکان پر بیٹھنے سے بچنے کے لیے مجھے یہی بہانہ سوجھا تھا۔

''تو کر لو کورس بھی، میں کونسا تمہیں پورا دن دکان پر بیٹھنے کا کہہ رہا ہوں۔'' ابو کا پارہ چڑھتا جا رہا تھا۔ میں بے بسی سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیسے انہیں اپنا مسئلہ سمجھاؤں۔

میرے انکار پر ابو کا رویہ مجھ سے کھنچ گیا۔ وہ مجھ سے بات ہی نہ کرتے۔ میں انہیں ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن میں بے بس تھا۔ حالات و واقعات بدل گئے تھے لیکن ابو کا وہی رویہ مجھے دوبارہ سہنا پڑ رہا تھا، جو میں پہلے بھی سہہ چکا تھا۔ میں نے ان کی مرضی کے خلاف کمپیوٹر سینٹر جانا شروع کر دیا لیکن اس بار میں کمپیوٹر سیکھ رہا نہیں بلکہ سکھا رہا تھا۔ فارغ وقت میں، میں انٹرنیٹ سے معلومات حاصل کرتا رہتا۔

وقت گزرتے کے ساتھ میں اپنی پہلی زندگی کے رشتوں سے محرومی کو بڑی حد تک بھول چکا تھا۔ بس کسک باقی رہ گئی تھی۔ یہ کسک مجھے تڑپاتی لیکن میں اس کو خود پر حاوی نہ ہونے دیتا۔

دن گزرتے رہے، جب رزلٹ آیا تو تحصیل میں میری پہلی پوزیشن تھی۔ اسکالرشپ پر مجھے کہیں بھی بہ آسانی داخلہ مل سکتا تھا۔ میں نے ایک پرائیویٹ کالج میں آئی سی ایس میں داخلہ لے لیا۔ آئی سی ایس کے بعد بی ایس میں میں نے ایک معروف یونیورسٹی سے اسکالرشپ پر کیا۔

مجھے وہ کامیابی مل گئی تھی جس کی تمنا مجھے پہلی زندگی میں تھی۔ جس دن ہمیں ڈگری ملی تھی اسی دن بہت سے سافٹ ویئر ہاؤسز کی طرف سے مجھے جاب کی آفرز آ گئیں۔ میرے ذہن میں ایسے بہت سے سافٹ ویئر پروگرامز اور ویب سائٹس کے آئیڈیاز تھے جو میں نے پچھلی زندگی میں استعمال کیے تھے۔ میں ان پر کام کرنا چاہتا تھا لیکن اس کے لیے تجربہ ضروری تھا۔ میں نے کچھ عرصہ جاب کی مگر وہاں مجھے اپنی مرضی کا کام کرنے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ وہ تو بس اپنا ہی کام کرا رہے تھے۔

میں نے جاب چھوڑ دی اور پھر گھر میں اپنا کام کرنا شروع کر دیا۔ میں جلد از جلد کوئی بڑا کام کرنا چاہتا تھا۔ میرے پاس وقت کم تھا۔ انٹرنیٹ کی دنیا میں تبدیلیاں تیزی سے رونما ہونا شروع ہو گئی تھیں۔ میں ان تبدیلیوں میں اپنا

www.pklibrary.com

حصہ ڈالنا چاہتا تھا اور نکالنا بھی۔ میں پوری تندہی سے کام میں لگ گیا۔ ان دنوں میرا اوڑھنا بچھونا بس کام تھا۔ مصروفیت کے باعث نہ مجھے اپنا سابقہ ماضی یاد رہا تھا اور نہ حال۔ میں جنونیوں کی طرح کام کرتا رہا لیکن مجھے تجربہ تو حاصل ہو گیا، اپنے مقصد میں کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ میں جس کام کو بہت آسان سمجھ رہا تھا وہ اتنا آسان نہ تھا۔ مجھے ایسی تکنیکی مشکلات پیش آ رہی تھیں، جن کا حل مجھے کہیں سے نہیں مل رہا تھا۔

مجھے کمپیوٹر کی فیلڈ میں چند مزید پروفیشنل کورسز کی ضرورت تھی جو میں پاکستان سے نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے ایک امریکن انسٹی ٹیوٹ میں ان کورسز کی فیس پتا کی تو میرے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ اتنی رقم تو جنرل اسٹور بیچ کر بھی حاصل نہیں کی جا سکتی تھی، ویسے بھی ابو مجھ سے ابھی تک ناراض تھے۔ اپنے اخراجات بھی میں کچھ آن لائن کام کر کے پورے کر رہا تھا۔ میں دل مسوس کے رہ گیا۔ یہ راہ بند ہوئی تو میں نے مزید راستے تلاش کرنا شروع کیے۔

میں نے سافٹ ویئرز بنانے والی چند بڑی کمپنیز کے ساتھ اپنے آئیڈیاز اور رپورٹ فولیو کو شیئر کیا لیکن کہیں سے خاطر خواہ رسپانس نہیں آیا۔ مایوسی مجھ پر غالب آتی جا رہی تھی کہ ایک کمپنی کی طرف سے میل آ گئی۔ انہوں نے میرے آئیڈیے کے متعلق تفصیلی سوالات پوچھے تھے۔ چند دن کی بات چیت کے بعد انہوں نے مجھے جاب آفر کی۔ میرا خوشی کا ٹھکانا نہ رہا۔ یہ امریکن کمپنی تھی۔ میں نے گھر میں بات کی تو ابو نے مجھے بھینچے سے صاف انکار کر دیا۔ امی بھی میرے باہر جانے کا سن کے تڑپ گئیں۔ میں ان کی اکلوتی نرینہ اولاد تھا۔ وہ مجھے اپنی آنکھوں سے دور نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ میں جھنجلا گیا۔ میری کامیابی میں میرے اپنے گھر والے ہی رکاوٹ بن رہے تھے۔

کچھ بھی ہوتا، میں نے ہر صورت باہر جانا تھا۔ اس بار میں نے گھٹ گھٹ کے زندگی نہیں گزارنا تھی۔ میں نے دولت اور وہ تمام آسائشات حاصل کرنا تھیں جن کے لیے میں پچھلی زندگی میں ترستا رہا تھا۔ اپنا نام بنانا تھا۔ سافٹ ویئر کی دنیا میں تہلکہ مچانا تھا لیکن مسئلہ باہر جانے کے لیے رقم کا تھا۔ کمپنی ویزا فری میں بھیج رہی تھی۔ مسئلہ ٹکٹ اور دوسرے اخراجات کا تھا۔ میں کسی سے ادھار بھی طلب نہیں کر سکتا تھا۔ دوسری طرف ابو کے مزاج سے میں واقف تھا۔ وہ ایک بار فیصلہ کر لیتے تھے تو انہیں ان کے فیصلے سے ہٹانا ناممکن ہو جاتا تھا۔ وہ ویسے بھی مجھ سے خفا تھے۔

میں نے پھپھی کو اپنے کاغذات بھیج دیے تھے۔ چند دن میں میرا ویزا آ گیا لیکن میں باوجود کوشش کے رقم حاصل نہیں کر سکا تھا۔ کوئی راہ نہ پا کر مجھے ابو کی گھر میں رکھی رقم کا خیال آیا۔ ابو بینک اکاؤنٹ کے خلاف تھے۔ وہ اضافی رقم ہمیشہ گھر میں ہی رکھتے تھے۔ چابی بھی گھر میں ہی ہوتی تھی۔ اس رقم کا حصول میرے لیے مشکل نہ تھا، مسئلہ میرے ضمیر کا تھا جو اپنے ہی گھر چوری کرنے میں مزاحمت کر رہا تھا۔ میں حیلوں بہانوں سے ضمیر کو قائل کرنے لگا۔

تجوری میں تین لاکھ سے کچھ اوپر رقم تھی۔ میں نے وہ رقم نکال لی۔ رقم نکالتے ہوئے میرے اندر موہوم سا احساس جرم جاگا، جسے امریکا جانے کی خوشی نے دبا دیا۔ میں نے ٹکٹ خرید لیا۔ مجھے اگلے دن کی نشست مل گئی تھی۔ اس دن میں گھر جاتے ہوئے خوفزدہ تھا کہ ابو نے تجوری دیکھ لی تو مسئلہ ہو جائے گا۔

میری یہ رات انتہائی بے چینی میں گزری تھی۔ پوری رات میں ایک لمحے کے لیے بھی سو نہیں سکا تھا۔ میں صبح سویرے ہی گھر سے نکل گیا۔ امی کو آخری بار دیکھتے ہوئے میں افسردہ تھا۔ ان کے لیے میں نے اپنے کمرے میں ایک نوٹ لکھ کر رکھ دیا تھا۔ وہ میرے جانے کے بعد وہ نوٹ پڑھ لیتیں۔ اس میں، میں نے امی اور ابو سے معافی طلب کی تھی۔ میں نے وہ رقم بھی جلد لوٹانے کا وعدہ کیا تھا۔

میں نے اپنا سوٹ کیس اپنے ایک دوست کے پاس ایک دن پہلے ہی رکھ دیا تھا۔ اس سے سوٹ کیس لے کر میں ائرپورٹ روانہ ہو گیا۔ جہاز کے ٹیک آف کرنے تک میں ڈرتا ہی رہا کہ کہیں کچھ ایسا نہ ہو جائے کہ میرا امریکا جانا کھٹائی میں پڑ جائے۔ جہاز کے اڑان بھرتے ہی میں نے سکون کا گہرا سانس لیا۔ مجھے اپنے وجود میں سنسنی کی لہریں دوڑتی محسوس ہو رہی تھیں۔ میں آنکھیں موند کے مستقبل کے سہانے سپنوں میں کھو گیا۔

☆☆☆

نیویارک ائرپورٹ پر ڈرائیور گاڑی لیے موجود تھا۔ میں اس کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گیا۔ روڈ پر بے پناہ رش تھا۔ میں گاڑی کی کھڑکی سے باہر اس پُرہنگم زندگی کا مشاہدہ کر رہا تھا۔ میرے رگ و پے میں سنسنی دوڑ رہی تھی۔ میری زندگی نئے دور میں داخل ہو رہی تھی۔ نئے لوگ، نیا ملک اور نیا کام..... مجھے خوشی کے ساتھ ایک انجانا سا خوف بھی پریشان کر رہا تھا۔

ڈرائیور نے گھنٹے بھر کے سفر کے بعد مجھے میری منزل

www.pklibrary.com

پر پہنچا دیا۔ یہ ایک بلند و بالا عمارت تھی۔ ہماری کمپنی کا دفتر ساتویں فلور پر تھا۔ وہاں میں نے فلپ سے ملنا تھا۔ وہی اس کمپنی کا کرتا دھرتا تھا۔ میری فون پر زیادہ اسی سے بات ہوتی رہی تھی۔

میں ڈرائیور کی معیت میں لفٹ کے ذریعے اپنے مطلوبہ فلور تک پہنچا۔ ایک بڑے ہال میں لوگ کمپیوٹرز پر بیٹھے کام کر رہے تھے۔ میری آمد کا کسی نے نوٹس نہیں لیا۔ ڈرائیور مجھے ساتھ لے کر فلپ کے دفتر کی طرف بڑھا۔

ڈرائیور نے فلپ کی سیکریٹری کے ساتھ میرا تعارف کرایا۔ وہ سنہرے بالوں والی لہوترے سے چہرے کی مالک تھی۔

''آپ تشریف رکھیے۔ سر ابھی میٹنگ میں ہیں۔'' وہ پیشہ ورانہ انداز میں مسکراتے ہوئے مجھ سے گویا ہوئی۔ میں نروس سے انداز میں بیٹھ گیا۔ سیکریٹری اپنے کام میں مشغول ہوگئی۔ یہاں آنے سے پہلے میں پُرجوش تھا لیکن لوگوں کا سرد سا رویہ محسوس کر کے اچانک میرا سارا اعتماد رخصت ہو گیا تھا۔ میں آدھے گھنٹے سے زائد بیٹھا پہلو بدلتا رہا لیکن سیکریٹری جیسے مجھے بٹھا کے بھول ہی گئی تھی۔ میں اس کے سامنے موجود ہوتے ہوئے بھی جیسے ناموجود تھا۔ اس نے اتنی دیر میں مجھ سے بات کرنا تو درکنار، ایک نظر دیکھا تک نہیں تھا۔ مجھے پیاس محسوس ہو رہی تھی لیکن اس نے مجھے کسی قسم کے کھانے پینے کی چیز کی نہ پیشکش کی نہ مجھے ہمت ہو رہی تھی کہ اس سے پانی ہی طلب کر سکوں۔

کوئی پینتیس چالیس منٹ بعد انٹر کام کی بیل بجی۔ سیکریٹری نے ''اوکے'' کہہ کے میری طرف دیکھا اور بولی۔

''آپ میرے ساتھ آئیں۔''

میں نے اطمینان کا گہرا سانس لیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ مجھے ایک راہداری سے گزار کے فلپ کے دفتر میں لے آئی۔

وہ فون پر گفتگو میں مصروف تھا۔ اس نے مجھے آنکھوں کے اشارے سے بیٹھنے کا کہا۔ میں اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ سیکریٹری اس کے اشارے پر واپس چلی گئی۔ میں فلپ کا جائزہ لینے لگا۔ اس کی عمر چالیس پینتالیس سال کے درمیان تھی۔ سر کے آدھے سے زیادہ بال اڑ چکے تھے۔ اس کے چہرے پر خشونت تھی۔ اس نے فون بند کیا اور مجھ سے مخاطب ہوا۔

''ہائے مسٹر ذیشان، ویلکم ہیئر۔'' اس کا انداز سپاٹ تھا۔

چند رسمی جملوں کے تبادلے کے بعد وہ فوراً کام کی بات پر آ گیا۔ یہ سافٹ ویئر کمپنی بنیادی طور پر موبائل و کمپیوٹر گیمز بناتی تھی تاہم ابھی تک ان کا بنایا گیا کوئی بھی گیم زیادہ مقبول نہیں ہو سکا تھا۔ میں نے ان کے ساتھ ایک ایسے گیم کا آئیڈیا شیئر کیا تھا جس کو میں اپنی پہلی زندگی میں بے انتہا مقبولیت سمیٹتے دیکھ چکا تھا۔ میں جوش و خروش سے اسے اپنے آئیڈیے کے متعلق تفصیلات بتانے لگا، مگر میرا لہجہ سمجھنے میں اسے مشکل ہو رہی تھی۔ میں نے انگریزی سیکھنے اور لہجہ درست کرنے کے لیے خاصی محنت کی تھی مگر پاکستان میں انگریزی بولنے کا موقع کم ہی ملتا تھا اس لیے روانی اور درست لہجے میں بولنے میں مجھے مشکل پیش آ رہی تھی۔ میرا انداز دیکھ کے فلپ کے چہرے پر کوفت چھا گئی تھی جس کی وجہ سے میں بھی نروس ہو گیا۔ بہرحال کسی نہ کسی طرح میں اسے اپنی بات سمجھانے میں کامیاب رہا۔ وہ مجھ سے سوالات کرتا رہا۔

اس کے تاثرات سے اس کے بارے میں اندازہ لگانا مشکل تھا۔

میری بنیادی مہارت ویب ڈیولپمنٹ میں تھی۔ اس پروجیکٹ پر کام کرنے کے لیے مجھے کم از کم ایک اور ویب ڈیولپر اور دو گرافکس ڈیزائنر کی ضرورت تھی۔ پروگرام کے خدوخال پر بات کرنے کے بعد فلپ کو اندازہ ہو گیا کہ اس کام کے لیے اس کے پاس موجود لوگوں میں سے کون سے لوگ بہتر رہیں گے۔ اس نے سیکریٹری کو مطلوبہ لوگوں کو بھیجنے کا کہہ دیا۔

چند لمحوں بعد دروازہ کھلا اور تین لوگ اندر داخل ہوئے۔ ان میں دو مرد اور ایک لڑکی تھی۔ فلپ نے ہمارا تعارف کرایا۔

ایڈی چوبیس پچیس سال کا لاابالی سا نظر آنے والا نوجوان تھا۔ طوطے کی طرح مڑی ہوئی ناک نے اسے کسی قدر کریہہ صورت بنا دیا تھا۔ وہ بار بار اپنے کان میں انگلی گھما رہا تھا۔ وہ ویب ڈیولپر تھا۔

جوزف کی عمر تیس سال کے لگ بھگ تھی۔ وہ سنجیدہ مزاج اور سپاٹ سے چہرے والا شخص تھا۔ وہ خاصا ہینڈسم تھا۔ ماریا ان دونوں سے کم عمر تھی۔ اس کا چہرہ جتنا پتلا تھا، اتنا ہی اس کا جسم بھرا بھرا تھا۔ اس کے قیامت خیز جسم کو دیکھ کر مجھے اپنا گلا خشک ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔ جوزف اور ماریا دونوں گرافکس ڈیزائنر تھے۔ یہ میری ٹیم تھی، ہم نے ایک ساتھ کام کرنا تھا۔ انہوں نے رسمی انداز میں مجھ سے ہیلو ہائے کی تاہم کسی نے ہاتھ ملانے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔ مجھے ان کا رویہ کھلا تاہم میں نے نظرانداز کیا۔

www.pklibrary.com

ہمارے درمیان میٹنگ کا آغاز ہوگیا۔ فلپ بھی اس میٹنگ میں شریک تھا۔ ان کا رویہ تو مجھے پسند نہیں آیا تھا تاہم ان کی گفتگو سے ان کی پیشہ ورانہ مہارت کا اندازہ کر کے میں نے سکون کا سانس لیا۔ مجھے امید تھی کہ جلد ہی سافٹ ویئر کی دنیا میں میرے نام کا ڈنکا بجنے والا ہے۔

☆☆☆

یہ سافٹ ویئر کمپنی میری توقع سے بہت چھوٹی تھی۔ بہرحال میں مطمئن تھا کہ مجھے اپنے آئیڈیاز پر کام کرنے کے لیے ایک بنیاد میسر آگئی تھی۔ میرے ایک پروجیکٹ کے کامیاب جانے کے بعد مجھ پر کامیابی کے دروازے کھل جاتے۔ پھر دولت و شہرت میرے در کی باندی بن جاتی۔ اس سب کے لیے میں ایک لمبا عرصہ تڑپا تھا۔ کامیابی کے حصول کے لیے میں نے بہت کچھ کھویا تھا۔ پہلی زندگی میں سمیرا اور بچے اور اب دوسری زندگی میں اپنے ماں باپ اور شاید ان کا اعتبار..... ان کا بھروسا بھی۔

امی تو شاید کچھ عرصے بعد مان جاتیں لیکن ابو کا جیسا مزاج تھا ان کو منانا کار دشوار تھا۔ میں شاید ساری دنیا بھی حاصل کر لیتا تو ابو کا بھروسا دوبارہ نہیں جیت سکتا تھا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میں نے انہیں ہمیشہ کے لیے کھو دیا ہو۔

اس ملک میں میری پہلی رات اپنے اکلوتے کمرے پر مشتمل اپارٹمنٹ میں لیٹے سو دو زیاں کا حساب کرتے ہی گزری تھی۔ اپارٹمنٹ مجھے کمپنی کی طرف سے ہی ملا تھا اور میرے دفتر سے پیدل کے فاصلے پر ہی تھا۔ اپارٹمنٹ میں ٹیلی فون اور انٹرنیٹ کی سہولت موجود تھی۔ میں گھر کال کرنا چاہ رہا تھا لیکن ہمت ہی نہیں پڑ رہی تھی۔

کامیابی مجھ سے محض چند قدم کے فاصلے پر تھی لیکن جانے کیوں مجھے وہ خوشی، وہ اطمینان، وہ ولولہ محسوس نہیں ہو رہا تھا جو اپنی زندگی کے سب سے بڑے خواب کو حاصل کرتے ہوئے محسوس ہونا چاہیے تھا۔ اس کے برعکس مجھے اپنے اندر ویسی ہی بے کیفی محسوس ہو رہی تھی، جس نے مجھے اپنی پہلی زندگی میں بھی اپنے حصار میں لیے رکھا تھا۔

اگلے دن ہی ہم نے کام کا باقاعدہ آغاز کر دیا۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو ان کا کام سمجھانے کے لیے بلایا۔ وہ میرے سامنے بیٹھ تو گئے مگر ان کے انداز میں بیزاری نمایاں تھی۔ میں نے ابھی تمہید ہی باندھی تھی کہ ایڈی میری بات کاٹ کے بے پروائی سے بولا۔

''ہم پروگرام کا پورا لے آؤٹ دیکھ چکے ہیں۔ کل کی میٹنگ میں اس بارے میں تفصیلی گفتگو بھی ہو چکی ہے۔ تو کیا بہتر نہیں ہوگا کہ اب ان خشک باتوں کو ایک طرف رکھ کے کام کا عملی آغاز کیا جائے؟''

اس کا انداز طیش دلانے والا تھا لیکن میں نے بہ مشکل برداشت کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر تم سمجھتے ہو کہ تمہیں مزید کسی گائیڈ لائن کی ضرورت نہیں تو جاؤ اپنا کام شروع کرو۔''

وہ اٹھا، تو ساتھ جوزف اور ماریا بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔

''تم لوگ بیٹھو، میں نے ابھی بات کرنی ہے۔''

ماریا نے جوزف کی طرف دیکھا۔ ''کیا تمہیں کچھ سمجھنے کی ضرورت ہے؟'' جوزف نے ماریا کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے طنزیہ سے انداز میں پوچھا۔

وہ معنی خیز انداز میں مسکرائی۔ ''اگر کوئی ضرورت ہوئی تو تم ہونا۔ اس کا تو لہجہ ہی میری سمجھ میں نہیں آتا۔''

جوزف نے کندھے اچکائے اور میری جانب دیکھا۔ ''میرا خیال ہے ہم اپنا کام بہتر انداز میں سمجھ چکے ہیں۔ مزید ضرورت ہوئی تو تمہیں زحمت دے دیں گے۔'' وہ یہ کہہ کر میرا جواب سننے کے لیے رکا نہیں۔ ماریا بھی اس کے

غذا کا صحیح استعمال

1- دودھ: بہترین وقت رات کو۔ غلط وقت صبح کو۔
2- دہی: بہترین وقت دن میں۔ غلط وقت رات میں۔
3- چاول: بہترین وقت دن میں۔ غلط وقت رات کو۔
4- چینی: بہترین وقت صبح۔ غلط وقت رات کو۔
5- دالیں: بہترین وقت رات۔ غلط وقت صبح کو۔
6- کیلا: بہترین وقت دوپہر۔ غلط وقت رات کو۔
7- سیب: بہترین وقت صبح۔ غلط وقت شام اور رات کو۔

پاگل

بیوی: آپ مجھ سے کتنی محبت کرتے ہیں؟
شوہر: بہت محبت کرتا ہوں۔
بیوی: اور اگر میں مر گئی تو آپ کیا کریں گے؟
شوہر: مجنوں ہو جاؤں گا۔ پاگل ہو جاؤں گا۔
بیوی: دوسری شادی تو نہیں کریں گے نا.....؟
شوہر: پاگل انسان کا کیا بھروسا ہے۔ کچھ بھی کر سکتا ہے۔

(مرسلہ: محمد انور ندیم، حویلی لکھا، اوکاڑہ)

www.pklibrary.com

پیچھے چل پڑی۔ ان کا اہانت آمیز انداز دیکھ کر میری غم و غصے سے بری حالت ہوگئی۔

میں اس ٹیم کا لیڈر تھا، لیکن میرے ساتھی مجھے اپنے رویّے سے احساس دلا رہے تھے کہ میرا لیڈر ہونا وہ بامر مجبوری ہی برداشت کر رہے ہیں۔ بالخصوص جوزف میں تعصب کچھ زیادہ ہی تھا۔ میرا تعلق ایک تیسری دنیا کے ملک سے تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ میرا لیڈر ہونا برداشت نہیں کر پا رہے تھے۔ وہ خود آپس میں ہنس بول رہے تھے لیکن میری کسی بات کا جواب بھی نخوت سے ہی دیتے۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے میں درجۂ چہارم کا ملازم ہوں اور وہ مغرور اساتذہ۔ میرا وقت بدل گیا تھا، ملک بدل گیا تھا حتیٰ کہ پوری زندگی ہی بدل گئی تھی لیکن میرا ''اسٹیٹس'' نہیں بدلا تھا۔ میں آج بھی چوتھے درجے کا ملازم ہی تھا۔

کچھ عرصے کی بات ہے، پھر یہ سب لوگ تمہارے آگے پیچھے پھرا کریں گے۔ میں خود کو تسلی دینے کی کوشش کرنے لگا، لیکن اس وقت میرے احساسات ایسے تھے کہ کوئی تسلی، کوئی دلاسا میرے لیے کام نہیں کر رہا تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے بھری دنیا میں، میں اکیلا رہ گیا ہوں۔ میں اپنے سارے رشتے ناتے، کامیابی کی خاطر چھوڑ آیا تھا، مگر کامیابی کا احساس بھی میرے اندر کوئی امنگ جگانے میں ناکام تھا۔

میں نے اپنے ٹیم ممبرز کو سارا کام سمجھا دیا تھا۔ وہ خود سے ہنستے بولتے کام کر رہے تھے مگر میرا اپنے ساتھیوں کے رویّے کی وجہ سے کام میں بھی دل نہیں لگ رہا تھا۔ لنچ کے وقفے کے دوران وہ باہر چلے گئے مگر میں ادھر ہی کمپیوٹر کے سامنے بیٹھا سوچتا رہا۔

شام کو میرے کہنے پر میرے ساتھیوں نے اپنا کام دکھایا۔ ایڈی نے مجھ سے زیادہ کام کیا تھا۔ میں اس کے کام سے مطمئن تھا مگر ماریا اور جوزف کے گرافکس ڈیزائنز میرے تخیل سے مختلف تھے جیسے میں نے انہیں سمجھائے تھے۔ میں نے اس کا ذکر کیا تو جوزف نخوت سے بولا۔

''ہم اپنا کام بہتر سمجھتے ہیں، سو بہتر ہوگا کہ تم دخل اندازی مت کرو۔''

اس کا انداز دیکھ کر میرا پارہ چڑھ گیا۔ بہ مشکل میں نے خود پر قابو پایا۔ اگلے دن میں نے فلپ سے جوزف کے متعلق بات کی تو اس نے بھی میری شکایت ان سنی کر دی۔ میں نے تنگ آکر انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا۔

اس رات میں نے ہمت مجتمع کر کے گھر کال کی۔ توقع کے مطابق کال امی نے ہی ریسیو کی۔ میری آواز سنتے ہی وہ رونے لگیں۔ میں نے انہیں کھل کے رونے دیا۔ کچھ دیر میں ان کی حالت سنبھلی تو انہوں نے شکووں کی پٹاری کھول لی۔ یہ سب کچھ میری توقع کے مطابق تھا۔

میں نے سکون سے انہیں دل کا بوجھ ہلکا کرنے کا موقع دیا۔ میں نے ان سے معافی مانگی تو وہ بولیں۔

''میں تو تمہیں معاف کر دوں گی مگر اپنے باپ کی نظر میں تم مر چکے ہو۔ وہ تمہیں کبھی معاف نہیں کر سکتے۔''

''امی! یہ سب کچھ میں نے ہماری بہتری کے لیے ہی کیا ہے۔ پاکستان میں مجھے اپنا من پسند کام کرنے کا موقع نہیں مل سکتا تھا۔ ابو اپنی ضد پر اڑ گئے تھے۔ بتائیں میں کیا کرتا؟ کیا میرے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ تھا؟'' میں نے بے بسی سے کہا۔

''کچھ بھی تھا تمہیں پیسے نہیں چرانے چاہیے تھے۔''

''امی! یہ کوئی اتنی بڑی رقم نہیں تھی۔ لیکن ابو کو مجھ سے زیادہ اس رقم سے پیار تھا۔ میرے خواب ان کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ وہ مجھے خود سے میری مطلوبہ رقم دے دیتے تو مجھے یہ حرکت نہ کرنا پڑتی۔'' میرے لہجے میں نہ چاہتے ہوئے بھی تلخی گھل گئی۔

''وہ رقم انہوں نے تمہاری بہن کی شادی کے لیے سنبھال کر رکھی تھی۔ ورنہ.....''

میں ان کی بات کاٹ کے بولا۔ ''گویا بیٹے کے مستقبل سے زیادہ ان کے لیے بیٹی کا مستقبل اہم ہے۔'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''ایسی بات نہیں ہے.....'' امی نے کمزور سے لہجے میں دفاع کی کوشش کی۔

''تین لاکھ سے زائد میری یہاں تنخواہ ہے اور یہ ابھی ابتدا ہے۔ جلد ہی میں کروڑوں میں کھیلنے لگوں گا۔''

''بیٹا! میری دعا ہے تم کروڑوں کیا اربوں میں کھیلو۔ مگر اپنے باپ کو تم جانتے ہو۔ ان کے دل میں تمہارے لیے جو گرہ پڑ گئی ہے، وہ اب کبھی نہیں کھل سکتی۔ تمہیں وہ رقم نہیں چرانی چاہیے تھی۔''

انہوں نے ابھی تک مرغے کی وہی ایک ٹانگ پکڑ رکھی تھی۔ میں جھنجلا گیا۔ ''میں تین لاکھ ایک ماہ بعد بھیج دوں گا۔'' یہ کہتے ہی میں نے کال کاٹ دی۔ غم و غصے سے میرا برا حال ہو رہا تھا۔ میرے گھر والوں کے لیے میرے خواب کوئی اہمیت ہی نہیں رکھتے تھے۔ مجھے علم تھا کہ مجھے یہ سب سننے کو ملے گا اسی لیے مجھے کال کرنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ میں

www.pklibrary.com

گہرے گہرے سانس لے کر خود کو پُرسکون کرنے لگا۔

مجھے ساری فکریں بھلا کے بس اپنے کام پر ساری توجہ مرکوز کرنی تھی۔ اس لیے میں نے فیصلہ کیا کہ جب تک میں تین لاکھ کی رقم بھجوا نہیں دیتا، گھر کال نہیں کروں گا۔

میں دن بھر کام میں جتا رہتا اور رات کو جب اپنے اپارٹمنٹ میں آتا تو تنہائی مجھے بری طرح کھلنے لگتی۔ میرا جی چاہتا کہ گھر کال کروں۔ اپنی ماں سے، اپنی بہنوں سے اپنے مسائل شیئر کروں۔ کچھ ان کی سنوں کچھ اپنی سناؤں۔ وہ مجھ سے فرمائشیں کریں۔ میں انہیں پورا کرنے کے وعدے کروں لیکن ان کے رویّے کا سوچ کے دل مسوس کے رہ جاتا۔

میرا کام تو ٹھیک چل رہا تھا لیکن اپنے کولیگز کے رویّے کے باعث میں خود کو بہت تنہا محسوس کرنے لگا تھا۔ میرے اردگرد لوگوں کا ہجوم تھا مگر ان میں کوئی بھی اپنا نہیں تھا۔ مجھ پر بے کیفی و بے حسی کی وہی چادر سی تن گئی تھی جس نے پچھلی پوری زندگی مجھے اپنے حصار میں مقید رکھا تھا۔ اکثر میں امریکا آنے کے فیصلے پر پچھتاتا۔ کچھ بھی تھا پاکستان میں میرے کچھ اپنے تو تھے، جنہیں میری فکر تھی۔ جن سے میں بات کرسکتا تھا۔ یہاں تو ایسا محسوس ہوتا تھا میں گونگوں کے شہر میں آگیا ہوں۔ جن کی زبان سے الفاظ تو نکلتے تھے مگر وہ میرے لیے نہیں نکلتے تھے۔ مجھے کوئی اشد ضرورت کے تحت ہی مخاطب کرتا تھا۔

آخر وہ دن آن پہنچا جب مجھے پہلی تنخواہ ملی۔ یہ پاکستانی چار لاکھ کے لگ بھگ کی رقم تھی۔ رقم ہاتھ میں دیکھ کر میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اپنی پچھلی پوری زندگی میں اتنی رقم یکمشت اپنے پاس ہونے کا میں نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ اس سے قریباً نصف رقم کے لیے میں نے اپنی سنہری جوانی کے دن رات برباد کر کے قرض اتارا تھا اور میرے والدین اس بار بھی چاہتے تھے کہ میں اپنی زندگی اس بار بھی پائی پائی جوڑتے ہوئے گزار دوں۔ آج پورے ماہ میں پہلی بار مجھے امریکا آنے کا فیصلہ درست محسوس ہوا تھا۔

میرے اخراجات نہ ہونے کے برابر تھے۔ میں نے تین لاکھ کے مساوی ڈالرز روپوں میں تبدیل کرانے کے بعد پاکستان بھجوا دیے۔ میں نے امی کو رقم کا بتانے کے لیے کال کی تو خلافِ توقع انہوں نے کسی خاص خوشی کا اظہار نہیں کیا۔ وہ ابھی تک مجھ سے ناراض لگ رہی تھیں۔ اس دن میں نے سائرہ اور نوشین سے بھی بات کی۔ ان سے بات کرنے کے بعد ایک عرصے کے بعد میرے دل میں خوشی کا احساس جاگا۔ سائرہ نے میری ڈھارس بندھائی۔

''بھائی! آپ نے درست فیصلہ کیا ہے۔ امی، ابو کا کیا ہے۔ وہ پرانے زمانے کے لوگ ہیں۔ انہیں علم ہی نہیں کہ دنیا کس ڈگر پر جا رہی ہے۔ فی زمانہ سب سے بڑی چیز پیسا ہی ہے۔ جلد جب آپ کی بدولت ہمارے مالی حالات بدلیں گے تو انہیں بھی آپ کا فیصلہ درست لگنے لگے گا۔''

''سائرہ! تم انہیں سمجھا نا۔ ابو تو چلو پہلے بھی مجھ سے ناراض ہی رہتے تھے مگر امی کے شکوے شکایات کی وجہ سے مجھے کال کرنے کا دل ہی نہیں چاہتا۔ میں دنیا و غیر میں بالکل تنہا ہوں۔ مجھے تم لوگوں کی سپورٹ کی ضرورت ہے۔''

''آپ فکر نہ کریں۔ اب آپ نے ابو کی رقم لوٹا دی ہے تو امید ہے ان کے دل میں بھی آپ کے لیے جگہ پیدا ہو جائے گی۔ آج نہیں تو کل وہ آپ پر فخر محسوس کریں گے۔''

سائرہ سے بات کر کے مجھے بہت سکون ملا تھا۔ مجھ پر چھائی اداسی کی کیفیت خاصی حد تک زائل ہو گئی تھی۔ اس کے بعد میں اکثر گھر کال کرنے لگا تھا۔ امی بھی مجھ سے راضی ہو گئی تھیں لیکن ابو جانے کس مٹی کے بنے تھے۔ باوجود کوشش کے انہوں نے مجھ سے بات کرنا گوارا نہ کیا تھا۔

تین ماہ میں ہمارا پروجیکٹ مکمل ہو گیا تھا۔ اب اسے لانچ کرنے اور اس کی مارکیٹنگ کا مرحلہ درپیش تھا۔ گیم میری توقع سے کچھ مختلف بنا تھا تاہم مجھے یقین تھا کہ ہمارا یہ پروجیکٹ کامیاب رہے گا۔

ان دنوں فیس بک تیزی سے مقبول ہو رہی تھی اور گیم کی مارکیٹنگ کے لیے میں فیس بک کا آئیڈیا فلپ کے سامنے پہلے ہی رکھ چکا تھا۔ فلپ نے اس حوالے سے ضروری کام کر لیا تھا۔ آخر وہ دن آگیا جس دن میرا پہلا پروجیکٹ لانچ ہوا۔ میری آئندہ زندگی کا دارومدار اسی پروجیکٹ کی کامیابی یا ناکامی پر تھا۔ ناکامی کی صورت میں مجھے یہاں جاب سے ہاتھ دھونے پڑ سکتے تھے۔ میں عجیب سے خوف کا شکار تھا۔ مجھے یہ وہم ستاتا رہتا کہ اس سے قبل مجھے زندگی میں کبھی کوئی خوشی مکمل نہیں ملی تھی تو کہیں اس بار بھی یہ خوشی ادھوری نہ رہ جائے۔ یہ خوف ہر لحظہ مجھے بے چین رکھنے لگا۔

گیم کمپیوٹر کے علاوہ ایپل کے آئی فونز کے ساتھ بھی مطابقت رکھتا تھا اور آئی ٹیون اسٹور پر بھی دستیاب تھا۔ اب ہمارا کام اس کے ایررز درست کرنا اور اسے بہتر کرنا تھا۔ گیم اگر مقبول ہو جاتا تو پھر اس کے نئے لیولز پر بھی ہم نے کام کرنا تھا۔ گیم آہستہ آہستہ مقبول ہو رہا تھا مگر اس کی

www.pklibrary.com

مقبولیت کی رفتار میری توقع سے سست تھی یا شاید میں ہی زیادہ بے چین تھا۔

آخر فیس بک پر مارکیٹنگ کا آئیڈیا کام کر گیا۔ گیم کی مقبولیت میں یکدم اضافہ ہو گیا۔ اس خوشی میں فلپ نے پوری ٹیم کے لیے بونس کا اعلان کیا۔ گیم اور مارکیٹنگ کا سارا آئیڈیا میرا تھا۔ اس پروجیکٹ کو لیڈ بھی میں کر رہا تھا لیکن فلپ نے بونس پوری ٹیم کے ارکان کو برابر دیا تھا۔ یہ امر میرے لیے تکلیف دہ تھا۔ میرا حق زیادہ بنتا تھا تاہم میں شکایت کا حق نہیں رکھتا تھا۔ میرا تعلق تیسری دنیا کے ملک سے تھا اور میری سب سے بڑی ''ڈس کوالیفکیشن'' ان کے نزدیک یہی تھی۔

گیم کی مقبولیت کے ساتھ ہماری تنخواہ بھی بڑھ گئی تھی، مگر اپنی ٹیم کے باقی ممبران کی تنخواہ دیکھ کر میری ساری خوشی ماند پڑ گئی تھی۔ میں ان سے زیادہ کام کرتا تھا مگر ہماری تنخواہوں میں نمایاں فرق تھا۔ میں خود کو درجۂ چہارم کے ملازم کی طرح ہی محسوس کر رہا تھا۔ کام سب سے زیادہ مگر رویہ اہانت آمیز۔ صلاحیت سب سے زیادہ مگر تنخواہ سب سے کم۔ میرے لیے سب بدل کے بھی کچھ نہیں بدلا تھا۔

انہی دنوں سائرہ کی شادی کے دن مقرر ہو گئے۔ میں اس کی شادی پر پاکستان جانا چاہتا تھا مگر ان دنوں کام کا بوجھ زیادہ تھا۔ گیم کی مقبولیت کے بعد ہم اس کے نئے لیولز پر کام کر رہے تھے۔ میں نے فلپ سے چھٹی کے متعلق درخواست کی جو اس نے حسب توقع رد کر دی۔

میں نے اپنا پورا بونس سائرہ کی شادی کے لیے بھیج دیا۔ سائرہ کی شادی میرے نزدیک اس لیے بھی مبارک ثابت ہوئی کہ سائرہ کی ضد پر پہلی بار ابو نے مجھ سے بات کی۔ میں نے ان سے معافی مانگی مگر ان کا رویہ سپاٹ ہی رہا۔ بہرحال ان کے بات کرنے سے مجھے امید بندھ گئی تھی کہ جلد ہی وہ مجھے معاف کر دیں گے۔ میری زندگی کافی الحال سب سے بڑا مسئلہ یہی تھا۔ میں یہی سوچا کرتا تھا کہ ابو مجھ سے راضی ہو جائیں تو میں خوشیوں کی ڈگر پر چل پڑوں گا مگر یہ میری بھول تھی۔

☆☆☆

ہم ہمیشہ خوشیوں کی جستجو میں رہتے ہیں اور اس جستجو میں ہم ان خوشیوں کو بھول جاتے ہیں جو ہمیں میسر ہوتی ہیں۔ ہم یہی سوچتے رہتے ہیں کہ یہ مسئلہ، یہ پریشانی حل ہو جائے تو زندگی پُرسکون ہو جائے گی لیکن ایک مسئلہ حل ہوتا ہے تو دوسرا پیدا ہو جاتا ہے یا ہم خود کسی مسئلے کو سر پر سوار کر لیتے ہیں۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہو رہا تھا۔ سائرہ کی شادی پر ابو نے کھل کے خرچ کیا تھا۔ ان کی معاشرے میں عزت بنی تھی اور یہ سب میری بدولت ہی ہوا تھا۔ ابو کو آخر کار میری اہمیت اور میرے فیصلے کے درست ہونے کا احساس ہو گیا تھا۔ وہ مجھ سے کھل کے بات کرنے لگے تھے۔ میں چند دن تو ان کے رویے میں بہتری کی وجہ سے خوشی سے سرشار رہا لیکن جلد ہی مجھ پر پرانے کیفی کی کیفیت پھر طاری ہو گئی تھی۔ میری زندگی بھی کوئی زندگی تھی، دن بھر کام میں جتے رہنا اور رات کو آ کے سو جانا۔

میرے اردگرد لوگ ایک دوسرے کے ساتھ وقت گزارتے تھے، ہنستے بولتے تھے۔ وہ زندگی سے بھرپور انداز میں لطف کشید کر رہے تھے مگر میرے لیے شاید ان خوشیوں میں کوئی حصہ نہیں تھا۔ مجھے ان دنوں تنہائی بری طرح کھلنے لگی تھی۔ میں کسی دوست کی کمی شدت سے محسوس کرنے لگا تھا۔ اب میں یہی سوچا کرتا تھا کہ مجھے کوئی اچھا سا دوست مل جائے، جس سے میں اپنا دکھ سکھ شیئر کر سکوں تو میری زندگی کتنی پُرسکون ہو سکتی ہے۔

انہی دنوں ہماری کمپنی میں ایک نئی لڑکی عنایہ جوائن ہوئی۔ وہ ویب ڈیولپر تھی۔ ہمارا کام بڑھ گیا تھا اس لیے فلپ نے اسے میرا معاون رکھا تھا۔ وہ پاکستانی نژاد امریکن تھی۔ وہ امریکا میں ہی پیدا ہوئی اور یہیں پلی بڑھی تھی۔ وہ بہت ہنس مکھ طبیعت کی مالک تھی۔ خوبصورتی اس کی اضافی خوبی تھی۔ گندمی رنگت، سیاہ سیدھے بال اور سیاہ آنکھیں..... وہ مغربی اداؤں اور مشرقی حسن سے مالا مال تھی۔ اسے دیکھتے ہی میرے دل کی دھڑکن بڑھ جاتی۔

اپنی ہنس مکھ طبیعت کے ساتھ جلد ہی اس کی سب سے دوستی ہو گئی۔ ایڈی اس کے آگے پیچھے پھرنے لگا۔ اس کی کام سے توجہ بھی ہٹ گئی۔ نتیجے میں مجھے اس کے حصے کا کام بھی کرنا پڑتا۔ فلپ سے شکایت فضول تھی۔ اسے بس کام سے مطلب تھا۔ اسے اس سے کوئی غرض نہیں تھی کہ کام کرتا کون ہے۔ لیڈر ہونے کے ناتے وہ مجھ سے ہی کام کے متعلق استفسار کرتا تھا۔ عنایہ کو کام سے زیادہ باتیں کرنے کا شوق تھا۔ اس وجہ سے جوزف اور ماریا کا کام بھی متاثر ہوا تھا۔ وہ انہیں بھی اپنے ساتھ لگائے رکھتی۔ عنایہ کے آنے سے کام کی رفتار بڑھنے کے بجائے سست ہو گئی تھی مگر میں اسے کچھ کہہ بھی نہیں سکتا تھا۔

عنایہ انگریزی لہجے میں اردو بولتی تھی اور میں اردو لہجے میں انگریزی۔ اس تضاد کے باعث اسے مجھ سے بات

www.pklibrary.com

کرتے ہوئے بہت لطف آتا تھا۔ وہ مجھ سے بات کرتے ہوئے ہنستی ہی رہتی اور میں یک ٹک اس کے چہرے پر پھیلے ہنسی کے رنگ دیکھتا رہ جاتا۔ وہ جب مجھ سے بات کر رہی ہوتی تو ایڈی کے تاثرات دیکھنے والے ہوتے تھے۔ اکثر وہ عنایہ کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے اسے کوئی کام بتاتا لیکن عنایہ ایک کان سے سن کے دوسرے سے نکال دیتی۔ ایڈی اپنی جگہ پیچ و تاب کھاتا رہ جاتا۔ اس کی کیفیت دیکھ کے مجھے دلی سکون ملتا۔

اس شام میری ٹیم کے سب ممبرز پہنچ کر چکے تھے۔ میرا کچھ کام رہتا تھا اور وہ میں نمٹا کے ہی اٹھنا چاہ رہا تھا۔ میں نے ایڈی سے رکنے کا کہا تھا مگر حسب توقع اس نے میری بات پر کان نہیں دھرے تھے۔ میں سخت غصے میں تھا لیکن کچھ کر نہیں سکتا تھا۔ میں بس کام کر سکتا تھا اور وہ کر رہا تھا۔ اچانک میری نظر عنایہ پر پڑی۔ وہ فلپ کے کمرے سے نکل رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ میری طرف بڑھی۔

''اوئے گھونچو، تم ابھی ادھر ہی بیٹھا ہے۔'' پاس پہنچ کے وہ میری طرف جھک کے اپنے مخصوص انداز میں بولی۔ مجھے وہ اکثر گھونچو ہی کہتی تھی۔ جانے کہاں سے اس نے یہ لفظ سیکھا تھا۔ مجھے برا لگنا چاہیے تھا لیکن جانے کیوں اس کے لبوں سے نکلا یہ لفظ بھی مجھے پیارا لگنے لگا تھا۔

''میرا خیال تھا تم جا چکی ہو۔'' میں اس کے سراپا سے نظریں چراتے ہوئے بولا۔

''جا رہی تھی کہ فلپ نے بلا لیا۔'' اس نے بیزاری سے کہا۔

''کیوں؟'' میں نے اچنبھے سے پوچھا۔

وہ ہنسی۔ ''گھنچا میرے ساتھ فلرٹ کر رہا ہے۔ ڈنر کی دعوت دے رہا تھا۔''

میرے چہرے پر سایہ سا پھیلا۔ ''پھر تم نے کیا کہا؟''

''میں نے اسے کہا آج تو میں ذیشان کے ساتھ دعوت پر جا رہی ہوں۔'' اس نے شریر سے انداز میں مسکراتے ہوئے کہا تو میرے دل کی دھڑکن بڑھ گئی۔

''مگر ہمارا تو ایسا کوئی پروگرام نہیں تھا۔'' میں نے حیرانی سے کہا۔

''نہیں تھا تو کیا ہوا، ابھی بن جائے گا۔'' وہ میرا بازو پکڑ کے بے تکلفی سے بولی۔ ''چلو اٹھو، آج میں تمہیں ڈنر پر لے کر جاؤں گی۔''

''بس تھوڑا سا کام رہ گیا ہے۔ یہ مکمل ہو جائے تو چلتے ہیں۔''

''نہ نہ..... جلدی اٹھو۔ اس سے پہلے کہ وہ گھنچا باہر نکلے، ہم کو جانا ہے۔''

میں نے احتجاجی انداز میں اسے دیکھا لیکن وہ مجھے کھینچنے لگی۔ ناچار میں نے کمپیوٹر شٹ ڈاؤن کیا اور اس کے ساتھ چل پڑا۔

پارکنگ سے اس نے اپنی گاڑی نکالی۔ یہ ریڈ کلر کی نئے ماڈل کی لیکسز تھی۔ کار چھوٹی تھی لیکن کافی قیمتی معلوم ہو رہی تھی۔ میں نے عنایہ سے اس کا اظہار کیا تو وہ ہنسی۔

''میرا باپ ٹھیک ٹھاک دولت مند ہے۔''

''تو پھر مزے اڑاؤ۔ جاب کی تمہیں کیا ضرورت ہے۔''

''جاب تو میں تجربے کے لیے کر رہی ہوں۔ میرا اپنی سافٹ ویئر کمپنی بنانے کا ارادہ ہے۔'' اس نے معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا۔

''یہ تو میرا بھی خواب ہے۔ کاش میرے پاس سرمایہ ہوتا۔'' میں نے حسرت سے کہا۔

''واقعی؟'' اس کے لہجے سے خوشی جھلکی۔ ''تو پھر چلو، دونوں مل کے اپنے خوابوں کی تعبیر پاتے ہیں۔''

میری سوالیہ نظروں کے جواب میں وہ بولی۔

''میرے پاس سرمایہ ہے تمہارے پاس آئیڈیاز۔ ہم دونوں مل کے جلد کامیاب ہو سکتے ہیں۔ فلپ کی کمپنی تمہارے گیم کی بدولت کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ وہ لاکھوں ڈالرز تمہارے گیم سے کما رہے ہیں، تمہیں کیا مل رہا ہے؟ یہ تمہاری اپنی کمپنی ہوتی تو یہ لاکھوں ڈالرز تمہارے اکاؤنٹ میں جانے تھے۔''

میری آنکھیں خواب بننے لگیں۔ کچھ دیر قبل تک میں مایوس اور دل گرفتہ تھا مگر عنایہ نے میرے سامنے خوابوں کی ایک ایسی راہ گزر بچھا دی تھی کہ اس پر چل کے اپنے خوابوں کی تعبیر پانے کا امکان روشن ہو گیا تھا۔ اس خواب کی تکمیل کے لیے میں نے اپنی زندگی کھودی تھی۔ سمیرا اور بچوں کو میں ابھی تک بھول نہیں سکا تھا۔ میں جب بھی مایوس ہوتا ان کی یادوں سے میرا سینہ جلنے لگتا۔ یہ قربانی ہی تھی جس نے مجھے اپنا دیس، اپنے والدین اور بہنوں سے جدائی کی ہمت دی تھی۔ اب اس قربانی کا صلہ ملنے کی امید پیدا ہو گئی تھی۔

عنایہ مجھے ایک مہنگے ریسٹورنٹ میں لے گئی تھی۔ مینیو کے انتخاب میں میرا گریز دیکھ کے اسی نے آرڈر کیا تھا۔ ڈنر کے دوران ہم سافٹ ویئر کمپنی کے متعلق باتیں کرتے رہے۔ بل کی باری آئی تو میں نے اپنا پرس نکالا۔ عنایہ مجھے پرس نکالتے دیکھ کر بولی۔

www.pklibrary.com

''ڈنر میری طرف سے ہے۔''

''ہمارے ہاں لڑکیوں کا بل دینا معیوب سمجھا جاتا ہے۔'' میں نے ڈیبٹ کارڈ نکال کے مسکراتے ہوئے کہا۔

وہ مسکرائی۔ ''مشرقی مردوں کی یہی ادا مجھ کو بہت پسند ہے۔ وہ خواتین کی بہت کیئر کرتے ہیں۔ میرے فادر بھی مام کا بہت خیال رکھتے ہیں۔''

''پھر تو تمہیں بھی کسی پاکستانی مرد سے شادی کرنی چاہیے۔'' میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

''تم مجھ کو پروپوز تو نہیں کر رہے گھونچو؟'' اس نے آنکھیں پھیلا کے کہا اور ہنسنے لگی۔ میں گڑبڑا گیا۔

''گھونچو، موقع اچھا ہے۔ دل کی بات کہہ دے۔'' میرے ذہن میں خیال آیا۔ میں نے بڑی مشکل سے ہمت مجتمع کی اور محتاط انداز میں پوچھا۔

''اگر میں ہاں کہوں تو؟'' اس نے ایک لحظہ رک کر میری طرف دیکھا اور پھر سنجیدگی سے بولی۔

''تو میں بھی ہاں کہوں گی۔'' اس کا جواب سن کر میں خود کو ہواؤں میں اڑتا محسوس کرنے لگا۔ چند لمحوں نے میری زندگی کی کایا پلٹ دی تھی۔ آج عرصے بعد میرا دل حقیقی خوشی سے معمور ہوا تھا۔

☆☆☆

عنایہ نے میری بے رنگ زندگی کو رنگوں سے بھر دیا تھا۔ اب اکثر ہماری شامیں ایک ساتھ گزرنے لگی تھیں۔ ویک اینڈ پر ہم کہیں گھومنے نکل جاتے۔ کہاں تو میں ہر وقت تنہائی اور بوریت محسوس کرتا رہتا تھا اور اب میرے پاس گھر کال کرنے کا بھی وقت نہیں ہوتا تھا۔ کبھی کال کر بھی لیتا تو امی اور نوشین کے شکوے شروع ہو جاتے اور میں جھنجلا جاتا۔ عنایہ کے ساتھ وقت گزارنے سے میرے اخراجات میں اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ دولتمند تھی۔ پیسا اس کے لیے ہاتھ کے میل کی حیثیت رکھتا تھا۔ وہ کھلے دل سے بنا سوچے خرچ کرتی تھی اور میں اس سے پیچھے نہیں رہنا چاہتا تھا۔ اب بچت محال تھی۔ نتیجے میں، میں نے گھر پیسے بھیجنا بھی بند کر دیے تھے۔

اس نے مجھے اپنے والدین سے بھی ملوایا تھا۔ وہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی۔ پہلی بار ہم ان کے گھر ہی ملے تھے۔

اس کی ماں امریکن تھی اور باپ پاکستانی۔ اکرم صاحب جوانی میں ہی اسٹڈی ویزے پر امریکا آئے تھے اور میری سے شادی کے بعد یہیں کے ہو کر رہ گئے تھے۔

دونوں میاں بیوی رئیل اسٹیٹ کے بزنس سے منسلک تھے جو میری کو اپنے والد سے ورثے میں ملا تھا۔ اکرم صاحب خاصے وجیہہ اور شریف آدمی تھے جبکہ میری صاحبہ شکل و صورت کے لحاظ سے تو عام سی تھیں مگر ان کی شخصیت میں ایسا رعب تھا کہ ملنے والا ان سے مرعوب ہوئے بنا نہیں رہ سکتا تھا۔ مجھے اکرم صاحب بھی ان سے کافی دبے دبے سے محسوس ہوئے۔ ان کے لہجے میں بیوی سے محبت کے ساتھ احترام کا جذبہ نظر آتا تھا جبکہ میری کے انداز میں تحکم کی جھلک تھی۔ ان کے کردار ہمارے ہاں کے میاں بیوی کے کردار سے الٹ تھے۔

میری کی رعب دار شخصیت دیکھ کر میں کافی کنفیوژ ہو گیا تھا۔ وہ مجھ سے کریدکرید کے سوال پوچھتی رہیں اور میں جھجک کے جواب دیتا رہا۔ وہ کچھ دیر مجھ سے بات کرنے کے بعد معذرت کر کے اٹھ گئیں۔ انہیں کسی ضروری کام سے جانا تھا۔ ان کے مقابلے میں اکرم صاحب سے بات کرنا سہل تھا۔ وہ مجھ سے پاکستان کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ عنایہ سے مجھے پتا چلا تھا کہ وہ امریکا آنے کے بعد ایک بار بھی پاکستان نہیں گئے تھے۔

''آپ کا کبھی پاکستان جانے کا دل نہیں چاہتا؟'' یہ سوال کافی دیر سے میرے ذہن میں مچل رہا تھا۔

انہوں نے ٹھنڈی آہ بھری اور گویا ہوئے۔ ''بیٹا! پاکستان میرا اپنا ملک ہے مگر افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ میرے جیسا شخص وہاں کبھی خوش نہیں رہ سکتا تھا۔''

''وہ کیوں؟'' میرے لہجے میں استعجاب تھا۔

''وہاں دو نمبر راستے پر چلے بنا بندہ ترقی نہیں کر سکتا۔ سیدھے راستے پر چلنے والا پریشان ہی رہتا ہے۔''

''یہ بات تو آپ درست کہہ رہے ہیں۔'' میں نہ چاہتے ہوئے بھی ان سے اتفاق کرنے پر مجبور تھا۔ میرے سامنے اپنی پچھلی زندگی کے ماہ و سال گھومنے لگے تھے۔

''مگر آپ کے والدین، بہن، بھائی؟''

''میری ماں میرے لڑکپن میں ہی فوت ہو گئی تھی۔ والد کی وفات یہاں آنے کے بعد جلد ہی ہو گئی تھی۔ بھائیوں نے تب تک رابطہ رکھا جب تک میں انہیں پیسے بھیجتا رہا۔ میں نے پیسے بھیجنا چھوڑے تو انہوں نے رابطہ ہی چھوڑ دیا۔ شکر کیا ہو گا انہوں نے کہ حصے کا ایک وارث کم ہو گیا۔'' ان کے لہجے میں تلخی تھی۔

''تمہاری خوش قسمتی ہے کہ تم وہاں سے نکل آئے۔'' میں نے چونک کے انہیں دیکھا۔ ''عنایہ بتا رہی تھی

www.pklibrary.com

کہ تم بہت ٹیلنٹڈ ہو۔ وہاں تمہارے ٹیلنٹ کی کوئی قدر نہیں تھی۔ یہاں دیکھنا کیسے تم ترقی کے زینے طے کرتے ہو۔'' ان کی باتیں میرے دل کو لگ رہی تھیں۔ واقعی اپنے ملک میں، میرے پاس ترقی کا کوئی چانس نہیں تھا۔ ساری زندگی کولھو کے بیل کی طرح کام کرتا رہتا اور میری محنت کا پھل کوئی اور کھاتا رہتا۔ یہ سب سوچتے ہوئے میں فلپ کو بھول گیا تھا۔ میں یہ بھی بھول گیا تھا کہ سرمایہ دار چاہے پاکستان کا ہو یا امریکا کا، اس کے پیش نظر بس اپنا مفاد ہوتا ہے۔ ملازم کی حیثیت اس کے لیے محض ایک مشین کے پرزے کی طرح ہوتی ہے۔ ایک پرزہ ٹوٹ گیا تو دوسرا آگیا۔ مشین کبھی نہیں رکتی۔ وہ نوٹ چھاپتی رہتی ہے اور سرمایہ دار کا اکاؤنٹ ان نوٹوں سے بھرتا جاتا ہے۔ رہا ملازم تو وہ ساری زندگی سسک سسک کر بس اپنی ضروریات ہی پوری کرنے میں لگا رہتا ہے۔ سرمایہ دار جو رقم ملازم کو دیتا ہے وہ دو پارہ ہتھیانے کے گر بھی اس کے پاس ہوتے ہیں۔ وہ ایسی پُرکشش مصنوعات متعارف کراتا ہے، ایسے انداز میں ان کی مارکیٹنگ کرتا ہے کہ وہ جلد ہی آسائشات سے ضروریات کے زمرے میں آجاتی ہیں۔ نتیجے میں ضروریات بڑھتی جاتی ہیں اور آمدنی کم پڑتی جاتی ہے۔ میں نے یہ سب بھولنا ہی تھا کہ میرا اسٹیٹس تبدیل ہونے والا تھا۔ میری سوچ تو بدلنی ہی تھی۔

☆☆☆

چند ماہ بعد ہی عنایہ نے اپنے والدین کے تعاون سے اپنی سافٹ ویئر کمپنی بنالی تھی۔ میں اس کمپنی کے منافع میں بیس فیصد کا شریک کار تھا۔

اب میں اپنے آئیڈیاز پر کھل کے کام کرسکتا تھا۔ میرا اگلا ٹارگٹ ایک سوشل میڈیا ایپ بنانا تھا۔ اسمارٹ فون کا استعمال بڑھتا جارہا تھا اور میں جانتا تھا کہ آنے والے وقت میں سوشل میڈیا ایپس کا استعمال بھی غیر معمولی طور پر بڑھے گا۔ میں کام میں جت گیا۔

میں اپنی سابقہ کمپنی کی طرف سے فراہم کردہ اپارٹمنٹ ترک کرکے عنایہ کے گھر منتقل ہوگیا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ عنایہ سے میری جلد شادی ہوجائے لیکن اس کے بقول ابھی اس کا وقت نہیں آیا تھا۔ سافٹ ویئر کمپنی کی کامیابی سے قبل وہ شادی کرنے پر رضامند نہیں تھی۔

عنایہ کے والدین سے اکثر میری ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ اکرم صاحب کے خیالات غیر محسوس انداز میں مجھ میں منتقل ہوگئے تھے۔ اب پاکستان جانے کے خیال سے ہی مجھ پر وحشت طاری ہوجاتی۔ میں اب مہینوں بعد گھر کبھی کال کرتا تھا۔ امی شکوے تو کرتی تھیں لیکن انہوں نے کبھی مجھے کال کرنا گوارا نہ کیا تھا۔ حالانکہ میرا نمبر ان کے پاس تھا۔

انہی دنوں امی نے بتایا کہ انہوں نے نوشین کی شادی کی تیاری شروع کردی ہے۔ میں نے کافی عرصے سے گھر ایک روپیا بھی نہیں بھیجا تھا۔ امی نے جھجکتے ہوئے پیسوں کا مطالبہ کیا تو میرا پارہ چڑھ گیا۔ انہوں نے تو گویا مجھے پیسے کمانے کی مشین سمجھ لیا تھا۔ حالانکہ اس پوزیشن تک پہنچنے میں میری اپنی محنت اور ارادے کی قوت تھی۔ ان کا کسی قسم کا تعاون شامل نہیں تھا۔ الٹا انہوں نے میرے خوابوں کی راہ میں رکاوٹیں ہی حائل کی تھیں۔ ان دنوں ہمارا کام نیا نیا شروع ہوا تھا اور پیسے کے لیے میرا ہاتھ خود تنگ تھا۔ میں نے امی کو صاف کہہ دیا کہ وہ مجھ سے مزید پیسوں کی توقع مت رکھیں۔ میں سائرہ کی شادی کے علاوہ بھی انہیں لاکھوں روپے بھیج چکا تھا۔ اب نوشین کی شادی کا میں نے ٹھیکا نہیں لے رکھا۔ میرے الفاظ کی کاٹ نے امی کو رلا دیا تھا۔ میں نے جھنجلا کے کال کاٹ دی۔ میرے دل کے نہاں خانوں میں ندامت کا موہوم سا احساس پیدا ہوا جو میں نے جھٹک دیا۔ یہ آخری بار تھا جب میں نے امی کی آواز سنی تھی۔

☆☆☆

دس سال بعد.....

ہماری کمپنی کامیابی کی ڈگر پر چل پڑی تھی۔ اب ہمارے پاس سیکڑوں ملازم تھے۔ میرے آئیڈیاز پر بنی بہت سی موبائل ایپلی کیشنز، کمپیوٹرز سافٹ ویئر اور ویب سائٹس بن چکی تھیں۔ اب ہم کروڑوں میں کھیل رہے تھے۔ ہماری کمپنی کا شمار امریکا کی چند بڑی سافٹ ویئر کمپنیوں میں ہونے لگا تھا۔ میرے ٹیلنٹ سے اب دنیا بھر میں کروڑوں لوگ فائدہ اٹھا رہے تھے۔ یہ میرا خواب تھا جو دن رات کی محنت کے بعد میں نے آخر کار حاصل کر ہی لیا تھا مگر یہ خواب میرے لیے اہمیت کھو چکا تھا۔ یہ میرے لیے خوشیوں کی ضمانت نہیں بن سکا تھا جیسا کہ میں نے خیال کیا تھا۔ اب میری آنکھوں نے نئے خواب بُن لیے تھے جن کی تعبیر میرے بس میں نہ تھی۔

عنایہ سے میری شادی کو نو سال سے زائد عرصہ گزر چکا تھا۔ وہ آج بھی ویسی ہی تھی۔ ہنس مکھ اور خوبصورت مگر نہ اس کی ہنسی میرے لیے تھی نہ خوبصورتی۔ ہمارا رشتہ میاں بیوی کا تھا مگر تعلق محض بزنس پارٹنرز کا۔ کام کے علاوہ خال ہی وہ مجھ سے بات کرتی تھی۔

www.pklibrary.com

مجھ سے شادی پر وہ بہت خوش تھی مگر میں اسے وہ پُرجوش محبت نہ دے سکا تھا جس کی وہ متقاضی تھی۔ میں مطمئن ہو جاتا مگر وہ جھنجلا جاتی۔ اس ناآسودگی نے اسے جلد ہی مجھ سے بیزار کر دیا تھا۔ میں ہر ممکن اسے خوش رکھنے کی کوشش کرنے لگا مگر وہ مجھ سے چڑنے لگی تھی۔ شادی کے چند ہفتوں بعد ہی اس نے اپنا بیڈروم الگ کر لیا تھا۔ تب سے ہم ندی کے دو کناروں کے مانند تھے جو ساتھ ساتھ چلتے رہتے ہیں لیکن کبھی ملتے نہیں۔

میں نے ڈاکٹر سے مشورے کے بعد ادویات استعمال کیں مگر عنایہ کے دل میں میرے لیے ایسی گرہ پڑ چکی تھی کہ وہ مجھے اپنے قریب آنے ہی نہ دیتی۔ آخر ہار مان کے میں نے خود کو کام میں مگن کر لیا۔ میری فطری ضرورت مجھے تنگ کرتی مگر میں بیوی کے ہوتے ہوئے بھی اپنی ضرورت کے آگے بند باندھنے پر مجبور تھا۔

اب وہ اکثر راتوں کو بھی باہر رہنے لگی تھی۔ میں جانتا تھا کہ وہ بے راہ رو نہیں۔ ہم نے شادی سے قبل بہت سا وقت گزارا تھا لیکن کبھی وہ ایک حد سے آگے نہ بڑھی تھی نہ میں نے اتنی جرأت کی تھی۔ وہ امریکی معاشرے میں پلی بڑھی تھی لیکن اس کے باوجود وہ اپنی آبرو کی حفاظت کرتی تھی۔ اس کی یہی ادا مجھے پسند آئی تھی مگر اب جانے وہ کس راہ پر چل پڑی تھی۔ مجھ سے اس کا تعلق برائے نام ہی تھا لیکن اس کے باوجود وہ جس رات گھر نہ آتی میں بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہتا۔ ویک اینڈز بھی وہ گھر سے باہر گزارنے لگی تھی۔ ہمارا تعلق جیسا بھی تھا وہ میری بیوی تھی۔ میں اس کے حوالے سے کوئی منفی اندیشہ پالنا نہیں چاہتا تھا لیکن واہمے مجھے ستاتے رہتے۔ میں خود کو مطمئن کر کر کے تھک چکا تھا۔

آخر ایک دن میرے واہمے حقیقت کا روپ دھار کے میرے روبرو آن کھڑے ہوئے۔ میں نے عنایہ کو کریہہ صورت ایڈی کے ساتھ دیکھ لیا تھا۔ وہ ایک بار سے نکل رہے تھے۔ ایڈی نے عنایہ کی کمر میں ہاتھ ڈال رکھا تھا۔ عنایہ اس کے سہارے لہراتی ہوئی چل رہی تھی۔ وہ نشے میں دھت لگ رہی تھی۔ وہ بعض اوقات ڈرنک کرتی تھی مگر میں نے اسے کبھی اس طرح نشے میں دھت نہیں دیکھا تھا۔ میرے سامنے وہ عنایہ کی کار میں بیٹھے۔ ڈرائیونگ سیٹ ایڈی نے سنبھالی تھی۔ گاڑی چلی تو میرا سکتہ ٹوٹا۔ میرا دماغ سائیں سائیں کر رہا تھا۔ بے یقینی تھی یا دکھ..... مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ یہ سب کچھ میرے اندیشوں کے عین مطابق تھا مگر اس کے باوجود اس منظر نے میرے وجود کی دیواریں ہلا دی تھیں۔ عنایہ نے مجھ پر فوقیت دی بھی تھی تو اس مڑی ہوئی ناک والے بندر کو۔ یکدم غصے کی ایک تند لہر میرے وجود سے نکلی اور میرا دماغ کھولتا ہوا آتش فشاں بن گیا۔ میں اپنی گاڑی میں بیٹھا اور ان کے پیچھے گاڑی دوڑا دی۔

کچھ دیر بعد ہی ان کی گاڑی ایک اپارٹمنٹ بلڈنگ کے سامنے رکی۔ میں جانتا تھا کہ ایڈی یہاں رہتا ہے۔ ایڈی اور عنایہ گاڑی سے اترے ہی تھے کہ میں ان کے سامنے پہنچ گیا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی ایڈی کی نظروں میں تنفر جاگا۔ میں یک ٹک کھڑا اسے گھور رہا تھا۔ عنایہ نے مجھے دیکھا اور ایڈی سے بہکے ہوئے لہجے میں بولی۔

''یہ باسٹرڈ کون ہے اور کیوں ہمارے راستے میں کھڑا ہے؟'' عنایہ کا یہ جملہ سن کر چھن سے جیسے میرے اندر کچھ ٹوٹا۔ میرا سارا غصہ دکھ کی کیفیت میں ڈھل گیا۔ میں بے یقینی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ سوالیہ نظروں سے ایڈی کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''ہٹو ہمارے سامنے سے۔'' ایڈی نے مجھے دھکا دیا۔ میں لڑکھڑا کے گرا۔ وہ میرے سامنے میری بیوی کو اپنے اپارٹمنٹ میں لے گیا اور میں کچھ نہ کر سکا۔ 18 اگست کی وہ تاریخ مجھے ہمیشہ یاد رہی تھی۔ یہ میری تاریخ وفات تھی۔ اس دن میں اندر سے مر گیا تھا۔

☆☆☆

میں گھر آ کر اپنی بے بسی پر خوب رویا تھا۔ اتنے عرصے میں مجھے پہلی بار اپنے ملک کی اور اپنے گھر والوں کی یاد آئی تھی۔ مجھے اس وقت کسی مہربان کندھے کی ضرورت شدت سے محسوس ہوئی، مگر اس اجنبی ملک میں میرا کوئی اپنا نہیں تھا۔ میں اپنوں کو تو خود بہت دور چھوڑ آیا تھا۔ آج دل ٹوٹا تھا تو ان کی یاد آئی تھی۔ میں نے موبائل نکالا اور فون بک سے امی کا نمبر نکالنے لگا مگر یہ کیا..... امی، ابو، نوشین، سائرہ، میرے بہنوئی کامران کسی کا بھی نمبر تو میرے سیل فون میں محفوظ نہ تھا۔ جانے کب میں سب کے نمبر کھو چکا تھا۔ میں ذہن پر زور ڈال کر امی کا نمبر یاد کرنے لگا۔ ان کا نمبر ایک عرصے تک میرے ذہن میں محفوظ رہا تھا لیکن میں عنایہ کی محبت میں ایسا کھویا تھا کہ سب بھول گیا تھا۔ باوجود کوشش کے میں کوئی بھی نمبر یاد نہ کر سکا۔ میں اپنے ہی بال نوچنے لگا۔

میرے خوابوں کا ملک میرے لیے بہت ظالم ثابت ہوا تھا۔ اجنبی اور بے مہر..... یہاں کے لوگوں کے رویے کی بدولت نہ میں اپنے اندر اعتماد پیدا کر سکا تھا نہ اپنی جھجک دور

www.pklibrary.com

کر سکا تھا۔ ایک عنایہ تھی جس نے مجھے اپنایا تھا مگر اس نے بھی اپنا کے ایسا توڑا تھا کہ میرا وجود ریزہ ریزہ ہو گیا تھا۔ اس رات میں اپنے ٹوٹے وجود کی کرچیاں چنتا رہا اور لہولہان ہوتا رہا لیکن آخر کب تک؟ میرے زخموں سے خون رسنا بھی بند ہو گیا۔ میرا دماغ سوچنے کے قابل ہوا تو مجھے خیال آیا۔ میں کیوں خود کو رو رو کے ہلکان کر رہا ہوں۔ ایک عنایہ کی بے وفائی سے میری زندگی ختم تو نہیں ہو گئی تھی۔ اس نے تو عرصہ ہوا مجھے چھوڑ دیا تھا۔ اب اس سے آخر کیا فرق پڑتا تھا کہ وہ کسی اور کے ساتھ تھی؟ یہ فرق تو میری سوچ نے پیدا کیا تھا۔ میری سوچ نے ہی اس امر کو میرے لیے انتہائی تکلیف دہ بنا دیا تھا۔ اگر میں ایسا سوچنا ترک کر دیتا، اس حقیقت کو قبول کر لیتا، سمجھوتا کر لیتا تو مجھے عنایہ کی بے وفائی سے کوئی فرق پڑنے والا نہیں تھا۔ وہ میری بیوی تھی تو کیا ہوا، یہ رشتہ بھی تو بس کاغذ کے ایک ٹکڑے پر لکھا رہ گیا تھا۔ اسے قائم رکھنا میری مجبوری تھی۔ مجھے اپنے خواب کی تکمیل کے لیے اس مجبوری کو برداشت کرنا ہی تھا۔

آئی ٹی کی دنیا میں تہلکہ مچا دینا میرا ایسا خواب تھا جس پر میں کسی قسم کا سمجھوتا نہیں کر سکتا تھا۔ اس خواب نے مجھ سے بہت بڑا اخراج وصول کیا تھا۔ میں بھلا اس خواب سے کیسے دستبردار ہو سکتا تھا؟ محبت کرنے والی بیوی تو مجھے پچھلی زندگی میں بھی میسر تھی لیکن میں اپنی زندگی کو بے مقصد سمجھتا تھا۔ اسی بے مقصدیت نے زندگی کو میرے لیے تکلیف دہ بنا دیا تھا۔ اب جب میرے سامنے ایک مقصد تھا تو مجھے دل کے بجائے دماغ کی سننی تھی اور میں نے دماغ کی ہی سنی۔ عنایہ سے میں مکمل طور پر مایوس ہو چکا تھا۔ مجھے بھی اب اسے بھلا کے اپنے خواب پر فوکس کرنا تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ عنایہ سے میرا تعلق جیسے بھی چل رہا تھا، مجھے اسے قبول کرنا ہے۔ یہ میری بقا کے لیے ضروری تھا۔ اس فیصلے نے مجھے اطمینان بخشا۔

اگلی صبح میں انھاقورات کے واقعات کا شائبہ تک میرے ذہن میں موجود نہ تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔ میرا دل عجیب سی بے حسی کا شکار ہو چکا تھا۔

عنایہ خلافِ معمول ناشتے کی ٹیبل پر موجود تھی۔ اسے دیکھ کر بھی میرے اندر کوئی احساس نہیں جاگا تھا۔ وہ مجھے یکسر نظر انداز کرتے ہوئے ناشتے میں مشغول رہی۔ اس سے پہلے اس کی بے اعتنائی مجھے بری طرح کھلتی تھی لیکن آج میں بالکل نارمل تھا۔

اکرم صاحب اور میری دیر سے اٹھتے تھے۔ ایک ہی

سنہرے اقوال (ہربرٹ اسپنسر)

☆ دوست کو اپنے حال سے اتنا ہی واقف کرو کہ اگر دشمن بن جائے تو نقصان نہ پہنچا سکے۔

☆ جس کو ماں باپ ادب نہیں سکھاتے اس کو زمانہ ادب سکھا دیتا ہے۔

☆ امن چاہتے ہو تو کان اور آنکھ استعمال کرو لیکن زبان بند رکھو۔

☆ وہ قابلِ تعریف ہے جس نے اولاد کے لیے مال و دولت چھوڑا لیکن اس سے زیادہ قابلِ تعریف وہ ہے جس نے اولاد کو روپیا کمانے اور بچانے کی تعلیم دی۔

☆ عورت کا دل اس کے دماغ پر حکومت کرتا ہے۔

☆ اعلیٰ چال چلن میں عموماً قوتِ ارادی کی کوتاہی سے کمی واقع ہوتی ہے نہ کہ بے عملی سے۔

☆ جو دوسروں کا ادب نہیں کرتا پھر دوسرے بھی اس کا ادب نہیں کرتے۔

☆ بے کار لوگوں کے دلوں میں شیطان فوراً دروازہ کھول لیتا ہے۔

مرسلہ: ریاض بٹ، حسن ابدال

گھر میں رہتے ہوئے بھی عنایہ کی طرح ان سے ملاقات بھی شاذ و نادر ہی ہوتی تھی۔ میں ناشتا کر کے آفس روانہ ہو گیا۔ عنایہ آفس آئی تو اس نے مجھے اپنے کمرے میں بلوایا۔ وہ کام کے متعلق مجھ سے بات چیت کرنے لگی۔ میں نارمل انداز میں جواب دیتا رہا۔ میرا انداز دیکھ کے وہ چند لمحے کے لیے حیران نظر آئی لیکن پھر کندھے اچکا کے اس نے بھی خود کو نارمل کر لیا۔

اس رات بھی عنایہ گھر نہیں آئی تھی لیکن میں سکون کی نیند سو گیا تھا۔ میرے اندر جو بھی تبدیلی آئی تھی میں اس سے مطمئن تھا۔ روز روز کے مرنے سے میرا دل ایک ہی بار اندر سے مر گیا تھا۔ یہی بہتر تھا۔ میں نے اپنا اوڑھنا بچھونا کام کو بنا لیا۔ امی کا نمبر مجھے یاد آ گیا تھا۔ وہ میں چند دن تک ملاتا رہا لیکن نمبر بند جا رہا تھا۔

'ان کے پاس میرا نمبر ہے۔ انہوں نے کبھی مجھے کال نہیں کی تو مجھے کیا ضرورت ہے ان کی یاد میں ہلکان ہونے کی۔' میں نے بے حسی سے سوچا تھا کیونکہ یہی بے حسی میرے مزاج کا حصہ بن گئی تھی۔ خوشی اور غم..... دونوں کے

www.pklibrary.com

احساس سے محروم میں اپنے خواب کی تکمیل میں آگے بڑھتا چلا گیا اور جب میں نے جو سوچا تھا حاصل کر لیا تو یکدم یہ سب میرے لیے بے معنی ہو کے رہ گیا تھا۔ مجھے اپنی ساری دوڑ دھوپ لاحاصل لگنے لگی۔ مجھ پر ڈپریشن کا ایسا دورہ پڑا کہ میرا جی ہر چیز سے اچاٹ ہو گیا۔ میں نے دفتر جانا چھوڑ دیا۔ پورا دن کمرے میں لیٹا سگریٹ پھونکتا رہتا اور سود و زیاں کا حساب کرتا رہتا۔ اب مجھے لگ رہا تھا کہ اس سے بہتر تو میری پہلی زندگی تھی۔ اس زندگی میں، میں کوئی بڑا کام نہیں کر سکا تھا تو کیا تھا۔ میرے پاس محبت کرنے والی بیوی تو تھی۔ میرے پاس دولت نہیں تھی تو کیا تھا، بچے تو تھے۔ ان کے سنگ میں جو زندگی کی خوشیاں کشید کر سکتا تھا، اب شاید ساری دولت خرچ کر کے بھی نہیں کر سکتا تھا۔ سمیرا اور بچوں کی یاد ان دنوں مجھے ایسے بے طرح ستانے لگی تھی کہ میں اس دعا پر پچھتانے لگا تھا جس کی قبولیت مجھے وقت میں پیچھے لے گئی تھی۔

چار پانچ دن تک مجھے کوئی پوچھنے نہ آیا۔ چھٹے دن عنایہ میرے کمرے میں آ دھمکی۔ میں بیڈ پر لیٹا خیالوں میں ایسا گم تھا کہ جب اس نے لائٹ روشن کی تو مجھے اس کی آمد کا علم ہوا۔

وہ کمرے کے وسط میں کھڑی مجھے گھور رہی تھی۔

''یہ کیا حال بنا رکھا ہے تم نے؟ دفتر کیوں نہیں آ رہے؟'' اس نے غصے سے پوچھا۔ میں خالی خالی نگاہوں سے اسے دیکھتا رہا۔

''میں تم سے پوچھ رہی ہوں ذیشان؟ دفتر کیوں نہیں آ رہے۔ کتنے ہی کام تمہاری وجہ سے پینڈنگ میں پڑے ہیں اور تم ادھر پیوں کی طرح پڑے ہوئے ہو۔'' وہ چلائی۔

''مجھے اکیلا چھوڑ دو۔'' اپنی آواز مجھے کسی گہرے کنویں سے آتی محسوس ہوئی تھی۔

''اٹھو، اپنا حلیہ درست کرو اور دفتر چلو۔'' وہ تحکمانہ انداز میں بولی۔ اس طرح بولتے ہوئے وہ بالکل اپنی ماں کی طرح لگ رہی تھی۔

''میں نے تمہیں کہا ہے کہ مجھے اکیلا چھوڑ دو۔ میرے لیے سب بے معنی ہو چکا ہے۔'' میں نے سپاٹ انداز میں کہا۔

''تم آخر کب تک ایسے ہی پڑے رہو گے؟'' اس نے عجیب سے انداز میں پوچھا۔

''جب تک تم برداشت کر سکو۔''

''میں یہ مزید ایک دن بھی برداشت نہیں کر سکتی۔''

''تو پھر میں واپس اپنے ملک چلا جاتا ہوں۔'' یکدم جانے کیسے میرے منہ سے یہ الفاظ نکلے تھے۔

''تم ہوش میں تو ہو؟'' وہ چلائی۔ ''کیا نہیں ہے تمہارے پاس؟ یہ دولت، یہ آسائشات..... لوگ خواب دیکھتے ہی ایسی زندگی کا اور تم یہ سب چھوڑ کے دوبارہ اس پسماندہ ملک میں جانا چاہتے ہو؟''

''میں نے کہا نا، یہ سب میرے لیے بے معنی ہو چکا ہے۔ ایک وقت تھا میں بھی ایسی زندگی کا خواب دیکھتا تھا مگر اس خواب میں میرے سنگ محبت کرنے والی بیوی بھی ہوتی تھی، پیارے پیارے بچے ہوتے تھے۔ اب وہ نہیں ہیں تو کچھ بھی نہیں ہے۔ میں بالکل تہی داماں ہوں۔'' میری آواز نہ چاہتے ہوئے بھرا گئی۔

''یہ سب تو میرے پاس بھی نہیں ہے مگر میں پھر بھی خوش ہوں۔ پتا ہے کیوں؟'' وہ عجیب سے انداز میں بولی۔

''کیونکہ میرے پاس جو ہے میں اس سے لطف اٹھاتی ہوں میں جس سے محروم ہوں اس کی فکر میں گھلتی نہیں۔''

یکدم میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ اتنی بنیادی چیز کبھی میرے ذہن میں کیوں نہیں آئی تھی۔ میرے پاس جو تھا میں نے کبھی اس کی قدر نہیں کی تھی۔ ہمیشہ یہی سوچا تھا کہ کاش ایسا نہ ہوتا یا ایسا ہو جائے۔ اس کاش نے ہی تو مجھے کبھی زندگی کا لطف نہیں لینے دیا تھا۔ اس کاش نے ہی تو میری زندگی کو بے کیفی سے بھر دیا تھا۔ اس کاش نے کبھی مجھے اس پر شکر گزار ہونے کا موقع ہی نہ دیا تھا جو مجھے حاصل تھا۔

''میں تمہیں آج کا دن دیتی ہوں۔ کل تم نے ہر صورت دفتر آنا ہے۔'' وہ یہ کہتی ہوئی چلی گئی مگر میرے لیے سوچ کا نیا در وا کر گئی۔ میرا ذہن آج ایک نئے زاویے سے سوچ رہا تھا۔ مکمل تو دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ کوئی نہ کوئی محرومی ہر شخص کے حصے میں ہوتی ہے۔ پھر کیوں میں ہمیشہ اپنی محرومیوں کا رونا روتا رہا تھا؟ کیوں اپنی منفی سوچ کو مایوسی کا پانی دے دے کر سینچتا رہا تھا؟ میرے رب نے جو مجھے عطا کیا تھا، اس پر، اس کا شکر گزار بندہ کیوں نہ بنا تھا؟ میں سوچتا رہا اور عرق ندامت میری آنکھوں سے بہتا رہا۔

یکدم میں اٹھا۔ وضو کر کے جائے نماز بچھا کر بیٹھ گیا۔ مجھے اپنے رب سے توبہ کرنا تھی۔ میں نے ہمیشہ اس سے شکوے ہی کیے تھے، کبھی شکر نہ کیا تھا۔ میں خدا سے معافی مانگنے لگا۔ ''یا اللہ، تو نے مجھے خیال رکھنے والی بیوی عطا کی تھی۔ اولاد کی نعمت سے نوازا تھا۔ میں تیرا ناشکرا بندہ ان کی قدر نہ کر سکا۔ یا اللہ، مجھے معاف کر دے۔ یا اللہ، میں غلطی پر تھا۔ اے غفور و رحیم! مجھے معاف کر دے، مجھے معاف کر

www.pklibrary.com

دے۔'' میرے لبوں پر اس جملے کا ورد ہونے لگا۔ یہ ورد کرتے کرتے میں شاید سو گیا تھا۔

☆☆☆

میں نے خود کو دھند کی طرح ہوا میں اڑتا ہوا محسوس کیا۔ خواب دیکھتے ہوئے بھی مجھے احساس تھا کہ ایسا میرے ساتھ پہلے بھی بیت چکا ہے۔ اس بار میں خوفزدہ نہیں تھا بلکہ سنسنی کی لہر اپنے وجود میں دوڑتی ہوئی محسوس کر رہا تھا۔ مجھے سمیرا اور بچوں کا خیال آیا۔

''کیا مجھے وقت ان کے پاس لے کر جا رہا ہے؟''

اس خیال نے میرے اندر خوشی کی لہر بیدار کر دی تھی۔ میں تاریک سرنگ میں سفر کر رہا تھا لیکن میرے اندر روشنی تھی۔ میری آنکھ کھلی تو میں نے اپنے اندر سکون کا انوکھا احساس موجزن پایا۔ جیسے کوئی من پسند خواب دیکھنے کے بعد انسان جاگتا ہے تو اس کی رگوں میں کیف و انبساط کی، سکون کی لہر موجزن ہوتی ہے، میں بھی کچھ ایسا ہی محسوس کر رہا تھا۔ کتنی ہی دیر تک میں آنکھیں موندیں اس احساس سے لطف کشید کرتا رہا۔

''مسٹر ذیشان، آپ کیسا محسوس کر رہے ہیں؟''

شفیق سی یہ آواز جیسے یکدم مجھے خوابوں کی دنیا سے نکال کے حقیقت کی دنیا میں لے آئی تھی۔ میں نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ میرے سامنے صبغت اللہ صاحب کھڑے تھے۔ وہ میری طرف دیکھتے ہوئے شفقت سے مسکرا رہے تھے۔ ان کے وجیہہ چہرے پر نظر پڑتے ہی میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ مجھے وہ وقت یاد آیا جب میری ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ انہوں نے مجھے اپنے ادارے کے متعلق بتایا تھا اور..... میرے ذہن میں یادوں کی ایک ریل سی چلنے لگی۔

جس دن سمیرا سے میرا جھگڑا ہوا تھا اور میں دعا مانگتے مانگتے سو گیا تھا، اس کے بعد سے میرے ذہن میں کچھ غائب تھا جو اب مجھے یاد آ رہا تھا۔ اس دن میری آنکھ بہت دیر سے کھلی تھی۔ میرے اٹھتے ہی سمیرا نے ناشتا میرے سامنے لا کے رکھ دیا تھا۔ میں ناشتا کر رہا تھا کہ سمیرا بولی۔

''میں شاپنگ کرنے جا رہی ہوں۔ بچوں کے لیے کچھ چیزیں لینی ہیں۔'' اس کا لہجہ سپاٹ تھا۔ رات کو اسی بات پر میرا اس سے جھگڑا ہوا تھا۔ اس جھگڑے کی یاد آتے ہی میرا جی مکدر ہو گیا۔

''ٹھیک ہے تو جاؤ نا، میں نے کبھی تمہیں منع کیا ہے۔'' میں نے اکھڑے لہجے میں کہا تھا۔

اس نے ایک خفا سی نظر مجھ پر ڈالی تھی اور اٹھ کر چلی گئی تھی۔ ناشتے کے بعد میں دکان کے لیے کچھ سامان لینے چلا گیا تھا۔ واپسی پر میں دکان میں بیٹھا تھا۔ میرا دل غم سے بوجھل تھا۔ میں وقت گزاری کے لیے انٹرنیٹ پر سرفنگ کر رہا تھا کہ میرے سامنے ایک ایڈ آیا۔

''ہم آپ کی ہر خواہش پوری کر سکتے ہیں۔'' ایڈ کی یہ سرخی دیکھتے ہی بے اختیار میں نے ایڈ پر کلک کر دیا تھا۔ آگے ایک فارم کھل گیا تھا۔ اس فارم میں چند ذاتی معلومات کے ساتھ آپ اپنی کوئی بھی خواہش لکھ کر سبمٹ کر سکتے تھے۔ میں نے وقت گزاری کے لیے اپنی سب سے بڑی خواہش لکھ کے بھیج کر دی۔ میں اپنے ماضی میں واپس جا کے اپنی غلطیاں سدھارنا چاہتا تھا۔ یہ سب میں نے محض ''خفل'' میں کیا تھا۔ بے شمار سائٹس ایسے ''کھیل'' متعارف کراتی رہتی ہیں۔ میں بھی اس کو ایسی ہی سائٹ سمجھا تھا۔ کوئی گھنٹے بعد میں نے موبائل اٹھایا تو اس پر ایک میل آئی ہوئی تھی۔ یہ ڈریم ورلڈ نامی اسی ویب سائٹ سے آئی ہوئی تھی۔

میں نے میل کھولی۔ اس میں انتہائی سنجیدہ انداز میں میری خواہش کی تکمیل کی یقین دہانی کرائی گئی تھی۔ اس میں ایک پتا درج تھا۔ اگر میں اپنی خواہش کی تکمیل کرانا چاہتا تھا تو میں نے اگلے دن بارہ بجے تک وہاں پہنچنا تھا۔

جانے یہ لوگ کس طرح کا فراڈ کر رہے تھے۔ اس میں خطرہ تھا لیکن اس کے باوجود مجھے یہ کھیل خاصا دلچسپ محسوس ہوا۔ میل میں ایک فون نمبر بھی درج تھا۔ میں نے کچھ سوچ کر اس نمبر پر کال کی۔

''مسٹر ذیشان، ویلکم ٹو یور ڈریم ورلڈ۔'' کال ریسیو ہوتے ہی میرے کانوں میں یہ جملہ پڑا تھا۔ اس آواز میں کچھ ایسا انوکھا سا احساس تھا کہ میں اپنی رگوں میں سنسنی کی لہریں دوڑتی محسوس کرنے لگا تھا۔

''آپ واقعی خواہشات کی تکمیل کرتے ہیں؟'' میں نے بے یقینی سے پوچھا تھا۔

''اس کا انحصار آپ کی خواہش کی شدت پر ہے۔'' وہی نرم اور سحر انگیز سی آواز مجھے دوبارہ سنائی دی تھی۔

''یہ تو میں جانتا ہوں یا میرا خدا کہ یہ انہونی خواہش میرے اندر کس شدت سے ابھرتی ہے۔ میں یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ ناممکن ہے، میں اپنی اس خواہش کی تکمیل کے لیے کسی بھی حد تک جا سکتا ہوں۔'' میں بے اختیار بولتا چلا گیا۔

www.pklibrary.com

''تو پھر آپ دیے گئے وقت میں کل ہمارے آفس آجائیں۔''

''میں کیسے یقین کروں کہ اس میں کوئی دھوکا نہیں؟'' میں نے جھجکتے ہوئے پوچھا تھا۔

''آپ نہ یقین کریں۔ ہم آپ کو مجبور نہیں کریں گے۔'' وہ شفیق سی آواز جیسے مجھے اپنے ٹرانس میں لے رہی تھی۔

''پھر بھی..... آپ تسلی تو دے سکتے ہیں۔''

''دیکھیے مسٹر ذیشان، خواہشات کی تکمیل میں خطرات تو مول لینے پڑتے ہیں۔ بہرحال میں آپ کو یہ مشورہ دے سکتا ہوں کہ آپ اپنے گھر میں، اپنے دوستوں کو یا آپ چاہیں تو پولیس کو بھی یہ بتا سکتے ہیں کہ آپ کہاں جا رہے ہیں۔ آگے آپ کی مرضی۔''

''میں ان شاء اللہ کل ضرور آؤں گا۔'' بے اختیار ہی جیسے میرے منہ سے یہ الفاظ برآمد ہوئے تھے۔

''ہم آپ کا انتظار کریں گے۔'' اس جملے کے ساتھ ہی کال منقطع کر دی گئی تھی۔

میری کیفیت عجیب سی ہو رہی تھی۔ میں انتہا درجے کا حقیقت پسند ہونے کے باوجود نجانے، اس آواز کے ٹرانس میں جکڑا گیا تھا۔ میرے اندر کوئی انجانی آواز مجھے اکسا رہی تھی۔ اپنی طرف بلا رہی تھی۔ میرا خود سے اختیار جیسے ختم ہو چکا تھا۔

یہ پوری رات میری جاگتے ہوئے گزری تھی۔ اگلے دن صبح ہوتے ہی میں نے اسکول سے چھٹی کر لی اور سیدھا اس پتے پر جا پہنچا۔

یہ تقریباً دو کنال پر محیط ایک کوٹھی تھی۔ سیکیورٹی گارڈ نے میرا نام پوچھ کر گیٹ کھول دیا تھا۔ میرے قدم بے اختیار اندر کی جانب اٹھنے لگے تھے۔ میں پختہ روش پر چلتے ہوئے داخلی دروازے کے قریب جوں ہی پہنچا داخلی دروازہ کھل گیا۔

میری نظر ایک پچاس پچپن سالہ شخص پر پڑی تھی۔ یہ سحر انگیز آنکھوں والا انتہائی وجیہہ چہرہ تھا۔ اس نے اپنے بازو پھیلا کے کہا تھا۔

''ویلکم ٹو یور ڈریم ورلڈ۔'' میں بے اختیار اس کے کھلے بازوؤں میں جا سمایا تھا۔ اس کے بازوؤں میں مجھے انوکھے سکون کا احساس ہوا تھا۔ میرے لاشعور میں جو خوف جاگزیں تھا وہ بھی یکسر جیسے مٹ گیا تھا۔ میں خود کو ہوا کی طرح ہلکا محسوس کرنے لگا تھا۔

وہ مجھے اپنے ساتھ اندر لے گیا تھا۔ یہ ایک وسیع و عریض ڈرائنگ روم تھا۔ جس کی دیواروں پر عجیب طرح کی پینٹنگز آویزاں تھیں۔ میں گم صم سی کیفیت میں ایک صوفے پر بیٹھ کے ان پینٹنگز کو دیکھنے لگا..... کوٹھی میں عجیب طرح کا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اس وسیع و عریض کوٹھی میں اس وجیہہ سے شخص اور میرے علاوہ کوئی موجود نہ ہو۔

''مسٹر ذیشان، آپ ٹھنڈا لیں گے یا گرم؟'' اس کی آواز سن کے یکدم میں چونکا تھا۔

''میری بس ایک ہی طلب ہے۔'' میں عجیب سے انداز میں بولا تھا۔

وہ مسکرایا۔ ''اس چھت تلے ان شاء اللہ آپ کی ہر طلب پوری ہوگی۔'' اس نے بے حد یقین سے کہا تھا۔ میں اسے حیرت سے دیکھتا رہ گیا تھا۔

''آپ کے ذہن میں بہت سے سوالات ہوں گے۔ میں آپ کو سب بتاتا ہوں لیکن پہلے آپ کچھ کھا پی لیں۔'' اس کی آواز میں نرمی و حلاوت گھلی ہوئی تھی۔

''میں پہلے آپ کے بارے میں جاننا چاہوں گا۔''

''اوکے۔'' اس نے کندھے اچکائے۔ ''میرا نام صفت اللہ ہے۔ ڈریم ورلڈ دراصل ایک تحقیقی ادارہ ہے... جس کی شاخیں قریباً بیس ممالک میں موجود ہیں۔ اس ادارے کے بانی مسٹر گولڈ اسمتھ ہیں۔ وہ امریکی شہری ہیں۔ وہ بنیادی طور پر آئی ٹی اسپیشلسٹ ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی وہ علم نفسیات کا شوق بھی رکھتے ہیں۔ ڈریم ورلڈ کی بنیاد انہوں نے تیس سال قبل رکھی تھی۔ میں گزشتہ پندرہ سال سے ان کے ساتھ کام کر رہا ہوں۔ تیس سال کی شبانہ روز محنت کے بعد اب ہم اس قابل ہو چکے ہیں کہ ہم کسی بھی شخص کی کوئی بھی خواہش پوری کر سکتے ہیں۔'' اس نے ایک لمحے کا توقف کیا تھا۔ میں نے بے چینی سے پہلو بدلا تھا۔

''ہمارا مقصد دراصل یہ جاننا ہے کہ انسان ہمہ وقت مضطرب و بے چین کیوں رہتا ہے۔ وہ سکون و اطمینان کیسے پا سکتا ہے؟ کیا ایک انسان کی ہر خواہش پوری ہونے لگے تو وہ سکون پا لے گا؟ اس کے لیے ضروری تھا کہ ہم کوئی ایسا طریقہ اختیار کر سکیں جس کی بدولت ہم کسی بھی انسان کی کوئی بھی خواہش پوری کر سکیں۔ اب جب ہم اس قابل ہو گئے ہیں تو ہم نے اپنی تحقیق کے اگلے میدان میں قدم رکھ دیا ہے۔ اب ہم ایک شخص پر اس کی خواہشات کی تکمیل کے مابعد اثرات کا مطالعہ کر رہے ہیں۔''

''اس سب سے آپ کو کیا حاصل ہوگا؟'' میں نے

www.pklibrary.com

عجیب سے انداز میں پوچھا تھا۔

وہ مسکرایا۔ ''مسٹر ذیشان، انسان ہمیشہ سکون کا متلاشی رہا ہے۔ اسی وجہ سے اس نے اتنی ایجادات کی ہیں لیکن اس ساری ترقی کے باوجود وہ سکون نہیں پا سکا۔ اگر ہم اس کی وجہ جان جائیں تو کیا یہ انسان کے لیے سب سے بڑی دریافت نہیں ہوگی؟''

اس کی دلیل قائل کر لینے والی تھی۔ میں نے پوچھا۔ ''آپ خواہشات کی تکمیل کیسے کرتے ہیں؟''

وہ یکدم اٹھا۔ ''آئیں میرے ساتھ، اب ہم پریکٹیکل کرتے ہیں۔''

میں اس کے پیچھے چل پڑا تھا۔ وہ مجھے تہ خانے میں بنے ایک کمرے میں لے آیا تھا۔ اس کمرے میں عجیب و غریب سی مشینیں لگی تھیں۔ کمرے کے ایک کونے میں ایک بیڈ لگا تھا۔

''آپ اس بیڈ پر لیٹ جائیں۔'' اس نے مجھے اشارہ کیا تھا۔

میں خودکار انداز میں چلتا ہوا بیڈ پر جا کے لیٹ گیا تھا۔

''یہ ڈریم ورلڈ ہے۔'' اس نے ایک مشین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ میں نے تجسس سے اس عجیب و غریب مشین کی طرف دیکھا۔

وہ مشین کے ساتھ لگے الیکٹروڈز میرے سر کے ساتھ چپکانے لگا۔ میں خالی ذہن کے ساتھ اسے ایسا کرتے دیکھنے لگا۔ کچھ الیکٹروڈز اس نے میرے جسم کے ساتھ بھی چپکائے۔ آخر میں اس نے ایک عجیب و غریب سا ماسک اٹھایا۔ اس کی آنکھوں کی جگہ شیشہ لگا تھا۔ باقی ماسک کسی دھات کا بنا لگ رہا تھا۔ اس نے میرے منہ پر ماسک پہنایا۔ میری نظروں کے سامنے اندھیرا چھا گیا تھا۔

''مسٹر ذیشان، آپ اپنے ماضی کے بارے میں سوچیں۔ ہر وہ واقعہ سوچیں جس کے باعث آپ دوبارہ ماضی میں جانا چاہتے ہیں۔ جب آپ کی ماضی میں جانے کی خواہش شدت اختیار کر لے گی تب آپ حال سے ماضی میں چلے جائیں گے۔ آپ جس دن سے اپنی زندگی دوبارہ شروع کرنا چاہتے ہیں، آپ اسی دن سے اپنی زندگی دوبارہ شروع کر پائیں گے۔ اگر آپ دوسری زندگی سے مطمئن نہ ہوئے تو آپ دوبارہ بھی ماضی میں جا سکتے ہیں۔ شرط بس خواہش کی شدت کی ہے۔ آپ جتنی بار ماضی میں جانا چاہیں گے جا سکیں گے۔ جب تک کہ آپ اپنی زندگی سے مطمئن نہیں ہو جاتے۔'' میری کیفیت بے حد عجیب ہو رہی تھی۔

''تو تیار ہیں آپ؟'' اس کی آواز مجھے کسی گہرے کنویں سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

''میں 'ڈریم ورلڈ' آن کر رہا ہوں۔'' اس کے کہتے ہی ایک بیپ کی آواز سنائی دی۔ میرا ذہن خودکار انداز میں اپنے ماضی کے صفحات کھنگالنے میں مصروف ہو گیا تھا۔

سمیرا سے جھگڑے کے بعد میں نے رو رو کے اللہ سے ماضی میں جانے کی دعا کی تھی۔ اس وقت میری دعا میں میری خواہش میں اتنی شدت تھی کہ میں ماضی میں پہنچ گیا تھا۔ میں نے پوری زندگی جی لی تھی لیکن میں سکون نہیں پا سکا تھا۔ ڈریم ورلڈ مجھے ایک بار پھر ماضی میں لے گئی تھی۔ صبغت اللہ کے مطابق، میں کبھی حال میں واپس آیا تھا جب میں اپنی زندگی سے مطمئن ہو گیا تھا۔

''مسٹر ذیشان، آپ ٹھیک تو ہیں؟'' صبغت اللہ کی پُرتشویش آواز مجھے یکدم ہی حال میں لے آئی۔

میں چونک کر اپنے خیالات سے باہر آیا۔

''جی، میں ٹھیک ہوں۔'' میری آواز میں موجود سکون خود میرے لیے حیران کن تھا۔

''تو کیسی رہی ڈریم ورلڈ کی سیر؟'' انہوں نے مسکراتے ہوئے استفسار کیا۔

''یہ..... یہ سب کیا تھا۔ کیا یہ محض خواب تھا؟'' میں نے بے یقینی سے پوچھا۔

وہ مسکرائے۔ ''یہ خواب سے بھی کچھ آگے کی چیز تھی۔ بہرحال، آپ اسے مصنوعی خواب کہہ سکتے ہیں۔''

''ہاں، واقعی، یہ سب بہت حقیقی تھا۔ خواب سے یکسر مختلف۔ مگر یہ سب ہوا کیسے؟''

''آپ نے کبھی موشن رائیڈ لی ہے؟'' انہوں نے پوچھا۔

''جی جی، بچوں کے ساتھ کئی بار.....'' میں نے چونک کر کہا۔

''اس میں کیا ہوتا ہے؟''

''اس میں آپ جو ویڈیو دیکھتے ہیں موشن رائیڈ میں لگے سینسرز آپ کو اس کا حصہ بنا دیتے ہیں۔ آپ ویسا ہی خوف اور سنسنی محسوس کرتے ہیں جیسے آپ حقیقی طور پر اس مہم کا حصہ بن کے کر سکتے ہیں۔''

''بالکل، یہ ڈریم ورلڈ بھی سمجھیں موشن رائیڈ کی جدید ترین شکل ہے۔ جیسے آپ موشن رائیڈ میں ویڈیو دیکھتے ہوئے خود کو اس ماحول کا حصہ محسوس کرتے ہیں۔ ڈریم ورلڈ بھی سمجھیں اسی طرح آپ کو ایک مخصوص ماحول میں، جس

www.pklibrary.com

میں آپ جانا چاہتے ہیں لے جاتی ہے۔ مگر اس میں لگے سینسرز آپ کے ذہن کو حال سے بالکل کاٹ دیتے ہیں۔ آپ خود کو حقیقتاً اسی ماحول میں محسوس کرتے ہیں جس کی آپ نے خواہش کی ہوتی ہے۔"

"اور یہ ماحول کیسے تخلیق ہوتا ہے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

اس نے ایک کمپیوٹر کی طرف اشارہ کیا۔ "اس میں مصنوعی ذہانت پر مشتمل جدید ترین سافٹ ویئرز انسٹال ہیں۔ وہ آپ کے ذہن کو پڑھ کر اس کے مطابق خود ماحول تخلیق کرتے ہیں۔ ساتھ ہی وہ آپ کے احساسات بھی ریکارڈ کرتے جاتے ہیں۔ جو ہماری تحقیق میں کام آتے ہیں۔"

"اچھا..... میرا کیس تو مختلف تھا۔" میں نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ "مگر بہت سے لوگ جب حقیقت کی دنیا میں واپس قدم رکھتے ہوں گے تو انہیں مایوسی ہوتی ہوگی؟"

"ایسا نہیں ہوتا۔ ہر شخص کی خواہشات مختلف ہوتی ہیں۔ کسی کو دولت کی خواہش ہوتی ہے تو کسی کو محبت کی۔ کوئی طاقت کا طلبگار ہوتا ہے اور کوئی مرتبے کا۔ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو اپنی کامیابی سے زیادہ دوسروں کی ناکامی کے خواہشمند ہوتے ہیں۔ قریباً ہر شخص ہی کسی نہ کسی جستجو میں لگا ہوتا ہے اور قریباً ہر شخص ہی اپنی موجودہ زندگی سے بیزار نظر آتا ہے۔ ہم ایسے تمام لوگوں کی خواہشات کی تکمیل کرتے ہیں مگر انسان کی فطرت ایسی عجیب ہے یا شاید ہمارا ماحول اور تربیت ایسی ہے کہ خواہش کی تکمیل بھی انسان کو سکون نہیں دیتی۔ وہ مزید کی جستجو میں لگ جاتا ہے۔ ایسے میں ہمارے سافٹ ویئرز اس کی تقدیر میں ایسی تبدیلیاں لاتے ہیں کہ وہ اپنی اصل زندگی کی ہی دوبارہ سے خواہش کرنے لگتا ہے۔"

میں ڈریم ورلڈ کی سیر کر چکا تھا اس لیے ان کی باتیں مجھے سمجھ آ رہی تھیں۔ میں اگر اس تجربے سے گزر نہ چکا ہوتا تو یہ سب میرے لیے ناقابلِ یقین ہوتا۔ یکدم میرے ذہن میں ایک خیال آیا تو میں چونکا۔

"میں کتنے عرصے تک ڈریم ورلڈ کی سیر کرتا رہا؟"

انہوں نے گھڑی کی طرف دیکھا اور بولے۔ "محض آٹھ گھنٹے۔"

"کیا؟" میری آواز حیرت سے جیسے پھٹ گئی۔ دو زندگیاں میں نے محض آٹھ گھنٹے میں جی لی تھیں۔

"اس کی خاص بات یہی ہے کہ آپ چند مناظر دیکھتے ہیں لیکن وہ اس تسلسل سے آپ کو نظر آتے ہیں کہ آپ کو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے آپ نے ساری زندگی جی لی ہو۔"

میں نے تفہیمی انداز میں سر کو جنبش دی۔ "میں آپ کا انتہائی شکر گزار ہوں کہ آپ نے میری ایک انہونی خواہش پوری کی۔ مجھے آپ کی اس انوکھی دنیا کی سیر سے ایسا سکون و اطمینان حاصل ہوا ہے جس کے لیے میں ساری زندگی ترستا رہا۔"

"بے شک، اس تجربے سے آپ کی خواہش کی تکمیل ہوئی لیکن دراصل اس تجربے سے ہماری تحقیق میں خاصی پیش رفت ہوئی ہے۔ ہمیں ایک اہم سوال کا جواب ملا ہے۔"

"وہ کیا؟"

"ہم نے ابھی تک جتنے بھی لوگوں کی خواہشات کی تکمیل کی ہے، انہیں سکون و اطمینان کا احساس تبھی ہوتا ہے جب ان کے دل میں شکر گزاری کا جذبہ جاگتا ہے۔ آپ بھی تب تک بے سکونی کا شکار رہے جب تک آپ کے دل میں شکر گزاری کا جذبہ نہیں بیدار ہوا۔ اس جذبے کے بیدار ہوتے ہی آپ مطمئن ہو گئے۔ اس جذبے کے بغیر انسان ہمیشہ اضطراب و بے چینی کا شکار ہی رہتا ہے۔"

"تو کیا اب میں ہمیشہ پُرسکون رہوں گا؟"

"نہیں۔" وہ مسکرائے۔ "جب تک آپ کا دل شکر گزاری کے جذبات سے معمور رہے گا آپ مطمئن رہیں گے۔ جوں ہی آپ کے دل میں شکوے شکایات پیدا ہوں گی آپ اپنا اطمینان غارت کر لیں گے۔"

میں نے ایک جھرجھری لی۔ اسی وقت میں نے خود سے عہد کیا کہ آئندہ کبھی شکایات کو دل میں جگہ نہیں دینی۔ ہر حال میں اللہ کا شکر ادا کرنا ہے۔

واپسی پر میں بے حد مسرور تھا۔ سمیرا اور بچوں کا خیال آتے ہی میرا دل چاہ رہا تھا کہ مجھے پر لگیں اور میں اڑ کے ان کے پاس پہنچ جاؤں۔ مجھے ان سے بچھڑے چند گھنٹے ہی ہوئے تھے لیکن مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے صدیوں سے میں نے انہیں نہ دیکھا ہو۔ آج طویل عرصے کے بعد میں سمیرا سے اس قدر محبت محسوس کر رہا تھا۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر تھا کہ میں نے سمیرا کو اور بچوں کو کھویا نہیں تھا۔ میں نے آسمان کی طرف دیکھا اور بے اختیار میرے دل کی گہرائیوں سے ایک جملہ نکلا۔

"اللہ، تیرا شکر ہے۔"

یہ شکر گزاری کا احساس ہی میری زندگی کا حاصل ہے جو میں نے بڑی مشکل سے حاصل کیا تھا۔

⌘⌘⌘